ماہنامہ

ذوقِ نظر

ست پانچ روپیہ Rs, 5/-

حیدرآباد (اے۔پی)

مئی ۱۹۸۵ء

"ذوقِ نظر"

حیدرآباد — فون نمبر (525117)

جلد (۱) — اپریل مئی ۱۹۸۵ء — شمارہ (۴)

زرِ تعاون:- سالانہ پچاس روپے فی شمارہ پانچ روپے
بیرونِ ممالک سے فی شمارہ ۱۵ ریال

[illegible] پریس [illegible] ذوقِ نظر
[illegible] حیدرآباد سے شائع کیا

اِس شمارے میں

سلسلہ نشان	عنوان	صفحہ نمبر
۱	حرفِ آغاز	۳
۲	حمد۔ حضرت حیرت وارثیؒ	۷
۳	نعتِ شریف۔ بشیر وارثی	۸
۴	منقبت مولائے کائنات حضرت علیؓ۔ حضرت امام شافعیؒ	۱۰
۵	امیر المومنین سیدنا علی المرتضیٰؓ اور صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہا۔ ڈاکٹر عبدالستار رضا صاحب	۱۱
۶	امیر المومنین حضرت علی المرتضیٰؓ۔ مولانا مفتی عبدالجلیل صاحب	۱۸
۷	منقبت۔ آصف سابع عثمان	۲۸
۸	حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ۔ حضرت عبداللہ شاہ صاحب نقشبندی مرحوم	۳۹
۹	منقبت خواجہ شوق	۵۳
۱۰	حضرت غریب نوازؒ کی زندگی کا ایک سرسری خاکہ۔ سید خواجہ معین الدین ایم اے	۵۴
۱۱	لائی ہوئی روشنی (افسانہ) رضاء الجبار ٹورنٹو امریکہ	۵۸
۱۲	غزل۔ حضرت شیخ احمد شطاری کامل مرحوم	۷۵
۱۳	جدید اردو نظم۔ آغاز، سمت و رفتار۔ ڈاکٹر مجید بیدار	۷۷
۱۴	غزل۔ حضرت مولانا حفیظ الرحمٰن واصف دہلوی	۹۴
۱۵	قیامت۔ شوکت تھانوی مرحوم	۹۵
۱۶	اردو تنقید۔ ایک جائزہ۔ علی احمد جلیلی	۱۰۷
۱۷	غزلیں۔ اسد انصاری؛ ماجد دفائی مرحوم	۱۱۵
۱۸	جواب۔ ڈاکٹر رحمٰن ساقر	۱۱۶
۱۹	غزل۔ خبیب گوندیاوی	۱۲۶
۲۰	قطعات۔ طاہر گلشن آبادی	۱۲۷
۲۱	اردو اسکول کا ٹیچر۔ ڈاکٹر یعقوب عمر	۱۲۸
۲۲	کسوٹی - ڈاکٹر یعقوب عمر	۱۳۰
۲۳	کبوتر اور پیغام رسانی۔ عظیم الرحمٰن عظیم	۱۳۳
۲۴	بزمِ خیال	۱۴۲

حرفِ آغاز

اس دنیائے خیر و شر میں ادب بھی دو قسم کے تخلیق ہوتے رہے ہیں ایک تعمیری اور دوسرا تخریبی تعمیری ادب کے خالقوں کو کبھی اس بات کی ضرورت ہی نہیں پڑی کہ وہ اپنی نگارشات کی مدافعت کریں جب کہ تخریبی ادب تخلیق کرنے والوں کو قدم قدم پر اپنی صفائی پیش کرنی پڑتی ہے۔ کبھی تو وہ یہ کہتے ہیں کہ پیپ سے بھرے سماجی پھوڑوں کی منظر عام پر جراحی دوسروں پر یقیناً عبرت انگیز اثرات مرتب کر سکتی ہے کبھی وہ یہ بھی دعوا کرتے ہیں کہ سماج کی اصلاح کیلئے ضروری ہے کہ اُسے آئینہ دکھایا جائے۔ یہ سب دل بہلانے کی باتیں ہیں، ذہنی مغالطے ہیں، چوری، بدکاری اور دیگر برائیوں کے معائب منظر عام پر لانے کے بجائے۔ یہ چوروں بدکاروں اور دیگر سماجی مجرموں کے کارنامے نمک مرچ لگا کر بیان کرتے ہیں۔ ان کی ذہنی عیاشی کا یہ عالم ہوتا ہے کہ مفروضہ خواہشات کی صورت گری کرتے ہیں۔ اگر لوگوں کو شراب کی برائیوں سے آگاہ کرنا مقصود ہو تو اس کیلئے بالم گھر شراب خانے کھول دئے جائیں تا کہ ہر شخص اس کی برائی سے عملی طور پر آگاہ ہو سکے تو ظاہر ہے کہ کوئی دانشمند اس قسم کی تجویز کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

فلموں کا حال بھی کچھ مختلف نہیں مگر یہ تخریبی ادب سے سو گنا زیادہ موثر ہوتی ہیں۔ تخریبی ادب پڑھنے کیلئے پڑھا لکھا ہونا ضروری ہے مگر فلموں کے لئے تو یہ قید بھی نہیں۔ زبان سے ناواقفیت بھی فلموں کے اثرات کو روک نہیں سکتی کیونکہ اس میں حرکات وسکنات سے ہی سب کچھ سمجھا جا سکتا ہے۔

تخریبی ادیب دراصل نفسیاتی مریض ہوتے ہیں۔ ان میں سے اکثر رائی سے پیٹ چھپاتے ہیں۔ ان کا مقصد صرف اتنا ہوتا ہے کہ جن چیزوں سے انھیں محروم ہونا پڑا یا وہ جائز طور پر اپنی جنسی خواہشات کی تکمیل نہ کر سکے اسے انھوں نے ذہنی چٹخارے حاصل کرنے کے لئے قلم کے ذریعے سے معاشرے میں پھیلا دیا کیونکہ برائیوں کے نتائج بتاتے وقت تو ان کے قلم کو زنگ لگ جاتا ہے مگر جب برائیوں کی منظر کشی کرنے پہ آتے ہیں تو تمام جزئیات کو اتنا نمایاں کرتے ہیں کہ محدب عدسہ MAGNIFYING GLASS بھی اس دوڑ میں پیچھے رہ جائے۔

یہ تو خیر کوئی دعویٰ نہیں کر سکتا کہ قرون اولیٰ میں اس قسم کا ادب یا ادیب نہیں ہوتے تھے مگر آج ان کا تناسب حد سے بڑھ گیا ہے۔ پرانے زمانے میں اگر کوئی اس قسم کا نفسیاتی مریض ہوتا بھی تھا تو اس کی جرأت نہ ہوتی تھی کہ وہ کھلے بندوں اپنی تخلیقات پیش کر سکے اور اسی طرح وہ لوگ بھی چوری چھپے احتیاط سے اس قسم کی نجس تخلیقات سے لطف اندوز ہوتے تھے جو نفسیاتی بیماری میں ادیب وشاعر سے مشابہت رکھتے تھے۔

وہ سماجی برائیاں جب سے ہندوستان کے طول وعرض میں رہنے والے

اکثر لوگ ناواقف تھے اسے پہلے پہل فلموں نے گاؤں گاؤں پہونچا دیا اور رہی سہی کسران ترقی پسند حقیقت نگار ادیبوں نے پوری کردی جنھوں نے نہ صرف برائیوں کی عکاسی کی بلکہ وہ بخیے کھڑے کردینے والی فرضی اور خیالی برائیاں بھی تخلیق کر ڈالیں جس سے نہ صرف ان کے اپنے سفلی جذبات کی تسکین ہو بلکہ اس قسم کی تخلیقات پڑھنے والوں کے حلقے میں بھی اضافہ ہوتا کہ انھیں کوئی دُم کٹی لومڑی سے تشبیہ نہ دے سکے اور ان کی نفسیاتی بیماری کے حقائق کسی کے سامنے نہ آسکیں۔

تعمیری ادیب اس ہمت شکن ماحول میں اسیر ہوتے جارہے ہیں۔ اچھے رسالوں کا فقدان تو پہلے ہی سے تھا مگر اب گنے چنے مشہور رسالوں میں بھی تعمیری ادیبوں کی حوصلہ افزائی کے امکان کم ہوتے چلے جارہے ہیں اور تخریبی ادیبوں کا تسلط ہوتا جارہا ہے۔ اس غیر صحتمندانہ رجحان کا سدباب ہونا ضروری ہے۔ چنانچہ اس سمت میں سب سے پہلا قدم تو یہ ہونا چاہیئے کہ مختلف اردو اکیڈمیوں کو تعمیری رسائل نکال کر ایسے ادیبوں کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیئے۔ جو تعمیری ادب کی تخلیق ہی میں نہیں بلکہ سماجی تشکیل نو میں بھی اپنا کردار بخوبی ادا کرسکیں۔

اقبال اکیڈمی اوارڈ

اقبال اکیڈمی کی جانب سے ڈاکٹر غلام دستگیر رشید سابق صدر شعبہ فارسی جامعہ عثمانیہ کو ۱۸ اپریل بروز یکشنبہ مدینہ منشن میں صدر اقبال اکیڈمی جناب خلیل اللہ حسینی نے ان کی علمی و ادبی خدمات کے اعتراف میں طلائی تمغہ پیش کیا۔ مدیر "سیاست" جناب عابد علی خان نے ادبی

ٹرسٹ کی جانب سے عطیہ کا چیک ان کی خدمت میں پیش کیا۔ اس موقعے پر
دانشمندوں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔ ڈاکٹر رشید صاحب کی حکیمانہ
شخصیت کے قد بالا کو دیکھتے ہوئے یہ ادارد کوئی بڑی بات نہیں پھر
بھی حق بحق دار رسید کے بمصداق ان کی خدمات کا اعتراف اس بات
کا غمّاز ہے کہ اہل حیدرآباد اپنی برگزیدہ شخصیتوں کو نہیں بھولتے۔ اور یہ
جذبہ نہایت قابل تحسین ہے۔ مدیر سیاست جناب عابد علی خاں صاحب
بھی مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے ڈاکٹر رشید صاحب کی گراں قدر
خدمات کا ادبی ٹرسٹ کے پلیٹ فارم سے اعتراف کیا ہے۔

اعتذار :۔ گزشتہ شمارے میں سہو نظری کے باعث چند کتابت کی غلطیاں رہ گئی تھیں جس
پر ادارے کو افسوس ہے۔ خصوصاً بعض غزلوں میں اسکی بناء پر قارئین
کو جو پریشانی ہوئی ہوگی اس کا ہمیں احساس ہے اور اس کی تلافی انشاءاللہ
اس شمارے میں ہو جائے گی۔

رُباعی

هم چاکِ گریبانِ تمنا نہیں سیتے
اوروں کی توجہ کے سہارے نہیں جیتے
ساقی ترے میخانے میں آئے ہیں تو لیکن
ہم بادۂ الفت کے سوا کچھ نہیں پیتے

از :۔ عریب شاہ خالد کیفی

حضرت حیرت وارثی رحمتہ اللہ علیہ

حمد

تیری تعریف کیسے کروں میں بیاں میری طاقت ہے کیا میں تو کچھ بھی نہیں
ہر ذرے میں نسبت تو ہوتی ہے کچھ مجھ کو نسبت ہے کیا میں تو کچھ بھی نہیں
میرے وہم وگماں سے بھی باہر ہے تو میں تو قطرہ نہیں اور سمندر ہے تو
تیرا سودا ہو مجھ کو یہ ہستی کہاں دل کی وسعت ہے کیا میں تو کچھ بھی نہیں
تو سمایا جو مجھ میں تیرا کام ہے میری ہستی ہے کچھ تو تیرا نام ہے
تیری رحمت نے رتبہ یہ بخشا مجھے میری جرات ہے کیا میں تو کچھ بھی نہیں
تیرا در چھوڑ کر میں کہاں جاؤں گا جو یہاں نہ ملا تو کہاں پاؤں گا!!
تو خزانوں کا مالک ہے دیدے شہاب کفایت ہے کیا میں تو کچھ بھی نہیں
میرا وارثؒ ہے تو میرا مالک ہے تو میرا آقا ہے تو میرا داتا ہے تو
تیرے ہونے سے جیتا ہے جینا میرا میری ہمت ہے کیا میں تو کچھ بھی نہیں
جس نے دیکھا مجھے کیوں نہ حیران ہو میں جو پہلا سا ہوں میری پہچان ہو
تیری آئینہ سازی کی ہے یہ جلا ورنہ حیرت ہے کیا میں تو کچھ بھی نہیں !

نعت شریف

آپ سراپا نورِ مجسم صلی اللہ علیہ وسلم
بعدِ خدا ہیں سب سے معظم صلی اللہ علیہ وسلم
آپ بنائے ہر دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم
حق کے صحائف سے ہے مسلم صلی اللہ علیہ وسلم
خلق کے رہبر سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم
دینِ خدا ہے آپ سے محکم صلی اللہ علیہ وسلم
آپ نبی آدم تا ایں دم صلی اللہ علیہ وسلم
ہادیِ اوّل مرسلِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم
نورِ خدا سے نور محمدؐ نورِ محمدؐ وجہہ دو عالم
نورِ مبیں ہیں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم
آپ مصفّا، آپ مطہّر آپ معطّر آپ معنبر
آپ سے مہکا ہر اک عالم صلی اللہ علیہ وسلم

دوش پہ ڈالے کملی کالی فرش نشیں ہیں عرش کے والی
جگ کے مونس جگ کے ہمدم صلّی اللہ علیہ وسلّم

ذاتِ مقدّس جسمِ معطّر حسنِ دو عالم خُلقِ مجسّم
شافعِ محشر رحمتِ عالم صلّی اللہ علیہ وسلّم

ہادیِ برحق، دین کے رہبر دونوں عالم کے ہیں سرور
بھیج درود اُن پر تو پیہم صلّی اللہ علیہ وسلّم

شہر کی خندق کھودنے والے بھوک کی شدّت جھیلنے والے
پیٹ پہ پتھر شاہِ دو عالم صلّی اللہ علیہ وسلّم

آب و گِل میں جب تھے آدم آپ نبی تھے سرورِ عالم
نورِ نبی تخلیقِ دو عالم صلّی اللہ علیہ وسلّم

عرش منوّر، فرش منوّر، جلوہ نما ہر شے کے اندر
نورِ مجسّم فخرِ دو عالم صلّی اللہ علیہ وسلّم

حمد و ثناء کے بعد بشیرؔ اب نعتِ نبیؐ ہے سب سے مقدم
نامِ محمدؐ اسمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم

بشیر وارثی

حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ

منقبت مولائے کائنات حضرت علیؓ

متن عربی :		ترجمہ اُردو :
علی حبہ جُنّۃ		علیؓ کی محبت سپر کا کام دیتی ہے (آتشِ جہنم
قسیم النار والجنۃ	۱	سے بچانے والی ہے) اور حضرت علیؓ جنت
وصی المصطفیٰ حقا		اور دوزخ کے تقسیم کرنے والے ہیں۔
امام الانس والجنۃ	۲	خدا کی قسم آپ حضرت محمد مصطفیٰ کے وصی
		اور تمام انسانوں اور جنات کے امام ہیں۔

دیگر :

یا اھل بیت رسول اللہ حبکم	۱	اے اہل بیت رسول اللہ صلعم تم سے محبت
فرض من اللہ فی القرآن انزلہ		رکھنا اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرض ہے
کفاکم من عظیم القدر انکم		جس کو اللہ تعالیٰ نے قرآن میں نازل کیا۔
من لم یصلّ علیکم لا صلوٰۃ لہٗ	۲	تمہاری منزلت کی بلندی کیلئے اتنا کافی
		ہے کہ جو شخص تم پر درود نہ پڑھے اس
		کی نماز نہیں ہوتی۔

حیدرآباد
مئی ۱۹۸۵ء

ڈاکٹر عبدالستار خان صاحب
ریڈر شعبہ اسلامیات عثمانیہ یونیورسٹی

امیر المومنین سیدنا علی مرتضیٰؓ
اور
صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم ایک ایسی مبارک جماعت تھی جن پر پوری انسانیت جتنا ناز کرے کم ہے۔ انسانیت کے مرقع میں بلکہ اس پوری کائنات میں پیغمبروں کے بعد اس سے زیادہ حسین و جمیل، دلکش و دل آویز تصویر نہیں ملتی جو ان کی مبارک زندگیوں میں نظر آتی ہے۔ ان کا پختہ یقین، ان کا گہرا علم، ان کا سچا حال، ان کی بے تکلف زندگی، ان کی بے نفسی، خدا ترسی، ان کی پاکبازی، ان کی شفقت و رافت اور ان کی دلیری اور شجاعت ان کا ذوق عبادت اور شوق شہادت، ان کی شہ سواری اور ان کی شب زندہ داری ان کی سیم و زر سے بے پروائی ان کی دنیا سے بے رغبتی، ان کا انصاف، ان کا حسنِ انتظام دنیا کی تاریخ میں اپنی نظیر نہیں رکھتا۔ ان کی خاکی اور نوری نہاد ہستیوں کی علامہ اقبال علیہ الرحمہ نے اپنی شاعرانہ عبقریت میں کیا تو تصویر کھینچی ہے ؎

ہر دو جہاں سے غنی اس کا دل بے نیاز	خاکی و نوری نہاد بندۂ مولیٰ صفات
اس کی ادا دلفریب، اس کی نگہ دل نواز	اس کی امیدیں قلیل اس کے مقاصد جلیل
رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاکباز	نرم دمِ گفتگو، گرم دمِ جستجو
عہد کہن کو دیا اس نے پیامِ رحیل	اس کے ادائے عجیب اس کے فسانے غریب

ساقی ارباب ذوق فارسِ میدان شوق ﷺ بادہ ہے اس کا رحیق تیغ ہے اس کی اصیل

اس مضمون پر بطور شہادت عینی امیر المومنین سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے خطبات کا اقتباس پیش کرتے ہیں جو اہلِ بیت کرام کی صداقت اور بلاغت اور فصاحت علوی کا مظہر ہے۔ یہ اقتباس نہج البلاغہ سے ماخوذ ہے جو شہرۂ آفاق ہاشمی شیعی ادیب وشاعر الشریف الرضی کا متفق علیہ مجموعہ ہے۔ جو اپنے عہد تک مستند و متداول اور جس کی شرح مشہور شیعی عالم دین ابی الحدید نے کی ہے۔ یہاں ہم صرف حضرت امیر المومنین سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے خطبہ کا ترجمہ کرتے ہیں فرماتے ہیں۔

"میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کی ایسی شان دیکھی ہے کہ میں تم میں کسی کو ان کا مشابہ نہیں پاتا وہ صبح میں اس حال میں نظر آتے تھے کہ ان کے بال بکھرے ہوئے غبار آلود ہیں رات انھوں نے سجدے اور قیام میں گزاری ہوتی۔ کبھی اپنی پیشانیوں پہ جھکے ہوتے تھے کبھی اپنے رخساروں پر، قیامت کی یاد سے ایسے بے چین نظر آتے تھے، جیسے انگاروں پہ کھڑے ہوں، ان کی پیشانی (کثرت طول سجود سے) ایسی خشک اور سخت معلوم ہوتی تھی جیسے بکری کی ٹانگ، اللہ تعالیٰ کا نام لیا جاتا تو ان کی آنکھیں ایسی اشکبار ہو جاتیں کہ ان کے گریبان اور دامن تر ہو جاتے اور وہ سزا کے خوف اور ثواب امید میں اس طرح لرزتے ہوئے نظر آتے جیسے تیز آندھی کے وقت درخت۔"

امیر المومنین سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے خلفائے ثلاثہ بالخصوص

شیخین کو اپنا پورا تعاون دیا۔ نازک موقعوں پر ان کے صحیح مشورے بڑے مفید اور قیمتی ثابت ہوئے۔ حضرت ابوبکرؓ کی وفات اور حضرت عمرؓ کی شہادت پر آپ نے اپنے جذبات و تاثرات کا جس طرح اظہار کیا اس سے ان مخلصانہ تعلقات کا اظہار ہوتا ہے۔ یہ دونوں خطبے جن میں ان کا اسلوب بیان' زبان اور بیان کی بلاغت پوری طرح نمایاں ہے۔ یہ الفاروق' البدایہ والنھایہ' تاریخ طبری' اور الریاض النضرۃ میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ طوالت کے خوف سے ان کو ان کو یہاں نقل نہیں کیا گیا۔

امیر المومنین حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے محاصرہ کے دوران پانی روک دیا گیا تھا۔ حضرت علیؓ کو اس کی اطلاع ہوئی تو پانی کی تین مشکیں بھیج دیں' ان کے لے جانے کے سلسلہ میں بنی ہاشم کے کئی تعلق والے زخمی ہوئے۔ حضرت علیؓ نے حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ سے فرمایا اپنی تلواریں لے کر حضرت عثمانؓ کے گھر کے دروازہ پر کھڑے ہو جاؤ اور کسی کو ان تک جانے نہ دو۔

جب باغیوں نے حضرت عثمانؓ پر نرغہ کیا اور آپ کے مکان کا محاصرہ کیا تو حضرت علیؓ نے حضرت حسنؓ اور اپنے غلام قنبر کو حضرت عثمانؓ کی حفاظت پر مامور فرمایا۔ اس مدافعت میں حضرت حسنؓ زخمی بھی ہوئے سارا بدن خون سے رنگین ہو گیا۔ قنبر کے سر پر چوٹیں آئیں اور باغی اس دروازہ سے داخل نہ ہو سکے لیکن باغی دوسری طرف سے دیوار پھاند کر اندر پہونچ گئے اور حضرت عثمانؓ کو بحالتِ تلاوت شہید کر دیا۔ اب صحابہ کرام اور اہل بیت اطہار کے باہمی تعلقات کی خوشگواری کے بارے میں چند واقعات بیان کئے جاتے ہیں۔

امام بخاریؒ حضرت عقبہ بن الحارثؓ سے روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت حضرت ابوبکرؓ نے عصر کی نماز پڑھی۔ پھر باہر نکل کر ٹہلنے لگے حضرت حسنؓ کو دیکھا کہ بچوں کے ساتھ کھیل رہے ہیں۔ آپ نے ان کو اپنے کاندھے پر بٹھایا اور فرمایا کہ میرا باپ قربان ہو یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مشابہ ہیں علیؓ سے مشابہ نہیں، حضرت علیؓ سن رہے تھے اور ہنس رہے تھے۔

ابن سعد بروایت امام جعفر صادقؓ بروایت امام محمد باقرؒ بروایت امام زین العابدینؒ روایت فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ کے پاس یمن کے حلے آئے (ایک ہی قیمتی کپڑے کا قمیص اور پائجامہ کو حلّہ کہتے ہیں) حضرت عمرؓ نے لوگوں میں تقسیم فرما دیئے۔

حضرت عمرؓ ریاض الجنۃ میں تشریف فرما تھے لوگ یہ پوشاک پہن کر مسجد نبوی میں آتے اور حضرت عمرؓ کو سلام کرتے اور دعا دیتے اتنے میں حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ دکھائی دیئے اور ان کے جسم پر حلّہ نہ تھا حضرت عمرؓ اداس ہو گئے۔ لوگوں نے پوچھا کیا بات ہے؟ آپ نے جواب دیا۔ اس وجہ سے مغموم ہوں کہ ان حضرات کے بدن کے مطابق کوئی حلہ نہ تھا سب بڑی عمر والوں کے لئے تھے۔ پھر آپ نے والی یمن کو لکھا کہ حضرات حسنینؓ کے لئے دو حلّے بھیجو اور جلدی کرو اس نے دونوں کی پوشاکیں بھیجیں۔ آپ نے دونوں کو پہنایا تب اطمینان ہوا۔

علامہ شبلی "الفاروق" میں متعلقین جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس و لحاظ" کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں۔

"(حضرت عمر) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلق کا نہایت پاس کرتے تھے۔

جب صحابہ وغیرہ کے روزینے مقرر کرنے چاہے تو عبدالرحمٰن بن عوفؓ وغیرہ کی رائے تھی کہ حضرت عمرؓ مقدم رکھے جائیں، لیکن حضرت عمرؓ نے انکار کیا اور کہا کہ ترتیب مدارج میں سب سے مقدم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلقات قرب و بُعد کا لحاظ ہے۔ چنانچہ سب سے پہلے قبیلۂ بنی ہاشم سے شروع کیا اور اس میں بھی حضرت عباسؓ اور حضرت علیؓ کے ناموں سے ابتدا کی، اپنے قبیلہ بنی عدی کو پانچویں درجہ میں رکھا، چنانچہ اسی ترتیب سے سب کے نام لکھے گئے تنخواہوں کی مقداروں میں بھی اسی کا لحاظ رکھا، سب سے زیادہ تنخواہیں جن لوگوں کی تھیں وہ اصحاب بدر تھے۔ حضرت امام حسنؓ و حسینؓ علیہم السلام اگرچہ اس گروہ میں نہ تھے لیکن ان کی تنخواہیں اسی حساب سے مقرر کیں۔"

نواب محسن الملک کی کتاب "آیات بینات" میں ہے۔

حضرت عمرؓ بڑی بڑی مہمات میں حضرت علیؓ سے مشورہ کے بغیر کام نہیں کرتے تھے اور حضرت علیؓ بھی نہایت دوستانہ اور مخلصانہ مشورہ دیتے تھے نہاوند کے معرکہ میں ان کو سپہ سالار بھی بنانا چاہا تھا لیکن انہوں نے منظور نہیں کیا۔ بیت المقدس گئے تو کاروبار خلافت انہیں کے ہاتھ میں تھا۔ اتحاد و یگانگت کا آخری مرتبہ یہ تھا کہ حضرت علیؓ نے حضرت ام کلثوم کو جو حضرت فاطمہ زہراؓ کے بطن سے تھیں ان کے عقد میں دے دیا۔"

جہاں تک شیر خدا حضرت علیؓ کا تعلق ہے آپ کا اپنی رضا و رغبت سے اپنی صاحبزادی ام کلثوم کو دوسری بیویوں کی موجودگی میں اس سن و سال میں حضرت عمرؓ کے عقد میں دینا اور اپنے تین صاحبزادوں کے نام ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ رکھنا، اس الفت و محبت اور اعتماد کی واضح

مثال ہے، ایسی اور مثالیں بھی دی جا سکتی ہیں لیکن بطور اختصار یہاں اسی پہ اکتفا کیا جاتا ہے۔

ان تاریخی حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے مسلمانوں میں ایک فرقہ ہے جو ان سارے تاریخی حقائق کو نظر انداز کر کے معاذ اللہ پہلے تینوں خلفاء کو غاصب خلافت قرار دیتا ہے۔ اور ایسی بے سرو پا باتیں رائج کر رکھی ہے جس کو ابن سبا نے اس امت مرحومہ کے شیرازہ کو بکھرنے کے لئے جمع کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس فرقہ کو نیک توفیق دے آمین۔

یاد رکھئے ـــــ یاد رکھئے

موقتی زندگی اور دائمی زندگی کی کامیابی کا راز بلا لحاظ مذہب و ملت مخلوق خدا کی خدمت اور ان سے پیار و محبت میں مضمر ہے۔ مخلوق خدا میں انسانوں کے علاوہ حیوانات و نباتات بھی شامل ہیں۔ اگر ایک حیوان کے ساتھ بھی نیکی کی جائے تو اللہ اس کا اجر دیتے ہیں اور اگر ایک حیوان کے ساتھ بھی برائی کرتے ہیں تو اللہ اس کی سزا دیتے ہیں پھر تو انسان انسان ہی ہے۔ اس کے علاوہ انسانیت کے رشتے سے ہر انسان ایک دوسرے کا بھائی ہے انسان جو بدی کرتا ہے وہ اپنے حق میں کرتا ہے اور جو نیکی کرتا ہے وہ بھی اپنے حق میں کرتا ہے۔

ان تمام باتوں کیلئے ایک لمحہ فکر کی ضرورت ہے ورنہ اسکے لئے ایک کتاب درکار ہے

آپ کا مخلص بھائی۔ حسین ضابط

از ۔ مولانا مفتی محمد عبدالجلیل صاحب
فاضل نظامیہ ۔

امیر المومنین حضرت سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ

نام و نسب :۔ علیؓ نام ۔ ابوالحسن اور ابوتراب کنیت ۔ شیر خدا حیدر کرار لقب ، والد کا نام ابوطالب اور والدہ کا نام فاطمہ بنت اسد تھا ۔ چونکہ حضرت ابوطالب کی شادی اپنے چچا کی لڑکی سے ہوئی تھی اس لئے حضرت علی نجیب الطرفین ہاشمی ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھائی ہیں ۔

حضرت علیؓ کے والد ابوطالب مکہ کے نہایت ذی اثر بزرگ تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں کی آغوشِ شفقت میں پرورش پائی تھی اور بعثت کے بعد انہیں کے زیرِ حمایت ، مکہ کے کفرستان میں دعوتِ حق کا اعلان کیا تھا ۔ حضرت ابوطالب ہر موقعہ پر آپ کے سینہ سپر رہے ۔ مشرکین عرب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پشت پناہی اور حمایت کے باعث حضرت ابوطالب اور ان کے خاندان کو مختلف تکلیفیں پہنچائیں اس کے باوجود حضرت ابوطالب نے اپنے آخری لمحۂ حیات تک اپنے عزیز بھتیجے کے سر سے دستِ شفقت نہ اٹھایا اور تاحیات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت میں سینہ سپر رہے ۔

حضرت علیؓ کی والدہ حضرت فاطمہ بنت اسد نے حضرت آمنہ کی وفات کے بعد نہایت سعادت اور محبت سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پرورش کی تھی ۔

مستند روایات کے مطابق وہ مسلمان ہوئیں اور ہجرت کرکے مدینہ آگئیں جب فاطمہ بنت اسد کا انتقال ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کفن میں اپنی قمیص مبارک

پہنائی اور قبر میں لیٹ کر اس کو متبرک کیا۔ لوگوں نے حضورؐ سے اس عنایت کی وجہ دریافت کی تو فرمایا کہ حضرت ابوطالب کے بعد سب سے زیادہ اسی نیک سیرت خاتون کا ممنونِ احسان ہوں۔

حضرت علیؓ کی پیدائش اور اسلام

آپ بعثت نبویؐ سے دس برس پہلے پیدا ہوئے تھے حضرت ابوطالب کثیر العیال تھے اور معاشی تنگی کی وجہ سے اکثر پریشان رہا کرتے تھے اس لئے رحمت اللعالمین نے اپنے محبوب چچا کی عسرت سے متاثر ہو کر حضرت عباسؓ سے فرمایا کہ ہمیں مصیبت اور پریشان حالی میں ان کا ہاتھ بٹانا چاہیئے چنانچہ حضرت عباسؓ نے حسب ارشاد نبوی حضرت جعفرؓ کی کفالت اپنے ذمہ لی اور سرور کائنات ؐ کی نگاہِ انتخاب نے حضرت علیؓ کو پسند کیا۔ چنانچہ حضرت علیؓ حضور پرنور کے ساتھ رہتے تھے۔

حضرت علیؓ کا سنِ مبارک ابھی دس سال کا تھا کہ ان کے شفیق و مربی کو دربارِ الٰہی سے نبوت کا خلعت عطا ہوا چونکہ حضرت علیؓ سرورِ عالم کے ساتھ رہتے تھے اس لئے اسلام کے مذہبی مناظر سب سے پہلے آپ کو نظر آئے چنانچہ ایک روز آنحضرتؐ اور ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کو مصروف عبادت دیکھا اس موثر نظارہ کا آپ نے اثر لیا۔ طفلانہ استعجاب سے پوچھا کہ آپ دونوں کیا کر رہے تھے۔ حضرت نبی کریمؐ نے نبوت کے منصب گرامی کی خبر دی۔ کفر و شرک کی مذمت کر کے توحید کی دعوت دی تو متحیر ہو کر عرض کیا کہ میں اپنے والد حضرت ابوطالب سے اس بارے میں دریافت کروں گا۔

سرورِ کائناتؐ کو ابھی اعلان عام منظور نہ تھا اس لئے فرمایا کہ اگر تمھیں تامل ہے تو خود غور کرو ابھی کسی سے اس کا تذکرہ مت کرو۔

آنحضرت کے زیرسایہ پرورش سے فطرت سنور چکی تھی۔ توفیق الٰہی شامل حال ہوئی زیادہ غور و فکر کی ضرورت پیش نہ آئی دوسرے ہی دن بارگاہ نبوت میں حاضر ہو کر مشرف بہ اسلام ہو گئے۔

ایمان کی اولیت کے تعلق سے مختلف احادیث کو محدثین نے اس طرح تطبیق دی ہے کہ مردوں میں سب سے پہلے حضرت ابو بکر صدیقؓ عورتوں میں سب سے پہلے ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ بچوں میں سب سے پہلے حضرت علیؓ اور غلاموں میں سب سے پہلے حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ ایمان لائے۔

دعوت اسلام :- منصب نبوت عطا ہونے کے بعد آنحضرت نے تین سال تک علانیہ دعوت اسلام کی صدا بلند نہیں فرمائی بلکہ پوشیدہ طریقہ پر خاص خاص لوگوں کو دیتے رہے چوتھے سال پہلے قریبی رشتہ داروں میں اسلام کی تبلیغ کا حکم ہوا چنانچہ یہ آیت پاک نازل ہوئی۔ وَاَنذِرْ عَشِيرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ (اپنے قریبی اقربا کو عذاب الٰہی سے ڈراؤ) اس حکم الٰہی کے مطابق حضورؐ اپنے قریبی خاندانی افراد کو کوہ صفا پر لے گئے اور دعوتِ اسلام کی صدا بلند کرتے ہوئے فرمایا کہ اس بارے میں میرا معاون و مددگار کون ہے کے جواب میں سب خاموش رہے مگر حضرت علیؓ نے تین تین مرتبہ یہی کہا کہ میں آپ کا دست و بازو رہوں گا۔ آخری مرتبہ آپ نے فرمایا تم میرے بھائی اور وارث ہو۔ اس وقت حضرت علیؓ کی عمر ۱۴ برس کی تھی۔

ہجرت کی شب جان نثاری کا ایک عدیم المثال کارنامہ | بارگاہ الٰہی سے ہجرت کا حکم ملنے پر چند نفوس قدسیہ کے علاوہ مکہ مسلمانوں سے خالی ہو گیا

مشرکین مکہ رسول اللہ کے دشمن ہوگئے ایک روز مشورہ کرکے وہ رات کے وقت کاشانۂ نبوی کی طرف چلے کہ کہیں صبح ہونے سے پہلے ذاتِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا سے رخصت کردیں۔

آفتابِ رسالت کا محافظ اللہ تعالیٰ تھا اس لئے وحی الٰہی نے حضرت کو مشرکین کے ناپاک ارادوں کی اطلاع دیدی اور فوری مدینہ طیبہ کو ہجرت کا حکم ہوا۔

سرورِ کائنات نے اس خیال سے کہ مشرکین کو شبہ نہ ہو حضرت علی مرتضیٰ کو اپنے بستر اطہر پر استراحت کا حکم دے کر حضرت ابوبکر صدیق کے ساتھ مدینہ منورہ روانہ ہوگئے۔ اس وقت حضرت علی کی عمر صرف بائیس سال کی تھی۔ اس نوجوانی کے عالم میں اپنی زندگی کو قربانی کے لئے پیش کرنا جاں نثاری کا عدیم المثال کارنامہ ہے۔ رات بھر کاشانۂ نبوت پر مشرکین کا محاصرہ قائم رہا اور اس خطرہ کی حالت میں یہ نوجوان نہایت سکون واطمینان کے ساتھ محوِ خواب رہا اور رات بھر مشرکین اس دھوکے میں رہے کہ سرورِ کائنات استراحت فرما ہیں۔ صبح ہونے سے پہلے اپنے ناپاک ارادہ کی تکمیل کے لئے جب اندر آئے تو یہ دیکھ کر متحیر ہوگئے کہ حضرت علی اپنے آقا پر سے قربان ہونے کے لئے سربکف سو رہے ہیں۔ مشرکین نے اپنی اس غفلت پر سخت نادم ہوکر حضرت علی کو چھوڑ دیا۔ اور اصل مقصود کی تلاش وجستجو میں روانہ ہوگئے۔

حضرت علی آنحضرت کے تشریف لے جانے کے بعد۔ وتین دن مکہ میں مقیم رہے۔ لوگوں کی جو امانتیں حضور نے واپس کر دینے کی ہدایت کی تھی

اس کی تعلیم سے قراغت پاکر تیسرے یا چوتھے دن اپنے وطن مکہ کو خیرباد کہہ کر عازم مدینہ ہوئے۔

رسول اللہ نے مدینہ منورہ میں انصار اور مہاجرین میں جب باہم بھائی چارہ کرایا تو حضرت علیؓ کو اپنا بھائی بنایا۔

حضرت علیؓ کے فضائل:۔ احادیث میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا علیؓ مجھ سے ہیں اور میں علیؓ سے ہوں" اور فرمایا کہ میں جس کا مولا ہوں علیؓ اس کے مولا ہیں۔ خیبر کی جنگ میں فتح خیبر کے لئے حضرت علیؓ کو سردار مقرر کر کے علم (جھنڈا) حضرت علیؓ کے ہاتھ میں دیا اور آپ کے ہاتھ پر خیبر فتح ہوا۔ حضورؐ نے فرمایا کہ میں علم کا شہر ہوں اور حضرت علیؓ اس کا دروازہ ہیں۔ جب خارجیوں نے اَنَا مَدِینَۃُ العِلمِ وَعَلِیٌّ بَابُھَا کی حدیث سنی تو دس اہل علم حضرت علیؓ کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ ہم سب آپ سے ایک ایک سوال کریں گے۔ آپ ہم میں سے ہر ایک کو سوال کا جواب مختلف طریقوں سے دیں تو واقعی آپ بابِ علم ہیں ورنہ ہٹیم آپ سے یہ سوال کیا کہ علم بہتر ہے یا مال۔ آپ نے اس سوال کا الگ الگ جواب دیا۔

(۱) علم بہتر ہے کہ وہ انبیا کی میراث ہے اور مال قارونؔ ہامان و فرعون کی میراث ہے

(۲) علم بہتر ہے اس لئے کہ تمہارا نگہبان ہوتا ہے اور مال کی نگہبانی تم کو کرنی پڑتی ہے

(۳) علم بہتر ہے اس لئے کہ علم کو لوگ دوست رکھتے ہیں اور مالدار کے دشمن ہوتے ہیں

(۴) علم بہتر ہے اس لئے کہ علم پڑھنے پڑھانے سے بڑھتا ہے اور مال خرچ کرنے سے کم ہوتا ہے

(۵) علم بہتر ہے اس لئے کہ اہل علم ہمیشہ کریم النفس ہوتا ہے اور مالدار اکثر بخیل ہوتا ہے

(۶) علم بہتر ہے اس لئے کہ مال کے لئے چور ڈاکو جیسی ہزاروں آفتیں ہیں علم ان سب سے بے خوف و محفوظ ہے۔

(۷) علم بہتر ہے اس لئے کہ مالداروں سے روز محشر حساب لیا جائیگا اور صاحب علم سے نہیں۔

(۸) علم بہتر ہے اس لئے کہ مال زیادہ رکھنے سے پرانا ہوتا ہے اور علم پرانا ہونے سے عالم ماہر ہوتا ہے۔

(۹) علم بہتر ہے اس لئے کہ کثرت مال سے فرعون وغیرہ نے دعویٰ خدائی کیا اور صاحب علم عالموں کے سردار حضور صلعم نے فرمایا ماعبدناک حق عبادتک اور آخر میں حضرت علیؓ نے فرمایا کہ اگر تم مجھ سے میری وفات تک یہی سوال کروگے تو ہر وقت اس کا نیا جواب دوں گا۔ اس پر تمام خارجی توبہ کر کے ایمان لے آئے۔

ایک مرتبہ حضرت علیؓ نے رسول اللہؐ سے پوچھا کہ یا رسول اللہ آپ کے نزدیک زیادہ محبوب میں ہوں یا فاطمہؓ اس پر سرکار عالم صلعم نے فرمایا کہ فاطمہؓ مجھے تم سے زیادہ محبوب ہے اور تم فاطمہؓ سے زیادہ عزیز ہو گو حضورؐ نے ہر ایک کے حق میں علیحدہ علیحدہ الفاظ فرمائے لیکن دونوں کے معنیٰ ایک ہی ہیں۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو جوامع الکلم بنایا تھا یہ آپ کا اعجاز ہے۔

حضرت فاطمہؓ سے نکاح

حضرت فاطمہؓ سے عقد کی درخواست سب سے پہلے حضرت ابوبکر صدیقؓ اور ان کے بعد حضرت عمرؓ نے کی تھی لیکن آنحضرت نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے بعد حضرت علیؓ نے خواہش کی تو آپ نے ان سے پوچھا کہ تمہارے پاس مہر ادا کرنے

کے لئے کچھ ہے حضرت علیؓ نے کہا میرے پاس ایک گھوڑا اور ایک تلوار اور زرہ کے سوا کچھ نہیں ہے آپ نے فرمایا کہ زرہ کو فروخت کردو۔ حضرت علیؓ نے اسے حضرت عثمان غنیؓ کو (۴۸۰) درہم میں بیچ دیا اور قیمت لاکر آنحضرت کے سامنے پیش کردی۔ آپ نے بلالؓ کو حکم دیا کہ بازار سے عطر اور خوشبو خرید لاؤ۔ وہ خرید لائے۔ سرکار نے خود نکاح پڑھایا۔ اور دونوں نورانی دولہا دلھن پر وضو کا پانی چھڑکا اور خیر و برکت کی دعا دی۔ حضرت عثمانؓ ذوالنورین نے خریدی ہوئی زرہ بطور سلامی یا نذر حضرت علیؓ کو واپس دیدی بہرحال ۲ھ میں شادی ہوئی۔

رخصتی

نکاح کے تقریباً ایک سال بعد باقاعدہ رخصتی ہوئی۔ اس وقت تک حضرت علیؓ حضور صلعم ہی کے ساتھ رہتے تھے۔ جب رخصتی کا وقت آیا تو آنحضرت صلعم نے ان سے فرمایا کہ ایک مکان کرایہ پر لو چنانچہ مکان لے لیا گیا۔ حضرت علیؓ اپنی ملکۂ جنت کو رخصت کراکے اس مکان میں لے آئے۔

جہیز

حضرت سیدہ زہرہؓ کو اپنے گھر سے جو جہیز ملا تھا اس کی تفصیل یہ ہے کہ ایک پلنگ معہ بستر، چادر، دو چکیاں اور ایک مشکیزہ۔ عجب اتفاق ہے کہ یہی چیزیں حضرت فاطمہؓ کی زندگی تک ان کے ساتھ رہیں اور حضرت علیؓ اس میں کچھ اضافہ نہ کرسکے۔

غزوات میں شرکت

غزوۂ بدر کے پہلے معرکہ میں آپ شریک ہوئے اور ایک سیاہ رنگ کا علم آپ کے ہاتھ میں تھا۔ غزوۂ احد میں بھی شریک تھے۔ جب مصعب بن عمیرؓ شہید ہوئے تو آپ نے آگے بڑھ کر علم سنبھالا اور خوب داد شجاعت دی۔ غزوۂ احد کے بعد بنو نضیر کو ان کی بدعہدی کے باعث جلاوطن کیا گیا۔ حضرت علیؓ

اس میں بھی پیش پیش تھے اور علم ان ہی کے ہاتھ میں تھا۔ غزوۂ خندق میں شریک ہو کر مشرکین کے سردار عمرو بن عبدود سے تنہا مقابلہ کرتے ہوئے ذوالفقار حیدری سے اس دشمن اسلام کو واصل جہنم کر دیا۔ صلح حدیبیہ پر حضرت علیؓ کو صلح نامہ لکھنے کا حکم ہوا۔ خیبر آپ ہی کے ہاتھ پر فتح ہوا چونکہ اس وقت حضرت علیؓ آشوبِ چشم میں مبتلا تھے لہذا حضورؐ نے اپنا لعاب دہن لگایا فوراً آنکھیں اچھی ہو گئیں۔ اور فتح و کامرانی کیساتھ واپس ہوئے۔ فتح مکہ میں بھی شریک رہے اور آخر میں حضرت علیؓ کو حکم ہوا کہ سعد بن عبادہ سے علم لیکر شہر مکہ میں داخل ہوں۔ پھر حضور نے حضرت علیؓ کو اپنے کندھوں پر چڑھا کر کعبہ کے اندر موجود بتوں کو گرانے کا حکم دیا۔ انھوں نے لوہے کی سلاخ سے حسب ارشاد نبوی بتوں کو پاش پاش کر ڈالا۔ جس سے کعبہ کی مکمل تطہیر ہو گئی اور پھر اس کے بعد خانہ کعبہ کو آپ نے زمزم سے دھو کر پاک وصاف کر دیا۔

ابوبکر صدیقؓ کی بیعت میں توقف کی وجہ

حضرت علیؓ نے چھ ماہ تک بیعت میں تاخیر کی۔ اس بارے میں صحیح روایت یہی ہے کہ حضرت فاطمہؓ کی سوگوار زندگی نے ان کو خانہ نشین بنا دیا تھا۔ اور تمام معاملات سے قطع تعلق کر کے وہ ان کی تسلی اور دلدہی اور قرآن شریف کے جمع کرنے میں مصروف تھے اور جب حضرت فاطمہؓ کا انتقال ہو گیا تو انھوں نے خود حضرت ابوبکر صدیقؓ سے ان کے فضل کا اعتراف کیا اور بیعت کر لی۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے وصال پر حضرت علیؓ کے الفاظ خطبہ یہ تھے کہ آج ہم

یہ ملت سے بہترین بزرگ شخصیت دنیا سے اٹھ گئی۔ ابو بکر صدیقؓ کی فضیلت کے لئے آپ کا یہی خطبہ بہت کافی ہے۔ آپ ہمیشہ بہترین فیصلہ کرتے تھے۔ ان فیصلوں کی تعلیم حضور انور صلعم نے خود آپ کو دی تھی اور آپ ہی علم نحو کے موجد ہیں۔ جنگ جمل و جنگ صفین بھی ہوئی لیکن آپ نے صلح سے کام لیا۔

وصال مبارک

واقعہ نہروان کے بعد چند خارجیوں نے حج کے موقع پر جمع ہو کر تین آدمیوں کے قتل کرنے کا فیصلہ کیا عبدالرحمٰن بن ملجم نے حضرت علیؓ کے قتل کا ذمہ لیا۔ نزال نے امیر معاویہؓ کا اور عبداللہ نے عمرو بن العاصؓ کے قتل کا بیڑا اٹھایا۔ اور تینوں اپنی اپنی مہم پر روانہ ہو گئے۔ غرض ۲۰ رمضان سنہ ۴۰ھ میں ان تینوں نے ایک ہی روز صبح کی نماز کے وقت تینوں بزرگوں پر حملہ کیا۔ امیر معاویہؓ اور عمرو بن العاصؓ اتفاقی طور پر بچ گئے۔ جناب علی مرتضیٰؓ صبح کی نماز کیلئے مسجد تشریف لائے اور نماز شروع کی سر سجدہ میں اور دل راز و نیاز الٰہی میں مصروف تھا اسی حالت میں ابن ملجم نے تلوار سے نہایت کاری وار کیا سر پر زخم آیا اور آپ سخت زخمی ہو گئے۔ زندگی کی امید نہ رہی اس لئے امام حسنؓ و امام حسینؓ کو بلا کر نہایت مفید نصائح فرمائے اس کے بعد مفید وصیتیں کیں بہر حال ۲۰ رمضان جمعہ کے روز یہ فضل وکمال اور رشد و ہدایت کا آفتاب ہمیشہ کیلئے غروب ہو گیا حضرت سیدنا امام حسنؓ نے خود اپنے ہاتھ سے تجہیز و تکفین کی نماز جنازہ پڑھائی اور جامع مسجد کوفہ کے صحن میں سپرد خاک کیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

منقبت

رتبہ ملا علیؑ کو ہے ربِّ قدیر سے
روشن ہوا ہے نام بھی اسمِ کبیر سے

سُن لو کہ جانشینِ پیمبرؐ علیؑ ہوئے
اعلان بھی ہوا ہے یہ خمِّ غدیر سے

کہتے ہیں یہ علومِ لُدُنّی بھی ناز سے
عالم بنا ہے گردشِ کلکِ دبیر سے

مولد یہ کہتا جاتا ہے بیشِ جہاں یہی
روشن ہوا ہے کعبہ بھی بدرِ منیر سے

مولا علیؑ کے لب پہ تھا مصحف رواں دواں
سیکھا انھوں نے علم خدائے قدیر سے

کہتا رہا مینِ خلد ہے ارضِ نجف سے بھی
گونجا ہے آج باغ یہ بانگِ صفیر سے

فرمایا مصطفےٰؐ نے ہے عثماںؓ یہ بار بار
قوت بڑھی ہے دین کی جنابِ امیرؓ سے

——— آصف سابع عثماںؔ

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ

اسم مبارک و لقب و کنیت و حلیہ شریف

اگر آپ خدا کے دوستوں کا نمونہ دیکھنا چاہتے ہوں تو آؤ میں آپ کو خدا کے دوستوں کا سردار دکھاتا ہوں، جن کا اسم مبارک علی (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) ہے۔

کام دہن و زیب زبان است نام او
آرام دل و راحت جاں است نام او

حضرت علیؓ کا نام مبارک منہ کا مقصود اور زبان کی زینت ہے
آپ کا نام مبارک دل کو آرام دینے والا اور جان کو راحت دینے والا ہے۔

آپ کا لقب امیر النحل، بیضۃ البلد، یعسوب الدین، حیدر کرار، اسد اللہ الغالب اور آپ کی کنیت ابوالحسن، ابوتراب ہے۔

آپ کا حلیہ شریف دکھانا چاہتا ہوں تاکہ آپ تصور جمائیں تو کیا عجب ہے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی متبرک صورت نظر آ جائے۔

آپ لانبے قد کے نہ تھے، آپ کی آنکھیں بڑی اور پتلیاں سیاہ تھیں۔ آپ کا چہرۂ مبارک نہایت خوبصورت گویا چودھویں رات کا پورا چاند تھا، آپ کے سر کے بال کم تھے مگر داڑھی کے بال کثرت سے تھے، آپ کی نازک گردن دیکھنے والوں کو بالکل چاندی کی ڈھلی ہوئی

صرف معلوم ہوتی تھی۔

مقام ولادت } جب آپ کی والدۂ محترمہ کو دردِ زہ شروع ہوئے تو حضرت ابو طالب انھیں بیت اللہ شریف کے اندر لے گئے وہاں نہایت سہولت سے زچگی ہوئی اس لحاظ سے آپ کا مقامِ ولادت اندرونِ کعبہ مکرمہ ہے۔

آپ کا یوم ولادت جمعہ، تاریخ دس ماہ رجب اور سنہ ۳۰ عام فیل ہے۔

حضرت علی کا اسلام لانا } عبداللہ بن عباس، انس بن مالک، زید بن ارقم، سلمان فارسی اور ایک جماعت صحابہ رضی اللہ عنہم اس پر متفق ہیں کہ بچوں میں حضرت علی رضی اللہ عنہ، اور عورتوں میں حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا سب سے پہلے مشرف بہ اسلام ہوئے۔

حضرت سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے خود ارشاد فرمایا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم دو شنبہ کو مبعوث ہوئے اور میں سہ شنبہ کے دن مشرف بہ اسلام ہوا۔ صرف ایک ہی شب درمیان ہے۔

مناقب و فضائل } حضرت سیدنا علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ وہ ہیں، جن کی محبت ایمان کی علامت ہے اور حضرت سے بغض کفر کی علامت ہے۔

حدیث شریف } ایک روز حضور صلی اللہ علیہ وسلم امام حسن اور امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا ہاتھ پکڑے اور فرمائے جو مجھ کو دوست رکھتا ہے، وہ ان دونوں کو دوست رکھے اور ان دونوں کے ماں اور باپ کو دوست رکھے تو کل قیامت کے روز

فردوسِ اعلیٰ میں میرے ساتھ رہے گا۔

حدیث شریف } ایک روز حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے کہ اتنے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ تشریف لائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی دونوں آنکھوں کے بیچ میں بوسہ دیا۔ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس وقت حاضر تھے۔ عرض کئے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا ان کو آپ دوست رکھتے ہیں۔ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہاں چچا، میں علی کو بہت دوست رکھتا ہوں۔ میں نہیں جانتا کہ مجھ سے زیادہ ان کو اور کوئی دوست رکھتا ہوگا۔ چچا، ہر پیغمبر کی اولاد کو اللہ تعالیٰ نے اس کی پشت میں رکھا ہے مگر میری اولاد علی (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کی پشت میں ہے۔

اس کے بعد آپ نے دُعا فرمائی۔ الٰہی دوست رکھیے اس کو جو علیؓ کو دوست رکھتا ہے اور دشمن ہو جائیے اس کا جو علیؓ کا دشمن ہے۔

ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں علی رضی اللہ عنہ کی محبت گناہوں کو اس طرح کھا جاتی ہے جس طرح آگ ایندھن کو۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ بازار گئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کئی خربوزے خریدے۔ جب ہم سب مل کر مکان پر واپس ہوئے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ ایک خربوزہ تراشے اور چکھے تو وہ کڑوا تھا۔ آپ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ بھائی اس کو پھینک دو۔ میں تم کو ایک حدیث سناتا ہوں۔

حدیث شریف : حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ

اے علیؓ تمہاری محبت کا عہد ہر ایک آدمی اور درخت سے لیا گیا ہے،
جس نے اس عہد کو قبول کیا اور تمہاری محبت کو دل میں جگہ دی، وہ
شیریں اور پاک ہوا اور جس نے تمہاری محبت کو قبول نہ کیا وہ خبیث
اور کڑوا ہوا۔

اس کے بعد حضرت سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا میرا خیال ہے کہ
یہ کڑوا خربوزہ اسی بیل کا ٹوٹا ہوا ہے جس میں میری محبت نہ تھی۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ہجرت کی رات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بستر مبارک پر آرام فرمانا

ہجرت سے ایک روز قبل حضور صلی اللہ علیہ وسلم
نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا اے علیؓ! آج رات مجھے مکہ
سے ہجرت کرنے کا حکم آگیا ہے۔ اے علیؓ خدائے تعالیٰ کا یہ بھی حکم ہے
کہ میرے بستر پر تم لیٹ جانا تاکہ کفار تم کو دیکھ کر سمجھیں کہ حضرت، محمد
(صلی اللہ علیہ وسلم) ابھی لیٹے ہوئے ہیں، جب تک میں دور نہ نکل جاؤں
تم میری چادر اوڑھے لیٹے رہنا۔

وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ ط وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ۝

(پ۳۔ ع۶۔ سورہ آل عمران)

مکر کیا انھوں نے اور مکر کیا اللہ تعالیٰ نے اور اللہ بہتر مکر کرنے والا ہے۔

حضرت رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نہایت خوشی سے اس تجویز کو منظور
فرمالیے، جب رات ہوئی اور خوب اندھیرا ہو گیا تو کفار مکہ تلواریں لے
کر چو طرف سے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مکان کو گھیر لیے اور طاق
پھرتے تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جس وقت گھر سے باہر نکلیں آپ کو
شہید کر دیا جائے۔

کفار آپس میں یہ باتیں بھی کہنے لگے کہ یہ شخص (یعنے حضور صلی اللہ علیہ وسلم) کیسی جھوٹی باتیں کرتا ہے۔ کہتا ہے کہ اے مکہ والو! اگر تم میری اطاعت کروگے اور مسلمان ہو جاؤگے تو تم دنیا میں عرب و عجم کے بادشاہ ہو جاؤگے اور آخرت میں عمدہ عمدہ باغ اور میوہ اور خوبصورت عورتیں ملیں گی۔

اگر اطاعت نہ کروگے تو آخرت میں بھڑکتی ہوئی آگ میں جلوگے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سب باتیں سُن کر فرمایا:

"نادانو! جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہ سب سچ ہے۔"

آدھی رات کے وقت دوسرا حکم آگیا کہ حضرت اب اٹھیئے یہ سونے کا وقت نہیں، حضرت نے فرمایا جبرئیل! چاروں طرف کفار جمع ہیں، میں کس طرح جا سکتا ہوں۔ جبرئیل (علیہ السلام) نے عرض کیا حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) سورۂ یٰسٓ ابتدا سے "فَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ٥" تک پڑھیئے۔ ان کافروں پر لعنت کی دیوار اُٹھ جائے گی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں آیاتِ شریفہ کی تلاوت فرما کر ایک مٹھی خاک پر دم کیا اور کافروں کی طرف پھینک دیا، وہ ایک مٹھی خاک ستر آدمیوں کے منھ، سر اور آنکھوں پر پڑی۔

مگر عجب طرفہ تماشہ یہ تھا کہ بجائے تکلیف ہونے کے سب کو نیند آگئی، سب کے سر سینوں پر تھے، سب سو رہے تھے، اللہ تعالیٰ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یوں صحیح و سلامت نکال لے گیا، یہ ہے:

وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ ط وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ٥

مکر کیا انھوں نے اور مکر کیا اللہ تعالیٰ نے اور اللہ بہتر مکر کرنے والا ہے۔

بہرحال خاک پڑتے ہی کافر بھی سوئے اور شیطان بھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خیر و عافیت سے چلے گئے۔

آنکھوں میں ایک تنکا یا تھوڑا سا کچرا اگر گر جائے تو سخت بے چینی اور تکلیف ہوتی ہے، یہاں پر کفارِ مکہ کی آنکھوں میں مٹھی بھر مٹی جھونکنے پر بھی سب کو آرام کی نیند آ گئی۔ کیا یہ نہیں ہے:

وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ ط وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ه

مسلمانو! ہم کو وہ سراپا رحمت پیغمبر ملا، جن کے غصہ بھرے ہاتھ سے دشمنوں پر خاک پڑتی ہے تو اس خاک سے ان کو راحت و آرام ملتا ہے۔

بھلا محبت بھرے مبارک ہاتھ مسلمانوں کی دعائے مغفرت کے لیے اٹھیں تو خیال کیجئے اس کا کیا اثر ہوگا۔

الغرض حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اطمینان سے تشریف لے گئے۔ اور حضرت سیدنا علی رضی اللہ عنہ، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی چادر اوڑھ کر آپ کے بستر مبارک پر لیٹ گئے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرئیل اور حضرت میکائیل علیہما السلام سے فرمایا ہم نے تم کو بھائی بھائی بنایا ہے، بتاؤ اب تم میں سے کون اپنی عمر دوسرے کو دینا چاہتا ہے۔ دونوں فرشتوں نے عرض کیا۔ آپ کا حکم ہوتا ہے تو ہم حاضر ہیں، ورنہ سب کو اپنی جان پیاری ہے کسی سے دوسرے کے لئے اپنی عمر دینا نہیں ہو سکتا۔

اللہ تعالیٰ کا حکم ہوا علی رضی اللہ عنہ کو دیکھو کہ اپنی جان اپنے بھائی (حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم) پر نثار کر کے ان کے بستر پر لیٹ گئے ہیں، تم

جاؤ اور ان کی حفاظت کرو۔

دونوں فرشتے وہاں پہنچے۔ ایک سرہانے اور دوسرا پائنتی کھڑے ہو کر رات بھر حضرت سیدنا علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حفاظت کرتے رہے اور یہ کہتے رہے کہ واہ واہ علیؓ تمہاری بھی کیا شان ہے۔ تمہارا ذکر اللہ تعالیٰ ملائکہ میں کر رہا ہے کہ دیکھو ہمارے بندے ایسے ہوتے ہیں۔

نعتِ شریف

آیا ہے کون سیدِ ابرارؐ کی طرح
جائے گا کون عرش پہ سرکارؐ کی طرح

خالق کے بعد خلق پہ ہے کس کا اختیار
ہوتا ہے کون احمدِ مختار کی طرح

سنتا ہے جب درود ہمارا خدائے پاک
پڑھتا ہے خود درود پرستار کی طرح

ہجرت رسولِ پاک نے حکمِ خدا سے کی
صدیق ساتھ ساتھ ہیں دلدار کی طرح

حیدر رسولِ پاک کے بستر پہ اے بشیر
ہجرت کی رات سوئے ہیں سرکار کی طرح

بشیر وارثی

حدیث شریف حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم ایک روز کچھ تقسیم فرمارہے تھے۔ بنی تمیم کا ایک شخص جس کا نام ذوالخویصرہ تھا کہا یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) انصاف سے بانٹئے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا افسوس اگر میں نے انصاف نہ کیا تو پھر کون انصاف کرے گا۔

عرض کیا گیا اگر حکم ہو تو اس کی گردن اُڑا دی جائے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ایک وقت ایسا آئے گا کہ اس کے ساتھ اس کے ایسے دوست جمع ہوجائیں گے کہ تم اپنی نماز اور روزے کو ان کے نماز اور روزے کے سامنے حقیر جانو گے۔ یہ لوگ قرآن تو پڑھیں گے، مگر قرآن ان کے حلق سے نیچے نہیں اُترے گا۔ وہ اسلام سے ایسے نکلے ہوئے ہوں گے جیسے تیر کمان سے نکل جاتا ہے۔ ان کا افسر ایک ایسا شخص ہوگا جس کا رنگ سیاہ اور اس کا ایک بازو عورتوں کی پستان کے مانند ہوگا اور اس پر چند بال بھی ہوں گے، جس طرح گھونس کے دم پر ہوتے ہیں اور وہ دنیا کے بہترین فرقہ سے مقابلہ کرے گا۔

خارجی فرقہ سے حضرت علی رضی اللہ عنہٗ کی جنگ سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہٗ کے زمانۂ مبارک میں یہ فرقہ پیدا ہوا اور آپ سے مخالفت شروع کیا بالآخر جب نوبت جنگ کی پہنچی تو سیدنا رضی اللہ عنہٗ حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہٗ کو بھیج کر بہت تفہیم کرائے، جب حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہٗ سے وہ فرقہ راضی نہ ہوا تو خود حضرت علی رضی اللہ عنہٗ ان کے پاس پہونچ کر فرمائے کہ کم از کم اتنا تو کرو کہ تم مجھ سے جنگ نہ کرو

میں بھی تم سے جنگ نہیں کروں گا، مگر ظالموں نے اس خوش اخلاقی کی کچھ بھی قدر نہ کی ورنہ ایک بادشاہ وقت کو اتنی نرمی کی کیا ضرورت تھی۔ الغرض ان لوگوں نے جنگ کی تیاری شروع کر دی اور یہ ارادہ کر لیے کہ سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ، جب کسی دوسری جنگ میں مصروف رہیں تو اس وقت کوفہ پر حملہ کر کے کوفہ لوٹ لیں، اب تو مجبوراً سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ، کو بھی فوجیں لے چلنا پڑا۔ اس پر بھی آپ نے دوبارہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ، کو سمجھانے کیلئے بھیجا۔ کچھ تو توبہ کئے۔ مابقی جنگ کے لئے آمادہ ہو گئے۔

آمادہ جنگ ہونے والوں کے لئے سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ فوجیں لئے ہوئے نہروان کی طرف بڑھے۔

راہ میں ایک عبادت خانہ تھا وہاں کے پجاری نے کہا۔

اے مسلمانوں کے امیر! ٹھیرو، لشکر کو آگے مت بڑھاؤ، اس وقت مسلمانوں کا ستارہ گرا ہوا ہے، جب یہ ستارہ عروج پر آئے اس وقت جنگ کرنا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ، فرمائے کہ تم کو علم آسمانی کا دعویٰ ہے، اچھا بتلاؤ فلاں ستارہ کے سیر کی کیا کیفیت ہے، اس پجاری نے کہا میں نے تو آج تک ایسا نام بھی نہیں سنا۔ اس کے بعد حضرت نے اور چند سوالات فرمائے، کسی کا بھی جواب نہ دے سکا۔ حضرت نے فرمایا کہ تم کو علم آسمانی کی پوری خبر نہیں ہے۔

اچھا زمین کی چیزوں کے متعلق پوچھتا ہوں بتلاؤ تمہارے قدم کے نیچے کیا ہے اس نے کہا نہیں معلوم، آپ نے فرمایا ایک برتن ہے۔

اس میں اس سکہ کی اتنی اشرفیاں ہیں۔ اس نے کہا آپ کو کیسے معلوم ہوا؟ آپ نے فرمایا اس جنگ میں جو کچھ ہونے والا ہے اس کی خبر حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم دے چکے ہیں۔

جس طرح اس تمہارے واقعہ کی خبر دیئے ہیں اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہ بھی فرما چکے ہیں کہ میرے لشکر کے صرف دس شخص شہید ہوں گے اور خارجیوں کے لشکر کے سب مارے جائیں گے صرف دس بچیں گے۔

اس بیچارے کے قدم کے نیچے کھودا گیا تو واقعی ایک برتن میں اسی سکہ کی اتنی ہی اشرفیاں نکلیں جتنے آپ فرمائے تھے وہ فوراً مسلمان ہوگیا۔

جندب بن عبداللہ کہتے ہیں کہ مجھے حضرت سیدنا علیؓ کے متعلق کبھی شک نہیں ہوا، میں ہمیشہ حضرت سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو حق پر سمجھتا رہا لیکن خارجیوں سے مقابلہ کے وقت مجھے شک ہونے لگا تھا کہ آپ اس معاملہ میں حق پر ہیں یا نہیں کیونکہ خارجیوں کی صورتیں نہایت مقدس تھیں اور وہ زاہد اور نیک لوگ معلوم ہوتے تھے۔ ایک روز ایک سوار آیا اور کہا کہ امیرالمومنین مخالفین نہروان سے آگے بڑھ گئے۔ حضرت سیدنا علی رضی اللہ عنہ فرمائے "کلا" ہرگز ایسا نہیں ہوسکتا۔

ابھی یہ باتیں ہورہی تھیں کہ دوسرا سوار دوڑتے ہوئے آیا اور کہا کہ مخالفین نہروان سے آگے بڑھ گئے۔ سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ فرمائے نہیں بڑھے۔ سوار نے کہا "واللہ" میں ان کو بڑھتے ہوئے دیکھ آیا ہوں۔ سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ فرمائے "واللہ" نہیں بڑھے

ان کے قتل کی جگہ تو وہی ہے اس سے آگے کیسے بڑھ جائیں گے۔

جندبؓ کہتے ہیں میں نے دل میں کہا اب مجھے موقع ہاتھ آیا ہے کہ تمہیں بتاؤں آیا سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنی رائے سے کہتے ہیں یا خدا اور رسول سے سنی ہوئی خبر ہے اور دل میں یہ عہد کیا کہ اگر مخالفین نہروان سے بڑھ گئے ہیں تو پہلا شخص میں ہوں گا جو سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جنگ کروں گا اور اگر نہیں بڑھے ہیں تو پہلا شخص میں ہی ہوں گا جو سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دشمنوں پر حملہ کروں گا جب ہم وہاں پہنچے تو ویسا ہی پایا جیسا کہ سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا۔ مخالفین کا ایک سپاہی بھی نہروان سے آگے نہیں بڑھا تھا

حضرت سیدنا علی رضی اللہ عنہ میرا شانہ ہلا کر فرماتے۔ جندبؓ! اب تو ہمارا حق پر ہونا تم کو معلوم ہوا۔

میں نے کہا بے شک امیر المؤمنین آپ حق پر ہیں۔

صبح ظفر از مشرقِ انوار برآمد
اصحاب غرض را شبِ سودا بسر آمد

فتح مندی کی صبح نورانی مشرق سے نکلی
حاجت مندوں کے لئے اندھیری رات آخر آئی۔

الغرض سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ کو فتح ہوئی اور سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ارشاد بھی پورا ہوا اور حضرت سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی طرف کے صرف دس شخص شہید ہوئے باقی سب سلامت رہے اور مخالفین کے سب مارے گئے صرف دس اشخاص نے بھاگ کر اپنی جان بچائی۔

حضرت سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا خدا کا شکر ہے یہ امید ہی

شخص ہے جس کا ذکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیشن گوئی میں اُوپر آ چکا ہے ا کو ڈھونڈو۔ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی ہے کہ اس جنگ میں وہ مارا جائے گا۔ بہت کچھ ڈھونڈا مگر وہ نہ ملا۔ آپ نے فرمایا خدا کی قسم میں جھوٹ نہیں کہتا' نہ مجھ سے جھوٹ کہا گیا ہے' اس جنگ میں اس کا مارا جانا ضروری ہے' پھر ڈھونڈو' دوبارہ ڈھونڈا گیا تو وہ چالیس مُردوں کے نیچے دبا ہوا ملا۔

سبھوں نے دیکھ لیا کہ ولی اللہ علی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے جو سُنا تھا وہ سب کچھ سچ ہوا۔

سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ' نے فرمایا کہ فتح کی خبر کوفہ میں کون پہنچائے گا۔ ابن ملجم نے کہا امیر المومنین میں پہنچاتا ہوں' حضرت نے فرمایا جاؤ تم اپنا کام کرو۔

فتح کی خوشی میں ہر ایک نے کچھ نہ کچھ تحفہ پیش کیا۔ ابن ملجم نے بھی ایک قیمتی تلوار پیش کی' سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ' اس سے منھ پھیر لئے اور اس کا تحفہ قبول نہ فرمائے۔ ابنِ ملجم نے تنہائی میں کہا' امیر المومنین' سب کے تحفے قبول فرمائے' میرا تحفہ کیوں قبول نہ ہوا۔ حالانکہ میں نے وہ تلوار پیش کی تھی جس کی عرب میں نظیر نہیں۔

حضرت سیدنا علی رضی اللہ عنہ' فرمائے' میں تجھ سے یہ تلوار کیسے لوں جب کہ اسی تلوار سے تو اپنا مقصد مجھ سے حاصل کرنے والا ہے

یہ سنتے ہی ابنِ ملجم زمین پر گر کر تڑپنے لگا اور عجز و انکساری سے عرض کیا یا امیر المومنین آپ میری نسبت ایسا خیال نہ فرمائیں' میں آپ کے عشق میں وطن اور گھر دار چھوڑ کر آپ کے قدموں میں پڑا ہوا ہوں۔

سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہونے والی بات ہے کیا کیا جائے۔

ابن ملجم نے کہا امیر المومنین آپ کے سامنے کھڑا ہوں میرے دونوں ہاتھ کاٹنے کا حکم دیجئے۔

حضرت نے فرمایا ابھی کوئی ایسی بات ہوئی ہی نہیں، میں کیسے قصاص کا حکم دوں مگر مخبر صادقؐ نے جو خبر دی ہے وہ سچ ہونے والی ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا کوفہ میں ورود اور خطبہ

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فتح اور نصرت کے ساتھ کوفہ میں داخل ہو کر بہت بلیغ خطبہ دیا۔ منبر کے سیدھے طرف حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ تھے، ان سے فرمایا بیٹا اس مہینے کے کتنے دن گذرے، شاہزادہ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ نے عرض کیا امیر المومنین ماہ رمضان المبارک کے تیرہ دن گذر چکے ہیں، بائیں طرف حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان سے بھی فرمایا بیٹا اس مہینے کے کتنے دن باقی ہیں۔

صاحبزادہ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ نے عرض کیا، امیر المومنین، رمضان المبارک کے سترہ دن باقی ہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے داڑھی مبارک پہ ہاتھ پھیر کر فرمایا "اس ماہ میں میری داڑھی کو میرے سر کے خون سے رنگین ہونا ہے" اس کے بعد آپ اس قدر روئے کہ داڑھی مبارک آنسوؤں سے تر ہو گئی، تمام مجلس بھی رونے لگی، پھر فرمایا لوگو تم سمجھتے ہوں گے کہ میں موت سے ڈرتا ہوں، نہیں نہیں میں تو ہمیشہ موت کا آرزومند رہا

ہوں ، اکثر شہادت کا انتظار رہتا ہے ۔

مرگ مارا زندگی دیگر است زہر مرگ از شہد شیریں خوشتر است	ہماری موت سے ایک دوسری زندگی شروع ہوتی ہے ۔ موت کا زہر شہد سے زیادہ شیریں اور بامزہ ہے ۔

(اس شعر میں شہدا کی حیات کی طرف اشارہ ہے)

مرگ ساز و مغز را صافی نہاد است تا رساند دوست را نزدیک دوست	موت سے چھلکہ نکل جاتا ہے ، صرف مغز ہی مغز باقی رہتا ہے اس لئے کہ موت دوست کو دوست سے ملا کر پہنچا دیتی ہے ۔

قیام کوفہ کے زمانے میں ایک رات حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے گھر میں افطار فرماتے ، ایک رات حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے گھر میں تین چار لقمے سے زائد تناول نہ فرماتے ۔

لوگ عرض کرتے ہیں کہ امیرالمومنین کچھ زیادہ کھائیے تو فرماتے کہ مجھے خدائے تعالیٰ سے ملنا ہے میں زیادہ کھانے کی حالت میں خدائے تعالیٰ سے ملنا نہیں چاہتا ۔

ایک روز حضرت علیہ رضی اللہ عنہ سے عرض کیا گیا امیرالمومنین اپنے ساتھ محافظ رکھیئے ، ابن ملجم تلوار لئے آپ کے پیچھے پھرا کرتا ہے ۔ یہ سن کر حضرت علی رضی اللہ عنہ فرمائے ، ہر آدمی کے ساتھ دو محافظ فرشتے ہر وقت موجود رہتے ہیں جو اس شخص کی حفاظت کرتے رہتے ہیں ، جب اس کی موت کا وقت آجاتا ہے تو وہ فرشتے ہٹ جاتے

ہیں۔ انسان کی زندگی کی ایک حد ہے، وہ اس کے لئے ایک مضبوط قلعہ ہے، وقت سے پہلے کوئی کسی کو مار نہیں سکتا۔

جب ۱۹ رمضان المبارک کی رات آئی، تمام رات آپ عبادت میں مشغول رہے بالکل نہیں سوئے، بار بار صحن میں آتے آسمان کو دیکھتے اور فرماتے۔ "صدق رسول اللہ"

واللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جھوٹ نہیں فرماتے ہیں پھر میرے قاتل کو میرے مارنے سے کونسی چیز روک رہی ہے۔

جب آپ کے مسجد جانے کا وقت قریب آیا تو آپ نے تازہ وضو کر کے باہر جانے کا ارادہ فرمایا۔ گھر میں جو قاز تھے وہ سامنے آئے اور آپ کا دامن مبارک پکڑنے لگے اور آپ کو چھوڑتے نہ تھے کہ آپ باہر تشریف لے جائیں، صاحبزادوں نے چاہا کہ ان کو علیحدہ کریں، آپ نے فرمایا اللہ کو مت روکو کہ یہ میری جدائی میں رو رہے ہیں۔

حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے عرض کیا بابا! آپ یہ کیا فرماتے ہیں، ہمارے دل ٹکڑے ہو رہے ہیں، حضرت نے فرمایا کہ میرا دل گواہی دے رہا ہے کہ میں اس مہینے میں شہید ہونے والا ہوں۔ پھر ایک ایک صاحبزادے اور صاحبزادیوں کو گلے لگا لگا کر رخصت کرنے لگے۔

در و دیوار سے الفراق الفراق کی صدا آ رہی تھی، سب کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور حضرت سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ فرما رہے تھے۔

رخت بربستم و دل برداشتیم ... اسباب باندھ رہا ہوں اور سب سے
صحبت دیرینہ را بگذاشتیم ... دل اٹھالیا ہوں، پرانے محبت کرنے والوں کو چھوڑ رہا ہوں، وقت آگیا ہے

کہ سارے غموں سے چھوٹ جاؤں، دنیا کی خوشی اور غمی پر لات ماردوں۔

وقت شد کز غصہ و غم وارہیم
برغم و شادی عالم پا نہیم
تا بکے بار دل دوناں کشیم
تا بکے خونابۂ ایں وآں چشیم

وقت آگیا ہے کہ سارے غموں سے چھوٹ جاؤں۔ دنیا کی خوشی اور غمی پر لات مار دوں۔ کب تک کمینوں کی دل دکھانے والی باتیں سنیں، کب تک ان کے اوران کے مصیبت ڈھانے والے حرکات کی برداشت کریں۔

صدر جنت بہر ما آراستہ
ما دریں زنداں بہ محنت کاستہ

جنت کے محل ہمارے لئے آراستہ ہو رہے ہیں، ہم اس دنیا کے قیدخانہ میں بڑی محنت سے زندگی بسر کئے ہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ، مسجد تشریف لے گئے، مسجد میں پہنچ کر اذاں دیئے، ابن ملجم دو ساتھیوں کے ساتھ قسطام کے گھر میں شراب پی کر مست پڑا تھا، قسطام نے اس کو جگایا اور کہا کہ اگر میرا وصال چاہتا ہے تو اس وقت کو غنیمت جان کہ اس وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ، مسجد میں اکیلے ہیں، پھر مسلمان جمع ہو جائیں گے، موقع ہاتھ سے جاتا رہے گا ابن ملجم زہرآلود تلوار لیا ہوا اٹھا اور مع ساتھیوں کے مسجد کے اندر آیا حضرت علی رضی اللہ عنہ، اذاں کے بعد مسجد میں تشریف لاکر نماز شروع کئے، پہلے سجدہ سے اٹھے تھے کہ ابن ملجم شقی نے تلوار چلائی، اتفاق سے تلوار سر مبارک میں اس جگہ لگی جہاں جنگ خندق میں زخم آیا تھا، ہڈی توڑتے ہوئے سر مبارک کے نیچے تک پہنچ گئی۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ، نے تلوار کا سخت اور جھٹک زخم کھاتے

ہی نعرہ مارا۔ "فُزْتُ بِرَبِّ الْكَعْبَة" خدا کی قسم میں اپنی مُراد کو پہنچا اور کامیاب ہوگیا۔

اللہ اللہ وہ کیسے لوگ تھے جو خُدا کے راستے میں جان دینا اپنی مراد کو پہنچنا سمجھتے تھے، تلوار کی چوٹ پیشانی پر کھاکر خوشی کا نعرہ مارتے تھے، مرجانے کو زندہ ہونا سمجھتے تھے، کیسے مبارک لوگ تھے۔

اور وہ کیسا نابکار تھا جو ایک عورت کی ناپاک جگہ کے لیے اپنے بزرگوں کو شہید کرکے خوش ہو رہا تھا، یہ اور وہ ایک ہی جگہ کے رہنے والے، ایک خُدا کا دوست تو دوسرا شیطان کا دوست۔

شہادت حضرت علی رضی اللہ عنہ جراح نے جب زخم دیکھا، اپنے سر سے عمامہ اٹھاکر پھینکا، کپڑے پھاڑنے لگا اور کہا۔ ہائے کیا کروں، تلوار زہر میں بجھائی گئی ہے، اس کا نہ کوئی علاج ہے نہ مرہم۔

سب میں واویلا تھا کہ ہائے ایسا مقتدا چلا، ہائے افسوس ایسا پیشوا چلا، ہائے ایسا عالم، ہائے ایسا حاکم عادل چلا، ہائے ایسا امیر، ہائے ایسا امام، ہائے ایسا شریعت کا مشیر، ہائے ایسا ملک کا انتظام کرنے والا چلا۔

صبح کا اجالا ہو رہا تھا۔ آپؓ نے فرمایا مجھ کو مشرق کی طرف پھیر دو۔ اس کے بعد فرمانے لگے۔ اے صبح صادق! تجھ کو قسم ہے اس خُدا کی جس کے حکم سے تو نکلتی ہے، کل قیامت میں گواہی دینا، جب سے کہ میں نے حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ پہلی نماز پڑھی ہے، آج تک کبھی تو نے مجھ کو سویا ہوا نہیں پایا۔ تیرے نکلنے کے پہلے میں ہوشیار ہوگیا ہوں۔

پھر سجدہ کئے اور فرمائے۔

"الٰہی کل قیامت میں جب کہ ہزار ہا پیغمبر حاضر ہوں گے، ملائکہ صدیق شہدا آپ کے عرشِ عظیم کو دیکھ رہے ہوں گے اس وقت آپ گواہی دینا کہ جب سے کہ میں نے آپ کے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لایا ہے، کبھی ان کا خلاف نہیں کیا۔"

لوگوں نے عرض کیا یا امیرالمومنین، آپ کے ساتھ یہ معاملہ کس نے کیا، آپ نے فرمایا ٹھیرو وہ ابھی ہے۔

ابن ملجم یہاں سے بھاگ کر اپنے چچازاد بھائی کے گھر گیا۔ ہتیار اتار رہا تھا کہ اس کے چچیرے بھائی نے پوچھا تو پریشان کیوں ہے، کیا تو نے حضرت سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو قتل کیا ہے؟ لا (نہیں) کہنا چاہتا تھا نعم (ہاں) زبان سے نکلا۔ ابن ملجم کا بھائی ابن ملجم کو گریبان پکڑ کر کھینچتے ہوئے مسجد میں لایا، آپ نے اس کو دیکھ کر فرمایا، ابن ملجم! میں نے تیرا کیا بگاڑا تھا جس بے وجہ تو نے میرے بچوں کو یتیم کر دیا، اس نے کہا کیا کروں امیرالمومنین جو ہونا تھا ہوا۔ حضرت نے فرمایا اس کو قید رکھو۔ لوگو! یہ ہمارا مہمان ہے، اس کے لئے نرم بچھونا بچھاؤ۔ اچھا مزیدار کھانا کھلاؤ۔ ٹھنڈا پانی پلاؤ۔

صاحبو! نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی یہ کیا تعمیل تھی کہ جان جاتی ہے جائے مگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی آن نہ جائے۔

زخم سے زیادہ خون بہنے سے ضعف ہو گیا، پیاس بہت ہونے لگی۔ شربت بنا کر حاضر کیا گیا۔ آپ نے فرمایا پہلے میرے قاتل مہمان کو شربت پلاؤ۔ میں بعد میں پیوں گا۔ جب وہ شربت ابن ملجم کے پاس لے گئے، اس نے کہا کہ مجھے معلوم ہے، میرے لئے اس میں زہر

ملایا گیا ہے، میں نہیں پیتا۔ حضرت سیدنا علی رضی اللہ عنہ یہ سن کر رو دیئے اور فرمائے کمبخت تو بڑا بدنصیب ہے، خدا کی قسم، اگر آج تو میرے کہنے سے یہ میرا شربت پی لیتا تو کل قیامت میں حوض کوثر پر میں نہیں پیتا، جب تک کہ تجھے پہلے نہ پلاتا، مگر میں کیا کروں تو میرے ساتھ رہنا پسند نہیں کرتا۔

مسلمانو! حضرت سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے اخلاق کو غور سے پڑھو کہ آپ دشمن کے ساتھ بھی کس طرح اخلاق کا برتاؤ فرما رہے ہیں۔

وفات ماہ رمضان المبارک کی ۲۱ تاریخ تھی، آپ کی حالت زیادہ نازک ہو گئی۔ غشی آئی تو آپ کی صاحبزادی ام کلثوم رضی اللہ عنہا رونے لگیں۔ صاحبزادی کی آواز سن کر آپ نے فرمایا۔ بیٹی خاموش رہو، اس وقت میں جو کچھ دیکھ رہا ہوں اگر تم دیکھو گی تو ہرگز رونے کا نام نہ لوگی۔

عرض کیا گیا حضور اس وقت آپ کیا دیکھ رہے ہیں۔ آپ نے فرمایا بہت بڑی جماعت فرشتوں کی ہے، ان کے ساتھ تمام نبیوں کا قافلہ ہے، سب سے آگے قافلہ سالار حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ مجھ سے فرماتے ہیں علی (رضی اللہ عنہ) خوش ہو جاؤ، اب تم بڑے چین و آرام میں بلائے جاتے ہو۔

اس کے بعد آپ نے کچھ وصیتیں فرمائیں۔ منجملہ ان کے ایک یہ بھی تھی کہ ہمارا قاتل ایک وار چلایا ہے، اس لئے اس پر بھی قصاص میں ایک ہی وار چلانا۔

اور کچھ مشک نکال کر دیئے اور فرمائے حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جنازہ مبارک کو اس مشک میں بسایا گیا تھا، تھوڑی

سی بچی ہوئی بطورِ تبرک میں نے آج کے لئے رکھ لی تھی' مجھے کفن دینے کے بعد میرے بدن پر مل دینا۔

پھر آپ نے فرمایا گھر والو! اب ہم جاتے ہیں۔ السلام علیکم اور حجرہ کا دروازہ بند کروائے۔ تھوڑی دیر کے بعد اندر سے لاالٰہ الااللہ محمد رسول اللہ کہنے کی آواز آئی۔

شاہزادے بے چین ہوکر دروازہ کھولے جب حجرہ میں آئے دیکھے کہ سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہٗ خدا کی رحمت میں تشریف لے گئے۔

آہ و فغاں کہ راحتِ دل و آرام جاں برفت شاہ زماں و قدوۂ خلق جہاں برفت	آہ افسوس کہ دل کی راحت' جان کا آرام چلا گیا کیا کہوں کہ شاہِ زماں اور تمام جہاں کے قطب چلے گئے۔
غم شد محیط مرکزِ عالم ز ہر طرف کاں مرکزِ محیط کرم از میاں برفت	ہر طرف تمام عالم کو غم نے گھیر لیا اس لئے جو سراپا کرم ہی کرم تھے' ہمارے پاس سے چلے گئے۔

غیب سے آواز آئی سب باہر چلے جاؤ۔ خدا کے دوست کو خدا کے پاس چھوڑ جاؤ۔

پھر آواز آئی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے گئے' ان کے داماد شہید ہوگئے' اب اس امت کی نگہبانی کون کرے گا۔

غیب ہی سے اس کا جواب ملا۔ جو ان کی خصلت پر ہوگا اور جو ان کی پیروی کرے گا۔

تھوڑی دیر بعد جب دروازہ کھولا گیا، دیکھے کہ آپ غسل کئے ہوئے اور کفن پہنائے ہوئے رکھے ہیں، نماز پڑھائی گئی دفن ہو گیا۔

تعزیت جوق در جوق لوگ آکر ملتے اور پوچھتے شاہزادو! آپ نے امیرالمومنین کو کیا کیا، امام المتقین کو کہاں چھوڑا، شاہِ ذوالفقار کہاں ہیں؟ شاہ دُلدُل (گھوڑے کا نام) سوار کہاں ہیں، ہمارا ویس اُجڑ گیا، ہمارا بادشاہ کہاں ہے۔

ہائے جس کا یہ عالی نسب کہ:

عَلِیٌّ مِنِّیْ وَاَنَا مِنْهُ عَلِیٌّ جس کی نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمائے علی مجھ سے ہیں، میں علی سے ہوں۔

ہائے جس کا یہ حسب:

اَنْتَ مِنِّیْ بِمَنْزِلَةِ هَارُوْنَ مِنْ مُوْسٰی جن کی نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمائے علی تمہارا میرے سے ایسا ہی تعلق ہے جیسا ہارونؑ کا موسیٰ علیہ السلام سے تھا۔

ہائے آج علم و حلم دفن ہو گیا۔ ہائے ایسا عبادت گذار چھپ گیا۔ ہائے کیا کیا باتیں یاد کریں، تواضع کو سوچیں، بہادری کا خیال کریں، آپ کیا دنیا اب ایسا زاہد اور تارکِ دنیا دکھا سکتی ہے۔

کرامتوں کو کوئی کہاں تک بیان کرے۔ درِ خیبر کا اکھیڑنا قیامت تک یاد رہے گا۔

ہائے یہ ساری خوبیاں زمین کے نیچے چھپ گئیں، اب ترسو گے علیؓ کی پیاری صورت نظر نہیں آئے گی۔

غرض حضرت حسن، حضرت حسین (رضی اللہ عنہما) کے اُترے ہوئے

اُداس چہروں کو دیکھو، نانا کا غم کیا کم تھا، ماں کی جُدائی کیا کم تھی، اب تو باپ کا سایہ بھی سر سے اُٹھ گیا۔ خدا کے سوا کوئی سہارا نہیں۔

نیکوں کے ساتھ برائی کا انجام	خدا کے دوستوں کا جہاں خون گرتا ہے عجب رنگ لاتا ہے۔ وہاں کے آدمی کیا زمین تک برباد کردی جاتی ہے۔

بنی اسرائیل کو پیغمبروں کے قتل کرنے کا کیا نتیجہ ملا۔ کوئی قوم اس سے بڑھ کر ذلیل نہیں۔

اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت نے کفارِ مکہ پر ایسا غضب ڈھایا کہ مکہ میں نام کو کوئی کافر نہ رہا۔

حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ، کی شہادت نے بنی امیہ کی سلطنت کا ستیاناس کردیا۔ دو ڈیڑھ برس کے اندر نہ یزید رہا نہ یزید کی قوم۔

دیدی کہ خونِ ناحق پروانہ شمع را
چنداں اماں نہ داد کہ شب را سحر کند

ساجد! دیکھئے کہ پروانہ کے خونِ ناحق نے شمع کے ساتھ کیا کیا
شمع کو اتنی مہلت نہ دی کہ رات گذار کر صبح کرسکے۔

ابن ملجم شقی قصاص میں مار دیا گیا۔ ہائے کہاں ہے قسطام سے
نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم — نہ اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے

دنیا یوں گئی۔ آخرت کا یہ حال کہ جو شخص کسی کافر کو ناحق مارے تو وہ جنت کی خوشبو نہیں سونگھے گا۔ اگرچہ کہ جنت کی خوشبو چالیس برس کی دوری کی راہ سے محسوس ہوتی ہے۔

کافروں کے قتل کا یہ عذاب ہے تو سردار اولیا حضرت علی رضی اللہ عنہ

کے شہید کرنے کا کیا عذاب ہوگا۔

افسوس اس بد نصیب قوم پر جن کی تلواریں دنیا کے متبرک خون میں رنگین ہوئیں' افسوس اس قومِ شقی پر جنھوں نے اصحابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو آستانۂ رحمت کے سامنے شہید کیا' ان بد نصیب قاتلوں کو جو عذاب نہ ہو وہ کم ہے۔ ●

خواجہ شوقؔ

منقبت

عطائے رسولؐ خواجۂ خواجگانؒ

کہوں کیا، تم پہ سب کچھ ہے عیاں اجمیر کے خواجہؒ
زبانِ حال ہیں اشکِ رواں اجمیر کے خواجہؒ

ہمارا سر تو ان قدموں کے قابل ہو نہیں سکتا
دکھا دو کم سے کم ان کے نشاں اجمیر کے خواجہؒ

نبیؐ کا نور ہے مشکل کشائی خون ہے تم میں
تمہی ہو خواجۂ کل خواجگاں اجمیر کے خواجہؒ

تمہارا سایۂ دامن سلامت ہے تو کیا غم ہے
زمانہ لاکھ ہو دامن کشاں اجمیر کے خواجہؒ

طفیلِ خواجۂ عثمانؒ نگاہے سوئے ما گاہے
عطائے سرورِ کون و مکاں اجمیر کے خواجہؒ

کرم کی آس جب تک سانس ہے تب تک نہ جائے گی
گدائے در ہوں جاؤں گا کہاں اجمیر کے خواجہؒ

ادائے شکر کے آنسو ہیں یہ رونا نہیں غم کا
غریبوں پر ہیں کتنے مہرباں اجمیر کے خواجہؒ

بنا دو اپنے قدموں کے اجالوں کو نظر میری
کہاں تک یہ حجابِ درمیاں اجمیر کے خواجہؒ

میرا دل بھی کبھی موجِ شمیمِ لطف سے مہکے
بہارِ گلشنِ روحانیاں اجمیر کے خواجہؒ

ہجومِ بیکسی میں ساتھ دے تابِ تواں کب تک
کرم اے چارہ سازِ بیکساں اجمیر کے خواجہؒ

ہماری حیثیت کیا شوقؔ ہم کیا در پہ خواجہؒ کے
جہاں صدیوں سے سر خم ہیں جہاں اجمیر کے خواجہؒ

حضرت غریب نوازؒ کی زندگی کا
ایک سرسری خاکہ

آپ ایک ہمہ گیر شخصیت کے حامل تھے۔ آپ میں بے پایاں قوت روحانی تھی۔ آپ کا فیض ساری دنیا میں جاری ہے اور آج بھی لوگ اس سرچشمۂ نور رشد و ہدایت سے ایسے ہی سیر ہوتے ہیں۔ جیسے اگلے لوگ ہوا کرتے تھے۔ زندگی میں بے حساب لوگوں نے رہبری و ہدایت پائی، اپنے دلوں میں تلاش حق کی امنگ پیدا کی اور آپ کی جاذب شخصیت سے برابر متاثر ہوتے رہے۔ لہذا آپ کے گرد جمع ہوتے رہے۔ خواص میں بالخصوص شاہان مملکت آپ کے آستانے پر اپنی پیشانی رگڑنا فخر سمجھتے تھے۔ چنانچہ سلطان شہاب الدین غوری، سلطان التمش آپ کے دربار میں خادموں کی طرح حاضری دیتے تھے۔ آج بھی مزار شریف میں دن رات ہزاروں کا مجمع رہتا ہے۔ ان میں غریب امیر سبھی ہوتے ہیں۔ شہنشاہ اکبر، جہانگیر اور شاہجہاں بھی حاجتمندوں کی طرح دربار میں آئے دست بستہ کھڑے رہے۔ نذر رونیاز پیش کئے اور آپ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے دنوں انتظار میں ٹھہرے رہے۔ بالآخر حضرت نے اپنی نظر کرم سے انھیں خوب نوازا۔ کئی اولیاء نے آپ کے سایہ میں تسکین و راحت کے سامان پائے۔ مشکل کشائی آپ کی نعمت تھی

جو بھی خلوصِ دل سے آیا وہ کبھی مایوس نہیں لوٹا۔

آپ کے مرید بے شمار ہیں جو اقطاعِ عالم میں پھیلے ہوئے اور آپ کی تعلیمات اور پیام کو دنیا کے گوشے گوشے میں پھیلانے میں مصروف ہیں۔

آپ بہت بڑے مصلح تھے۔ آپ نے اپنی بلند کردار اور قوتِ روحانی سے سماج کو سدھارا اور کئی مناسب سماجی تبدیلیاں لائیں۔ آپ کی کوشش یہی تھی کہ زمانے میں ایک صالح معاشرہ ابھرے جس کی بنیاد حق و صداقت اور عوامی فلاح و بہبود ہو۔ بھائی چارگی دوستی اور محبت پیدا ہو اور ایک عالمی برادری کی فضا پیدا ہو جائے جو کہ اسلام کی روح ہے۔ بے غرض خدمتِ خلق آپ کا شعارِ عظیم رہا۔ یہی وہ خصوصیات ہیں جن کی بنا پر آپ کو حیاتِ دوام نصیب ہوئی' خدمتِ خلق' ترکِ خواہشات اور خدا کی یاد میں محویت آپ کی زندگی کے تین پہلو تھے۔

حضرت رسولِ کریمؐ اور آپ کی زندگی میں ایک طرح کی مشابہت پائی جاتی ہے سرکارِ دو عالمؐ کی زندگی نہایت سادہ مگر بامقصد تھی۔ جس میں عمل کی فراوانی تھی۔ یہی حال حضرت غریب نوازؒ کی زندگی کا تھا۔ حضرت رسول اللہؐ کے حکم سے مدینہ تشریف لے گئے۔ حضرت غریب نوازؒ حضرت رسولؐ کے حکم سے اجمیر تشریف لائے سرکارِ دو عالمؐ کا مزار مدینے میں چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کے درمیان ہے۔ اور غریب نواز کا مزار بھی اجمیر میں چھوٹی پہاڑیوں سے گھرا ہوا ہے۔ شہر مدینہ میں پانی کی کمی ہے تو اجمیر میں پانی کی کمی ہے۔ مدینہ اور اجمیر دونوں مقامات کی گلیاں تنگ ہیں۔ سرکارِ دو عالمؐ کا رہائشی کمرہ ہی آپؐ کی آخری خواب گاہ بنا تو حضرت خواجہ اجمیریؒ کا رہائشی کمرہ بھی آپ کا آخری راحت کدہ بنا۔

آپ صاحبِ کشف و کرامات تھے۔ شہاب الدین غوری کا ہندستان

فتح کرنا آپ ہی کی کرامت کا نتیجہ تھا۔ آپ کے مرید کا ایک واقعہ ہے کہ وہاں کے حاکم نے اسے شہر چھوڑنے کا حکم دیا۔ مرید اپنا دکھڑا حضرت کو سنایا تو آپ نے پوچھا "حاکم کہاں رہتا ہے۔" تو مرید نے کہا۔ وہ آج کل شکار کے لئے گیا ہوا ہے۔" تو حضرت نے فرمایا۔ "تعجب ہے کہ وہ زندہ لوٹے گا کہ نہیں"۔ بعد میں خبر آئی کہ وہ راستے میں گھوڑے سے گر کر فوت ہو گیا۔

ایک دفعہ ایک معصوم کو پھانسی دی گئی۔ اس کی ماں نے گریہ وزاری کرتے ہوئے حضرت غریب نوازؒ سے عرض کیا۔ "میرا بیٹا معصوم ہے، میری مدد کیجئے۔" تو آپ چند صوفیوں کے ہمراہ اس کی ماں کو لے کر اس مقام پہ پہنچے اور چھڑی کے اشارے سے فرمایا "اگر تو معصوم ہے تو اللہ کے حکم سے زندہ ہو جا اور دار سے نیچے آجا۔" وہ زندہ ہو گیا اور حضرت کے قدموں پہ سر رکھا۔

آپ کے وصال کے بعد حضرت شیخ فرید شکر گنجؒ نے آپ کے مزار پر پہونچ کر سورۂ فاتحہ پڑھی اور سورۂ کہف کا ورد فرمایا۔ اتفاق سے ایک لفظ چھوٹ گیا۔ تو قبر سے حضرت شکر گنجؒ کو لقمہ ملا۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت کی درگاہ کی زیارت اگر کوئی سات دفعہ کرے تو ایک حج کا ثواب ملتا ہے۔ ایک دفعہ کوئی حضرت کے مزار کی جاروب کشی کرے تو دل صاف ہو جاتا ہے اور دل کی تاریکی روشنی میں بدل جاتی ہے۔ لوگ درگاہ میں چراغ جلا کر یہ سمجھتے ہیں کہ انھوں نے اپنے دل کو روشن کر لیا۔ وہاں پانی پلا کر سمجھتے ہیں کہ انھوں نے دل کی پیاس بجھائی۔ سر جھکا کر سمجھتے ہیں کہ وہ سرفراز ہو گئے۔

آپ کی زندگی کا ایک مقصد تھا اسی کی خاطر سفر و حضر اختیار کیا۔ مرشد کی خدمت میں رہ کر مصائب جھیلے اور بالآخر فتح و کامرانی سے ہم کنار ہوئے۔

ہندوستان میں آپ کے لئے سب سے بڑی اُلجھن زبان کی رہی اس پر قابو
انے کے لئے حضرت نے ایک نئی زبان کی طرح ڈالی جسے اُردو کہتے ہیں اسی لئے
ضرت غریب نوازؒ کو اردو زبان کے بانیوں میں شمار کرتے ہیں۔ اور اس کو پروان
چڑھانے میں بڑے ممد اور معاون ثابت ہوئے۔

حضرت کی مجلسِ سماع نے بھی مختلف الخیال اور عقیدے کے لوگوں کو یکجا کرنے
ں اکسیر کا کام کیا۔ اُن میں محبت اور بھائی چارگی کا جذبہ پیدا کیا اور ایک دوسرے
سمجھنے کے مواقع فراہم کئے۔

حضرت کا پیام ساری دنیا کے لئے انسانی ہمدردی، بھائی چارگی اور محبت کا پیام تھا
ب کا منشا یہ تھا کہ باہمی مفاہمت اور خیرسگالی اور "لے اور دے" کے اصول پر ایک
یا سماج ابھرے جس کا ایک اجلا کلچر ہو جو ہندوستان کے لئے جسدِ واحد کا کام کرے۔
ام کا منشا بھی یہی ہے۔ یہی بات ہندوستانیوں کے لئے ریڑھ کی ہڈی ثابت ہوئی۔ اس
یا اساس میں محبت، شکر، کشادہ دلی، مہمان نوازی، قناعت، باہمی اعتماد، سچائی، ایمان
ی، اور تقویٰ جیسی خوبیوں کے سوا کوئی اور چیز نہیں ملتی۔ غریب نوازؒ کا یہ تصور ہماری
ندگی کی قدروں کو پروان چڑھانے میں پوری طرح ممد و معاون ثابت ہو رہا ہے۔
ت کی رواداری، انسان دوستی، ہمارے ادب اور شاعری، مصوری، روایات،
ات اور رسم و رواج عقائد میں رگِ جاں کا کام دیتی ہے ؎

آدم، فخرِ عالم، فخرِ کل ؎ خواجۂ ما، دینِ ما، ایمانِ ما

سید خواجہ معین الدین
ایم اے ریٹائرڈ ہیڈ ماسٹر

رضا الجبار
(نوز شو)

لاتی ہوئی روشنی

(افسانہ)

ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے تمام افراد کی آنکھیں ٹی وی کی رنگ برنگی اور دلکش روشنی کی طرف مرکوز تھیں۔ ہالی ووڈ کی نامور، خوبصورت اور اداکاری کے بے پناہ جوہر رکھنے والی ایکٹریس گریس کیلی کی فنکارانہ زندگی کا خلاصہ دیکھ دیکھ کر سب لڑکیاں بے اختیار رو رہی تھیں۔ گریس کیلی سفر کے دوران کار کا بریک فیل ہو جانے کی وجہ سے ایک زبردست حادثے کا شکار ہوئی اور زخموں کی تاب نہ لاکر اس افق پر سے ہمیشہ کے لئے غائب ہو گئی جہاں پر وہ کئی سال قبل قوس و قزح بن کر رنگینیاں بکھیرتی ہوئی بجلی کی طرح چمکی اور بہار بن کر کئی ہزار نوجوان فلم بینوں کے دل چمن زاروں کو مہکا گئی تھی۔

ٹی وی کے سامنے بل کی تینوں قد آور لڑکیاں تاشی، آشی اور واشی ہچکیاں لے رہی تھیں اور بل ٹی وی کے پردے پر کبھی گریس کیلی کو اور کبھی اپنی بہنوں کی آنکھوں کو دیکھ دیکھ کر ان کے غم و اندوہ کا پتہ چلا رہا تھا۔

"ہالی ووڈ میں گریس کیلی صرف سات برس رہی۔ ان سات برسوں میں اس نے گیارہ فلموں میں کام کیا۔ گیارہ فلموں میں اداکاری کے جوہر بتاکر اپنی شخصیت کو اتنا بلند کر لیا اور اپنے تصور کو اتنا پرکیف بنا دیا بس اسی کا کمال تھا کہ

لگتا تھا جیسے وہ پریوں کے دیس سے آئی ہوئی کوئی شہزادی ہے۔ اس کی عمر کے چھبیس ویں سال میں ملک مناکو کے شہزادے ایمی نے اسے شادی کا پیغام دیا تھا جسے گریس نے قبول کر لیا تھا۔ دوسرے دن دنیا بھر کے اخباروں میں پہلے صفحوں پر جلی حرفوں میں لکھا تھا:

"پریوں کی شہزادی مناکو کی شہزادی بن گئی
تصورات کے خوبصورت جزیرے کی ملکہ اب ایک حقیقی ملک کی ملکہ!
الف لیلیٰ کی جدید ترین کہانی...... گریس کیلی....."

"ڈیڈی" تاشی نے ٹی وی سے آنکھیں ہٹا کر بل کو دیکھتے ہوئے کہا:
"اپنی ویڈیو لائبریری میں گریس کیلی کی صرف سات فلموں کے ٹیپ ہیں۔ باقی چار بھی ہمارے ہاں ہونے چاہئیں۔"

"کون سے چار نہیں ہیں؟" آشی نے بل کے بجائے پوچھا۔ بل نے خلاؤں میں دیکھتے ہوئے اپنا سر ہلایا جیسے یہ اعتراف ہے کہ آشی کا سوال اس کا سوال ہی ہے۔

"ڈیڈ کو ان چار فلموں کی فہرست دے دو" آشی نے اس بار اپنی طرف سے کہا۔ تاشی نے فوراً انگلی پر گننا شروع کر دیا۔

"ڈائیل ایم فار مرڈر۔ ایک، ہائی نون۔ دو، ٹرننگ پوائنٹ۔ تین، اور........"

"بس بس۔ اسے بعد میں بھی دیکھو پہلے" واشی نے آشی کو خاموش کرواتے ہوئے کہا۔ "گریس کے ہاتھ میں آسکر ہے اور اسے مبارکباد دینے کے لئے کون بڑھ رہا ہے۔ پہچانو۔ پہچانو۔ پہچانو۔" واشی اپنی آواز کو پیانو کے سروں کی طرح اٹھانے لگی۔

"مارلن برانڈو" بل نے جھٹ سے کہہ دیا۔

مارلن برانڈو اپنے دونوں ہاتھوں کو کھولے مبارکباد دینے کے لئے گریس کی طرف بڑھنے لگا۔ پھر شائقین کو پتہ چل گیا کہ مارلن کے ہونٹوں پر آدھا آسکر ہے اور گریس کے گال پر دوسرا آدھا آسکر ہے۔ مارلن نے آدھے کو آدھے سے جوڑ دینے کی فنکارانہ صلاحیت بتائی۔ جوڑنے کی آواز بھی آئی جیسے بہت سی کلیاں ایک ساتھ چٹکیں۔ تینوں لڑکیوں کی آنکھوں میں دبی دبی مسکراہٹ کے سائے اور ہونٹوں پر شرارے تھے۔

"کنٹری گرل میں گریس کیلی نے اکیڈمی ایوارڈ لیا تھا۔" ناشی نے دہرایا اور آشی کی طرف رُخ کر کے کہا:

"ہماری لائبریری میں کنٹری گرل بھی کہاں ہے؟"

"وہ تو میں کہنے ہی جا رہی تھی 'کنٹری گرل' چار۔" آشی نے جواب دیا اور اپنے ابتدائی جملے کو مکمل کر دیا۔

"ڈیڈ!" ناشی نے بل کو مخاطب کر کے کہا۔ "ہم گریس کیلی کی چار فلموں کے ٹیپ خرید کر ہی اس کی مرحومہ کو خراجِ عقیدت ادا کر سکتے ہیں۔"

"میں ناشی کی بات سے سو فیصدی متفق ہوں۔" آشی نے ہاں میں ہاں ملائی۔

"میں تو اس ویک اینڈ پر گریس کیلی کی پوری گیارہ فلمیں اپنے وی سی آر پر دیکھنا چاہوں گی۔" ناشی نے کہا۔

اسی لمحے اپنے بیڈروم سے صوفیہ تیزی سے ڈرائنگ ہال میں آ کر بل سے کہنے لگی۔

"وہ لوگ جن کا اپائنٹمنٹ ہے آ رہے ہیں۔ ہائی وے نمبر چار سے [illegible]

بھٹک گئے تھے۔ میں نے انھیں راستہ سمجھا دیا ہے۔ اب وہ دس پندرہ منٹ میں یہاں پہنچ جائیں گے۔ کیا تم تیار ہو ڈئیر؟"

"میں تیار ہوں۔ بالکل ریڈی لیکن تم؟" بل نے اپنی بیوی سے پوچھا

"پندرہ بیس منٹ تم ان کی خاطر تواضع کرتے رہو۔ میں تب تک تیار ہو جاؤں گی۔ ریفریجریٹر میں خاطر تواضع کا پورا سامان ہے۔ انگور کارس، سیب کارس، کوک، فرنچ فرائز، اور کرسٹی نومارٹینی کی پوری بوتل۔"

"اوہ ڈیڈ" ناشی بولی۔ "آپ سے ملنے والے ہمیشہ نامناسب موقعوں پر اور غلط وقت پر آتے ہیں۔ ابھی یہ پروگرام مزید آدھا گھنٹہ چلے گا۔"

"گریس کیلی کا حادثہ صرف پرسوں ہوا ہے بیٹی۔" صوفیہ نے ہنس کر کہا "لیکن گورنمنٹ کے ملٹی کلچر ڈپارٹمنٹ کے لوگوں کے ساتھ تمہارے ڈیڈ کا پروگرام پندرہ دن قبل طے ہوا تھا۔" پھر بل کی جانب رُخ کر کے صوفیہ نے دوبارہ پوچھا۔ "تمہارا انٹرویو لینے کے لئے آخر انھیں کس نے اکسایا؟"

"کسی نے نہیں۔" بل نے جواب دیا۔ "دراصل ناشی اور آشی کی شادیوں کی تصویریں جو اخباروں میں شائع ہوئیں وہ تشہیر کا باعث بنیں۔ اب کینیڈا کا دستور جو برطانیہ سے آیا ہے اس کے جشن کے سلسلے میں ملٹی کلچر کا ایک طویل ملا جلا پروگرام ٹی وی کے لیے ترتیب دیا جا رہا ہے۔ یہ اسی کی کڑی ہے۔ اخبار کے ذریعے سے ہی انھوں نے میرا پتہ نکالا اور میرے دفتر پر فون کیا۔"

"لیکن ہم گریس کیلی کے پروگرام کو ادھورا نہیں چھوڑیں گے مام۔" واشی نے دوبارہ کہا۔ "وہ لوگ آ رہے ہیں تو آئیں، باقی پروگرام ہمیں دیکھنا

ہے۔ یہ پروگرام دوبارہ نہیں ہوگا۔"

"ٹھیک ہے۔" صوفیہ نے انھیں بھگاتے ہوئے کہا "ماسٹر بیڈروم کے ٹی وی پر دیکھ لینا۔"

اور جب دروازے پر بیل بجی تو آشی نے دروازے کے سوراخ میں سے جھانک کر دیکھنے کے بعد اعلان کیا۔ "ایک کے ہاتھ میں ٹی وی کیمرہ ہے، دوسرے کے ہاتھ میں بریف کیس ہے اور تیسرا برابر دکھائی نہیں دے رہا ہے۔"

"تم تینوں بیڈروم میں جا سکتی ہو۔ دروازہ میں کھول دوں گا۔" بل نے کھڑے ہو کر کہا۔

"میں بھی جا رہی ہوں۔" صوفیہ بھی جانے لگی۔

دروازہ کھل گیا تو تینوں اندر آ گئے۔ اگلے آدمی نے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا "ہیلو، میں تھرڈیک ہوں۔ یہ میرے ساتھی ہاروے ڈیوس اور لین گرین۔"

"میں محمد ہوں۔" بل نے اپنا تعارف کروایا۔

"بل یا محمد؟" ہاروے نے پوچھا۔

"میرا پورا نام محمد بل علی ہے۔"

"بڑا دلچسپ نام ہے۔" لن نے تعریف کرتے ہوئے کہا۔

بل ہنسا اور بولا: "تعلیمی سرٹیفکٹ اور پاسپورٹ کے مطابق میرا نام محمد علی ہے۔ جب میں کینیڈا نیا نیا آیا تھا ان دنوں دنیا کے مشہور باکسر محمد علی کا خوب چرچا تھا۔ میں جب اپنا نام لوگوں کو محمد علی بتاتا تھا تو ان کو بڑا عجیب سا لگتا تھا جیسے یہ نام کسی اور کا نہیں ہو سکتا۔ اس لیے محمد اور علی کے درمیان میں نے بل کو بٹھایا۔ اب یہ حال ہے کہ لوگ محمد کو اور علی کو بھول گئے، صرف بل باقی رہ گیا۔" بل کے لہجے میں تاسف تھا جیسے اچانک اسے شیر کی کھال [illegible]

ہوئے بھیڑیئے کی کہانی یاد آگئی۔"

"گلوب اینڈ میل اخبار میں ہم نے آپ کی لڑکیوں کی شادی کی تصویریں دیکھی تھیں۔" لن نے کہا۔

"جی ہاں۔" بل نے سر جھکا کر کہا۔ "میری دو لڑکیوں کی شادیاں ایک ساتھ ہوئیں ناشی اور آشی، گلبرٹ اور الفریڈ کے ساتھ بیاہی گئیں۔ شادی کی تقریب میں پارلیمنٹ کے چند اراکین بھی مدعو تھے۔"

"ناشی اور آشی۔" ڈیک نے دہراتے ہوئے کہا۔ "ناموں کے انتخاب میں آپ کا جواب نہیں۔"

"نامیہ بڑی لڑکی ہے جسے ہم ناشی کہہ کر پکارتے ہیں اور آشی جو دوسری لڑکی ہے وہ دراصل آسیہ ہے۔ نامیہ نے اپنے کلاس میٹ گلبرٹ کے ساتھ شادی کی اور آشی نے اپنے آفس کے دوست الفریڈ سے شادی کی۔"

"گلبرٹ اور الفریڈ۔" ہاروے نے دہرایا اور پوچھا۔ کیا یہ نام بھی کچھ ایسے ہی ہیں۔"

"گلبرٹ اور الفریڈ ہی اصل نام ہیں۔" بل نے یقین دلایا۔

"جہاں تک مجھے یاد ہے میں نے اخبار میں تین لڑکوں اور تین لڑکیوں کی تصویریں دیکھی تھیں۔" لن نے یاد دلایا۔

"آپ نے ٹھیک دیکھا۔" بل نے جواب دیا۔ "میری تیسری لڑکی واصفہ بھی تصویر میں شامل تھی۔ لیکن واشی کی شادی ابھی طے نہیں ہوئی۔ تصویر میں جو لڑکا اس کے پاس کھڑا تھا وہ اس کا بوائے فرینڈ تھا۔"

"شادی کیا بوائے فرینڈ کے ساتھ نہیں ہوتی؟" آرتھر نے جھک کر بل کے کان میں سوال کیا۔ آرتھر کے کہنے کے انداز پر سب ہنسنے لگے۔ ہنستے ہوئے

بل نے کہا:

"عین ممکن تھا کہ ایمی کی شادی بھی ساتھ ہو جاتی مگر ایسا نہیں ہوا۔ پچھلے بوائے فرینڈ کے ساتھ اس کے تعلقات خراب ہو گئے تھے۔ اب اس نے نیا بوائے فرینڈ کر لیا ہے جو تصویر میں تھا۔ اس کا نام دانیال ہے۔ ابھی ان کے ذہنوں میں شادی کا کوئی خیال نہیں ہے۔ جب شادی کا خیال پکّا ہو جائے گا تو شادی طے ہو ہی جائے گی۔"

"ہاں پہلے خیال کا بیج ذہن کی نازک زمین کے اندر جا کر نمو پاتا ہے۔ اور باہر نکل کر پھل پھول دیتا ہے تو اسے ہم تصفیہ کہتے ہیں۔" بل کا انداز ایک فلاسفر کی طرح تھا۔ دوبارہ سب ہنسنے لگے۔

ناصر بیڈ روم سے ڈرائنگ روم میں آئی۔ آرتھر نے زور سے ہائے کہا۔ ناشی نے ہائے کا جواب ہائے سے دیا۔ ڈرنک لانے کے لئے ناشی سب کی فرمائشیں لینے لگی۔ بل نے کہا۔

"تینوں لڑکیاں زیادہ تر میرے ہاں ہی رہتی ہیں حالانکہ تینوں نے اپنے الگ الگ اپارٹمنٹ لے رکھے ہیں۔"

"اوگڈ۔" آرتھر نے کہا۔ "آپ کو ان کی کمپنی اور ان کو آپ کی کمپنی سے بڑی خوشی محسوس ہوتی ہو گی۔"

"جی ہاں، جی ہاں۔"

"بہت اچھی بات ہے۔" آرتھر نے کہا اور پوچھا۔ "آپ کینیڈا کب اور کیونکر آئے۔ یوں ہی پوچھ رہا ہوں۔ انٹرویو لینے کے پروگرام کے تحت نہیں۔"

"ستائیس برس پہلے کی بات ہے۔ میں نے میٹرک کا امتحان پاس کر لیا تھا، ملازمت تلاش کی لیکن نہیں ملی۔ میرے بابا محلے کی مسجد کے مؤذن

تھے۔ وہ دعائیں کرتے تھے کہ مجھے اچھی ملازمت مل جائے اور گھر کی آمدنی بڑھے۔"

"یقیناً ان کی دعا قبول ہو گئی۔"

"ہاں مگر۔ نوکری لندن میں ملی۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ لندن میں بھی خدا ہے۔" آرتھر نے دوبارہ مذاق کرنا چاہا۔

"ان دنوں انگلینڈ میں کام کرنے والوں کی بہت ضرورت تھی۔" ہل نے کہنا شروع کیا۔ "میرے ایک دوست نے یہ پیشکش کی کہ وہ میرے لئے بھی ایمگریشن حاصل کرے گا اور سفر کا خرچ بھی دے گا جسے میں بعد میں ادا کر دوں۔ میں نے ہاں کر دی اور اس کے چھ مہینوں بعد میں لندن میں ملازمت کر رہا تھا۔ میں نے اس کا قرض ادا کیا اور ہر ماہ اپنے بابا کو بھی کچھ پونڈ روانہ کرتا رہا جو اس ملک میں جا کر اچھی خاصی بڑی رقم بن جایا کرتی تھی۔"

"بہت خوب۔" آرتھر ڈیک نے دوبارہ لقمہ دیا۔ "آپ کے ڈیڈ نے آپ کی مزید ترقی کے لئے اور زیادہ دعائیں کیں، اس کا پتہ چل جاتا ہے کیونکہ آپ پہلے لندن میں تھے لیکن اب کینڈا میں ہیں۔"

"ہاں! میں نے لندن میں کمپیوٹر کا کورس کیا تھا۔ ان ہی دنوں کینڈا کے ہائی کمیشن سے یہ اطلاع شائع ہوئی تھی کہ کینڈا میں لوگوں کی ضرورت ہے۔ میں نے امیگریشن حاصل کیا اور تب سے یہاں ہوں۔ پہلے ملازمت کرتا تھا اب میں کمپیوٹر کی اپنی ہی کمپنی کھول لی ہے۔"

"قابلِ تعریف ہے۔" ڈیک نے کہا۔

"یقینی یقینی۔ اچھی مثال آپ نے قائم کی ہے۔ اپنی ترقی کے ساتھ ساتھ

ملک کی بہبودی میں بھی آپ کا حصہ ہے۔ یہ بات نوٹ کرنے کے قابل ہے۔"

"شکریہ" بل نے خوش ہو کر کہا۔

ناشی نے سب کو ڈرنک تقسیم کئے اور واپس چلی گئی۔

"اپنا ملک چھوڑنے سے پہلے کیا آپ کی شادی ہو چکی تھی بل؟" آرتھر نے دوسرا سوال پوچھا۔

"ہو گئی ہوتی لیکن نہیں ہوئی" بل کے لہجے میں اچانک سنجیدگی آ گئی۔

"جیسے ہی میں نے اسکول کا آخری امتحان پاس کر لیا میری ماں نے خواہش کی کہ میری شادی ہو جائے اور انھیں بہو ملے۔ میری شادی کی بات چلی بھی تھی۔ محلے کی دوسری مسجد کے موذن کی لڑکی کے ساتھ۔ اماں خوش ہو کر کہتی تھیں کہ لڑکی چوتھی کلاس پاس ہے۔ خط لکھ پڑھ سکتی ہے، گھر کا حساب رکھتی ہے اور پکوان کرتی ہے۔ میری منگنی بھی ہوئی تھی لیکن جب مجھے نوکری نہیں ملی تو وہ منگنی ٹوٹ گئی۔"

"آپ کو بہت افسوس ہوا ہوگا" لن نے کہا۔

"زیادہ نہیں ہوا" بل نے جواب دیا۔ "وہ تو میں محض ماں کے اصرار پر راضی ہوا تھا۔ اس کے بعد میرا لندن چلا جانا لوگوں کے لئے میری بہت بڑی قابلیت کا باعث بنا۔ ڈیڑھ سال کے بعد جب میں چھٹیوں میں والدین سے ملنے کے لئے آیا تو پتہ چلا کہ میری آمد سے قبل ہی کئی امیر خاندانوں کی اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکیوں کے پیام میرے لئے آئے ہیں۔ لوگوں نے مجھے اپنی لڑکیاں بتائیں ان سے گفتگو کروائی۔ سب کو دیکھ لینے کے بعد میں نے صفیہ کا انتخاب کیا۔"

"آپ کا مطلب ہے آپ کی بیوی ڈاکٹر صوفیہ؟" آرتھر نے پوچھا۔

"ہاں وہ صفیہ ہے۔" بل نے جواب دیا۔

"آپ بڑے خوش قسمت ہیں۔" ہاروے نے کہا۔

"جی ہاں۔" بل بولا: "میری صحت کا خیال رکھنے کے لئے گھر میں ہی ڈاکٹر ہے۔ اس ملک میں آنے کا خیال صفیہ کا تھا۔ میں نے صفیہ کے خیالی خاکے میں حقیقت کے رنگ بھرے۔ یہی نہیں، بلکہ جب بھی میں اپنی ملازمت سے لے آف ہوتا رہا صفیہ کے کہنے پر اس کے لئے اچھا ڈرائیور، اچھا باورچی اور اکثر گھر پر بچوں کی نگرانی و نگہداشت کا کام انجام دے کر صفیہ کو سہولتیں پہنچاتا رہا۔" کہتے کہتے بل خاموش ہو گیا۔ دفعتاً زور سے دروازے پر بیل بجی۔

بل چونکا اور بولا: "وہ لوگ آ گئے ہوں گے۔"

ماسٹر بیڈروم سے صفیہ اور تینوں لڑکیاں بھی تیزی سے آئیں اور مہمانوں کو ہائے ہائے کہتی ہوئی دروازے کی طرف جانے لگیں۔ صفیہ دروازے کی طرف نہ جا کر مہمانوں کے ساتھ بیٹھ گئی اور بولی:

"ہمارے داماد ہوں گے۔ دونوں ساتھ نہیں تو دونوں میں سے ایک ضرور ہوگا۔ کیا آپ لوگ انٹرویو میں مصروف ہیں؟"

"نہیں نہیں۔ چند منٹوں میں شروع کر دیں گے۔ ابھی تو یوں ہی گپ شپ ہو رہی ہے۔" ڈیک نے کہا۔

"آپ لوگوں کے لئے کچھ اور لے آؤں کیا؟" صفیہ نے پوچھا۔

"نہیں۔" ہاروے اور لن نے ایک ساتھ کہا۔ ڈیک نے بھی انکار میں سر ہلایا۔

صوفے پر ٹیک لگاتے ہوئے صفیہ بولی۔ "کریس کیلی کا حادثہ بڑا غضبناک رہا۔ گاڑی کا بریک فیل ہو جانا اس وقت جب کہ گاڑی ڈھلوان راستے پر تھی اور دونوں طرف بڑی بڑی کھائیاں تھیں، بڑی ہیبتناک

بات ہے۔ سوچنے پر ہی دہشت طاری ہو جاتی ہے۔"

"بہت غمگین کر دینے والا واقعہ ہے۔" تینوں نے حامی بھری۔

"ہم وہی واقعات ٹی وی پر دیکھ رہے تھے۔" صفیہ نے کہا۔

باہر کے دروازے کی جانب سے تینوں لڑکیوں کے بے اختیار ہنسنے کی آوازیں آنے لگیں۔ بل اور صفیہ کی نگاہیں اسی جانب تھیں لیکن وہ نظر نہیں آرہی تھیں۔ ہنسی کی آواز پر توجہ نہ دیتے ہوئے آرتھر ڈیک بولا:

"بہتر یہ ہے کہ اب ہم انٹرویو شروع کر دیں۔"

پھر وجگر اور تیز روشنی پھیلانے والا آلہ لے کر بل کھڑی ہو گئی۔ ہاروے نے اپنے بیگ سے ریکارڈ کرنے والا آلہ نکالا اور مائیک فٹ کرنے لگا:

تینوں لڑکیوں کی ہنسی جاری تھی۔ وہ ہنسی سے دوہری ہوتی ہوئیں اندر آئیں۔ واشی ہنستی ہوئی بولی:

"ناشی نے گلبرٹ سمجھ کر دروازہ کھلتے ہی ہائے کہا اور آشی نے بھی الفریڈ کو مخاطب کر کے ہائے کہا۔" پھر وہ ہنستے ہنستے فرش پر گر گئی۔

"کون تھا؟"

"نہ گلبرٹ اور نہ الفریڈ۔ دروازے پر چار آدمی تھے ان کی بڑی بڑی گھنی داڑھیاں تھیں۔ جنھیں دیکھ کر ہم تو چونک ہی گئے۔" ناشی نے فرش پر سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"چار آدمی! کاہے کے لئے آئے تھے؟" صفیہ نے تعجب کا اظہار کیا پھر بل کی طرف رخ کر کے پوچھا: "کیا دوسروں کو بھی وقت دیا تھا؟ کیا لوگوں کو اپائنٹمنٹ دیتے وقت اپنی ڈائری نہ دیکھنے کی تمہاری پرانی عادت

لوٹ کر آ رہی ہے ؟"

"میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے دوسروں کو کوئی وقت نہیں دیا۔"

"ہاں ڈیڈ نے نہیں دیا۔" کاشی نے اپنے ڈیڈی کی تصدیق کرتے ہوئے کہا۔ "ان لوگوں نے بھی اقرار کیا تھا۔ اس کے باوجود وہ ڈیڈ سے ملنا چاہتے تھے میں نے انہیں بتا دیا کہ ہمارے ڈیڈ بہت مصروف رہتے ہیں اور وہ کسی سے وقت طے کئے بغیر نہیں ملتے۔"

لن نے روشنی کا آلہ اٹھا کر آن کر دیا۔ بل پر تیز روشنی پڑ رہی تھی۔

"بڑے جاہل لوگ معلوم ہوتے ہیں جو فون کئے بغیر ٹپک سے گئے۔" صفیہ نے بیزاری سے کہا۔

"کچھ بتایا نہیں کیا کہ کہاں سے آئے اور کیا کہنا چاہتے ہیں۔" بچیوں کی طرف دیکھتے ہوئے بل نے پوچھا۔

"ہاں بتایا۔" ناشی نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔ "واشی نے جب اپوائنٹمنٹ کی بات کی تو ان میں سے ایک کالی داڑھی والے آدمی نے کہا ہم تو پانچ اوقات کی یاد دلانے آئے ہیں جو اللہ کے ساتھ طے ہو چکے ہیں۔"

بل کی آنکھوں میں ایک چمک سی آئی پھر آنکھیں ماند ہو گئیں۔

"کوئی خطرے کی بات تو نہیں۔" آرتھر نے سوال کیا اور بل کی طرف دیکھا جو مائیک لے کر تیار تھا۔

"مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے۔" بل نے آہستہ آہستہ کہا۔ "کہ میرے باپ کی روح مجھے تلاش کرتی ہوئی ان لوگوں کے ساتھ دروازے تک چلی آئی تھی مگر افسوس وہ مجھ سے نہ مل سکے۔"

"اللہ کے ساتھ اوقات کا طے ہو جانا، یہ کیا بات ہوئی؟" آرتھر نے فکر سے پوچھا۔

واشی صراحت کرنے لگی۔ "ہمارے پڑوس میں ایک مسلم چرچ کھلی ہے یہ لوگ وہاں کے پریسٹ ہیں۔" آشی بولی۔ "واشی نے ان سے کہا کہ ہمارے ڈیڑھ سال میں دو مرتبہ بڑی پابندی سے مسلم کرسمس کے موقعہ پر عبادت کرنے کے لئے جاتے ہیں اور بڑی فراخدلی سے ان موقعوں پر چیریٹی بھی کرتے ہیں۔"

"وہ لوگ ابھی تک ٹھہرے ہوئے تو نہیں ہیں؟" لین کی ڈالی ہوئی روشنی میں بل کے چہرے کا تردد بڑی آسانی سے نظر آ رہا تھا۔

"نہیں وہ لوگ چلے گئے۔"

"معاف کرنا ہم بے کار باتیں کر رہے ہیں،" ڈاکٹر صوفیہ نے افسوس کے لہجے میں آرتھر کو کہا۔ "آپ جس کام سے آئے ہیں وہ تو رہ ہی گیا اور بے کار باتیں ریکارڈ ہوتی جا رہی ہیں۔"

"کوئی بات نہیں۔" آرتھر نے خوش اخلاقی کا مظاہرہ کیا۔ "ٹی وی پر بتانے سے پہلے ہم لوگ اسے ایڈٹ کر دیں گے۔" پھر وہ بل کو مخاطب کر کے بولا۔ "میں سوال کر رہا ہوں۔"

"میں جواب کے لئے تیار ہوں۔"

"اپنے ملک کے ایک کلچر سے اس ملک کے دوسرے کلچر میں آنے کے بعد کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ آپ نے کیا پایا اور کیا کھویا؟"

"ہاں میں بتا سکتا ہوں۔ یہاں کی فضا محبوس ہے۔ کھڑکیوں اور ... شیشوں کی وجہ سے میری سننے کی حس اسی قدر

پامال ہو گئی ہے کہ مجھے باہر سے آنے والی میرے بابا کی آواز نہیں سن پا رہا ہوں میں ان کے بلانے پر نہیں جاتا ہوں۔ ہاں میرے گھر میں رکھے ہوئے ٹی وی میں ستائیس کھڑکیاں ہیں جو باہر کی دنیا میں کھلتی ہیں لیکن ہر کھڑکی کے سرے پہ اژدھا ہے جو ہمیشہ اندر کی طرف سانس لیتا ہے اور اس اپنے حلق سے جو کچھ میں لے کر آیا تھا وہ آہستہ آہستہ ڈکارتا جا رہا ہے۔ اب میرے پاس کچھ باقی نہیں بچا۔ ذرا سی لائی ہوئی روشنی بھی باقی نہیں رہی۔"

"بل آپ کو پسینہ کیوں آرہا ہے۔" آرتھر نے تردد سے کہا۔ "آپ کے چہرے کا رنگ کیوں بدل رہا ہے؟ کیا سب کچھ ٹھیک ہے؟"

ڈاکٹر صوفیہ کھڑی ہو گئیں اور کہا۔" یہ صحت مند ہوتے ہیں تو میرے شوہر ہوتے ہیں اور صحت مند نہیں رہتے ہیں تو میرے مریض۔" اور بل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: "انھیں روشنی کی الرجی ہے۔ یہ تیز روشنی زیادہ دیر تک برداشت نہیں کر سکتے۔"

"مجھے سوال کا جواب دینے دو۔ صرف اندھیروں کا احساس ہو رہا ہے۔ کوئی الرجی نہیں ہے۔"

"روشنی میں اندھیرے کا احساس ہی روشنی کی الرجی ہے۔" پھر وہ آرتھر کو کہنے لگی۔ "اس تیز روشنی کا انعکاس اگر آنکھوں کے ذریعہ سے ان کے دماغ کو مل جائے تو یہ اپنا دماغی توازن کھو بیٹھیں گے۔ اس کا کوئی علاج نہیں ہے، ریسرچ چل رہی ہے۔"

بل نے گھبرا کر روشنی کو آف کر دیا۔ اسے ڈر ہوا کہ اگر بل کو کچھ ہو گیا تو صوفیہ اس پر ہرجانے کا دعویٰ کر دے گی۔

"مجھے افسوس ہے۔" آرتھر نے ملائمت سے کہا۔

"بل کو دوا اور آدھے گھنٹے کے آرام کی ضرورت ہے۔ اگر آپ بُرا نہ مانیں تو میں ان کی طرف سے آپ کے سوالوں کے جواب دے دوں گی۔"

"کوئی حرج نہیں۔ مجھے منظور ہے۔" آرتھر نے جواب دیا۔

"بل۔" صفیہ نے بل کی طرف رُخ کر کے کہا۔ "بیڈ روم کے دواؤں کی الماری میں تیسرے خانے میں پچھلی جانب جو اودی شیشی ہے اس میں سے ایک کیپسول آدھی پیالی ٹھنڈے دودھ کے ساتھ اور آدھے گھنٹے کا آرام تمہیں نارمل بنا دے گا۔"

"میں اچھا ہوں۔" بل نے جواب دیا۔

"پلیز" صفیہ نے کہا اور اپنے ہونٹوں کو یوں بنایا جیسے اس نے ابھی ابھی ڈرائنگ روم سے ملحقہ راہداری میں لٹکے ہوئے پنجرے کے سامنے کھڑے ہو کر "مٹھو بیٹے پپی دو" کہا ہے اور بل کو اپنے ذہن کی زیریں لہروں سے پتہ چل گیا کہ یہ صفیہ کی آخری وارننگ ہے۔ اگر بل نے صفیہ کی بات نہیں مانی تو پھر کئی ہفتوں تک گھر میں قیامت برپا ہوتی رہے گی۔ اس لئے قیامت کی گھڑیوں کو ٹالنے کے لئے بل آہستہ سے اٹھا اور خراماں خراماں بیڈ روم کی طرف چلا گیا اور صفیہ کی بتائی ہوئی کیپسول دودھ سے لینے کے بعد جب وہ کھڑکی کے شیشے پر اپنا سر ٹکا کر خیالات میں گم ہو گیا، اس کے والد کی اذان کی آواز میں کتنی جاذبیت تھی۔ جب تک وہ ان کے قریب رہا ان کی آواز سنتا رہا اور ان کے پیچھے پیچھے جاتا رہا۔ ان کے گزر جانے کے بعد جب بھی اسے کہیں سے اذان سنائی دی اس کے بابا کا تصور بھی اُبھرا اور اپنے پیچھے بلاتا رہا۔ لیکن اب کئی سالوں سے ....

خیالات کی بھول بھلیوں سے جب وہ باہر نکلا تو ٹی وی پر ملٹی کلچر

والوں کا پروگرام ہو رہا تھا۔ آر تھر ڈیک کے روبرو بیٹھ کر صفیہ کہہ رہی تھی

"... ہمارے پاس تین کاریں ہیں۔ دو ٹیلیفون، تین ٹی وی، ریڈیو، ویڈیو، ٹیپ، پروجیکٹر، کپڑے دھونے کی مشین، کپڑے سکھانے کی مشین، الکٹرانک کی چیزیں۔ صحت عامہ کے شعبوں میں اتنے جدید ترین آلات، اتنے زیادہ ریسرچ کے کام اور اتنی زیادہ تحقیقات ہوتی چلی جا رہی ہیں کہ زندگی میں کام کرنے کا بڑا جوش و خروش آجاتا ہے۔ ہم تو بڑے ہی مطمئن ہیں۔ ہم نے خوب پایا۔ کھویا کچھ بھی نہیں۔ ہمارے بچے تو اب واپس جانے کا نام بھی لینا پسند نہیں کرتے"

اچانک بل کو محسوس ہوا کہ بیک گراؤنڈ سے ایک آواز آرہی ہے۔

بہت دھیمے اور یہ اس کی آواز ہے۔

"ہر کھڑکی کے سرے پر ایک اژدہا ہے جو ہمیشہ اندر کی طرف سانس لیتا ہے اور اپنے ملک سے جو کچھ میں لے کر آیا تھا وہ آہستہ آہستہ ڈکارتا جا رہا ہے۔ اب میرے پاس کچھ نہیں بچا۔ ذرا سی لائی ہوئی روشنی بھی باقی نہیں رہی"

بل کو بڑا غصہ آیا۔ وہ پیر پٹخ کر بولا: "ارے بڑے بکواس ہیں یہ لوگ۔ دیکھو نا ایڈٹ بھی برابر کرنا نہیں آتا۔ بیک گراؤنڈ میں بہت سی بے کار باتیں رہ گئیں۔ انھوں نے برابر پرکھا کیوں نہیں"

صفیہ نے لمحہ بھر کے لئے اپنے شوہر کی شکل کو دیکھا اور جواب دینے کی بجائے ان کے غصہ کا نفسیاتی تجزیہ کرنے میں مشغول ہو گئی۔ ●

——————(خاص برائے ذوقِ نظر حیدرآباد)

حضرت شیخ احمد شطاری کامل

غزل

یار کی مرضی کے تابع یار کا دم بھر کے دیکھ
عرضِ مطلب کر کے دیکھا ترکِ مطلب کر کے دیکھ

بے ارادہ مرنے والے با ارادہ مر کے دیکھ
سب تماشے کر چکا یہ بھی تماشہ کر کے دیکھ

موت خود بن جائے گی تیرے لیے اک زندگی
زندگی پر مرنے والے زندگی میں مر کے دیکھ

یار تیرا ہے تو پھر تیری ہے ساری کائنات
سب کو اپنا کرنے والے اس کو اپنا کر کے دیکھ

ترکِ دنیا ترکِ عقبیٰ ترکِ مولا ترکِ ترک
یعنی یوں بے آرزو جینے کی عادت کر کے دیکھ

حسن کی کافر ادائی، عشق کی وارفتگی
دیکھنی ہو تو کسی سے ربط پیدا کر کے دیکھ

چھوڑ بھی دے مجھکو میرے حال پر اے چارہ گر
عقل کے دشمن خدا پر بھی بھروسہ کر کے دیکھ

ہر مصیبت پیش خیمہ ہے ترے آرام کا
صبر سے بھی کام لے کچھ دن مصیبت بھر کے دیکھ

آ گیا کامل دمِ آخر وہ جانِ انتظار!
مرنے والے جینے سے مر دیکھ اب جی بھر کے دیکھ

جدید اُردو نظم

آغاز، سمت و رفتار

از:- ڈاکٹر مجید بیدار ایم۔اے ایم فل پی ایچ ڈی
شعبۂ اردو۔ مولانا آزاد کالج۔ اورنگ آباد

انسان کی سوچ اور فکر کے بہاؤ اور تغیر پذیر زندگی کے حالات و واقعات کو شاعری میں ذریعۂ اظہار بننے کے لئے دورِ حاضر کے شعراء نظم کے طرز کو اپنا کر تمام تر خیالات کی نمایندگی کر رہے ہیں۔ دورِ قدیم میں صنفِ مثنوی کے ذریعہ شعراء اپنے احساسات اور خیالات کو پیش کرنے کی بنیاد رکھتے تھے۔ لیکن دورِ حاضر نے شعراء کو ایک ایسی قیمتی صنف سے مالا مال کر دیا ہے جس میں خیال کو پوری آزادی کے ساتھ پیش کرنے کی سہولت حاصل ہے۔ اسی سہولت نے نظم کے طرز کو عام مقبولیت بخشی اور عہدِ حاضر میں اسے اردو شاعری میں دل کی حیثیت دی جا سکتی ہے۔ دورِ قدیم سے دورِ حاضر تک اردو کی تمام تر شاعری کا جائزہ لیا جائے تو دو اصناف ایسی نظر آئیں گے جنھوں نے نہ صرف اردو شاعری کے مرتبہ کو بلند کیا بلکہ اُردو ادب کو مایہ ناز بنا دیا۔ اگر اردو شاعری کو ایک جسم کا مرتبہ دیدیا جائے تو اس جسم میں دماغ کی حیثیت غزل کو حاصل رہے گی اور نظم دل کا درجہ حاصل کرے گی۔ اس طرح اردو شاعری میں غزل اور نظم دو نایاب اصناف ہیں۔ جنھیں زمانے کی دست و برد سے کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا اور جب تک اُردو شاعری زندہ ہے یہ دونوں

اصناف بھی زندہ رہیں گے۔

دورِ قدیم میں مسلسل خیال کی ترسیل کے لئے شاعری میں "مثنوی" کے پیمانہ کو استعمال کیا جاتا تھا اس دور میں نظم کا تصور نہیں تھا اسی لئے شعراء جب ایک لڑی میں گندھے ہوئے تصوّر کو پیش کرنا چاہتے تو صرف مثنوی کا سہارا لیتے کیونکہ ان کے ذہن میں مسلسل تخیّل کے اظہار کے لئے کوئی دوسری صنف کی صورت گری ممکن نہیں تھی اسی لئے انھوں نے مثنوی کے روپ میں نظمیہ شاعری کی چنانچہ اُردو کی قدیم مثنویوں میں موجود اکثر مناظر میں "نظم" کا رُوپ جھلکتا ہے۔ فنی طور پر مثنوی کو نظم کے چیدہ چیدہ نمونے نہیں کہا جاسکتا لیکن یہ ضرور کہا جائے گا کہ اردو مثنویوں میں نظم کا انداز اپنایا گیا جو مبہم اور غیر واضح ہے۔ گولکنڈہ، بیجاپور اور اورنگ آباد کے شعراء نے جو مثنویاں لکھیں ان کا بغور مطالعہ کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ ان مثنویوں میں اکثر جگہوں پر نظم روپ نمایاں ہے لیکن یہ عمل مثنویوں میں غیر شعوری ہے۔ اردو شاعری میں ۱۴۱۱ء سے لے کر ۱۶۱۱ء تک دکنی میں بے حساب مثنویاں لکھی گئیں۔ یہ عہد اُردو ادب میں "دکنی دور" کے نام سے موسوم ہے۔ اس دوسو سال میں اردو شاعری پر مثنوی کا اثر غالب رہا۔ ۱۵۸۰ء سے ۱۶۱۱ء کے دوران دکن کے مشہور شاعر محمد قلی قطب شاہ کا "کلیات" مرتب ہوا، محمد قلی قطب شاہ اردو کا پہلا باشعور شاعر ہے جس نے صنفِ نظم کو بروئے کار لایا چنانچہ بسنت، عیدین، نوروز۔ سالگرہ۔ مہندی۔ شاہی ہاتھی۔ بارہ پیاریاں۔ ترانۂ عیش۔ چوگان۔ چھوکری چھو۔ پرم کی کہانی۔ موسم۔ محلات پر نظمیں۔ ایسا قیمتی ذخیرہ ہے جسے اردو میں ابتدائی نظموں کا درجہ حاصل ہے۔ محمد قلی قطب شاہ

نے نظم کے استعمال کے لئے مزاج ۔ ماحول ۔ موسم ۔ موقع ۔ موضوع عشق ۔ کھیل غرض ہر عمل کو شاعری میں پرو دیا ہے اسی وجہ سے قدیم دور میں اردو شاعری میں نظم کی بنیاد رکھنے والے شاعر کی حیثیت سے محمد قلی قطب شاہ کا نام سب سے پہلے لیا جاتا ہے۔ قلی قطب شاہ گولکنڈہ کا بادشاہ تھا اور اس کی تمام تر زندگی عیش پرستی میں گزری تھی یہی وجہ ہے کہ اس کی نظموں میں عیش پرستانہ عناصر واضح ہیں۔

دکن میں بیرونی حملوں کی وجہ سے اس کی شعر و ادب کی مرکزیت ختم ہو گئی۔ مغلوں کے حملوں اور ان کی فتح یابی نے دکنی ادب کا شیرازہ بکھیر دیا۔ چنانچہ دکن میں پروان چڑھنے والی اردو نظم بھی گمنامی کی نذر ہو گئی۔ ولی اورنگ آبادی کے دہلی پہنچنے کے بعد دہلی میں بھی اردو شاعری کا زور بڑھنے لگا لیکن غزل اور مثنوی کے سوا کسی دوسری صنف پر توجہ نہیں دی گئی۔ دہلی سے لکھنو منتقل ہو کر اردو شاعری نے قصیدہ اور مرثیہ کا سلیقہ سیکھ لیا لیکن نظم کی روایت جو دکن سے علاقہ رکھتی تھی دہلی اور لکھنو کے خمیر میں شامل نہ ہو سکی۔ قصیدہ اور مرثیہ میں گو کہ " نظم " کا عکس موجود ہوتا ہے لیکن فنی اعتبار سے نظم کے لوازمات قصیدہ اور مرثیہ میں موجود نہیں ہوتے۔ قصیدہ میں بہاریہ تشبیب اور مرثیہ میں سراپا ۔ چہرہ اور رجز ایسے عوامل ہیں جن میں کسی حد تک نظم کا عمل دکھائی دیتا ہے ۔ اس کے باوجود بھی ارادی طور پر نظم لکھنے کے عمل کی کمیابی کی وجہ سے قصیدہ اور مرثیہ کو نظم کی سرشت میں شامل نہیں کیا جا سکتا غرض محمد قلی قطب شاہ کی وفات ۱۶۱۱ء کے بعد تقریباً ڈیڑھ سو سال تک اردو شاعری میں نظم لکھنے کی روایت پر کوئی توجہ نہیں دی گئی جس کی وجہ سے دہلی اور لکھنو میں اس صنف میں کوئی شاعر پیدا نہ ہو سکا اور نظم کا

دامن خالی رہا۔

گو کہ دہلی اور لکھنو میں "شہر آشوب" کے ذریعہ کسی قدر نظم نگاری کی طرف پیشقدمی ہوئی لیکن اسے شہر اور حالات کا مرثیہ کہا جا سکتا ہے۔

۱۸۵۰ء کے بعد اردو شاعری میں نئے لب و لہجہ کے ساتھ نظم کا آغاز ہوا۔ ولی محمد نظیر اکبرآبادی نے اردو نظم کی روایت کو پروان چڑھایا۔ اس طرح محمد قلی نے دکن میں جس انداز سے نظم کی بنیاد رکھی تھی اسی کی تجدید نظیر اکبرآبادی نے کی۔ ۱۸۳۰ء میں نظیر کے ان کی نظم نگاری بھی دفن ہو گئی۔ اپنے دور میں نظیر نے عید، تیوہار، میلہ، بازار اور دیگر سماجی موضوعات پہ نظمیں لکھیں چنانچہ ان کی مشہور نظمیں برسات کی بہاریں۔ بسنت۔ ہولی۔ دیوالی۔ شب برات۔ عیدالفطر۔ بنجارہ نامہ۔ ریچھ کا بچہ۔ سانپ اور نیولے کی لڑائی۔ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے اپنے مشاہدہ کو بنیاد بنا کر نظم نگاری کا آغاز کیا جسے اس دور کے شعراء نے سوقیانہ کلام قرار دیکر نظر انداز کر دیا۔ لیکن دور حاضر میں نظیر اکبرآبادی کو اردو نظم کا مجدد تصور کیا جاتا ہے۔ انھوں نے محمد قلی کی طرح آزاد ماحول میں سماج پسند شاعری کی جس میں ہندوستانی معاشرہ کی جھلکیاں اور ہندوستانیوں کے طرز عمل کا اظہار پوری طرح نمایاں ہے۔

۱۶۱۱ء میں اردو نظم کی ترویج میں ٹھہراؤ آگیا اور پھر ۱۸۵۰ء کے بعد اردو نظم نے نئے ماحول میں سانس لی لیکن یہ ماحول بھی اسے سازگار مواقع فراہم نہ کر سکا چنانچہ ۱۸۳۰ء کے بعد پھر اردو نظم میں انجماد کی کیفیت عام ہو گئی لیکن یہ عمل زیادہ عرصہ تک برقرار نہ رہ سکا کیونکہ ۱۸۷۴ء میں اردو نظم "نیچرل شاعری" کے زیر عنوان دوبارہ منظر عام پر آگئی۔

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

غزل کے موضوعات اور مضامین میں تغیر پیدا ہو گیا۔ نہ یہ انقلاب ۔۔۔
تھی اور جس تجدید سے اردو شاعری کو مالا مال کرنا تھا وہ وقت ابھی نہیں
آیا تھا۔ انسان کے چہروں پہ پڑا ہوا پردہ ہٹ گیا۔ حسن آفرینی اور
ضیافت طبع کیلئے وضع کئے گئے مضامین کی ملمع کاری کا دور ختم ہوا۔ لفظوں
کی ساحری کچھ کام نہ آسکی۔ غدر کے بدلتے ہوئے حالات نے انسان
کو اس قدر تبدیل کر دیا تھا۔ کہ وہ مبالغہ اور خیال کی پرکاری کے بجائے
حقیقت کے عکس پر متوجہ ہو گیا۔ اسی بدلتے ہوئے معاشرہ کے رجحانات
کی بدولت اردو شاعری میں جدید نظم کا آغاز ہوا۔
سائنسی ایجادات اور جدید علوم کے ٹھوس حقائق نے انسانی
ذہن میں ایک تہلکہ مچا دیا۔ غدر کے بعد ہندوستان میں جدید علوم کی
برکات کا نزول شروع ہو گیا۔ نئے اوزار نئے مشین اور جدید طرز کے
آلات نے ہندوستانیوں کو مجاز کے پردہ سے نکال کر حقیقت کے روبرو
کیا۔ جس کی بدولت ہندوستانیوں کی سوچ اور فکر میں ایک عظیم انقلاب
پیدا ہو گیا۔ یہی انقلاب اردو شاعری میں "جدید اردو نظم" کی بنیاد
ڈالنے کا پیش خیمہ ہے۔ گو کہ ہندوستانیوں میں پوری طرح عقلی بالیدگی
نہیں آئی تھی۔ لیکن یوروپی طرز و انداز اور تہذیب کے علاوہ ان
کی عقلی دسترس نے ہندوستانیوں میں ایک عجیب و غریب جذبہ پیدا کر دیا
تھا اور اسی جذبہ نے انھیں اندھی تقلید کی جانب راغب کیا لیکن جدید
اردو نظم تقلیدی طور پہ اردو شاعری میں مروج نہیں ہوئے۔ بلکہ پوری عقلی
اور شعوری بصیرت کے ساتھ تھا۔ دو شعراء نے اس طرز شاعری کو ۔۔۔

اس اعتبار سے جدید اردو نظم کے آغاز میں سائنسی ترقیات اور جدید علوم کی حقیقت پسندی کو بھی بہت بڑا دخل ہے۔

جہاں تک جدید اردو نظم کو ایک تقلیدی عمل قرار دینے کا تعلق ہے اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انگریزی شاعری کی نظم نگاری ہی اردو میں نظم لکھنے کی محرک رہی ہے۔ وقائع نگاروں نے بتایا ہے کہ کرنل ہالرائیڈ نے حالی اور آزاد کو انگریزی شاعری کی اس قیمتی صنف کے بارے میں معلومات دیں جو نظم کہلاتی ہے چنانچہ انگریزی شاعری کی نظم سے واقفیت کے بعد ہی آزاد اور حالی نے اردو میں نظم لکھنے کی بنیاد رکھی لیکن اس عمل کو تقلید قرار دینا مشکل ہے بلکہ اسے تحریک کا نام دیا جا سکتا ہے۔ حالی اور آزاد نے کرنل ہالرائیڈ کی تحریک پر نیچرل شاعری یا نظم گوئی کی بنیاد رکھی۔ ان حقائق کی روشنی میں اردو نظم پر تقلیدی کارنامے کا حکم لگانا قطعی غلط ہے البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ جدید اردو نظم نے انگریزی شاعری سے استفادہ ضرور کیا ہے اور یہ عمل جاری ہے۔

جدید اردو نظم کے ۱۸۵۷ء میں آغاز کے ساتھ ہی اردو شاعری میں نظم نگاروں کا ایک قافلہ بن گیا۔ ان نظم نگاروں نے اپنی سمت کا تعین کر کے نئی راہوں کو اپنانے کا بیڑا اٹھایا جس کے نتیجہ میں آغاز کے وقت موجود نیچرل شاعری نے نظم کے قالب کو اپنایا اور اردو میں مکمل طور پر نظم نگاری کی سمت مقرر ہو گئی۔ غدر کے بعد کا دور ایک ایسا عہد ہے جب کہ اردو کے بیشتر شعراء نے غزل کو خیرباد کہہ کر نظم نگاری

کے مسلک کو اختیار کیا اور اس طریقہ نے انھیں کافی مقبولیت دلائی۔ محمد حسین آزاد اور مولانا حالی نے نظم کے لئے موزوں سمت کا تعین کر دیا۔ جس کی بدولت اردو نظم مسدس۔ مخمس۔ مثلث۔ مربع۔ جیسی اقسام میں لکھی جانے لگی۔ گو کہ نظیر اکبرآبادی نے بھی مخمس اور مسدس کی طرز میں نظمیں لکھی تھیں لیکن وہ شعوری طور پر اردو نظم کی سمت کا تعین نہ کر سکے یہی وجہ رہی کہ عرصہ تک ان کی شاعری التواء کا شکار رہی۔ غرض حالی اور آزاد نے فطری موضوعات' محنت کشی۔ قدرتی مناظر۔ حقیقت پسندی اور رسم و رواج کو نظموں میں شامل کر کے دیگر شعراء کو نظم لکھنے کے لئے موضوعات کی سمت دکھائی اور نظم کے موضوع کو عید و تیوہار کے پرانے تصور سے نکال کر حقیقت اور عمل کے تصور سے جوڑ دیا۔

حالی اور آزاد کی وفیات سنہ ۱۹۱۴ء تک اردو نظم کی سمت دو اہم دھاروں سے وابستہ رہی۔ اخلاقی و اصلاحی موضوعات اور فطری مناظر کو نظم کرنے کی جانب ان دونوں شعراء نے خصوصی توجہ دی اور ان ہی عنوانات پر نظم گوئی کے طرز کو روا رکھا۔ محمد حسین آزاد پیدائش سنہ ۱۸۲۷ء وفات سنہ ۱۹۱۴ء نے اپنی نظموں میں مناظر قدرت' ہندوستانی معاشرہ اور یہاں کے مصروفیات۔ رسم و رواج۔ اصلاح معاشرہ اور اخلاق موضوعات کو پروان چڑھایا چنانچہ ان کی نظمیں برکھا رت۔ نشاطِ اُمید۔ حبِ وطن۔ مناظرِ رحم و انصاف اردو شاعری میں نئے موڑ کی جانب اشارہ کرتی ہیں۔ آزاد نے اردو نظم کو جدید خیالات جدید تصورات اور جدید موضوعات سے مالا مال کیا۔ لیکن ان کی شاعری کی سمت کا دھارا ماحول کے نقشوں

کو سمجھنا اور زندگی کے واضح نقطۂ نظر کے سوا کچھ نہ رہا۔ اردو شاعری کی غلط روایات کو سدھارنے اور شاعری کو نکھارنے کے مقصد کے تحت مولانا آزاد نے جدید نظم کے لبادہ کو اوڑھ لیا۔ جس کی وجہ سے ان کی نظموں کے موضوعات تو نئے ہو گئے لیکن توازن اور اعتدال کے سوا اردو نظم کو کوئی اور سلیقہ میسر نہ ہوا۔ آزاد کی نظموں میں انسانی جذبہ، انقلابی لہجہ اور زندگی کی دھڑکن کی کمی ہے۔ اتنا کہا جا سکتا ہے کہ آزاد نے اردو نظم کو جدت کا انداز دینے کے لئے جدید اردو نظم کی حمایت میں نظمیں لکھیں اور انھیں مقبولیت حاصل ہو گئی۔

محمد حسین آزاد کے ہم رتبہ شاعروں میں خواجہ الطاف حسین حالی کا شمار ہوتا ہے۔ انھوں نے بھی نظم کو سمتِ اخلاق اور فطرت سے ہی وابستہ رکھا۔ سماج کی برائیوں پر نشاندہی کرنا اور اصلاح کی طرف توجہ ان کی نظم گوئی کا اہم مسلک رہا ہے۔ انھوں نے اپنی نظموں میں اصلیت لانے کی کوشش کی۔ سادہ الفاظ سے تاثر پیدا کیا۔ دل کی تڑپ کو نظم کا لبادہ دیدیا۔ جوشِ زبان و بیان سے نظم کو عطر بیز کر دیا۔ غرض ان کی نظموں میں خلوصِ دل پوری طرح جھلکتا ہے۔ فطرت پرستی۔ حقیقت نگاری۔ شدتِ احساس ان کی نظموں کا خاصہ ہے ان کی نظمیں فلسفۂ ترقی، مسلمانوں کی تعلیم، مدرسۃ العلوم، انجمن حمایت الاسلام، وغیرہ کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ حالی نے اخلاق، تہذیب و تمدن، طرز معاشرت سے دلی وابستگی کو اپنی نظموں کی سمت مقرر کیا۔ ان کی نظموں میں انسانی جذبہ ہمدردی اور زندگی کی دھڑکن کے ساتھ ساتھ رقیق القلبی کا عنصر غالب ہے۔ اخلاقی اور اصلاحی موضوعات

کو حالی نے بڑے اچھے انداز سے ابھارا ہے۔ اس کے باوجود ان کی نظموں میں انقلابی رجحانات سیاسی شعور۔ فلسفۂ زندگی اور حیات و کائنات کے بنیادی حقائق کا سراغ نہیں ملتا۔ غرض حالی اور آزاد کی شاعری کو جدید اردو نظم کے بنیادی خطوط کی حیثیت سے قبول تو کیا جا سکتا ہے لیکن ان کی نظموں میں زندگی اور ماحول کے ربط سے متعلق کوئی اشارہ نہیں ملتا اسی لئے حالی اور آزاد کو جدید اردو نظم کے طبقۂ دوم کے شعراء تسلیم کیا جاتا ہے۔ جنھوں نے اردو نظم کی سمت مقرر کی اور نظم کو کن موضوعات سے وابستہ رکھنا چاہئے اس سلسلہ میں رہنمائی کی یہی وجہ ہے کہ وہ دونوں جدید اردو نظم کی عمارت کے دو اہم ستون قرار دیئے جاتے ہیں۔

حالی اور آزاد نے اردو نظم کے لئے جو سمت اختیار کی اس سے بالکل مختلف انداز سے نظم کو رواج دینے والے شعراء میں اکبر الہ آبادی اور ڈپٹی نذیر احمد کا شمار کیا جاتا ہے۔ گو کہ نذیر احمد کے اعتبار سے حالی اور آزاد کے ہمعصر ہیں لیکن انھیں اس بنیاد پر حالی اور آزاد کی سرشت سے علحدہ کیا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اپنی نظموں میں اجتماعی معاملات اور جذباتی رنگ کو نمایاں کیا ہے جس کا اثر ہمیں اکبر الہ آبادی کی شاعری میں بھی نظر آتا ہے۔ حالی اور آزاد اردو نظم کے جن موضوعات کو چھو نہ سکے انھیں نذیر احمد اور اکبر الہ آبادی نے پوری شدت کے ساتھ سلوک میں لایا اس طرح اردو نظم کے قافلے میں ان دونوں شعراء کی سمت بالکل مختلف ہو گئی۔ ڈپٹی نذیر احمد نے اپنی زندگی کے آخری دور میں نظم نگاری کی بنیاد رکھی "نظم بے نظیر" ان کی شاعری کا مجموعہ ہے جس میں انھوں نے نظم کی روایت

کو غزل کے طرز میں اپنانے سے دکھایا۔ نذیر احمد نے جتنی مقبولیت نثر خصوصاً ناول نگاری میں حاصل کی اتنی شہرت انھیں اردو نظم میں نہ مل سکی۔ انھوں نے نظم کے موضوع کو یکسر بدل دیا۔ حالات حاضرہ، سیاسی کشمکش، سماجی بدحالی، مسلمانوں کا تنزل، تہذیبی و اخلاقی کمزوری ان کی نظموں کے موضوعات ہیں۔ نذیر احمد کی نظموں میں سیاسی شعور موجود ہے۔ لیکن سیاسی بصیرت عنقا ہے۔ حقیقت کی عکاسی اور موضوعاتی نظموں کی پیشکشی ان کا شعار رہا۔ نذیر احمد کی نظمیں فلسفۂ زندگی اور حیات و کائنات کے بنیادی حقوق کی نشاندہی کرنے سے قاصر ہے۔ البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اسلام اور اسلامی اصولوں کی اشاعت و ترویج کے لئے نظم نگاری کا طریقہ اپنایا۔ ان کی نظم میں انقلابی لہجہ کی کمی شدت سے محسوس کی جاتی ہے۔ غرض ڈپٹی نذیر احمد ایک کامیاب نظم نگار تھیں لیکن جدید اردو نظم کی سمت کو متعین کرنے والے شعراء میں اپنا علحدہ مقام رکھتے ہیں۔

اُردو شاعری کے ابتدائی دور میں انقلابی لہجہ کی کمی رہی لیکن شاعری کے ذریعہ حسیت کو بیدار کرنے والے شاعر کی حیثیت سے اکبر الہ آبادی کا نام کافی بلند ہے۔ ہندوستانیوں اور مسلمانوں کی حمیت اور غیرت کو للکارنے کا کام اکبر الہ آبادی نے اپنی نظموں کے ذریعہ انجام دیا۔ وہ پہلے شاعر ہیں جنھوں نے پہلی بار اردو نظم میں معترضانہ لہجہ دیا اور بغاوت کی روح کو اردو شاعری میں عام کر دیا۔ انگریزی تہذیب اور رہنمائی پر عدم اعتماد کا اظہار کرتے ہوئے اکبر نے تشکیک کی بنیاد رکھی۔ انھوں نے اردو نظم کی سمت کو ایک نئی ڈگر سے آشنا کیا۔ مزاحیہ انداز میں اُردو نظم

کی ساکھ بڑھانے کا سہرا اکبر ہی کے سر ہے۔ طنز و ظرافت کے ساتھ ترغیب ان کی نظم نگاری کی اہم خصوصیت ہے۔ اکبر کی بیشتر نظموں میں تنقید برائے تعمیر کا انداز نمایاں ہے۔ اسی انفرادی طرز کی وجہ سے اکبر اردو نظم کے شاعروں کی صف میں بالکلیہ مختلف مقام و مرتبہ کے حامل ہو جاتے ہیں۔

اسمٰعیل میرٹھی اور شبلی نعمانی نے اردو نظم کی روایت کو قدیم سمت سے ہی مربوط رکھا۔ ان کے دور تک بھی اردو نظم کی رفتار میں کوئی فرق نہیں آیا بلکہ حالی اور آزاد نے جس سمت کا تعین کیا اور جس رفتار کو روا رکھا وہی انداز اپنایا جانے لگا۔ البتہ نظموں کے انداز میں تغیر آنے لگا۔ اب نظموں کی درجہ بندی ہونے لگی۔ قومی نظمیں۔ وطنی نظمیں۔ خیر مقدمی نظمیں۔ تاریخی نظمیں۔ تہنیتی نظمیں۔ تاثراتی نظمیں۔ حکایتی نظمیں۔ مذہبی نظمیں۔ تعمیری نظمیں۔ دینی نظمیں۔ بچوں کی نظمیں۔ لکھنے کا رواج عام ہونے لگا۔ اس انداز سے اردو نظم کی رفتار میں سرعت پیدا کرنے والے شعراء میں شوق قدوائی۔ بے نظیر شاہ۔ تلوک چند محروم۔ برج نارائن چکبست۔ درگا سہائے سرور۔ نظم طباطبائی۔ وحید الدین سلیم۔ مہاراجہ کشن پرشاد شاد ظفر علی خاں۔ صفی لکھنوی۔ عزیز لکھنوی۔ جگت موہن لال رواں۔ وغیرہ کا شمار ہوتا ہے جنہوں نے اردو نظم کی رفتار میں نئی جہتوں کا اضافہ کیا لیکن اس وقت تک بھی اردو نظم کی سمت کا تعین ہونے کے باوجود اس کی رفتار میں کوئی فرق نہیں آیا۔ قدیم محسوسات اور پرانی ڈگر سے وابستگی اردو نظم کا شیوہ رہا۔

اردو نظم میں سمت کے تعین اور رفتار کی تبدیلی کا احساس سب سے پہلے جمالیاتی اور عشقیہ نظموں سے ہوا۔ اسرار الحق مجاز لکھنوی، اختر شیرانی۔

جاں نثار اختر، سیماب اکبر آبادی۔ جیسے شعراء نے اردو نظم کی رفتار میں جمالیاتی نظموں کے ذریعہ ایک عظیم تغیر پیدا کیا۔ اس تبدیلی کے ساتھ ہی اردو نظم کی رفتار میں سرعت پیدا ہو گئی۔ انقلابی لہجہ کے ساتھ ساتھ شبابیات اور خمریات کا عمل بھی نظم کی زینت بننے لگا۔ جوش ملیح آبادی نے اردو نظم کو مسلسل تین رفتار سے وابستہ رکھا۔ جوشیابیات۔ انقلابیت۔ اور خمریات کے نام سے موسوم ہے۔ جوش کے آہنگ نے اردو نظم کو رواں لہجہ سے وابستہ کر دیا۔

جدید اردو نظم کو تعمیر زندگی۔ مقصد حیات۔ فلسفۂ زندگی۔ تصورِ کائنات اور مقصدِ تخلیق انسانیت سے آشنا کرنے والے عظیم شاعر کی حیثیت سے علامہ اقبال کا نام لیا جاتا ہے۔ انھوں نے روح اسلام کو نظم اور فلسفہ کے ذریعہ محسوس کیا۔ چنانچہ اپنی اپنی نظموں میں اسی عکس کو غالب رکھا۔ وہ ایک مفکر شاعر گزرے ہیں۔ اس طرح اردو نظم میں قومیت، وطنیت۔ مذہبیت۔ تعمیر پسندی۔ تاریخیت۔ اور تہنیت کے اثرات شامل ہونے کے بعد انقلابیت۔ شبابیت۔ اور خمریات کا دور چلا اور پھر فکر ریزی۔ دلائل کے ساتھ ٹھوس حقائق کی پیشکشی کا دور، دورہ ہو گیا اس عمل نے اردو نظم کو ہیئت کے نئے تجربوں سے واقف کروانے کے لئے راہیں کھول دیں۔ نئی نظم۔ آزاد نظم۔ معریٰ نظم۔ پابند نظم۔ نثری نظم۔ یہ ایسے جدید انداز تھے جنھیں اردو نظم نے قبول کر لیا اور پھر اردو نظم کی رفتار میں ایک نئی روح پیدا ہونے لگی۔ اقبال کی فکری شاعری نے اردو نظم کے بند پردوں کو کھول دیا اور تصور عشق تصور فقر۔ تصور خودی تصور موت اور تصور تعلیم کے ذریعہ ثبوت قائم کر دیا کہ اردو شاعری خاص طور پر نظم

میں اتنی وسعت ہے کہ وہ فلسفیانہ اور مفکرانہ خیالات کی نمائندگی کر سکتی ہے۔ اقبال نے اُردو نظم کو زندگی، زندگی کی رونق اور کائینات کے علاوہ تخلیق کائینات کے ساتھ ساتھ دنیا میں انسان کی آمد کے مقصد کو سمجھایا جس کی وجہ سے اردو نظم فکری اور عصری ضروریات سے مالا مال ہوگئی۔ جوش کی نظموں نے عقد پد جذباتیت' دیوانہ وار چاہت۔ انقلاب پسندی اور جمالیاتی شعور کو روا رکھا۔ مجاز اختر شیرانی۔ جاں نثار اختر نے جدیدیت کا ساتھ دینا شروع کیا۔ جس کے پس منظر میں شعراء کا ایک ایسا گروہ پیدا ہوگیا جس نے روایت سے بغاوت کو اولین حیثیت دی۔ چنانچہ میراں جی۔ ن۔م راشد۔ مخدوم محی الدین۔ فیض احمد فیض۔ علی سردار جعفری کیفی اعظمی۔ آنند نرائن ملا۔ اختر الایمان۔ ساحر لدھیانوی۔ اور مجروح سلطان پوری جیسے شعراء کی نئی نسل پیدا ہوگئی۔ اس نئی نسل کے جدیدیت سے تصور سے ہم آہنگ ہونے کے باوجود چند شعراء نے قدامت کو ضروری قرار دیا جن کی نمائندگی کرنے والوں میں عظمت اللہ خاں۔ حفیظ جالندھری۔ افسر میرٹھی۔ جلیل قدوائی۔ احسان دانش۔ ساغر نظامی۔ فراق گورکھپوری۔ اور راز چاند پوری۔ جیسے شعراء ہیں جنھوں نے روایت کی تعظیم و تکریم کی۔

جدید اور نئی نظم کے معماروں نے نظم میں ہئیت کے تجربے بھی کئے جس کے ساتھ ہی سیاسی کشمکش اور معاشی بدحالی کو بھی نظم کا پیراہن دے دیا نظم میں علامت نگاری کو فروغ دینے والے شاعر کی حیثیت سے ن۔م راشد نے نمایاں مقام پیدا کیا جب کہ عریانیت اور جنسیت کی پیشکشی میں میراں جی نے مقبولیت حاصل کرلی جس کی وجہ سے جدید اردو نظم کی رفتار

میں اضافہ ہوگیا اور وہ نظم جو صرف اخلاقی اصلاحی اور تعمیری نظریوں کی پابند
تھی عالمگیر احساسات کی آئینہ دار بن گئی۔

اردو نظم میں عالمی ادبیات کے اثرات کا عکس بھی شامل ہونے لگا۔
سب سے پہلے اردو نظم نے انگریزی ادب کی پیروڈی کو اپنے قالب میں
قبول کیا اس طرح اردو نظم کی ہیئت، ترائیلے، تثلیث۔ یہ ایسے اضاف
ہیں جو عہد حاضر کی اردو نظم میں انگریزی شاعری کے زیر اثر پروان چڑھے
ہندوستانی ادبیات سے اردو نظم نے گیت کے مزاج کو اپنایا۔ چند اردو
نظم نگاروں نے "دوہے" کی نظمیہ خصوصیات کو بھی قبول کیا۔ گیت کی
صنف کو اپناتے ہوئے شعراء نے مجرا۔ بابل جیسے گیتوں کی بنیاد رکھی جو
خالص ہندوستانی تہذیب کے آئینہ دار ہیں۔ طوائف کے کوٹھے پر گائے
جانے والے گیتوں نے مجرا کی شکل اختیار کی جب کہ ماں باپ کے گھر سے
دلہن کی وداعی کے وقت گائے جانے والے درد بھرے گیتوں کو بابل کے
نام سے موسوم کیا گیا۔ ان کے علاوہ برسہ کے گیت کا تصور بھی اردو شاعری
میں عام ہونے لگا۔ اس طرح اردو نظم نے آغاز کے بعد اپنی سمت کا تعین
کیا اور اب اس کی رفتار تیزی کے ساتھ ترقی کی جانب مائل ہے۔ آزاد نظم
کا شہرہ ترقی پسند تحریک کے زیر اثر ہوا جدیدیت کے علمبرداروں نے
جدید نظموں کی بنیاد رکھی جب کہ دور حاضر میں نثری نظم کا رواج عام ہونے
لگا ہے۔ غرض اردو نظم آغاز کے وقت اصلاحی اخلاقی اور تہذیبی اقدار
کی پابند رہی پھر اس میں جمالیاتی اور عشقیہ انداز شامل ہونے لگا۔
شبابیات، خمریات اور انقلابی رجحان پروان چڑھنے کے بعد فکری اور

فلسفیانہ انداز بھی اردو نظم کا گہوارہ بنے۔ پھر جنسیت، عریانیت اور علامت پسندی نے اردو نظم میں جگہ پائی اس طرح اردو نظم کے قافلہ نے ۱۸۷۴ء سے دور حاضر میں تقریباً ایک سو سال کے دوران جس قدر ترقی کے مراحل طے کئے اتنی تیز رفتاری دنیا کے دیگر ادبیات میں ملنی مشکل ہے۔ غرض اردو نظم کا موجودہ ذخیرہ صرف سو سال کی محنتوں اور کاوشوں کا نتیجہ ہے۔

اس بیش بہا ذخیرہ کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اردو نظم نے اس قدر قلیل مدت میں جو شہرت اور ناموری حاصل کی ہے وہ مستقبل کے لئے فال نیک ہے اور نئی نسل کے نظم گو شعراء کو دعوت فکر دیتی ہے جو اس بات کی ضمانت ہے کہ مستقبل کی اردو نظم عظیم اور بلند آہنگ کی آئینہ دار ہوگی۔

(حضرت مولانا حفیظ الرحمان واصفؔ دہلوی)
اردو بازار - دہلی ۶

غزل

کیا ہوا؟ چپ سی لگی ہو جیسے　　مجھ سے کوئی خفگی ہو جیسے
ان کا دل، تازہ کلی ہو جیسے　　ایک خوابیدہ ہنسی ہو جیسے
میرا دل ننگ چمن عار وطن　　ایک پژمردہ کلی ہو جیسے
میکشوں پر جھکی آتی ہے گھٹا　　مہرباں کوئی عتی ہو جیسے
آگ حاسد کے ہے دل میں ایسی　　میرے ہی دل کی لگی ہو جیسے
تم نے کیوں مجھکو کہا دیوانہ　　یہ بھی میری غلطی ہو جیسے
کیوں بگڑتے ہو خفا ہوتے ہو　　میں نے وہ بات کہی ہو جیسے
لب پہ جلتے ہوئے حرف آتے ہیں　　دل میں اک آگ دبی ہو جیسے
وقتِ رخصت جو پلٹ کر دیکھا　　ان کی آنکھوں میں نمی ہو جیسے
اک کہانی سی ہے روداد اپنی　　عہدِ طفلی میں سُنی ہو جیسے

آج حاضر نہیں واصفؔ شاید
بزم میں کوئی کمی ہو جیسے

شوکت تھانوی

قیامت

اول تو خدا سے ڈرنا یوں بھی عین ایمان ہے، دوسرے ایسی حالت میں جب کہ قیامت کا آنا برحق بھی ہو اور زلزلہ کی صورت میں نصف قیامت آ بھی چکی ہو، اگر کوئی خدا سے نہ ڈرے تو معاف کیجئے گا۔ یہ بہادری نہیں بلکہ ہم تو اس کو فرعونیت کہیں گے۔ بہرحال ہم کو اپنے اس ایمانی استقلال پر ناز ہے کہ جیسے ہی اخبار میں ہماری نظر سے یہ خبر گزری کہ چندر گرہن کے وقت ایک چھوٹا سا ستارہ چاند سے منصادم ہو کر پاش پاش ہو جائے گا اور اس کے ٹکڑے خطِ استوا سے اوپر دنیا کے کسی حصہ میں گریں گے جس سے سخت نقصانات پہونچیں گے۔ اور زمین ان کے گرنے کی دھمک سے ہل جائے گی۔ تو جناب ہمارا خون منجمد ہو گیا طائرِ روح قفسِ عنصری سے پرواز کرنے کے لئے پر تولنے لگا اور اخبار ہمارے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا۔ قصہ اصل یہ ہے کہ اگر ہم گنہ گار نہ ہوتے اور عاقبت کی طرف سے دل کو اطمینان ہوتا تو شاید یہ سراسیمگی کا عالم طاری نہ ہوتا مگر یہاں تو اس طالب علم کا سا عالم تھا جس نے تمام سال گلی ڈنڈے کے نذر کیا ہو اور دفعتاً امتحان بغیر اطلاع کے سر پر آ پہنچا ہو۔ لیکن یہ مثال بھی ذرا کمزور رہی ہم کہنا

یہ چاہتے ہیں کہ ہمارا اس وقت یہ عالم تھا کہ گویا موت کی سزا کا حکم سننے کے بعد موت کے خوفناک انتظار میں ۔"موت آتی ہے پر نہیں آتی"۔ کی کیفیت میں ڈوبے ہوئے تھے۔ کچھ دیر تک تو اس خوفناک خبر کا تخیلی فلم دیکھتے رہے اس کے بعد تمام گناہوں سے بیساختگی کے ساتھ توبہ کرتے ہوئے گھر میں آئے تاکہ اس بقیہ مختصر سی زندگی کو بال بچوں کے ساتھ اور خدا کی یاد میں صرف کریں، گھر میں آکر ہم نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ خود اپنے کو ذرا مضبوط بنا کر بیگم کو یہ خوفناک خبر سنادی تاکہ وہ بھی بے خبر نہ رہیں۔ بیگم نے پہلے تو ہمارے متعلق یہ سمجھا کہ ہم شاید مذاق کر رہے ہیں۔ لیکن جب ہم نے ان کو اخبار دکھایا تو وہ سنگر مشین کو اس طرح دبوچ کر بیٹھ گئیں کہ گویا قیامت سے اگر بچنے کا کوئی ذریعہ ہے تو وہ سنگر مشین ہی ہو۔ ہم نے اپنی ہمت مردانہ اور استقلال کا مظاہرہ کرتے ہوئے زبردستی متبسم ہو کر کہا "آپ پریشان کیوں ہو گئیں۔"

سہمی ہوئی آواز میں بولیں "اب بتائیے کیا ہوگا؟"

ہم نے اپنے کو سنبھالتے ہوئے کہا "ہوگا کیا، وہی ہوگا جو خدا کو منظور ہے"۔

جنوری کے مہینہ میں چہرہ کا پسینہ پونچھتے ہوئے کہا "اب بتائیے کیا کریں؟"

ہم نے کہا "یہ بھی کوئی اپنے بس کی بات ہے۔ خدا کو یاد کرو اور کیا کروگی"

ٹھنڈی سانس لے کر دل کی گہرائیوں سے "یا اللہ توبہ ہے" کہکر بیگم نے کہا "اور یہ چندر گرہن ہے کب؟"

ہم نے کہا "کل رات کو دس بجے کے بعد پڑیگا۔ میں چاہتا ہوں کہ [illegible] تاکہ کم سے کم نماز ہی پڑھ سکوں"

بیگم نے گردن ہلا کر جواب دیا کہ "ہاں" اور ہم غسل خانہ میں چلے گئے۔ سچ تو یہ ہے کہ جس احتیاط اور باقاعدگی کے ساتھ آج ہم نے غسل کیا ہے شاید اس سے پہلے کبھی نہیں کیا تھا اپنے نزدیک جب ہم بالکل طاہر ہو گئے اور کلمہ پڑھ پڑھ کر وضو کر چکے تو غسل خانہ سے نکلے، یہاں بیگم پہلے ہی سے سجدہ میں موجود تھیں۔ ہم نے بھی کپڑے پہنے اور ایک سچے مسلمان کی طرح زندگی میں پہلی مرتبہ چار رکعت نماز فرض کی نیت باندھ کر اپنے کو خدا کے حضور پیش کیا۔ کچھ نہ پوچھئے کہ کس انہماک کے ساتھ یہ نماز ہوئی ہے اور اس کے بعد جو نوافل کا سلسلہ شروع ہوا ہے تو قضائے عمری کا لطف آ گیا۔ بس یہ سمجھ لیجئے کہ چار بجے تھے جو نماز پڑھنے کے لئے کھڑے ہوئے تھے اور چھ بجے کے قریب بیٹھے اس کے بعد ہی مغرب کا وقت آ گیا۔ اور ہم پھر وضو کے اوپر وضو کر کے کھڑے ہو گئے۔ مختصر یہ کہ نمازوں کا سلسلہ رات کو دس بجے تک قائم رہا۔ جب عشا کی نماز اور نماز کے بعد تسبیح وغیرہ سے فارغ ہو کر ہم دستر خوان پر آئے۔ کھانا تو خیر یونہی سا کھایا البتہ یہ رسم بھی ادا ہو گئی اور ہم سونے کے لئے لحاف میں پہونچ گئے۔ مگر توبہ کیجئے نیند کا کہیں کوسوں پتہ بھی نہ تھا اور یہی حال بیگم کا تھا کہ ادھر سے اُدھر کروٹیں لے رہی تھیں۔ کبھی کبھی "یا اللہ توبہ ہے" کا نعرہ بلند کرتی تھیں اور رہ جاتی تھیں آخر ہم نے خود ہی ان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: "کیا نیند نہیں آ رہی ہے"

کہنے لگیں: "اور آپ بھی تو جاگ رہے ہیں"

ہم نے کہا: "ہاں ذرا کچھ وحشت سی ہے"

بولیں: "میرا بھی دل گھبرا سا رہا ہے"

ہم نے مرد مسلمان بنتے ہوئے کہا: "ارے جی کوئی بات نہیں اللہ مالک ہے سو بھی جاؤ" کہنے لگیں: "ہاں یہ تو ہے مگر دل جیسے الجھ سا رہا ہے معلوم ہوتا ہے جیسے دم الٹا جاتا ہے۔"

ہم نے جماہی لیتے ہوئے کہا: "کچھ نہیں بس اللہ مالک ہے اس کے حکم سے نجوم غلط ہو سکتا ہے۔ اور منجم کی پیشنگوئی جھوٹی ہو سکتی ہے اور اگر واقعی قیامت آ ہی گئی ہے تو جو سب کا حشر ہوگا ہمارا بھی ہوگا۔ بہرحال یہ کوئی اپنے اختیار کی بات نہیں ہے۔"

بیگم نے کہا "ہوں"

ہم چپ ہو رہے اور ادھر ادھر کروٹیں بدلنے لگے۔ یکایک ہم کو خیال آیا کہ ذرا صحن میں چل کر دیکھیں تو سہی کہ اس سے کونسا ستارہ ایسا قریب ہے کہ ٹکرا ہی جائیگا۔ اب ہم جو باہر آئے تو دیکھتے کیا ہیں کہ چاند سے ایک ذرا چھوٹا سرخ رنگ کا دہکتے ہوئے انگارہ کی طرح کا ستارہ چاند سے کوئی ایک فٹ کے فاصلہ پر ہے۔ اور چاند میں گرہن پڑا ہوا ہے ہم نے دوڑ کر بیگم کو اٹھا دیا اور دونوں بچوں کو کلیجہ سے چمٹا کر بیٹھ گئے ہماری نظریں چاند اور ستارہ پر جمی ہوئی تھیں اور دل کی دھڑکن خود ہم کو ہلائے دیتی تھی۔ ستارہ رفتہ رفتہ چاند کے قریب ہوتا جاتا تھا اور ادھر بیگم رفتہ رفتہ ہمارے قریب ہوتی جاتی تھیں۔ یہاں تک کہ چاند اور اس ستارہ کے درمیان شاید ایک انچ کا فصل رہ گیا اور بیگم نے ہمارا بازو نہایت مضبوطی کیساتھ پکڑ لیا۔ ہم برابر کلمہ پڑھ رہے تھے اور دونوں بچوں کو خوب بھینچے ہوئے تھے کہ ایک دم سے ایک ہولناک فلک شگاف دھماکے کے ساتھ

ستارہ چاند سے ٹکرا کر پارہ پارہ ہوگیا اور اس کے ساتھ ہی ہم اس طرح اچھل پڑے کہ ــــ آنکھ کھل گئی۔ بیگم نے کہا: "کیا ہے؟"

ہم نے لرزتی اور ہانپتی آواز میں کہا: "کچھ نہیں"

بیگم نے کہا: "کیا ڈر گئے؟"

ہم نے کہا "نہیں تو ــــ ایک خواب دیکھا تھا"

بیگم چپ ہوگئیں اور ہم بھی اس ہولناک خواب سے سہمے ہوئے پڑے رہے، خدا جانے کس وقت آنکھ لگ گئی، بہرحال ہم اس وقت بیدار ہوئے جب موذن "الصلوٰۃ خیر من النوم" کہہ کر مسلمانوں کو آواز دے رہا تھا ہم نے آج سے پہلے بارہا یہ آواز سنی تھی لیکن کبھی اس کے مفہوم کو سمجھنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی اور ہمیشہ ہم یہ آواز سنکر لحاف کے اندر اپنا منہ چھپا لیا کرتے تھے۔ لیکن آج یہ آواز سنتے ہی ایک لات مار کر لحاف الٹ دیا اور کلمہ پڑھتے ہوئے اٹھ بیٹھے جلدی جلدی ضروریات سے فارغ ہوئے وضو کرکے نماز کے لئے کھڑے ہوگئے اور نہایت محویت کے ساتھ نماز پڑھی۔ نماز سے فارغ ہوکر کلام پاک کھول کر بیٹھ گئے، اُدھر بیگم دس دس اور پندرہ پندرہ منٹ تک سجدے میں پڑی ہوئی دعاؤں میں مصروف تھیں مختصر یہ کہ اسی دینداری میں ہم دونوں نے سات بجادئے، ہر طرف دھوپ پھیلی ہوئی تھی یہ وہی دھوپ تھی جو آج آخری مرتبہ اپنی چمک دمک دکھا رہی تھی۔ بیگم اپنے بچوں کی دیکھ بھال میں مصروف ہوگئیں اور ہم ذرا ٹہلتے ہوئے اپنے پڑوسی میر صاحب کی طرف چل دیئے کہ دیکھیں وہاں کیا رنگ ہے

میر صاحب اس وقت باہر کے مردانے کمرہ میں بیٹھے رہتے تھے مگر آج خلاف معمول گھر کے اندر گھسے ہوئے تھے۔ ہم نے آواز دی تو ملازمہ نے جواب دیا کہ نماز پڑھ رہے ہیں لہٰذا ہم نے بھی انگلیوں پر درود پڑھنا اور ٹہلنا شروع کر دیا۔ اتنے میں میر صاحب سر پر بلوچیوں کی طرح رومال باندھے کچھ بڑبڑاتے ہوئے تسبیح پھیرتے ہوئے برآمد ہوئے ہم نے کہا میر صاحب اس وقت کونسی نماز پڑھ رہے تھے؟" کہنے لگے "چاشت" ہم نے کہا' اللہ اکبر' کہنے لگے " بھائی یہی وقت دعاؤں کا ہے اور یہی تھوڑا سا وقت ہے کہ ہم بھر کے گناہگار توبہ کر لیں۔" ہم نے بھی دل گہرائیوں سے میر صاحب کی تائید کرتے ہوئے نہایت سنجیدگی سے کہا۔ بیشک میر صاحب کے چہرے پر وحشت برس رہی تھی' ہم آئے تھے ذرا دل بہلانے مگر یہاں تو اور بھی خوف اور دہشت کا ماحول تھا لہٰذا ہم واپس ہونا چاہتے تھے کہ میر صاحب نے کہا " سنا ہے کہ جو ستارہ ٹوٹنے والا ہے وہ ہماری دنیا کی طرح مٹی کا نہیں بلکہ لوہے کا بنا ہوا ہے۔ ہم نے کہا۔ مگر میر صاحب ایک بات ہے کہ اگر وہ لوہے کا ہے تو خود اس کو نہ ٹوٹنا چاہیئے بلکہ وہ تو چاند کو توڑ سکتا ہے۔" میر صاحب نے ایک بھولے بھالے مسلمان کی طرح جواب دیا: " یہ سب خدا کی قدرت ہے' آپ کو کیا معلوم کہ وہ زیادہ مضبوط ہے یا چاند؟ ممکن ہے کہ چاند اس سے بھی زیادہ سخت کسی دھات کا بنا ہوا ہو اور نہ بھی سہی تو کیا یہ خدا کی قدرت سے کچھ بعید ہے کہ مٹی لوہے کو توڑ دے اور کمزور چیز مضبوط چیز پہ غالب آجائے" ہم کو ماننا پڑا کہ واقعی میر صاحب سچ کہتے ہیں قصہ اصل میں یہ ہے۔

یہ قدرت کی کاریگری ہے جناب۔

ہم نے کہا: "میر صاحب یہ تو گویا قیامت ہے۔" کہنے لگے "اے کیا جناب قیامت اور کسے کہتے ہیں۔ اب آپ یہ سمجھیے کہ وہ ستارہ چاند سے تھوڑا ہی چھوٹا ہے اور چاند بالکل دنیا کے سر پہ ہے اس کے یہ معنی ہوئے کہ جس وقت وہ چاند سے ٹکرا کر ٹوٹے گا اس کے تمام ٹکڑے خطِ استوا سے اوپر دنیا میں گریں گے۔ فرض کر لیجئے کہ کوئی ٹکڑا ہندوستان کے برابر ہے اب اگر وہ ہندوستان کے اوپر گر پڑا تو ہندوستان کا کیا حال ہو گا؟" ہم نے لرزتے ہوئے کہا "ہندوستان بھی پاش پاش ہو جائے گا۔ جناب یہ کہئے کہ چٹنی ہو جائیگا چٹنی۔ کہیں پتہ بھی نہ چلے گا کہ دنیا کے نقشہ میں ہندوستان تھا بھی ہیں۔ ہم نے جھرجھری لے کر کہا" یا اللہ توبہ ہے۔ یا اللہ توبہ ہے میر صاحب نے عجیب طریقہ پر آسمان کی طرف دیکھ کر اپنے کان پکڑے اور رخساروں پر توبہ کے تھپڑ رسید کرنے لگے۔ ہم نے کہا: "میر صاحب جو کچھ ہونا ہے وہ تو ٹل نہیں سکتا اور نہ ہم کہیں بچ کر جا سکتے ہیں۔ مگر دل چاہتا ہے کہ چندر گرہن کے وقت سب لوگ پاس ہوں تو اچھا ہے۔" میر صاحب نے ہماری تائید کرتے ہوئے کہا۔ ہے تو بہت اچھا مگر اس میں ایک رکاوٹ ہے کہ ہم لوگ عورتوں سے علٰحدہ رہیں گے اس لئے کہ پردہ کی وجہ سے ہمارے اور آپ کے یہاں کی مستورات اور مرد کیونکر یکجا ہو سکتے ہیں" بھائی ایسے نازک وقت میں پردہ کا کیا سوال پردہ تو وہ کرے جس کو اس دنیا میں رہنا ہے" کہنے لگے "یہ ٹھیک ہے مگر ایسے موقع پر شرع کی

کی پابندی اور بھی زیادہ ضروری ہے۔" ہم پردہ کے سخت مخالفین میں سے تھے مگر اس وقت شرع کا نام سن کر لاجواب ہوگئے اور یہی طے پایا کہ اسوقت شرع کا نام سن کر لاجواب ہوگئے اور یہی طے پایا کہ اس وقت اپنے اپنے گھر میں اپنے اپنے بال بچوں کے ساتھ اللہ اللہ کریں۔

میر صاحب کے یہاں سے واپس آکر ہم کو دفتر جانا چاہیئے تھا مگر بیگم نے کہا "آج دفتر نہ جایئے درخواست بھیج دیجئے۔" ہم نے بھی مناسب سمجھا کہ دفتر نہ جائیں بلکہ اس تھوڑے سے وقت کو گھر ہی میں گزاریں مگر درخواست بھیجنے کی بھی ضرورت اس لئے محسوس نہ کی درخواست تو وہ بھیجے جس کو ملازمت کرنا ہو اور اس دفتر میں بھیجے جو آئندہ بھی دفتر رہنے والا ہو مگر آج کے بعد نہ تو ہم ملازم ہی رہ سکتے ہیں۔ اور نہ ہمارا دفتر ہی ہوگا۔ دفتر تو جب رہ سکتا ہے جب یہ دنیا رہے اور جب دنیا ہی ختم ہونے والی ہے تو کیسا دفتر اور کہاں کی ملازمت' لہذا ہم بغیر درخواست بھیجے ہوئے بیٹھ رہے اور بجائے دفتر کی چکی چلانے کے کلام خدا کی تلاوت سے اپنے مردہ ایمان میں روح پھونکنے لگے۔ ادھر بیگم اپنے دونوں بچوں کے ننھے ننھے ہاتھ اٹھوا کر دعائیں کرا رہی تھیں۔ اور ان کو طوطے کی طرح پڑھا رہی تھیں کہ "جل تو جلال تو صاحب کمال تو آئی بلا کو ٹال تو"

ہم نے تمام دن عبادت اور خدا کی یاد میں گزارا اور مغرب کی نماز سے فارغ ہو کر ہم سب ایک ہی کمرہ میں بلکہ ایک ہی چارپائی پر اس طرح خاموش بیٹھ گئے کہ اگر ننھے بچے ذرا دیر بھی خاموش ہو جاتے تو ہم دونوں میاں بیوی ایک دوسرے کی دل کی دھڑکن تک بخوبی سن سکتے تھے۔ رات کی خوفناک

تاریکی بڑھتی جاتی تھی اور اسی کے ساتھ ہمارے جسم میں خون منجمد ہوتا جاتا تھا۔ ہم نے آٹھ بجے کے قریب بیگم سے کہا: "بجائے یہاں بیٹھنے کے ہم کو چاہیئے کہ کسی ایسی جگہ بیٹھیں جہاں سے چاند نظر آسکے۔ چلو صحن میں کیوں نہ بیٹھیں۔" بیگم نے ہمارا گھٹنہ مضبوطی سے پکڑ کر کہا: "واہ بالکل آسمان کے نیچے جاکر بیٹھ جائیں" ہم نے کہا: "تو کیا چھت کے نیچے ہونے سے ہم آسمان کے اوپر ہیں اچھا خیر باہر نہ جاؤ مگر عشاء کی نماز تو پڑھ لیں۔" بیگم نے پوچھا "گرہن کے بجے پڑے گا؟" ہم نے کہا: "دس بجے کے قریب" بیگم نے کہا: "اچھا تو پہلے آپ جلدی سے پڑھ لیجئے پھر بچوں کو لے کر وظیفہ پڑھئے گا تو میں نماز پڑھ لوں گی مگر نماز کی چوکی چارپائی کے قریب بچھا لیجئے۔"

ہم نے بغیر کچھ جواب دئے ہوئے نماز پڑھنے کی چوکی چارپائی سے بالکل ملاکر نماز شروع کردی اور انتہائی کوشش کرتے رہے کہ قیامت کے خوف کے بجائے خدا کی محبت اپنے اوپر طاری کرکے نماز پڑھیں مگر یہ کوئی اپنے بس کی بات نہ تھی بہرحال گھبرا گھبرا کر کسی نہ کسی طرح گر پڑ کر نماز ادا کی اور تسبیح کھٹکھٹاتے ہوئے بچوں کے پاس آگئے۔ تاکہ بیگم بھی نماز پڑھ لیں۔ ہمارے آجانے کے بعد بیگم نے نماز شروع کردی اور ہم بچوں کو لئے ہوئے تسبیح پڑھتے رہے۔ بڑے صاحبزادے جو بڑی دیر سے نہایت خاموشی کے ساتھ ہمارا منہ دیکھ رہے تھے کہنے لگے: "تو کیا آپ کے اللہ اللہ کرنے سے قیامت بھاگ جائے گی؟" ہم نے تسبیح پڑھتے ہوئے گردن کے اشارہ سے کہا: "ہاں" وہ بولے "نہ بھاگے گی وہ تو آئے گی" ہم نے تسبیح پڑھتے ہوئے آنکھیں نکال کر اشارہ سے کہا کہ "دعا مانگو" وہ غریب کچھ سہم سا گیا اور

[illegible] [illegible] آیا۔
ہاتھ اٹھا کر جو اس کی سمجھ میں آیا دعائیں کرتا رہا یہاں تک کہ دعائیں مانگتے مانگتے سو گیا۔ چھوٹا بچہ پہلے ہی سے سو رہا تھا اور ہم تسبیح کے واسطے نہایت مستعدی سے اس طرح گنے میں مصروف تھے کہ گویا ؎

نہر پہ چل رہی ہے پنچکی

بیگم بھی نماز پڑھنے کے بعد ہمارے پاس ہی بیٹھی ہوئی تصویر ہی تصویر میں گویا خدا کے دربار میں حاضر تھیں اور اپنے گناہ بخشواتے پر اڑی ہوئی تھیں کہ گھڑیال نے گونج جانے والی آواز کے ساتھ آخری مرتبہ دس کا گھنٹہ بجا دیا اور ادھر ہمارا دم گھٹنا شروع ہوا۔ بیگم تو بالکل ایک بیجان مجسمہ بنی ہوئی بیٹھی تھیں مگر ہم کو یہ محسوس ہو رہا تھا کہ ہمارے دل کی دھڑکن ہم کو منگیر کی طرح متزلزل بنائے ہوئے ہے ابھی مشکل سے اس کیفیت کو دس منٹ گزرے ہوں گے کہ سڑک پر کسی نے کہا۔

"پڑ گیا چاند میں گرہن۔"

یہ آواز سنتا ہی تھا کہ بیگم اپنے بچوں کو کلیجہ سے چمٹا کر اور خود کو بلی کے شکار کئے ہوئے چوہے کی طرح دبوچ کر بیٹھ گئیں۔

"دیا کرو۔ دھرم کرو۔"

یہ آواز گویا صور تھی بیگم نے تھر تھر کانپنا شروع کیا اور ہمارے ہاتھ پیر اس طرح سرد ہو گئے کہ گویا اب ان میں جان ہی نہیں ہے یہاں تک کہ ٹھنڈا پسینہ بہنا شروع ہوا۔ "دیا کرو۔ دھرم کرو" کی دل ہلا دینے والی آوازیں برابر آ رہی تھیں اور ایک سے ایک بھیانک آواز والا مہتر یہ صدائیں بلند کر رہا تھا۔ دس سے گیارہ بجے اور بارہ بجے سے ایک مگر نہ قیامت آئی نہ دل ٹھہرا، چاند گرہن میں تھا اور ہم موت کے منہ میں مع اہل و عیال (سلسلہ صفحہ پر)

"قیامت" ص ۷ کا سلسلہ

اگر کہیں کمٹ سے بھی کچھ ہوتا تھا تو ہم یہی سمجھ کر الجھن پڑتے تھے کہ ستارہ چاند سے ٹکرا گیا مگر چونکہ خدا نے یہ دیکھ لیا کہ ابھی اس کی دنیا میں اس سے ڈرنے والے بندوں کی کوئی کمی نہیں ہے لہٰذا ستارہ کو چاند سے ٹکرانے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ نتیجہ یہی ہوا کہ چاند گرہن سے نکل گیا اور ہم چاند کے صاف ہو جانے کے بعد کچھ دیر قیامت کا انتظار کر کے سو رہے۔ البتہ صبح جب بیگم نے نماز کے لئے اٹھانا چاہا تو ہم نے یہ کہہ کر لحاف میں منہ چھپا کر کروٹ بدل لی کہ قضا پڑھ لیں گے۔

علی احسن جلیلی

اُردو تنقید۔ ایک جائزہ

تنقید کا مفہوم محدود معنوں میں کسی ادب پارے کی خوبیوں اور کمزوریوں کا مطالعہ ہے وسیع معنوں میں اس میں تنقید کے اصول قائم کرنا اور ان اصولوں کو تنقید میں استعمال کرنا بھی شامل ہے۔ ارسطو پہلا شخص ہے جس نے باقاعدہ تنقید کی بنیاد ڈال کر تنقید کو فن و سائنس کی حیثیت دی۔ رومانی تنقید کا آغاز جرمنی میں ہوا۔ دیکلین اور بنگ، کولرج، سنت بیو، بلیک، ورڈسورتھ اور شیلے نے رومانی تنقید کو قائم کرنے میں بڑا حصہ لیا۔ بعد ازاں یہ سلسلہ جائی نس، آسکر وائلڈ اور والٹر پیٹر سے ہوتا ہوا جدید دور میں امریکی نقاد اسپنگارن تک پہنچتا ہے پھر ایلیٹ اور رایذرا پاؤنڈ کی آوازیں بھی اس میں شامل ہو جاتی ہیں۔

اُردو میں تنقید مغرب کی دین ہے، مغربی ادب ہی نے ہمیں اس کے اصول وضع کروا دئے۔ اردو کے قدیم دور میں تنقید ادب کا کوئی جدا شعبہ نہ تھا۔ صرف شعراء کے تذکروں میں اس کے خد و خال ملتے ہیں۔ میر تقی میر کی "نکات الشعرا" اردو شاعروں کا پہلا تذکرہ ہے لیکن اس میں تنقیدی مواد بہت کم ہے جو کچھ ہے وہ محض برسبیل تذکرہ ہے۔ مصحفی نے اپنے تذکرہ "ہندی گویاں" میں شعراء کے کلام پر صرف اپنی رائے دی ہے۔ اس کی تنقیدی حیثیت نہ ہونے کے برابر ہے۔ اسی طرح میر علی لطف کی "گلشن ہند" اور شیفتہ کی "گلشن بے خار" شاعری پر تنقید کم اور زیادہ شاعر کی شخصیت کی ترجمان ہیں۔

محمد حسین آزاد پہلے شخص ہیں جنہوں نے اردو تذکرہ نگاری کی اصلاح کی طرف قدم اٹھایا اور تنقید نگاری کی روایت قائم کی۔ ان کی آب حیات پہلی شعوری کوشش کہلانے کی مستحق ہے۔ یہ اپنی خامیوں کے باوجود یہ تصنیف مورخین ادب کے لئے آج بھی مشعل راہ بنی ہوئی ہے۔ حالی نے اس فن کو ایک قدم آگے بڑھایا اور جدید تنقید کے بانی و مجتہد کہلائے۔ نئی تنقید کی ابتدا انہی سے ہوتی ہے۔ ان سے پہلے تذکرہ نگاری یا تنقید زبان و محاورات کی صحت و اسناد تک محدود تھی۔ حالی پہلے تنقید نگار ہیں جنہوں نے سائنٹفک رجحان کو پیش نظر رکھا اور اردو ادب کو شاعری کے معیار سے آشنا کیا "مقدمہ شعر و شاعری" اردو میں تنقید کی اولین باضابطہ کتاب الاصول سمجھی جاتی ہے۔ مولانا شبلی حالی سے زیادہ ذہین اور ان سے زیادہ مغرب سے آشنا تھے۔ انھوں نے تنقید میں خاص کارنامے انجام دیئے۔ "شعر العجم" اور "موازنہ انیس و دبیر" ان کی اہم تنقیدی تصانیف ہیں۔ اردو تنقید میں شبلی کا رویہ اہل نقد و نظر کے لئے موجب بصیرت ہے۔ آزاد۔ حالی اور شبلی نے انگریزی سے محدود واقفیت کے باوجود ادب کے مغربی نظریات سے استفادہ کرنے کی کوشش کی جن میں کلاسیکی اور رومانی دونوں طرح کے تصورات شامل تھے۔

بعد میں آنے والوں نے انہی تینوں کو بنیاد بنا کر تنقید کی منزلیں طے کیں۔ ابتدا کے ایسے تنقید نگاروں میں امداد امام، وحیدالدین سلیم اور مہدی افادی قابل ذکر ہیں۔ امداد امام کی "کاشف الحقائق" تنقیدی حیثیت سے بڑی قابل قدر ہے۔ ان کے یہاں مشرقی و مغربی تنقید کا سنگم ملتا ہے وہ حالی سے زیادہ مغرب سے مستفید تھے۔ وحیدالدین سلیم کے تنقیدی مضامین (افادات سلیم) تعداد میں زیادہ نہیں پھر بھی انہیں نقادوں کی صف میں

جگہ ملتی ہے۔ وہ مغربی طرز سے متاثر ضرور ہیں لیکن شرقی روایات کو مجروح نہیں کیا ہے۔ مہدی افادی اپنے زمانے کے اچھے تنقید نگار تھے انھوں نے تنقید پر کوئی مستقل کتاب تو نہیں لکھی لیکن جو کچھ لکھا وہ تنقیدی ادب میں اضافہ ہے۔ ان کے تنقیدی مضامین افادات مہدی کے نام سے چھپ چکے ہیں

ان کے متبعین کے یہاں تحقیق اور تنقید ملے جلے انداز میں آگے بڑھتی ہے۔ اس کاروان میں پہلا نام مولوی عبدالحق کا ہے وہ محقق ہونے کے علاوہ نقاد بھی ہیں۔ تنقید پر ان کی کوئی مستقل تصنیف نہیں لیکن ان کے تنقیدی اشارات ان کے تبصروں، مقدمات اور مختلف مضامین میں ملتے ہیں۔ ان کی تنقید کا انداز سائنٹیفک ہے۔ سید مسعود حسن ادیب نے تنقید پر ایک مستقل کتاب "ہماری شاعری" لکھی۔ ان کی تنقید میں مشرقی رنگ نمایاں ہے۔ پروفیسر حامد حسن قادری اردو زبان کے مورخ کی حیثیت سے مشہور ہیں لیکن ان کی کتابوں "تاریخ و تنقید ادبیات" "نقد و نظر" اور "ماثر عجم" میں ان کے تنقیدی نظریات جا بجا بکھرے پڑے ہیں۔ وہ قدیم رنگ کو فوقیت دیتے ہیں۔ مولانا سلیمان ندوی عالم بھی تھے اور محقق بھی۔ ان کے تحقیقی کاموں میں تنقید برائے نام ملتی ہے لیکن جو تنقیدی مضامین انھوں نے لکھے ہیں ان میں ان کے تنقیدی خیالات ملتے ہیں ان کی تعلید میں شبلی کا رنگ نمایاں ہے۔

عبدالماجد دریابادی کا شمار بھی محققین میں ہوتا ہے۔ ان کے تنقیدی مضامین "مقالات ماجد" کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ تنقید کے ساتھ مذہبی غلو ہر جگہ نمایاں ہے۔ محی الدین قادری زور نے مغربی تنقید سے استفادہ کر کے "روح تنقید" کے نام تنقید پر جو کتاب لکھی ہے وہ

اپنی نوعیت کی پہلی ادبی تصنیف ہے۔ "تنقیدی مقالات" اور "اردو کے اسالیب بیان" ان کے دیگر ادبی تصانیف ہیں۔ عبدالسلام ندوی نے اپنی "شعر الہند" شعر العجم کی تقلید میں لکھی۔ لیکن شبلی کی تنقید کا اجتہادی رنگ ان کے یہاں نہیں ملتا۔ ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری کا مقدمہ دیوان غالب تنقید سے زیادہ تخلیقی ادب کی حیثیت رکھتا ہے تاہم یہ تصنیف مغربی طریقہ پہ تنقید کا ایک اور نمونہ ہے۔ تنقید میں نیاز فتحپوری کا نام قابل توجہ ہے۔ "انتقادیات" "مالہ وماعلیہ" ان کے تنقیدی مضامین کے اہم مجموعے ہیں۔ نیاز کا انداز تنقید رومانی اور تاثراتی ہے۔ طبیعت میں جدت پسندی ہے اور اختراعی ذہن کے مالک ہیں۔ اقبال مفکر اور شاعر تھے انھوں نے براہ راست تنقید نہیں کی مگر ان کے تنقیدی خیالات ان کی نظم ونثر میں جابجا موجود ہیں۔

مذکرہ بالا ناقدین کی اکثریت ایسی ہے جن کی جدید تنقید زیادہ تر قدیم مشرقی تنقید کا اثر نمایاں ہے ان لوگوں نے چونکہ دوسروں کی مدد سے مغربی خیالات پیش کئے اس لئے ان کی تنقیدوں میں وہ گہرائی نہیں پائی جاتی جو مغربی نقادوں کا وصف ہے۔ پھر وقت کے ساتھ اردو تنقید میں تبدیلیاں آتی گئیں تنقید کے دور جدید کا آغاز ۱۹۳۵ء سے ہوتا ہے جب ترقی پسند تحریک نے زور پکڑا اور ادب برائے زندگی کے نظریے کو مقبولیت حاصل ہوگئی۔ اس تحریک کے تحت جدید ادب میں سماجیات اور اقتصادیات بھی اہم موضوع بن کر داخل ہوگئے۔ اسی زمانے میں کمیونزم اور سوشلزم کے نظریات سامنے آئے۔ اس کا اثر ادب وتنقید پر پڑا اور مارکسی انداز کی تنقید کا بازار گرم ہوگیا ساتھ ہی فرائڈ ینگ اور دیگر ماہرین تحلیل نفسی کے نظریات بھی عام ہوئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تنقید خالصاً اصولی عقلی بلکہ بڑی حد تک سائنسی ضابطوں کی تابع ہوگئی

آج دورِ جدید کے عام نقاد اسی راستے پر گامزن ہیں۔

سجاد ظہیر پہلے نقاد ہیں جن کے تنقیدی مضامین مارکسی نظریہ تنقید کے آئینہ دار ہیں۔ انھوں نے تنقید پر کوئی مستقل کتاب تصنیف نہیں کی۔ لیکن جو مضامین لکھے انھوں نے تنقید کے اعتبار کو بہت بڑھایا۔ ڈاکٹر علیم نے تنقید پر چند مضامین لکھے اور تنقید کے بنیادی اصولوں پر بحث کی۔ نظریاتی تنقید کی بنیاد پر انھیں ترقی پسند تنقید نگاروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اختر حسین رائے پوری بھی ترقی پسند ہیں ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ "ادب و انقلاب" کے نام سے چھپا ہے۔ ان کی تنقیدوں پر مارکسی اور اشتراکی نقطۂ نظر کی چھاپ ہے۔ سید احتشام حسین متوازن سوجھ بوجھ کے ناقد ہیں۔ انھوں نے بہت لکھا۔ "تنقیدی جائزے" "روایت اور بغاوت" "ادب اور سماج" اور ان کے تنقیدی مضامین کے مجموعے ہیں۔ احتشام کے یہاں بھی مارکسی اور اشتراکی نقطۂ نظر نمایاں ہے۔ کلیم الدین احمد نے بھی اردو تنقید پر تین کارآمد کتابیں لکھی ہیں "اردو شاعری پر ایک نظر" "اردو تنقید پر ایک نظر" اور "فنِ داستان گوئی" ان کے یہاں تنقید کا مغربی انداز بہت گہرا ہے۔ ہر چیز کو مغرب کے معیار سے جانچنے کی کوشش کی ہے۔ مجنوں گورکھپوری فن برائے زندگی کے اولین باغیوں میں تھے۔ ان کی کتاب "تنقیدی حاشیے" کے نام سے شائع ہوئی۔ ان کے یہاں تاثراتی تنقید کے ساتھ ساتھ سائنٹیفک تنقید بھی جا بجا نمایاں ہے۔ محمد حسن عسکری مغربی ادیبوں بالخصوص جیمس جوائس اور ڈی۔ ایچ لارنس سے بہت متاثر ہیں۔ ان کی رہنمائی میں اردو میں جمالیاتی یا ہئیتی تنقید کی بنا پڑی۔ "انسان اور آدمی" ان کے تنقیدات کا مجموعہ ہے۔

آل احمد سرور نے اردو تنقید کو مغربی طرز و آہنگ بخشا۔ تاثراتی اور

سائنٹفک تحقیق کے درمیان ایک توازن قائم کیا۔ ان کی تنقید میں ان کے مزاج کی رومانیت کو بڑا دخل ہے۔ پروفیسر مسعود حسین خاں نے تنقید کو ایک نیا زاویہ نظر دیا۔ ان کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے پہلی بار لسانی نقطہ نظر سے اسلوب شناسی اور صوتیاتی نقطہ نظر سے تنقید شعر کے اصول پیش کئے۔ جدید نقادوں میں وارث علوی تاثراتی تنقید کے علمبرداروں میں ہیں ان کے یہاں قدیم روایات کا شعور بھی موجود ہے اور جدیدیت کے نئے طرز تنقید کی کاٹ بھی۔ گوپی چند نارنگ نقاد ہونے کے علاوہ لسانیات سے بھی تعلق رکھتے ہیں۔ اپنے تنقیدی مطالعوں میں انھوں نے صوتیات اور اسلوبیات کو بنیاد بنا لیا ہے۔ ڈاکٹر قمر رئیس نے اپنے آپ کو افسانوی ادب کی تنقید کے لئے بڑی حد تک وقف کر لیا ہے۔ ظ۔ انصاری کے تنقیدی مضامین کا ذکر بھی یہاں ضروری ہے۔ غالب شناسی کے علاوہ تنقیدی کتابچوں کے ذریعہ انھوں نے اردو کو آفاقی ادب سے بہتر طور پر متعارف کرانے کا سلسلہ جاری رکھا ہے۔ جدید ہیئتی تنقید کو اردو میں ایک مسلمہ دبستان کی حیثیت سے شمس الرحمن فاروقی نے اہم حصہ لیا فاروقی نے ہمعصر مغربی ادب اور مغربی تحریکات کو اردو سے روشناس کرتے ہوئے جدید رجحانات کو فروغ دیا۔ وزیر آغا نے اپنی تصنیف اردو شاعری کا مزاج میں تحلیلی سطح پر اجتماعی لاشعور اور نسلی یادداشت کی کارفرمائیوں کا سراغ لگایا ہے۔ "نظم جدید کی کروٹیں" ان کی دوسری قابل ذکر کتاب ہے۔ ڈاکٹر عقیل کی دو تنقیدی تصانیف حال ہی میں شائع ہوئی ہیں" اردو میں علامت نگاری" اور مختلف تنقیدی مضامین کا ایک مجموعہ۔

ان کے علاوہ بہت سے لکھنے والے اور بھی ہیں جن کا تنقیدی کام اردو نقد و نظر کی توسیع کا باعث بنا ہوا ہے۔ ۱۹۴۷ء کے قریب اور اس کے بعد جن

نقادوں نے اردو ادب کے مسائل کے بارے میں ایک خاص تحرک پیدا کیا ان کی نگارشات نے اردو تنقید پر گہرا اثر ڈالا ہے ان ناقدوں اور ان کے تصانیف کی تعداد اچھی خاصی ہے۔ مثلاً احسن فاروقی کی "مرثیہ کا فن اور انیس کی مرثیہ گوئی" عزیز احمد کی "ترقی پسند ادب" ڈاکٹر محمد حسن کی "اردو میں رومانیت کی تحریک" احتشام حسین کی "ادب اور سماج" اور "تنقیدی جائزے" اسلوب احمد انصاری کی "مجاز کی شاعری" ممتاز حسین کی "ادبی مسائل اور نئی قدریں" آفتاب احمد کی "غالب کی شاعری" ڈاکٹر یوسف حسین کی "اردو غزل" اور "غالب اور آہنگ غالب" سردار جعفری کی "ترقی پسند ادب" وقار عظیم کی "ہماری داستانیں" اور "ناول" ڈاکٹر ابو اللیث کی "دبستان لکھنؤ" اور "غزل اور متغزلین" عبادت بریلوی کی "تنقیدی زاویے" اور "غزل اور مطالعہ غزل" خلیل الرحمن اعظمی کی "فکر و فن" افتخار جالب کی "نئی شاعری" پروفیسر جیلانی کامران کی "نئی نظم کے تقاضے" اور "تنقید کا پس منظر" اعجاز حسین کی "ادبی رجحانات" اور سلیم احمد کی "نئی نظم اور پورا آدمی" وغیرہ ان کے ساتھ کچھ اور ناموں کا بھی اضافہ کیا جا سکتا ہے مثلاً ڈاکٹر وحید قریشی۔ ظ۔ انصاری۔ ڈاکٹر سید عبداللہ۔ ڈاکٹر گیان چند۔ مغنی تبسم، شمیم احمد، ریاض احمد، بلراج کومل، خواجہ احمد فاروقی، اطہر پرویز، ممتاز شیریں، عتیق حنفی، عنوان چشتی، شمس الرحمن فاروقی، انتظار حسین، فرمان فتحپوری، ڈاکٹر وزیر آغا، شارب ردولوی۔ نورالحسن ہاشمی، ڈاکٹر قمر رئیس اور ڈاکٹر خورشید الاسلام وغیرہ

مجموعی طور پر اردو تنقید نے نہایت تیزی کے ساتھ ایک طویل سفر طے کیا ہے اردو تنقید کا سب سے اہم رویہ یہی ہے کہ اس نے اپنے دامن میں ان تمام رجحانات کو سمو لیا جن سے مختلف تنقیدی نظریات کی تکمیل ہوتی نظر آتی ہے ان نظریات کے سائے میں تنقید کے نئے انداز پیدا ہوتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ گزشتہ ربع صدی میں اردو تنقید کا ارتقاء، کافی حوصلہ افزا رہا ہے جس نے ہمارے ادب پر مثبت اور صحت بخش اثرات ڈالے ہیں۔

غزلیں

ڈاکٹر اسدؔ انصاری

بخشی گئی ہے چشمِ حقیقت نگر مجھے
ملتی ہے روز دعوتِ ذوقِ نظر مجھے

جلووں کے جو فریب میں آیا نہ ہو کبھی
ایسا نظر نہ آیا کوئی دیدہ ور مجھے

پیشِ نگاہ رہتے ہیں نظارے تو بہ تو
حاصل یہ فیضِ دل ہے، شعورِ نظر مجھے

چہرہ ہے میرا آئینہ دارِ جمالِ حسن
اپنے کو دیکھ لیتے ہیں وہ دیکھ کر مجھے

بن جاؤں میں نہ مجرمِ نازِ خود آگہی !
دیکھیں یہ التفات نہ اہلِ نظر مجھے

کل تک سنا رہا تھا زمانے کو اپنا حال
یہ کیا ہوا کہ اب نہیں اپنی خبر مجھے

بڑھتے گئے اسدؔ میری منزل کے فاصلے
اک رہنما نیا ملا، ہر موڑ پر مجھے

ماجدؔ وفائی

ایک مدت سے جو ہو احساس کی منزل میں تم
جلوہ آرا ہو مرے ارمان کی محفل میں تم

حُسن کی رنگینیاں ہیں اعتبارِ شوق تک
لالہ و گُل میں ستاروں میں مہِ کامل میں تم

آتی ہے خوشبو تمہاری سانس جب لیتا ہوں میں
میں سمجھتا ہوں کہ ہو ہر وقت میرے دل میں تم

جلوہ گہہ میں دیکھ سکتی ہیں فقط نظریں مری
کیا خبر ان کو کہ پوشیدہ ہو کس محفل میں تم

اک تمہارے واسطے میں ہوں سراپا آئینہ
میری نظروں میں ہو تم احساس میں تم دل میں تم

رات دن کیوں تم کو ماجدؔ دھن ہے وصلِ یار کی
مبتلا ہو اک خیالِ فاسد و باطل میں تم

ڈاکٹر رحمان ساتر

جواب

اس خط نے اسے ادھر اکے رکھ دیا تھا اس کے جی میں آئی کہ یا تو وہ زوردار قہقہے لگائے یا پھر چلا چلا کر رونا شروع کر دے اس کے اندر عجیب سی ہلچل تھی۔ کاغذ پر موجود مختصر سی تحریر نے اسے سنسنا دیا تھا۔ یہ تحریر یوں تو ندامت کا ایک سلیقہ مند اظہار تھی مگر اس نے محسوس کیا کہ یہ تو پھولوں کے شہر میں اس کے داخلے پر ہمیشہ کے لئے امتناع کا حکم نامہ تھی۔ یہ تحریر یوں تو ایک اطلاع کا درجہ رکھتی تھی مگر درحقیقت کسی عدالت کی طرف سے جاری کردہ ایسی قرقی کی نوعیت رکھتی تھی کہ " اٹھو اور تن پر موجود کپڑوں میں اس عمارت سے نکل جاؤ کہ اب تمہاری تمام جائیداد منقولہ اور غیر منقولہ ضبط کر لی جاتی ہے "۔ اس نے ایک بھرپور نظر اپنے اس جانثار دوست سہیل پر ڈالی جو ہوٹل " مڈلینڈ " کی ایک میز پر اس کے بالمقابل کرسی پر بیٹھا اس کی حرکات و سکنات کا بغور مشاہدہ کر رہا تھا۔ شاید سہیل یہ سوچ رہا تھا کہ دیکھیں اب یہ حضرت کیا ردِ عمل دیتے ہیں کیوں کہ ابھی کچھ دیر پہلے سہیل نے بھی اس مختصر سے خط کو پڑھا تھا وہ سات برسوں پر پھیلی ہوئی اس داستان کے ہر واقعہ سے واقف تھا، سات موسموں کے پھیلنے اور سمٹنے سے عبارت اس کتاب کے ہر پتے پر موجود ہر سطر اور ہر عبارت کے بین السطور موجود و نا موجود کرب و لذت کا رازدار تھا۔ گو کہ سہیل ذاتی طور پر دوسری شادی کا بھی قائل نہیں تھا۔

اور نہ اسے پسند کرتا تھا کہ کوئی شادی شدہ مرد کسی اور عورت میں دلچسپی لے لیکن نعیم اور ناجیہ کی حد تک محض اس لئے کہ حالات کا انھیں "آشیرواد" حاصل تھا، اس نے مفاہمت کر لی تھی۔ دونوں کے آغاز سے لے کر "نقطۂ عروج" تک ہر اچھے اور نازک موڑ پر سہیل نے ان کا ساتھ دیا تھا، اب جب کہ ناجیہ نے اپنے چھوٹے سے لیٹر پیاڈ پر چند سطور میں اپنے نئے قدم کا انکشاف کر دیا تھا تو اُسے ناجیہ سے نفرت سی ہو گئی تھی۔ ناجیہ ہی کیا، اُسے اپنی بیوی کے علاوہ ہر عورت سے نفرت ہو گئی تھی۔ جب ناجیہ جیسی اعلیٰ تعلیم یافتہ ذمہ دار آفیسر اور ہر طرح سے خود مختار عورت اتنا بڑا فریب کر سکتی ہے تو ایک ایسی گھریلو لڑکی سے کیا شکایت کی جا سکتی ہے جو اپنے سرپرستوں پر منحصر ہو اور جس کی قسمت کا فیصلہ والدین ہی کرتے ہوں یا اور کوئی ذمہ دار، سہیل نے نعیم کو دیکھا جو سگریٹ کے بڑے بڑے کش لیتا ہوا سڑک پر رواں دواں زندگی کو دیکھ رہا تھا یا کچھ سوچ رہا تھا، اس نے نعیم کے بائیں شانے پر ہاتھ رکھا اور وہ چونک پڑا۔

"جواب دے رہے ہیں نا آپ؟" اس نے بڑی متانت سے پوچھا۔

"جواب...؟" نعیم نے کھوئے کھوئے اور استفہامیہ انداز میں کہا۔

"جی ہاں جواب جو مبارک باد نامہ بھی ہو سکتا ہے۔ آخر سات سال کی رفاقت ٹوٹی ہے، پل دو پل کی بات نہیں، لوگ پل دو پل کے ساتھ کو بھی تاریخ بنا دیتے ہیں۔" سہیل نے گویا مشورہ دیا گو کہ وہ بھی دکھی تھا اور نعیم کی حرماں نصیبی میں برابر کا شریک تھا لیکن اس کے باوجود وہ نعیم کو تلخ نوائی کا موقع بھی دینا نہیں چاہتا تھا۔ وہ خود بھی ناجیہ کو لکھنے ہی والا تھا مگر یہ بھی دیکھنے کا خواہشمند تھا کہ آخر قلم کا یہ دھنی بے شمار لوگوں کا یہ محبوب کہانی کار

وادیب جواب تک جگ بیتی کی کئی داستانیں قلم بند کر چکا ہے جو اپنی لفاظی اور علمیت کی وجہ سے رنگین کو سنگین اور ریگ زار کو مرغزار بنا دیا ہے جو اتنی متاثر کن تحریریں ادب کو دے چکا ہے کہ جنھیں پڑھتے ہوئے لوگ روتے روتے کھل کھلا کر ہنس پڑتے یا پھر ہنستے ہنستے آبدیدہ ہو جاتے۔ جب وہ آج آپ بیتی کے سفر میں ایک ایسے موڑ پر پہنچ چکا ہے کہ آبلہ پائی مزید سفر میں رکاوٹ بن گئی ہے۔ اندرون اتنا ٹوٹ گیا ہے کہ اب مزید ٹوٹ پھوٹ کی بظاہر گنجائش نہیں رہی تو ایسے میں یہ جو بھی جواب ہوگا ناجیہ کے لئے ایک تازیانہ ثابت ہوگا اور سہیل یہی چاہتا تھا کہ ناجیہ کو اپنے کئے کی بھرپور نہ سہی بہرحال سزا تو ملے یہ طے تھا کہ نعیم کو اس اطلاع نے غیر معمولی طور پر نڈھال کر کے رکھ دیا تھا اس کی روح گھائل ہو چکی تھی تبھی تو اس نے ناجیہ کا خط پڑھتے ہی "محبوبہ اور کتیا" کو پالنے کی بات کر کے وفاداری کے جذبے کو کُتیا کی میراث قرار دیا تھا۔ جانے کیوں سہیل کو کرشن چندر کی کہانی "دو لاکھ کی بوتل" یاد آ گئی جس میں کرشن چندر نے کہا تھا کہ عورتیں کبھی وفادار نہیں ہوتیں، عورتیں وفادار رکھی جاتی ہیں اور یہ کام صرف مرد کر سکتا ہے۔"

"سنو عارف! نعیم نے "مڈلینڈ" کے بیرے کو آواز دی۔

"دو میں ایک اسٹرانگ (تلخ ترین) کافی لاؤ۔"

"سہیل! نعیم نے درست ہی مشورہ دیا ہے ہمیں جواب تو دینا چاہئے تو خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو۔"

عارف نے کافی سرو کر دی تو اس نے اس کے ہلکے ہلکے گھونٹ لیتے ہوئے بڑے پُرخیال انداز میں سہیل کو دیکھا اور کہا:

" پیارے سہیل! تم تو مجھ سے زیادہ سنٹی مینٹل اور اموشنل نظر آتے ہو لگتا ہے کہ تمہاری پیاری پیاری ناجیہ باجی نے یہ قدم اُٹھا کر میرے ساتھ ساتھ تمہارے نروس سسٹم کو بھی بریک ڈاؤن کر دیا ہے۔ !"

" آپ جواب تو لکھیئے نا نعیم بھائی تاکہ اس موضوع کو ختم کیا جا سکے۔"

سہیل نے کہا مگر اس کا انداز ہ ایسا تھا کہ جیسے وہ مشورہ نہیں دے رہا ہو بلکہ عاجزانہ درخواست کر رہا ہو۔ غالباً وہ اس نتیجہ پر پہنچ چکا تھا کہ اگر نعیم ناجیہ کے نام خط لکھ دے تو اس کے دل کی بھڑاس نکل جائے گی اور اس طرح ممکن ہے کہ غبارِ خاطر کے تصفیہ کے بعد وہ نارمل ہو جائے۔ " سہیل میری جان! نعیم نے مسکراتے ہوئے کہا یہ اور بات تھی کہ اس کی مسکراہٹ ہزاروں طنزوں اور بے شمار استہزاؤں سے عبارت تھی۔

" تم سمجھتے ہو کہ اس طرح ہم موضوع کو ختم کر سکتے ہیں یا بدل سکتے ہیں، تو تم غلطی پر ہو' جسمانی آزار کا علاج ممکن ہے لیکن دکھی روح کا معالجہ کوئی بھی نہیں کر سکتا' جسم مجروح ہو تو زخم مندمل ہو ہی جاتے ہیں' لیکن جب روح پر زخم آئیں تو کبھی بھی نہیں بھرتے تم سمجھ سکتے ہو کہ یہ وار میری روح پر ہوا ہے اور اب میری آتما شکست میں پڑی ہوئی ہے سہیل! ایک جواب کی کیا بات ہے میں ہزار جواب بھی دے دوں تب بھی نارمل نہیں ہو سکتا۔"

" دیکھیے! آج آپ خود اپنے ایک نظریہ کی نفی کر رہے ہیں' آپ ہر وقت کہتے ہی رہتے ہیں کہ وقت سب سے بڑا مرہم ہے جو بڑے سے بڑے زخم کو بھی مندمل کر دیتا ہے۔ وقت بیت جاتا ہے اور آدمی بڑے سے بڑے حادثے کو بھول جاتا ہے جیسے وہ کبھی ہوا ہی نہ ہو۔" سہیل نے گویا اسے یاد دلایا۔

" سہیل!" نعیم نے بڑے نپے تلے لہجے میں کہا۔" پہلے تو یہ میرا نظریہ نہیں

کو ہیں مگر وقت نسل در نسل ان کی آتماؤں پر لگے زخم نہیں بھر سکا۔ سوال یہ نہیں ہے کہ کسی نے اپنے سفرِ حیات کے لئے ایک نیا ہم سفر چُن لیا بلکہ سوال یہ ہے کہ کسی نے میرے ساتھ وشواس گھات کیوں کیا؟ کیوں میرے اعتماد کو پارہ پارہ کر دیا؟ کیوں ایک فیصلے کے ذریعہ میرے وجود کو ادھرا کے رکھ دیا کیوں کیوں آخر کیوں؟ نعیم رک گیا۔ نئی سگریٹ جلائی اور اس کا ایک بڑا کش لے کر اس انداز میں اس نے سہیل کو دیکھا جیسے کہہ رہا ہو کہ کیا تم کر سکتے ہو تاویل لا سکتے ہو استدلال اور کر سکتے ہو وکالت؟

سہیل ایک بے نامی خلش کا شکار ہوتے ہوئے بھی ایک زبردست ذہنی کشمکش سے نبرد آزما ہوتے ہوئے بھی نعیم کے مقابلے میں زیادہ پُرسکون اور زیادہ غیر جذباتی تھا۔

"معاف کیجئے گا نعیم بھائی! یقیناً آپ کا مطالعہ بڑا وسیع اور آپ کے تجربات و مشاہدات کم مثال ہیں۔ مگر اس کے باوجود آج میں محسوس کر رہا ہوں کہ آپ چونکہ شدید ہیجانی کیفیت کے شکار ہیں اور آپ کو روحانی صدمہ ہوا ہے اس لئے آپ کی گفتگو مدلل نہیں ہے یا تو آپ نے وقت پر روشنی ڈالتے ہوئے عظیم روحانی ذوات کے حوالے دیئے۔ مسلّمہ تاریخی حقائق کو سامنے لایا اور پھر آفاقی انداز میں بات کرتے کرتے محض اپنے ساتھ ہوئی ایک واردات کو آفاقی اساطیری کرداروں سے ملا دیا۔ یہ بھی میری نظر میں خود پسندی اور تعلّی کی بات ہے کہ آپ زندہ تاریخ کر داروں [illegible] کا ایک عجیب نامانوس تقابل کر رہے ہیں" سہیل نے بڑے ٹھہراؤ کے ساتھ کہا۔

"[illegible] افسوس کہ تم مفہوم نہ سمجھ سکے۔ میری خود اعتمادی کو

ہے، بلکہ ایک مشہور کہاوت ہے، میں اس وقت کسی مسلّمہ نظریہ یا اصول کی تکذیب و نفی نہیں کرنا چاہتا۔ مگر کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ وقت کو اپنے عمل کے لئے اپنے اثر کے لئے بھی وقت چاہیئے جو ایک ثانیہ یا ایک ساعت کو محیط نہیں ہوتا بلکہ وہ غیر معین ہوتا ہے۔ وقت یقیناً اندمال کرتا ہے مگر اس کیلئے کبھی کبھی صدیاں درکار ہوتی ہیں اور گاہ گاہے صدیاں بھی بیت جاتی ہیں مگر زخم بھی رستے رہتے ہیں۔ افراد و نفوس کے مابین خود پسندی اور اصول کی جنگ چھڑتی ہے تو ہمارا پورا دنیاوی نظام اس کا نتیجہ در نتیجہ اور عمل در عمل بن کر رہ جاتا ہے۔ ایک فرد کو ایک فرد سمجھنا ہی سب سے بڑی غلطی ہے۔ بھیانک غلطی۔ کیوں کہ ہر فرد اس سے بحث نہیں وہ اچھا ہے یا بُرا، ایک لامتناہی کائناتی زنجیر کی کڑی ہوتا ہے۔ کل کا کوئی ایک نفس آج کروڑوں افراد کا روحانی پیشوا ہے اور اسی طرح کل کا کوئی ایک فرد آج لاکھوں افراد کیلئے ہدف ملامت و لعنت ہے کیا تم نہیں دیکھتے کہ ہر سال کروڑوں لوگ راون کے پتلوں کو جلا کر خیر و شر کی جنگ میں نیکی کی فتح کا جشن مناتے ہیں، کیا تم نہیں دیکھتے کہ ہر سال کروڑوں افراد حسینؓ کی شہادت پر ماتم کر کے یزید پر نفرت و حقارت اور ملامت و مذمت کا سلسلہ دراز کرتے ہیں صدیاں ہی نہیں کئی یگ بیت گئے لیکن وقت نہ رام کے نام لیواؤں کے زخم بھر سکا اور نہ حسینؓ کے ماتم داروں کی ارواح کو سکون دے سکا۔ نہیں!

سوال یہ نہیں ہے کہ کسی تاج دار نے 184 برس اُدھر محض اپنی عملداری کے استحکام کی خاطر کاویری کے لخت جگر کے ساتھ وفا نہیں کی اور اسے شہید ہونا پڑا بلکہ سوال یہ ہے کہ آج بھی کاویری کی آغوش میں پلنے والے گوداوری اور موسیٰ کے دامن میں جینے والوں کو غدّار کیوں کہتے ہیں۔ دو صدیاں بیتنے

تم نے خود پسندی کہہ دیا، میرے تاثر کو تعلّی سے تعبیر کر دیا۔ کون سی دُنیا کی بات کر رہے ہو تم۔ دو ہزار سال اُدھر کی یا پانچ ہزار سال پہلے کی۔ جانِ من! آج کا ہر فرد کہیں بھی رہتا ہو آفاقی ہے۔ قابیل بڑا بھائی تھا۔ اس کی قربانی قبول نہیں ہوئی کیوں کہ اس کے من میں کھوٹ تھا۔ اس نے اپنے چھوٹے بھائی ہابیل کو ہلاک کر ڈالا۔ قابیل حسد اور جلن کے جذبوں میں اندھا ہو چکا تھا۔ بجھے اور ہم سب کو ہابیل عزیز تر ہے اور ہم سب قابیل سے نفرت کرتے ہیں۔ یہ یگوں پہلے کی بات ہے اور ہماری یہ ہابیل پسندی اور قابیل بیزاری خود ہمارے آفاقی ہونے پر دال ہے۔ ویتنام میں امریکی خار زادے بربریت کر گزرتے ہیں تو ہم آب دیدہ ہو جاتے ہیں چیکوسلواکیہ میں روس کے عسکری دبابے سڑکوں پر گشت کرتے ہیں تو ہمارے سینوں میں درد ہونے لگتا ہے۔ افغانستان میں روسی افواج در آتی ہیں تو ہم فکر مند ہو جاتے ہیں۔ ہزاروں میل دور لومبا کو ہلاک کر دیا جاتا ہے تو ہمیں لگتا ہے کہ ہمیں صلیب پر کھینچ دیا گیا ہے۔ شاہ فیصل کے جسم و جان کے رشتے کو ایک جنونی ختم کر دیتا ہے تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ گندم بادرڈ کے ایک سودائی نے ہمارا کام تمام کر دیا ہے۔ پاکستان میں کوئی یحییٰ خاں، شیخ مجیب الرحمٰن کو قید کر دیتا ہے تو لگتا ہے ہمارے بال و پر کاٹ دیئے گئے ہیں، جان ایف کینڈی کے سینے میں کوئی عفریت گولیاں اتار دیتا ہے تو ہمیں اپنے گھر ادھڑتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ 4۔ جولائی کو ہماری وزیر اعظم شملہ میں ایک شاندار سیاسی معاہدہ کرتی ہیں تو اسی دن پیدا ہونے والے اپنے بچے کا نام ایک انسان "ابیض نوید" رکھ کر اس تاریخی صلح کو یادگار بنا لیتا ہے۔ سات سمندر پار ایک مقام پر اسکائی لیب گرایا جاتا ہے

دنیا محفوظ ہو جاتی ہے۔ تمام اندیشے ختم ہو جاتے ہیں تو ہزاروں میل دور بڑودا میں ایک شہری اسی دن شام میں پیدا ہونے والے اپنے بچے کا نام اسکائی لیب رکھ دیتا ہے۔

۳۱۔ اکتوبر کی منحوس صبح کو ایک ہند دشمن و ناپاک غیر ملکی قوت کی چشمِ شہ پر جب چند رذیل اور پاگل اندرا گاندھی کو شہید کر دیتے ہیں تو ایک آدھ ملک کو چھوڑ کر باقی دنیا کے سارے عوام و خواص دھاڑیں مار مار کر رو دیتے ہیں اور سفو احمد ندیم قاسمی کہتے ہیں:

گو مرے دل کے زخم ذاتی ہیں
ان کی ٹیسیں تو کائناتی ہیں

ہم یوں تو ایک حقیر وجود رکھتے ہیں مگر یا تو اس پر پورے کائناتی نظام کا اثر ہوتا ہے یا پھر ایک دن وہ پوری کائنات کو متاثر کر دیتا ہے اسی طرح ہمارے پیدا ہونے اور پھر مر جانے کے بیچ کا وقفہ ہی وہ گیپ GAP ہوتا ہے جو یا تو کائنات سے کچھ لیتا نظر آتا ہے یا پھر کائنات ہی کو کچھ دیتا ہوا۔" نعیم نے اپنی بات ختم کر دی، ختم ہوتی ہوئی سگریٹ کو پیر تلے مسل دیا اور قلم اٹھا کر جواب لکھنے لگا۔ اس نے لکھا: "ناجیہ جانِ من" (شاید دیرینہ عادت کے طور پر) اور پھر اسے کاٹ دیا۔ اور لکھا:

ناجیہ بی بی! یاد ہیں
ایک خوشخبری سنو ۱۶۔ جون کو اپنی سالگرہ کے
موقع پر میں نے ایک بڑی خوب صورت کتیا خریدی
ہے۔ سفید جھک نرم و ملائم بالوں سے بھری یہ کتیا
ایک ریشمی گڑیا معلوم ہوتی ہے خود مبشرہ کا یہ کہنا ہے کہ

میں نے شاید پہلی بار ایک عقل مندی کا کام
کیا ہے۔ وہ کہتی ہے کہ کتا بڑا وفادار جانور ہوتا ہے
ہمارے گھر میں بہت دنوں سے ایک بلی پلتی تھی اور
ہمیشہ مبشرہ اس کے پالنے کی مخالفت کرتی تھی
جس دن بلی ایک حادثے میں کام آئی مبشرہ نے سکون کی
سانس لی۔ وہ ہر وقت کہتی ہے کہ توتے جیسا پرندہ
اور بلی جیسا جانور بڑا ہی بے وفا اور مکار ہوتا ہے
اور آدمی کو چاہیئے کہ ہمیشہ وفادار جانور ہی پالے۔
خیر چھوڑو سناؤ تم کیسی ہو' بہت دنوں سے تمہارا کوئی
خط نہیں آیا۔
اخبار میں پڑھا تھا کہ اس سال تمہیں اسٹیٹ ایوارڈ
مل رہا ہے جو تمہیں ایک سرکاری تقریب میں چیف منسٹر
خود دیں گے۔ بھئی مبارک باد قبول کرو۔

مبارک باد۔ تمہارا: نعیم

سنو سہیل! دیکھو میں نے ناجیہ کو خط لکھ دیا ہے۔ اچھی طرح پڑھ لو اور عجلت میں اگر میں نے زبان کی کوئی غلطی کر دی ہو تو صحیح کر دو۔ اس نے خط سہیل کی جانب بڑھا دیا۔ سہیل نے خط پڑھا اور مسکرا دیا۔ اس نے سوچا آخر نعیم نے اپنے قلم کا جادو جگا ہی دیا بکھیر ہی دیا۔ اُسے یقین تھا کہ اس مختصر خط میں موجود کتیا کی خریدی جذبۂ وفا کی تمثیل مبشرہ کے ریمارکس اور اسٹیٹ ایوارڈ پر مبارک باد ایسی چیزیں تھیں کہ ناجیہ کے دنوں کے سکون کو غارت کر سکتی تھیں' بہت دنوں سے خط نہ ملنے کی بات کر کے تو نعیم نے کمال کر دیا تھا

جبکہ وہ 19۔ جون کی شام تھی اور 17۔ جون کا ناجیہ کا لکھا خط اسے اسی شام کی ڈاک سے مل چکا تھا۔ سہیل نے نعیم کو خط واپس کر دیا اور صرف اتنا کہا :

"بڑا بھرپور جواب دیا ہے آپ نے۔"

وہ جب "مڈلینڈ" سے باہر نکلے تو شام کے سائے گہرے ہو چلے تھے، نعیم نے آٹو لیا اور ڈرائیور سے "اومیگا" کہا۔ سہیل کو یقین تھا کہ اب نعیم "اومیگا" میں ڈوب جائے گا بری طرح۔ نعیم نے آٹو میں بیٹھ کر سہیل سے مصافحہ لیا اور کہا۔ "جاؤ سہیل عشاء کا وقت ہو رہا ہے اور سنو میرے لئے سکونِ قلب کی دعا ضرور کرنا۔"

سہیل تھوڑی دیر کھڑا اس آٹو کو دیکھتا رہا جس میں نعیم بیٹھا ہوا تھا۔ اور جب آٹو نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تو وہ پلٹ پڑا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیوں اُردو کے عظیم ادیب کرشن چندر نے عورتوں کو وفادار رکھنے کی بات کی تھی اور کہا تھا کہ یہ کام صرف مرد ہی کر سکتا ہے تو نعیم جو بھرپور مرد ہے کیوں ناجیہ کو وفادار نہ رکھ سکا۔ اس ایک سوال کے کئی جواب اس کے ذہن میں یکے بعد دیگرے آنے لگے اور پھر وہ کسی ایک جواب کو بھی قطعیت نہ دے سکا۔

حبیب گوندیادی

غزل

تنہا خطا پہ اپنی پشیماں نہیں ہے دل
شرمندہ ہو رہا ہے نظر کا غرور بھی

ساقی تری نگاہ کی تاثیر کیا کہیں!
پیمانِ تشنگی بھی ہے جامِ سرور بھی

دل سے کبھی جدا نہ ہوا جذبۂ وفا
ہم سے رہا زمانہ کبھی دور دور بھی

راہوں کے پیچ و خم سے شکایت بھی تھی ہمیں
بخشا ہے پیچ و خم نے سفر کا شعور بھی

ہے سلسلہ حبیب شبِ غم کا شام سے
خوشیوں کی روشنی بھی ہے غم کا ظہور بھی

طاہر گلشن آبادی

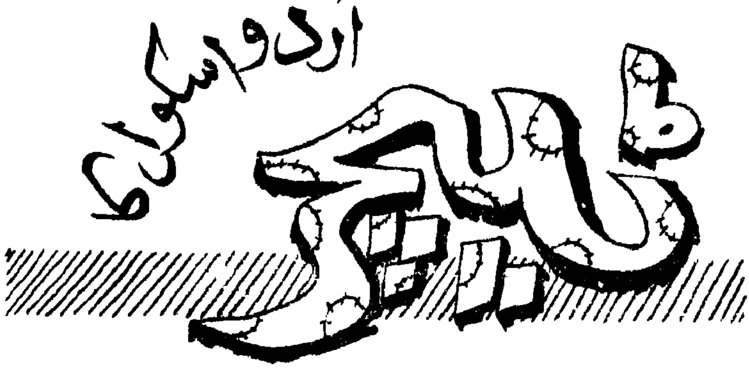
قطعات

پیاس پلکوں کی کبھی یوں بھی بجھا لیتا ہوں
ایک اک لفظ پہ میں دریا بہا لیتا ہوں
جب بھی ہوتی ہے تری دید کی خواہش یارب
پڑھ کے قرآن کو آنکھوں سے لگا لیتا ہوں

○

ایماں کے نظاروں کی نگہباں ہیں آنکھیں
اللہ کے انوار کی پہچان ہیں آنکھیں
ہر چیز کو دیکھوں گا میں قرآں کی نظر سے
مومن ہے مرا دل تو مسلماں ہیں آنکھیں

ڈاکٹر یعقوب عمر



ہوا گھر سے برآمد ہانپتا اُردو کا اک ٹیچر ابھی کچھ دور پہونچا تھا کہ سیکل ہوگئی پنکچر
اُسے جب دوش پر رکھا تو حالت ہوگئی ابتر کہ نیچے تھا سوار اس کا، سواری اس کے تھی اوپر
نگاہوں نے بڑی حیرت سے دیکھا یہ عجب منظر
عبارت ہوگئی الٹی، زبر نیچے تھا زیر اوپر

بہت تاخیر سے پہونچے مگر پہونچے جیالے تھے نرالی تھی بہت اسکول، یہ اس سے نرالے تھے
نہ گھنٹہ تھا نہ چپراسی، درودیوار کالے تھے بھلا چھت کیا نظر آتی کہ اس میں لاکھ جالے تھے
یہی تاخیر روز آنہ یہی حیلے حوالے تھے
جناب صدر خود ہول لیٹ تو پوچھیں انھیں کیونکر

کسی کونے میں آفس صدر صاحب کا مقرر ہے جہاں پر میز ہے کوئی نہ تو کوئی رجسٹر ہے
شکستہ چاک ایس ٹوٹا ہوا سا ایک ڈسٹر ہے لگا دیوار پر دس سال پہلے کا کلینڈر ہے
بلوں سے فرش چھلنی رات دن چوہوں کی بھگدڑ ہے
کلاسیں پانچ، کمرے تین، لڑکے ایک سو ستر

پڑھائی چھوڑ کر بچوں کو ہر اک کام آتا ہے کوئی ہوٹل سے ٹیچر کیلئے پان لاتا ہے

کوئی مالش کرے ان کی کوئی حقہ لگاتا ہے — کوئی بازار سے گھر ان کے سبزی لے کے جاتا ہے
یہی میوا ہے جس سے امتحاں میں فیض پاتا ہے
کہ بے محنت کے مل جاتے ہیں اسی فیصدی نمبر

تماشہ امتحاں کے وقت ہوتا ہے بہت بھاری — گرو چیلوں پہ ہوتی ہی نہیں ہیبت کوئی طاری
خبر ہے پاس ہونے میں نہ ہوگی کوئی دشواری — کریں گے ہال میں ٹیچر لکھا دینے کی تیاری
جو لکھ سکتے نہیں ان کی لکھیں گے کاپیاں ساری
نہ آنے دیں گے کوئی آنچ اس اسکول پہ ٹیچر

پڑھانے کے لیے جس وقت یہ تشریف لاتے ہیں — نہیں کچھ سوجھتا ان کو تو بے پر کی اڑاتے ہیں
بجائے چاند بی بی قصۂ لیلیٰ پڑھاتے ہیں — کلاسوں میں یہ گانوں کی ریہرسل بھی کراتے ہیں
بڑی تفصیل سے پکچر کا ہر منظر سناتے ہیں
جو اس ٹاپک پہ چھڑ جاتی ہے بحث اسکول کے اندر

رہے اردو کے جانے انکو دلچسپی نہیں ہرگز — ملے فرصت تو کچھ سوچیں مگر ملتی نہیں ہرگز
ہٹیں روٹی کے محور سے یہ ممکن ہی نہیں ہرگز — انھیں معلوم ہے تحقیق تو ہوگی نہیں ہرگز
گورنمنٹ جاب ہے تنخواہ رکنے کی نہیں ہرگز
نہیں جب فکر اس کو تو اندیشہ انھیں کیونکر

غرض اسکول کی دن رات گاڑی یوں ہی چلتی ہے — نہ یہ ٹیچر بدلتے ہیں نہ یہ خود ہی بدلتی ہے
یہ وہ کھیتی ہے صاحب پھولتی ہے جو نہ پھلتی ہے — انھیں کیا غم کہ کیسی قوم اس سانچے میں ڈھلتی ہے
مگر جو تنخواہ یہ پاتے ہیں وہ دس دن ہی چلتی ہے
بقیہ بیس دن پیسے سے کھٹ پٹ ہے اہل خانہ پر

کہا ٹیچر سے بچوں نے جو خواہش کی پڑھانے کی — وہ بولے تم کو پنڈت ہوں میں اردو نہیں آتی
کسی ٹیچر کو آتا ہی عنایت ہے بڑی بھاری — خبر ہے اپنے صوبے میں ہیں کچھ اسکول ایسے بھی
پڑھانے کے لیے ٹیچر کیا عمارت تک نہیں ملتی — مگر اسٹاف کی تنخواہ جاری ہے رجسٹر سے

کسوٹی

"کسوٹی" میں تعمیری تنقید کی حوصلہ افزائی کی جائے گی اور اس کے لئے یہ ضروری نہیں کہ ہر تنقید نگار کی رائے مدیر کے زاویۂ نظر سے مطابقت رکھتی ہو۔ کسوٹی کا مطمحِ نظر صرف یہ ہے کہ ایسی تنقید سے نئی نسل کے ادبا و شعرا نہ صرف استفادہ کر سکیں بلکہ تعمیری اندازِ فکر کی نشوونما بھی ہو۔

حضرت شاذ تمکنت کی غزل

۱۔ بجھا نہ دے کہیں اے حسنِ جوئے کم آبی چراغِ تشنہ لبی کو ہوائے سیرابی

ایک پامال مضمون میں شاعر نے واقعی حسن اور ندرت لانے پیدا کرنے کی کوشش کی ہے مگر صرف ڈیڑھ مصرعہ کی حد تک اسے کامیابی حاصل ہوئی کیوں کہ "اے حسنِ جوئے کم آبی" کے ٹکڑے کے بغیر ہی شعر مکمل ہو گیا ہے۔ شاعر کا مضمون صرف اتنا ہی ہے کہ: "چراغِ تشنہ لبی کو ہوائے سیرابی کہیں بجھا نہ دے۔" مگر شاعر کو مطلع بھی نظم کرنا تھا چنانچہ قافیہ کے التزام کے پیشِ نظر بھرتی سے کام لینا پڑا بات یہیں تک رہتی تو بھی گوارا تھی مگر اس سلسلے میں جو ترکیب "اے حسنِ جوئے کم آبی" اس نے وضع کی وہ فارسی سے ناواقفیت کی بنا پر غلطی کا شکار ہو گئی۔ مطلع میں تو خیر اس ترکیب کا وجود نامناسب ہی تھا مگر اس کی صورت گری میں بھی شاعر سے تسامح ہو گیا ہے۔ اردو ہو یا فارسی دونوں میں صحیح ترکیب "جوئے کم آب" تھی نہ کہ "جوئے کم آبی۔"

۲۔ تمام قہر سخن وادِ ناشناسِ ہنر ہماری آبرو اہلِ نظر کی گمیابی

نہایت خوبصورت شعر ہے لیکن پہلا مصرعہ اردو کی حدود سے نکل کر فارسی کی قلمرو میں داخل ہو گیا ہے۔ شاعر نے اس شعر میں صائب تبریزی کے ایک

مصرعے اور غالب دہلوی کے ایک شعر کو نحقی کرنے کی کوشش کی ہے۔ مضمون چونکہ مسیلہ تھا لہٰذا دریا کو کوزے میں سمونے کی خاطر فارسی پیمانوں کو بروئے کار لانا پڑا۔ یہ چیز غالب کے زمانے میں ہی معیوب سمجھی جاتی تھی تو اس عہد میں اسے کیا کہا جائے۔

۳۔ خود اپنے آپ سے کھائی ہے میں نے زک اکثر میری حریف رہی میری خوئے سرتابی

سرتابی کے معنی ہیں۔ سرکشی یعنی "میں نے اپنی سرکشی سے خود ہار مانی ہے"۔ معلوم نے شاعر نے کن کیفیات کے زیر اثر یہ شعر لکھا ہے۔ سوائے لفظوں اور اور حشو و زوائد کے اس شعر میں کچھ نہیں۔ شاعر نے جو کچھ ظاہر کیا ہے اسے قاری سے باور کروانے میں اس لئے ناکام ہو گیا کہ وہ اپنے دعوے کی کوئی معقول دلیل پیش نہیں کر سکا۔

۴۔ وہ قربتیں کہ تمیں بیتابی سکوں جیسے یہ دوریاں کہ ملا ہے سکونِ بیتابی

جدید لب و لہجہ رکھنے والے شعراء کے یہاں ایسے لفظی گورکھ دھندوں کے حامل اشعار کی بہتات ہے عام قاری بے چارہ لفظوں سے مرعوب ہو کر رہ جاتا ہے لیکن جو لوگ سخن فہمی کی قدروں سے واقف ہیں وہ ان معمہ نما اشعار سے بڑی روحانی اذیت محسوس کرتے ہیں۔ "بیتابی سکوں" اور "سکونِ بے تابی" جیسی ترکیبوں سے شاعر نے جو کچھ ظاہر کرنا چاہا ہے اس تک قاری کے ذہن کی رسائی نہیں ہو سکی۔ یہ ابلاغ کی کوتاہی ہے جس سے انبساط کے بجائے انقباض پیدا ہوتا ہے۔ نوجوان شعراء کو اس قسم کی مہم پسندی سے بچنا چاہیئے۔

جدید لب و لہجہ رکھنے والے شعرا کے ہاں یہ بات عام ہے کہ وہ حسن صورت میں الجھ کر رہ جاتے ہیں۔ اس سے آگے بڑھ کر شاہد معنی پر دست درازی کی جرأت نہیں کرتے۔ نئی نسل کے شعرا کو خاص طور پر الفاظ کے حسن سے مبہوت نہ ہونا چاہیئے۔ اس جائزے کا مقصد بھی صرف یہی ہے

کہ سخن اہل کے شعرا اس کوچے میں سوچ سمجھ کر قدم رکھیں۔ اُوپری جلووں کی چمک دمک سے خیرہ نہ ہوجائیں بلکہ جلوۂ دروں کا بھی تفصیلی مشاہدہ کریں تب کہیں جاکر نگارِ سخنوری ہاتھ لگے گی۔

غالب کا ایک شعر ہم یہاں بطور مثال درج کرتے ہیں جس میں انہوں نے اسی قسم کی دو ترکیبوں کو استعمال کیا ہے ؎

دور فتادم ز تو ماہیٔ بے دجلہ ام نیست دلم در کنار دجلۂ بے ماہیم

ترجمہ: "تیری جدائی نے جہاں مجھے ماہیٔ بے دجلہ (بے آب) بنا دیا ہے وہیں دل کی میرے سینے میں عدم موجودگی نے مجھے دجلۂ بے ماہی بنا رکھا ہے"

ترجمے سے ظاہر ہے کہ غالب نے ان ترکیبوں کی الٹ پھیر کو مضبوط دلائل سے ثابت بھی کر دیا ہے۔

۵۔ نگاہ میں ہے یم زندگی کی گہرائی مگر ہے پاؤں میں زنجیرِ موجِ پایابی

پایابی دریا کی صفت ہے مگر شاعر اسے موج کی صفت بتا رہا ہے۔ یہ فروگذاشت مشاہدے کے بھی خلاف ہے کیونکہ پایاب دریا میں موج کا اٹھنا ہی ناممکن ہے۔ بالفرض محال مفہوم سے قطع نظر صرف ترکیب ہی کو دیکھیں تب بھی موجِ پایاب ہی کو درست ٹھہرایا جاسکتا ہے لیکن موجِ پایابی قطعاً غلط ہے۔ دریائے پایاب، جوئے پایاب، چاہِ پایاب تو کہا جاسکتا ہے لیکن پایابی نہیں کہا جاسکتا۔

۶۔ دھرا ہوا ہے مرا زادِ راہ برلبِ جُو وفورِ تشنہ دھانی دلیل عز قابی

یہ شعر بھی ۷۵٪ فارسی ہے اس میں جو ۲۵ فیصد اردو ملتی ہے وہ بھی باوقار نہیں ہے۔ "دھرا ہوا" نہ صرف ذوقِ سلیم پر بار ہے بلکہ نزاکت شعار آبگینۂ غزل کے آبگینے کو بھی چور چور کر رہا ہے۔ اس شعر میں "برلبِ جو" کی بھی ضرورت نہ تھی صرف "لبِ جو" کافی تھا۔ "تشنہ دھانی" کا بے ضرورت استعمال

فصاحت کے خلاف ہے۔ "تشنہ لبی" جیسے فصیح لفظ کو چھوڑ کر "تشنہ دھانی" کے استعمال کا جواز اسی وقت ممکن تھا جب کہ قافیہ میں اس کا استعمال ناگزیر ہوتا دھن جیسے لفظ کے ہوتے ہوئے بے ضرورت "دھان" کا استعمال مناسب نہیں۔ اگر اس شعر کو یوں باندھا جاتا تو مصرع بھی فارسی کی قلمرو سے نکل کر اردو کی سرحد میں داخل ہو جاتا ہے

دفورِ تشنہ لبی ہے دلیلِ غرقابی

۷۔ شکن شکن مری کروٹ گواہ ہے اے شاذ دکھا گئی ہے کئی خواب میری بے خوابی

شکن شکن کروٹ اور بے خوابی جیسے اشاروں کے بعد "دکھا گئی ہے کئی خواب" کا فقرہ قاری کے ذہن کو الجھا دیتا ہے۔ مضمون تو خیر سبھی جانتے ہیں نہ صرف عام بلکہ پامال بھی ہے اس میں شاعر نے کوئی ندرت بھی پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی البتہ "دکھا گئی ہے کئی خواب" والا ٹکڑا گویا دی النظر میں جدت ادا پیدا کرنے کی دانستہ کوشش ہے مگر اس میں بھی شاعر کو کامیابی حاصل نہ ہوگی کیونکہ لفظ "خواب" سے رنگ یا انداز مراد لے کر شاعر پھر اسی عام مضمون میں الجھ کر رہ گیا ہے۔ مفہوم یہی ہے کہ میری بے خوابی کئی رنگ دکھا چکی ہے مگر رنگ اور انداز کی جگہ "خواب" کا استعمال غرابت لئے ہوئے ہے۔

بچوں کا صفحہ

از عظیم الرحمن عظیم

کبوتر اور پیغام رسانی

انسانی ماحول میں کبوتر کے داخلے کا اولین ثبوت ہمیں تین ہزار سال قبل مصر میں ملتا ہے۔ قدیم ہند میں کبوتروں کے بطور قاصد استعمال کی پہلی مثال اشوک اعظم کے عہد میں ملتی ہے۔ اشوک کے خفیہ رپورٹر ایک خفیہ رسم الخط میں پیغام لکھ کر تربیت یافتہ کبوتروں کے ذریعہ منزل مقصود تک پہنچاتے تھے۔ دورِ عباسیہ میں بھی کبوتروں کو تربیت دے کر ان سے قاصد کا کام لیا جاتا تھا۔ دورِ عباسیہ میں کبوتروں کے بطور قاصد استعمال کی پہلی مثال ۷۶۸ء میں ملتی ہے۔

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے مطابق ۱۱۵۰ء کے قریب خلیفہ بغداد نے کبوتر چوکیاں قائم کر رکھی تھیں۔ جہاں سے قاصد کبوتروں کو پیغام دے کر مختلف منازل کو بھیجا جاتا تھا۔ عباسیوں نے اپنے زوال تک کبوتروں سے نامہ بری کا کام لیا۔ مصری بادشاہوں نے کبوتروں کی تربیت اور ان سے نامہ بری کے فن کو مزید ترقی دی۔ قاصد کبوتروں کے لئے قاہرہ کے قریب قلعہ جبال میں خصوصی مینار تعمیر کئے گئے جہاں سے کبوتر مختلف ڈاک چوکیوں کے لئے پیغام لے کر پرواز کرتے جیسے ہی کبوتر کسی ڈاک چوکی پر پہنچتا تو پیغام کھول کر دوسرے کبوتر سے باندھ

دیا جاتا اور تازہ دم کبوتر اپنی نئی منزل کو پرواز کرجاتا۔ اس طرح ڈاک کی چوکیوں کا سلسلہ ملک بھر میں پھیلایا گیا تھا۔ عہدِ وسطیٰ میں کبوتر پیغام رسانی کا تیز ترین ذریعہ تھے۔ قاصد کبوتروں کے ذریعے بھیجا جانے والا پیغام جدید برقیے کی طرح بہت مختصر ہوتا تھا۔ پھر پیغام دو پرندوں کے ذریعے بھیجا جاتا۔ یہ احتیاط اس لئے کی جاتی کہ ایک پرندے کے بھٹک جانے کی صورت میں بھی پیغام اپنی منزل تک پہنچ جائے۔ بارش، آندھی یا خراب موسم میں قاصد کبوتروں کو نہیں اڑایا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ پرواز سے قبل انہیں اچھی طرح خوراک دی جاتی۔ تاکہ طویل سفر کے دوران انہیں دانا دنکا چگنے کے لئے نہ رکنا پڑے۔

سلاطین کی ذاتی ڈاک خاص کبوتر لاتے تھے۔ جن پر امتیازی نشان لگے ہوتے تھے یہ نامہ بر سلطانی محلوں کے بار بار چکر لگاتے تو سلطان کو خبر کی جاتی جس پر وہ خود آکر پیغام وصول کر لیتے۔ جہانگیر پہلا مغل حکمراں تھا جسے کبوتروں سے پیار تھا۔ اس نے برق رفتار پیامبری کے لئے کبوتروں کی اہمیت کو محسوس کیا۔ چنانچہ ماہر کبوتر باز کبوتروں کی تربیت پر مامور کئے گئے۔ تربیت پانے والے کبوتروں کی آزمائشی پرواز مانڈو سے برہان پور تک ہوتی۔ اس آزمائشی پرواز سے کامیاب گزرنے والے کبوتروں کو ہی اہم پیغامات کی ترسیل کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔

۱۸۴۸ء کے قریب فرانس اور بلجیم کے اخبار کبوتروں سے بھیجی ہوئی خبریں بکثرت استعمال کرتے تھے۔ ۱۸۴۹ء میں جب برلن اور برسلز کے درمیان تار برقی کا سلسلہ منقطع ہوگیا تو رائٹر (R E U T E R) نے فرانس

اور بلجیم میں کبوتر چوکیاں قائم کیں اور کبوتروں کے ذریعے تار برقی کے اس تعطل کو دور کر دیا۔ پال جولیس وائز عالمی شہرت یافتہ خبر ایجنسی رائٹر کا بانی تھا۔ ۱۸۴۹ء کے انقلاب فرانس میں باغیوں نے خبروں کی ترسیل اور اطلاعات بھیجنے کے لئے کبوتر وسیع پیمانے پر استعمال کئے۔ ریڈیو کی ایجاد سے قبل افواج بھی تار برقی اور تیز ترین پیغام رسانی کے لئے کبوتروں کو استعمال کرتی تھیں۔ کبوتروں کے ذریعے پیغام رسانی کے لئے پیغام کو مختصر ترین الفاظ میں لکھ کر اسے کیپسول میں بند کر دیا جاتا اس کیپسول نما خط کو کبوتر کی ٹانگ یا گردن سے باندھ دیا جاتا پھر اسے سفر پر روانہ کر دیا جاتا۔ اس تدبیر کا مقصد یہ ہوتا کہ خط ہلکا بھی ہو اور عام لوگوں کی نگاہوں سے پوشیدہ رہے۔

کبوتروں کو مقابلے میں اڑانے کا رواج صرف ہمارے ہاں ہی نہیں یورپ، افریقہ اور دنیا کے کئی دوسرے حصوں میں بھی ہے۔ آج بھی یہ کھیل کبوتر بازوں میں مقبول ہے اور ماضی میں بھی یہ تفریح کا ایک مقبول ذریعہ تھا۔ آج بھی مختلف کبوتر بازوں کے اڈوں پر یہ تماشا ہوتا ہے کہ کبوتر ایک ساتھ ہوا میں چھوڑے جاتے ہیں پھر اس بات کا انتظار ہوتا ہے کون کبوتر دیر میں اترتا ہے اور کون جلد تھک کر واپس پہنچتا ہے۔ دیر سے اترنے والے کبوتر بازی جیتتے ہیں۔ یورپی ممالک میں کبوتر دوڑیں تفریح کا عام ذریعہ ہیں۔ لندن اور بلجیم کے درمیان کبوتر دوڑ ۱۸۲۳ء میں منعقد ہوئی۔ انیسویں صدی کے آخر تک فرانس، برطانیہ اور امریکہ میں بھی کبوتر دوڑ مقبول ہو گئی۔ بلجیم میں کبوتر پالنے کا رواج عام ہوتا گیا۔

کبوتربازی آج بھی بلجیم کا مقبول عام کھیل ہے۔ اس کے سالانہ مقابلے منعقد ہوتے ہیں۔ عوام الناس جوش وخروش سے ان مقابلوں میں حصہ لیتے ہیں

مغلیہ ہندوستان کی وسیع وعریض سلطنت پر مغل اعظم کی حکمرانی تھی۔ اکبرآباد (آگرہ) کا شاہی قلعہ ہندوستان کی فنی اور ثقافتی ترقی کا عکاس تھا۔ شہزادے کنیزوں کے جھرمٹ میں گھرے رہتے تھے۔ شہزادہ سلیم کا عالم شباب تھا۔ قلعہ آگرہ کے زنانہ دالان میں تتلیوں اور پریوں کا جھرمٹ تھا۔ شہزادہ سلیم کبوتروں کا ایک جوڑا تھامے جمنا کے نظاروں میں محو تھا۔ اچانک اسے کوئی کام یاد آیا۔ اس نے کبوتروں کا جوڑا پاس کھڑی مہرالنساء کو تھمایا۔ شہزادے کے جاتے ہی مہرالنساء نے شوخی میں ایک کبوتر اڑایا اور دوسرا ہاتھ میں تھامے رکھا۔ واپس آکر شہزادے نے ایک کبوتر دیکھا تو پوچھا "کبوتر کیسے اڑا؟" "صاحب عالم" "یوں" کہنے کا انداز شہزادے کو اتنا پسند آیا کہ وہ اس معصوم ادا پہ دل ہار گیا۔ اور مہرالنساء کو نہ صرف اپنے دل کی حکمراں بنا لیا بلکہ شیرافگن کی موت کے بعد اسے مہرالنساء سے نورجہاں بنا دیا۔ نورجہاں نہ صرف جہانگیر کے دل کی ملکہ تھی بلکہ عملی طور پہ مغلیہ سلطنت میں اس کی مرضی چلتی تھی۔

کبوتر صرف شاعری ادب اور محبوب سے رابطے کی علامت ہی نہیں بلکہ ..... کبوتر کو دنیا بھر میں امن اور محبت کی علامت بھی مانا جاتا ہے۔ دوست سربراہان مملکت کے استقبال کے لئے ہزاروں کی تعداد میں کبوتر چھوڑے جاتے ہیں کھیلوں کے آغاز یا خاتمے پر جشن فتح منانے کے لئے کبوتر اڑائے جاتے ہیں۔ مسلم اکابر کے مزاروں اور

درگاہوں پر کبوتر بڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ تاشقند و بخارا تک اور دمشق کی مسجد اموی سے تیونس کی جامع قیروان تک مساجد اور درگاہوں میں کبوتروں کی بڑی تعداد موجود رہتی ہے۔ مسجد نبویؐ کے آس پاس بے شمار کبوتر موجود ہیں اور بے خطر اڑتے پھرتے ہیں۔ کعبۃ اللہ کے قریب بھی کبوتروں کی بڑی تعداد موجود ہے۔ مگر بات باعث حیرت ہے کہ کبوتر اپنی پرواز کے دوران کبھی بھی کعبۃ اللہ کی مرکزی عمارت کے اوپر پرواز نہیں کرتے۔ قدیم اسلامی فن تعمیر میں درگاہیں اور مقابر تعمیر کرتے وقت کبوتروں کی رہائش کے لئے بطور خاص جگہ رکھی جاتی تھی جن میں یہ پرندے شب بسری کر سکیں مساجد اور درگاہوں میں عموماً جنگلی کبوتر رہتے ہیں جنہیں "سبزے" کہا جاتا ہے۔ یہ کبوتر "ہُو ہُو" کی آواز نکالتے ہیں جو اللہ والوں کو بڑی مرغوب ہے۔ لوگ مزاروں کی زیارت کو جاتے ہیں تو کبوتروں کے لئے دانا دنکا "چوگا" بطور نذرانہ لے کر جاتے ہیں۔ ماہرین طب کے مطابق جنگلی کبوتر "لقوہ" کی بیماری کے لئے اکسیر کا درجہ رکھتا ہے۔ چنانچہ لقوہ کے مریضوں کو جنگلی کبوتروں کا گوشت کھلایا جاتا ہے۔ کبوتر کو عہد قدیم سے محبت اور امن کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ ایک فارسی شاعر نے کبوتر کی وفاشعاری اور دلداری کی تعریف کرتے ہوئے کہا ہے۔

دل کبوتر نہیں کہ بام سے اڑا اور پھر کے بیٹھ گیا یہ ایک بار اڑا تو پھر ہمیشہ کے لئے اڑ گیا۔

کبوتر قمری کے خاندان کا خوبصورت خمدار چونچ اور گردن والا سڈول نیز بھولا بھالا پرندہ ہے۔ جو دنیا بھر کے معتدل گرم اور سرد

آب و ہوا والے خطوں میں پایا جاتا ہے۔ کبوتروں کی دو سو نوے (۲۹۰) کے قریب اقسام ہیں۔ جن میں فاختائیں بھی شامل ہیں۔ جنھیں کبوتروں سے علیحدہ کرنا ذرا مشکل کام ہے۔ کیونکہ ان کے خد و خال اور رنگ کبوتروں جیسے ہی ہوتے ہیں۔ کبوتر کے بازو بڑے سڈول اور مضبوط ہوتے ہیں۔ اور بڑی تیزی سے حرکت کرتے ہیں۔ پروں کی تیز حرکت اور مضبوطی کبوتر کا رفتار بڑھاتے اور عمودی پرواز میں مدد دیتی ہے۔ کبوتروں کو عام طور پر دو نسلوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ایک جنگلی اور دوسرے پالتو یا لٹھے۔ جنگلی کبوتر ہلکے نیلے رنگ کا ہوتا ہے۔ اور ان کی دم پر دھاریاں ہوتی ہیں پالتو کبوتر یا لٹھے اگرچہ بے شمار قسموں کے ہوتے ہیں مگر عادات کے لحاظ سے ان کی چار قسمیں ہیں۔

اول گوّے کبوتر، یہ جھنڈ بنا کر اڑتے ہیں۔ اور جب کوئی مخالف سمت سے جھنڈ آئے تو اس میں گھس جاتے ہیں۔ چنانچہ دوسرے جھنڈ کا ایک آدھ کبوتر ان میں رہ جاتا ہے۔ تب وہ مالک کے اشارے پر نیچے اتر آتے ہیں۔ پھر اجنبی کبوتر کو الگ کر لیا جاتا ہے۔ دوسری قسم کے "گنگ تر لکے" کہلاتے ہیں۔ یہ صرف نمائشی کبوتر ہیں۔ جو اکثر چھاتی پھیلائے دم کو چھتر کئے اکڑ کر چلتے اور غٹر غوں غٹر غوں کرتے نظر آتے ہیں۔ کبوتروں کی تیسری قسم "تاروں" کی ہے۔ جو بہت بلندی پر پرواز کرتی ہے۔ اور بسا اوقات نظروں سے بھی اوجھل ہو جاتی یہ قسم فضا میں دوران پرواز قلابازیاں لگانے کے لئے مشہور ہے۔ چوتھی قسم کے کبوتر "لوٹن" کہلاتے ہیں یہ عادتاً لوٹن نہیں ہوتے بلکہ ان کو اگر ... بدلے کر، پلٹ کر یا کپڑے کے نیچے چھوڑ دیا جائے تو قلابازیاں کھانا اور

تڑپنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہاں تک کے اگر ان کو اٹھا کر پھونک نہ ماری جائے
اور گردن پر ہاتھ سے گرمی نہ پہنچائی جائے تو تڑپ تڑپ کر جان دیدیتے ہیں۔

بزمِ خیال

اس عنوان کے تحت قارئین "ذوق نظر" کے دو ایسے سوالوں کے جواب دیئے جائیں گے جو علمی و ادبی موضوعات پر پوچھے گئے ہوں (مدیر)

س ۔ رزمیہ شاعری کسے کہتے ہیں ؟

ج ۔ رزم کے معنی ہیں جنگ' لہٰذا جس شاعری میں جنگ کے مضامین بیان کئے جائیں یا جنگی مناظر کی عکاسی کی جائے۔ اسے رزمیہ شاعری کہتے ہیں ۔ رزمیہ شاعری عربی سے فارسی میں اور فارسی سے اردو میں آئی۔ فارسی کے سب سے زیادہ مشہور رزم نگار فردوسی ہیں جن کی مثنوی شاہنامہ فردوسی کے نام سے عالمگیر شہرت رکھتی ہے۔ اسی شاعر نے "رستم و سہراب" جیسے دو رزمیہ کردار دئیے جو اردو شاعری میں بھی بہت مشہور ہیں۔ فردوسی کے بعد نظامی گنجوی کا سکندر نامہ رزمیہ شاعری کی بہترین مثال ہے۔ اس کے بعد تو فارسی شاعری میں بہت سے رزمئے لکھے گئے جنھیں تاریخ ادبیات میں تلاش کیا جاسکتا ہے۔

اُردو شاعری ایسے دور میں عروج پر آئی جب کہ جنگی جذبات سرد پڑ چکے تھے اور کوئی مستحکم سلطنت بھی باقی نہیں تھی کہ جس کے جنگی کارنامے لکھے جائیں پھر بھی اکادکا رزمئے اردو میں بھی لکھے گئے ہیں۔

" رزمیہ مثنویوں کی ایک خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ ایک ہی یعنی بحر متقارب مثمن محذوف (یا مقصور) میں لکھی جاتی ہیں۔"

رزمیہ شاعری کے سلسلہ میں ایک دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ اُردو شاعری میں جتنے مرثیے واقعۂ کربلا پر لکھے گئے ہیں ان میں سے اکثر مرثیوں میں رزمیہ شاعری کے بہترین نمونے پائے جاتے ہیں چنانچہ اس طرح آج بھی رزمیہ شاعری ان مرثیوں کی بدولت اُردو میں زندہ ہے تقریباً نصف صدی قبل حفیظ جالندھری نے شاہنامۂ اسلام کے نام سے ایک مثنوی چار جلدوں میں لکھی تھی۔ اس مثنوی میں بھی رزمیہ شاعری کے بہترین نمونے ملتے ہیں۔ مگر اس کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ مثنوی رزمیہ مثنوی کے لئے مختص بحر میں نہیں لکھی گئی بلکہ "بحر ہزج مثمن سالم" میں لکھی گئی ہے۔ اسی طرح مراثی میں بھی اس بحر کی تقلید شاذونادر ہی ملتی ہے۔

س :۔ کیا ڈر اور خوف دونوں کے درمیان واو عاطفہ استعمال کیا جاسکتا ہے (یعنی ڈر و خوف)؟

ج ۔ از روئے قواعد اردو یہ غلط ہے۔ واو عاطفہ دو عربی یا فارسی لفظوں کے درمیان ہی استعمال کیا جاسکتا ہے۔ دو ہندی لفظوں' ہندی فارسی یا ہندی عربی لفظوں کے درمیان اس کا استعمال جائز نہیں۔ آج کل اردو اخباروں میں کثرت سے اس اصول کی خلاف ورزی ہورہی ہے۔ خصوصاً نئے لکھنے والے اس کا بالکل خیال نہیں رکھتے۔ گو عمر رسیدہ ادیبوں کو یہ بات بہت کھلتی ہے۔ مگر اس کا اتنی کثرت سے استعمال ہورہا ہے کہ شائد آنے والی نسل اسے غلطی نہ سمجھے۔

میری رائے یہ ہے کہ اردو کے نئے اور پرانے دانشمند اس مسئلہ پر

یک جا ہو کر کوئی فیصلہ کریں اور اسے رواج دیں تو مناسب ہوگا۔ بہت سارے ہندی الفاظ ایسے ہیں جو پہلے فارسی میں تھے اور روپ بدل کر سنسکرت کے ذریعہ اُردو میں پہونچے ہیں لہٰذا ہندی اور سنسکرت کے لفظوں کے مابین واو عاطفہ کے اصول کو مان لیا جائے تو یکسانیت پیدا ہو جائے گی مگر اس سلسلے میں دانشمندوں کا بہرحال بحث کے بعد کسی فیصلے پر پہونچنا زیادہ مناسب ہوگا۔



ماہنامہ
حیدرآباد

حفاظت کی اور جو شخص نماز کو بری طرح پڑھے، وقت کو بھی ٹال دے، وضو بھی اچھی طرح نہ کرے تو وہ نماز بری صورت سے سیاہ رنگ میں بد دعا دیتی ہوئی جاتی ہے کہ اللہ تجھے بھی ایسا ہی برباد کرے جیسا تو نے مجھے ضائع کیا اس کے بعد وہ نماز پرانے کپڑے کی طرح لپیٹ کر اس کے منہ پہ ماردی جاتی ہے۔

آداب صلوٰۃ کو بجا نہ لانے کی صورت میں اتنی شدید تنبیہ آئی ہے یہ ہر نماز کے متعلق ہے نماز تراویح بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے اگر تراویح بغیر تعدیل ارکان اور خشوع و خضوع کے پڑھی گئی جیسا کہ اکثر دیکھنے میں آتا ہے تو اس کا حال بھی ایسا ہی ہو سکتا ہے۔ خدا ہمیں اور قارئین کو آداب صلوٰۃ صحیح طریقے پر بجالانے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔ (ماخوذ)

پیامِ ماہِ صیام

خدا کی راہ میں جو دل سے کام دیتا ہے ؏ اسی کو لطفِ خدا صبح و شام دیتا ہے

کرو عبادتِ باری کو شوق کامل سے ؏ مہِ صیام یہ تم کو پیام دیتا ہے

کہ اس مہینے میں ہوتی ہیں برکتیں نازل ؏ اسی میں سب کو خدا احترام دیتا ہے

جو اس مہینے میں جاتے ہیں دارِ فانی سے ؏ تو اُن کو خلد میں کوثر کا جام دیتا ہے

کلام پاک کی ترتیل روز و شب جو کرے ؏ تو اس کو عزت و شہرت مدام دیتا ہے

جو روزے رکھتے ہیں خوشنودیٔ خدا کیلئے ؏ تو حق بھی خلد میں اعلیٰ مقام دیتا ہے

کرے نہ غفلت و سستی کبھی کوئی صائم ؏ خدا تمھارے لئے اذنِ عام دیتا ہے

رہو نہ لہو و لعب میں کبھی مسلمانو! ؏ خدا کا قہر یہ تم کو پیام دیتا ہے

کہاں ہیں حضرتِ نامی بگوشِ دل سن لیں ؏ خدا کا فضل یہ پیغام عام دیتا ہے

ابوالوقار نامی کوہ سوار نظامی شاہ پوری مرحوم

از: جناب احمد حسین صاحب

عید الفطر

جب ہم تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں اور انسان کی سماجی زندگی پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں روئے زمین پر بسنے والی ہر قوم اور ہر قبیلے میں مختلف رسوم ورواج نظر آتے ہیں جو کسی قوم کے تشخص کا اظہار ہوتے ہیں۔ رسوم ورواج کی حیثیت گو کہ ہر قوم میں جداگانہ ہے لیکن ان کی موجودگی انسانی معاشرت کے ساتھ لازم وملزوم ہے۔ ان رسوم ورواج میں تہواروں کو ایک مخصوص اہمیت حاصل ہے۔ زمین پر آباد ہر قبیلہ، ہر قوم کسی نہ کسی نام سے جشن یا تہوار مناتی ہے اور یہ اس کے قومی تشخص کا آئینہ ہوتے ہیں۔ اس آئینہ میں قومی شعار کا چہرہ صاف اور واضح نظر آتا ہے۔ قوموں میں تہوار منانے کے طریقے جداگانہ ہیں۔ بعض قومیں یہ تہوار صرف کھیل کود راگ رنگ اور سیر وتفریح کے ذریعہ مناتی ہیں۔ ان تقاریب کے پس منظر میں قوموں کو ان کے اسلاف سے جو روایات یا اخلاق منتقل ہوا ہے اس کی نمایاں طور پر منظر کشی ہوتی ہے تہوار ایک ایسی کسوٹی ہے جس پر کسی قوم کی اخلاقی اور روحانی طرز فکر جتنی بلند یا پست ہوتی ہے اس کا اظہار ماحول میں رائج روایات اور طریقوں سے ہوتا ہے۔ ان روایات اور طریقوں کے اظہار کا سب سے بڑا ذریعہ تہوار ہیں بالفاظ دیگر تمام انسانی گروہ اپنی تقریبات اور تہوار منانے میں جو طریقے اختیار کرتے ہیں وہ اعلیٰ مقاصد اور بنیادی اصولوں سے اخذ ہوتے ہیں جن سے ان کی بقا اور قیام وابستہ ہے ہر قوم اپنے ماضی پر زندہ ہے۔ اگر کسی قوم کے پاس اس کا اپنا ماضی نہیں تو اس کی حیثیت قوم کی کبھی نہیں ہوتی۔ دوسری قوموں کی طرح مسلمانوں کا بھی ایک ماضی ہے اور اس ماضی کو یاد رکھنے اور ماضی کے تاثرات کو آنے والی نسلوں میں پختہ کرنے کے لئے مسلمان دو تہوار مناتے ہیں۔

پہلا تہوار عید الفطر ہے۔ جس کی نورانیت اور پاکیزگی اس علامت پر قائم ہے کہ یہ تہوار اس وقت منایا جاتا ہے جب من حیث القوم ہر فرد اپنا تزکیہ نفس کرکے پاک اور مصفیٰ و مجلیٰ ہو جاتا ہے۔ تیس دن تیس رات کے وقت کی پابندی، غذا اور نیند میں کمی سحر اور افطار میں اجمالیت، عمل میں ہم آہنگی ایسی یکسوئی پیدا کر دیتی ہے جس یکسوئی کے ذریعے انسان اپنی انا سے واقف ہو جاتا ہے۔ انا سے واقفیت آدمی کے اندر بسنے والے انسان کو متحرک کر دیتی ہے اور جب کسی آدمی کے اندر تزکیہ نفس کے بعد انسان بیدار ہو جاتا ہے تو اس کی صلاحیتوں میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ یہ اضافہ دراصل ذہن کی رفتار ہے آدمی کے اندر بسنے والے انسان کی رفتار پرواز عالم آدمی کی نسبت ساٹھ ہزار گنا زیادہ ہوتی ہے تیس روزے رکھنے کے بعد آدمی کے اندر کا انسان انگڑائی لے کر اٹھ کھڑا ہوتا ہے

وہ نہ صرف فرشتوں کو دیکھتا ہے بلکہ فرشتوں سے ہمکلام ہوتا ہے۔ یہی وہ عید (خوشی) ہے جو انسان کے لئے قلبی سکون کا باعث بنتی ہے۔ یہی وہ مسرت ہے جو قوم کی فکر و نظر میں ایسی تبدیلی لے آتی ہے جو بندے کو اللہ تعالیٰ سے قریب کر دیتی ہے۔

رمضان المبارک کا مہینہ مسلمانوں کے لئے ایک تربیتی پروگرام ہے۔ اس مہینے میں ہر مسلمان کو اطاعت خداوندی کا خوگر بنایا جاتا ہے۔ نفسیات کا یہ مسلمہ اصول ہے کہ ذہنی مرکزیت سے قوتوں میں اضافہ ہوتا ہے اور ذہن کو کسی ایک مرکز پر مرکوز کر دینے سے آدمی کے اوپر روشنی کے بنے ہوئے ایک اور آدمی AURA کی روشنیوں میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ جب یہ روشنیاں ایک ہالہ کی شکل اختیار کر لیتی ہیں تو آدمی مادی پستیوں سے نکل کر روحانی رفعتوں کو چھونے لگتا ہے۔ یہ پروگرام انفرادی اور اجتماعی دونوں طرح جاری و ساری ہے ..... رمضان المبارک کے بیس روزوں کے بعد چار راتیں ایسی آتی ہیں جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ایک ہزار مہینوں سے افضل ہے اور اس کی افضلیت یہ ہے کہ اس میں فرشتے اور ارواح اترتے ہیں اور یہ پوری رات اللہ کی طرف سے خیر اور سلامتی کی رات ہے۔

اللہ کا کوئی فرمان محض کہانی [illegible] کہ ہر ایک کوئی نہ کوئی حکمت پوشیدہ ہے۔ اس فرمان میں

> [illegible] ہزار مہینوں [illegible] راتیں ہوتی ہیں
> عبادت و ریاضت سا ٹھ ہزار دن اور راتوں کی عبادت و ریاضت سے افضل ہے [illegible]
> [illegible] راتوں [illegible] کثرت سے بارش کرتے [illegible] اس [illegible] پوری

وضاحت موجود ہے۔ سیدنا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد عالی مقام ہے کہ شب قدر میں فرشتے اور جبرئیل اپنے رب کے حکم سے سلامتی کے ساتھ اترتے ہیں اور جو بندے شب قدر میں اپنے خالق کی یاد اور محبت میں اور اس کی قربت کے حصول کے لئے جاگتے ہیں، فرشتے اور جبرئیل ان عید بندوں سے مصافحہ کرتے ہیں یہ اتنی بڑی سعادت اور خوشی ہے کہ اس پر جتنا شکر کیا جائے اور جس قدر خوشی کا اظہار کیا جائے وہ کم ہے عید دراصل اسی سعادت اور اسی نعمت کا شکر ادا کرنے کا نام ہے۔

اسلام دین فطرت ہے۔ اس نے اپنے پیروکاروں کو عید منانے کی اجازت دی ہے نبی برحق صلی اللہ علیہ وسلم نے اس فطری خوشی کا اظہار کرنے کے لئے ایسے ضابطے بنائے ہیں جن میں غیر فطری اعمال و حرکات نہیں ہیں بلکہ متانت اور بردباری ہے۔ اسلام نے دیگر شعبہ ہائے زندگی کی طرح عید کی خوشی کے لئے بھی میانہ روی کی تعلیم دی ہے۔ اسلام اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ دوسری اقوام کی طرح مسلمان غیر اخلاقی اور غیر فطری حرکات کے مرتکب ہو کر عید کے بنیادی مقاصد کو نظر انداز کر دیں۔ اسلام دین فطرت ہے۔

اور فطرت کا مطلب ہے اعتدال۔ اعتدال میں عبادت اور عمل دونوں کو مساوی حیثیت حاصل ہے۔ اسلامی طرز زندگی جہاں روحانی خوشی کا سرچشمہ ہے وہاں کردار اور افعال کی تعمیر کا بھی وسیلہ ہے۔ قرآن وسنت کی پیروری کا مطلب، یہ ہے کہ ہر فرد میں آدمیت کا احترام پیدا ہوجائے اور ہر مسلمان بحیثیت مسلمان کے اپنے بھائی کا سہارا بنے۔ ہر مسلمان ایک قوم کی حیثیت میں بلاتخصیص مذہب وملت اس اخلاق وکردار کا مظاہرہ کرے جو ہمارے نبی برحق صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش کیا ہے اس کی زبان اور ہاتھ سے اگر کسی کو فائدہ نہیں پہنچتا تو کسی کو نقصان بھی نہ پہنچے۔ رمضان المبارک کا پورا مہینہ ہمیں یہی درس دیتا ہے۔

عید خوشیوں کا گہوارہ ہے۔ عید کے روز اُجلے کپڑے پہننا' خوشبو اور عطر لگانا۔ فطرہ دینا دوسروں کے ساتھ بیٹھ کر لذیذ کھانے کھانا اور اپنے مرحوم اعزا واقربا کی قبروں پر جاکر فاتحہ پڑھنا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔ اس کا فلسفہ یہ ہے کہ مسلمان خوشی' مسرت اور فخر وانبساط کے موقعوں پر بھی ماضی اور مستقبل سے وابستہ رہے۔ اسے یہ یاد رہے کہ ایک نہ ایک دن یہاں سے جانا ہے اور ماضی میں کئے ہوئے اعمال کا حساب دینا ہے۔ اس کے ذہن میں دوسروں کے لیئے برادرانہ جذبات ہوں وہ مسکینوں' محتاجوں بے کسوں' یتیموں' بیواؤں اور معذوروں کی اس طرح دستگیری کرے کہ انہیں اپنی کم مائیگی کا احساس بھی نہ ہو۔ اسلامی معاشرے کا منشاء بھی یہ ہے کہ قابل رحم افراد اور ضعیف طبقہ کو اس بات کا یقین ہوجائے کہ وہ جس ماحول میں رہ رہے ہیں وہاں کے لوگ ان کے دکھ سکھ میں برابر کے شریک ہیں۔

عید الفطر جہاں عطر بیز ہواؤں سے جھکتا ہوا خوشی کا ایک دن ہے وہاں قوم کے ہر فرد کے لیئے ایک آزمائش اور امتحان بھی ہے۔ رمضان المبارک کا پورا مہینہ ہم اتحاد' تنظیم اور یقین محکم کے پروگرام پر عمل کرکے اعلیٰ اخلاق اور روحانی تعلیم وتربیت حاصل کرتے ہیں اور جب یہ تعلیم وتربیت ہمارے اوپر غیب وشہود کی دنیا کو روشن کرتی ہے تو ہم اجتماعی مسرت کا اظہار کرتے ہیں۔ اسلام کا یہ تہوار جسے عید کہا جاتا ہے دوسری اقوام کے تہواروں سے مختلف ہے دوسری قوموں کے تہوار ایک ہنگامے سے شروع ہوتے ہیں اور لہو ولعب کے ہنگاموں پر ختم ہوجاتے ہیں لیکن عید کے دن کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ مسلمان صبح بیدار ہونے کے بعد ہی ذکر الٰہی اور عبادت الٰہی میں مشغول ہوجاتا ہے دوسری اقوام کی تقریبات عموماً سیاسی' سماجی اور قومی ہوتی ہے جبکہ عید اللہ تعالیٰ کی عظمت وکبریائی کا اقرار ہوتی ہے اسلام سے پہلے عرب اپنے میلے بازاروں میں منعقد کرتے تھے حضرت ابراہیمؑ نے جس قوم کے جھوٹے خداؤں (بتوں) کو توڑا تھا وہ ہر سال ایک مقررہ دن شہر سے باہر نکل جایا کرتی تھی۔ آج کی دنیا میں بھی اعلیٰ تہذیب یافتہ ہونے کا دعویٰ کرنے والی اقوام اپنے تہوار پارکوں کلبوں اور سڑکوں اور عیش ونشاط کی دیگر مخصوص جگہوں پر مناتی ہیں لیکن مسلمان بحیثیت مسلمان اس بات کا پابند ہے کہ عید کی پرمسرت گھڑیوں کی ابتداء اور انتہا عیدگاہوں اور مسجدوں میں کرے اور اللہ کے حضور سجدہ ریز ہوجائے۔

احکام عیدالفطر و مسائل

عیدالفطر

عیدالفطر اس عید کا نام ہے جو ماہ رمضان کے اختتام پر ماہ شوال کی پہلی تاریخ کو منائی جاتی ہے جس میں نماز کے علاوہ صدقہ فطر بھی دیا جاتا ہے نماز عیدالفطر ان لوگوں پر واجب ہے جن پر جمعہ واجب ہے نماز عید کی وہی شرائط ہیں جو نماز جمعہ کی ہیں البتہ فرق اتنا ہے کہ نماز جمعہ میں خطبہ شرط ہے اور عیدین کی نماز میں سنت جمعہ کا خطبہ نماز سے پہلے ہوتا ہے۔ اور عیدین کا خطبہ نماز کے بعد۔ عیدین کی نماز میں اذان و اقامت نہیں ہوتی ایسے دیہات جہاں صحت عیدین کے شرائط موجود نہ ہوں عیدین کی نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہے۔

نماز عیدالفطر کا وقت

عید کی نماز کا وقت آفتاب کے ایک نیزہ بلند ہونے کے بعد سے زوال آفتاب تک رہتا ہے۔ عیدالفطر کی نماز میں تاخیر افضل ہے عیدالفطر کے روز بارش وغیرہ کے عذر قوی سے زوال کے اندر امام و جماعت نماز نہ پڑھ سکے ہوں تو دوسرے روز قبل الزوال پڑھنا چاہیئے۔

عیدالفطر کے آداب

مستحب ہے کہ صبح عید غسل و مسواک کرے اور سرمہ لگائے۔ پاکیزہ لباس پہنے۔ اور خوشبو ملے اور فطرہ دے۔ سویرے عیدگاہ جانے سے قبل فطرہ دیکر تین یا پانچ یا سات کھجوروں سے افطار کرے لیکن کھانا بعد نماز کے ہی کھائے۔ اگر کھجور نہ ہوں تو میٹھی چیز افطار کے لئے کافی ہے۔ اور عیدگاہ کو تکبیر آہستہ کہتے ہوئے جائے۔ اور جب مصلی پر پہنچے تکبیر موقوف کر دے۔ ایک راستہ سے عیدگاہ کو جانا اور دوسرے راستے سے گھر آنا بھی مستحب ہے تکبیر یہ ہے۔

اللہ اکبر اللہ اکبر لا الہ الا اللہ واللہ اکبر وللہ الحمد

(درمختار) عید کی صبح کو قبل از نماز عید کلمۃ التوحید یعنی لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ لہ الملک ولہ الحمد یحیی و یمیت وھو علی کل شئی قدیر چار سو مرتبہ پڑھے کہ اس کی فضیلت اور فوائد کثیر ہیں۔

(درمختار) نماز عید سے پہلے نوافل نہ پڑھے

عیدالفطر کی نماز کا طریقہ

عیدالفطر کی نماز دو رکعت

واجب ہے۔ دوران نماز علاوہ حسب معمول تکبیرات کے ہر رکعت میں تین زائد تکبیرات اس طرح چھ زائد تکبیرات واجب ہیں عیدین کی نماز کی دوسری رکعت میں رکوع کی تکبیر بھی واجب ہے جب کہ اور نمازوں میں سنت ہے طریقہ یہ ہے کہ پہلے نیت کریں دو رکعت واجب نماز عیدالفطر کے زائد چھ تکبیرات کے ساتھ ادا کرتا ہوں واسطے اللہ تعالیٰ کے منہ کعبہ شریف کے اللہ اکبر کہہ کر رکعت باندھ لیں اور ثنا پڑھے۔ اب امام صاحب اور مقتدی دونوں اللہ اکبر کہتے ہوئے دونوں ہاتھ کانوں تک اٹھا کر چھوڑ دیں اور تین تسبیح کے موافق وقف کریں اسی طرح دوسری اور تیسری تکبیر کے بعد ہاتھ باندھ لیں۔

اب امام صاحب سورہ فاتحہ ضم سورہ پڑھیں گے پھر رکوع و سجدہ کر کے دوسری رکعت کے لئے کھڑے ہوں گے۔ تب سورہ فاتحہ اور ضم سورہ پڑھ کر رکوع میں جانے سے قبل تین بار کانوں تک ہاتھ اٹھاتے جائیں اور چھوڑتے جائیں اور چوتھی تکبیر پر بغیر ہاتھوں کو کانوں تک اٹھائے رکوع میں چلے جائیں اور نماز ختم کریں۔

خطبہ کے آداب

اب امام صاحب خطبہ پڑھیں گے عید کی نماز کے بعد دو خطبے پڑھنا مسنون ہے۔ اور دونوں کے درمیان بیٹھنا بھی مسنون ہے۔ خطبہ اولیٰ سے قبل ممبر پر نہ بیٹھیں بلکہ کھڑے ہوتے ہی خطبہ شروع کریں دونوں خطبوں کی ابتدا تکبیرات سے کرنا مسنون ہے۔ خطبہ اولیٰ کے ابتدا میں کم از کم ۹ بار پے درپے اللہ اکبر کہتے جائیں۔ اور خطبہ ثانی میں اختتام پر اترنے سے قبل ۱۴ بار پڑھنا مسنون ہے۔

صدقہ فطر کی مقدار

صدقہ فطر میں شکل میں صرف چار چیزوں سے ادا کیا جانا واجب ہے۔ گیہوں، جو، کھجور اور کشمش ان چار چیزوں کے سوا جتنے اناج یا غلہ کی قسم کی چیزیں اگر دینا چاہے تو ان کو وزن کیا جائے گیہوں یا جو کی قیمت میں جتنا بھی غلہ آسکے اتنا دیا جاسکتا ہے وزن صرف ان چار چیزوں کا مقرر کیا گیا ہے۔ لیکن چونکہ ہمارے یہاں جو کشمش اور کھجور غذا کے طور پہ استعمال نہیں ہوتے اور وہ کافی گراں ہیں اس لئے گیہوں کو ہی معیار بنایا گیا ہے تاہم اگر گیہوں کو چھوڑ کر باقی تین اشیا کی شکل میں صدقہ فطرہ ادا کرنا چاہیئے تو اس کی مقدار جو کی طرح ایک صاع ہوگی گیہوں اور جو کا آٹا اور ستو بھی گیہوں کی طرح ہیں اگر گیہوں کی بجائے چاول، جوار، باجرا یا کوئی اور غلہ دینا چاہے تو اس کا معیار بھی گیہوں کی قیمت ہوگی یعنی نصف صاع یعنی پونے دو سیر ایک ۲ ۶۳ گرام یا سوا سیر ایک کیلو۔ ۶۳ ۱ گرام گیہوں کی جو قیمت ہو اس کے دوسرے اجناس خرید کر یا اس کی قیمت دی جاسکتی ہے گیہوں یا جو وغیرہ میں اچھے برے کا لحاظ عام طور پہ

پر نہیں کیا جاتا اس کا لحاظ کرنا نہایت ضروری ہے یعنی اچھے گیہوں کی ½ صاع کی قیمت معمولی گیہوں کے ½ صاع کے لحاظ سے غلہ کی بجائے اس کی قیمت دینی افضل ہے۔

صدقہ فطر کن کن پر واجب ہے

جو شخص کہ صاحب نصاب ہو یعنی چالیس روپے نقد جو حاجت شرعی سے زیادہ رکھتا ہو اور قرض نہ ہو۔ اپنی طرف سے اور اپنی نابالغ اولاد کی طرف سے جو صاحب نصاب نہیں ان کو ایک ایک فطرہ دینا واجب ہے۔ جس شخص پر زکواۃ واجب ہے اس پر صدقہ فطر بھی واجب ہے۔ اگر کسی کے پاس سونا اور چاندی نصاب سے کم ہے۔ لیکن دونوں کی مجموعی قیمت کسی ایک نصاب کو پہونچتی ہے تو اس پر زکواۃ و فطرہ واجب ہے۔ چاندی یا سونا کسی حالت یا شکل میں ہو اس کا چالیسواں حصہ فرض ہے (۲۰۰) درم بحساب ۱۲ ماشہ فی تولہ ۳۲ تولہ ½ ۵ ماشہ چاندی کا نصاب مقرر ہے جس کا چالیسواں حصہ ۵ درم یا ۱۰ ماشہ ½ ۷ رتی ہے اس طرح سونا کا نصاب (۲۰) مثقال ہے یعنی ۵ تولہ ½ ۲ ماشہ کا چالیسواں حصہ ½ مثقال یا ایک ماشہ ۷ رتی سونا ہوگا۔ یا پھر چاندی اور سونے کی قیمت جو اس وقت بازار میں قرار پائے اس نرخ کے بموجب فطرہ ادا کرنا واجب ہے اسی طرح سونا چاندی نقد یا اسی مالیت کے زیور مال جائیداد سامان تجارت وغیرہ جس کے پاس ہو صدقہ فطر ادا کرنا واجب ہے۔ دیوانہ اور پاگل اولاد کا حکم بھی کمسن بچوں کا سا ہے نابالغ یتیموں کی کوئی جائیداد ہو تو ان کے ولی یا سرپرست ان کے مال سے صدقہ فطر ادا کریں۔ ہاں یاد رہے کہ صدقہ فطر پر زکواۃ کی طرح پورا سال گذرنا ضروری نہیں۔ صدقہ فطر کی ادائی کے لئے روزہ رکھنا شرط نہیں یعنی کسی شخص نے غفلت یا شرعی جواز (بڑھاپا یا بیماری) کے سبب روزہ نہ رکھے ہوں یا تھوڑے رکھے ہوں۔ ہر صورت میں صدقہ فطر ادا کرنا واجب ہے صدقہ فطر نماز (عیدالفطر سے قبل بلکہ ایک آدھ دن پہلے ادا کر دیا جائے تو افضل ہے۔ عید کے بعد دینے یا قبل عید دینے میں ثواب زیادہ ہے۔

صاع کا وزن

صاع کا وزن بعض علماء کرام ڈھائی سیر (۲ کیلو ۲۴۴ گرام اور بعض ساڑھے تین سیر (۳ کیلو ۶۴۰ گرام) قرار دیتے ہیں اس لحاظ سے ½ صاع کا وزن علی الترتیب پونے دو سیر یا سوا سیر (ایک کیلو ۶۳۲ گرام) اور ایک کیلو ۱۶۳ گرام) ہے یہ اختلاف اس وجہ سے ہے کہ حضور رسول معظم کے مبارک عہد میں مدینہ منورہ میں کئی مختلف مقدار وزن کے صاع مقرر تھے اس لئے احادیث میں اختلاف پیدا ہوا بعض نے تو کم سے کم قبول کیا اور بعض نے زیادہ سے زیادہ۔

غزل

از حضرت کاملؔ

اک بار ہو تو جائے محبت کسی کے ساتھ
سب غم غلط ہیں ایک غمِ عاشقی کے ساتھ

سانسیں تو چل رہی ہیں مگر سوچتا ہوں میں
اللہ! ربط کیا ہے مجھے زندگی کے ساتھ

ہوتا ہے اک ملالِ مسرت نگاہ میں
ہنستا جو دیکھتا ہوں کسی کو کسی کے ساتھ

آخر غمِ حیات کے ماتم سے فائدہ
غم زندگی کے ساتھ خوشی زندگی کے ساتھ

کیا پوچھتے ہو مجھ سے مرے دل کی آرزو
اب میری، ہر خوشی ہے تمہاری خوشی کے ساتھ

جانا ہے کس کے در پہ درِ یار چھوڑ کر
مرنا اسی کے ساتھ ہے جینا اسی کے ساتھ

کاملؔ یہ بات یاد رکھو بلکہ لکھ رکھو
خالی کبھی نہ جائے گی نسبت کسی کے ساتھ

غزل

از حضرت کاملؔ آرہ

فسانہ ہے وجودِ ماسوا اللہ ہی اللہ ہے
جدھر دیکھو ادھر جلوہ نما اللہ ہی اللہ ہے

اگر ہر عکس کرتا ہے دلالت شخص پہ اپنے
بجا ہے پھر تو یہ کہنا مرا اللہ ہی اللہ ہے

قسم اے شانِ وحدت! غیر کا دھوکا نہ کھاؤں گا
گماں کیسا یقیں جب ہو گیا اللہ ہی اللہ ہے

تجدّد ہے فقط امثال کا اس سینما گھر میں
نتیجہ کھیل کا کیا پوچھنا؟ اللہ ہی اللہ ہے

جہاں معمور ہے جلووں سے کاملؔ حسنِ مطلق کے
خدا حافظ ہے دل کا عشق کا اللہ ہی اللہ ہے

وقار خلیل

اردو میں نعتیہ شاعری

نعت کے لغوی معنیٰ کسی کی خوبیوں کو بیان کرنا ہیں۔ وصف اور نعت میں فرق یہ ہے کہ وصف میں مدح و ذم دونوں عناصر کارفرما ہوتے ہیں اور نعت کا تعلق صرف مدح سے ہے۔ ادھر تقریباً صدیوں سے یہ الفاظ مستقل اصطلاح بن گئے ہیں اور ممدوح کے تعلق سے اس کا استعمال ہونے لگا ہے۔ چنانچہ ممدوح اگر اللہ تبارک تعالیٰ ہیں تو وہ حمد و ثنا ہے اور اگر ممدوح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں تو یہ نعت ہے اور اگر صحابہ کرام، اصحابِ اہل بیت اطہار اور بزرگانِ دین و متقین ہیں تو اس کے لئے منقبت کا لفظ صنفِ شاعری میں روشن تر باب بن گیا ہے اور اگر مطلقاً کوئی سربرآوردہ شخصیت ہے تو اس کے لئے مدح مستقل صنفِ سخن رہی ہے۔

محمد طفیل مدیر نقوش لاہور نے نقوش کے "رسول نمبر" جلد دہم میں ادارتی نوٹ میں لکھا ہے کہ "نعت معتبر صنفِ شاعری ہے، اس کے اصول و معیار حضورؐ کی زندگی میں مقرر ہوئے۔ بعض شعرا کو حضورؐ نے اصلاح دی اور انعام و اکرام سے نوازا۔ شاعری کی یہ صنف حضور کی فرمایش پر وجود میں آئی۔ ایک دن سرورِ کائنات صحابۂ کرام کے درمیان تشریف فرما تھے کہ حضورؐ نے ارشاد فرمایا۔ "جو لوگ تلوار سے میری مدد کرتے ہیں انھیں چاہیئے کہ زبان سے بھی مدد کریں۔" حضرت حسان بن ثابتؓ اس اشارہ کو سمجھ گئے چنانچہ کہا "میں حاضر ہوں۔" عربی ادبیات میں حضرت حسانؓ کی نعتیہ شاعری اولین نقوشِ رسالت کو سرچشمہ تسلیم کی گئی ہے۔

اب ایک اور اقتباس، نقوش کے اسی رسول نمبر میں ڈاکٹر ریاض مجید نے "نعت" کے موضوع پر عالمانہ مقالہ لکھا ہے۔ ایک جگہ ڈاکٹر مجید نے ممتاز حسن کے ایک مقالہ کا حوالہ دیتے ہوئے نعتیہ شاعری کے موضوعات کے اظہار پر ان کے یہ خیالات رقم کئے ہیں:

"میرے نزدیک ہر وہ شعر نعت ہے، جس کا تاثر ہمیں حضور نبی کریمؐ کی ذاتِ گرامی سے قریب لائے، جس میں حضورؐ کی مدح ہو، یا حضورؐ سے خطاب کیا جائے۔ صحیح معنوں میں نعت وہ ہے جس میں محض پیکرِ نبوت کے ظاہری محاسن سے لگاؤ کی بجائے مقصدِ نبوت سے دل بستگی پائی جائے، جس میں جناب رسالت مآب سے صرف رسمی عقیدت کا اظہار نہ ہو بلکہ حضورؐ کی شخصیت سے ایک قلبی تعلق موجود ہو، وہ مدح یا خطاب بالواسطہ یا بالا واسطہ اور وہ شعر نظم ہو یا غزل، قصیدہ ہو یا مثنوی، رباعی ہو یا مثلث، مخمس ہو یا مسدس، اس سے نعت کی نوعیت میں کوئی فرق نہیں پڑتا، البتہ نعتیہ کلام کی معنوی قدر و قیمت کا دار و مدار اس کے نفسِ مضمون پر ہے اگر اس کا مقصد ذاتِ رسالت کی حقیقی عظمت کو واضح کرنا اور آقائے دو جہاں کی بعثت کی جو اہمیت نوعِ انسانی اور جملہ موجودات کے لئے ہے، اُسے نمایاں کرنا ہو تو وہ صحیح طور پر نعت کہلانے کی مستحق ہے۔"

ممتاز حسن نے نعت کی تعریف کرتے ہوئے نہ صرف یہ کہ نعت کے معیار کی نشان دہی کی ہے بلکہ مروجہ اخلاقی، مذہبی، قومی (حالی والی) اور اسلامی شاعری اور نعتیہ شاعری میں جو ایک نازک سی حدِ فاصل ہے، اُس کی بھی وضاحت کر دی ہے، یعنی نعتیہ شاعری صرف وہ شاعری ہوگی جس کے شعری پیکر میں حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی ابھاجلی یا خفی حوالہ موجود ہو، جس کا تاثر ہمیں رسولِ اکرم کی طرف لے جائے۔ گویا نعت کے لئے ضروری نہیں ہے کہ اس میں حضورِ اکرمؐ کا نام ظاہری طور پر لیا جائے یا حضورؐ کے متعلقات و مناسبات کا ضرور ہی ذکر کیا جائے۔ نعت کے شعر کی فضا ایسی ہونی چاہیئے کہ اس کا تاثر ہمیں حضورِ اکرم کی ذاتِ گرامی، ان کے منصبِ نبوت، کارِ رسالت، سیرت وسوانح یا جذبۂ عشقِ رسول کی طرف لے جائے۔ مثلاً علامہ اقبال کا شعر ہے ؎

شوق اگر تیرا نہ ہو، میری نماز کا امام
میرا قیام بھی حجاب، میرا سجود بھی حجاب

فنِ نعت اس کے لکھنے والے سے سب سے پہلے اس امر کا متقاضی ہے کہ وہ نعت لکھتے ہوئے حدودِ شریعت کی پاسداری کرے۔ خدا اور بندے کے، الوہیت اور نبوت کے فرق کو پیشِ نظر رکھے۔ دراصل حفظِ مراتب کے ادراک کا ہی نازک مقام نعت نگار کے لئے پُل صراط عبور کرنے کے مترادف ہے۔ کامیاب نعت گوئی کے لئے جس سوز و گداز، تڑپ اور تشریت د جاذبیت کی ضرورت ہے اُس کا سرچشمہ عشقِ نبی ہے۔

بلیغ الدین اشفاق نے اپنی کتاب اردو میں نعتیہ شاعری میں ایک جگہ تحریر کیا ہے کہ :

"نعت کا لفظ جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصف کے لئے حضرت علی کرم اللہ وجہ سے منقول ہے۔ غالباً اسلامی ادب میں اس معنی میں اس کا استعمال پہلی دفعہ کیا گیا ہے جس کا ہے۔ "آپ پر یکایک جس کی نظر پڑتی ہے، ہیبت کھاتا ہے، جو آپ سے تعلقات بڑھاتا ہے، محبت کرتا ہے۔ آپ کا وصف کرنے والا یہی کہتا ہے کہ آپ سے پہلے نہ آپ کے جیسا دیکھا اور نہ آپ کے بعد آپ کے جیسا دیکھا۔"

بیشتر صحابہ کرام نے اپنی نعتوں میں حضور ختمی مرتبت کے معنوی اوصاف کا ذکر کیا ہے تو دوسری طرف آپ کے حسن و سیرت کا نقشہ بھی پیش کیا ہے، چونکہ جمالِ محمدی کا مشاہدہ انھوں نے اپنی آنکھوں سے کیا تھا اس لئے انھیں تخیل سے کام لینے کی ضرورت نہ رہی۔

ہر دور اور تقریباً ہر زبان میں نعت گوئی کا سلسلہ جاری ہے۔ جب اسلام کی شعاعیں ایران پہنچیں اور وہاں کے اربابِ شعر و سخن نے نظم گوئی کی طرف توجہ کی تو نعت میں قابلِ قدر تخلیقات منظرِ عام پر آئیں جن میں حافظ، سعدی، قدسی اور جامی کے نام زیادہ روشن ہیں۔ ایران سے شاعری کا یہ سیلاب جب ہندوستان پہنچا تو تمام اصنافِ سخن کے ساتھ نعت گوئی کا حق بھی ادا کیا گیا۔

دکن میں اردو کی پہلی منظوم تصنیف فخرالدین نظامی کی مثنوی "کدم راؤ پدم راؤ" کو مسلمہ حیثیت حاصل ہے جو بہمنی دور سے علاقہ رکھتی ہے۔ اس مثنوی کی زبان ایسی ہے جس میں سنسکرت اور پراکرت کے سینکڑوں الفاظ استعمال ہوئے ہیں، جس سے اُس دور کے ایران اور عرب سے آنے والے نو واردانِ دکن کے میل جول کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس مثنوی کی شروعات حمد سے ہوتی ہے اور پھر نعت کے ساتھ آگے بڑھتی ہے۔ نعت کے یہ اشعار ۔

محمد بڑا راوت جگ اتھا	کہ شجرہ چرن رائے جگمگ اتھا
نبی یار تھے، یار تھے جھار جھار	بچارن نبی کام کرتے بچار
نظامی جس اوپر بھری ایک چک	رتن لال موتی بھرے تیس مکھ

دکھنی کے محققوں نے حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی نعت کو اردو کی پہلی نعت کے نام سے یاد کیا ہے ۔

اے محمد، جھلو جم جم جلوہ تیرا	ذات تجلی ہووے گی سین سپورن بھرا
واحد آپ ہی آپ تھا، اپیں آپ نجھایا	پرگٹ جلوہ کارنے الف میم ہو آیا
فاضل، افضل جتے مرسل، ساجد سجود آئے	اُمت، رحمت، بخشش، ہدایت تشریف پائے

دکھنی شاعری میں جن شعرائے کرام نے اپنی تصانیف میں نعتیہ شاعری کے اُفق کو روشن کیا ان میں اشرف، محمد قلی قطب شاہ، ملا وجہی، محمد قلی قطب شاہ، معانی قابلِ ذکر ہیں۔ معظم بیجاپوری جس نے "معراج نامہ" ایسی اہم مثنوی لکھی۔ نصرتی اور ہاشمی نے بھی اپنی مثنویوں میں واقعۂ معراج پر اور ابن نشاطی نے "پھولبن" میں محسنِ انسانیت کی بارگاہ میں نذرانۂ سخن ادا کیا ہے۔

قطب شاہی عہد کے باکمال سخنور ملا وجہی جس کی نثری تصنیف "سب رس" دکنی کے ادبِ عالیہ میں شمار ہوتی ہے۔" اپنی مثنوی "قطب مشتری" میں نعت کے یہ شعر رقم کرتا ہے ؎

محمد نبی ناؤں تیرا رہا ہے — عرش کے اُپر پاؤں تیرا رہا ہے
کہ چودہ طبق کا تو سلطان ہے — علی سا ترے گھر میں پردھان ہے
اسی ہور اک لاکھ پیغمبر آئے — ولے مرتبہ کوئی تیرا نہ پائے
صفت کر توں معراج کی رات کا — کہ جاگیا ہے بخت تج بات کا
اتھاہ اس زمیں کو عجب کو چ نور! — کہ لاکھاں ستے چانداں کروراں تھے سور

علی عادل شاہ ثانی کے دربار کا محبوب اور نابینا شاعر سید میراں ہاشمی بیجاپوری کے "معراج نامہ" سے چند ابیات پیش ہیں ؎

نبیاں میں جسے سب میں افضل کیا — تو ہے اے محمدؐ رسول انبیار
اول کر محمد کوں پرور دگار! — بزاں سب خدائی کیا آشکار
اول نور ذاتی کو پیدا کیا — بزاں سب پو عالم ہویدا کیا
نبیاں کا تو دادا ہے آدم صفی — کہ روحاں کا دادا ہے خاتم نبی

ہماری زبان میں سب سے پہلے میلادناموں کا آغاز دکھنی یعنی اردو سے قدیم سے ہوا، جو جنوبی ہند، حیدرآباد، گولکنڈہ، بیجاپور اور گلبرگہ میں لکھے گئے میلادناموں پر برصغیر ہند و پاک کی جامعات میں ڈاکٹریٹ کے لئے ریسرچ کی گئی ہے۔

اردو شاعری میں اسلامی اقدار اور کرداروں کا جس طور اور جس طریق میں گذشتہ پانچ سو سال سے اظہار ہو چلا ہے اُن میں عمومی طور پر کم و بیش ہر شعری مجموعہ کا آغاز حمد اور نعت سے ہوا کیا اور آج بھی یہ روایت روشن نظر آتی ہے۔ ثنائے رب اور نعتِ رسولِ مقبول کا التزام ہند مسلم اتحاد کا ایسا نمونہ ہے، جسے نہ زمانوں کی سیاست نے متاثر کیا اور نہ فرقہ وارانہ تعصب و تنگ نظری نے اثر چھوڑا۔ محسنِ انسانیت حضور سرورِ عالم کی شانِ نبوی کو ہر عہد اور زمانے کے

سخنوروں نے دل کی گہرائیوں سے قبول کیا اور اپنے اپنے فکر و وجدان کے سہارے اپنے جذبات کی ترسیل کو روا رکھا۔

اسلام میں خدا، قرآن اور رسول کا مثلث جن حدود کا تعین کرتا ہے، وہ اصولِ فطرت کے عین مطابق ہیں۔ فطرت اسی معنٰی میں مسلمان ہے کہ ہمیشہ اپنی حد میں رہتی ہے اور لامحدود امکانات کا سراغ دیتی ہے۔ اردو کی سات سو سالہ نعتیہ شاعری کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ بات محسوس کی گئی کہ تخیل کی بلند پروازی اکثر مقامات پر حد سے تجاوز کر گئی ہے۔ قرآنِ حکیم کے مطالعے سے یہ نمایاں ہوتا ہے کہ شخصیت کی عظمت میں عبدیت کا تعین اور اس کی اہمیت پر اصرار ہے۔ عبدیت کا نقطۂ عروج ہے کہ معراج کی معرفت انسان کو خدا کے قرب کی عظمت ہوتی ہے۔ یہی عظمت ہمیں بشریت پر غور کرنے کی دعوت دیتی ہے۔ علامہ اقبال نے اس نکتہ پر مروجہ مذہبی عقائد کے بجائے سائنسی انداز میں یوں سوچا ؎

سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفٰےؐ سے مجھے　　　کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں

اور اس مقامِ ارتفاع کا ادراک حاصل کر کے یہ فیصلہ دیا کہ ؎

متاعِ بے بہا ہے درد و سوزِ آرزو مندی　　　مقامِ بندگی دے کر نہ لوں شانِ خداوندی

عالمِ انسانیت میں افضل و برتر مقام صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ بابرکات کو حاصل ہے اور ہمارے لئے رہنمائی کے چراغ ان کے نقشِ کفِ پا ہیں۔ ہمارے عہد کی خوش نصیبی ہے کہ اقبال ایسا شاعر ہمیں نصیب ہوا جس نے مذہبی عقائد و نظریات پر بھی ہمیں سائنسی انداز سے سوچنے کا حوصلہ دیا اور ایسی نعتیہ فکر عطا کی جو شخصیت کے معنوی ادراک کا در باز کرتی ہے اور ہمارے شعور پر رسولِ اکرم کی عظمت کے نئے افق روشن کرتی ہے ؎

لوح بھی تو، قلم بھی تو، تیرا وجود الکتاب　　　گنبدِ آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب

اردو میں نعت گو شعراء کا تذکرہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے پاکستان سے مرتب اور شائع کیا ہے نعت گوئی صوفیوں کا محبوب مشغلہ رہا ہے اور اس صنف کو رواج دینے اور مقبول بنانے میں انھوں نے نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ آنحضرت صلعم سے بے پناہ عقیدت و محبت اور کارِ ثواب و وسیلۂ نجات کے پیشِ نظر مسلم شاعروں کی نعت گوئی جہاں ایک فطری عمل قرار پاتی ہے وہاں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سی چیز ہے جس نے ہندو شعرا کو نعت گوئی کی طرف مائل کیا۔ ظاہر ہے رسولِ اکرم کے حسنِ اخلاق، انسان دوستی، مومن و کافر سے مساویانہ سلوک، رحمدلی، سخاوت، انصاف اور

انسانیت پر مبنی تعلیم اور اس پر عمل ان کے چند ایسے اوصاف حمیدہ ہیں، جن کی مثال تاریخ عالم پیش کر سکتی۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اوصاف حمیدہ سے مسلم و غیر مسلم دونوں کو یکساں طور پر متاثر کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلم شعرا کے دوش بدوش ہمیں ایسے ہندو شعرا بھی ملتے ہیں جنھوں نے نعت لکھی ہے اور اپنی عقیدت مندی کا اظہار کیا ہے۔ ان نامی گرامی شعرا میں کبیر داس، درگا سہائے سرور جہان آبادی، مہاراجہ سرکشن پرشاد، دلورام کوثری، برج موہن دتاتریہ کیفی، ہری چند اختر، تلوک چند محروم، رگھوپتی سہائے فراق، جگن ناتھ آزاد، منور لکھنوی، مُدنا منظر اور حیدرآبادی شاعر منوہر لال بہار جن کی نعتوں کا مجموعہ "افکارِ نورانی" شائع ہوا ہے، ان کے علاوہ راگھویندر للکھینجب، سکینہ الہام، کنول پرشاد کنول، دامودر ذکی ٹھاکور قابلِ ذکر ہیں۔

دلورام کوثری حقیقی معنوں میں نعت گو شاعر تھے انھیں اس حد تک نعت گوئی میں انہماک تھا کہ وہ خود کو فخریہ انداز میں اردو کا حسان بن ثابت سمجھتے تھے، کہتے ہیں ؎

لکھیں عمر بھر کوثری ہم نے نعتیں — نہ کچھ اور غمِ زندگانی میں رکھا
ہے حسان پہلا تو میں دوسرا ہوں — نہیں فرق اوّل و ثانی میں رکھا
خدا نے اُسے سونپی محفل عرب کی — مجھے بزمِ ہندوستانی میں رکھا

کوثری نے ایک غیر منقوطہ نعتیہ دیوان بھی اپنی یادگار چھوڑا ہے۔

پنڈت ہری چند اختر کے یہ مشہور زمانہ نعتیہ اشعار ؎

کس کی حکمت نے یتیموں کو کیا دُرِّ یتیم — اور غلاموں کو زمانے بھر کا مولا کر دیا
آدمیت کا غرض ساماں مہیا کر دیا — اک عرب نے آدمی کا بول بالا کر دیا

ہمارے عہد کے سب سے بڑے اور آخری شاعر رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری کے یہ اشعار ؎

انوارِ بے شمار معدود نہیں — رحمت کی شاہراہ مسدود نہیں
معلوم ہے کچھ تم کو محمدؐ کا مقام — وہ امتِ اسلام میں محدود نہیں

آج کے اقبال آشنا سخنور جگن ناتھ آزاد نے حضور اکرم کی خدمتِ اقدس میں یوں سلام گزرانا ہے ؎

سلام اُس ذاتِ اقدس پر سلام اُس فخرِ دوراں پر
ہزاروں جس کے احسانات ہیں دنیائے امکاں پر

بڑے چھوٹے میں جس نے اک اخوت کی بنا ڈالی
زمانے سے تمیزِ بندہ و آقا مٹا ڈالی

تاریخ کے ہمہ وقت تبدیل ہوتے ہوئے تناظر میں مذہب کو مینارۂ نور قرار دینے کا رجحان عصرِ حاضر میں مغرب ہو کہ مشرق ہر جہت اور ہر اُفق کو روشن کر رہا ہے۔ موضوع کی وسعت اور مکروہاتِ زمانہ کی تنگ دامنی کے سبب ادھورا مطالعہ پیشِ خدمت ہے۔
میں پروفیسر مغنی تبسم کا شکر گزار ہوں کہ اس باب میں پاکستانی شعراء کی نعتیہ شاعری سے استفادہ کا موقع مرحمت فرمایا۔ اس گفتگو میں کسی حاشیہ آرائی کے بغیر پاکستانی شعراء کی نعتوں سے چند اقتباسات پیش ہوں گے۔

عصری شاعری جسے ہم 'جدید' ترقی پذیر یا بڑی شاعری بھی کہیں گے 'حضورِ اکرم کی ذاتِ مستودہ صفات اور پیامِ انسانیت کو اپنے انداز' اسلوب اور طریق میں روشن کرنے کا بے پناہ سلیقہ رکھتی ہے اور حدود و مراتب سے آشنائی کا لحاظ بھی کرتی ہے۔ انور جمال کے نعتیہ مسدس "لولاک لما" پر تبصرہ کرتے ہوئے انور سدید نے اس خیال کی یوں تائید کی ہے۔ "اس طویل نعتیہ مسدس میں حضوری کی کیفیت بھی موجود ہے اور وہ عرفانی صورت بھی 'جب لوح پر ظاہر ہونے والا ہر لفظ حضور نبی کریم کی ذاتِ مستودہ صفات کا مدح سرا بن کر ذہن و دل کا زنگ اتار دیتا ہے' انور کی خوبی یہ ہے کہ اس نے طغیانِ اظہار میں شعورِ عشق کو پیشِ نظر رکھا اور عقیدت کے تپیدہ جذبے کو بے راہ روی کی اجازت نہیں دی۔ چنانچہ وہ نعت نگاری کے مقدس فریضے سے کامیاب و کامران گزرے ہیں اور انہوں نے فن کے آبگینوں کو بھی طہارت و نفاست آشنا کر دیا ہے' لفظ ان پر انوار کی بارش بن کر برستے ہیں اور جذبہ اس بارش میں یوں بھیگ جاتا ہے کہ حضور کی سیرت کی خوشبو مسدس کی زمین سے نکل کر قاری کی طرف مسحور کن انداز میں لپکنے لگتی ہے۔" اسی رائے کا عکس اور رنگ اب پیش کی جانے والی پاکستانی نعتوں پر ہم بآسانی محسوس کریں گے۔ عرض یہ ہے کہ انور کی یہ مسدس دستیاب نہ ہو سکی۔

سب سے پہلے انور سدید کی نعت کے اشعارِ سلکِ مروارید ملاحظہ ہوں

یہ چاند چہرۂ اقدس کا پھول ہو جیسے یہ کہکشاں ترے قدموں کی دھول ہو جیسے
یہ کیفیت تھی رسالت مآب سے پہلے بشر کے ساتھ زمیں بھی ملول ہو جیسے
زباں پہ ذکرِ محمدؐ ہو آنکھ پر نم ہو تو یوں لگے کہ دعا قبول ہو جیسے

طمانیت مرے دل کو ہوئی نصیب تو یوں — کہ سر پہ میرے بھی دستِ رسول ہو جیسے
یہ نعت لکھی ہے انور سدیدیوں میں نے — کہ میرے سامنے میرا رسول ہو جیسے

حسن رضا عابد نے نذرانۂ عقیدت کے زیرِ عنوان نعتیہ نظم میں یوں خراج پیش کیا ہے ؎

لغاتِ دہر کے ایک اک ورق سے / بولتے ہر لفظ کو
قرطاسِ سادہ پر اگر رکھ دوں!
میانِ ارض / بہتے پانیوں / شفاف چشموں، قلزموں میں / اپنے ایقان کی
چمکتی روشنائی بھی اگر گھولوں!
لچکتے نرم پودوں / اور فلک چھوتے درختوں کی / مہکتی ٹہنیوں سے اک قلم مانگوں
تو پھر بھی ہادیٔ برحق!
ترا نامِ مبارک / اسمِ اعظم / میرے جیسے کم سخن
بے نام شاعر سے کبھی لکھا نہ جائے گا!!

اب صائمہ قریشی کی نظم "مرے پیمبرؐ" کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

مرے پیمبرؐ! بکھر گئی ہوں / تمام راستے / حبیب اندھے کنوئیں کی جانب سمٹ گئے ہیں
میں سوچتی ہوں کہ بات مانوں تو کس کی مانوں / کہ میرے اندر / کہ میرے باہر
تضاد لاکھوں جھلک رہے ہیں
سوال لاکھوں اُبل رہے ہیں / محبتوں اور نفرتوں کا عجیب لاوا
مری نسوں میں کئی برس سے پگھل رہا ہے
جواب پاؤں تو کس سے پاؤں / تمام انسان مضطرب ہیں
کئی برس سے میں رو رہی ہوں
خطائیں لاکھوں قدم قدم ساتھ چل رہی ہیں / میں ایک ذرّہ، بہت ہی عاجز
بہت ہی پاگل / مجھے کوئی راستہ دکھا دے

عطاء اللہ قاسمی کے اشعار "از دل ریزد و بر دل خیزد" کے مصداق ہیں ؎

ہم اصل کا نقشِ پا بھولے ہوئے ہیں — خدا وندا! یہ کیا بھولے ہوئے ہیں
چلو پھر لوٹ جائیں اس طرف کو — جدھر کا راستہ بھولے ہوئے ہیں
اسے سوچیں تو یاد آتا ہے ہم کو — کہ ہم تو مدعا بھولے ہوئے ہیں

تبسم ہم کو عطا شیریں لبوں کی   بیاں کا ذائقہ بھولے ہوئے ہیں

اسحٰق فرزی کی نعت "مطلع الفجر کا لمحۂ اولین" سے ایک بند ملاحظہ ہو :-

پھر ایسے میں غارِ حرا کے خنک بطن سے اک نئی روشنی کا تولد ہوا
نور و نکہت کی یورش سے کوہِ حرا پر مقدس صحیفہ اُترنے لگا
مرحمتِ دو جہاں سرورِ انبیاء تاج و تختِ نبوت کے منصب پہ فائز ہوئے
روشنی اتنی پھیلی کہ اس کی چکا چوند سے اندھے لوگوں کو بینائیاں مل گئیں
اور پھر سب نے دیکھا
اندھیرے افق چھوڑ کر خود اماں کی تگ و دو میں روپوش ہونے لگے ہیں
جہالت کے تاریک بادل فلک سے اُتر کر سمندر کی آغوش میں رو رہے ہیں
یہی مطلع الفجر کا لمحۂ اولیں تھا

اعجاز فاروقی کی نثری نظم "محمدؐ" کے اُفق پر روشن لفظوں کا یہ دروبست ملاحظہ ہو :-

وہ، اُفق کی سمت بہتا ہوا صحرائے بسیط / آسمانوں کی طرف اڑتی ہوئی ریت کی مثال
وہ ہر ایک ذرّہ میں خورشید درخشاں کا طلوع / ریت کے ماتھے پہ وہ چاندی کا جھومر
اس کی زلفوں میں چمکتی ہوئی افشاں / فرش پر اونچے کھجوروں کے ستون
منتظر تھے نور کے عرش کو شاخوں پہ بٹھانے والے
مگر انسان تھا ان روشنیوں کا دُشمن / لفظ پتھر تھے بتوں کی مانند
اور وہ آیا / وہ، اک نور کی کملی اوڑھے / اس کی آنکھوں سے شعاعیں برسیں
ریت کی دھند چھٹی / اُس کے ہونٹوں سے ترنم کی وہ لہریں پھوٹیں
لفظ پھر زندہ ہوئے / لفظ جن میں ہے خدا کا سایہ
لفظ جن میں تیری میری تصویر۔

اب آخر میں ہندوستانی شاعر صلاح الدین پرویز حال مقیم سعودی عرب کی ایک نعت کا اقتباس پیش ہے۔ پرویز کی اس نعت کا عنوان " ایک التجا بحرا خط اللہ تعالیٰ کے نام " ہے اور ایک نوٹ بھی مندرج ہے، جس میں لکھا گیا ہے کہ ۲۹ اگست ۱۹۸۴ء کی وہ کیفیت جب لاہور کی شاہی مسجد میں رسول اللہ کے پاؤں کے نقوش دیکھے تو یہ پاؤں میری روح پر پھیل گئے اور پھر سارے جہان و آسمان ان دو پاؤں سے زیادہ نظر نہیں آئے۔ صلاح الدین پرویز کی نعت

شاعری کا اِدھر چند سالوں سے تمام و کمال اُفقِ اسلامیات سے گلنار ہو چلا ہے۔ جدید تجربوں کو پرویز نے ہند المانی اور عرب و عجم کے آمیزہ سے کچھ ایسا دھنک رنگ کر دیا ہے کہ پڑھتے ہوئے نئے پن کا احساس ہوتا ہے۔ "محمدؐ" ان کی نعتیہ مسلسل نظم کا عنوان ہے جو کئی زبانوں میں چھپ چکی ہے۔ اب پرویز کی نظم کے ان ابیات پر توجہ چاہوں گا ؎

اندھیری راتوں میں چاند دیکھوں / وہ چاند افضل، ازل سے افضل
ابد تلک چاندنی میں افضل / بہت بنائے ہیں تو نے چہرے
مگر وہ دو پاؤں جو بنائے / تمام چہروں سے خوبصورت
وہ کون ہے جو زمیں پہ اپنی نگاہ کے بوسے رکھ گیا ہے
وہ کون ہے جو ہمارے دل پر پناہ کے تحفے رکھ گیا ہے
وہ کون ہے جو ہماری حیرت کی بستیوں میں / حسین اک چھاؤں رکھ گیا ہے
وہ کون ہے جو تمام ارض و سما کی پلکوں کی مستیوں میں / گداز دو پاؤں رکھ گیا ہے
کہ اب زمیں کا ہر ایک چہرہ / کہ اب فلک کا ہر اک ستارہ
بہت پرانا بہت ہی بد شکل لگ رہا ہے
بہت بنائے ہیں تو نے چہرے / مگر وہ دو پاؤں جو بنائے
تمام چہروں سے خوبصورت
وہ میرے ماتھے کی بندگی ہیں / وہ میری آنکھوں کی روشنی ہیں
وہ فجر میرے، وہ ظہر میرے، وہ عصر میرے / وہ مغرب میرے
عشاء کے لمحوں میں آنکھ تیکھے / وہی سلامت وہی سنہرے
بہت بنائے ہیں تو نے چہرے / مگر وہ دو پاؤں جو بنائے / تمام چہروں سے خوبصورت
اگر اجازت تو ایک سجدہ / بس ایک سجدہ، بس ایک سجدہ

دبستانِ دکن کے قدیم اور جدید شاعروں نے عمومی طور پر اپنی تصانیف میں نعت کو شامل کیا ہے اور یہ سلسلہ عصر بہ عصر، عہد بہ عہد چلتا رہے گا۔ گفتگو کے اختتام سے پہلے میں ان شعرائے کرام کے نام پیش کروں گا، جن کی کتابیں مطبوعہ ہو کر عاشقانِ رسولؐ کی آنکھوں کا سرمہ اور دل کا سرور بن چکی ہیں۔ ان میں الطاف حسین حالی، امیر مینائی، محسن کاکوروی، غلام مصطفیٰ عشقی، غلام امام شہید، فصاحت جنگ جلیل، اعظم علی شائق، سیماب اکبرآبادی، امجد حیدرآبادی، حفیظ جالندھری،

ناظر احسن گیلانی ، عبدالقدیر حسرت صدیقی، تسکین قریشی، ماہر القادری، بہزاد لکھنوی، عبدالعزیز خالد، عمیق حنفی، عرش ملسیانی، مرزا شکور بیگ، تہنیت النسا بیگم زور، حسام الدین فاضل، عمر انصاری لکھنوی، شکیل بدایونی، مظفر الدین صاحب حیدرآبادی، علی اکبر رعنا اکبرآبادی، ازش پرتابگڑھی، بیکل اتساہی، فخرالدین رازی اور بے ہوش محبوب نگری شامل ہیں۔

۱۹۸۱ء میں راقم السطور نے پندرھویں صدی ہجری کی مسرت میں نعتوں کا ایک مجموعہ "روشنی ہی روشنی" کے نام سے شائع کیا تھا اس مجموعہ میں خواجہ بندہ نوازؒ سے وقار خلیل تک دکن کے ۹۲ نعتوں کو یکجا کیا گیا ہے۔

کیا مرا منہ ہے، مری مدح نگاری کیا چیز
جب خدا خود ہے ثنا خوانِ رسولِ عربی!

(حیدرآباد لٹریری فورم میں پڑھا گیا)

نقیر بیدار بیدی وارثی

التجا
بحضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم

رحمتِ کبریا، تاجدارِ حرم اس طرف بھی نگاہِ کرم کیجیے
اشرف الانبیا، فخرِ کون و مکاں میری بگڑی ہوئی کو بنا [illegible]

اے حبیبِ خدا، نورِ ربُّ العلا فرش سے عرش تک آپ کی ہے ضیا
ظلمتوں کو مجلّیٰ بنا دیجیے، دل کی دنیا مرے جگمگا [illegible]

وارثِ دو جہاں کا تصدق ملے، مالکِ انس و جاں کا تصدق ملے
آلِ خیر النساءؓ کا تصدق ملے اک بھکاری ہوں صدقہ [illegible]

کشتیِ دل ہے اور غم کا طوفان ہے، بس خدا ہی ہمارا نگہبان ہے
رحمتوں کے سہارے پہ ہے آسرا، پار بیڑا ہمارا لگا [illegible]

خاتم الانبیاء، شاہِ جن و بشر، اے شفیعِ امم، ہادیِ دوسرا
ہے یہ بیدارِ خستہ غلام آپ کا، اپنے قدموں میں آقا بلا لیجیے

شعرا

قافیہ کی میزان میں

اس مست کے دہن کو جو غنچوں سے دوں مثال	آنے لگے گلاب سے بھی بو شراب کی	ناسخ
غیبت سے میکشوں کی یہ حاصل ہوا فقط	واعظ کے منھ سے آنے لگی بو شراب کی	اسیر
یا محتسب کو دیتے تھے ہم درسِ احتساب	یا مشق رہتی ہے خطِ جامِ شراب کی	رشک
دریا رواں ہے فرقتِ ساقی میں چشم سے	درکار اب ہوئی مجھے کشتی شراب کی	گویا
مرنے سے میرے محفلِ ماتم ہے بزمِ مے	ساقی سیاہ پوش ہے بوتل شراب کی	قلق
دکھلا رہی ہے دخترِ رز رنگِ برقِ طور	چوٹی ہے طور کی مجھے بوتل شراب کی	امیر
گر آگ میکشی کی سزا ہے تو یا خدا	دوزخ میں ایک نہر بہا دے شراب کی	داغ
لاشہ مرا ہے یا مئے رنگیں کی موج ہے	تربت مری ہے یا کوئی بوتل شراب کی	ریاض
واعظ مئے طہور جو پینا ہے خلد میں	عادت ابھی سے ڈال رہا ہوں شراب کی	جلیل
سب میکدے پہ ٹوٹ پڑے ابر دیکھ کر	آئی گھٹا تو بڑھ گئی قیمت شراب کی	اختر مینائی
کیفیتیں دکھاتی ہے بارش سحاب کی	بادل سے بھی ٹپکتی ہیں بوندیں شراب کی	جلال
توبہ تو کی ہے مے سے مگر اعتبار کیا	ساقی لگی رہے کوئی بوتل شراب کی	تسلیم
شرکت گناہ میں بھی رہے کچھ ثواب کی	توبہ کے ساتھ توڑیئے بوتل شراب کی	ظہیر دہلوی
پیتے ہی مے فراق میں چھلنی ہوا جگر	چھروں کا کام کر گئیں بوندیں شراب کی	مضطر خیرآبادی
ٹوٹی اگر یہ شیخ تو ٹوٹے گا دم مرا	پیمانہ عمر کا ہے صراحی شراب کی	وسیم
تا ہو تمیز راہِ عذاب و ثواب کی	مسجد کے پاس چاہیے بھٹی شراب کی	حفیظ جونپوری

ادارہ

ایک خط

عابد قادری

"منظور ہے نگارشِ احوالِ واقعی"
اور
"منظور کچھ نگارشِ حُسنِ بیاں نہیں"

؎ اک ان کو دیکھنے کے لئے بزم میں مجھے ؎ اور وں کی سمت مصلحتاً دیکھنا پڑا

محترمہ بلقیس!

؎ افسانۂ بہار اسیرِ قفس سے سُن ؎ یادِ وطن کا لُطف کسی بے وطن سے پوچھ

السلام علیکم۔

دل کی ہزار گہرائیوں سے نکلی ہوئی پر خلوص دعاؤں، تمناؤں، آشاؤں کے ساتھ درگاہِ قاضی الحاجات میں تم سب کی سلامتی، اقبال مندی اور درخشاں مستقبل کا آرزومند ہوں۔ خود خیریت سے ہوں اور تم سب کی خیریت کا طلبگار ہوں۔

؎ ترے دیار سے نکلے ہوئے تو دیر ہوئی ؎ ترے صحن میں میرا سایہ گھومتا ہو گا

یقین کرو حیدرآباد سے نوّے میل دور ورنگل آچکا ہوں، لیکن اس تفاوت کے باوجود میں خود کو اسی ماحول میں، اسی فضاؤں میں پاتا ہوں، جہاں تم سب ہو کیونکہ ؎

عجیب بات ہے یہ بھی عجیب تماشہ ہے
تمھاری یاد میرے ساتھ ساتھ آئی ہے

اور کیوں نہ ہو تم سب کے اخلاص، خلق و مروت، جذبۂ ایثار و ہمدردی کا اقتضا بھی تو یہی تھا کہ جہاں کہیں بھی رہوں، تم سب کو بھولنے نہ پاؤں، اپنے محسنوں کے احسان کو، مخلصوں کے اخلاص کو، کرم فرماؤں کی کرم فرمائیوں کو جو فراموش کرتے ہیں، بھول جاتے ہیں تو اس سے بڑھ کر رذالت اور کیا ہو گی؟ شرافتِ نفس اور عظمتِ کردار اسی میں تو ہے کہ آدمی خود فراموش ہو نہ کہ احسان فراموش کیونکہ حدیث شریف میں آیا ہے "جو اپنے ساتھی کا احسان بھول جائے وہ خدا کا احسان کیا یاد رکھے گا"۔ تم بہنوں، بھائیوں نے اپنے سلوک، اپنے برتاؤ سے، اپنے خلوص، اپنے پیار سے مجھے اتنا گرویدہ کر لیا،

جون ۱۹۸۳ء

ذوقی نظر حیدرآباد

ایسے ماحول میں یوں رنگ لیا ہے کہ مجھے اب اس ماحول سے دور ہو کر کسی اور ماحول کو قبول کرتے جھجک ہوتی، حجاب آتا ہے، حتیٰ یہ کہ مجھ سے میرا اپنا ماحول بھی فراموش ہو گیا۔ تم لوگوں کی سادگی مزاج نے مجھے اس درجہ متاثر کیا ہے کہ اب ؎

تم سے دوری کا الم تاک تاثر کیا کیا
میرے احساس پہ طاری ہے تمھیں کیا معلوم

وہ لمحات حیات جو کسی تم سب کے ساتھ گزرے ہیں تاریخ حیات کا روشن باب بن کر چمک رہے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس سے وابستہ ہر حسین یاد آج بھی نہاں خانۂ دل میں محفوظ ہے۔ کبھی اس یاد سے کیف ہستی سرور جاں پاتا ہوں تو کبھی اسی یاد کو سینہ سے لگائے تنہا بہ تقدیر کار زار حیات میں ایک عزم نو کے ساتھ سرگرم عمل ہو جاتا ہوں۔ اسی یادگار دور زندگی کے بارے میں اور کیا لکھوں — کہ

؎ دلچسپ حادثوں سے عبارت تھی زندگی
مڑ مڑ کے دیکھتا ہوں اسی رہگذر کو میں

ماضی کا ہر روپ سامنے ہے، ہر یاد تازہ ہے — سکون قلب چھن چکا ہے — دامن ضبط تار تار ہے — وحشت بڑھ جاتی ہے — دل گھبرانے لگتا ہے، اور بے ساختہ اس شعر کی گردان شروع کر دیتا ہوں ؎ یاد ماضی عذاب ہے یارب! چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

اس وحشت اثر کیفیت سے جب کسی حال چھٹکارا نہیں ملتا اور اس عالم بیچارگی میں جب یہ شعر بھی ذہن کے کسی گوشے سے سر ابھارنے لگتا ہے ؎

اک بار تجھے عقل نے چاہا تھا بھلانا
سو بار جنوں نے تری تصویر دکھائی

— تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے یہ میری بے بسی پہ مجھے منہ چڑھا رہا ہو۔

سچ ہے ماحول سے فرار ہر ایک کے بس کا روگ نہیں" نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن ؎

کس قیامت کی کشاکش ہے دورا ہے پہ نہ پوچھ
نہ ادھر ہوتی ہے دنیا نہ ادھر ہوتی ہے

ہنسی آتی ہے جب یہ سوچتا ہوں ؎

اکثر تمھاری یاد سے دل کو سکوں ملا
اکثر تمھاری یاد ہی بے چین کر گئی

دیار غیر میں کسی غریب الدیار کیلئے "وطن کی یاد" سے بڑھ کر اور کچھ نہیں ہوتا۔ یہی یادیں اس کے لئے سامان تسکین اور یہی اس کی مونس اور دمساز ہوتی ہیں۔ غمخوار یہی یادیں، ہمراز یہی یادیں ؎

عہد فرقت میں یادوں کی رعنائیاں
جیسے جاگا ہو خواب چمن دیکھ کر

مسافر انہیں یادوں کے سہارے، انہیں کے حسین و دلفریب، پر کیف و پر بہار تصور کی روشنی اور اس کے

اجالے میں کشاکشِ روزگار کی پرواہ کیئے بغیر زندگی کے تاریک و دشوار مرحلوں سے نظریں ملاتا ہوا ہنستا ہنستا گذرجاتا ہے اور یہاں وقت کے گھمبیر اندھیرے ڈسنے لگتے ہیں، ظلمتِ یاس قوتِ ضبط کو سلب کرنے بڑھتی ہے اور انتہائی بے بسی کا احساس شدید سے شدید تر ہو جاتا ہے تب اس کے ہاتھ یادوں کی شمع فروزاں کر دیتے ہیں۔ اس کی لو اور بڑھا دیتے ہیں ؎

یہ تنہائی کی تاریکی تو ڈستی اور بھی ہمدم ؎ غنیمت ہے کہ یادوں سے چراغاں کرلیا میں نے

ہر مسافر حالتِ سفر میں زادِ سفر کی طرح وطن سے وابستہ ماضی کی یادوں کو سینے سے اس لگا رکھتا ہے جیسے وہ سمجھا ہو ؎

زندگی درد کا تپتا ہوا صحرا ہوتی ؎ نرم یادوں کا اگر اس پہ نہ سایا ہوتا

بلقیس! تم نے پوسٹ گریجویشن کے لئے یونیورسٹی میں داخلہ لیا ہوا ہے، تمھاری تعلیمی مصروفیات اور گھریلو ذمہ داریوں کے پیشِ نظر یہ خط تمھیں نہیں بلکہ اوروں کو لکھا ہوتا اس کا احساس ضرور ہے لیکن مجبوری!! ؎ ہر ناگوار چیز کو گوارا بنا دیتی ہے بس یہی سمجھو، یہی مجبوری تھی کہ ؎

دشمنوں سے مروت بھی کرنی پڑی ہے ؎ آج کے دوستوں کا چلن دیکھ کر

یا یوں سمجھو کہ مجبوری ایسی ہی تھی کہ ؎

اک ان کو دیکھنے کے لیئے بزم میں مجھے
اوروں کی سمت مصلحتاً دیکھنا پڑا

مجھے وہ رات آج تک بھی نہیں بھولتی جس کی صبح میں نے ورنگل کے لیئے حیدرآباد کا قیام ترک کیا، اس رات کے تصور ہی سے بڑی مایوسی، بڑا قلق، بڑا دکھ ہوتا ہے۔ سوچتا ہوں کاش گیڈر کی موت نہ آتی اور نہ ہی وہ آبادی کا رخ کرتا، سوچتا ہوں کاش اس رات میں ادھر تمھارے گھر ہی رہ سکتا اور نہ ہی مفت کی یہ الجھن، یہ خلش میرے سر ہوتی اور غارت گرِ صبر و قرار بن کر سایہ کی طرح یہاں تک میرے تعاقب میں چلی آتی اور ع چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسدؔ کے مصداق بار بار مجھ سے یہ کہتی ؎

اے متاعِ سکوں کے دیوالے ؎ زندگی اضطرابِ پیہم ہے۔

خیر — چھوڑو بھی اس لاحاصل تذکرے کو، جہاں کی بات وہیں رہے، یہی مناسب بھی ہے جب کہ میرے نزدیک ؎

وہ التفات مجھے کیوں نہ بارِ خاطر ہو ؎ جس التفات میں ہوں کم رخی کے پہلو بھی

اور کاش کوئی اس شعر کا انگریزی ترجمہ کر سکتا ہے ؎

ایسے ملا کرو کہ کریں لوگ آرزو ؎ ایسے رہا کرو کہ زمانہ مثال دے

ہاں تو! آؤ ہم پر سرِ مطلب کہو، اب تمھارے مزاج کیسے ہیں؟ تمھارے سرِ نازک کا کیا حال ہے؟ نزلہ کا کیا عالم ہے، "بھائی" جو وہاں نہیں ہیں یہ نزلہ اب کس پر گر رہا ہے۔ ایم اے کی کلاسوں کا

ابھی ہوا یا نہیں؟ وہ شاہدِ رعنا قتالۂ جہاں مہ جبیں کیسی ہے۔ بھاوج کو رنگ چڑھا یقین یا تمکین اب کہاں ہے وہ برابر روز فردا میں ہنگامہ اٹھانے والا تھا، ممتشم اور نور جہاں تو شاید سمر ہالی ڈے پر میں وہاں آئیں گے ذیشان کے خطوط تو مل ہی رہے ہوں گے؟

بلقیس! اس مختصر سی فرصت میں کاغذ کی اس محدود وسعت میں زیادہ تو کیا تھوڑی بہت ہی باتیں کریں یہی دل چاہتا ہے ـــ آؤ کیوں نہ کچھ دل کی سنیں کچھ اپنی کہیں ـــ ہماری اس گفتگو کو محض مجذوب کی بڑ سے زیادہ اہمیت نہ دینا، ہم تو بس بکواس کے انداز میں بکواس کے عادی ہیں۔ خیال رہے ہماری اس تحریر اور اس کی کسی عبارت پر سنجیدہ نہ ہو جانا اور نہ ہی اسے کوئی اور معنیٰ دینے کی کوشش کرنا کہ یہ میرے اور میرے قلم کے ساتھ انصاف ہوگا۔

بی بی! علم کی اہمیت، تعلیم کی ہمہ گیر افادیت سے انکار کی کسی کو جرأت نہیں ہو سکتی جب کہ تہذیب و تمدن خود تعلیم کا عطیہ ہیں۔ بیشک علم انسانیت کا زیور ہے اور آدمی علم کی بدولت ہے۔ لیکن کردار سازی ـــ ! تعلیم کا اولین مقصد ہے اور شاید یہی مقصدِ حیات بھی ـــ محض تعلیم اور دولت ہی اس دنیا میں سب کچھ نہیں۔ مذہبی اقدار بقائے ملت اور قیامِ دنیا کا باعث ہیں اور تمام مذاہبِ عالم ان کے اصول صرف اور صرف محورِ کردار کے گرد ہی گھومتے ہیں تمدن (CULTURE) نام ہے کردار کی بلندی اس کے عروج اس کی پختگی کا ـــ آدمی چاہے لاکھ متمول ہو، عالم ہو، فاضل ہو، حسنِ کردار سے بہرہ ور نہیں تو جانو! کسی مقام کسی عظمت کا مستحق نہیں۔ اگر انسان کی شخصیت، اس ذات سے اس کے کردار کو الگ کر دیں تو باقی کچھ نہ بچے انسانیت کے دنیا میں کئی ایک نام ہیں۔ ایک نام کردار بھی ہے ہمیں چاہئے کہ جہاں تک بنے اپنے کردار کے سنوارنے اس کے بنانے پر زور دیں وہ ننگ انسانیت ہے جس کا کوئی کردار نہیں۔ نیک سیرت اور اعلیٰ کردار انسانیت کا کمال ہیں۔ انسانیت کا جوہر ہیں۔ مبارک ہیں وہ لوگ جو کردار کے مالک ہیں۔ کہتے ہیں "آدمی بشر ہے اگر بے شر" سچ پوچھو تو آدمیت کے مدارج اونچے ہیں فرشتوں سے تو صرف علوئے کردار کی وجہ سے ورنہ ع ہو فرشتہ آدمی ممکن نہیں۔ ـــ زندگی کے کسی شعبے میں آپ اسی وقت کامیاب و کامران ہو سکتے ہیں۔ جب کہ کردار درست ہو۔ مضبوط ہو آپ میں اچھے برے کی تمیز ہو، آپ مہذب ہوں، شائستہ ہوں۔ باکردار ہوں۔ آپ پر لوگ بھروسہ کریں، آپ سے لوگ خوش رہیں۔ آپ اتنے با اخلاق ہوں کہ دوسروں کی عزت اپنی عزت، ان کی خوشی کو اپنی خوشی، ان کا درد اپنا درد سمجھ سکیں اور دوسروں کے جذبات ان کے احساسات کا آپ کے دل میں احترام ہو ہر حال میں یکسانیت، ہر کام میں اعتدال اور رفتار میں میانہ روی ہو تو آپ کی زندگی کامیاب ہے۔ آپ کتنے ہی (civilized) کیوں نہ ہو جائیں آپ کا اپنا کلچر، آپ کی اپنی تہذیب (الگ) ہونی چاہئے۔ اس ترقی پسند ارتقائی دور میں ع "تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا" پر یقین رکھنے والے ہر ایک شخص کو رجعت پسندی سے بجا طور پر چڑھ ہو سکتی ہے اور یہ فطری بات ہوگی کہ آدمی دقیانوسیت سے بھاگے اور روشن خیال زمانے میں خود بھی روشن خیال بنتا جائے۔ اس سائنسی دور میں زمانہ نت نئی ترقی کر رہا ہے اس کا ہر قدم ارتقاء

کی راہ میں سنگ میل ہے۔ طبقات الارض کے اسکالرز اب نظام شمسی پر کامیاب ریسرچ کر چکے ہیں چنانچہ ہم اپنے راکٹ خلاؤں میں بھیج رہے ہیں۔ تسخیر افلاک کی دھن جنون کی حد تک پہنچ چکی ہے۔ ہماری کمندیں فضائے بسیط میں ہلچل مچا دی ہیں۔ ہمیں اس دوڑ میں دنیا کے دوش بدوش جانا ہے۔ وہ اپنی موت آپ مر گیا جس نے دنیا کی رفتار کا ساتھ نہ دیا۔ لیکن ــــ اس کے یہ معنی نہیں کہ ہم اپنا کلچر اور اپنا تمدن تہذیب حاضر کی بھینٹ چڑھا دیں۔

ہر ایک کو اپنا تمدن۔ اپنا معاشرہ' اپنی تہذیب دل و جان سے عزیز ہوتی ہے۔ کیوں نہ ہو صدیوں کی جان کوشی عرق ریزی ہمارے اجداد کی توجہ' ان کی محنت کا حاصل یہ تہذیب و شائستگی ہی تو ہے جو ہمیں بطور ورثہ نصیب ہوئی ہے ہم پر لازم ہے کہ اس سرمایہ کا تحفظ زمانے کے سرد و گرم کی پرواہ کئے بغیر کرتے رہیں۔ صدیوں کی محنت و جانفشانی سے جو کردار جو تمدن ہمیں ملا ہے۔ اسے یک دم بھلا دینا محال ہے۔ دشواری نہیں قطعاً ناممکن ہے۔ مشرق و مغرب کا یہ بُعد بہر حال قائم رہے گا۔ چلا جو چال کوئی ہنس کی ' اس کا چلن بگڑا۔

ہم نہیں کہتے اور کوئی صاحب فہم نہیں کہہ سکتا کہ زمانے کی اقدار کا لحاظ نہ کرو' رفتار زمانہ کا ساتھ نہ دو ہر کوئی بالغ نظر' فکر صحیح کا مالک یہی کہے گا کہ یقیناً زمانے کے نشیب و فراز پر نظر رکھو۔ ترقی کی راہ پر گامزن رہو اور چلو تم اُدھر کو ہوا ہو جدھر کی' جہد و کاوش زندگی کی تعمیر میں دو بنیادی پتھر ہیں۔

ہمیں فروغ فکر کے ساتھ صحت مند نظریہ کی ضرورت ہے۔ ہمیں چاہیئے کہ ہر دور میں اپنی تہذیب اپنے تمدن کی حفاظت کو اولیت دیں۔ ایک صحت مند معاشرہ کی تشکیل جدید میں ہم اپنی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار لائیں۔ ہمیں نہ تو تہذیب کو اور نہ ہی خود اپنے آپ کو حالات کے دھارے پر چھوڑنا ہے کیونکہ ؎

ہم کو مٹا سکے یہ زمانے میں دم نہیں ؎ ہم سے زمانہ خود ہے زمانہ سے ہم نہیں۔

اور سبب کہ ہم خود زمانے کو بناتے ہیں۔ ماحول گر ہیں اس شعر کی روشنی میں ؎

ہر دور میں صورت گر ماحول میں جبریلِ ؎ ہم صورتِ حالات کے پابند نہیں ہیں

تو لیں موقع و محل کی پابندی نہیں زیب نہیں دے گی ہاں! یہ ممکن ہے کہ ہم اس کی تلاش و جستجو میں پوری دیانتِ فکر کے ساتھ لگے رہیں۔ اور موقع و محل کو ہاتھ سے جانے نہ دیں۔ ہم کو چاہیئے کہ ہمیشہ کردار سازی کے ساتھ ساتھ ایک اچھے ماحول کی بھی صورت گری کرتے رہیں۔ حالات سے متاثر اور مرعوب ہوئے بغیر ــــ کیونکہ ایک بہترین ماحول ہی ہمارے عظیم مقاصد کی تکمیل کا سبب اور کامیاب مستقبل کی ضمانت بن سکتا ہے آدمی خواہ کچھ نہ ہو لیکن اس کا ماحول بہتر ہے تو جان لو ایک نہ ایک دن وہ بھی بہت کچھ ہو سکتا ہے تغیر ماحول کی فطرت میں داخل ہے اور فطرت کبھی بدل نہیں سکتی ــــ انسان کی ترقی' اس کا ارتقاء اس کی نیک نامی میں اس کے ماحول کا بہت بڑا حصہ ہے۔ آدمی ماحول سے ہے اور ماحول آدمی سے وابستہ ہے گویا ماحول اور آدمی ایک ہی سلک میں منسلک دو موتی ہیں جن کے الگ الگ ہونے پر قیاس نہیں کیا جا سکتا ایک مشہور فلسفی کا قول ہے "مجھے بتاؤ تمہارے دوست کون ہیں میں بتاتا ہوں تم کیا ہو" دوست دوست کا

جون ۱۹۸۵ء

ذوقِ نظر حیدرآباد

آئینہ ہوتا ہے۔ سچا دوست فطرت کا عطیہ ہے۔ سمجھو تو ماحول ہی سب کچھ ہے نہ سمجھو تو خیر ——— کچھ نہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ ماحول ہی آدمی گر ہے۔ ماحول ہی تنہا اک زمانہ ہے۔ ؎ اک عالم محوِ گردش ہے اس اک محور کے گرد ——— ماحول کیا ہے؟ یہی آپ کے متعلقین، یہی آپ کے احباب، انہیں کے مجموعہ کا نام ماحول ہے۔ بس یہیں ضرور ہے کہ ہمیشہ ماحول سے باخبر رہیں اس کے بگڑنے، سنورنے کا بطورِ خاص خیال رکھیں ——— دوست مشکل سے ملتے ہیں ان کی تلاش میں رہو مگر ہر کسی کو دوست بنانے سے احتراز کرو۔ ہر کوئی دوستی کی تعریف میں نہیں آسکتا ہر کوئی دوستی کے معیار پر پورا نہیں اتر سکتا۔ غرض مند دنیا میں کوئی بے لوث دوستی کا دعویدار نہیں ہو سکتا۔ قول و فعل میں تضاد، مکر و فریب، حسد و کینہ، بغض سب ظاہر کی دین ہے۔ ہماری شخصیت کے جامعہ کو اس گندگی سے پاک رکھنا ہے۔ آج کے دور میں کوئی قیافہ شناس نہیں۔ کوئی دعویٰ نہیں کر سکتا کہ وہ مردم شناس بھی ہے۔ وہ زمانہ لد گیا جب خط کا مضمون بھانپ لیتے تھے لفافہ دیکھ کر اور آدمی پہچانا جاتا تھا قیافہ دیکھ کر ——— اگر آج کا انسان خود اپنے آپ کو پہچان لے تو بڑی حیرت کی بات ہے چہ جائیکہ وہ دوسرے کے دل کا حال اس کے چہرے بشرے سے بتا سکے۔ ظاہر بین نظریں کبھی حق بینی کا کمال نہیں رکھتا ظاہر پہ باطن کا قیاس ذہنی پستی، عقلی دیوالیہ کا ثبوت ہے ——— محتاط نظر کبھی دھوکہ نہیں کھا سکتی۔ ہر کسی پہ اعتماد، ہر کسی پہ اعتقاد، ہر کسی پہ بھروسہ انسان کی سب سے بڑی کمزوری ہے اور کمزور کو آج کی دنیا میں جینے کا کوئی حق نہیں۔

تجربہ شاہد ہے کہ اکثر معتمد غیر معتمد ثابت ہوا ہے۔ ہر حسین چہرہ معصوم نہیں ہوا کرتا اور بننے سے کوئی شریف نہیں بن سکتا، شرافت انسان کے دل میں ہوتی ہے۔ شرافت بازار سے خریدی بھی تو نہیں جا سکتی ورنہ ہر مالدار شریف ہو جاتا۔ اسلئے کہنے والے نے کیا خوب کہا ہے۔ بہترین مطالعہ انسان کا مطالعہ ہے آدمی کو اس کے کردار میں ڈھونڈو۔ اس کی نجی زندگی میں تلاش کرو، اس کی گفتگو کو NOTE کرو۔ اس کی تحریر پہ نظر رکھو تب معلوم ہو گا کہ آدمی کس قدر آدمی ہے محض تعلیم سے آدمیت نہیں آجاتی ورنہ کیوں کہتے ؎

فرشتے سے بہتر ہے انسان ہونا ؎ مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ

آدمی محض اپنے کردار کی بزرگی کے باعث اشرف مخلوق ہوا ورنہ ایک حیوانِ مطلق اور حیوانِ ناطق میں فرق ہی کس بات کا ———!

بلقیس!۔ ذہنی تحفظ کے ساتھ شریعت کے مطابق، حدِ اعتدال میں خاندانی عزت کا لحاظ کرتے ہوئے ماحول کی پابند رہ کر جدید فیشن پرستی اختیار کر لو تو کچھ قباحت نہیں مگر ان سب اخلاقی، مذہبی، سماجی اقدار کو بیک جنبشِ قلم ٹھکراتے ہوئے فیشن پرستی ——— خود اپنی ذات سے دشمنی ——— مذہب سے بغاوت اور

سماج کے لئے چیلنج ہے ـــ لہٰذا فیشن کو چھوڑ کر دین و مذہب کی بات کریں یہی مناسب بھی رہے گا۔ دور حاضر کی بیزارگی کی حد تک مذہب سے دوری، ہماری ذہنی پستی اور اخلاقی موت کا سبب بنتی جا رہی ہے اور یہی بے حیائی بے پردگی ہماری بے راہ روی کا اصل سبب ہے۔ حوا کی بیٹیوں کو زیب نہیں دیتا کہ وہ کمال بے حیائی و بے پردگی کے ساتھ اپنے جسموں کی نمائش کرتی پھریں اور ہر نگہ و نظر کو دعوت عیش و نشاط دیتی رہیں۔ آج کی اس حیا سوز بے حجابی پر مریمؑ و آسیہؑ کی روحیں بھی بلاشبہ نوحہ کناں ہوں گی' عورت شرم و حیا کی مورت آج شمع حرم نہیں، شمع محفل ہو گئی ہے۔ عصمت و عفت کے قیمتی زیور سے جو کبھی مزین تھی آج اس سے یہ زیور اتر چکے ہیں مرادی معنوں کو چھوڑیئے لفظی معنوں سے بھی عورت بے بہرہ ہو گئی ہے عورت جس کی حرمت میں یہاں تک کہا گیا کہ "عورت کی آواز بھی عورت ہوتی ہے۔" آج دیکھئے! اخلاقی گراوٹ کے کس درجہ پر آ گئی ہے۔ کاش تہذیب سے بیگانہ میری بہنیں جن کے چہرے سے نقاب کھنچ چکی ہے۔ جن کی رکشاؤں کے پردے تک اتر رہے ہیں کبھی سنجیدگی سے اپنے ماضی کا مطالعہ کریں۔ The holy Mohammed کے گھرانے پر بھی اک نظر ڈالیں اور دیکھیں کہ فاطمہؓ دختر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا کیا کردار تھا۔ دم آخر سیدۂ عالمیانؓ مولا علیؓ کو کیا وصیت فرماتی ہیں' میری بے پردہ بہنیں اس پہ غور فرمائیں۔ ارشاد ہوتا ہے "علی! خیال رکھیئے میرا جنازہ دن کے اجالے میں نہ اٹھایئے گا دور رہاں! وقت تدفین پردے کا اہتمام پوری احتیاط سے کیجئے کہیں میری میت پر کسی نامحرم کی نظر نہ پڑ جائے۔" اللہ اکبر" یہ کردار تھے پروردۂ آغوشِ نبوت کے ـــــ ایک مرتبہ حضور آقائے دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم صحابہؓ سے پوچھتے ہیں کہ عورت کی سب سے بڑی خوبی کیا ہے؟ لیکن صحابہؓ کے جوابات سے آپ مطمئن نہیں ہوتے دوسرے دن مولائے متقیان علی ابن ابی طالبؓ نے بیان فرمایا "عورت کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ نہ وہ کسی نامحرم کو دیکھے اور نہ ہی کسی نامحرم کی نظر اس پر پڑے" سرکارؐ نے متبسم ہو کر دریافت فرمایا "کیوں علی! کیا یہ بات تمھیں فاطمہؓ نے بتائی؟" علیؓ نے عرض کی ہاں یا رسول اللہ!" تب یوں گہر فشاں ہوئے لعل لب رسول کریمؐ "کیوں نہ ہو فاطمہؓ میرے جگر کا ٹکڑا ہے" اور ایک روایت میں لکھا ہے کہ (ام المومنین) عائشہ بنت ابوبکرؓ کے حجرہ میں آقائے نامدارؐ تشریف فرما تھے۔ ایک نابینا صحابی نے اذن حضوری چاہا۔ ام المومنین نے فوراً کہہ دیا کہ آنے دیجئے لیکن سرکارؐ نے ٹوک دیا اور فرمایا کہ نہیں' کیا ہوا اگر وہ نابینا ہیں' تم تو اندھی نہیں ہو۔" میری بہنو! محل عبرت ہے توبہ کرو۔ ـــ کیا تم ان بیبیوںؓ کو بھی دقیانوسیت کا لیبل دو گی؟ کیا انھیں بھی فرسودہ خیالات کی ماری عورتوں میں شمار کرو گی؟ ـــ نعوذ باللہ ـــ نہیں تم ایسا نہیں کر سکتیں ـــ ابھی تمھارے اندر کی عورت زندہ ہے مری نہیں ـــ میرا دل مطمئن ہے ـــ دیکھو تمھارا ضمیر تمھیں جھنجھوڑ رہا ہے۔ اب بھی وقت

بے اپنے میری آواز کا ساتھ دو، توبہ کرو ـــ تائب ہو جاؤ ـــ اللہ نیتوں کا جاننے والا ہے۔ ـــ بھول کس سے نہیں ہوتی، انسان خطا و نسیان کا مرکب ہی تو ہے۔ صبح کا بھولا اگر شام کو آجائے تو اس کو بھولا نہیں کہتے ـــ اللہ غفور الرحیم ہے ـــ اللہ ستار العیوب ہے کہو ـــ

اے رحمتِ تمام مری ہر خطا معاف ؎ میں انتہائے شوق میں گھبرا کے پی لیا

بلقیس! مصورِ فطرت خواجہ حسن نظامیؒ نے حیدرآباد کے اپنے کسی مرید کو خط میں ہدایت کی تھی کہ وہ اپنی بیوہ بہو کو فوری اس کے میکہ بھیج دے کہ کہیں وہ "نظر کے زنا" کا مرتکب نہ ہو جائے ـــ سوچو اللہ والوں کی احتیاط کا کیا عالم ہوتا ہے۔ ان کے زہد و ورع، تقویٰ و طہارت کا مقام کتنا ارفع ہوتا ہے۔

بی بی! شرافتِ نفس، نفاستِ خیال، ارادے کی پختگی کے ساتھ ہم اگر زندگی گزارنے کے عادی ہو گئے تو بس ہمارے لئے یہی غنیمت ہے۔ عملِ نیک، فکرِ صحیح، طہارتِ قلب، انسان کی زندگی اگر ان خوبیوں سے متصف ہے تو سمجھو اس کے مستقبل کی درخشانی کی ضمانت مل گئی۔ ہم اپنے عمل اپنے افعال سے اپنے لئے جنت اپنے لئے دوزخ بناتے ہیں۔ ورنہ دوزخ، جنت بجائے خود اس دنیا میں کوئی بامعنی لفظ نہیں ہے

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

ہاں بی بی! ایک خاندان کے افراد کیلئے باہمی خلوص، بھائی چارگی، اتحاد و اتفاق، یکجہتی اور ہم آہنگی اولین شرط لازمی ہے۔ بھائی بہن باہم شیر و شکر رہیں۔ تفرقہ اندازی سے بچے رہیں۔ وقتی کشیدگی کو دائمی ناچاقی میں مبدل نہ ہونے دیں اور اپنے خانگی جھگڑوں، نجی معاملات میں دخیل ہونے، دلچسپی لینے کی ذرہ بھی مہلت اور مطلق اجازت نہ دیں کیوں کہ ایسے ہی مواقع پر ہماری ہمدردی حاصل کرنے کے لئے ہر کوئی غمخوار، طرفدار بن کر سامنے آتا اور ہماری موقتی رنجشوں کو اور ہوا دے کر اپنے پاؤں جمانے کی سوچتا ہے۔ حالانکہ ہم کو یہ بات یاد رکھنا چاہیئے کہ خونی رشتوں سے بڑھ کر کوئی رشتہ کوئی تعلق لائق اعتبار نہیں اور نہ ہی ہمارا مونس و دمساز ہو سکتا ہے۔ دیکھو! بہن عفو کی مورتی ہوتی ہے۔ اس کا دل بھائیوں کے لئے جذباتِ نیک اور وفورِ محبت سے معمور رہنا چاہیئے لوگ تو منہ بولے رشتوں پر جانیں نثار کرتے ہیں اور اگر ہم بہن بھائیوں کی ذرا ذرا سی بات کا برا مانیں ان کی چھوٹی بڑی بھول پر سنجیدگی کے ساتھ (NOTICE) لیں تو ناانصافی ہی نہیں بلکہ ظلم ہوگا۔ اپنی ذات اور اس مقدس رشتہ کی حرمت پر ـــ

بی بی! دنیا میں والدین سے بڑھ کر کوئی تعظیم کے مستحق نہیں قرار دیئے گئے۔ خدا خود ان کی تعظیم و تکریم ان کے ادب، ان سے سلوک کی ہدایت فرماتا ہے۔ ان کی اطاعت ان کی فرمانبرداری ان کا

خیال ہر سعادت مند اولاد پر واجب ہے۔ جنت ـــــ جس کو عابد و زاہد متقی و پرہیز گار شب و روز کی عبادت شاقہ کے باوجود نہیں پا سکتے ـــــ وہ جنت محض ان کے قدموں تلے بتائی گئی ہے ؎

"کہتے ہیں ماں کے پاؤں کے نیچے بہشت ہے" (میر انیس)

یعنی مراد یہ ہے کہ اپنے معبود کی عبادت اور اس کی بندگی سے کہیں افضل ماں باپ کی خدمت' ان کی اطاعت اور ان کی تابعداری ہے ورنہ اللہ کی اطاعت اور اس کی بندگی کا جہاں تک سوال ہے ؎

"اس کی طاعت کے لئے کچھ کم نہ تھے کرّوبیاں"

بلقیس! باپ سے عزت' ماں سے آرام ملتا ہے۔" یہ دنیا کا ایک مسلمہ ہے۔ مبارک ہیں وہ لوگ جنہیں والدین کا سایۂ عاطفت حاصل ہے۔ والدین اللہ کا سب سے بڑا کرم ہوتے ہیں۔ ہم اگر جیتے جی اس دولت بیدار نعمتِ غیر مترقبہ کی قدر و منزلت کا اندازہ نہیں کرتے تو اس سے بڑھ کر ہماری بدبختی نہیں ہو سکتی۔ ویسے اللہ جو ستر ماں باپ کی محبت والا ہمارا رب ہمارا پالن ہار ہے ـــــ ہمارا رازق ہمارا حافظ و ناصر ہے۔ لیکن ہم بھی والدین کے رتبہ کی عظمت اور اس کی اہمیت سے انکار نہیں کر سکتے۔ خدا نے ان کے مصحف رخ کی زیارت کو بھی عبادت ٹھیرایا ہے۔ بی بی! تمہیں تمہارے چچا جتنی عزت دے سکتے تھے اس سے کہیں زیادہ دے کر انہوں نے اپنا فرض پورا کر دیا۔ اب سے دے کے تمہاری ماں ہی تمہارے لئے سب کچھ ہیں۔ بس ان کی پاسداری ان کی اطاعت' ان کی خدمت ان کا لحاظ ہی تمہیں جنت سے ہمکنار کر سکتا ہے۔

دیکھو بڑی بہن کی ذمہ داری بھی بڑی ہوتی ہے۔ ماں کے بعد تمہارا ہی درجہ ہے لہٰذا تم کو چاہئے کہ خوش اسلوبی سے اپنی چھوٹی بہنوں کو کچھ اس انداز سے TREAD کرو کہ وہ اپنے ہر عمل سے ماں کی دعاؤں کی مستحق بن جائیں اور یوں زادِ آخرت خود بخود فراہم ہو۔

اچھا بلقیس! بہت وقت لے لیا اب چلتے ہیں۔ میری طرف سے جملہ بزرگوں کو عموماً اور خصوصاً تمہاری امی کو بہت بہت سلام پہنچاؤ اور کہو کہ ہمارا سلام قبول فرما کر عزت بخشیں اور ساتھ ہی دعا فرمائیں کہ خدا ہم کو ہمارے کردار کو درست فرمائے اور ہمیں توفیق دے کہ ہم تمام گمراہیوں سے بچ کر راہِ ہدایت پر گامزن ہوں اور اس صراطِ مستقیم پر چل پڑیں جس کے چلنے والوں پر اس نے انعام و اکرام فرمایا (آمین) قدسیہ اور ان کی امی اور تمہارے بھائی بہنوں کو بھی نام بہ نام سلام دعا کہو۔ محمد احمد صاحب اور ماسٹر صاحب کو بھی سلام کہنا مت بھولنا۔ شائد میرے آنے میں کچھ دن لگیں لہٰذا اب کی خیریت سے گاہے ماہے مطلع کرتی رہو تو عنایت ہو گی۔

اچھا ـــــ

تم سے اک بات کہنی ہے ٹھیرو ذرا۔ ہاں نہیں جاؤ کوئی بات نہیں۔

والسلام۔ خیر اندیش

تمہارا

ذیشان

رحمن ثاقب

عصمت چغتائی اور طوائف کا تصور

یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ عورت بنیادی طور پر جنسی اور معاشی مظالم کا شکار رہی ہے چنانچہ ترقی پسند مصنفین نے عورت کو ان دہرے مظالم سے نجات دلانے کی شعوری طور پر کوشش کی ہے۔ ان ترقی پسند مصنفین میں عصمت نے اپنی جنس کی بہتری اور بہبودی کے لئے اپنی زندگی وقف کر دی ہے۔ عورت کی جنسی اور معاشی آزادی عصمت کی تحریروں میں دو ایسے مطالبے ہیں جن کو ہم بنیادی اور اہم کہہ سکتے ہیں۔ عصمت عورت کو معاشی اعتبار سے مرد کا دست نگر دیکھنا پسند نہیں کرتیں بلکہ عورت کو بھی مرد کی طرح مکمل معاشی آزادی حاصل کرنے کی ترغیب دیتی ہیں۔ اپنی تخلیقات میں انہوں نے اس طرح کے بیشتر کردار پیش کئے ہیں جو ذریعۂ معاش کے لئے جدوجہد کرتے ہیں اور مرد کی طرح ہر اعتبار سے آزاد ہیں۔ مثلاً ناولوں میں "ٹیڑھی لکیر" کی شمن، "معصومہ" کی نیلوفر، "عجیب آدمی" کی زرینہ جمال۔ افسانوں میں "تھوڑی سی پاگل" کی گینا، "بےکار" کی ہاجرہ بی، "دو ہاتھ" کی مہترانی ______ ایسے کئی کردار ہیں جو معاشی طور پر مرد پر منحصر نہیں رہتے۔ وہ عورتیں جو معاشی طور پر مرد پر انحصار کرتی ہیں اور ان کے ظلم سہتی رہتی ہیں، ایسی عورتوں کی عصمت سختی سے مخالفت کرتی ہیں اور ان کے بارے میں ان کا نظریہ منفرد اور بڑا ہی تلخ ہے۔ وہ لکھتی ہیں:

> "وہ عورتیں جو صرف روٹی کپڑے کے لئے اپنے شوہر کی
> حرام کاریاں اور ذلتیں برداشت کرتی ہیں، بیسواؤں ہی
> جیسی ہوتی ہیں کہ وہ بھی پیٹ کی خاطر سودا کرتی ہیں۔" ۱

---

۱ عصمت سوالنامہ ۳۰ جون ۱۹۷۸ء

ہمارے معاشرے میں عام طور پر طوائفوں کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا مگر ایسی عورتیں جو مرد کی ذلتیں اور حرامکاریاں سہتی ہیں اور ان سے زندگی بھر نباہ کرتی ہیں انھیں شریف، مجسّم صبر اور وفا کی دیوی کے نام سے یاد کیا ہے۔ چنانچہ راقم الحروف کو سوالنامے کے ذریعہ ایک اور سوال کرنا پڑا تاکہ عصمت کا یہ نظریہ پورے طور پر واضح ہو جائے۔

"کیا آپ کے خیال میں مرد کی ذلتیں اور حرام کاریاں سہنے والی عورتوں سے وہ کال گرل بہتر ہیں جو ٹھاٹ سے فلیٹ میں رہتی ہیں اور سیٹھوں کی عیاشی کا سامان بنتی ہیں؟ حالانکہ سماج میں شوہر کی ذلتیں برداشت کرنے والی شریف عورت کو دیوی کہا جاتا ہے، جب کہ کال گرل کو ڈائن۔" [1]

عصمت جواب دیتے ہوئے لکھتی ہیں کہ:

"کال گرل سے مجھے کوئی شکایت نہیں۔ وہ ٹھاٹ سے رہتی ہے اس لئے لوگ منہ پر خوشامدیں کرتے ہیں۔ دکھاوے کو گالیاں دیتے ہیں آپ کو پتہ نہیں ان کال گرلز کے ہاں بڑے بڑے منسٹر ناک گھسنے جاتے ہیں لیکن وہ عورت جو گرہستن کہلاتی ہے اگر ذلتیں سہتی ہے تو رنڈی سے بدتر ہے اور جھوٹے لوگ اس کی تعریف کرتے ہیں۔ جھوٹ! دراصل وہ عزت کال گرل کی ہی کرتے ہیں۔ دیوی کہہ کر اسے بیوقوف بنا رکھا ہے۔"

عصمت اپنے افکار کی بے باکی کی وجہ سے منفرد اور مشہور ہیں۔ انھوں نے دوٹوک الفاظ میں اپنی رائے کا اظہار کر دیا ہے۔ اسی رائے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وہ عورت کو معاشی طور پر مرد کی پابند نہ بننے بلکہ معاشی طور پر آزاد، خوشحال اور آسودہ زندگی بسر کرنے کی تعلیم دیتی ہیں۔ عصمت کا یہ موازنہ موجودہ عہد کی کال گرل اور موجودہ عہد کی ظلم سہنے والی عورت کا موازنہ ہے۔ عصمت نے موجودہ سرمایہ دارانہ عہد کے اس فریب کا پردہ فاش کیا ہے۔ جہاں خرد کا نام جنوں اور جنوں کا نام خرد پڑ گیا ہے۔ موجودہ عہد کی کال گرل کے بارے میں جو

---

[1] اور [2] عصمت سوالنامہ ۲ر جولائی ۱۹۷۸ء

رویہ سماج کا ہے وہ ایک تضاد پر مبنی ہے۔ وہ عملاً کال گرل کی عزت کرتا ہے اور قولاً اس کو بُرا کہتا ہے۔ لینن نے ایک جگہ لکھا ہے کہ آدمی جو کرتا ہے وہ اصل ہے جو کہتا ہے وہ نقل ہے۔ اس لئے موجودہ سماج کا قول کال گرل کے بارے میں بے معنی ہی نہیں بلکہ فریب پر مبنی ہے۔

عصمت نے یہاں ایک اہم حقیقت کو یکسر نظرانداز کر دیا ہے کہ کال گرل کیوں بہت ٹھاٹ سے رہتی ہے؟ اس کا یہ ٹھاٹ بھی سرمایہ دارانہ نظام ہی کا عطیہ ہے اور یہ بھی اسی قدر قابلِ نفرین ہے جس طرح موجودہ سرمایہ دارانہ نظام میں عورت کا معاشی مجبوری کی وجہ سے مرد کا ظلم سہنا۔ عصمت کی مندرجہ بالا رائے سے اتفاق کرتے ہوئے سلمیٰ صدیقی اپنے انٹرویو میں کہتی ہیں کہ:

> "اس میں شک ہی کیا ہے؟ عصمت چغتائی سچی بات کہنے سے کبھی گریز نہیں کرتی ہیں۔ عصمت چغتائی سے پہلے صرف سماج ہی نہیں ادب میں بھی عورت موم کی پتلی تھی۔ ایسی مجبور، مظلوم، مقہور کہ خدا کی پناہ! عصمت چغتائی نے عورت کو زبان دی، شعور دیا، حوصلہ دیا اور اس کو سماجی رتبہ بھی دیا۔" [۱]

عصمت کا مندرجہ بالا قول ان کے عورت کے اسی نظریئے کی وضاحت اور تشریح کرتا ہے جس پر انہوں نے اپنے فن کی بنیاد رکھی ہے اور اسی نظریئے کی اساس پر اپنے فن کی عمارت استوار کی ہے۔ یہ دلچسپ بات ہے کہ ان کی معاصر فن کار خاتون قرۃ العین حیدر جو اپنے عہد کی ممتاز، مشہور اور معیاری ناول نگار خاتون ہیں، عصمت کی اس رائے پر یہ تنقید کرتی ہیں:

> "بہت سی عورتوں کی اس میں مجبوریاں ہو سکتی ہیں، بہت سی عورتیں ایسی ہیں جن کے پاس تعلیم نہیں ہوتی۔ ان کو کہیں باہر جانے کا ذریعہ نہیں ہوتا۔ اگر وہ تعلیم یافتہ ہوں تو ملازمت کرنے کا موقع ملتا ہے۔ تعلیم یافتہ نہیں ہوں تو ان کو مجبوراً گھروں میں رہنا پڑتا ہے۔ میں اس بات سے اتفاق نہیں کرتی کیوں کہ ہماری دادیاں، نانیاں پڑھی لکھی نہیں تھیں۔ وہ گھروں

---

[۱] سلمیٰ صدیقی سے راقم الحروف کا انٹرویو۔ بمبئی۔ مورخہ ۲۶ دسمبر ۱۹۷۸ء

میں ہی شریفانہ زندگی گزارتی تھیں۔ کیا ہم ان کو بھی
کال گرل سے بدتر کہہ سکتے ہیں" ؎۱

عصمت نے نانی دادیوں پر تنقید نہیں کی ہے بلکہ موجودہ عہد کی ظلم سہنے والی بیویوں کا موازنہ کیا ہے۔ موجودہ عہد میں اگر خواتین تعلیم کے مواقع سے استفادہ نہیں کرتیں اور مجبوراً گھروں میں رہ کر ظلم سہنے کو ترجیح دیتی ہیں تو یہی ان کی محرومی ہے جس پر عصمت نے انھیں للکارا ہے۔ ظلم سہنے والی عورتوں کو دیوی کہنا عصمت کے نقطۂ نظر سے ان کو بیوقوف بنانا ہے اور ایسے عصمت عورت کا استحصال قرار دیتی ہیں۔ وہ دادیاں اور نانیاں جن کو تعلیم کے مواقع ہی میسر نہ تھے اور جو گھروں میں شریفانہ زندگی گزارتی تھیں، ان کو طوائف کا درجہ دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

موجودہ سرمایہ دارانہ نظام میں ماں باپ محض دولت اور جائیداد کی خاطر اپنی لڑکیوں کی شادی اپنے ہی طبقہ کے لڑکے سے کر دیتے ہیں۔ عورت اپنی روایتی شرم وحیا اور ماں باپ کی عزت کے لحاظ سے اس سودے بازی پر قربان ہوجاتی ہے۔ ایسی صورت میں بہت کم میاں بیوی ہوتے ہیں جن میں ذہنی رفاقت اور قلبی وابستگی پائی جاتی ہے۔ ایسی عورتیں مجبوراً اپنے شوہروں سے نباہ کرلیتی ہیں۔ وہ طلاق بھی نہیں لیتیں کیوں کہ طلاق کے بعد وہ اقتصادی طور پر لاچار ہوجاتی ہیں اور کچھ اس معاشرہ کا خیال جو اُن کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتا۔ مرد عیاشی کرتا ہے، شراب پی کر اپنی بیوی کو مارتا ہے اور طرح طرح کی اذیتیں پہنچاتا ہے اور عورت اس کے ظلم سہتی رہتی ہے۔ ایسی عورتوں کے متعلق عصمت کا یہ کہنا بجا ہے کہ وہ اپنے ظالم شوہروں سے خلع لے لیں اور کوئی ذریعہ معاش تلاش کرکے معاشی طور پر آزاد ہوجائیں۔ یہ بھی صحیح ہے کہ کال گرل کے یہاں بڑے بڑے منسٹر یا الفاظ دیگر سماجی اور سیاسی رہنما تاک جھانک کے لئے جاتے ہیں۔ ان کی تعریفیں اور خوشامد کرتے ہیں مگر ان کی تعریف اور خوشامد میں ظاہری پہلو نمایاں ہوتا ہے یعنی محض دکھاوے کے لئے وہ ان کی عزت کرتے ہیں۔ عصمت کی سودے بازی اور تجارت سرمایہ دارانہ نظام کی لعنت ہے۔ یہ تجارت بہت گھناؤنی ہے اور یہ رشتہ محض روپیہ کی خاطر ہوتا ہے۔ کال گرل اور اس کے ہاں جانے والے افراد کا رشتہ جتنا تجارتی ہے اتنا ہی عارضی اور

؎۱ قرۃ العین حیدر سے راقم الحروف کا انٹرویو۔ بمبئی۔ مورخہ ۲۳ دسمبر ۱۹۶۸ء

وقتی ہوتا ہے اس رشتہ میں دلی وابستگی کا فقدان لازمی ہے۔ ظاہری طور پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گھریلو عورت کو کال گرل سے بدتر کہہ دینا انتہا پسندی ہے۔ گھریلو شریف عورتوں کا ظلم سہنا ان کی انتہائی مجبوری ہے مگر یہ درست ہے کہ ظلم کرنا اور ظلم سہنا دونوں بُرے ہیں۔ خود کلام الٰہی بھی ایسے نظریئے کی ترجمانی کرتا ہے ' لایظلمون ولمایظلمون ' نہ وہ ظلم کرتے ہیں نہ وہ ظلم سہتے ہیں۔ اسلام نے رشوت لینے اور دینے والے کو یکساں بُرا قرار دیا ہے۔ اگرچہ رشوت دینے والا ایک طرح سے مجبور ہوتا ہے مگر رشوت لینے والا مجبور نہیں ہوتا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں عصمت بیوی کی اس کمزوری کو کہ وہ شوہر کا ظلم سہے اور چپ رہے اس پر احتجاج نہ کرے اور بظاہر دیوی بنا کر شوہر کی عیاشی اور ظلم پر پردہ ڈالے اس پر سخت لعنت ملامت کرنے میں حق بجانب ہیں۔ وہ راقم الحروف کے ایک سوال کے جواب میں تحریر کرتی ہیں کہ:

"آپ اس عورت کو کیا دیوی کہیں گے ' جس کا شوہر اس کا دلال بن کر اسے گاہکوں کو پیش کرتا ہے اور اس کی کمائی پر عیش کرتا ہے۔ مگر وہ زبان سے شکایت نہیں کرتی منہ بند رکھتی ہے کہ کہیں اس کے دیوی پن کا بھرم نہ ختم ہو جائے۔ فلمسٹاروں کو لوگ گالیاں دیتے ہیں اور ان کی ایک جھلک دیکھنے کو زندگی کا سرمایہ سمجھتے ہیں۔ یہ دنیا کی قدریں کتنی جھوٹی ہیں۔ سیتا اور مریم کے لوگ گن گاتے ہیں مگر میں تو کہتی ہوں کہ کسی ماں کی بیٹی پر وہ نہ بیتے جو سیتا اور مریم پر بیتی۔ ہاں یہ سوال کہ دنیا کیا کہتی تو دنیا بہت سی غلط باتیں بھی کہتی ہیں۔"[1]

اس طرح عصمت نے اپنی بیویوں کی دلالی کرنے والے شوہروں کی بیویوں کو طوائفوں کے مقابلہ میں بدتر کہا ہے تو وہ عورت جو شوہروں کے اشاروں پر ناچتی ہے اور پیٹ پالتی ہے اور وہ عورت جو عصمت فروشی کا پیشہ کرتی ہے دونوں کی برائی کی سطح یکساں ہے پیشہ کرنے والی عورت کم از کم کسی نہ کسی حد تک اپنی ذاتی آزادی تو رکھتی ہے جب کہ شوہر کی خاطر

---

[1] عصمت۔ سوالنامہ مورخہ ۱۲ر جولائی ۱۹۷۸ء

اس کے خوف کی خاطر برائی کرنے والی عورت برائی بھی کرتی ہے اور ریاکاری بھی اور آزاد بھی نہیں رہ سکتی۔ قرۃ العین حیدر نے جن نانیوں اور دادیوں کا حوالہ دیا ہے ان کا تعلق موجودہ عہدِ سرمایہ داری سے نہ تھا۔ شوہر کی رضا اور خوشنودی ان کا مسلک تھا۔ ان کے ہاں شوہر پرستی ایک مستقل قدر تھی۔ ان کی اپنے شوہر سے ایک مضبوط قلبی رفاقت تھی جن کے اظہار کے لئے وہ شوہر کی رضا اور خوشی کو ہر قیمت پر حاصل کرنا چاہتی تھی۔ عصمت ایسی عورتوں کو بھی طوائف سے بدتر کہتیں تو یہ ان کی فکر کی انتہا پسندی اور اعتدال کی کمی کا نتیجہ قرار دیا جا سکتا ہے کیونکہ ایسی عورتوں کی خدمات کو روپے پیسے کی ترازو میں تولا نہیں جا سکتا۔ مگر عصمت نے اپنی بیوی کی دلالی کرنے والے شوہروں کی بیویوں کا ذکر کرکے اپنی بات نباہ لی ہے۔

عصمت اعلیٰ طبقہ کی عورتوں کی جنسی زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتی ہیں کہ یہ عورتیں بھی طوائفوں کی طرح ہیں جو ایک سے زائد مردوں سے جنسی تعلق رکھتی ہیں۔ اعلیٰ طبقے کے ایک ایسے ہی میاں بیوی جو سوسائٹی کے چہیتے فرد مانے جاتے ہیں ان کی خانگی اور جنسی زندگی پر تبصرہ کرتے ہوئے وہ لکھتی ہیں کہ :

> "دونوں میاں بیوی .... ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے یہی وجہ ہے کہ انھیں ایک دوسرے سے اتنی شدید قسم کی نفرت ہے ' وہ مہینوں ایک دوسرے کی صورت نہیں دیکھتے۔ فرصت ہی نہیں ملتی۔ میاں کا ایک دوسرے اعلیٰ افسر کی بیوی سے مشہور و معروف قسم کا عشق چل رہا ہے اور بیوی اسی کے ایک ہم عصر سے مانوس ہے جس کی بیوی اپنی سہیلی کے میاں سے اٹکی ہوئی ہے یہ سہیلی ایک سارجنٹ کے دامِ الفت میں گرفتار ہے جس کی اپنی بیوی ایک لبوجھل سے سیٹھ کے پاس رہتی ہے جس کی پرانی چیچک رو بیوی کسی اور سے اُلجھی ہوئی ہے جو اینگلو انڈین لڑکیوں کے چکر میں پڑا ہوا ہے۔ جو ملٹری کے ..... اُنھ چھوڑیئے بھی کیا فائدہ دخل در معقولات ہے۔ میرے بال نائی کے پاس' نائی کا استرہ میرے پاس' میرا استرہ گھسیارے کے پاس' اس طرح یہ زنجیر ایک حلقہ کے منہ میں دوسرے کی دم لئے

دنیا کے گرد چکر کاٹ رہی ہے۔" ۱؎

ناول "معصومہ" میں بیگم ایک نواب زادی ہے۔ اپنے میاں کے ٹھکرانے کے بعد خود کے معاشی تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے اپنی بیٹی کو طوائف بنانے پر مجبور ہوجاتی ہے۔ عصمت اس طرح کے نوابوں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ جاگیر دارانہ نظام میں نواب ایک سے زیادہ شادیاں کرتے تھے مگر ہر ایک کو خوش رکھنا کسی کے بس کی بات نہیں جس کی وجہ سے یہ عورتیں اپنی جنسی آسودگی کے لئے غیر مرد سے تعلق پیدا کرلیتی تھیں اگر بیگم نے اپنی بیٹی کو طوائف بنایا تو کوئی نئی بات نہیں کی۔ مزید وہ لکھتی ہیں کہ :

> "یہاں لڑکیوں کے سودے تو پشتوں سے ہوتے چلے آرہے تھے ان (بیگم) کی جوان خالہ بوڑھے پھونس نواب قمرالدین کو پیسے کی خاطر بیاہی گئی تھیں کھلے بندوں ان کا سول سرجن صاحب سے تعلق تھا۔ خود ان کی بڑی کے شوہر نے ایک میم سے شادی کرلی تھی اس کا غم وہ ایک شاعر کی آغوش میں غلط کرتی تھیں۔ عزت اور شرافت کا پیمانہ تھا، دولت اور مرتبہ۔" ۲؎

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دولت اور مرتبہ کے پردے میں جو برائیاں ہوتی ہیں ان میں اور کھلے عام طوائفوں کے دھندے میں عصمت کوئی فرق نہیں کرتیں۔ کیونکہ دونوں ایک ہی کام کرتے ہیں۔ عصمت کی بموجب دونوں میں :

> "فرق اتنا ہے کہ طوائف کے مشاغل کو پیشہ کہتے ہیں اور نواب زادی کے پیشے کو رومان۔ ایک کو روپیہ کی ضرورت ہے تو دوسری کو اللہ نے دیا ہے۔ لہٰذا میدان ضرورت مند کے ہاتھ رہا۔" ۳؎

ان اقتباسات سے ظاہر ہوتا ہے کہ عصمت کی نظر میں اعلیٰ طبقہ کی عورت کی جنسی زندگی مشکوک ہے۔ ان کی تخلیقات میں بھی اعلیٰ طبقہ کی تقریباً ہر عورت مختلف وجوہات کی بنا پر

۱؎ "چھوئی موئی" ص ۴۶ تا ۴۷　　۲؎ "معصومہ" ص ۱۹
۳؎ "چھوئی موئی" ص ۹

اخلاقی جرائم کے ارتکاب کا شکار نظر آتی ہے۔ جس کی وجہ سے فضیل جعفری نے ان کے اس رجحان پر اعتراض کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :

"پورے سلسلے میں ایسا لگتا ہے کہ خدا نے اس پورے طبقے کی تخلیق ہی اخلاقی جرائم اور خصوصاً EXTRA MARITAL رشتے بنانے کے لئے کی ہے"۔ ؎۱

عصمت نے اس میں کوئی شک نہیں کہ اس موضوع کو بہت زیادہ اہمیت دی ہے لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ ان کی طبیعت کو اسی موضوع سے خصوصی مناسبت ہے۔ موجودہ عہد ہر لحاظ سے تخصیص کا عہد ہے اس لئے اگر عورت کے موضوع سے عصمت نے خصوصی دلچسپی لی ہے تو یہ ان کی خامی نہیں بلکہ خوبی سمجھنی چاہیئے۔ وہ چونکہ خود عورت ہیں اور انہوں نے اس صنف کے جذبات کو بہت گہری نظر سے دیکھا ہے اس لئے اس موضوع پر ان کی نظر کی گہرائی اور گیرائی بڑی اہمیت کی مستحق ہے۔ ابتدا میں انہوں نے عورت کی جنسی زندگی پر خصوصی توجہ کی ہے اس وجہ سے بعض ناقدین ان کی خصوصی توجہ پر بھی اس طرح کے نفسیاتی شکوک کا اظہار کیا ہے کہ انہوں نے برائی کو بہت کریدا ہے۔ اس کو چھپایا نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مسعود زاہدی نے ان پر تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :

"انھیں ہر عورت میں طوائف نظر آتی ہے۔ ترقی پسندوں اور اصلاح پسندوں کا خیال ابھی تک یہی تھا کہ ہر طوائف میں عورت موجود ہے اور ہر طوائف پہلے عورت ہے بعد کو طوائف۔ لیکن ان کا زاویۂ نگاہ قطعی مختلف ہے"۔ ؎۲

راقم الحروف کے سوال کے جواب میں عصمت چغتائی نے اس سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے اس سے مسعود زاہدی کی تنقید کا جواب ملتا ہے۔ ملاحظہ کیجئے :

"دھن دولت کی دنیا میں عورت میں اور طوائف میں کیا فرق ہے؟

؎۱ "اردو افسانہ روایت اور مسائل" ص ۴۲۷

؎۲ مضمون "افسانوی رجحانات کا تجزیہ"۔ "ادب لطیف" لاہور اے افسانہ نمبر ۱۹۴۵ء شمارہ ۱-۲

دونوں کسی دولت مند مرد کی توجہ پر پلی ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ گھرہستن عام طور پر ایک مرد پالتا ہے اور طوائف ساجھے میں پلتی ہے۔ ان میں وہ عورتیں شامل نہیں جو اپنا بوجھ خود اٹھانے کے قابل ہیں۔ بغیر مرد کی مالی امداد کے بھی زندہ رہ سکتی ہے۔ بے غرض محبت کا لین دین کر سکتی ہیں۔

طوائف پن کیا ہے؟ مالی مدد دینے والے کی آؤ بھگت کرنا جو پیٹ کی خاطر کی جاتی ہے۔ بہت سوچتی ہوں مگر میری سمجھ میں بالکل نہیں آتا کہ ایک مرد میں جو بہت سی عورتیں پالتا ہے اور ایک عورت میں جو بہت سے مرد گھیرتی ہے' اخلاقی نقطۂ نظر سے کیا فرق ہے؟ اور کیوں مرد باعزت سمجھا جاتا ہے اور عورت طوائف اور نیچ سمجھی جاتی ہے۔ طوائفیں کوئی آسمان سے نہیں ٹپکتیں۔ انسانوں کی بہو بیٹیاں ہی ہوتی ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ بہت سی گھرہستنیں شوہر کے جوتے کھاتی ہیں۔ سوتوں کا دکھ سہتی ہیں۔ اُف نہیں کر سکتیں کہ انھیں خودداری کا اظہار کرنے کی جرأت نہیں۔ شوہر رنڈی کے کوٹھے سے شراب کے نشے میں لوٹتا ہے اور بیوی کو جوتے مارتا ہے۔ طوائف یہ ذلت نہیں جھیلتی۔ جوتی پلاکر اودھم مچاتا ہے' اسے دھکے دلوا کر کوٹھے سے نکال دیتی ہے۔ عام طور پر رنڈی کے کوٹھے پر لوگ بڑے ادب سے بیٹھتے ہیں۔ اسے ناراض کرتے ڈرتے ہیں۔ اس کی عزت کرتے ہیں۔ حاضری کی اجازت کے روپے دیتے ہیں۔ ایمان داری سے دو اور دو چار ملایئے' حقیقت سے منہ موڑ لینے سے اور صرف الفاظ پر

ایمان لانے سے سچائی پر پردہ نہیں ڈالا جا سکتا"۔ [۱]

یہی وجہ ہے کہ انہوں نے طوائف اور شریف گھرانے کی عورت کی سماجی حیثیت اور درجہ کے بارے میں اس طرح لکھا ہے:

"کون ہے جو یہ درجے بانٹ رہا ہے۔ میں بہت سی ایسی طوائفوں کو جانتی ہوں جنھوں نے جسم فروشی سے دولت کما کر شرافت کو خرید لیا۔ جبکہ غربت نے ان انگنت عورتوں کو طوائف بنا دیا۔ امیر طوائفوں کی بیٹیوں کی اعلیٰ خاندان میں شادیاں ہوئیں اور انہوں نے وہ درجہ پا لیا جو شریف گھرانے کی عورت کو نہیں ملا"۔ [۲]

عصمت کے اس طرح کے خیالات سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ غربت زدہ طوائفوں کی ہمدرد ہیں لیکن وہ دولت مند طوائفیں جو شرافت کا ڈھونگ رچاتی ہیں انھیں اچھی نظر سے نہیں دیکھتیں۔ جس سماج نے عورت کو غریب بنا کر طوائف بننے پر مجبور کیا ہے اور وہ اس لحاظ سے قابلِ نفرت ہے اسی طرح وہ سماج بھی اتنا ہی قابلِ نفرت ہے جو دولت مند طوائف کو شریف خیال کرتا ہے۔

سرمایہ دارانہ سماج نے طوائف کو جنم دیا ہے اور اس کی ہر شکل یکساں قابلِ نفرت ہے۔ یہ بات قابلِ نفرت ہے کہ سرمایہ دارانہ سماج میں عزت اور شرافت کا پیمانہ محض دولت ہے اور عورت سماج کے بنائے ہوئے غلط اصولوں اور اس نظام کی برائیوں کا شکار ہوتی رہی ہے۔ چنانچہ قرۃ العین حیدر نے عورت کے طوائف بننے کی ذمہ داری معاشرے پر ہی عائد کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ:

"عورت طوائف اس لئے بنتی ہے کہ اس کو تفریح کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ اس کی خرید و فروخت ہوتی رہی ہے کبھی وہ رقاصہ بنی ہے تو کبھی داشتہ۔ یہ پورے

---

[۱] عصمت "سوالنامہ" مورخہ ۲۹ اپریل ۱۹۸۲ء
[۲] عصمت "سوالنامہ" مورخہ ۳ جون ۱۹۷۹ء

نظام کی ہی خرابی ہے۔ پہلے وہ طوائف کہلاتی تھی اور
اب کال گرل کہلائی جاتی ہے۔ جو معاشرہ استحصال پر
مبنی ہو، جس معاشرے کی بنیاد ہی استحصال پر قائم ہو
تو پھر اس معاشرے سے اس کا الگ سے کوئی وجود
نہیں ہے"۔ [1]

جیلانی بانو نے بھی انہی وجوہات کی بنا پر طوائف کو شریف گھرانے کی عورت کے درجہ کی مستحق بتایا ہے [2] اور سلمیٰ صدیقی بھی عورت کو طوائف بنانے کی ذمہ داری سماج پر عائد کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ:

"طوائف تو سماج کی ٹکسال ہی میں ڈھلی ہے۔ طوائف کوئی
آسمان سے تھوڑی ٹپکتی ہے۔ تجارت کا پرانا دستور ہے کہ
دوکان دار بازار میں وہی مال لاتا ہے، جس کے خریدار وافر
ہوں اور دوکان داری کا یہ منصب عہدِ قدیم سے مرد کو
حاصل رہا ہے اور خریداری بھی! کہنے کا مطلب یہ ہے کہ
کوئی عورت اپنی خوشی اور مرضی سے چکلے میں نہیں بیٹھتی ہے
اس کی مصیبتیں، اور طرح طرح کے سماجی اور معاشی آلام
اُسے بے عزتی کی زندگی گذارنے پر مجبور کرتے ہیں۔ شریف
گھرانے کی عورت کی سے آپ کا مطلب شاید امیر گھرانے
کی عورت سے ہے، قدم قدم پر جسے سہارا دینے والے
موجود ہوں۔ ورنہ شرافت کا معیار تو ایک ہی ہوتا ہے
کون جانے آج جو شمعِ محفل ہے کل وہ چراغِ خانہ رہی ہو!"[3]

عصمت نے اپنی تخلیقات میں عورت کے طوائف بننے کے یہی اسباب بتائے ہیں۔

---

[1] : قرۃ العین حیدر سے راقم الحروف کا انٹرویو۔ بمبئی۔ مورخہ ۲۳ دسمبر ۱۹۷۸ء
[2] : جیلانی بانو سے راقم الحروف کا انٹرویو۔ حیدرآباد۔ یکم اکتوبر ۱۹۷۸ء
[3] : سلمیٰ صدیقی سے راقم الحروف کا انٹرویو۔ بمبئی۔ مورخہ ۲۶ دسمبر ۱۹۷۸ء

ناول "معصومہ" کی ہیروئن بھی چراغ خانہ سے شمع محفل بنتی ہے۔ ناول "عجیب آدمی" میں تربینی اور پدما کے کردار ہیں جو فلم سٹار بننے کے شوق میں بمبئی آکر فلمی لوگوں کی طوائفیں بن جاتی ہیں۔ ایسی فلمی طوائفوں کے بارے میں عصمت لکھتی ہیں کہ :

" ویسے وہ کوئی بلشتہاپشت کی رنڈی نہیں، اس میں اس کا کیا قصور آرٹ کی خدمت کرنے فلم لائن میں گئی اور وہاں سے لوگ نہ جانے کیوں اور کیسے اسے دھیرے دھیرے اس کونے میں کھینچ لائے۔" لہ

اس کے علاوہ افسانہ "نیرا" کی ہیروئن نیرا ایک نچلے طبقہ کی لڑکی ہے جو اپنے گاؤں کے سیٹھ کے لڑکے سندر کی ہوس کا شکار بنا جاتی ہے اور "جگ کی دلہن" کہلاتی ہے۔ ترقی پسند مصنفین نے ایسی طوائفوں کے مسائل کو اپنی تخلیقات میں پیش کرکے ان سے ہمدردی کا اظہار کیا ہے۔ پچھلے صفحات میں عصمت کے بیانات میں پھر ناول "معصومہ"، "عجیب آدمی" اور افسانے "نیرا"، "پیشہ" اور چھوئی موئی کے مجموعے میں جگہ جگہ طوائفوں سے ان کی ہمدردی نمایاں ہوتی ہے۔ انھیں کال گرل کی فکر نہیں ہے بلکہ ان غریب عورتوں کی فکر ہے جو جانداروں کی طرح رہتی ہیں۔ ان گری ہوئی مجبور عورتوں کو انھوں نے اپنے افسانے "بھیڑیں" میں پیش کیا ہے۔ اور بتایا ہے کہ یہ عورتیں بھیڑ بکریوں سے بدتر ہیں۔ اس طرح کی مقہور اور مجبور عورتوں کے بارے میں وہ لکھتی ہیں کہ :

" سوال تو ان عورتوں کا ہے جو جانوروں کی طرح برتی جاتی ہیں اور بوڑھی اور بیمار ہوجانے کے بعد سڑک پر بھیک مانگتی ہیں۔ اپنی اولاد کو جسم فروشی پر مجبور کرتی ہیں ہماری قومی سرکار کی سرپرستی میں بمبئی میں پینتالیس ہزار عورتیں کھلے بندوں جسم فروشی کرتی ہیں۔ ان میں کتنی نابالغ ہیں، کتنی لڑکیاں دوسرے شہروں سے اغوا کرکے اس دھندے میں جھونکی جاتی ہیں، مجھے اس کال گرل کی

لہ "چھوئی موئی" صـ ۸۹

فکر نہیں جو ٹھاٹ سے فلیٹ میں رہتی ہے اور سیٹھوں
کی عیاشی کا سامان ہے وہ انسان کی طرح تو رہتی ہے۔" ۱؎

ظاہر ہے ایسی طوائفوں سے انھیں ہمدردی ہے۔
کبھی کبھی ایسا معلوم ہے کہ عصمت طوائف کے پیشے کو ENCAURAGE کر رہی ہیں
کیونکہ سلمیٰ صدیقی نے ایک روایت بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"ایک ڈکھیا طوائف کی شامت آگئی جو عصمت چغتائی سے
اپنا دکھڑا روتے بیٹھ گئی۔ سب کچھ بتا سُنا چکی تو اس نے اپنے
اس نیک ارادے سے عصمت آپا کو مطلع کیا کہ وہ اپنی گناہ کی
زندگی سے عاجز آگئی ہے اور اپنی باقی ماندہ زندگی شریفانہ
اور صوفیانہ طور پر گزارنے کا فیصلہ کر چکی ہے۔"
عصمت آپا بے حد بھڑک کے بولیں:
ہے ہے بکمبخت کیا بھوکوں مرنے کا ارادہ ہے....؟
کتنے عیش کر رہی ہو، شریفوں کے کیا سرخاب کے پر لگے ہوتے
ہیں، جو شریف بننے کے لئے مری جا رہی ہو۔ کبھی پیشہ
چھوڑنے کی غلطی بھی مت کرنا .... اور چھوڑ دو تو میرے
پاس مت آنا روتی بلکتی .... شریف بہوں، بیویوں کی
طرح شریف مردوں کے جوتے ڈنڈے سہتی ہوئی۔"
اور اس طرح عصمت چغتائی نے اس طوائف کو طوائفیت کے
ایسے ایسے فائدے بتائے کہ وہ لالہ رُخ اپنے کاشانہ میں
واپس چلی گئی۔" ۲؎

اسی طرح کسی طوائف کو اپنے پیشے میں لگے رہنے کی ترغیب دینا حیرت انگیز بات معلوم ہوتی ہے مگر غور سے دیکھا جائے تو یہاں ان کا منشا واضح ہوتا ہے کہ ان کی نظر میں عورت بہر صورت

۱؎ عصمت "سوالنامہ" مورخہ ۳ر جون ۱۹۸۵ء
۲؎ سلمیٰ صدیقی۔ مضمون "عصمت چغتائی۔ ایک جادو گرنی" شاعر، بمبئی شمارہ ۳ صد ۱۲ ۱۹۷۶ء

معاشی طور پر آزاد رہے، انسان کی طرح زندگی بسر کرے۔ شریف بننے کے لئے معاشی طور پر مرد پر منحصر نہ رہے اور مردوں کی حرامکاریاں اور ذلتیں نہ سہے۔ افسانہ "پتھر دل" کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے عورت کو طوائف بننے کی بجائے محنت کر کے عزت کی زندگی گزارنے کی تلقین کی ہے۔ اس افسانے کی ہیروئن تہمینہ بی اے پاس کرنے کے بعد اپنی منہ بولی آنٹی کے پاس بمبئی آتی ہے۔ اس کی آنٹی اس کو دولت اور عیش و آرام کا لالچ دلا کر طوائف کا پیشہ اختیار کرنے کی رائے دیتی ہے مگر تہمینہ نوکری کر کے عزت سے جینا چاہتی ہے۔ اس کی آنٹی کہتی ہے کہ چار پانچ سو روپیوں میں بمبئی جیسے شہر میں مکان کا کرایہ اور دوسری ضروریات زندگی کو پورا کرنا مشکل ہے۔ پتھروں پر چلنے کی تمنا چھوڑ دے اور عیش سے زندگی بِتائے۔ مگر تہمینہ پتھروں اور کنکروں پر چل کر اپنے پاؤں زخمی کرنے کے لئے تیار ہو جاتی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عصمت عورت کو ایمان داری کے لئے مشکل پسند بننے کی تلقین کرتی ہیں۔ وہ تہمینہ کے بارے میں لکھتی ہیں کہ:

> "میں ایسی عورت کا جنم چاہتی ہوں۔ میں اس عورت کو
> چاہتی ہوں جو ہمت سے حوصلے سے زندہ رہے۔ وہ لالچ
> کو چھوڑ دیتی ہے اور دُکھ کی طرف راغب ہو جاتی ہے،
> دُکھ اٹھانے سے نہیں ڈرتی۔" [1]

اب رہا بھیڑ بکریوں کی طرح برتی جانے والی طوائفوں کا سوال تو ترقی پسندوں کی نظر میں ایسی بدحال طوائفیں ہمدردی اور اصلاح کی مستحق ہیں۔ عصمت کی تخلیقات میں ایسی طوائفیں بہت کم ہیں بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ البتہ سعادت حسن منٹو کی طوائف معاشی طور پر گری ہوئی سماج کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہوتی ہے جب کہ عصمت کی طوائف معاشی طور پر منٹو کی طوائف سے کئی درجہ بہتر ہے۔ منٹو کی طوائف ایک رات میں دس بارہ بار دلہن بنتی ہے اور اتنے ہی بار بیوہ ہو جاتی ہے۔ جب کہ عصمت کی طوائف کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ ان کے یہاں اعلیٰ طبقے کے لوگوں کا اعلیٰ کار ہے مگر انسان کی طرح زندگی بسر کرتی ہے۔ مگر عصمت ذاتی طور پر ایسی گندی طوائفوں کی ذمّہ داری اس نظام پر رکھتی ہیں اور ان کی اصلاح

---

[1] عصمت چغتائی "ترقی پسند تحریک اور میں" افکار کراچی، اشاعت خاص نومبر ۱۹۷۶ء صفحہ ۱۹

چاہتی ہیں۔ وہ ایسی طوائفوں کے متعلق اظہارِ خیال کرتی ہیں کہ :

"وہ ننگی بھوکی کتیا جو راہ چلتے کی ٹانگ پکڑ کر گھسیٹتی ہے جو ہر قیمت پر ہر حیثیت کے انسان کو لنگر باٹتی ہے۔ اس کی گندگی اور غلاظت گھن کھانے کی چیز نہیں بلکہ اصلاح کی محتاج ہے۔ اگر ہمارے مکان میں نالی سڑ رہی ہے تو یہ اس بے چاری نالی کا قصور نہیں بلکہ مکان دار کا قصور ہے، منہ موڑ لینے سے گندگی دور نہیں ہو جائے گی۔ طوائف گندی اور بیمار اور جعلساز ہے تو یہ اس کا قصور نہیں بلکہ نظام کا قصور ہے جو انسانیت کی یوں بے قدری کرتا ہے۔ طوائف کیسی بھی ذلیل ہو ہماری دنیا کے جسم کا ایک حصہ ہے اسے سڑا کر نہیں پھینکا جا سکتا... دیکھئے نا، آپ کے محلے کی نالی خراب ہو جاتی ہے تو آپ غل مچا دیتے ہیں اور آپ پروا بھی نہیں کرتے کہ اس سال لڑائی کی وجہ سے وکٹوریہ گارڈن میں عمدہ بیج نہ بوئے جا سکے، اس لئے اس سال تختۂ گل کی بہار سے لوگ محروم رہیں گے آپ کی بلا سے پھول کھلیں یا نہ کھلیں مگر نالی ضرور صاف ہونا چاہیئے۔" [1]

یعنی ایسی گندی طوائفوں کی اصلاح کے لئے وہ ملک میں سرمایہ داری کا خاتمہ کرنا چاہتی ہیں۔ ناول "ٹیڑھی لکیر" میں شمن، برکت سے طوائفوں کے بارے میں بحث کرتی ہوئی اس سے سوال پوچھتی ہے کہ ان طوائفوں کا علاج کیا ہے؟ برکت کہتا ہے کہ سرمایہ داری کا خاتمہ کرنا ہوگا، جس میں روس میں ہوا۔ [2] مطلب یہ کہ وہ ایسی طوائفوں کی اصلاح کے لئے اشتراکی نظامِ حکومت کی خواہاں ہیں۔ علاوہ ازیں وہ طوائف بننے کی ذمہ داری صرف معاشرے یا نظام پر ہی لاگو نہیں کرتیں بلکہ خود عورت کو بھی اس کی ذمہ دار ٹھہراتی ہیں اور عورت کو

---

[1] "ایک بات" صہ ۱۰۴ تا ۱۰۵ [2] "ٹیڑھی لکیر" صہ ۲۶۴

خود اپنی اصلاح کرنے کی تلقین کرتی ہیں۔ وہ عورت سے کہتی ہیں کہ :

" تو اپنا سر اٹھا، تو اپنا سر اٹھا کر اپنا حق مانگ تو صرف
بازار کی زینت کے لئے نہیں ہے۔ تجھے بیچا جاتا ہے
خریدا جاتا ہے۔ یہ تیرا قصور ہے۔ میں نے کبھی یہ نہیں
کہا کہ رنڈی کو سماج نے ہی بنایا ہے۔ میں نے یہ بھی کہا کہ
رنڈی خود بھی بنتی ہے۔ سستی اور کاہلی سے بنتی ہے
وہ محنت نہیں کرنا چاہتی۔" [1]

اور اپنے اس نظریہ کو انہوں نے افسانہ " پتھر دل " کی تہمینہ کے کردار کے ذریعہ پیش کر دیا ہے کہ عورت اگر چاہے تو طوائف بننے کی بجائے مشکل پسندی کا راستہ اپنا کر عزت سے زندگی گزار سکتی ہے۔

---

[1] عصمت " ترقی پسند تحریک اور میں " افکار کراچی ' اشاعت خاص ' نومبر ۱۹۷۶ء صـ۱۸ تا ۱۹

غلام حسین خاں ساحر حیدرآبادی

غزل

آپ سے ایک نظر پیار کی ڈالی نہ گئی
میری بگڑی ہوئی تقدیر سنبھالی نہ گئی

دیکھنے والوں کو اندازۂ غم کیا ہوتا
فرطِ غم میں بھی طبیعت کی بحالی نہ گئی

جن کی قسمت میں بھٹکنا تھا بھٹکتے ہی رہے
شوقِ منزل سے کوئی راہ نکالی نہ گئی

ڈر گئے دیکھ کے بجلی کی مسلسل چشمک
ہم سے بنیادِ نشیمن کی بھی ڈالی نہ گئی

دیکھ کر تشنہ لبی کا میرے عالم ساحر
بات میری میرے ساقی سے بھی ٹالی نہ گئی

غزل

ڈاکٹر وحید اشرف

جب سے اسیرِ کاکلِ پیچاں ہوئے ہیں ہم
پیہم اجل سے دست و گریباں ہوئے ہیں ہم

اک ہم ہیں رازِ گیسوئے بستہ سے آشنا
صیدِ بلائے زلفِ پریشاں ہوئے ہیں ہم

ناموسِ نازِ حسن کا جب آگیا سوال
آخر شہیدِ ناوکِ مژگاں ہوئے ہیں ہم

جس نے ہمارے دل کو اجاڑا ہے آج تک
اس سنگ دل کے دل کا بھی ارماں ہوئے ہیں ہم

پنہاں ہیں بن کے درد دلِ درد مند میں
خوں ہو کے رنگِ گل میں نمایاں ہوئے ہیں ہم

ہو کے چمن میں ہم نفسِ بوئے گل وحید
بہرِ نثارِ یار پر افشاں ہوئے ہیں ہم

غزل

مریم غزالہ

زخمِ دل کا اور گہرا ہو گیا
میری نظروں پر جو پہرا ہو گیا

اب کوئی پہچانتا ہمکو نہیں
کیا سے کیا اپنا یہ چہرہ ہو گیا

کل تلک تو آدمی آزاد تھا
ہر طرف کیوں آج پہرا ہو گیا

اب گھٹا میری طرف آتی نہیں
میں بھی جیسے کوئی صحرا ہو گیا

زندگی مریم غزالہ یوں لٹی
لفظ گونگے کان بہرا ہو گیا

غزل

سید غوث الدین علی خاں زاہد قادری

بھولے سے بھی نہ بات کوئی ہم بری کریں
جب نیک ہیں تو نیک رہیں کیوں بدی کریں

ڈوبے رہیں سرور میں مستی میں رات دن
آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے بادہ کشی کریں

اپنوں کے واسطے تو سبھی مرتے ہیں مگر
غیروں پہ بھی نثار کبھی زندگی کریں

جس دشمنِ قرار کا ہو لطف بھی ستم
اس دشمنِ قرار سے کیا دوستی کریں

زاہدؔ! خلوصِ دل سے عبارت ہے بندگی
دل میں نہیں خلوص تو کیا بندگی کریں

غزل

شمیم نصرت

ہر آن بیچ ڈالے ہر شان بیچ ڈالے
ساری کمائی اپنی نادان بیچ ڈالے

دعویٰ ہے جن کو اب بھی انساں کی رہبری کا
اُن رہبروں نے اکثر انسان بیچ ڈالے

دنیا دی لذتوں کی رنگینیوں کے بدلے
اکثر خدا کے بندے ایمان بیچ ڈالے

جشنِ بہار ہوگا امید تھی یہ سبکو
لیکن ہمیں نے اُس کے امکان بیچ ڈالے

اُن کی خوشی کی خاطر ہم نے شمیم اکثر
غم کے عوض ہی اپنے ارمان بیچ ڈالے

کشن پرتو
ترجمہ : ڈاکٹر یعقوب عمر

نازک فیصلہ

حشمت دیوان کے مہمان خانے میں سلیمان خان اپنے میزبان کے ساتھ تاش کھیلنے میں مصروف تھا۔ دونوں تاش کے پتوں کو تھامے ہوئے للچائی ہوئی نظروں سے ایک دوسرے کا جائزہ لے رہے تھے۔ دونوں کے ہاتھوں میں لرزش نمایاں تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو ہرانے کی فکر میں تھے اور اس طرح ایک دوسرے کو گھور رہے تھے جیسے جانی دشمن ہوں۔ دونوں کی نگاہوں سے انتقامی انداز جھلک رہا تھا۔ البتہ سلیمان خاں مزے میں تھا۔ وہ کئی گھنٹوں سے مسلسل جیت رہا تھا۔ حشمت دیوان نے واسکوٹ کی جیب سے طلائی گھڑی نکالی اور دیکھتے ہوئے بولا :

"۔ اُفوہ ! پانچ بج گئے۔ مجھے ایک ضروری کام بھی تھا اور کسی سے ملنا بھی تھا۔"

سلیمان خاں نے کہا : " اگر تم چاہتے ہو تو بازی ہم یہیں روک دیں اور کل ...."

"نہیں نہیں ! کھیلیں گے۔ کوئی بہت اہم کام نہیں۔ کل بھی کیا جاسکتا ہے۔"

سلیمان خاں ناراضگی سے بولا : "جیسی تمہاری مرضی ! مگر پیارے تم بہت ہار چکے ہو۔ آج قسمت تم سے روٹھی ہوئی ہے اور تم تھک بھی چکے ہو۔ تمہاری جیب بھی تقریباً خالی ہو چکی ہے۔ لہٰذا بہتر یہی ہے کہ آج یہیں پر کھیل ختم کر دیا جائے۔"

" ہرگز نہیں۔ کبھی نہیں ! اگر میری جیب خالی ہو چکی ہے تو کیا ہوا۔ گھڑی ہے۔ میرا گھر ہے۔ باغ ہے۔ گھر کا تمام مال و اسباب موجود ہے۔ میں کسی قیمت پر اس کھیل سے دست بردار نہیں ہو سکتا۔"

حشمت دیوان اپنا ذہنی توازن کھو چکا تھا۔ سلیمان خاں بہت دیر تک اُسے دیکھتا رہا

پھر نہایت ہمدردی سے کہنے لگا:

"یہ تو کوئی عقلمندی کی بات نہیں! مجھے کوئی اعتراض نہیں مگر . . ."

"اگر مگر کچھ بھی نہیں۔ میں تو کھیلوں گا! تمہاری باری ہے پتے بانٹو۔"

سلیمان خاں نے پتے بانٹے مگر اس کا دل شدت سے یہی چاہ رہا تھا کہ کھیل یہیں پر ختم کر دیا جائے چنانچہ وہ کھیل کسی نہ کسی بہانے ختم کرنے کی سوچتا ہی رہا۔

حشمت دیوان مسلسل ہارنے کی بنا پر اپنے حریف سے آنکھیں ملانے کی سکت کھو چکا تھا۔ شاید قسمت پلٹ جائے۔ اس موہوم امید نے ابھی تک اُسے اسیر کر رکھا تھا۔ کبھی کبھی وہ دھیرے سے پتوں پر ایک گہری نظر ڈال لیتا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ اس کے دل کی کشتی تلاطم خیز سمندر میں ڈول رہی ہو۔ کبھی ڈوبتی تھی کبھی اُبھرتی تھی۔ بدقسمتی سے وہ پھر ہار گیا اور قسمت دور کھڑی قہقہے لگاتی رہی۔

اچانک حشمت دیوان کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے حلق میں کانٹے پڑ گئے ہوں اور اب وہ آگے کھیل جاری نہیں رکھ سکے گا مگر دل کسی طرح بھی کھیل سے دست بردار ہونے کو تیار نہ تھا وہ چاہتا تھا کہ اس کے ہاتھوں کی بازی اتنی لمبی ہو جائے کہ روٹھی ہوئی قسمت پھر مہربان ہو جائے۔ وہ ہر قیمت پر ہاری ہوئی رقم واپس لینا چاہتا تھا۔ اس نے میز پر رکھے ہوئے شیشے سے اپنے پیگ میں تھوڑی سی شراب انڈیلی اور گلاس اٹھانا ہی چاہتا تھا کہ وہ ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ گو اس نے بدشگونی محسوس کی لیکن چہرے سے کسی قسم کی بدحواسی ظاہر نہ ہو اس کے لئے اس نے اپنے مہمان کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا:

"کیا تم بھی ایک گلاس لوگے۔"

سلیمان خاں نے اسے فاتحانہ نظروں سے گھورتے ہوئے جواب دیا۔ "نو! تھینکس۔"

حشمت دیوان نے دوسرا گلاس پُر کر کے اسے ایک ہی سانس میں خالی کر دیا۔ شراب کی گرمی جیسے ہی اس کی رگ و پے میں دوڑنے لگی اُسے کچھ سکون محسوس ہوا۔ اس نے اپنی ٹائی کھول کر سلیمان خاں کی طرف دیکھا۔ مگر سلیمان خاں کے چہرے پر شادمانی اور فتح مندی رقص کر رہی تھی۔ اچانک اس کے دل میں ایک عجیب سی نفرت پیدا ہوئی۔ اگرچہ حشمت دیوان اس کا لنگوٹیا یار تھا اور اس سے بہت محبت رکھتا تھا مگر چند لمحوں سے اُسے ایسا محسوس

ہو رہا تھا کہ وہ اچانک سلیمان خاں پر جھپٹ پڑے گا اور اس کے جبڑے توڑ دے گا۔

حشمت دیوان کا تعلق نوابی خاندان سے تھا اور وہ نواب زادوں کی طرح شکار اور جوئے کا رسیا تھا۔ اسی شوق میں وہ اپنی کافی دولت لٹا چکا تھا۔

نوجوانی ہی سے اس کی دوستی سلیمان خاں سے تھی۔ دونوں ایک ساتھ سیر و تفریح کو جاتے اور شکار کرتے تھے۔ البتہ جوا کھیلنے کا سلیمان خاں سے اُسے کم ہی اتفاق ہوا تھا مگر ادھر پچھلے ہفتے سے وہ دو تین مرتبہ اس کے ساتھ بازی کھیل چکا تھا اور آج بھی دونوں صبح سے ہی کھیل رہے تھے۔ آج سے پیشتر شاید ہی کھیلتے ہوئے ان دونوں میں تو تو میں میں ہوئی ہو مگر آج کھلم کھلا دشمنی کے آثار دونوں کے چہروں سے نمایاں تھے۔ اتنے میں حشمت دیوان پھر ہارا۔ وہ جیسے جیسے ہارتا جاتا تھا اس کا چہرہ سفید ہوتا جاتا تھا اور ایسا لگتا تھا کہ اس کا ذہنی توازن بالکل بگڑ چکا ہے۔

سلیمان خاں نے اپنے میزبان پر ایک ہمدردانہ نظر ڈالی اور کہنے لگا۔

" بہتر ہے کہ اب ہم اور نہ کھیلیں۔ پیارے تم دیکھ ہی رہے ہو کہ قسمت تمہارے ساتھ یاوری نہیں کر رہی ہے۔ میں اس موقع پر تمہاری بدقسمتی سے فائدہ نہیں اٹھانا چاہتا۔ مناسب یہی ہے کہ بازی یہیں ختم کر دی جائے۔"

حشمت دیوان کے ہاتھ میں پتے کانپنے لگے۔ اس کا ذہنی توازن بالکل بگڑ چکا تھا اُس نے اپنے آپ کو اس طرح جھٹکا دیا گویا حریف پر حملہ کرنا ہی چاہتا ہے مگر جلد ہی نارمل ہو گیا۔ اس نازک موقع پر بازی ختم کر دینا اسے بے حد مشکل معلوم ہو رہا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ یہ بازی ختم ہو جائے اور سلیمان خاں چلا جائے وہ سلیمان خاں جو صبح سے لے کر اب تک مسلسل اس کی رقم جیب میں اُتار چکا تھا وہ سلیمان خاں! جس نے اسے تقریباً کنگال کر دیا تھا۔ وہ کیسے اسے جیت کر چلا جانے دے۔ ممکن ہے اب بھی پانسہ پلٹ جائے اور اس کی ہاری ہوئی رقم میں سے ایک حصہ اُسے واپس مل جائے۔ چنانچہ اس نے بھرّائی ہوئی آواز میں جواب دیا:

" نہیں کھیل جاری رہے گا!"

سلیمان خاں نے کہا۔" تمہارے پاس اب اور رقم ہے کہاں! کھیل کیسے جاری رہ سکتا ہے؟"

حشمت دیوان نے تنک کر جواب دیا۔ " رقم نہیں ہے تو کیا ہوا۔ گھر اور باغ تو ابھی باقی ہیں!!"

" بہت خوب !!! "

" بہت خوب ، بہت خوب کیا ؟ کیا تم سمجھتے ہو میں مذاق کر رہا ہوں "

" اچھا اگر وہ بھی ہار گئے تو ! ۔ "

حشمت دیوان نے کوئی جواب نہیں دیا اور پتے بانٹنے لگا ۔ سلیمان خاں نے پتے اٹھائے اور اپنی قسمت پر نہایت مطمئن ہو کر مسکراتے ہوئے حشمت دیوان کو دیکھنے لگا ۔ اچانک کمرے کا پردہ اُٹھا اور ایک حسین و جمیل عورت آکر حشمت دیوان کے پیچھے کھڑی ہو گئی ۔

حشمت دیوان نے پلٹ کر اسے دیکھتے ہوئے کہا ۔ " اوہ ! غزالہ تم ہو "

غزالہ نزدیک آکر میز سے ٹک کر کھڑی ہو گئی اور کہنے لگی ۔ " ابھی کھیل ختم نہیں ہوا ؟ "

حشمت دیوان نے کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے جواب دیا : " ابھی ختم ہوئی جاتی ہے "

غزالہ سے نہ رہا گیا ۔ وہ سہمی ہوئی آواز میں پوچھنے لگی ۔

" آخر یہ بازی کب ختم ہوگی ؟ مجھ سے اب اور برداشت نہیں ہوتا ۔ کیا تم دونوں ابھی تک تھکے نہیں ہو ؟ "

حشمت دیوان نے کہا ۔ " کیا کریں اور کوئی کام نہیں ہے ۔ ۔ ۔ " یہ کہہ کر اس نے غزالہ کو خود سے قریب کر لیا ۔ وہ اسی طرح کھڑی رہی ۔ حشمت دیوان نے ہاتھوں سے تھپتھپاتے ہوئے نرم لہجے میں کہا ۔

" ڈیئر غزالہ ! کچھ دیر اور صبر کر لو ۔ میں بہت ہار چکا ہوں ابھی ہماری بازی ختم ہوئی جاتی ہے " پھر کچھ سوچتے ہوئے بولا ۔ " تم تیار ہو جاؤ ابھی تھوڑی دیر میں گھومنے چلتے ہیں "

غزالہ نہایت حسین اور جوان تھی ۔ بڑی بڑی آنکھیں شوخی سے بھرپور ، لب و رخسار کی سرخی میں ایک دل انگیز کشش اور سراپا نہایت زہد سوز تھا ۔ چند مہینے پیشتر ہی وہ اُسے والد کی لولاب سے منتخب کر کے لایا تھا ۔ جب سے وہ آئی تھی حشمت دیوان اس پر صدقے اور قربان تھا ایسے موقعے پر جب کہ وہ اپنی تمام پونجی تقریباً ہار چکا تھا غزالہ کا قرب اس میں ایک نئی اُمید پیدا کر رہا تھا ۔ وہ سوچنے لگا جب سے غزالہ کے قدم اس گھر میں آئے ہیں وہ نیک بخت ہی ثابت ہوئی ہے ۔ اب جب کہ وہ سب کچھ ہار چکا ہے اگر ۔۔۔ اگر !! غزالہ پر بازی کھیل لے تو ؟ ہو سکتا ہے اس کی خوش قسمتی سے پانسہ پلٹ جائے ۔ شاید وہ اپنی ہاری ہوئی دولت میں سے

کچھ واپس حاصل کرلے! اس خیال نے اُسے عجیب مسرت سے دوچار کر دیا۔ اس نے غزالہ کے ہاتھوں پر دباؤ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "جاؤ تیار ہوجاؤ!"

ایسے معلوم ہوا گویا غزالہ حشمت دیوان کا ذہن پڑھنے میں کامیاب ہوگئی ہو۔ غالباً اُسے معلوم ہوچکا تھا کہ حشمت دیوان کے ذہن نے کیا فیصلہ کیا ہے۔ وہ بے تاب ہوگئی اور قریب تھا کہ اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑیں مگر اس نے ضبط کا مظاہرہ کیا اور اندر چلی گئی۔

غزالہ کے جانے کے بعد حشمت دیوان پھر ہارا۔ حالانکہ اُسے ایسی اُمید نہیں تھی۔ یوں لگا جیسے کسی نے اس کا خون چوس لیا ہو۔ نااُمیدی اس کی آنکھوں میں رقص کرنے لگی۔ تھوڑی دیر کے لئے ٹھنڈا پسینہ بھی اس کی پیشانی پر نمودار ہوگیا۔ گھر، گھر کا سارا اسباب یہاں تک کہ وہ پائیں باغ بھی ہار چکا تھا۔ اب کوئی چیز اس کی بساط میں نہیں تھی۔ درد بھرے لہجے میں کہنے لگا۔

"اب میرے پاس کچھ نہیں!!"

اس کا چہرہ سفید ہوچکا تھا اچانک اس کی نگاہیں سلیمان خاں کی فاتحانہ اور مسکراتی ہوئی نگاہوں سے ٹکرائیں۔ اس نے پھر درد بھری آواز میں کہا۔

"اب کچھ نہیں رہا! سب ختم ہوگیا!!"

سلیمان خاں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔ "سوائے ایک چیز کے۔"

حشمت دیوان نے فوراً اس کا مطلب سمجھ لیا۔ کہنے لگا:

"ہاں بجز غزالہ کے!"

سلیمان خاں دھیمے لہجے میں کہنے لگا۔ "اس پر کیوں نہیں کھیل لیتے۔"

"غزالہ پر!!!"

"ہاں ہاں کیوں نہیں اگر یہ بازی تم جیت گئے تو میں تمہاری ساری پونجی لوٹا دوں گا۔"

ایک مرتبہ حشمت دیوان کا سارا جسم کانپ گیا۔ غزالہ پر بازی کھیل لوں؟ اگر ہار گیا؟ اُسے یقین نہ آیا نہ اس میں یہ ہمت باقی رہ گئی تھی کہ اتنا بڑا اقدام کرے۔ اب کھیل جاری رکھنے کے لئے صرف ایک ہی چیز باقی رہ گئی تھی۔ بازی چھوڑنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ سوچنے لگا کیا کرے؟ اور کیا کرے! اب جب کہ ساری پونجی ہاتھ سے نکل چکی ہے اگر وہ بھی چلی جائے تو کیا فرق پڑ جائے گا! کھیل ہی لوں شاید کوئی کرشمہ ہو جائے۔ اللہ ساری پونجی بھی لوٹ آئے۔ قطعی جواب

دینے سے پہلے وہ مزید غور کرلینا چاہتا تھا۔ اس کے اندر ایک جنگ جاری تھی۔ غزالہ کو وہ بہت چاہتا تھا۔ دل کسی طرح راضی نہ ہوتا تھا۔ آخرکار لالچ اور جوئے کے جراثیم بازی لے گئے۔ اس کے ذہن نے فیصلہ کرلیا کہ وہ کسی طرح بھی سلیمان خاں کو فاتحانہ اپنے گھر سے جانے نہ دے گا۔ "اپنے گھر" کے تصور پر اسے دل ہی دل میں ہنسی آگئی ———— اپنا گھر! اب اپنا کہاں تھا؟ وہ تو اسے ہار چکا تھا۔ !!! بہتر یہی ہے کہ وہ خود غزالہ کو لے کر یہاں سے چلا جائے۔

بالآخر اُس نے خود سے کہا۔ ہر چہ بادا باد! غزالہ کو بھی بازی پر لگا دوں گا اور اس گھر سے تنہا ہی نکل جاؤں گا! یا پھر سب کچھ میرا ہو جائے گا۔ تخت یا تختہ!

آخر اس نے ڈھٹائی سے کہہ ہی دیا۔

"ٹھیک ہے مگر غزالہ کو تمہارے سپرد کیسے کروں گا؟"

سلیمان خاں نے کہا۔ "اس میں کیا مشکل ہے اگر میں جیت گیا تو بھی غیر قانونی طریقے پر اُسے حاصل نہیں کروں گا بلکہ پہلے تم سے قانوناً خلع ہو جانے کے بعد اُسے حاصل کروں گا۔ مگر اس کے ساتھ یہ بھی شرط ہے کہ کسی قسم کی زبردستی نہ ہوگی اگر غزالہ خود سے میری ہونا قبول کرلے گی تب ہی اُسے اپناؤں گا اگر اُسے قبول نہ ہوگا تو وہ آزاد ہے۔"

حشمت دیوان اس آخری شرط سے خوش ہو اُٹھا۔ پتے اٹھا کر پھینٹنے لگا۔ دل میں کہنے لگا چاہے جو ہو جائے شرط بُری نہیں ہے۔ اُسے ایسے لگا جیسے خواب دیکھ رہا ہو۔

سلیمان خاں کو بھی کوئی جلدی نہیں تھی۔ اس نے حشمت دیوان کو سوچنے کی مہلت دیدی وہ نہیں چاہتا تھا کہ حشمت دیوان کو مجبور کر دے مگر حشمت دیوان کے سر پر تو شیطان سوار ہو چکا تھا اور اسے مجبور کر رہا تھا کہ وہ اس شرط پر بازی کھیلنا منظور کرلے۔ الغرض آخری بار اس نے قسمت آزمانے کا فیصلہ کر ہی لیا۔

"ٹھیک ہے مجھے منظور ہے۔"

سلیمان خاں مسکرایا۔ اسے اپنی قسمت پر پورا بھروسہ تھا۔ چند ہی سکنڈوں میں حشمت دیوان نے پتے تقسیم کر دیئے۔ اس کے ہاتھ ہی نہیں سارا وجود لرز رہا تھا۔

سلیمان خاں نہایت مطمئن تھا۔ اُس کے لئے جیتنے یا ہارنے کی کوئی اہمیت ہی نہ تھی۔

دونوں صورتوں میں اس کے لئے کوئی فرق پڑنے والا نہیں تھا۔ وہ نہایت غور سے حشمت دیوان کا چہرہ دیکھنے لگا کہ اس پر کیا رنگ نمایاں ہوتے ہیں۔

بدقسمتی سے حشمت دیوان یہ آخری بازی بھی ہار گیا۔ اس کا چہرہ سفید پڑ چکا تھا۔ سانس رُکتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ چند لمحوں کے لئے اس نے اپنا سر میز پر ٹکا دیا۔

کچھ دیر بعد حشمت دیوان اٹھا۔ اس کا سر چکرا رہا تھا۔ قریب تھا کہ وہ زمین پر گر پڑے۔ وہ کئی گھنٹوں سے اس کمرے میں بیٹھا ہوا مسلسل جوا کھیل رہا تھا۔ اس پر بے حد تھکن طاری ہو چکی تھی۔ وہ بدقت تمام اپنے آپ کو غزالہ کے کمرے میں لے آیا۔ جیسے ہی وہ کمرے میں داخل ہوا غزالہ لرزاں اور ترساں اس کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی اور نہایت دلگراشی سے اس کے ہاتھ تھام لئے۔ حشمت دیوان نے بدقت اتنا ہی کہا۔

"ڈیر غزالہ سنو! میرے پاس جو کچھ تھا اور جو کچھ نہ تھا سب جوئے میں ہار چکا ہوں تم سُن رہی ہو! گھر، اسباب، باغ، یہاں تک کہ تمہیں بھی ہار چکا ہوں۔"

غزالہ نے روتے روتے اپنا سر حشمت دیوان کے سینے پر ٹکا دیا۔

حشمت دیوان بولا۔ "اب نہ روؤ! قسمت میں جو ہوتا ہے وہ ہو کر رہتا ہے۔ اب تم میری ملکیت نہیں ہو، جاؤ اس کمرے میں سلیمان خاں کے پاس۔"

غزالہ کچھ سوچنے لگی۔ پھر اس نے کمرے کے دروازے کا پردہ اٹھایا اور آہستہ آہستہ اس کمرے میں داخل ہو گئی جہاں سلیمان خاں بیٹھا ہوا تھا۔

سلیمان خاں ایک کرسی پر بیٹھا ہوا سوچ میں غرق تھا۔ جیسے ہی غزالہ داخل ہوئی وہ اُٹھا اور کہنے لگا۔

"تم جانتی ہو کہ حشمت دیوان نے صبح سے مجھے یہاں جبراً روک رکھا ہے۔ ہم دونوں کھیلتے رہے۔ میں جلد کھیل ختم کرنا چاہتا تھا مگر وہ راضی نہ ہوتا تھا۔ معلوم ہوتا ہے اُس نے تمہیں بتا دیا ہے کہ وہ تمہیں بھی ہار چکا ہے۔"

غزالہ روتے ہوئے کہنے لگی۔ "ہاں ! میں جانتی ہوں کہ وہ مجھے ہار چکا ہے۔"

سلیمان خاں نے کہا۔ "تم جانتی ہو کہ اس شرط پر ہم نے بازی کھیلی تھی کہ اگر تم حشمت دیوان کے ساتھ رہنا چاہو گی تو میں تم پر جبر نہیں کروں گا اور اپنا حق چھوڑ دوں گا۔"

غزالہ روتی رہی مگر منہ سے کچھ نہ کہا۔

"کیوں رو رو کے برا حال کئے دیتی ہو۔ اگر میں تمہیں پسند ہوں تو یہ وعدہ ہے کہ تمہیں نہال کر دوں گا اور عمر بھر تم سے جُدا نہ ہوں گا۔ اگر تمہیں پسند نہ ہو تو بھی کوئی جبر نہیں ہے اچھی طرح سُن لو۔ میں اپنی آنکھیں بند کرلیتا ہوں اگر تم میرے ساتھ زندگی گزارنے پر راضی ہو تو صحن میں جاکر کھڑی ہوجاؤ اور اگر تمہاری مرضی نہ ہو تو واپس اندر چلی جانا۔ اگر صحن میں جاؤگی تو میں بھی چند منٹوں میں تمہارے پاس آجاؤں گا۔"

غزالہ کی آنکھیں ابھی برس رہی تھیں لیکن ایک لمحے کے لئے اس کے دل میں یہ خیال بھی آیا کہ اگر حشمت دیوان واقعی اس کا عاشق ہوتا تو کبھی اسے بازی پر لگا کر نہ ہارتا۔ لہٰذا معلوم ہوگیا کہ اس کے دل میں میری کوئی چاہت نہیں ہے ورنہ کون اپنی قیمتی اور عزیز شے کو اس طرح ہاتھ سے دیتا ہے۔ جب وہ مجھے نہیں چاہتا تو مجھے بھی سلیمان خاں کے ساتھ جانا چاہیئے۔

وہ نہایت آہستگی سے اُس دروازے کی طرف بڑھنے لگی جو صحن کی طرف جاتا تھا۔ سلیمان خاں کے دل میں مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی اور چاہتا ہی تھا کہ اس کے پیچھے جائے اور اُسے اپنے ہمراہ لے جائے کہ اچانک غزالہ رُک گئی۔ اس کا دل کہنے لگا۔

"اگر وہ مجھے نہیں چاہتا تو کیا ہوا؟ میں تو اسے چاہتی ہوں۔ آج جب کہ وہ ہر چیز سے محروم ہوچکا ہے میں اُسے کسی طرح تنہا نہیں چھوڑ سکتی۔"

چنانچہ وہ آدھے راستے ہی سے پلٹ کر اندرونی کمرے میں چلی گئی۔ •

ڈاکٹر بیگ احساس

میوزیکل چیر

چلچلاتی دھوپ سیاہ سڑک کی نس نس میں اتر گئی اور سڑک اژدہے کی طرح پھنکارے مارنے لگی۔ اس پھنکار سے موڑ کا منظر دھندلا گیا اسی وقت ایک تیز رفتار بس دھند کی چادر چاک کرکے نکلی تو یوں محسوس ہوا جیسے کوئی موٹا سا سرخ کیڑا اژدہے کی چکنی پیٹ پہ رینگ رہا ہو۔

میوزیکل چیر (MUSICAL CHAIR) کے کھلاڑی کی طرح اس نے بڑی پھرتی سے ایک سیٹ پر قبضہ جما لیا اور اس طرح مطمئن ہو گیا جیسے سفر کے اختتام تک اس سے یہ سیٹ کوئی نہیں چھین پائے گا۔ اسے وہاں آرام سے بیٹھا دیکھ کر تاخیر سے پہنچنے والے کرداروں کے چہرے لٹک گئے لیکن وہ خود بھی اندر سے اتنا مطمئن نہیں تھا جتنا بظاہر نظر آرہا تھا اپنی جانب اٹھی ہوئی نظروں سے وہ خوف زدہ تھا کہ کہیں کوئی ترسی ہوئی نظر اس کے اوپر کے سخت خول کو پگھلا نہ دے اور اس کے پگھلے ہوئے وجود کی راکھ جھاڑ کر اس سیٹ پہ قبضہ نہ جمالے۔ اس نے ہاتھ میں دبا ہوا میگزین کھول لیا۔ اس طرح وہ خود کو کچھ محفوظ محسوس کرنے لگا۔

بس رکی تو کرداروں کی بھیڑ اور بڑھ گئی۔

بہت ساری دیہاتی عورتیں اس کی سیٹ سے چونٹیوں کی طرح چمٹ گئی تھیں وہ چوکنا ہو گیا جیسے ذرا سی غفلت پر وہ چونٹیاں اس کے جسم کو گھسیٹ کر کسی اندھیرے بل میں چھوڑ آئیں گے۔ خوف کا گاڑھا سیال اس کی ریڑھ کی ہڈی پر بہنے لگا۔ ایک لجلجا سا سڑاندا اٹھتا ہوا ماحول بن گیا تھا۔

"بابو تھوڑی سی جگہ دے دو نا" وہ چونک پڑا۔ ایک دیہاتی عورت ڈھائی برس کی مریل سی لڑکی کو کندھے پر ڈالے اس سے سیٹ کا مطالبہ کر رہی تھی۔ اس نے حقارت سے اس عورت کو گھورا۔ جاہل عورت میوزیکل چیر کے اصول نہیں جانتی ــــ وہ عورت اس کے بہت قریب کھڑی تھی۔ اس عورت کو دیکھ کر اسے وہ پھل یاد آگئے جو پکنے کے عمل سے گزرنے سے قبل ہی ڈالی سے الگ ہو کر دھوپ میں پلپلا جاتے ہیں۔ ڈھائی برس کی وہ مریل لڑکی بھی اس عورت پر بڑا بوجھ لگ رہی تھی۔ وہ اس بوجھ کو

اُٹھائے خود کو بس کی رفتار سے ہم آہنگ کرنے اور توازن برقرار رکھنے کی کوشش میں ڈگمگا رہی تھی کمزور طبقات زندگی کا بوجھ اٹھائے حالات کی برق رفتاری سے ہم آہنگ ہونے کی کوشش میں یوں لڑکھڑاتے جا رہے ہیں اور یہی ان کا مقدر ہے تو پھر وہ کیا کر سکتا ہے۔ اس نے کھڑکی سے باہر جھانکا سیاہ سڑک ــ سرخ بس ــ مخالف سمت دوڑتے سبز کھیت سرخی سیاہی سے چمٹ کر سبزے کو بہت پیچھے چھوڑتی جا رہی ہے ــ انقلاب کا خواب جھوٹا ہے ــــ اژدہے کا آخری سرا بھی بہت دور ہے۔

اس کی سرد مہری سے عورت مایوس ہو گئی اور اس کی سیٹ کی پشت مضبوطی سے تھام کر وہ بڑی حد تک توازن برقرار رکھنے میں کامیاب ہو گئی تھی ایک عجیب کی بساند نتھنوں سے ٹکرانے لگی۔

ایک لمحے کے لئے اس نے سوچا اٹھ کر سیٹ عورت کے حوالے کر دے اور اس بساند سے دور جا کھڑا ہو جائے لیکن اس کے لئے میگزین بند کرنا ہوگا۔ اس طرح وہ علم کی بصیرت سے محروم ہو جائے گا۔ ایک سڑی بسی جاہل عورت کے لئے ــــ پورا گھنٹہ بھر اس بھینچے ماحول میں کھڑے کھڑے وہ تھک بھی جائے گا ــــ نہیں وہ نہیں اٹھے گا۔ میگزین بند کر کے وہ اونگھنے لگا۔ علم سے محرومی کا احساس ذہن کے کسی گوشے میں موجود نہ تھا۔

" بابو تھوڑی سی جگہ دے دو نا۔ اس نے اونگھتی ہوئی آنکھوں سے جھلا کر دیکھا۔ بچی کو تیز بخار ہے بابو اس نے سیٹ چھوڑ دی۔ بساند سے ناک پھٹ رہی تھی۔ اس بھیڑ میں کھڑی تنہا صاف ستھری و صحت مند عورت کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ جو اس طبقے سے تعلق رکھتی تھی جس طبقے میں پہنچ کر جوانی حسن اور عمر ایسے محفوظ ہو جاتے ہیں۔ جیسے فریج میں رکھی چیزیں ــ بظاہر تر و تازہ لیکن برف جیسی ٹھنڈی ــ

اس کی چھوڑی ہوئی سیٹ پر وہ عورت بیٹھ گئی تھی۔ گود میں دبی مریل چھپکلی جیسی لڑکی لپٹی ہوئی تھی جس کی آنکھیں حلقوں سے ابلی پڑی تھیں۔ جسم پر پھوڑوں پھنسیوں کے داغ اور دھیمے زخموں سے بہتی خون و پیپ کی آمیزش پیلے چیکٹے کپڑوں میں لپٹی وہ گندہ نالی کے بجبجاتے کیڑوں کی طرح کلبلا رہی تھی۔ اس نے گھبرا کر خوش پوش عورت کی عریاں لچکتی کمر پہ نظریں گاڑ دیں۔ بہت سی غلیظ نظریں اس عورت کے جسم پہ رینگ رہی تھیں ــ ان نظروں کا کوئی وجود ہوتا تو وہ عورت غلاظت میں ڈوب گئی ہوتی ــ چھپکلی جیسی لڑکی نے عجیب سی آواز نکالی۔ جیسے ابکائی لے رہی ہو ــ ابھی قے کر دے گی۔ لڑکی کے بدن میں زلزلہ سا آیا۔ آنتوں میں ہل چل مچی ــ خالی آنتوں نے کچھ نہیں اگلا ــ سوکھے ہونٹوں پہ ہلکی سی نمی کا احساس بھی نہ تھا ــ حلقوں سے ابلی ہوئی آنکھیں اور بھی پتھرا گئی تھیں

بھیں اس لڑکی کے اطراف کھڑی بوڑھی عورتیں مضطرب ہوگئیں۔ بڑے کربناک انداز میں لڑکی تڑپی۔ چھپکلی تو کبھی کی دم توڑ چکی تھی مگر بے جسم دم وہاں اچھل رہی تھی۔ "پیٹ میں کچھ بھی نہیں ہے ۔۔ دودھ تک نہیں پیتی" دیہاتی عورت نے ہمدردی سے گھبرائی ہوئی ایک عورت سے مخاطب ہو کر کہا۔ وہ سب ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ نحیف لڑکی بے قرار ہونے لگی۔ تو دیہاتی عورت نے بلاوز ہٹایا اور لٹکتی ہوئی چھاتی اس کے منہ میں ٹھونسنے لگی۔ اس کے پاس ہر مرض کا شاید یہی ایک علاج تھا۔ لڑکی نے ہونٹ نہیں کھولے منہ پھیر لیا۔ جیسے احتجاج کر رہی ہو کہ اب وہاں اس کے لئے کچھ بھی نہیں بچا ہے۔ یا پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس چھپکلی نے ان چھاتیوں کا سارا رس چوس لیا ہو۔

ان نچڑی ہوئی بے دم چھاتیوں کی جگہ صحت مند چھاتیاں ہوں تو وہ لڑکی راغب ہو جائے گی۔ اس نے سوچا۔ اس نے دائروں کی تلاش میں نظریں دوڑائیں ۔ اس بھیڑ میں سب سے صحت مند وہی عورت تھی جو اس کے قریب کھڑی تھی ۔۔ ساڑی کے آنچل بلاوز اور قیمتی برنیر میں احتیاط سے لپٹی خوب بھری بھری چھاتیاں"!! اگر یہ چھپکلی ایک ہی جست میں اس عورت کے سینے سے چمٹ کر زندگی کا امرت پی لے تو شاید ایک دم یوں صحت مند ہو جائے جیسے پچکے ہوئے غبارے میں ہوا بھر دی گئی ہو ۔۔ لیکن ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ انسان غبارہ کیسے ہو سکتا ہے ۔۔ اور پھر صحت مند عورت کا فیگر چیخ چیخ کر کہہ رہا ہے کہ اس نے بچوں کو بھی کم ہی سینے سے لگایا ہوگا۔ فیگر ۔۔ آج کی عورت کا سب سے اہم مسئلہ۔

آنکھوں میں کھپ جانے والا تیز خنجر۔
رگوں میں دوڑنے والا آتشیں سیال۔
"ٹکٹ ۔۔" کنڈکٹر اس دیہاتی عورت سے پوچھ رہا تھا۔

"دواخانہ جانا ہے۔" دیہاتی عورت نے چھاتی ڈھانکے بغیر کہا۔ لڑکی ہچکیاں لینے لگی تھی۔ بار بار اس طرح منہ کھولتی جیسے زندگی کی ایک بوند کی تلاش ہے ۔۔ اتھ دیے کی لمبائی ابھی باقی ہے ۔۔ دواخانہ تو بہت دور ہے لمحوں کا زہر قطرہ قطرہ بن کر ٹپک رہا ہے۔

پھر چھپکلی کی دم ناچنے لگی ۔۔ دیہاتی عورت نے مضطرب ہو کر اسے کندھے پر لٹا دیا۔ اور تھپکیاں دینے لگی۔ میلا کچیلا سا کپڑا اُبھرا ۔۔ بہت سی گدھیں ایک ساتھ اڑیں۔ کریہہ منظر تھا زخموں سے بہتی پیپ کوٹھوں پر جم گئی تھی۔ عورت نے لڑکی کو کندھے سے اتار کر گود میں لٹایا۔ تو چھپکلی کی دم بے حس ہو گئی تھی۔ سرخ کپڑا اچیخ کے ساتھ رک گیا۔ چلچلاتی دھوپ میں تپتے ہوئے اژدہے نے کروٹ لی۔ دیہاتیوں نے لڑکی کو سمیٹا اور بس سے اتر گئے۔ دواخانہ قریب تھا۔ مسافروں نے کھڑکیوں

سے گردنیں نکال کر دیہاتی عورتوں کو گھورا ۔ جوا کڑی ہوئی لڑکی کو ہاتھوں پر لٹائے ہوئے دھاڑیں مار مار کے رو رہی تھیں ۔ امید کی بکھری کرچیوں نے ان کے جسموں کو لہولہان کر دیا تھا ۔ اژدہا ہانپ رہا تھا ماحول میں ایک عجیب سی سراسیمگی پھیل گئی ۔ کرداروں نے بے بسی سے ایک دوسرے کو دیکھا ۔ زندگی کا ساز جھنا کے سے تھا تھا لیکن میوزیکل چیر خالی پڑی تھی ۔ متحرک تصویریں چلتے چلتے رک گئی تھیں ۔ فرینہ شارٹ تھا ۔ سارے کردار منجمد ہوگئے تھے ۔ کسی کی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ اس سیٹ پر قبضہ کرلے ۔ موت وہاں کنڈلی مارے بیٹھی تھی ۔

وقت نے مٹھی کھولی اور بہت سارے لمحے ایک ساتھ پھسل کر نکل گئے لیکن سیٹ خالی پڑی تھی ۔

اچانک ہی ان جامد کرداروں کے بیچ سے ایک بہت ہی خوبصورت لڑکی دراتی ہوئی آئی اور خالی سیٹ پر اطمینان سے بیٹھ گئی ۔

وہ سب مضطرب ہوگئے لیکن ان ساکت کرداروں سے اتنا بھی نہ ہوسکا کہ اس لڑکی کو روکتے اور وہاں سیٹ پر کنڈلی مارے بیٹھی موت کے بارے میں آگاہ کرتے ۔

اتنے طوفانی انداز میں در آئی زندگی کو روکنا کرداروں کے بس کی بات بھی تو نہیں اس لئے انھوں نے اضطراب کی نقاب نوچ پھینکی اور بھیڑیوں کی طرح منہ کھولے لڑکی کے جوان بدن کو گھورنے لگے ۔

غزل

بشیر وارثی

مثلِ شفق حیا سے ہوا ہے جو یار سرخ
رخسار آج اس کے ہیں جیسے انار سرخ

سرخی شباب کی ہے کہ لائی شراب کی
آنکھیں ہیں اس کی جیسے کوئی لالہ زار سرخ

شاید تصورِ لبِ لعلیں کا فیض ہے
آیا نہیں ہے یوں ہی شفق پر نکھار سرخ

اس سال آئی ہے عجب انداز سے بہار
گلشن کا پتہ پتہ ہے مثلِ چنار سرخ

الزام قتل کا نہ کسی پہ لگا دیے
آئی کہاں سے آپ کے دامن پہ دھار سرخ

شبیرؑ کے لہو نے کیا سرخرو بشیرؔ
اسلام کی قبا کا ہوا تار تار سرخ

کسوٹی

ذوقِ نظر کے اپریل ۱۹۸۵ء کے شمارے میں ڈاکٹر شاذ تمکنت صاحب کی غزل بغرضِ تنقید و تبصرہ شائع کی گئی تھی مئی کے شمارے میں اس غزل پر ڈاکٹر یعقوب عمر صاحب کا تبصرہ شائع کیا گیا تھا اس شمارے میں جناب علی احمد جلیلی صاحب کا تبصرہ ہدیۂ قارئین ہے۔

بجھا نہ دے کہیں اے حسن جوئے کم آبی
چراغِ تشنہ لبی کو ہوائے سیرابی

ڈاکٹر شاذ تمکنت کی غزل پر تنقید کرتے ہوئے ڈاکٹر یعقوب عمر نے اظہار خیال کیا ہے کہ اس شعر میں "اے حسن جوئے کم آبی کا ٹکڑا ابلاغ ضرورت ہے۔" اور شاعر جو کچھ کہنا چاہتا ہے اس کا مکمل مضمون صرف اتنا ہے "چراغ تشنہ لبی کو ہوائے سیرابی کہیں نہ بجھا دے"۔ سوال یہ ہے کہ "ہوائے سیرابی" کا ماخذ کیا ہے؟ جناب شاذ نے یہاں لفظ "جو" کے استعارہ سے بطور خاص کام لیا ہے۔ حسن سے متعلق اس استعارہ کو اگر اس شعر سے نکال دیا جائے تو سیرابی کا تلازم باقی نہیں رہتا اور شعر کا مضمون معلق ہو کر رہ جاتا ہے۔

تمام شہر سخن داد ناشناس ہنر
ہماری آبرو اہل نظر کی کمیابی

ڈاکٹر صاحب کے نزدیک شاذ تمکنت کا یہ "نہایت خوبصورت شعر ہے"۔ لیکن اس ہنر شناس داد کے ساتھ انہوں نے طنز کا ایک نشتر بھی چلا دیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ — "پہلا مصرع اردو کے حدود سے نکل کر فارسی قلمرو میں داخل ہو گیا ہے .... یہ چیز غالب کے زمانے میں ہی معیوب سمجھی جاتی تھی —" فارسیت غالب کی غزل گوئی کا ایک پہلو ہے نہ کہ عیب۔ ہو سکتا ہے کہ بعض لوگوں نے اس کو پسند نہ کیا ہو لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ 'فارسیت' کا عنصر کسی شعر یا مصرع کو معیوب بنا دیتا ہے درست اور قابل قبول نہیں! اگر اسے غالب کے کلام کا عیب سمجھ بھی لیا جائے تو غالب اس عیب کے باوجود سر فہرست ہے۔ پھر یہ کہ خود ناقد کے الفاظ میں — "دریا کو کوزے میں سمونے کی خاطر بروئے کار لانا پڑا ہے"۔ اردو کے بہت سارے شاعروں کا بالخصوص اقبال کا کلام تو اس سے بھرا پڑا ہے۔

خود اپنے آپ سے کھائی ہے میں نے زک اکثر
مری حریف رہی میری خوئے سرتابی

میرے نزدیک اس شعر میں کوئی نقص نہیں۔ مفہوم بھی واضح ہے۔ شاعر نے واضح طور پر اس بات کا اعتراف

کیا ہے کہ اس کی "خوئے سرتابی" اس کی دشمن ہے جس نے اکثر اسے شکست سے دوچار کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے اس شعر پر دو اعتراض ہیں۔ ایک یہ کہ "سوائے لفاظی اور تعقید کے اس شعر میں کچھ نہیں ہے" حشو و زوائد کیا ہیں۔ وہ نہیں بتا سکے اس لئے یہ اعتراض کوئی وزن نہیں رکھتا۔ دوسرا اعتراض یہ ہے کہ "شاعر اپنے دعویٰ کی کوئی معقول دلیل پیش نہیں کر سکا" آج کی غزل کے تعلق سے دعویٰ اور دلیل کی باتیں بہت فرسودہ ہو چکی ہیں۔ جدید تنقید میں اب یہ اصطلاحیں کہیں نظر نہیں آتیں۔ تاہم زیرِ بحث شعر کے دونوں مصرعوں میں مجموعی طور پر مفہوم کو پورا کرنے کے لئے جو لوازم درکار تھے وہ سب موجود ہیں۔

وہ قربتیں تھیں کہ بیتابیٔ سکوں جیسے
وہ دوریاں کہ ملا ہے سکونِ بیتابی

جدید غزل کے شعر کو اگر جدید ذہن سے نہ جانچا جائے تو تنقید نگار کی نظر اس کے حسن و قبح تک نہیں پہنچ سکتی کیونکہ پرانی غزل میں جو عناصر شجرِ ممنوعہ سمجھے جاتے تھے نئی غزل کا حسن و وقار بن گئے ہیں۔ پھر یہ کہ تنقید نگار جو قاری بھی ہے اسکو شعر کی جانچ کے لئے شاعر کی ذہنی سطح تک پہنچنا ضروری ہے اگر نہیں پہنچ پاتا تو وہی شعر اسے معمہ نظر آتا ہے۔ "بیتابیٔ سکون اور سکونِ بیتابی" نہایت خوبصورت ترکیبیں ہیں جن سے شاعر نے خود پر گزرنے والی دو متضاد کیفیتوں کی بڑے حسن سے ترجمانی کی ہے۔

بعض قربتیں ایسی ہوتی ہیں جن سے دوری کا احساس ہوتا ہے اس کیفیت کو شاعر نے بیتابیٔ سکون کا نام دیا ہے اور بعض دوریاں ایسی ہوتی ہیں جن پر سکون بیتابی کا اطلاق ہوتا ہے۔ اس میں سمجھ میں نہ آنے والی کوئی بات نہیں۔ پہلی کیفیت کی وضاحت میرے اس شعر سے بھی ہوتی ہے۔

بار ہا ہم پاس ان کے بیٹھ کر ناپتے ہیں قربتوں کی دوریاں

اس مضمون کا ایک اور شعر۔

نہ اشارہ۔ نہ کنایہ، نہ تبسم نہ کلام پاس بیٹھے ہیں مگر دور نظر کرتے ہیں

دھرا ہوا ہے مرا زادِ راہ بر لبِ جو
دفورِ تشنہ دہانی دلیلِ غرقابی

اس شعر پر بھی موصوف نے وہی "فارسیت" والی تنقید کو دہرایا ہے۔ لکھتے ہیں۔ "یہ شعر بھی ۵۰ فیصد فارسی ہے" نہ جانے ناقد نے یہ کلیہ کیسے اخذ کر لیا کہ فارسیت اردو شعر کا نقص ہے۔

ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ اس شعر میں "تشنہ دہانی کا بطور ضرورت استعمال فصاحت کے خلاف ہے" اس کی جگہ ڈاکٹر صاحب نے "تشنہ لبی" تجویز کرتے ہوئے یہ بھی لکھا ہے کہ "تشنہ لبی کے استعمال کا جواز

اسی وقت ممکن تھا جب کہ قافیہ میں اس کا استعمال ناگزیر ہو۔" اس کے جواب میں یہ لکھنا چاہوں گا۔

(۱) ایسا شاعر جو الفاظ کا انتخاب کرنا جانتا ہے اس کے لئے "تشنہ لبی" کا استعمال مشکل نہ تھا لیکن اس نے ارادتاً اسے ترک کرکے تشنہ دہانی کی ترکیب استعمال کی ہے اور اس طرح دو مساوی ٹکڑوں نے مصرع کو چست کرکے اس کا حسن بڑھا دیا ہے۔

وفورِ تشنہ دہانی، دلیلِ غرقابی

اس سے ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ لفظ "ہے" سے اسے نجات مل گئی جو حشو ہے اور مصرع میں جھول پیدا کرتا ہے جیسا کہ ناقد کے اس تجویز کردہ مصرع سے ظاہر ہوتا ہے۔

وفورِ تشنہ لبی ہے دلیل غرقابی

(۲) یہ کہنا بھی اور یہ قید لگانا بھی درست نہیں کہ صرف قافیہ کی صورت میں تشنہ دہانی کا استعمال ناگزیر ہوتا ہے۔ درست یہ ہے کہ شعر کے وزن کے لحاظ سے اس قسم کے الفاظ کہیں بھی بلا تکلف استعمال کئے جا سکتے ہیں۔ مثلاً۔

تیری زلفوں کی گھٹا اور کہیں جا برسی   رہ گئی تشنہ دہانی مری صحرا ہو کر

اس تعلق سے فصیح اور غیر فصیح کی بحث بھی بیکار ہے۔ ایک ہی لفظ کہیں فصیح اور کہیں غیر فصیح کیونکر ہو سکتا ہے

شکن شکن مری کروٹ گواہ ہے اے شاذ!
دکھا گئی ہے کئی خواب میری بے خوابی

اعتراض:۔ "شکن شکن، کروٹ اور بے خوابی جیسے اشاروں کے بعد "دکھا گئی ہے بے خواب" کا ٹکڑا قاری کے ذہن کو الجھا دیتا ہے۔"

یہ ضروری نہیں کہ غزل کے ہر شعر کو سائنٹیفک طور پر جانچا جائے۔ خواب دیکھنے کے لئے سونا ضروری نہیں ہے۔ خواب تو لوگ جاگتے میں بھی دیکھتے ہیں۔ تخیل کی دنیا بھی خواب کی سی کیفیت پیدا کر سکتی ہے۔ اس شعر میں جناب شاذ نے بے خوابی کے لوازمات شکن شکن اور کروٹ کو جمع کرکے بے خوابی کے عالم میں جن خوابوں کو قوتِ تخیل سے مجسم کرنا چاہا ہے اس نے بے خوابی کے کرب میں بھی لذت پیدا کر دی ہے۔

بچوں کا صفحہ

محمد ظہیر الدین

حرص کی سزا

کہتے ہیں ایک مچھیرا اور اس کی بیوی کسی سمندر کے کنارے ایک درخت کے نیچے رہتے تھے مچھیرا دن میں صرف ایک مرتبہ سمندر میں اپنا جال پھینکتا تھا اور کوئی مچھلی پکڑی جاتی تو اس کو شہر میں بیچ کر دونوں گزر بسر کرتے اور اگر کوئی مچھلی نہ ملتی تو بھی گھر آکر خدا کا شکر ادا کرتا اور دوسرے دن کا انتظار کرتا ایک دن اس نے حسب عادت سمندر کا جال ڈالا جب اسے باہر نکالا تو اس میں بہت بڑی مچھلی تھی وہ اتنی بڑی مچھلی کو دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ لیکن جلد ہی اس کی خوشی حیرت میں بدل گئی جب اس نے سنا کہ مچھلی کہہ رہی ہے کہ مجھ پہ رحم کر مجھ پہ رحم کر مجھے چھوڑ دے میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں میں تجھے اس کا بہت بڑا بدلہ دوں گی۔ اس نے مچھلی کو پانی میں چھوڑ دیا۔ مچھلی نے سمندر میں غوطہ لگایا اور پھر پانی کی سطح پر ظاہر ہوئی اور کہا اے اچھے مچھیرے! تیرا شکریہ تو نے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے تو جو کچھ مانگے گا میں تجھے دے دوں گی اور پھر پانی میں غوطہ لگائی۔ مچھیرے نے واپس آکر پوری روداد اپنی بیوی کو سنائی بیوی نے ماننے سے انکار کر دیا اور کہنے لگی اگر تو سچا ہے تو مچھلی کے پاس جا اور اس سے کہہ کہ ہمیں رہنے کے لئے چھوٹا سا گھر دے۔ مچھیرے نے سمندر کے کنارے جا کر مچھلی کو آواز دی مچھلی پانی کی سطح پر ظاہر ہوئی اور پوچھا اے اچھے مچھیرے تو کیا چاہتا ہے۔ مچھیرے نے کہا میری بیوی ایک چھوٹا سا گھر چاہتی ہے مچھلی نے کہا جا اے اچھے مچھیرے تو وہاں درخت کے نیچے ایک چھوٹا اور خوبصورت گھر پائے گا مچھیرے نے واپس آکر دیکھا اس کی بیوی ایک خوبصورت گھر میں رہ رہی ہے۔ لیکن بیوی نے اس پہ قناعت نہ کی اور شوہر سے کہنے لگی یہ گھر تو بہت چھوٹا ہے تو جا کر مچھلی سے کہہ دے کہ ہمیں ایک بڑا گھر چاہئے۔ مچھیرا پھر سمندر کے کنارے گیا اور مچھلی سے بیوی کی خواہش کا ذکر کیا تو مچھلی نے کہا جا اے اچھے مچھیرے تو چھوٹے گھر کی جگہ بڑا گھر پائے گا۔ گھر لوٹا تو دیکھا کہ اس کی بیوی ایک بڑے گھر میں رہ رہی ہے۔ لالچی بیوی نے کہا تو مچھلی کے پاس جا اور اس سے کہہ کہ ہمیں شہر کے

ذوقِ نظر

بنگلوں کی طرح خوبصورت بنگلہ چاہیئے مچھیرا نے پھر جا کر مچھلی سے کہا کہ میری بیوی چاہتی ہے کہ اس کو شہر کے بنگلوں کی طرح خوبصورت بنگلہ ملے۔ مچھلی نے کہا جاؤ اے اچھے مچھیرے تیری بیوی شہر کے بنگلوں کی طرح خوبصورت بنگلہ میں رہے گی مچھیرے نے واپس آکر دیکھا کہ اس کی بیوی ایک خوبصورت بنگلہ میں رہ رہی ہے لیکن اس کی بیوی نے اس پر بھی قناعت نہ کی اور کہا کہ تو جا اور مچھلی سے کہہ کہ ہمیں ملکہ کے محل کی طرح محل چاہیئے۔ مچھیرے کو بیوی کے اس لالچ پر بہت غصہ آیا اور اس نے مچھلی کے پاس جانے سے انکار کر دیا لیکن بیوی کے مجبور کرنے پر ایک بار پھر وہ سمندر کے کنارے گیا اور مچھلی کو صدا دے کر عرض حال کیا۔ مچھلی نے کہا کہ اے اچھے مچھیرے جا میں نے تیری بیوی کو ملکہ جیسا خوبصورت محل دیا۔ مچھیرے نے واپس آکر دیکھا کہ بیوی ایک خوبصورت محل میں رہ رہی ہے ایک دن مچھیرے کی بیوی نے کہا کہ میں اس زندگی سے خوش نہیں میرا محل تو ملکہ جیسا ہے لیکن جب میں باہر نکلتی ہوں تو لوگ میرا استقبال ملکہ جیسا نہیں کرتے تو مچھلی کے پاس جا اور اس سے کہہ کر مجھے ملکہ بنا دے مچھیرا اپنی بیوی کی تازہ فرمائش سے بگڑ گیا اور مچھلی کے پاس جانے سے یہ کہتے ہوئے انکار کر دیا کہ مچھلی نے ہم پر بہت احسان کیا ہے۔ ہمکو قناعت کرنی چاہیئے۔ بیوی نے مچھیرے کی بات نہیں مانی آخر اسے ایک بار پھر مچھلی کے پاس جانے پر مجبور ہونا پڑا۔ وہ سمندر کے کنارے گیا اور مچھلی کو آواز دیکر سارا قصہ سنا ڈالا۔ مچھلی نے کہا اے اچھے مچھیرے میں تیری بیوی کو ملکہ بنا دیتی ہوں لیکن حرص نہ کر جو کچھ تو نے جمع کیا حرص وہ مٹا دے جائیگی۔ اور جب مچھیرے کی بیوی کی سواری اور ملکہ کی سواری کی طرح نکلی تو بجلی چمکنے لگی اور بادل برسنے لگے دیکھتے ہی دیکھتے۔ سڑکیں پانی سے بھر گئیں اور استقبال کے لئے کھڑے ہوئے لوگ اپنے گھروں کو بھاگ گئے۔ یہ حال دیکھ کر ملکہ کو بہت غصہ آیا اور شوہر سے کہنے لگی یہ کیا تماشہ ہے سورج مجھ سے چھپ گیا اور بارش مجھ پر برس پڑی حالانکہ میں ملکہ ہوں تو جا کر مچھلی سے کہہ کے وہ مجھے آسمان کی ملکہ بنا دے تا کہ میں سورج بارش اور ہوا پر حکومت کر سکوں جب مچھیرے نے جانے سے انکار کیا تو وہ رونے پیٹنے لگی اور مچھیرے کو مجبور کر دیا کہ ایک بار پھر بھی مچھلی کے پاس جائے۔ آخر مچھیرے نے جا کر مچھلی کو صدا دی اور بیوی کی ضد کا حال سنایا تو مچھلی نے ہنس کر کہا اے اچھے مچھیرے یقیناً تیری بیوی حریص عورت ہے وہ کسی چیز پر خوش نہیں ہوتی اور کسی چیز پر قناعت نہیں کرتی۔ اس کے لئے یہی بہتر ہے کہ وہ املی کے پیڑ کے نیچے رہے مچھیرے نے وہاں سے لوٹ کر دیکھا کہ اس کی بیوی اسی درخت کے نیچے بیٹھی ہے تو اس نے ہنس کر کہا تو بیٹھی ہے بغیر قالین کے اور بغیر چھت کے اے زمین و آسمان کی ملکہ ـــ بیوی کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

بزمِ خیال

(اس عنوان کے تحت قارئین "ذوق نظر" کے دو ایسے سوالوں کے جواب دیئے جائیں گے جن کی نوعیت علمی و ادبی ہو۔ ادارہ)

س ۱ :- کیا یہ صحیح ہے کہ انگریز بھی اُردو کے شاعر ہیں؟ (محمد عبدالحمید قلعہ گولکنڈہ حیدرآباد)

ج :- جی ہاں ۔ انگریزوں نے اردو میں شاعری کی ہے۔ ایسے شعراء کے حالات اور نمونہ کلام کے لئے ڈاکٹر رائے بہادر رام بابو سکسینہ کی کتاب "تاریخ ادب اردو" کے اوراق الٹیئے اس کے علاوہ حیدرآباد کے ایک مصنف حبیب یوسف الدین مرحوم نے چالیس سال اُدھر ایک تذکرہ "انڈو یورپین شعرائے اردو" کے نام سے چھپوایا تھا۔

ہم آپ کے مطالعہ اور معلومات کے لئے ماہنامہ افکار کراچی اپریل ۱۹۸۱ء کے مبسوط اور ضخیم "برطانیہ میں اردو" نمبر سے چند شعراء کا کلام درج کر رہے ہیں۔ افکار کے اس یادگار نمبر میں مولانا عبدالماجد دریابادی کا ایک مضمون "اردو میں چند انگریز شاعر" کے زیر عنوان چھپا ہے اسی مضمون کا مفید اقتباس درج کیا جاتا ہے۔

جانِ عالم ترے انداز نے مارا مجھ کو ؎ بے ترے اب تو نہیں زیست گوارا مجھ کو
زلفیں جھک جھک کے یہ کہتی ہیں کسی کو پھانسوں ابرو اس شوخ کے کرتے ہیں اشارا مجھ کو

یہ شعر خاص الخاص یورپین آئی اے یس صاحب بہادر کے ہیں اب سے ۷۵ سال پہلے ڈاکٹر ولیم ہوٹی کمشنر و کلکٹر نے یہ شعر کہے تھے ۔

کسی کی بات محبت میں ناگوار نہیں ؎ کسی کی بات سے ہرگز کچھ انتشار نہیں
مرے لئے تو محبت کٹھن ہے مشکل ہے مجھے ملے وہ سمندر جو ہمکنار نہیں

یہ دو شعر مسٹر آر پی ڈیو ہرسٹ کے ہیں، یہ صاحب بہادر اُناؤ، رائے بریلی (اتر پردیش) میں کلکٹر اور سشن جج کے عہدہ پہ فائز رہے، ۱۹۱۰ء میں پنشن لے کر آکسفورڈ چلے گئے اور وہاں اردو زبان کے استاد بن گئے ۔

ایک صاحب خاص علم و زبان کے ماہر یہ دفیسر ایڈورڈ پامر ہوئے ہیں کہا جاتا ہے کہ عربی کے منتہی عالم تھے اور خود کیمبرج میں عربی زبان کے استاد تھے ۔ چند شعر ملاحظہ ہوں ۔

جان لب پہ آن پہنچی دلدار گھر نہ آیا ٭ ہم جا چکے جہاں سے پر وہ اِدھر نہ آیا
تب تک نہ باز آیا رونے سے دل ہمارا ٭ آنسو کے ساتھ جب تک خونِ جگر نہ آیا
بیتابیوں سے عاشق لاکھوں مرے گئے ہیں ٭ لیکن وہ جور پیشہ بیرون در نہ آیا
اس چشم خوں فشاں سے کس دم لہو نہ برسا ٭ سیلاب خون ہمدم کیا کیا کمر نہ آیا
پائمرسا اک نصارا تھا بے گناہ مارا ٭ اے بت خدا کا تجھ کو ذرہ بھی ڈر نہ آیا

اب سلیمان شکوہ گارڈنر فنا کے اشعار ملاحظہ کیجئے ؎

مرا دیواں ہے مشرق آفتابِ حمدِ یزداں کا ٭ طلوعِ صبح معنیٰ ہے ہر اک مصرع دیواں کا
غیر سے فیصلہ طلب ہے وہ ٭ ہم سے کوئی معاملہ نہ ہوا
دل کو میں خاک میں ملا دیتا ٭ ہائے افسوس! دوسرا نہ ہوا
روئے سفید کو ڈکریں گے سیاہ پھر ٭ لو آج شیخ بیٹھے ہیں قصدِ قصاب میں

ڈاکٹر بنجمن ڈیوڈ روز مضطر الہ آبادی ؎

دل کو تسکیں مگر نہیں آتی ٭ کوئی صورت نظر نہیں آتی"
مرنے جینے کی اے شب فرقت ٭ کوئی صورت نظر نہیں آتی

مس ایلیں کرسچانہ گارڈنر ؎

خودی نے مجھ پہ کیا ہے ستم خدا کی قسم ٭ جو بے خودی ہے تو پھر کس کا غم خدا کی قسم
یہ غیب غیب ہے کہتے ہیں لوگ جسکو شہود ٭ شہود ہی ہے عدم کا عدم خدا کی قسم
جو ہونے کا ہے نہ ہونا وہی تو ہے عقبیٰ ٭ نہ ہونے کا ہے نہ ہونا عدم خدا کی قسم
مزے جو دل نے دکھائے وہ دل ہی جانتا ہے ٭ نہیں ہے دل یہ مگر جام جم خدا کی قسم

س ۲ ۔ ہندوستان کا سب سے پہلا اردو اخبار کونسا ہے؟ (محمد عبدالحمید قلعہ گولکنڈہ)

ج ۔ ۱۹۶۰ء (۱۹ اکتوبر) میں بمقام دہلی اردو اخبارات اور کتابوں کی نمائش منعقد ہوئی تھی۔ اس سلسلے میں پریس انفارمیشن بیورو دہلی نے چند صحافتی مضامین اخبارات کو جاری کئے تھے۔ ہم کتب خانہ ادارۂ ادبیات اردو سے پی آئی بی کے ایک مضمون سے آپ کے سوال کا جواب نقل کرتے ہیں۔

۱۸۲۲ء میں صرف ایک اردو اخبار کلکتہ سے شائع ہوتا تھا۔ اس کا نام جام جہاں نما ہے اس کے بارے میں محمد عتیق صدیقی نے اردو صحافت پر ایک مفید کتاب میں لکھا ہے کہ "جام جہاں نما" (کلکتہ) ہندوستان کا دوسرا فارسی اور پہلا اردو اخبار تھا۔ فارسی کا پہلا اخبار راجہ رام موہن رائے نے

کلکتہ سے مراۃ الاخبار کے نام سے نکالا تھا۔ مراۃ الاخبار اور جام جہاں نما میں صرف ڈیڑھ مہینے کی چھٹائی بڑائی تھی۔ جام جہاں نما کے ایڈیٹر منشی سدا سکھ تھے۔ اخبار نستعلیق ٹائپ میں چھپتا تھا اس اخبار کو ایسٹ انڈیا کمپنی کی حمایت اور سرپرستی حاصل تھی یہ اخبار ۴ صفحات کا ہوتا تھا اور سائیز ۳۰×۲۰/۸ تھا۔ اس اخبار میں شاعری بھی چھپتی تھی۔ خبروں کے علاوہ مضامین بھی ہوتے تھے۔ ایک شمارہ میں غزل لطف افزا مسٹر ڈی کاسٹا کے زیر عنوان یہ یہ اشعار چھپے تھے۔

کل ہم تمہارے کوچے میں اۓ چلے گئے ہے غم میں ہزار اشک بہائے چلے گئے۔
کل اُس پری کی بزم میں سب مل کے پر ملا تیری غزل ڈی کاسٹا گائے چلے گئے
مانگتے تجھ سے دوا ہم نہ کبھی اے پیارے مرض ہجر کا جز وصل جو چارا ہوتا
موجزن زورق دل اپنا نہ ہوتا دائم بحر الفت کا کبھی آہ کنارا ہوتا

جام جہاں نما اردو کا وہ پہلا اخبار ہے جو چار سال آٹھ مہینے تک جاری رہنے کے بعد ۲۳ر جنوری ۱۸۲۸ء کو بند ہوگیا۔

مزاحیہ غزل

(سر پٹ حیدرآبادی)

جو نسبت ہے یہاں وعدے وچن میں وہی نسبت ہے شادی اور لگن میں
ہمارا بھی ہوا تھا عقد ان سے رہے ہم بھی رتن اک نورتن میں
رقیبوں میں اڑنچھو ہوگئے وہ اکڑتے رہ گئے ہم بانکپن میں
پرانے میکشوں میں ہے بڑھاپا جوانی ہے نئے توبہ شکن میں
بنیں گے اندھوں میں ہم کانے راجا بٹھاؤ پاس ہم کو انجمن میں
ملے گا کیا امانت دار بن کر منافع ہی منافع ہے غبن میں
میں فاقے کر کے دبلا ہو رہا ہوں مجھے ضم ہوتا ہے نازک بدن میں
یہ چلے جانا تھا مجھ کو دفن کر کے یہ گھس کر رہ گئے تم کیوں کفن میں
حواس و ہوش میں اپنے نہیں ہے
ہے سرپٹ آجکل گم مادمن میں



"ذوقِ نظر"

حیدرآباد

فون نمبر 25117

جلد (۱) جولائی ۱۹۸۵ء شمارہ (۷)

زرِ تعاون :- سالانہ پچاس ۵۰ روپئے فی شمارہ : پانچ روپے

عرب ممالک سے فی شمارہ ۵ ریال

محمد بشیر الدین ایڈیٹر پرنٹر اور پبلیشر نے اعجاز پرنٹنگ پریس میں چھپوا کر دفتر ذوقِ نظر ۶۱۳-۸-۱۴ [illegible] حیدرآباد سے شائع کیا۔

اس شمارے میں

حرفِ آغاز

آج سے ۲۵، ۳۰ سال قبل کے عالمی معاشرے میں منظم تشدد اور دہشت گردی کی مثالیں خال خال ملتی تھیں لیکن گذشتہ پانچ سال سے اس میں جو غیر معمولی اضافہ ہوا ہے اُس نے سب کو دہلا کر رکھ دیا ہے قتل و خونریزی کی وارداتیں ایسی بے جگری اور بے حسی سے کی جارہی ہیں جیسے گڑیوں کا کھیل ہو۔ معصوم اور بے گناہ افراد کا خون انتہائی بے دردی سے کیا جارہا ہے اور اسے ایک اسپورٹ سمجھا جارہا ہے۔ فلسطین ہو یا سری لنکا، جنوبی امریکی ممالک ہوں یا آفریقی ممالک تشدد نے انتہائی درندگی اختیار کرلی ہے۔ ماہرین [illegible] نفسیات بھی شش و پنج میں پڑ گئے ہیں کہ آخر اس برائی نے اچانک اتنی شدت کیوں اختیار کرلی ہے۔ آخر بے انصافیاں، جبر و تخویف، حق تلفیاں پہلے بھی ہوتی رہی ہیں مگر اس کے ردعمل میں ایسا خوفناک تشدد ابھر کر کبھی سامنے نہیں آیا جو ان سب کا انتقام بے گناہوں سے لیتا۔ دانشمندوں کے لئے واقعی یہ ایک لمحۂ فکر ہے کہ آخر اس بے نظیر تشدد کے پیچھے کونسا جذبہ کام کررہا ہے۔ وہ کونسے عوامل ہیں جس نے انسانی معاشرے میں ایسے رِستے ہوئے ناسوروں کو جنم دیا ہے۔ وہ کونسی وجوہات ہیں جنکی بناء پر چند سر پھرے اور سرپوش نوجوان ملکی اور بین الاقوامی قوانین کو اپنے ہاتھوں میں لے لیتے ہیں۔

محترمہ اندرا گاندھی کے بہیمانہ قتل سے لیکر ایر انڈیا کے جمبو جٹ کی تباہی تک تخریب کاروں اور تشدد کے علمبرداروں نے جو ننگا کھیل کھیلا ہے اُس نے ہر اُس شخص کو دہلا کر رکھدیا ہے جو رائی برابر بھی جذبۂ دردمندی کا حامل ہے۔ اس طیارے میں ستّر نوخیز اور معصوم بچے بھی سفر کررہے تھے۔ ایسا نیچ عمل، ایسا سفاکانہ کھیل اور ایسا بیدردی کا مظاہرہ کرنے والے سبھی کچھ ہوسکتے ہیں لیکن انسان نہیں ہوسکتے۔

غالباً انقلاب روس کے بعد ہی ایسی روپوش تنظیموں کا رول شدت سے اُبھر کر سامنے آتا ہے جو ہر مسئلے کو بندوق کی گولی سے حل کروانے کو اپنا نصب العین سمجھتی ہیں اور اپنا جائز و ناجائز مقصد حاصل کرنے کے لئے انھیں غلط راستے اپنانے میں کبھی باک محسوس نہیں ہوا کرتا۔ عالمی معاشرے کی اکثریت اسی خیال کی حامل ہے کہ یہ تشدد کمیونزم کی دین ہے مگر میں سمجھتا ہوں کہ اسمیں ذرا مبالغے سے کام لیا گیا ہے۔ چند وجوہات میں یہ بھی ایک وجہ ہوسکتی ہے اس سے مجھے انکار نہیں مگر میرا خیال ان فلموں کی طرف بار بار جاتا ہے جو سینکڑوں کی تعداد میں دنیا کے ہر گوشے میں دکھائی جارہی ہیں اور جنہیں تشدد کے بہیمانہ مناظر کی عکاسی ضرورت سے کہیں زیادہ ہورہی ہے۔ بعض فلموں میں تو بے پناہ تشدد دکھایا جارہا ہے۔ دنیا کی نوجوان نسل پہلے ہی اخلاقی تعلیم سے بیگانہ ہوچکی ہے اس پر اتنے شدید دہشت انگیز مناظر ان کے ناپختہ ذہنوں پر کیا اثرات مرتب کرتے ہوں گے اس کا اندازہ کرنا بہت آسان ہے۔ مذہب اور اخلاق سے بیگانگی نے پہلے ہی ان نوجوانوں کو بے سکون اور مضطرب بنا رکھا ہے اس پر ہیجان انگیز نشیات کی عادت نے ان کے ذہنوں کو اتنا ناکارہ کردیا ہے کہ وہ سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیتوں کو ہمیشہ کے لئے کھوچکے ہیں اور [illegible]

(۔۔۔) مناظر پر مبنی فلموں کا دن رات مشاہدہ کرتے رہتے ہیں ایسے نوجوانوں سے اور کیا توقع کی جا سکتی ہے۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ عالمی معاشرہ ایسی فلموں کی حوصلہ شکنی شروع کر دے، جس میں تشدد پر اکسانے والے مناظر فلم بند کئے جاتے ہیں دوسرے حکومتیں ایسے سخت قوانین بنائیں کہ ایسی فلموں کی تیاری پر ضرب کاری لگے تب کہیں آئندہ دس سالوں میں اس کے مثبت اثرات نوجوان نسل پر ہوں گے اور شاید یہ ناسور قابلِ علاج ہو جائے۔

"ادارہ"

سلام

سلام بحضور مولائے کائنات حضرت علی کرم اللہ وجہٗ

معین و مونسِ ہر بے نوا سلام علیک — غریب پرور مشکل کشا سلامٌ علیک
حریم کوئے تو دار الشفاء سلام علیک — درِ تو قبلۂ اہلِ وفا سلام علیک
حضورِ خواجۂ گلگوں قبا سلام علیک — جمیلِ حُسن، جمالِ خدا سلام علیک
ابو تراب و علی۔ بوالحسن۔ شہِ مرداں — امیرِ لشکرِ فقر و فنا سلام علیک
امام و مرشد و مولا و پیشوائے ہمہ — ندیم و نائبِ خیر الوریٰ سلام علیک
ہژبر و حیدر و صفدر، کریم و ہم جواد — بذوالفقار شہِ لافتیٰ سلام علیک
ولیٔ حق و وصیِ نبی و زوجِ بتولؑ — قسیم کوثر و دستِ خدا سلام علیک
علوئے شان ہویدا زِ آیۂ تطہیر — بحُسنِ خلق شہِ ھَل اَتیٰ سلام علیک
بہارِ گلشنِ وحدت نگارِ اِلّا ھُو — گُلِ حدیقۂ اِنّی اَنَا سلام علیک
کمینہ بندہ ام از بندگانِ درگہ تو — قبول کُن کہ رسانم شہا سلام علیک

زیبد مے کہ سگِ کوئے تست و بندۂ تست
صلوٰۃ دائم و صد مرحبا سلام علیک

فقیر بیدم وارثی

مقامِ صوفیہ

ڈاکٹر سید وحید اشرف

اس مضمون میں تصوف یا صوفیہ کی تعلیمات سے بحث کرنا مقصود نہیں ہے۔ اگرچہ اس مضمون سے صوفیہ کے محض احوال و کوائف اور ان کے مقام کا کچھ پتہ چل سکیگا، لیکن حقیقت میں ان کے مقام کو پوری طرح سمجھنا عام انسانوں کی فہم سے باہر ہے کہ ان کے بارے میں خود حدیث قدسی ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اولیائی تحت قبائی لا یعرفهم غیری، میرے اولیاء میری چادر میں پوشیدہ ہیں اور ان کو سوائے میرے کوئی پوری طرح نہیں پہچانتا۔

پچھلے ادوار میں صوفیہ کی مخالفت میں کہیں اِکّا دُکّا افراد ہی نظر آتے تھے، لیکن چودہویں صدی میں ان کی مخالفت نے باقاعدہ تحریک کی شکل اختیار کر لی ہے۔ اس دور میں ایک بڑی قباحت یہ بھی ہے کہ کچھ لوگ تصوف کے نام پر ہی صوفیہ کی تعلیمات کو غلط طور پر پیش کرتے ہیں اور کوئی جماعت باقاعدہ مہم کے طور پر ان کی رد میں کتابیں لکھتی اور عوام میں مشتہر کرتی ہے۔ ایک مختصر مضمون میں ان سب کا جواب اس طرح دے دینا کہ جس سے عام لوگوں کو تشفی ہو جائے بہت دشوار ہے۔ صوفیہ نے کہیں کہیں بعض اعتراضات کا خود جواب دیا ہے لیکن اس دور میں چونکہ صوفیہ کی مخالفانہ تحریک نہ تھی، اس لئے انہیں خود اپنی مخالفت کا زیادہ علم نہ ہو سکا اور جواب میں کچھ لکھنے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ ابن تیمیہ کے شاگرد ابن قیم نے صوفیہ کی مخالفت میں تزکیۂ نفس پر کتاب لکھی لیکن اس میں بھی کوئی ایسی بات نہیں جو مسلمانوں کے عقیدہ کے خلاف ہو۔ اگر اس میں سلوک کا ذکر نہیں ہے، تو صوفیہ اسے سب کے لئے ضروری بھی قرار نہیں دیتے۔

ہمیں محی الدین ابن عربی کے زمانے میں اسپین میں صوفیہ کی مخالفت کا کچھ ذکر ملتا ہے لیکن وہ بھی محض انفرادی طور پر تھا۔ کوئی تحریک نہ تھی۔ تغلق کے دور میں ہندوستان میں ابن تیمیہ کے شاگردوں نے صوفیہ کے خلاف آواز بھیلائی چاہی تھی تھوڑے دنوں ایوان حکومت کی حد تک موثر رہی اس کے بعد ختم ہو گئی۔

لیکن ان ابتدائی مخالفتوں سے دشمنی کے

میں ایک داؤں ضرور آگیا۔ یورپ میں جب مستشرقین پیدا ہونے شروع ہوئے اور انہوں نے دیکھا کہ مادی غلبہ کے باوجود اسلام کی تسخیری قوت کو توڑنے میں وہ ناکام ہیں تو انہوں نے اسلام کی اصل قوت پر ضرب لگانا چاہا۔ ان کو یہ بھی خوف ہوا کہ اسلام کی روحانی قوت سے اگر اہل یورپ آشنا ہو گئے تو کہیں ایسا نہ ہو کہ اسلام یورپ میں بھی پھیلنا شروع ہو جائے اس لئے مستشرقین نے ہر طرح کا جھوٹا پروپگنڈا کرنا شروع کیا۔

یورپ میں مشتہر کیا گیا کہ اسلام میں روحانیت نام کی کوئی چیز نہیں ہے اور اس کو جو کچھ غلبہ حاصل ہوا ہے وہ صرف مادی طاقت اور تلوار کے زور پر لیکن جب انگریزوں کا مشرق میں زیادہ عروج ہوا اس کے بعد ان کی خود ایک بڑی تعداد نے اسلام کی روحانیت کا یہاں مشاہدہ کیا تو یوں کہنے لگے کہ اسلام میں کچھ روحانیت ہے لیکن یہ خود اس کی اپنی نہیں ہے بلکہ عیسائیوں سے قریب آنے کے بعد انہوں نے عیسائی مذہب سے حاصل کی ہے یہ پروپگنڈہ کچھ دنوں تک چلا لیکن اس خیال سے کہ ان کے جھوٹ کا بھانڈا نہ پھوٹ جائے انھوں نے تصوف کا ڈانڈا ویدانت سے ملا دیا۔ چونکہ ہر ملک اور ہر قوم میں انبیا کی تعلیمات آئی ہیں اس لئے ان میں تحریف کے باوجود بعض تعلیمات کا باقی رہ جانا بالکل ممکن ہے اس لئے بعض مماثلتیں دکھانا بھی آسان ہے۔ ان مماثلتوں کی بنیاد پر یہ کہہ دیا کہ قرآن میں انجیل و توریت سے نقل کیا گیا ہے روحانی تعلیمات پر ویدٔ عیسائیت اور یونانیت کا اثر ہے لیکن آخر کار یہ جھوٹ بھی کمزور نظر آنے لگا تو آخر میں مشہور مستشرق آر۔ بری نے اقرار کیا کہ اسلام کی تعلیمات میں بھی یقیناً روحانیت ہے البتہ یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ کتنا اس میں اسلامی ہے اور کتنا ویدانت، یونانی فلسفہ اور عیسائیت کے سبب ہے۔ گویا ان کے نزدیک یہ روحانیت کسی نہ کسی طرح غیر اسلامی تعلیمات کے نتیجہ میں پیدا ہوئی ہے ورنہ اسلام میں یہ طاقت نہیں کہ اس پر عمل کر کے آدمی زیادہ روحانی طاقت حاصل کر سکے اور اب مستشرقین کو یہ اطمینان ہے کہ جو کام وہ ایک صدی سے زیادہ عرصہ میں خود نہیں کر سکے اب وہی کام اسلام کے نام لیوا کر رہے ہیں۔

ہم نے بہت اختصار سے یہ تاریخی جائزہ دیا ہے جن کو پوری تفصیل دیکھنا ہو وہ ملاحظہ فرمائیں۔ آر بری کے وہ لکچرس جو اس نے کلکتہ میں اس موضوع پر دیئے تھے اور جو عرصہ ہوا کتابی شکل میں شائع ہو چکے ہیں، اس سے پتہ چلتا ہے کہ اسلام کے دشمنوں کو سب سے زیادہ خطرہ صوفیہ سے ہی تھا یہی نہیں بلکہ خود مسلمانوں میں ظالموں اور جابروں کو سب سے زیادہ خوف صوفیہ کا تھا۔ اس کے بھی نفسیاتی اور تاریخی اسباب ہیں۔

یہ سب کو معلوم ہے کہ بنو امیہ کو خاندان نبوت

سے ہمیشہ خطرہ محسوس ہوا اور اسی سبب سے واقعہ کربلا پیش آیا۔ اس کے بعد بنو عباس کا دور رہا۔ اسی دور امام حسینؑ کی اولاد میں حضرت زید نے خروج کیا اور وہ شہید ہوگئے۔ اس کے بعد حضرت امام حسنؑ کی اولاد میں محمد اور ابراہیم دو بھائیوں نے خروج کیا۔ ان کے تقویٰ کے سبب وہ نفس زکیہ اور نفس رضیہ کے القاب سے مشہور تھے۔ ان کا ساتھ امام ابو حنیفہؒ اور امام مالکؒ نے دیا۔ جس کی پاداش میں ان دونوں کو ابو جعفر منصور نے اتنے کوڑے لگوائے کہ امام ابو حنیفہؒ خون سے لہولہان ہوگئے اور امام مالکؒ کا ایک ہاتھ شانہ سے اتر گیا۔ عباسی اپنے کو مقبول بنانے کے لئے خود اپنے کو اہل بیت اور اصلی سادات میں شمار کرتے تھے۔ اور بنو فاطمہ کو طالبی کہتے تھے۔ یعنی ابو طالب کی اولاد میں۔ ایسا بھی ہوا کہ سادات کے کئی بچوں کو عباسی بادشاہوں نے دیوار میں چنوا دیا۔ یہ سب اس وجہ سے تھا کہ سادات کی مقبولیت سے سلطان بادشاہوں کو ہمیشہ خطرہ محسوس ہوتا تھا۔[1]

نفس زکیہ اور نفس رضیہ کا خروج اور ان کی ناکامی کے بعد سادات نے تبلیغ و ہدایت کو اپنا لائحہ عمل بنا لیا، لیکن اس کے باوجود وہ مامون نہ رہے اور دنیا کے طالب ان سے خطرہ ہی محسوس کرتے رہے۔ اس کی چند مثالیں ذیل میں پیش کی جاتی ہیں۔

حضرت سید اشرف جہانگیر (م در حدود ۸۲۹ھ) ایران میں ایک سفر میں تھے ایک مقام پر جہاں تیمور تھا آپ بھی پہونچے۔ آپ کے ساتھ فقراء کی ایک بڑی تعداد ہوتی تھی اور چہرے سے شاہانہ جلال بھی نمایاں تھا۔ کچھ لوگوں نے تیمور تک یہ خبر پہنچائی اور یہ آگ لگائی کہ ان سے حکومت کو خطرہ ہے۔ تیمور نے آپ کو بلوایا۔ آپ نے ملاقات کی۔ کچھ گفتگو ہوئی۔ تیمور تقتمش خاں پر چڑھائی کے لئے ایک لشکر بھیج چکا تھا۔ اس جنگ کے انجام کے بارے میں تردد تھا اور حضرت اشرف جہانگیرؒ سے اس کا انجام پوچھا آپ نے دیوان حافظ سے فال نکال کر کہا ع

"اے پادشاہ کوش کہ صاحبقراں شوی"

عجیب اتفاق ہے کہ نہ صرف تیمور فتحیاب ہوا بلکہ بعد ازاں وہ صاحب قرآں کے لقب سے مشہور ہوگیا۔ تیمور کو جب معلوم ہوا کہ یہ خود سلطنت کو چھوڑ چکے اور انہیں حب دنیا و دولت سے کوئی سروکار نہیں ہے تو اس نے آپ کو چھوڑ دیا، ورنہ تیمور کے ظلم اور سفاکی کا حال کس کو نہیں معلوم۔

اس طرح کی مثالیں اگر ہم پیش کرنا چاہیں تو مضمون بہت طویل ہو جائے گا اور مثالیں ختم

[1] یہ تفصیلی واقعات عالم اسلامی تاریخی کتابوں میں مل جائیں گے۔ مناظر احسن گیلانی نے اپنی کتاب "ابو حنیفہؒ کی سیاسی زندگی" میں حوالوں کے ساتھ نقل کیا ہے۔

نہ ہوں گی اس لئے یہاں انگریزوں کے دور کی صرف ایک اور مثال پیش کر دی جاتی ہے۔

حضرت قطب ویلور کے خلاف مفسدوں نے انگریزی حکومت کو یہ خبر پہنچائی کہ آپ مریدوں اور عوام کو بغاوت پہ آمادہ کر رہے ہیں۔ آپ کے ماننے والوں کی تعداد لاکھوں تک تھی۔ اس خبر پہ آپ کو قید کیا گیا۔ لیکن قید میں آپ کی بعض روحانی خصوصیات اور کرامات کو دیکھ کر جیل کے ملازمین خوفزدہ ہو گئے آپ نے عدالت میں اپنی صفائی پیش کر دی اور قرآنی تعلیمات سے یہ ثابت کیا کہ ایسے موقعوں پہ مسلمانوں کا کیا شیوہ ہونا چاہیئے اور ظاہر ہے کہ ان حالات میں بغاوت کسی طرح جائز نہ تھی۔ اس وقت انگریزوں کا استیلا اس دیار میں کامل ہو چکا تھا۔ عدالت نے آپ کو بری کر دیا۔ بلکہ وکٹوریہ کو اس واقعہ کی خبر پہنچی تو اس نے آپ کی قدر افزائی کی اور نقد و خلعت روانہ کیا۔ آپ نے قبول کرنے سے انکار کیا اور اسلام کی دعوت دی' آج بھی وہ مکتوب موجود ہے۔ ملکہ وکٹوریہ نے جواب میں اسلام کی سچائی کا اقرار کیا' مگر قبول کرنے سے معذرت کی حضرت قطبؒ ویلور نے اپنی پوری زندگی تبلیغ و ارشاد میں گزاری اور اس جوار میں اسلام کی بے بہا خدمات انجام دیں اور ان کے بعد بھی یکے بعد دیگرے یہ سلسلہ جاری رہا اور آج بھی جاری ہے۔

یہ دو واقعات صرف نمونہ کے طور پہ پیش کئے ہیں۔ ان کے پیش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ سادات کرام نے جب یہ دیکھا کہ حکومت کے حصول میں دین کی خدمت انجام دینا ناممکن ہے تو انہوں نے ایسی طرز زندگی اختیار کی جس سے یہ شائبہ بھی نہ ہو سکے کہ ان کے دلوں میں دنیا کی دولت وجاہ کا کچھ بھی لالچ ہے تاکہ وہ عوام و خواص کے اندر رسولؐ کا اسوۂ زندگی پیش کر سکیں۔ ان کے دلوں سے حب دنیا طمع' حسد' بغض' و نفاق' فساد و کینہ غیبت وغیرہ عیوب نکال کر ان کے اندر اخلاق حسنہ پیدا کریں۔ تاکہ ان کے دلوں میں صفائی اور کردار میں پاکیزگی پیدا ہو۔ کچھ لوگوں نے ان سادات کرام کی تقلید کی اور وہ بھی ولایت کے بلند درجہ پہ فائز ہوئے اور آج بھی انہیں اجلۂ صوفیہ میں شمار کیا جاتا ہے۔ جیسے جنید بغدادیؒ۔ ابو سعید ابوالخیر' بایزید بسطامی' وغیرہ لیکن اکثریت ان میں سادات کی ہے۔ بلکہ شاید یہ مبالغہ نہ ہوگا اگر کہا جائے کہ نوے فیصد صوفیہ سادات سے ہیں۔

ایک طرف تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کچھ مخصوص حالات کا یہ نتیجہ تھا کہ صوفیہ اپنی زندگی کو اس طرح ظاہر کرنے پہ مجبور تھے جس سے یہ پوری طرح ثابت ہو جائے کہ ان کو حکومت و دولت سے کوئی غرض نہیں ہے' دوسرے یہ کہ انسانی خمیر ہی کچھ ایسا ہے کہ کسی بھی دور میں کسی شخص کو اپنا مصلح ماننے کے لئے

وہ آمادہ نہیں ہوتا جب تک کہ باور نہ کرلے کہ یہ مصلح ذاتی اغراض سے بالکل خالی ہے اور اگرچہ اصلاح وتبلیغ کا کام ہر حال میں ضروری ہے لیکن تبلیغ واصلاح اور تعلیمات ونصائح موثر اس وقت ہوتے ہیں جب خود معلم ومصلح سچائی وخلوص کے ساتھ ان پر عمل پیرا ہو اور جب تک اس کی سچائی کا ثبوت لوگوں کو مل نہیں جاتا تب تک تعلیمات کا اثر زیادہ نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ صوفیہ نے ہر اعتبار سے اپنی زندگی سے یہ ثابت کیا کہ وہ اپنی تعلیمات میں کامل مخلص ہیں۔ اور خود اس پر عمل کرنے والے ہیں۔

ہم کہہ چکے ہیں کہ اس مضمون میں صوفیہ کی تعلیمات سے بحث کرنا مقصود نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا صوفیہ نے غیر اسلامی تعلیمات پر عمل کیا ؟ کیا صوفیہ نے جھوٹا پروپگنڈہ کیا ؟ یا صوفیہ نے خلوص کے ساتھ اسلام کو سمجھنے کی کوشش تو کی لیکن وہ قرآن وسنت اور ائمہ فقہا کے کلام کو سمجھ نہ سکے اور اس لئے غلطی میں پڑ گئے۔ ان سوالوں کا جواب ہم صرف تاریخی پس منظر میں ہی ڈھونڈنا چاہتے ہیں اور شواہد بے شمار ہیں جن کو پیش کرنے کے لئے کتاب درکار ہوگی۔ اس لئے ہم چند مثالوں پہ اکتفا کرتے ہیں۔

پہلا سوال یہ ہے کہ کیا صوفیہ نے غیر اسلامی تعلیمات پہ عمل کیا؟ اس کا جواب کئی طرح سے دیا جاسکتا ہے۔ اول تو غیر اسلامی تعلیمات پہ عمل کرکے روحانی طاقت حاصل ہی نہیں ہوسکتی۔ غیر اسلامی طریقے سے ریاضت ومجاہدہ کرکے جو قوت حاصل ہوتی ہے اسے استدراج کہتے ہیں اور استدراج کے حصول کے لئے شیطانی قوتیں مسخر کی جاتی ہیں۔ اور یہ ماننا پڑے گا کہ روحانی قوت کے آگے شیطانی قوت نہیں ٹھہر سکتی۔ صوفیہ کا مقابلہ ہندوستان میں اکثر انہیں استدراجی قوتوں سے ہوا جس کے نتیجہ میں جن لوگوں کے اندر حق کو قبول کرنے کا داعیہ تھا انھوں نے اسلام قبول کیا۔ طوالت کے خیال سے ہم یہاں پھر مثالوں سے گریز کرتے ہیں۔

یہاں یہ سوال کیا جاسکتا ہے بلکہ عام طور سے آج کل یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس روحانی قوت کے حصول میں صوفی کو دنیاوی امور تمدنی ترقی اور سماجی بہبودی کے کاموں سے علیحدہ ہونا پڑتا ہے اگر سبھی لوگ اس پہ عمل کرنا شروع کردیں تو قافلہ تہذیب کا کارواں اتنا پیچھے رہ جائے کہ وہ مادی ترقی میں دوسری قوموں سے بالکل پیچھے رہ جائے گا اور اسلام مادی زندگی اور مادی ترقی سے کنارہ کشی کی تعلیم نہیں دیتا۔ لہٰذا یہ روحانی ترقی اسلام کے مقصد ہی کے خلاف ہے۔

لیکن یہ اعتراض بہت سی غلط فہمیوں پر مبنی ہے اور اگر یہاں گنجائش ہوتی تو ہم دکھاتے کہ یہ اعتراض خود اسلام کی جڑ اور بنیاد پہ ضرب کاری ہے اس لئے ہم اپنے جواب کو حکمتہ حد تک محدود رکھیں گے۔

اول تو صوفیہ نے عوام کو یہ تعلیم ہی نہیں دی کہ وہ سب کے سب چلہ کشی پر آمادہ ہو جائیں اور راہ سلوک کی تکمیل کریں۔ دوسرے یہ سب کیلئے ممکن بھی نہیں ہے۔ اس کا ملکہ مخصوص افراد میں ہوتا ہے۔ اگر وہ مخصوص افراد اپنے اس ملکہ کو استعمال کریں تو راہِ سلوک میں کامیاب ہو سکتے ہیں لیکن لاکھوں میں کوئی ایسا ہوتا ہے جو اس کی سخت کسوٹی پر پورا اترتا ہے اس لئے اگر کروڑوں آدمیوں میں چند آدمی دنیاوی کاموں میں حصہ نہ لیں تو اس سے تمدنی ترقی میں رکاوٹ نہیں ہوتی۔ تیسرے یہ کہ صوفیہ نے اپنی زندگی غیر ضروری اور غیر اہم کاموں میں نہیں صرف کی لوگوں کو دینی و اخلاقی تعلیمات اور ان کے اخلاق کو سدھارنے کا ذمہ اپنے سر لیا جس کے بغیر ساری مادی ترقیاں بیکار ہیں آج ان ہی تعلیمات کی کمی ہے خود مسلمان میں اخلاقی بلندی اور پختگی کا فقدان نظر آتا ہے' اس لئے صوفیہ کے کام کی وہ اہمیت ہے جو جسم میں روح کی اہمیت ہے' اور اس پر مزید طرہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنے کام کا کوئی معاوضہ نہیں لیا انھوں نے دنیا سے صرف اتنا لیا جو جسمانی زندگی کے لئے ضروری ہے اور دنیا والوں کو وہ دیا جو روح کے لئے ضروری ہے۔

اب غور کیجئے ایک مدرسہ اور تعلیم گاہ کا معلم درس دیتا ہے تو اس کا معاوضہ لیتا ہے۔ تاجر اپنا نفع کماتا ہے۔ سپاہی اپنی تنخواہ لیتا ہے جو لوگ بھی اس تمدنی زندگی میں ہاتھ بٹاتے ہیں' وہ در اصل اپنی ذاتی غرض کے لئے اگرچہ دنیا کا معمول یہی ہے اور اس کاروبار سے دنیا والوں کو فائدہ پہنچتا ہے لیکن صوفیہ نے سب سے زیادہ اہم کام کیا اور اس کا کوئی معاوضہ کسی سے نہیں لیا۔ دراصل ان کے سامنے اسوۂ رسول تھا۔ ہمارے رسول جو معلم انسانیت تھے وہ اپنی خدمات کے لئے کسی معاوضہ کے طالب نہ تھے۔ انہیں صرف انسانوں کی ہدایت مطلوب تھی۔ ان صوفیہ میں ہر طرح کے لوگ تھے۔ بادشاہ بھی تھے۔ مدرس بھی تھے۔ سپاہی بھی تھے اور اگرچہ پیشہ ایک معاش کے لئے تھا یا قیام عدالت کے لئے تھا لیکن وہ روحانی تعلیمات مفت دیتے تھے۔ یہ ہر شخص کے ذاتی احوال و کوائف پر منحصر تھا۔ یہ معلوم ہو جانے کے بعد یہ الزام کہ صوفیہ نے تمدنی زندگی کی ترقی میں رکاوٹ ڈالی محض ایک پر فریب اعتراض ہے'۔ نیز یہ کہ انھوں نے زندگی کا اہم ترین کام انجام دیا۔ اب اس سوال پر مزید بحث کی گنجائش نہیں رہ جاتی تاہم یہ شک دلوں میں رہ سکتا ہے یا پیدا کیا جا سکتا ہے کہ دینی اور اخلاقی تعلیم دینے کے لئے ریاضت و مجاہدہ اور راہ سلوک اختیار کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے قرآن و حدیث کی تعلیمات کھلی ہوئی تھیں اور بغیر سلوک کے تعلیم

کے یہ فریضہ ادا کیا جا سکتا ہے۔

اس کا جواب ہم نہایت مستحکم طریقہ سے مفصلاً اور مدلل دے سکتے ہیں۔ لیکن بحث کو مختصر کرنے کے لئے صرف ایک مثال کے ذریعے ہم اس کی ضرورت کو دکھائیں گے۔

ابھی استدراج کی بات آچکی ہے۔ استدراجی قوت رکھنے والا یہ نہیں سمجھتا کہ اُسے شیطانی قوت حاصل ہوئی ہے۔ وہ یہی سمجھتا ہے کہ اس کے پاس روحانی قوت ہے جو ریاضت اور مجاہدہ سے حاصل ہوئی ہے۔ اور اس لئے اس کو یقین ہوتا ہے کہ وہ حق پر ہے اور اس کی مذہبی تعلیمات ہی حق ہیں۔ اس غلط فہمی کے علاج کے بغیر اسے روحانی اور شیطانی قوت کا فرق بتانا نہایت دشوار ہے۔ اور جب تک یہ فرق نہ بتایا جائے اس پر حق ظاہر ہونے کی توقع بے سود ہے۔

اب ذرا یہ دیکھئے کہ یہ استدراجی قوت کیا چیز ہے۔ اس کو سمجھنے کے لئے آپ جادو کی حقیقت پر غور کیجئے جادو کیا ہے؟ کچھ لفظوں کی قوت کا نام جادو ہے۔ جب ان لفظوں کی مشق خاص شرائط کے ساتھ کرتے ہیں تو بالآخر یہ قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ یعنی جادو کے عامل کے اندر شیطانی قوت پیدا ہو جاتی ہے اور شیطان اس کا مسخر ہو جاتا ہے۔ اس مشق کے لئے اس کو بالعموم ناپاک اور حرام چیزوں کو استعمال کرنا پڑتا ہے۔ جب جادو کے لفظوں میں یہ قوت ہے کہ اس کے ذریعہ انسان سے غیر عادی کاموں اور چیزوں کا ظہور ہو سکتا ہے تو رحمانی لفظوں میں بدرجۂ اولیٰ یہ قوت ہونی چاہیئے کہ اس کے عامل کے لئے وہ قوتیں مسخر ہو جائیں جو رحمانی ہوں اور ظاہر ہے جہاں رحمانی قوت اور حق کا غلبہ ہوگا وہاں باطل نہیں ٹھہر سکتا۔ اس قوت کے حصول کے لئے رحمانی الفاظ کو خاص شرائط کے ساتھ استعمال کرنا پڑتا ہے۔ پاکیزگی و طہارت، اکل حلال، عبادت، صوم و صلوٰۃ، حرام چیزوں سے بچنا اس کی اولین شرائط ہیں اگرچہ ان کا حصول دین کا مقصود نہیں ہے لیکن دین کو اس قوت سے عاجز نہ ہونا چاہیئے کیونکہ باطل جس انداز سے کام اُٹھائے اس کو اسی انداز سے قائل کرنے کی ضرورت ہے اس سے ظاہر ہے ایک وقت میں اس کی خاص ضرورت بھی کہ حق کو اس طرح بھی ظاہر کیا جائے تاکہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ قرآن وحی الٰہی ہے اور اسلامی تعلیمات رحمانی تعلیمات ہیں   کیونکہ

اس رحمانی قوت کا قائل دراصل خود رحمان ہے اور اگر یہ تعلیمات رحمانی نہ ہوتی تو رحمانی قوت کا ظہور بھی ناممکن تھا۔

ہمارا جواب صرف اس موقع کے لحاظ سے ہے ہم نے اسلام کی تعلیمات سے ربانی اصولی طور پر ثابت

ہیں کہ ہے۔ ورنہ روحانیت کی ضرورت اور زیادہ کھل کر سامنے آتی۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا صوفیہ نے جھوٹ پروپیگنڈا کیا؟ اس کا جواب دینے سے پہلے ہم یہ کہیں گے یہ وہ نفوس قدسیہ ہیں کہ اگر ان پر جھوٹ کا گمان بھی کیا جائے تو پھر کوئی بھی اس قابل نہیں رہ جائے گا کہ جس کو سچا سمجھا جا سکے۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے بچپن کا واقعہ مشہور ہے کہ ڈاکوؤں نے راہ میں گھیر لیا اور پوچھا تمھارے پاس کچھ ہے۔ آپ نے سچ بتا دیا کہ ۸۰ دینار ہیں۔ ڈاکوؤں کو یقین بھی نہ آیا کہ ایک لڑکے کے پاس اتنا مال ہوگا۔ لیکن آپ کی ماں نے جو تعلیم دی تھی کہ جھوٹ کبھی نہ بولنا تو ایسے کٹھن وقت پر اس کم عمر نے اس پر عمل کر کے دکھا دیا۔

خواجہ اجمیریؒ نے گھربار چھوڑ دیا۔ اجمیر صرف چالیس آدمیوں کے ساتھ اس وقت آئے جب کہ سلطان شہاب الدین غوری شکست کھا کر جا چکا تھا اور پرتھوی راج اس سبب سے آگ بگولا تھا کہ غوریوں نے اس کی سلطنت پر حملہ کیا تھا۔ اس حال میں اس کی سلطنت میں چند نہتوں کے ساتھ قدم رکھنا بظاہر ہوشمندوں کا کام نہ تھا کیونکہ جان بوجھ کر اپنے کو ہلاکت میں ڈالنا تھا لیکن یہ خیال صرف ان لوگوں کو ہوگا جو صرف مادی قوت ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں پرتھوی راج نے خواجہؒ کو قتل کرنے کی بڑی کوشش کی لیکن ناکام رہا اور آخرکار اسے تخت و تاج سے محروم ہو کر دنیا سے رخصت ہونا پڑا۔

حضرت سید اشرف جہانگیرؒ نے سلطنت کو ترک کر دیا۔ ابراہیم شاہ شرقی نے جاگیر پیش کرنا چاہی تو اسے قبول نہ کیا اور جواب یہ دیا کہ خدا نے اپنی ساری دنیا میرے تصرف میں دے دی ہے اور وہ چیز جو میرے ہی تصرف میں ہے اسی میں سے تھوڑا سا حصہ مجھے دینا چاہتے ہو۔ اور سید علی ہمدانی نے کشمیر کا تین بار سفر کیا۔ اور تنہا انہیں کی کوششوں اور تعلیمات سے وہاں اسلام پھیلا۔ اس زمانے میں وہاں کوئی بیرونی فوج بھی نہیں جا سکتی تھی اور وہاں اس طرح اسلام پھیلا کر وہاں مسلمانوں کی اکثریت ہو گئی۔ علاء الدین خلجی جیسے ظالم بادشاہ نے حضرت نظام الدین اولیاء کو اپنے دربار میں بلانا چاہا جب آپ نے انکار کیا تو کہلا بھیجا کہ وہ خود آپ کے گھر پر آئے گا۔ آپ نے کہا کہ فقیر کے گھر میں دو دروازے ہیں ایک طرف سے بادشاہ آئے گا دوسری طرف سے فقیر نکل جائے گا۔ بادشاہ عادل ہو تو اس سے ملنا عین سعادت ہے۔ حضرت نظام الدین اولیاؒ اپنے طرز عمل سے بتا رہے تھے کہ بادشاہ ظالم ہے اور جب تک وہ عدل اختیار نہ کرے گا اس کا منہ نہ دیکھیں گے یہ طرز عمل اختیار کرنے کا مطلب یہ تھا اب سر جلاد کے حوالے ہو گیا۔

یہ مثالیں صرف مشتے نمونہ از خروارے تھیں۔

کیا یہ کام جھوٹ پروپگنڈہ کرنے والوں کے ہو سکتے ہیں
ہم سے آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ بہت سے غیر مسلمین نے بھی
اپنے مقصد کے حصول کے لئے جان کی بازی لگا دی ہے
انہیں میں صوفیا، کی کیا تخصیص ہے ؟ بیشک یہ
تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ وہ غیر مسلمین جنھوں نے اپنے
مقصد کے حصول کے لئے جان کی بازی لگا دی وہ
اپنے مقصد میں مخلص تھے۔ بس ہم بھی یہی کہنا چاہتے
ہیں کہ صوفیہ بھی اپنے مقصد میں مخلص تھے اور ان کا
مقصد کیا تھا اس کی بحث پہلے ہو چکی ہے اس کے
علاوہ جھوٹ صدیوں تک نہیں چھپا رہ سکتا۔

اب تیسرا سوال یہ رہ جاتا ہے کہ کیا صوفیہ نے اسلام
کو سمجھنے میں غلطی کی ؟ صوفیہ کرام بالعموم وہ تھے
جو نابغہ تھے۔ عقل ذہانت اور حافظے میں ان کی
قوتیں غیر معمولی تھیں۔ اس کا اندازہ ان کی کتابوں
اور ان کے ملفوظات سے ہوتا ہے ان میں
خصوصیت کے ساتھ چند نام یہاں لے سکتے ہیں۔
امام غزالیؒ۔ محی الدین ابن عربیؒ۔ شیخ شہاب الدین
سہروردیؒ۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ مولانا رومؒ
حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ۔ نظام الدین اولیاؒ
شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ۔ سید اشرف جہانگیر سمنانیؒ۔
اور حضرت مجدد الف ثانیؒ سید محی الدین عبداللطیف ذوقیؒ
یہ صرف مثال کے طور پر ہم نے چند نام لئے ہیں جو
صاحب تصنیف نہیں بھی ہیں وہ بھی غیر معمولی ذہانت
رکھتے تھے۔

ہم نے اوپر جن لوگوں کے نام لئے ہیں ان میں سے
ہر ایک اجتہادی صلاحیت کا حامل تھا لیکن انھوں نے
خود اجتہاد سے کام نہیں لیا۔ اسے یا توشیت الٰہی
کہئے یا یہ کہنا پڑے گا کہ صوفیہ نے کمال دانشمندی اور
احتیاط سے کام لیا۔ انھوں نے خود اجتہاد نہ کرکے
آئمہ مجتہدین کی پیروی اختیار کی اور وہ مشہور چاروں
فقہ میں سے کسی ایک فقہ کے پیرو تھے۔ اس لئے ان
پر اجتہادی غلطی کا بھی الزام نہیں لگایا جا سکتا۔ اب
ذرا بعد کے ان لوگوں کو قیاس کیجئے جو بزعم خود
اپنے کو تقلید سے بالاتر سمجھتے ہیں۔

ان سوالوں کے مختصر جوابات کے بعد ہم
یہاں ضمناً یہ بھی بیان کرتے چلیں کہ صوفیہ نے
دنیاوی فلاح سے یکسر کنارہ کشی نہیں کی۔ یہ ہم پہلے
کہہ چکے ہیں کہ بہت سے صوفیہ نے معاش کے لئے خود
کئی پیشے بھی اختیار کئے۔ جن لوگوں نے صرف فتوح
پر گزارہ کیا اس کا سبب ایک تو یہ تھا کہ شرعی طور پر
جائز تھا اور بعض حالات میں فتوح نہ قبول کرنا
خدا کی ناراضگی کا سبب بھی بن سکتا تھا دوسرے یہ
کہ خدا پر انہیں اس درجہ توکل تھا کہ ہر روز کی آمد
اسی روز دوسروں پر صرف کر دیتے تھے اور کل
کے لئے کچھ بچا کر نہ رکھتے تھے۔ انہوں نے صحیح
معنوں میں اختیاری طور پر فقر کی زندگی بسر کی
اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے دوسرا فلاحی کام
یوں انجام دیا کہ عوام کی اصلاح کے ساتھ

خواص علماء امراء حکام اور بادشاہوں کی اصلاح کا کام کیا۔

سید اشرف جہانگیرؒ نے ابراہیم شاہ شرقی ہوشنگ خاں غوری شاہ مالوہ اور مشرقی یوپی کے امراء و حکام کو خاص طور سے موکداً بادشاہ و امراء کے فرائض سے آگاہ کیا اس لئے کہ اگر بادشاہ امراء و علماء کی اصلاح ہو جائے تو معاشرہ میں عدل کا قیام اور اصلاح اور بھی زیادہ آسانی سے ہو سکتا ہے اور یہ کام کوئی معمولی کام نہ تھا۔

سید علی ہمدانی نے کشمیر کے بادشاہوں کی اصلاح کی اور ان کی وہ کتاب جو بادشاہ کے لئے لکھی تھی آج بھی ذخیرۃ الملوک کے نام سے موجود ہے۔
سید محمد گیسو دراز نے دکن کے حکمرانوں کی اصلاح کی کوشش کی۔

قطب الدین ایبک سے بلبن تک غلام خاندان نے جس عدل و انصاف سے حکومت کی یہ صوفیہ کے اثرات کا نتیجہ تھا۔ شہاب الدین غوری نے ہندوستان کی حکومت بجائے اپنے خاندان میں منتقل کرنے کے اپنے ایک لائق غلام کے حوالے کر دی جو قطب الدین ایبک کہلایا کرتا کی سے قریب تھا۔ قطب الدین ایبک نے بجائے اپنے خاندان میں حکومت منتقل کرنے کے اپنے قابل غلام شمس الدین التمش کے حوالے کر دی اگر غلام خاندان کے بادشاہوں کے کارنامہ کا کچھ عکس دیکھنا چاہتے ہوں تو ملاحظہ کیجئے پروفیسر خلیق احمد نظامی کی انگریزی کی کتاب تیرھویں صدی میں ہندوستان میں مذہب و سیاست کے چند پہلوؤں کا مطالعہ۔ یہ تمام بادشاہ صوفیہ کی تعلیمات سے متاثر تھے۔ ہندوستان کی بیشتر ریاستوں میں صوفیہ نے اصلاح و تبلیغ کا کام جاری رکھا تھا اور انہوں نے بادشاہوں کی اصلاح کی کوشش کی۔

حضرت قطبؒ ویلور نے اپنے زمانہ میں بہت سے راجاؤں وغیرہ کو تبلیغی خطوط لکھے ان میں جو لوگ صاحب تصنیف تھے ان کی کتابیں مکتوبات اور ملفوظات آج بھی ان کی تبلیغی و اصلاحی مساعی پر گواہ ہیں۔

اب ہم قارئین کی توجہ ایک اور مسئلہ کی طرف منعطف کرنا چاہتے ہیں ہر مسلمان کو معلوم ہے کہ اس کے لئے نمونۂ عمل رسولؐ کی زندگی ہے اور اللہ تعالیٰ نے رسول کی پیروی کی بار بار تاکید کی ہے اسی تاکید کے سلسلے میں یہ بھی کہا ہے کہ اے رسولؐ تم مسلمانوں سے کہہ دو کہ اگر تمھیں اللہ سے محبت ہے تو میری اتباع کرو۔ جو لوگ تمھاری اتباع کریں گے اللہ انہیں اپنا دوست بنا لیگا۔ اس آیت کے تین اجزاء ہیں ایک یہ کہ اللہ سے محبت کرو اللہ سے محبت کی دلیل اتباع رسول ہے۔ پھر اتباع کا ثمرہ بھی بیان کیا ہے جو اس آیت کا تیسرا جزو ہے یعنی اتباع رسولؐ کے نتیجہ میں خدا اپنے بندے کو دوست بنا لے گا

یہ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے دوستوں کو
جنت میں داخل کرے گا۔ اور بہت سے مقامات
پر جنت کی بشارت دی گئی ہے لیکن یہاں بجائے
جنت کی بشارت دینے کے اپنی دوستی کی بشارت
دے رہا ہے۔ یہ اس سے بھی بڑی بشارت ہے
کیونکہ اس بشارت میں جنت کی بشارت از خود
شامل ہے۔ جہاں تک اتباع رسول کا تعلق ہے
اس کی علامت کا بیان قرآن و حدیث میں موجود
ہے جس کے اندر یہ علامات ظاہری طور پہ پائی
جائیں گی اس پر اتباع رسول کا حکم لگایا جائے گا
اور اس کے باوجود یہ ضروری نہیں کہ اس کے دل
میں اللہ کی محبت غالب [illegible] یہ معاملہ اللہ اور
اس کے بندے کے درمیان ہے۔ نیتوں کا حال
اور قلب کی کیفیت خدا ہی کو معلوم ہے اس کی
مثال کے لئے ابلیس کی مثال کافی ہے۔ ابلیس
جب تک عبادت کرتا رہا اس وقت تک کوئی بھی
یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس کے دل میں کھوٹ ہے۔
وقت آنے پر جب کھوٹ ظاہر ہو گیا تو اس کی عبادت
کچھ کام نہ آئی اسی لئے جب بندہ کے قول یا فعل
سے کوئی ایسی بات سرزد نہ ہو جو اصول دین کے
خلاف ہو اور وہ اتباع رسول پر عامل ہو
تو اس پر اتباع رسول ہی کا حکم لگایا جائے گا۔
اگرچہ واقعی یہ اتباع ہے یا نہیں اس کا علم صرف
خدا کو ہے۔ اس لئے کہ اتباع میں محبت بھی شامل
ہے اور اس کے معنی ہیں اطاعت با محبت رسول

کی محبت فرض ہے اس لئے لفظ اتباع استعمال کرنے
کا مطلب یہی ہوا کہ رسول کی اطاعت محبت کے ساتھ
کرو اور محبت کا تعلق قلب سے ہے اگرچہ اعمال
اس کے مظاہر ہیں اور شرعی حکم مظاہر پہ لگایا جائے گا
اس لئے اللہ سے محبت کرنے والے میں یہ مظاہر نظر
آئیں تو اس کو علامات محبت پہ محمول کیا جائے گا
یہاں تک کہ مسئلہ آسانی سے حل ہو گیا۔ لیکن جب
اللہ نے بندہ کو اپنا دوست بنا لیا تو اس کی کیا علامت [illegible]
اس وقت اتفاق سے ہمارے ہاتھوں میں ایک
کتاب بنام اسلامی تصوف موجود ہے جس کے مصنف
سید احمد عروج قادری ہیں اس کتاب میں لکھتے ہیں
"اس کتاب میں فلسفۂ یونان اور ویدانت
سے متاثر تصوف کے بجائے وہ تصوف پیش کیا
گیا ہے۔ جو قرآن کریم اور احادیث نبوی میں موجود
ہے۔ اس میں صوفیہ کرام کے وہی اقوال و احوال
نقل کئے گئے ہیں جو کتاب و سنت سے متصادم نہیں [illegible]
اس عبارت کا صاف مطلب یہ ہے کہ مصنف
کے نزدیک ان ہی صوفیہ کرام کے یہاں ایسے اقوال
و احوال بھی ہیں جو قرآن و سنت کے خلاف [illegible]
وہ دین اسلام کو چھوڑ کر فلسفۂ یونان اور ویدانت
کی تعلیمات پہ عمل پیرا ہیں۔
لیکن مصنف کی کتاب سے کہیں یہ پتہ نہیں [illegible]
کہ وہ فلسفہ یونان اور ویدانت کی کونسی تعلیمات
ہیں۔ جن کو صوفیہ نے اپنا مافلتر [illegible]
میں جملۂ معترضہ کے طور پر یہ بات [illegible]

ہم پہلے اسی کتاب سے وہ علامات پیش کریں گے جو صوفیہ کے مخالفین کے نزدیک بھی اللہ کے دوست ہونے کی علامات ہیں۔ انھوں نے اس سلسلہ میں ایک حدیث کا ترجمہ پیش کیا ہے جو یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جب اللہ تعالیٰ بندے سے محبت کرتا ہے تو جبریلؑ کو پکار کر کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ فلاں بندے سے محبت کرتا ہے تو بھی اس سے محبت رکھ' پھر جبرئیل اس سے محبت کرتے ہیں اور آسمانوں میں منادی کرتے ہیں کہ اللہ فلاں بندے سے محبت کرتا ہے تم لوگ بھی اس سے محبت رکھو تو اہل آسمان اس سے محبت کرتے ہیں۔ پھر اس شخص کے لئے زمین میں حسن قبول پیدا کر دیا جاتا ہے۔" (اسلامی تصوف ص۲۸۹)

آپ حدیث بالا کی روشنی میں حقیقت پر نظر ڈالئے تو اس سے انکار کی گنجائش نہ ہوگی کہ امت مسلمہ میں سوادِ اعظم جن لوگوں سے بے لوث پرخلوص اور دلی محبت رکھتا ہے وہ یہی گروہِ صوفیہ ہے۔ اس کے لئے کسی دلیل کی حاجت نہیں یہ خود اظہر من الشمس ہے آفتاب آمد دلیل آفتاب۔ رسول اکرم اور صحابہ کے بعد دنیائے اسلام میں صوفیہ کے علاوہ کوئی بھی شخصیت ایسی نہیں ہے جس کے لئے سوادِ اعظم میں ایسی محبت اور عقیدت اور حسن قبول ہو جیسی کہ صوفیہ کے بارے میں ہے۔ ان کی مقبولیت سے یہ اظہر من الشمس ہے کہ اللہ انھیں دوست رکھتا ہے۔

مصنف نے ایک حدیث اگرچہ باب مجاہدہ میں نقل کی ہے لیکن اس حدیث میں اللہ کے پاس محبوب ہونے کی علامات بیان کی گئی ہیں۔ ہمارے سامنے اس وقت حدیث کی کوئی کتاب نہیں ہے ہم مصنف کے ترجمہ اور ان کے تبصرہ کو من وعن پیش کرتے ہیں۔

"حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں۔
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے جس کسی نے میرے کسی ولی سے عداوت کی تو میں اسے آگاہ کرتا ہوں کہ اس کے خلاف میری طرف سے اعلان جنگ ہے بندہ جن چیزوں سے میرا تقرب حاصل کرتا ہے ان میں مجھے سب سے زیادہ محبوب وہ فرائض ہیں جو میں نے اس پر عائد کئے ہیں۔ اور بندہ مسلسل نوافل کے ذریعہ میرا تقرب حاصل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ میرا محبوب بن جاتا ہے تو میں اس کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اس کا ہاتھ

بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اس کا پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے۔ اور اگر وہ مجھ سے مانگے تو میں اسے دیتا ہوں اور اگر مجھ سے پناہ طلب کرے تو میں اُسے پناہ دیتا ہوں۔"

اس کے بعد مصنف یوں تبصرہ فرماتے ہیں:

"یہ حدیث تصوف کا ایک بنیادی ماخذ ہے اور ائمہ تصوف نے اپنی کتابوں کے مختلف ابواب میں اس سے استدلال کیا ہے۔ اس حدیث قدسی میں تمثیل کا پیرایہ اختیار کیا گیا ہے کان، ہاتھ، پاؤں بن جانے کا مطلب یہ ہے کہ فرائض کی ادائیگی اور نوافل کی کثرت سے اللہ کی محبت اتنی غالب آجاتی ہے کہ بندے کی مرضیات اللہ کی مرضیات میں گم ہو جاتی ہیں۔ پھر وہ اپنی آنکھوں سے وہی کچھ دیکھتا ہے اور کانوں سے وہی کچھ سنتا ہے جو اللہ کو پسند ہو، ہاتھوں سے وہی کچھ کرتا ہے جس کا کرنا جائز ہو۔ اور اس کے قدم اس طرف اٹھتے ہیں جہاں جانے کی اللہ نے اجازت دی ہو۔ گویا اس کی تمام حرکات و سکنات اپنے محبوب حقیقی کے اشارۂ چشم و ابرو کے تحت ہوتی ہیں۔ سر تسلیم خم ہے جو مزاج یار میں آئے یہ تصوف کا سب سے اونچا مقام ہے۔" (ص ۴۶)

مصنف نے اس حدیث کی جس طرح وضاحت کی ہے اس میں اسے تصوف کا سب سے اونچا مقام قرار دیا ہے۔ یہ درحقیقت تصوف کا ابتدائی مقام ہے لیکن حدیث کا یہ مفہوم ہے۔ اس کے بعد تصوف کا یہ تصوف کا سب سے اونچا مقام بیان کیا گیا ہے نوافل کی کثرت سے پہلے اپنے ہوش و حواس، ہاتھ پاؤں آنکھ کان کو ان تمام امور سے بچانا ضروری ہے۔ جو اللہ کو ناپسندیدہ ہیں۔ اور ہر حرام عمل سے اعضاء کو باز رکھنا ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے اس میں کسی صوفی یا غیر صوفی کی تخصیص نہیں عبادت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بندہ صرف نمازیں پڑھتا رہے اور اپنے اعضاء سے ہر معیوب کام کرتا رہے نوافل پڑھے یا نہ پڑھے صرف فرائض ادا کرے جب بھی اپنے اعضا کو ہر مذموم فعل بلکہ ارادے سے باز رکھنا ضروری ہے۔ جو عبادت کا ایک مقصود بھی ہے۔ مصنف نے نوافل کا ثمرہ نہیں بیان کیا بلکہ عمل ہی کو عمل کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ اس طرح کی تمثیلات کے مفہوم کی طرف کلام الٰہی ہماری رہنمائی کرتا ہے خدا نے جب کہا کہ:-

وما رمیت اذ رمیت ولکن اللہ رمیٰ

تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ تم نے جب تیر پھینکا تو تمہارا پھینکنا خدا کا پھینکنا تھا اور جس میں خدا کی مشیت و قوت شامل ہو تو اس کے اثر کو کون روک سکتا ہے

ظاہر ہے کہ تیر پھینکنے والا تو حضور تھا لیکن خدا نے تمثیل کے طور پر کہا اسی طرح یہاں بھی فرض کیا گیا کہ اللہ کا دست زبان

وہ گویا اللہ کی مرضی ہوتی ہے۔ اور وہ صادر ہو کے رہتی ہے۔ اس کی آنکھ وہ دیکھ لیتی ہے جو عام لوگ نہیں دیکھ سکتے اس کو ایک حدیث میں یوں بھی بیان کیا گیا ہے۔ اتقوا فراست المومن فانہ ینظر من نور اللہ۔ مومن کی فراست سے ڈرو کیونکہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔ ان معانی کے ثبوت میں اگر واقعات پیش کئے جائیں تو دفتر تیار ہو جائے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ساریہ بن زنیم کو جمعہ کے خطبہ میں خبر دینا جب کہ وہ ایران میں تھے اور حضرت عمرؓ مدینہ میں۔ حضرت عثمانؓ کا ایک شخص کو اس بات پہ تنبیہ کرنا کہ کسی غیر عورت پہ قصداً نظر ڈالی تھی اور اس طرح کے بیشمار واقعات ہیں اس حدیث میں ایک امر کو مصنف نظر انداز کر گئے ہیں یعنی جس نے اللہ کے ولی سے عداوت کی اسے آگاہ کرتا ہوں کہ اس کے خلاف میری طرف سے اعلان جنگ ہے۔

اس لئے مولانا روم لکھتے ہیں ؎

چوں خدا خواہد کہ پردہ کس درد
میلش اندر طعنۂ پاکاں زند

جب خدا کسی کے عیب کا پردہ چاک کرنا چاہتا ہے تو اسے پاک لوگوں پہ طعنہ زنی پہ آمادہ کرتا ہے۔

پھر لکھتے ہیں۔

ہیچ قومے را خدا رسوا نکرد
تا ولی صاحبدلی نامد بدرد

خدا نے اس وقت تک کسی قوم کو رسوا نہیں کیا جب تک کہ اس نے اللہ کے کسی ولی کو نہیں ستایا۔

اللہ کے اولیاء سے عداوت اور ان کو ستانے کے نتائج تاریخ کس طرح پیش کرتی ہے چند مثالیں ملاحظہ ہوں ؎

واقعہ کربلا کے بعد دشمنانِ اہلبیت کا جو انجام ہوا وہ سب کو معلوم ہے۔ ایک صحابی کا چشم دید بیان ہے کہ دشمنوں کے سر کے ڈھیر لگے تھے۔ ایک سانپ آیا اور ابن زیاد کے سر میں ناک کے ایک نتھنے سے داخل ہوتا اور دوسرے نتھنے سے باہر آتا۔ اور یہ بار بار ہی کرتا رہا۔ ان دشمنوں کا انجام جہنم میں جو ہوگا وہ تو ہوگا ہی دنیا میں بھی خدا نے نتائج دکھا دی کہ یہ مغضوب ہیں کیونکہ انہوں نے اللہ کے ولی سے عداوت کی۔

حضرت سید اشرف جہانگیر سمنانی لکھتے ہیں کہ خوارزم کے بادشاہ علاؤالدین نے شیخ سعدالدین حموی کو قتل کرادیا۔ سبب یہ تھا کہ ان کے پیر شیخ نجم الدین کبریٰ نے انہیں لوگوں کی ہدایت کے لئے خوارزم بھیجا تھا۔ ان کے وعظ کی مقبولیت کو دیکھ کر کچھ لوگوں میں حسد پیدا ہوا اور ان کے خلاف سازش کی۔ بادشاہ نے بغیر تفتیش کے غصہ میں آکر انہیں قتل کرادیا۔ بعد میں اسے حقیقتِ حال کی خبر ہوئی۔ ایک طشت میں زر اور دوسرے طشت میں خنجر لے کر شیخ نجم الدین کبریٰ کی خدمت میں آیا کہ اگر

دیت چاہیئے تو یہ زر ہے اور قصاص چاہیئے تو یہ سر ہے اور یہ خنجر ہے۔ شیخ کبریٰ نے کہا کہ تیرا سر اور سعدالدین کا سر برابر نہیں۔

سعدالدین کے سر کے بدلے میں ایران کا سر، توران کا سر، خراسان کا سر، بغداد کا سر وغیرہ خون سے بھر جائیں گے۔ اس کے بعد چنگیز کا حملہ ہوا۔ اور جو کچھ ہوا مورخین کا ہاتھ اسے لکھتے ہوئے کانپ جاتا ہے۔

حضرت نظام الدین اولیا اور فیروز تغلق میں کشیدگی ہوئی۔ بادشاہ نے کہا کہ بنگال کی فتح کی واپسی کے بعد تمھاری خبر لوں گا۔ آپ نے فرمایا "دلی ہنوز دور است" فتح سے واپس ہوا اسے میں ایک تعمیر کردہ مکان میں اس کا استقبال کیا گیا دعوت میں لوگ بیٹھے تھے کہ مکان کی چھت گر پڑی اور سب کے سب ختم ہو گئے۔

بنگال کے سلطان نے شیخ علاؤ الدین پنڈوی کو اپنی سلطنت سے نکال دیا۔ وہ باہر نکل گئے۔ لیکن تھوڑے دنوں میں اس کی سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔ اس کے وزیر کنس نے سلطنت پر قبضہ کر لیا۔ اس کا متبنیٰ بیٹا جیمل تھا جو حضرت نورالدین قطب عالم کی محبت میں مسلمان ہو گیا اور جلال الدین کے نام سے حکمراں ہوا۔

اسپین کے دور زوال میں صوفیہ کی تحقیر شروع ہو گئی۔ اگرچہ عام طور سے لوگ صوفیہ کے خلاف نہیں تھے۔ لیکن کئی بادشاہوں نے انہیں ستانا شروع کر دیا تھا۔ طوالت کے خوف سے ایک واقعہ پیش کیا جاتا ہے۔ محمد ابن جبیر ایک بزرگ تھے اور بادشاہ وقت کی محفل میں ان کا جانا ہوتا تھا۔ ایک بار ان کی موجودگی میں شراب کا دور چلنے لگا اور ان کی طرف بھی پیالہ بڑھایا گیا۔ انہوں نے انکار کیا تو بادشاہ کو غصہ آ گیا اور حکم دیا کہ زبردستی ان کے حلق میں شراب ڈالی جائے۔ اور حلق تک بھر دی جائے۔
اس واقعہ کے بعد محمد بن جبیر نے گھر بار بیچ کر وطن ترک کر دیا کہ جہاں شریعت پر پابندی ممکن نہ ہو وہ جگہ رہنے کے قابل نہیں۔ مشرق میں یہ زمانہ صلاح الدین ایوبی کا تھا۔ محمد بن جبیر نے مشرق میں پناہ لی اور مصر میں وفات پائی۔ انہوں نے اپنے سفرنامے میں یہ حالات تفصیل سے لکھے ہیں۔ اسپین میں زوال کی علامات شروع ہو چکی تھیں لیکن اس کے بعد تیزی سے زوال شروع ہوا اور پھر جو کچھ ہوا وہ تاریخ کا دردناک المیہ ہے۔

حضرت نصیرالدین محمود چراغ دہلی کے ایسے بھی دشمن تھے جنہوں نے ایک بار آپ کے حجرے میں آپ پر چاقو سے حملہ کیا اور آپ خون میں لہولہان ہو گئے۔ لیکن کوئی بددعا نہ دی۔ وفات کے وقت مرشد کے تبرکات کو بھی قبر میں اپنے ساتھ دفن کرنے کی وصیت کی۔ لوگوں نے کہا سید محمد گیسو دراز کو اپنا سجادہ نشین بنا دیجئے جواب دیا اس کو [illegible]

جہاں اللہ کے ولی کے دشمن ہوں وہاں عافیت نہیں۔ اس کے بعد ہی دہلی پر تیمور کا حملہ ہوا۔ سید محمد گیسو دراز دہلی سے ہجرت کر گئے۔ اور پھر جو ہنگامہ ہوا وہ تاریخ میں محفوظ ہے۔ اس حدیث میں خود ان لوگوں کے لئے تازیانۂ عبرت ہے جو آج کل اللہ کے دوستوں سے مخالفت پر آمادہ ہیں اور اس طرح خود انہوں نے خدا کے خلاف اعلان جنگ کر رکھا ہے تو چاہئے کہ اب وہ اپنے انجام سے خبردار رہیں کیونکہ خدا سے جنگ کرنے والا کبھی فلاح نہیں پا سکتا۔

یہ چند مثالیں صرف مشتے نمونہ از خروارے ہیں۔ آپ کہیں گے کہ ان تاریخی واقعات کے تاریخی اور مادی اسباب ہیں جنہیں مورخین نے بیان کیا ہے اور ہم نے کہاں کی بات کہاں ملا دی ہے لیکن قرآن نے ہمیں تاریخ کے مطالعہ کا طریقہ بتاتا ہے۔ جو مغربی نقطۂ نظر کے برعکس ہے۔ لیکن صوفیہ کے مخالفین اکثر مادی نظریات پر زیادہ اعتماد کرتے ہیں۔ اور مغربی طرز فکر کی پیروی کر رہے ہیں۔ قرآن میں کہیں یہ نہیں لکھا ہے کہ قوموں کا عروج و زوال اور فتح و شکست صرف مادی اسباب کی بنا پر ہوتے ہیں بلکہ زوال کے لئے سب سے پہلے اخلاقی گراوٹ پیدا ہوتی ہے۔ جو خدا کی نافرمانی کا نتیجہ ہے اس کے بعد مختلف شکلوں میں عذاب الٰہی نازل ہوتا ہے۔ اس کی ایک شکل دشمن سے مغلوب ہونا ہے

قرآن کے اس بیان کی تائید بعض دوسرے مفکرین نے بھی کی ہے اس میں مشہور فلسفی مورخ ابن خلدون کا نام سر فہرست ہے۔ جدید دور میں مشہور فرانسیسی فلسفی موسیو لیبان نے اس موضوع پر کتاب لکھی ہے جو انقلاب الامم کے نام سے اردو میں ترجمہ ہو چکی ہے۔ اس نے بھی اقوام عالم کی اخلاقی حالت کا جائزہ لیا ہے اور اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ کسی قوم کے زوال کے مادی اسباب پیدا ہونے سے پہلے ان میں اخلاقی زوال پیدا ہوتا ہے۔ مسلمانوں میں اخلاقی زوال ان کی دین سے بے پروائی کے سبب ہی ہوتا ہے۔ اللہ کے ولی سے عداوت انتہائی بے دینی کی علامت ہے جس کے نتیجہ میں اللہ کا غضب نازل ہوتا ہے۔ غضب نازل ہونے کے مادی اسباب پیدا ہوتے ہیں۔ دنیا میں جو کچھ بھی ہوتا ہے اس کو اللہ تعالیٰ اسباب کے تحت پیدا کرتا ہے۔ ظاہر بیں نگاہیں صرف عالم اسباب پر ہوتی ہیں اور اللہ کی مشیت سے غافل ہوتی ہیں۔ لیکن روحانیت اور اخلاقی قوت پر یقین رکھنے والے کی نظر مسبب الاسباب پر ہوتی ہے کیونکہ جو کچھ واقع ہوتا ہے اس کی مشیت سے واقع ہوتا ہے اور در حقیقت اللہ کے دوستوں کے وجود سے دنیا کا وجود قائم ہے۔ یہاں ہم ایک اور علامت کا ذکر کرتے ہیں جس کا بیان قرآن میں ہے کہ

سیماھم فی وجوھھم من اثر السجود

ان کے چہروں میں سجدوں کے اثر سے پہچان ہے۔ یعنی وہ اپنے چہروں سے پہچان لئے جاتے ہیں کہ وہ ساجدین و خاشعین ہیں۔ سیما کے معنی فارسی شاعروں نے مجازاً پیشانی لکھ دیا ہے لیکن عربی میں صرف پیشانی کے معنی میں نہیں استعمال ہوتا اگر پیشانی میں سجدوں کا نشان مراد ہوتا تو وجوہ کہنے کی ضرورت نہ تھی صرف یہ کہنا کافی تھا کہ پیشانی میں سجدوں کے نشان سے پہچان لئے جاتے ہیں اور بالعموم صحابہ کرام کی پیشانیوں میں سجدے کے ایسے نشان نہ تھے جو آج کل چند دنوں کے نمازیوں میں بھی نظر آنے لگتا ہے۔

راقم الحروف نے ایسے بھی لوگ دیکھے ہیں زندگی بھر جن کی نماز قضا نہیں ہوئی سوائے اتفاقاً کسی سبب سے جس کا حال معلوم نہیں اس کے علاوہ بھی وہ تہجد اور بہت سے نوافل کے پابند تھے لیکن پھر بھی ان کی پیشانیوں پر کوئی گھٹا نہیں تھا۔ دراصل آیت کا مطلب یہ ہے کہ ایمان و عبادت کے سبب ان کے چہرے نورانی ہو جاتے ہیں اور یہ کیفیت ان کے چہروں سے نمایاں ہوتی ہے۔ آیت مباہلہ نازل ہونے کے بعد جب حضورؐ حضرت علیؓ فاطمہؓ حسنؓ حسینؓ کو لے کر مباہلہ کے لئے نکلے تو اس وقت حسینؓ اور بہت چھوٹے تھے۔ لیکن ان لوگوں کی صورتوں کو دیکھ کر پادریوں نے کہا کہ ہم وہ چہرے دیکھ رہے ہیں کہ اگر یہ پہاڑ کو حکم دیں تو وہ بھی اپنی جگہ سے ٹل جائیں۔ ان سے کوئی مباہلہ نہیں کر سکتا چنانچہ کسی کی ہمت نہ ہوئی۔

حضرت عمرؓ جب فتح بیت المقدس کے لئے گئے تو راہب نے ان کو دیکھ کر کہہ دیا کہ یہی وہ شخص ہے جس کی فتح کی پیشین گوئی ان کی کتابوں میں ہے۔ حضرت عمرؓ کو دیکھ کر دشمن لرز جاتے تھے۔

حضرت سید اشرف جہانگیر کو پہلی بار جب ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادی نے دیکھا تو دیکھتے ہی کہہ دیا کہ یہ کوئی بزرگ عالی حال ہیں۔

راقم الحروف کے والد کا عمر کا آخری وقت تھا۔ اور وہ مریض تھے جلک بینری ہو رہی تھی۔ اسی معاملہ میں ان کو طلب کیا گیا ان کو دیکھ کر حاکم نے کہہ دیا کہ ان کی گواہی پر فیصلہ کر دیا جائے گا کہ یہ جھوٹ تو نہیں بول سکتے اور انہیں کی گواہی پر فیصلہ کیا۔ صوفیا کی مخالفت میں جتنی کتابیں لکھی ہیں انہوں نے وہ حال بیان

بیان کئے ہیں جو ان کے نزدیک قرآن اور سنت سے ثابت ہیں۔ ان میں جن باتوں کی تائید واقعی قرآن وسنت سے ہوتی ہے ہمیں ان سے کوئی اختلاف نہیں ہے اور نہ کسی صوفی کو اختلاف ہے تمام صوفیہ کہتے ہیں کہ شریعت پہ عمل ہر مسلمان پر فرض ہے۔ اس کے بغیر نہ اسے طریقت حاصل ہو سکتی ہے نہ حقیقت نہ معرفت، شریعت پہ کامل اخلاص کے ساتھ عمل کرنے کا نام تصوف ہے اخلاص کا معاملہ افراد سے متعلق ہے مختلف افراد میں نفس کی مختلف کمزوریاں ہوتی ہیں اور جب تک نفس کو مکمل طور پہ قابو میں نہ کر لیا جائے یعنی اپنی مرضی کو خدا کی مرضی کے کلیتہً تابع نہ کر لیا جائے کامل اخلاص نہیں پیدا ہو سکتا۔

شیخ علاء الدولہ سمنانی (م ۷۳۶ھ) اپنی کتاب العروہ لاہل الجلوہ والخلوہ میں لکھتے ہیں کہ ہر آدمی کو خود غور کرنا چاہیئے کہ اس کے نفس میں کیا کمزوریاں ہیں اور اسی کے مطابق اس کو علاج اور پرہیز سے کام کرنا چاہیئے۔ ہم یہاں جزئیات اور مثالوں میں نہیں جانا چاہیئے۔

غرضکہ صوفیہ نے اخلاص کامل پیدا کرنے کے لئے نفس کی تادیب کے طریقے اختیار کئے ہیں اس کے نتیجے میں انہیں شریعت پہ عمل کرنے کے ثمرہ کا تجربہ ہوا۔ اس تجربہ کو وہ کتابوں میں بیان کرتے ہیں جن لوگوں کو اس کا تجربہ نہیں ہے۔ وہ صوفیہ کا انکار کرنے لگتے ہیں حالانکہ اللہ کی اطاعت کا اثر باطن پہ پڑنا بدیہی اور لازمی ہے۔ ایک اثر تو ظاہری اخلاق میں ظاہر ہوتا ہے اور یہ چیز تو غیر مسلم ریاضت کرنے والوں میں بھی پائی جاتی ہے لیکن دوسرا اثر یہ ہے کہ مثلاً کلام میں تاثیر تجلیات ربانی کا مشاہدہ، غیب سے نصرت، خدا پہ ایسا ایمان کہ اسے یقین ہو جائے کہ خدا ہی اس کے لئے کافی ہے۔ (ومن یتوکل علی اللہ فھو حسبہ) خدا سے وہ جو طلب کرے اس کا فوراً پورا ہو جانا وغیرہ یہ وہ اثرات ہیں جو باطن میں ظاہر ہوتے ہیں۔ صوفیہ نے جن باتوں کو بیان کیا ہے عمل کے بعد تجربہ حاصل ہونے کے بعد بیان کیا ہے اور جتنے مخالفین نے ان کے خلاف لکھا ہے انھوں نے خود اپنے لکھنے کے مطابق بھی عمل نہیں کیا اور جس نے عمل ہی نہیں کیا اسے اعتراض کرنے کا کیا حق ہے۔ اگر معترض بھی اپنے عمل میں کامل اخلاص پیدا کرے اور شریعت پہ اخلاص کے ساتھ عمل کرے تو اسے بھی ان تجربات کا مشاہدہ ہو گا۔ جو صوفیہ بیان کرتے ہیں۔

اور پھر وہ مجبور ہوگا کہ صوفیہ کی تائید کرے ہزاروں صوفیہ جن باتوں کی تائید کرتے ہیں تو وہ محض وہم نہیں ہو سکتی اور جنھوں نے شریعت پر کامل اخلاص کے ساتھ عمل نہیں کیا انہیں صوفیہ پر اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔

آخر میں ایک قول ہر اس کے لئے ایک مثال پر ہم اس مضمون کو ختم کرتے ہیں۔ حضرت سید اشرف جہانگیرؒ نے امام احمد غزالی کا ایک قول نقل کیا ہے جو فرماتے ہیں کہ مجھے منکرین صوفیہ کے سوء خاتمہ کا خوف ہے۔
(مکتوبات اشرفی)

یہاں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا ایک واقعہ یاد آگیا جسے حافظ ابن حجر عسقلانی نے بھی نقل کیا ہے اور متعدد کتابوں میں یہ واقعہ ملتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ طالب علمی کے زمانہ میں شیخ عبدالقادر جیلانیؒ اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ ایک بزرگ سے ملنے گئے جن کے بارے میں لوگوں کا خیال تھا کہ یہ غوث وقت ہیں۔ راستہ میں ایک ساتھی نے کہا کہ بڑے غوث بنتے ہیں، آج ان سے ایسے سوالات کروں گا کہ جواب نہ بن پڑیگا، ساری غوثیت نکل آئے گی" دوسرے نے کہا خیر یہ تو نہیں ہے مگر ہم بھی پوچھوں گا دیکھیں کیا جواب دیتے ہیں۔ حضرت عبدالقادر جیلانیؒ نے کہا کہ یہ کیا کم سعادت ہے کہ ہمیں غوث کا دیدار ہوگا۔ یہ جائے ادب ہے نہ کہ جائے سوال یہ باتیں ہوگئیں اور یہ تینوں غوث وقت کے پاس پہنچے۔

غوث وقت نے پہلے شخص کی طرف مخاطب ہو کر کہا، دیکھ تیرا سوال یہ ہے اور جواب یہ ہے اور تو جہنمی ہے۔ دوسرے کو کہا تو گردن تک غرق ہو جائے گا۔ اور حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ سے کہا کہ تمہاری جگہ یہ ہے گا اور اپنی مسند کی طرف اشارہ کیا اور مسند پر بٹھایا گویا یہ اشارہ تھا ان کے مقام غوثیت تک پہنچنے کا۔ پہلے صاحب کا لقب بعد میں ابوالادیان ہوا کیونکہ یہ غیر مذاہب والوں سے مناظرہ کرنے میں مشہور ہوئے اور یہودیوں سے مناظرہ کے لئے روم بھیجے گئے، وہاں کسی یہودی عورت کے عشق میں گرفتار ہو گئے، شرط قرار پائی کہ انہیں دین بدلنا پڑے گا۔ اگرچہ یہودی کسی غیر یہودی کو اپنے دین میں داخل نہیں کرتے لیکن عشق تو عجب بلا ہے اس کا بھوت ذات نسل، مذہب کچھ نہیں دیکھتا پھر ابوالادیان معمولی آدمی نہ تھا، مسلمانوں کا بڑا عالم تھا مصلحت یہی تھی کہ اسے یہودی بنا لیا جائے چنانچہ وہ یہودی ہو گئے۔ دوسرے صاحب کو قاضی بنا دیا گیا اور وہ رشوت لے کر فیصلہ کرتے تھے۔ اس طرح وہ گردن تک گناہوں میں غرق ہو گئے۔ ان دونوں کا نام بھی حافظ ابن حجر عسقلانی نے دیا ہے لیکن اس وقت میرے ذہن میں محفوظ نہیں ہے۔ یہ قلم برداشتہ مضمون لکھ دیا ہے اور غوث اعظمؒ سے آج کوئی مسلمان ناواقف نہیں ہے۔

حضرت کاملؔ

غزل غزل

اعتبارِ کفر و دیں کا ہیں ہر اک افسانہ ہم
شیخ ہم ہیں، برہمن ہم، کعبہ ہم بت خانہ ہم

یار ہی کے ہے اشاروں پہ مدارِ ہست و بود
چاہتے ہیں شیوہ ہائے غمزۂ ترکانہ ہم

جس نے کم ظرفوں میں بھی اک ظرف پیدا کر دیا
چاہتے ہیں تجھ سے اے ساقی! وہی پیمانہ ہم

ناصحوں سے ہو سکے گا کس طرح اپنا نباہ
عشق سے بیگانہ وہ ہیں ہوش سے بیگانہ ہم

رونقِ مے خانہ تھے کاملؔ یہ کل کی بات ہے
فیضِ ساقی سے ہیں اب تو حاصلِ میخانہ ہم

تم ہی مطلوب ہو افتادِ طبیعت کی قسم!
میں تمہارا ہوں، تمہاری ہی محبت کی قسم!

آپ کے غیر کو ہم نے کبھی دیکھا ہی نہیں
چشمِ مشتاق کی معصومیِ فطرت کی قسم!

آپ کے حسن کی ہے شعبدہ بازی ساری
میری جاں! گرمیِ بازارِ محبت کی قسم!

ہے جگانا ہی تو قسمت بھی جگاتے جاؤ
نیند آنکھوں میں نہیں ہے شبِ فرقت کی قسم!

دل جلی بات نہیں نازِ غلامی کے سوا
دیدۂ تر کی قسم! سوزِ محبت کی قسم

آپ ہی پر ہے نظر ہم سے گنہ گاروں کی
عفوِ بے حد کی قسم! دامنِ رحمت کی قسم!

ترا اقبال سلامت! مجھے ڈر کس کا ہے
تیری ہمت ہے مجھے، اور اسی ہمت کی قسم!

دیکھ لو ایک نظر بندۂ کاملؔ کی طرف
جس پہ نازاں ہوں میں تم کو اسی نسبت کی قسم!

دیکھنے والا دیکھ رہا ہے

یہ واقعہ نئی دہلی میں ۱۱ فروری ۱۹۸۵ء کو پیش آیا۔ کناٹ پلیس کے ہوٹل تاج میں ایک تقریب تھی یہ تقریب دہلی کے ایک تاجر مسٹر ایس پی سونی نے اپنے لڑکے کی شادی کے سلسلہ میں نہایت اہتمام کے ساتھ منعقد کی تھی۔ شرکاء کی تعداد تقریباً چار سو تھی جو سب کے سب اعلیٰ طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔

لوگ تقریب کی رونقوں میں کھوئے ہوئے تھے کہ اچانک ایک خاتون نے محسوس کیا کہ اس کا پرس چوری ہو گیا ہے۔ یہ مسز سنتوش سونی کا پرس تھا اس میں پچاس ہزار روپے نقد رکھے ہوئے تھے اس کے علاوہ اس کے اندر ایک قیمتی ہار بھی تھا جو خالص موتیوں کا بنا ہوا تھا۔

چوری کے واقعہ کو نہ پرس کی مالکہ نے دیکھا اور نہ دوسرے شرکاء اس کو محسوس کر سکے۔ بظاہر یہ مکمل طور پر ایک راز تھا چوری کرنے والا چوری کر چکا تھا۔ اور جس کی چوری ہوئی تھی اس کے لئے صرف یہ باقی رہ گیا تھا کہ وہ اپنی خوشیوں کو غم میں تبدیل کر کے اپنے گھروں کو واپس چلی جائے تھا کہ ہوٹل کے ذمہ دار یہ ماننے کے لئے بھی تیار نہ تھے کہ چوری کا واقعہ ہوا ہے انھوں نے کہا کہ یہ بناوٹی بات ہے۔ ہمارے یہاں ایسا نہیں ہو سکتا ہوٹل والوں کی نظر میں یہ قصہ اتنا بے بنیاد تھا کہ انہوں نے اس کی ضرورت بھی نہیں سمجھی کہ ہال کا دروازہ بند کر کے لوگوں کی تلاشی لیں۔

اتنے میں بعض افراد کو خیال آیا کہ شادی کی تقریب شروع سے آخر تک (VIDEO FILM) پر ریکارڈ کی گئی ہے۔ کیوں نہ اس کا معائنہ کیا جائے فوراً تقریب کے شرکاء اور ہوٹل کے ذمہ داروں کے سامنے ویڈیو ٹیپ چلایا گیا۔ اس سے پہلے تمام شرکاء کی نگاہیں زرق برق اسٹیج پر لگی ہوئی تھیں جہاں دولہا اور دلہن رونق افروز تھے۔ مگر اب ان کی توجہ کا مرکز دوسرا تھا۔ جس منظر کو اس سے پہلے انہوں نے صرف تفریح کی نظر سے دیکھا اب اس کو انہوں نے تفتیش کی نظر سے دیکھنا شروع کر دیا۔

بہت جلد لوگوں کی نگاہیں ایک عورت پر جم گئیں جو ایک لڑکے کے ساتھ آیا کے روپ میں ہال کے اندر داخل ہوئی تھی۔ ابتداءً لوگوں نے یہ سمجھ کر نظر انداز کر دیا تھا کہ وہ معزز مہمانوں میں سے کسی مہمان کے ساتھ آئی ہے مگر اب اس کو ایک امکانی مجرم کی نظر سے دیکھا جانے لگا۔

یہ عورت جو آیا کے روپ میں آئی تھی وہ اس سے بالکل بے خبر تھی کہ یہاں ویڈیو کیمرہ نصب ہے اور اس کی نظریں ہر لمحہ اس کو دیکھ رہی ہیں وہ اس کی ہر حرکت کا نہایت باریکی کے ساتھ ریکارڈ کر رہی ہیں وہ مشتبہ انداز میں ادھر سے اُدھر جا رہی تھی آخر کار لوگوں نے دیکھا کہ اس "آیا" نے شال میں چھپا ہوا اپنا ہاتھ باہر نکالا اور نہایت تیزی سے مذکورہ پرس کو اٹھا کر علیحدہ اس وقت اس کو اپنے کپڑوں کے اندر چھپا لیا۔ جب کہ پرس کی مالکہ فوٹو کھینچوانے کے پروگرام میں کھوئی تھی۔

جو واقعہ لوگوں کی نظروں سے اوجھل تھا اس کو ویڈیو کیمرہ کی نگاہ نے بتادیا جو مجموعی طور یہ سارے منظر کی تصویر کشی کر رہا تھا۔ فوراً پولیس بلائی گئی اور پولس کے سامنے دوبارہ پوری فلم چلائی گئی۔ جرم ثابت ہو گیا تھا مذکورہ عورت کو پولس نے تلاش کر کے گرفتار کر لیا اس کا نام اخبار میں شیلا بتلایا گیا ہے۔ جو سلطان پوری کی بسنے والی ہے۔ ہندوستان ٹائمس ۶ ارمارچ ۱۹۸۵ء نے یہ کہانی تفصیل کے ساتھ شائع کرتے ہوئے یہ معنی خیز جملہ لکھا ہے۔

YOU CAN NOT ONLY SPAT THIEF BOUT SEE HER COMMIT THE CIRME.

آپ نہ صرف چور کو پکڑ سکتے ہیں بلکہ اس کو جرم کرتے ہوئے دیکھ بھی سکتے ہیں۔

یہ دنیوی واقعہ آخرت کے واقعہ کا آئینہ ہے۔ یہ واقعہ تمثیل کے انداز میں بتایا جا رہا ہے کہ کوئی بالاتر دیکھنے والا ہے جو ہر ایک کو دیکھ رہا ہے۔ وہ ان باتوں کو نہایت باریکی کے ساتھ ریکارڈ کر رہا ہے جس کی خبر نہ قریب کے لوگوں کو ہوتی اور نہ دور کے لوگوں کو وہ ان باتوں کو بھی جانتا ہے جس کو لوگ نہیں جانتے۔ وہ ان چیزوں کو بھی دیکھتا ہے جن کو لوگ نہیں دیکھتے۔

دنیا کے واقعات آخرت کی حقیقتوں کا آئینہ ہیں۔ آج جو کچھ ہو رہا ہے اس میں ان واقعات کو دیکھا جا سکتا ہے۔ جو کل کے دن پیش آنے والے ہیں۔ مگر اس مشاہدہ کے لئے بصیرت کی نگاہ درکار ہے اور یہ وہ چیز ہے جو آنکھ والوں کے پاس بھی اکثر نہیں ہوتی۔

ماخوذ

(بشکریہ "الرسالہ" دہلی)

مکتوبات

اس عنوان کے تحت سربرآوردہ قارئین کے خطوط کے اقتباسات شائع کئے جائیں گے

گورنر ہریانہ جناب سید مظفر حسین برنی کا خط

ہریانہ راج بھون چنڈی گڑھ - ۱۸ ر مئی ۱۹۸۵ء

محترمی - آداب :-

"ذوق نظر" کا "غوث اعظم" نمبر موصول ہوا، شکریہ - اس خصوصی اشاعت میں حضرت عبدالقادر جیلانیؒ کی حیات و تعلیمات پر سیر حاصل مضمون ہیں۔ بعض منظوم خراج عقیدت بہت خوب ہیں۔ ان برگزیدہ ہستیوں کی تعلیمات پر عمل کرنے کی آج زیادہ ضرورت ہے کیونکہ ان کا بنیادی پیام اخوت، رواداری اور بھائی چارے کا ہے۔ خدا کرے آپ "ذوق نظر" کو یوں ہی سنوارتے رہیں۔

مخلص

سید مظفر حسین برنی - گورنر ہریانہ

کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب کا خط

کراچی یونیورسٹی۔ کراچی - ۳۲ (پاکستان) یکم جون ۱۹۸۵ء

مکرمی - سلام مسنون

آپ کی عنایت سے "ذوق نظر" کے تین شمارے "شافع محشر نمبر" "غوث اعظم نمبر" اور ادبی نمبر موصول ہوئے۔ شکر گزار ہوں۔ خدا کرے آپ اسی ذوق و شوق کے ساتھ علم و ادب کی خدمت کرتے رہیں۔

مخلص

(ڈاکٹر) جمیل جالبی

ترجمہ: ڈاکٹر یعقوب عمر
محمد علی جمال زادہ

قاز کے کباب

آفس میں یہ روایت تھی کہ جس شخص کی ترقی کے احکام نکلیں وہ اپنے ہمجولیوں کی دعوت کرے اور صحیح معنوں میں قاز کے کباب کھلوائے۔ اتفاقاً نوروز کے موقع پر مجھے ترقی کے احکام مل گئے چنانچہ دعوت کا اہتمام بھی ضروری ہوگیا۔

میں نے اپنی نئی نویلی بیوی سے دعوت کا ذکر کیا تو وہ کہنے لگی کہ اب تک ہم نے انھیں شادی کی مٹھائی بھی نہیں کھلائی ہے، لہٰذا دعوت تو کرنی ہی پڑے گی مگر ایک مشکل یہ ہے کہ میرے پاس جو ڈنر سیٹ ہے وہ صرف ایک درجن مہمانوں کے لئے ہی کافی ہو سکتا ہے لہٰذا ایک اور سیٹ خریدنا پڑے گا یا پھر مہمانوں کی تعداد گیارہ سے زائد نہ ہو تا کہ تمہیں ملا کر بارہ ہو جائیں۔

میں نے کہا تم اچھی طرح جانتی ہو کہ عید کے اس موقع پر ہم کافی خریدی کر چکے ہیں اور اب ہمارے پاس بجٹ نہیں ہے کہ مزید کچھ خریدا جا سکے اور مہمانوں کی تعداد دو درجن سے کم نہیں۔

بیگم نے کہا دعوت آئندہ ترقی پر اٹھا رکھو اور دوستوں کو حکمتِ عملی سے وعدۂ فردا پہ ٹرخا دو۔

میں نے کہا۔ ارے باپ رے باپ۔ میری جان عذاب میں آجائے گی۔ یہ آفس میں پائی جانے والی مخلوق اتنی آسانی سے رام نہیں کی جا سکتی۔ کم بختوں نے سال بھر سے دیدے اس دعوت کی طرف لگا رکھے ہیں اور جلیلہ شکم کو صابون سے دھو دھا کر دعوت کے لئے آمادہ کر لیا ہے اور اس تاک میں ہیں کہ میری طرف سے سگنل ملے اور یہ قاز کے کبابوں پر ٹوٹ پڑیں۔ کیا ایسا ممکن نہیں کہ ہم کسی دوست سے ڈنر سیٹ ایک دن کے لئے مانگ لیں۔

بیگم کا موڈ خراب ہوگیا۔ کہنے لگی۔ "یہ شادی کے فوراً بعد پہلی دعوت ہے، میں ابداً اپنی ناک نہیں کٹواؤں گی۔ لوگ جہیز کے متعلق کتنی باتیں بنائیں گے۔ نابابا نا! اس گھر میں کوئی مانگے کی چیز نہیں آئے گی۔"

میں نے کہا تو پھر بالاقساط دعوت دیں گے۔ ایک دن ایک گروپ کو دعوت اور دوسرے دن دوسرے گروپ کو۔ چنانچہ آج پہلے گروپ کو ٹیلیفون کے ذریعے دعوت دے دیتا ہوں۔"

عید نوروز کے موقعے پر ظاہر ہے کہ ایک قسم کے پکوان سے کام نہیں چل سکتا تھا۔ چنانچہ جو کا سوپ، نرگسی کباب، دو قسم کے پلاؤ اور چند اقسام کے سالن دسترخوان کی رونق بڑھانے کے لئے، قاز کے کباب کے علاوہ بنائے گئے۔ سب اہتمام ہوگیا تو میں ایک ناول لے کر پلنگ پر نیم دراز ہوگیا۔ ناول کی کیفیتوں میں ڈوبا ہوا تھا کہ بیگم نے خبر دی کہ آپ کے کوئی چچازاد بھائی مصطفیٰ خان آئے ہیں اور عید ملنا چاہتے ہیں۔

یہ مصطفیٰ خاں دراصل دور کے رشتے سے میرا چچازاد بھائی ہوتا تھا۔ بے ہنگم، لاپھاقد، ناک بھولی ہوئی، ہاتھ پاؤں تنکوں جیسے، چہرے پر ہمیشہ بارہ بجتے ہوئے، پھوس جیسے بال کہ جس پر گھونسلے کا گماں ہو، عمر یہی کوئی پچیس چھبیس سال تھی۔ سال میں ایک آدھ مرتبہ ان کی زیارت ہوجاتی تھی۔

میں نے بیگم سے کہا۔ بھئی خدا کے لئے اسے ٹہلا دو، کہہ دو میں ابھی سو کر نہیں اٹھا ہوں میں اس بے ہینگم جنات سے ملنا نہیں چاہتا کہ اپنے اقربا کے مزار پر پہلے فاتحہ پڑھ آئے۔"

بیگم نے تنک کر کہا۔ "میں وہاں چولھے میں گھسی ہوئی ہوں اور تم یہاں نہایت آرام سے اپنی بلائیں میرے سر ٹالتے ہو۔ اٹھو! جاؤ اپنی بلا کو خود سنبھالو۔

میں نے دیکھا کہ اب ملے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ بے چارہ اتنی دور سے آیا ہے، بھوکا پیاسا ہوگا، چند روپیوں کی عیدی کی امید لے کر آیا ہے اسے کس طرح نامراد لوٹا دوں۔ دل نے کہا کہ آج عید کا دن ہے آج تو صلہ رحمی سے کام لینا چاہیئے۔ چنانچہ میں نے آواز دی اور وہ بے چارہ نہایت عاجزی سے سرخم کرتے ہوئے اندر داخل ہوگیا۔ ماشاءاللہ چشم بددور، چہرہ بھی پہلے سے زیادہ بھیانک اور قد بھی کچھ اور لمبا ہوچکا تھا۔ گردن اسی قاز کی گردن کی طرح نظر آرہی تھی جو کباب بننے کے مرحلوں سے گزر رہا تھا۔ اگرچہ خط بنوا کر آیا تھا مگر کچھ بال جیب دامن سے ابھی پیٹ ہوئے تھے۔ لباس کا کیا ذکر کروں، کچھ نہ کہنا ہی بہتر ہے۔ پاجامہ اتنی بار دُھل چکا تھا کہ دونوں پائنچوں کی لمبائی میں اختلاف پیدا ہوگیا تھا۔ ہوا لگنے سے دونوں پائنچے لہرا

پھول رہے تھے جیسے کسی نے دو تربوز اس میں چھپا رکھے ہوں۔

میں ابھی اس عجیب مخلوق کا باریک بینی سے جائزہ ہی لے رہا تھا کہ میری بیوی گھبرائی ہوئی اندر آئی کہنے لگی۔ غضب ہوگیا، قاز تو صرف ایک ہی آیا ہے اور آج اس کے کباب کھا لئے گئے، تو کل قاز کے کباب دوسرے دوستوں کو کہاں سے کھلاؤ گے جب کہ تم سب کو قاز کے کباب کھلانے کا وعدہ کر چکے ہو۔"

بات تو واقعی گھبرانے کی ہی تھی بے خیالی میں صرف آج ہی کے لئے قاز کا انتظام کر لیا گیا تھا۔ کل کی بات ذہن سے نکل ہی گئی تھی۔ میں نے پوچھا:

"کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آدھے قاز کے کباب آج اور آدھے قاز کے کباب کل دسترخوان پر رکھے جائیں؟"

میری بیوی تقریباً چیخ پڑی۔" خدا کے لئے اپنی ناک نہ کٹوا لینا۔ قاز کے کباب کا حسن یہی ہے کہ مسلم اور مہر بند دسترخوان پر آئے۔"

بات نہایت معقول تھی لہٰذا اس سے اختلاف کا کوئی موقعہ ہی نہ تھا مگر مسئلہ یہ تھا کہ اب ایک عدد قاز اور کس طرح مہیا کیا جائے۔ میں نے دل میں کہا کہ یہ مصطفیٰ خاں انتہائی کودن اور کندۂ ناتراش ہی سہی کیا ایک قاز مہیا نہیں کر سکتا؟ جب امریکہ کی دریافت اور رستم زماں کی گردن توڑنے جیسی ناممکن باتیں ہو سکتی ہیں تو بظاہر یہ کوئی مشکل مسئلہ نہیں ہونا چاہیئے۔ اب میں مصطفیٰ خاں کی طرف متوجہ ہوا۔

"مصطفیٰ خاں تمہاری سمجھ میں آیا کیا بات ہے؟ آج تمہارا امتحان ہے۔ ایک قاز لاکر ثابت کردو کہ تم بھی اس دنیا میں کوئی نہ کوئی مصرف رکھتے ہو۔"

مصطفیٰ خاں کا رنگ پہلے ذرا سرخ ہوا اور پھر سیاہی مائل ہوگیا۔ بالآخر اس کے حلق سے حقے کی سنے کی طرح گڑگڑاہٹ دار آواز نکلی۔ معلوم ہوا کہ اس کی آواز یہ مفہوم رکھتی ہے کہ "آج عید کے دن کسی دکان کے کھلے رہنے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، جہاں قاز مل سکے۔" میں نے اس کی رگِ حمیت بھڑکانے کی بہت کوشش کی کہ۔" افسوس میری ناک کٹ جائے گی۔ رہی سہی عزت خاک میں مل جائے گی۔" مگر وہ تھوک کے گھونٹ نگلتا رہا اور یہی کہتا رہا کہ مجھے بھی ! میں آپ کے کسی کام نہیں آسکتا۔ آپ مختار ہیں۔ آپ کے اطمینان کی خاطر

تو ابھی ہفت اقلیم کھنگال آؤں مگر نتیجہ کیا ہوگا یہ آپ جانتے ہی ہیں! آپ دعوت ملتوی کیوں نہیں کر دیتے۔"

میں نے کہا: میاں عقل کے ناخن لو ایک گھنٹے میں مہمان آیا ہی چاہتے ہیں' دعوت کیسے ملتوی ہوگی۔"

کہنے لگا: آپ بیمار بن جائیں اور یہی بتائیں کہ ڈاکٹر نے پلنگ چھوڑنے کو منع کر رکھا ہے۔

میں نے کہا: ارے بندۂ خدا صبح ہی صبح کئی لوگوں سے فون پر بات کر چکا ہوں' اب بیمار کیسے بن جاؤں؟

کہنے لگا: یوں کہیئے کہ قاز کتا اٹھالے گیا۔

میں نے کہا: میرے دوستوں کو تم نہیں جانتے کیا وہ چھوٹے بچے ہیں جو ہر بات مان لیں گے۔"

کہنے لگا: یوں کہلوا دیناکہ آقا بغرض زیارت کربلائے معلّیٰ تشریف لے گئے ہیں۔

میں نے دیکھا کہ یہ تو یاوہ گوئی پر آمادہ ہے لہٰذا اس سے پیچھا چھڑانے کے لئے میں نے کہا: مصطفیٰ خاں! عیدی تو تم لے ہی چکے ہو۔ یہ شیرینی لے جاؤ اور جلد چچا اور چچی کو پہونچا دو اور ہم دونوں کا سلام عید بھی ان سے کہہ دینا کہ انشاءاللہ یہ نیا سال آپ کو مبارک ہو اور آپ ایسے ہزاروں سال دیکھیں۔

مگر مصطفیٰ خاں کسی اور ہی فکر میں تھا۔ میری بات سنی ان سنی کرتے ہوئے بولا کہ اگر کوئی ایسی ترکیب کی جائے کہ آج مہمان خود ہی قاز کے کباب کھانے سے دست بردار ہو جائیں اور کل اسی قاز سے کام چلا لیا جائے تو؟"

شروع میں تو یہ ترکیب انتہائی ناقابلِ عمل معلوم ہوئی لیکن غور کرنے پر معلوم ہوا کہ نسخہ برا نہیں ہے اور آزمایا جا سکتا ہے۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد میں نے مسکراتے ہوئے مصطفیٰ خاں سے کہا:

"شاید زندگی میں پہلی مرتبہ تم نے کوئی ڈھنگ کی بات کی ہے' لہٰذا یہ خدمت تمہارے سپرد ہی کی جاتی ہے کہ اپنی زبانی جارحیت مہمانوں پر خرچ کرکے انھیں آج قاز سے باز رہنے پر آمادہ کر لو۔"

پہلے تو اس کی سمجھ میں نہ آیا اور سوچنے لگا لیکن جیسے ہی اس کی سمجھ میں یہ بات آگئی کہ میں

اس سے کیا کام لینا چاہتا ہوں تو وہ کھل اٹھا۔ میں نے بھی اندازِ گفتگو بدل دیا اور اسے خوش رکھنے کی کوشش کرنے لگا۔

"کھڑے کیوں ہو، یہاں صوفے پر آکر بیٹھ جاؤ۔ آج کل کیا کر رہے ہو؟ کیسی گذر رہی ہے؟ اگر تم چاہو تو تمہارے لئے ایک بہترین نوکری اور بیوی تلاش کردوں؟ اماں! کھاؤ نا! گزک کیوں نہیں کھاتے۔ یہ ایرانی بادام کا حلوہ بھی نہایت لذیذ ہے۔ شرماؤ نہیں اپنا ہی گھر سمجھو۔"

بےچارہ ایک دم سے اتنی نوازشیں دیکھ کر گھبرا سا گیا اور اس غیر متوقع عنایات کی شکرگزاری کے لئے مناسب الفاظ تلاش کرنا ہی چاہتا تھا کہ میں نے بیچ سے ہی بات کاٹ دی۔

"اماں ہٹاؤ بھی کیوں کانٹوں میں گھسیٹتے ہو۔ تم تو میرے چھوٹے بھائی ہو، آج تمہیں کھائے بغیر نہ جانے دوں گا۔ ایک سال سے تم اس طرف نہیں آئے۔ کیا اپنے چچازاد بھائی کو اتنا جلد فراموش کرگئے، کوئی تمہیں بھی اس شہر میں یاد کرتا رہتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مجھ سے کوئی بھول ہو گئی ہے۔ اب کوئی اور بات نہ سنوں گا۔ آج کھانا میرے ساتھ ہی کھاؤ گے۔ ابھی بیگم سے کہتا ہوں کہ وہ تمہارے لئے میرا کوئی نیا لباس نکال دیں گی۔ نہا دھو کر ٹیپ ٹاپ ہو جاؤ۔ میز پر میرے پہلو میں بیٹھو، جو دل چاہے کھاؤ۔ جھینگا سوپ، برہ کباب، پلاؤ۔ میٹھے سب تمہارے لئے حاضر ہیں اور پیچھے ہی قاز کے کباب دسترخوان پر آئیں گے۔ بھائی اب بس بھی کرو۔ پیٹ میں تل دھرنے کی جگہ باقی نہیں۔ اتنا کھالیا ہے کہ کہیں معدہ شق نہ ہو جائے۔ مانا کہ کھانا آپ کا ہے مگر معدہ تو اپنا ہے۔ افسوس اتنی مہارت سے دم دیا ہوا قاز بے دلی سے کھائیں۔ میں اپنی اور ان مہمانوں کی طرف سے درخواست کرتا ہوں کہ اس آخری آئٹم کو فی الوقت ملتوی کر دیں اور واپس اندر لے جائیں اور اگر آپ بہت اصرار کرتے ہیں تو اسی موسم بہار میں پھر کسی دن آپ بلائیں ہم ضرور انصاف کریں گے۔ آج تو خدا گواہ ہے اتنا کھالیا ہے کہ کہیں یہیں بستر نہ لگانا پڑے اور ہم آپ کے لئے وبالِ جان بن جائیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ تمہارے اتنا کہنے کے بعد میں جس قدر اصرار کروں تم نہ ماننا اور ابداً قاز پر دست درازی کرنے سے انکار کر دینا۔"

مصطفیٰ خان حیرت سے منہ کھولے ہوئے میری اسکیم سنتا رہا۔ گاہ بگاہ سر کو ادھر ادھر جنبش دیتا رہا۔ بالآخر بولا: ٹھیک ہے! میں سمجھ گیا۔ خاطر جمع رکھئے بالکل ایسے ہی ہوگا۔

پھر بھی احتیاطاً کئی مرتبہ میں نے اسے ریہرسل کرائی جب مجھے اطمینان ہو گیا کہ یہ اپنا پارٹ بخوبی ادا کرسکتا ہے تب میں نے اسے اپنی وضع قطع درست کرنے کے لئے بھیجا اور خود

ناول لے کر بیٹھ گیا۔

دو گھنٹے بعد بلا کم و کاست تمام دوست کھانے کی میز پر جمع ہو چکے تھے اور ادھر اُدھر کی باتیں چل رہی تھیں کہ مصطفیٰ خاں نہایت زرق برق لباس میں سوٹڈ بوٹڈ ٹائی لگائے ہوئے کسی متوالے مور کی طرح آ پہنچا۔ میرے بہترین لباس اور سینٹ سے مزین اور معطر ہو کر وہ کسی فلمی ہیرو کی طرح نظر آ رہا تھا۔ مجھے تعجب ہو رہا تھا کہ آخر میرا لباس اس کے لمبے قد پر کس طرح فٹ آیا ہوگا۔ بہر حال اُس نے میرے جس سوٹ کا انتخاب کیا تھا اس سے ایسا ہی معلوم ہو رہا تھا کہ گویا درزیٔ ازل نے اسی کے قدِ بالا کے لئے یہ سوٹ سیا ہو۔

الغرض مصطفیٰ خاں نے آدابِ مجلس کا خیال رکھتے ہوئے پُر وقار انداز میں سب سے اپنا تعارف کروایا اور میرے پہلو والی نشست پر براجمان ہو گیا۔ میں نے بھی لقمہ دیتے ہوئے سب پر یہی ظاہر کیا کہ وہ ایک نہایت عالم و فاضل اور شائستہ نوجوان ہے اور مصطفیٰ خاں نے بھی کسی ایسی حماقت کا اظہار نہیں کیا جس سے رنگِ محفل خراب ہونے کا اندیشہ ہو۔ اب مجھے اطمینان سا ہو گیا کہ یقیناً وہ اپنا رول بخوبی ادا کرلے گا۔

اپنے اطمینان کا اظہار کرنے کے لئے میں نے ایک پگ مصطفیٰ خاں کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "لو یہ انتہائی نفیس چیز ہے۔ آج ہی اصفہان سے منگوائی ہے۔ الکوحل بھی اس میں کم ہے اور مزہ بھی نہایت خوشگوار ہے۔"

اس نے ہونٹوں کو تبسم ریز بناتے ہوئے کہا:

"اگرچہ کہ میں فرانسیسی شمپین کا عادی ہوں مگر آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔"

گلاس میرے ہاتھوں سے لے کر اس نے فوراً اُسے اپنے حلق میں انڈیل لیا اور خالی گلاس میری جانب بڑھاتے ہوئے نہایت عیاری سے بولا۔

"واقعی مزہ برا نہیں ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے لینن گراڈ کی "ووڈکا" ہو۔ ابھی چند روز ہوئے سفیر روس نے ازراہِ عنایت چند بوتلیں بھجوائی تھیں۔ لیکن آپ جیسے جگری دوستوں کی عنایت بھی کیا کسی سے کم ہو سکتی ہے یہ سئے اصفہانی بھی لگ بھگ اسی معیار کی معلوم ہوتی ہے۔ کبھی کبھی ایرانی بھی ایسی لاجواب کشید کرتے ہیں کہ اہلِ یوروپ منہ دیکھتے رہ جائیں واہ! کیا کہنے ایک گلاس اور عنایت ہو۔"

کیا عرض کروں کچھ ہی دیر میں اس لائق و فایق اور شائستہ نوجوان کے حلق سے دو تہائی

بوتل معہ دیگر مشروبات نیچے اتر چکی تھی۔ شراب وکباب نے اس کا لب ولہجہ ہی بدل کر رکھ دیا تھا۔ ایسی شوخی آمیز اور تبسم انگیز گفتگو اس نے شروع کر دی کہ محفل رنگ پر آگئی۔ کوئی اندازہ بھی نہیں کر سکتا تھا کہ یہ ایک جاہل اور غیر مہذب نوجوان تھا۔ ہر شخص اس کی گفتگو میں ڈوب کر رہ گیا تھا اور وہ بھی مزے لے لے کر اپنے فرضی سفروں اور سیر سپاٹوں کا بیان ایسی چابکدستی سے کر رہا کہ باور کئے بغیر چارہ بھی نہ تھا جو کبھی اپنے شہر سے باہر نہ نکل سکا ہو وہ تمام مشہور ملکی و غیر ملکی زیارت گاہوں کے چشم دید قصے بیان کرتے کرتے اب سفر امریکہ و فرانس پر پہنچ چکا تھا۔ ایسے سفید جھوٹ پر میرا دل اندر ہی اندر سے لعنت کے ڈونگرے برسا رہا تھا مگر زبان میں یہ ہمت نہ تھی کہ اس کی بات کاٹ سکے۔ انداز بیاں کی شگفتگی کا یہ عالم تھا کہ زبان صرف اسکی چل رہی تھی اور باقی سب ہمہ تن گوش بنے تھے۔ حیرت تو اس بات پر ہو رہی تھی کہ لقمہ نگلنے وقت بھی کم بخت کی زبان بند نہ ہوتی تھی ایسا لگتا تھا کہ اس کے حلق میں دو نالیاں ہوں اور دونوں جدا جدا اپنا کام بیک وقت کر رہی ہوں۔ ایک نالی سے لقمے اندر داخل ہو رہے تھے اور دوسری سے بے سر و پا قصے ڈھل کر باہر نکل رہے تھے۔ اچانک اس نے گفتگو کی پٹری بدلی اور شعر و شاعری کے متعلق گلفشانی کرنے لگا۔ کہنے لگا عید نوروز کے موقعے پر پچھلی شب بزم سخن میں بندے نے وہ قصیدہ پڑھا کہ ساری محفل لوٹ پوٹ ہوگئی۔ میرے دل نے صدا دی "واللہ آپ اور موزوں شاعر!" مگر مرتا کیا نہ کرتا میرا ہاتھ پتھر کی چٹان کے نیچے دبا ہوا تھا۔ سر ہلانے کے سوا کوئی چارہ ہی نہ تھا۔ دوسری طرف میرے دوست تھے کہ اس کے ہر مسروقہ شعر پر داد و تحسین کے ڈونگرے برسائے جا رہے تھے، حالانکہ ان میں سے دو ایک شعر و ادب سے بخوبی واقفیت بھی رکھتے تھے مگر اکثر اشعار پر ان کی زبان سے "مکرر ارشاد" ہی کی صدا بلند ہو رہی تھی۔ میرا ایک دوست جو خیر سے ایک اچھا شاعر بھی تھا اس نے تو غضب ہی کر دیا، اپنی سیٹ چھوڑ کر اس نے مصطفیٰ خاں کی سلیٹی پیشانی کے پیاپے بوسے لے لئے کہ وہ آج حقیقت میں ایک بے مثل استاد کو دیکھا ہے۔ پھر نہایت عقیدتمندی سے اس کا اس کا تخلص دریافت کیا۔ میں نے بمشکل اپنی ہنسی روکی مگر مصطفیٰ خاں کا جواب سننے کے قابل تھا۔ نہایت متانت سے بولا:

"میں یوں تو ذاتی طور پر تخلص کو انتہائی غیر ضروری اور بے کار شے سمجھتا ہوں مگر کیا کروں ملک کے بزرگ ترین شاعر حضرت ادیب پیشاوری کے انتہائی اصرار پر میں نے بھی انہی کا عطا کردہ ایک تخلص از راہِ سعادتمندی قبول کر لیا تھا۔ مرحوم آخر لا میں اتنے کرم فرما ہو گئے تھے

ہے اکثر کھانا پینا اور اٹھنا بیٹھنا انہی کے ساتھ تھا۔ گو انھوں نے "استاد" تخلص مجھے عنایت کیا تھا لیکن میں عموماً اسے استعمال نہیں کرتا۔"

حاضرینِ محفل نے بیک آواز کہا۔

"بے شک آپ جیسی ہستی کے لئے یہی تخلص مناسب تھا۔"

اتنے میں ٹیلیفون کی گھنٹی بجنے لگی۔ مصطفیٰ خاں نے نہایت ڈھٹائی سے نوکر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ دیکھو لائن پر وزیر داخلہ ہوں گے جو مجھ سے بات کرنا چاہتے ہیں فی الحال معذرت طلب کر لو اور کہو کہ مصطفیٰ خاں اس وقت دسترخوان پر ہے اور تھوڑی دیر بعد خود ہی فون کرلے گا۔ اتنے میں نوکر نے اطلاع دی کہ رانگ نمبر تھا۔

اگر کبھی غلطی سے میری نگاہ اُس کی نگاہ سے مل بھی جاتی تو ایسا لگتا گویا کوئی اجنبی ہو اور چشم زدن میں کبھی اس ڈش پر ہاتھ صاف کر رہا تھا اور کبھی اس ڈش پر — ! مصطفیٰ خاں میز پر رکھے ہوئے پکوانوں کے سوا اس وقت ساری دنیا سے بے نیاز معلوم ہو رہا تھا۔

سوپ، برد کباب، نرگسی کوفتوں کے علاوہ دو قسم کی بریانیاں خانۂ شکم آباد کر چکی ہیں مگر آنکھیں ہیں کہ مزید فتوحات کی سوچ رہی ہیں۔ اسی دوران میٹھوں کا نمبر بھی آگیا۔ اب غالباً سبھی دوست، قاز کے کبابوں کی تلاش میں تھے۔ میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ میں دل ہی دل میں قاز کے کبابوں کی سلامتی کے لئے "فاللہ خیر حافظا" کا وظیفہ پڑھ رہا تھا۔ اتنے میں خادم ایک بڑا سا خوان اُٹھا کر لے آیا۔ گھی میں تر بتر مسلم قاز کباب کیا ہوا میز کے بیچوں بیچ رکھ کر وہ روانہ ہوگیا۔ میری ساری توجہ مصطفیٰ خاں کی طرف تھی کہ کہ کہیں خوان سے اٹھتی ہوئی اشتہا انگیز مہک مصطفیٰ خاں کو بے تاب نہ کر دے اور پھر وہ قابو میں نہ رہے مگر ابھی وہ ہوش میں تھا اور اس کی عقل کام کر رہی تھی۔ مسلم قاز پر نظر پڑتے ہی وہ مہمانوں کی طرف متوجہ ہو کر بولا:

" غالباً آپ سب میری تصدیق کریں گے کہ یہ کوئی قاز کے کباب لانے کا وقت ہے؟ میں حلق تک کھا چکا ہوں۔ اب ایک لقمہ بھی نہیں لے سکتا چاہے میرا سر ہی کیوں نہ قلم کر دیا جائے اگر ہم نے یہیں ہاتھ نہ روک لئے تو یہاں سے براہِ راست سرکاری ہسپتال جانے کی نوبت آجائے گی۔ آخر انسان کا معدہ ہے یہ ناممکن ہے کہ ہاتھی کی خوراک ہضم کر جائے۔" یہ کہتے ہوئے اُس نے نوکر کو آواز دی کہ ادھر آؤ، مہمانوں کی خواہش ہے کہ یہ مسلم قاز واپس لے جاؤ۔ پھر کبھی سہی۔

ادھر میرے دوستوں کا یہ حال تھا کہ مسلم قاز کی مہک دعوت دے رہی تھی کہ

اسے چکھ کر یہ اندازہ لگائیں کہ اس میں اور برہ کباب کے ذائقہ میں کیا فرق ہوتا ہے۔ دوسری جانب ظاہری رکھ رکھاؤ اور اظہارِ تکلف بھی ضروری تھا کہ اوپری دل سے ہی سہی مصطفیٰ خاں کی ہاں میں ہاں نہ ملا سکیں تو کم سے کم خاموش رہیں۔

اب یہ سین تھا کہ سب کی نگاہیں تو مسلم قاز پر ہیں لیکن زبان رسمِ تکلفات میں اُلجھی ہوئی ہے — "ہاں ہاں — اب اس کی کیا ضرورت ہے — ہم تقریباً سیر ہو چکے ہیں۔ اُستاد مصطفیٰ خاں ٹھیک ہی تو کہہ رہے ہیں"۔ جیسے یہ جملے بادلِ ناخواستہ ادا کر رہی ہے۔ میں نے دیکھ لیا کہ میری اسکیم کارگر رہی۔ مصطفیٰ خاں نے اپنا کردار نہایت خوش اسلوبی اور کامیابی سے نبھایا۔ بے ساختہ دل سے صدائے تحسین و آفریں بلند ہونے لگی اور اس میں بڑی شدت سے اس کی اونٹ جیسی گردن اور اور پیشانی کو چومنے کی خواہش کروٹیں لینے لگی۔

میں نے صرف رسماً اتنا کہا کہ جہاں آپ لوگ اتنا کھا چکے ہیں وہاں میری خاطر ایک لقمہ اور لے لیجئے۔ اب یہاں تو میری طرف سے اصرار ہو رہا تھا اور مصطفیٰ خاں سراپا انکار بنا ہوا تھا۔ یہاں تک بعض مہمان بھی بادلِ ناخواستہ اس کے ہم آواز بن گئے۔

میں نے اپنی اسکیم کی کامیابی دیکھ لی تھی اور قاز کو اندر پہونچانے کے لئے نوکر صرف میری جنبشِ ابرو کا منتظر تھا کہ یکایک میری زبان سے نکلا:

"کتنے افسوس کی بات ہے کہ مہمان ایک ایسے قاز سے دست بردار ہو رہے ہیں جسے فرنگی مکھن لگا کر مسلم کباب کیا گیا ہے اور اُس کے شکم میں انڈوں کی زردی بھری ہوئی ہے"۔

ابھی یہ جملہ میری زبان سے پوری طرح ادا بھی نہ ہوا تھا کہ مصطفیٰ خاں نے قاز کی ٹانگ پر ہاتھ صاف کرتے ہوئے کہا:

"اب جب کہ آپ اتنے مصر ہیں اور فرما رہے ہیں کہ اس قاز کو فرنگی مکھن میں مسلم کباب کیا گیا ہے اور اس کے شکم میں انڈوں کی زردی بھری ہوئی ہے تو پھر ہم بھی آپ کو مایوس نہیں کریں گے اور آپ کا دل رکھنے کے لئے ایک ایک ٹکڑا چکھ لیتے ہیں۔

مصطفیٰ خاں کا جملہ سنتے ہی تمام مہمان بھوکے بنگالیوں کی طرح قاز پر ٹوٹ پڑے اور پلک جھپکتے ہی مسلم قاز تو قاز اس کی ہڈیوں کا ڈھانچہ بھی نہیں رہا تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ یہ قاز کبھی عالمِ وجود ہی میں نہ آیا ہو۔ گوشت خور انسان تو کوئی نئی بات نہ تھی لیکن ہڈی خور آدمیوں

میں نے کبھی ذکر بھی نہیں سُنا تھا۔ ظالم دو گھنٹوں تک انواع و اقسام کی نعمتوں سے معدے وگودام بنانے کے باوجود قاز کی یہ گت بنا گئے تھے اس پر طرہ یہ کہ پلیٹوں میں ذرا تو روغن لگا رہ گیا ہو۔ کم بختوں نے پلیٹیں تک چاٹ لی تھیں۔ میری آنکھوں نے بارہ کے بارہ مہمانوں کو از سر نو کھانے کے سمندر میں غوطہ لگاتے ہوئے سُرخ قرمزی مسلّم قاز سے حساب چکاتے ہوئے دیکھا جو ٹکڑے ہو ہو کر ان کے گورستانِ شکم میں دفن ہو رہا تھا۔ اس ہولناک منظر کو دیکھ کر میرا حلق خشک ہو چلا تھا اس کے باوجود مجھے ہنستے ہوئے ان مہمانوں کی فرماں برداری کو خوش آمدید کہنا پڑ رہا تھا۔ اب یہ میرا ہی دل جانتا تھا کہ میری ہنسی میں کھسیاہٹ کا عنصر کتنا تھا۔

مصطفیٰ خاں کی چہک دیکھنے اور سُننے کے قابل تھی کم بخت نے میری ہی دی ہوئی پتلون کی جیب سے میرا نیا فرانسیسی ریشمی رومال نکالا اور بے دردی سے ہاتھوں اور ہونٹوں سے روغن پونچھنے لگا۔ اسی دوران زبان برابر چل رہی تھی۔ کبھی ہندوستان میں ہاتھیوں کے شکار کا تذکرہ ہو رہا تھا اور کبھی سوئٹزرلینڈ کے جنگلوں میں سفید ریچھوں کے شکار کے قصے بیان ہو رہے تھے۔ اسی ضمن میں جب اس نے ایک پری پیکر فرنگی لڑکی کا خود پر عاشق ہونا بیان کیا تو میرے دل سے آواز آئی یا اللہ غیرتی تیری ہی آسرا۔ اور حاضرینِ محفل تھے کہ اس کی ہر بات پر آمنّا و صدقنا کہہ رہے تھے۔

اتنے میں پھر فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں باہر جا کر آیا اور کہنے لگا۔ مصطفیٰ خاں! وزیرِ داخلہ بذاتِ خود لائن پر ہیں اور مصر ہیں کہ ایک منٹ گفتگو کر لیجیے۔ مصطفیٰ خاں کھانے کی میز سے بادلِ ناخواستہ اُٹھا اور میرے پیچھے پیچھے آیا۔ جیسے ہی وہ دوسرے کمرے میں داخل ہوا میں نے لپک کر دروازہ بند کیا اور چھوٹتے ہی بول اُٹھا:

"خانہ خراب حلق تک پیٹ کا گودام بھر لینے کے بعد مسلّم قاز بھی نہ چھوڑا۔ یہ تم نے میری عنایات کا اچھا حق ادا کیا۔ شاباش۔"

این کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

مصطفیٰ خاں کا وہی مسکین لہجہ لوٹ آیا جس کا کھانے کی میز پر دور دور تک پتہ نہیں تھا۔ گھگھیا کر بولنے لگا:

"بھائی جان! میری کیا خطا ہے۔ میرا آپ سے یہی معاہدہ ہوا تھا کہ آپ صرف قاز کھانے

پر اصرار کریں گے اور میں انکار کروں گا۔ مگر آپ نے تو فرنگی محل میں اُسے پُرزہ کباب کرنے اور اس کے شکم میں انڈوں کی زردی کا تذکرہ کیا تھا اس کے متعلق آپ سے پوچھا نہ ہوا تھا۔ اس سلسلے میں اگر کسی کی غلطی ہے بھی تو وہ آپ کی ہے۔ جب میں نے انکار کر دیا تھا آپ قاز واپس لے جاتے اس کے بجائے آپ نے اندازِ بیان ہی کچھ ایسا اختیار کیا کہ میں اسے قاز کھانے کا سگنل سمجھا اور مجھے یہی گمان گزرا کہ آپ نے خیال بدل دیا ہے۔

میں غصے کی شدت سے کانپ اٹھا دروازہ کھول کر اُس نمک حرام کو بیک بینی و دوگوش گھر سے نکال باہر کیا۔ موڈ درست کرنے کے لئے کچھ دیر تک آنگن میں چہل قدمی کرنے کے بعد میں پھر اپنے مہمانوں کے پاس لوٹ آیا۔ مہمان سب نیم دراز ہو کر بستر بہیں جمانے کی فکر میں نظر آرہے تھے۔ میں نے کہا:

" مصطفیٰ خاں نہایت شرمندہ تھے کہ وہ شخصی طور پر آپ سب کو خدا حافظ نہ کہہ سکے۔ وزیر داخلہ نے خود اپنی موٹر انھیں لینے کے لئے بھیج دی تھی لہٰذا انھیں جانا پڑا اس لئے انھوں نے مجھ سے درخواست کی کہ میں اس سلسلے میں آپ لوگوں سے معذرت خواہی کروں۔"

سارے مہمان اس ناخلف کے اس طرح چلے جانے پر افسوس کرنے لگے۔ کوئی اس کی خوش مشربی، بذلہ سنجی اور خوش مذاقی کا قصیدہ پڑھنے لگا تو کوئی دیگر اصناف کا۔ کچھ مہمانوں نے اُسے اپنے گھر مدعو کرنے کے لئے اس کا پتہ اور فون نمبر تک مانگا اور میں نے نہایت بے غیرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے سب کو غلط پتہ اور نمبر دے دیا۔ دوسرے دن مجھے یاد آیا کہ ہائے، ہائے میں نے یہ کیا کیا۔ اپنے ایک بہترین سوٹ کے ساتھ اُسے گھر سے باہر کر دیا مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ مصطفیٰ خاں تمام لوازمات کے ساتھ سوٹ کے ہمراہ جا چکا تھا۔ میں نے تہیہ کر لیا کہ آئندہ کبھی ترقی کے متعلق سوچوں گا بھی نہیں۔

رباعی

عرب شاہ خالد کیفری

مصروف ہے تکمیل تمنا کے لئے کھویا ہوا دنیا میں ہے دنیا کے لئے
بندے یہ تغافل یہ تساہل کب تک کر کچھ تو عمل زینتِ عقبیٰ کے لئے

غزلیں

ڈاکٹر امیر عارفی

پیار محبت کرنے والو! پیار میں ہے رسوائی بھی
عشق سے جتنا گھبراؤ گے، کاٹے گی تنہائی بھی

دل کے گلزاروں میں جب بھی گھومنے پھرنے جاتے ہیں
وعدوں کے گھنگھرو بجتے ہیں، یادوں کی شہنائی بھی

تم کو کس کی نظر لگی ہے، کس نے آخر دل توڑا
پھول سا چہرہ مرجھایا ہے، کمہلائی رعنائی بھی

مدت سے ہم گھوم رہے ہیں دل والوں کی بستی میں
کوئی تو ایسا مل جائے گا، چھین لے جو تنہائی بھی

بھاگ متی، کا دیس نہیں یہ، عارفی! شہر علیگڈھ ہے
دل نہ لگانا اس نگری میں، لوگ ہیں یاں ہرجائی بھی

طاہرہ بنارسی

جس کو وہ اپنا بناتے ہیں مٹا دیتے ہیں
کس محبت سے محبت کی سزا دیتے ہیں

آپ دامن کو ذرا اپنے بچائے رکھیے
اپنے اشکوں سے بھی ہم آگ لگا دیتے ہیں

سرخرو بس وہی ہوتے ہیں جہانِ غم میں
اپنا سب کچھ جو محبت میں لٹا دیتے ہیں

لطف کی بات بھی نفرت میں بری لگتی ہے
دل میں الفت ہو تو شکوے بھی مزا دیتے ہیں

طاہرہ! ان کو نہ مل پائی کبھی لذتِ غم!
آتشِ عشق جو اشکوں سے بجھا دیتے ہیں

مرحوم ماجد وفائی

زندگی بے مزا نہ ہو جائے
بے وفا با وفا نہ ہو جائے

آپ کے انتظار میں آخر
موت کا سامنا نہ ہو جائے

میں جواں ہوں جواں طبیعت ہے
دل کسی پر فدا نہ ہو جائے

آپ انگڑائی سوچ کر لیجیے
اک قیامت بپا نہ ہو جائے

ہر حسیں سے مجھے محبت ہے
کوئی مجھ سے خفا نہ ہو جائے

میرے محبوب کی امانت ہے
درد، دل سے جدا نہ ہو جائے

کیا سمجھ کر یہ لوگ کہتے ہیں!
کہیں ماجدؔ وفا نہ ہو جائے

مرحوم ماجد وفائی کی یہ آخری غزل ہے جو بزم تشکیل ادب کے لیے لکھی گئی تھی۔
پیشکش گروہ: سید محمد عباس ماجد فرزند ماجد وفائی •

عشرت کرتپوری

جلووں کے دیکھنے میں دکھانے میں رہ گیا
میرا وجود آئینہ خانے میں رہ گیا!

یاروں نے رینگ رینگ کے منزل کو پا لیا
میں راستے کے خار ہٹانے میں رہ گیا

خوشیاں تمام غیروں نے آپس میں بانٹ لیں
میں اپنے غم کا بوجھ اٹھانے میں رہ گیا

کل رات چور، دولتِ احساس لے گئے
میں اپنے گھر کی شمع جلانے میں رہ گیا

چپکے سے اس نے آ کے مرا گھر جلا دیا
میں جس کے گھر کی آگ بجھانے میں رہ گیا

تاج پیامی

حالی کی تصنیف "مقدمہ شعروشاعری" پر
کلیم الدین احمد کے غلط تاثرات

جناب کلیم الدین احمد "گلِ نغمہ" (عظیم الدین صاحب کا مجموعۂ کلام) کے مقدمہ کے صفحہ ۷ پر رقم طراز ہیں:
"جہاں اردو شاعری محض قافیہ پیمائی کا مترادف ٹھہری اسی طرح اردو تنقید بعض الفاظ کے دام میں جا پھنسی۔"

کوئی شخص کتنا ہی با صلاحیت اور صاحب فہم ہو اگر وہ شاعری کو قافیہ پیمائی سمجھتا تو اس کی تنقیدی صلاحیت پر بجا طور پر شبہ کیا جا سکتا ہے۔ غلط بات بہر حال غلط ہے۔ کلیم صاحب کی قابلیت اپنی جگہ پر لیکن اس کو کیا کیجیے کہ ان کی صلاحیت اور قابلیت تعمیری نہیں۔ وہ شاعری کو بھی قافیہ پیمائی سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں ان کی تنقیدی صلاحیت پر شبہ کرنے کا حق محفوظ رکھتا ہوں۔ اردو تنقید کے سلسلے میں بھی کلیم الدین صاحب کا رویہ جارحانہ ہے۔ میں اس مضمون میں صرف حالی کی تصنیف مقدمہ شعر و شاعری پر کلیم صاحب کے غلط اعتراضات کا مدلل جواب دوں گا۔ آپ دیکھیں گے کہ کلیم صاحب نے حالی کے سلسلے میں کس قدر علمی بددیانتی (INTELLECTNAL DISHONESTY) سے کام لیا ہے۔ بعض باتیں ایسی ہیں جن کا تذکرہ بھی حالی نے نہیں کیا لیکن کلیم صاحب انھیں حالی کے سر منڈھ دینا چاہتے ہیں۔ حالی اہلِ مشرق اور اہلِ مغرب کے اقوال پیش ضرور کرتے ہیں لیکن انھیں من و عن تسلیم نہیں کرتے۔ وہ ان پر غور و فکر کرتے ہیں، ان کی خوبیوں اور خامیوں پر روشنی ڈالتے ہیں اور تب اپنی رائے الگ سے پیش کرتے ہیں۔

حالی اور حالی کی تصنیف "مقدمہ شعروشاعری" کے سلسلے میں کلیم صاحب نے اتنی گمراہ کن باتیں تحریر کی ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ کوئی دیانت دار شخص ایسی لغو باتیں ضبطِ تحریر میں

نہیں لاسکتا۔ کلیم صاحب کی تصنیف "اردو شاعری پر ایک نظر" ۱۹۴۲ء میں شائع ہوکر یونیورسٹیوں میں داخل نصاب ہوئی۔ اردو اساتذہ نے حالی اور کلیم صاحب کے تصانیف کو پڑھا بھی ہوگا اور پڑھایا بھی ہوگا لیکن تعجب ہوتا ہے کہ کسی نے حالی کی تصنیف "مقدمہ شعر و شاعری" پر کلیم صاحب کے غلط اعتراضات کی نشان دہی نہیں کی۔ میں اس مضمون میں ایک ایک اعتراض کی نشان دہی کروں گا اور (POINT_WISE) جواب دوں گا۔

کلیم صاحب "اردو تنقید پر ایک نظر" (حالیہ اشاعت ۱۳؍ فروری ۱۹۸۴ء) کے پیش لفظ میں ایک ناقد کو باغباں سے تشبیہہ دے کر یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ ناقد کے اعتراضات بھی باغباں کی تراش خراش کے مترادف ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ باغباں باغباں میں فرق ہوتا ہے ایک باغباں تراش خراش کر باغ کو سنوارتا ہے۔ دوسرا باغباں بھی تراش خراش کرتا ہے لیکن بجائے سنورنے کے باغ کی صورت بگڑ جاتی ہے۔ ایک تیسرا باغباں بھی ہوتا ہے جو بجائے تراش خراش کے باغ کے سارے پودوں کو کاٹ ڈالتا ہے اور کلیم صاحب نے یہی کیا ہے۔ انھوں نے اپنے جاننے میں اپنی جارحانہ اور تخریبی تنقید سے اردو زبان و ادب کے باغ کو بالکل کاٹ ڈالا۔ پہلے تو انھوں نے اردو زبان کے سارے اصناف سخن میں خامیاں نکالیں، غزل جیسی مہذب ترین صنف شاعری کو نیم وحشی صنف شاعری کہا۔ اردو کے تمام ادبا و شعرا کو دنیا کے سامنے کمتر بنا کر پیش کیا، انھیں شاعرانہ خوبیوں سے نابلد ٹھہرایا۔ جب اس سے بھی تشفی نہیں ہوئی تو یہ فتویٰ بھی صادر کردیا "اردو شاعری قافیہ پیمائی کے مترادف ٹھہری اور اردو تنقید بھی الفاظ کے جال میں جا پھنسی"۔ اب آپ ہی انصاف سے فیصلہ کریں اردو زبان و ادب کے باغ میں کیا رہا؟ کیا کلیم صاحب نے سارا باغ کاٹ نہ ڈالا!

مجھے یہ بھی کہنے دیجیے کہ کلیم صاحب بعض اردو نثر کے جملوں کو بھی ٹھیک سے نہیں سمجھتے یا قصداً اس کے معنی میں تحریف کرتے ہیں۔ مثلاً حالی کے "مقدمہ شعر و شاعری" کا یہ جملہ:

"شعر کی مدح و ذم میں بہت کچھ کہا گیا ہے اور جس قدر اس کی مذمت کی گئی ہے وہ بہ نسبت مدح سے زیادہ قرین قیاس ہے۔"

حالی کے اس جملے سے کلیم صاحب یہ غلط نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ حالی "شاعری کو غیر ضروری سمجھتے ہیں۔" یہ ہے معنی میں تحریف۔ حالی کے اس جملے کا قطعی یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ بھی شاعری کو غیر ضروری سمجھتے ہیں۔ حالی مذکورہ جملے میں صرف اتنا کہنا چاہتے ہیں کہ شعر کی مدح کی بہ نسبت اس کی مذمت میں جو باتیں کہی گئی ہیں وہ زیادہ مدلل ہیں، یہی وجہ ہے کہ

وہ زیادہ قرینِ قیاس معلوم ہوتی ہیں۔ مثلاً افلاطون نے اپنی جمہوریت سے شعرا کو خارج کرنے کی جو دلیل دی یا شاعری کو میجک لینٹرن سے تشبیہہ دے کر ثابت کرنا کہ یہ دورِ جہالت میں زیادہ مقبول ہوتی ہے زیادہ قرینِ قیاس معلوم ہوتی ہے۔ لیکن حالی نے ان دونوں نظریات کو باطل ٹھہرایا اور ثابت کیا کہ شاعری کی اہمیت مسلّم ہے۔ حالی کو شعر و شاعری کا صحیح اندازہ ہے۔ اور وہ اسے بہت اہم اور ضروری سمجھتے ہیں۔ حالی مقدمہ شعر و شاعری میں رقمطراز ہیں:

"افلاطون نے جو یونان کے لئے جمہوری سلطنت کا ایک خیالی ڈھانچہ بنایا تھا اس میں شاعروں کے سوا ہر پیشہ اور فن کے لوگوں کی ضرورت تسلیم کی تھی۔ زمانۂ حال میں بعض نے شعر کو میجک لینٹرن سے تشبیہہ دی ہے۔ یعنی میجک لینٹرن جس قدر زیادہ تاریک کمرے میں روشن کی جاتی ہے اسی قدر زیادہ جلوے دکھاتی ہے اسی طرح شعر جس قدر جہل و تاریکی کے زمانے میں ظہور کرتا ہے اسی قدر زیادہ رونق پاتا ہے۔

شاعری کا ملکہ بیکار نہیں

یہ اور اسی قسم کی بہت سی باتیں جو شعر کے برخلاف کہی گئی ہیں ایسی ہیں جو لامحالہ تسلیم کرنی پڑتی ہیں مگر اس بات کا بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ دنیا میں ہزاروں بلکہ لاکھوں آدمی ایسے پیدا ہوئے ہیں جن کو قدرت نے اسی کام کے لئے بنایا تھا اور یہ ملکہ ان کی طبیعت میں ودیعت کیا تھا اگرچہ اکثر نے اس ملکہ کو مقتضائے فطرت کے خلاف استعمال کیا پس ایک ایسے عطیے کو جو قدرت نے عنایت کیا ہے صرف اس وجہ سے کہ اکثر لوگ اس کو فطرت کے خلاف استعمال کرتے ہیں کسی طرح عبث اور بیکار نہیں کہا جا سکتا ہے۔"

دیکھا آپ نے! یہ ہے حالی کا خیال۔ شعر و شاعری کی ضرورت اور اہمیت کے سلسلے میں۔ حالی شعر و شاعری کو قدرت کا عنایت کردہ عطیہ سمجھتے ہیں اسے وہ کسی طرح بے کار اور عبث نہیں سمجھتے لیکن کلیم صاحب نے یہ صاف کہہ دیا کہ حالی شاعری کو غیر ضروری سمجھتے ہیں اور ان پر تہمت بھی لگا دی کہ وہ افلاطون کے ہم خیال ہیں۔ حالی قطعی افلاطون کے ہم خیال نہیں۔ دیکھئے حالی کس طرح افلاطون کو رد کرتے ہیں:

"اگر افلاطون اپنے خیالی کانسٹیٹیوشن سے شاعروں کو جلاوطن کر دینے میں کامیاب ہو جاتا تو وہ ہرگز اخلاق پر احسان نہ کرتا بلکہ اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ ایک سرد مہر، خود غرض اور مروت سے دور ایسی سوسائٹی قائم ہو جاتی جس کا کوئی کام اور کوئی کوشش موقع اور

مصلحت سے محض دل کے ولولہ اور جوش سے نہ ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ تمام دنیا شعرار کا ادب اور تعظیم کرتی ہے جنھوں نے اس خاتم سلیمان کی بدولت جو قوت متخیلہ نے ان کے قبضہ میں دی ہے انسان میں ایسی تحریک اور برانگیختگی پیدا کی ہے جو کہ خود نیکی ہے اور نیکی کی طرف لے جانے والی ہے۔"

حالی کے مذکورہ بالا اقتباس سے کلیم صاحب کے بہت سارے الزامات اور اعتراضات رد ہوجاتے ہیں مثلاً وہ (حالی) افلاطون کے ہم خیال ہیں اور شاعری کو غیر ضروری سمجھتے ہیں" وغیرہ وغیرہ۔

حالی کے نزدیک شاعری کوئی اکتسابی چیز نہیں کہ اسے وہ ضروری یا غیر ضروری سمجھے۔ اسے وہ عطیۂ الٰہی سمجھتے ہیں۔ "دنیا میں ہزاروں بلکہ لاکھوں آدمی ایسے پیدا ہوئے ہیں جن کو قدرت نے اسی کام سے بنایا تھا۔" حالی شعر کا مقصد جذبات کو بھڑکانا قطعی نہیں سمجھتے۔ حالی ان لوگوں کی مذمت کرتے ہیں جو "اس ملکہ کو مقتضائے فطرت کے خلاف استعمال کرتے ہیں" حالی مختلف مثالیں پیش کرکے یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ دنیا کی مختلف قوموں میں شعر کی تاثیر سے دلوں پر فتح حاصل کی گئی ہے لیکن ان کے نزدیک شعر کا اصل مقصد روحانی خوشی حاصل کرنا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

"شعر سے جس طرح نفسانی جذبات کو اشتعال ہوتی ہے اسی طرح روحانی خوشیاں بھی زندہ ہوتی ہیں۔" حالی شعر اور اخلاق کے پیش نظر کہتے ہیں: "شعر کا اثر محض عقل کے ذریعہ نہیں بلکہ زیادہ تر ذہن اور ادراک کے ذریعہ اخلاق پر ہوتا ہے۔ پس ہر قوم اپنے ذہن کی جودت اور ادراک کی بلندی کے موافق شعر سے اخلاق یا فاضلہ کا اکتساب کرسکتی ہے۔"

کلیم صاحب کا کہنا ہے: "شاعری جذبات کی تہذیب و تربیت کرتی ہے انھیں برانگیختہ نہیں کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شاعری کا اثر ہنگامی نہیں بلکہ پائیدار ہوتا ہے اس سے ہماری روحانی اور جسمانی زندگی خوشگوار ہوتی ہے۔" یہ ساری باتیں کلیم صاحب نے حالی سے سیکھی ہیں لیکن تعجب ہے کہ وہ اس حقیقت کا اقرار نہیں کرتے بلکہ حالی پر غلط اعتراض کرتے ہیں۔ حالی نے صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ شاعری کا تعلق انسان کی روحانی اور پاک خوشیوں سے ہے اور اس کا رشتہ قوموں کے اخلاق سے وابستہ ہے۔ حالی کا کہنا ہے کہ شاعری انسان کے اندر نیکی کی تحریک پیدا کرتی ہے۔ وہ شاعری کو باعث "تصفیۂ" نفس اور

تزکیہ باطن" سمجھتے ہیں۔ کیا ان سے جذبات کی تہذیب و تربیت نہیں ہوتی۔ دراصل حالی نے بھی یہ بات کہی ہے کہ شاعری جذبات کو بھڑکاتی نہیں بلکہ یہ ان کی تہذیب و تربیت کرتی ہے۔ کلیم صاحب کا حالی پر اعتراض کہ ان کے خیال میں شاعری محض تفریح طبع کا ذریعہ ہے۔ غلط ہے اور یہ بھی غلط ہے کہ حالی کا معیار مادی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حالی کا معیار مادّی نہیں، اخلاقی اور روحانی ہے۔ جس کے نزدیک شاعری کا معیار روحانی اور اخلاقی ہوگا وہ شاعری کو محض تفریح طبع کا ذریعہ کیسے سمجھے گا؟ حالی کے نزدیک اخلاق اور شاعری اہم موضوع ہے جس کا اعتراف کلیم صاحب بھی کرتے ہیں، لیکن غلط اعتراض کی عادت نے مجبور کیا، کہتے ہیں کہ:

"اس موضوع پر جو خیالات حالی سپرد قلم کرتے ہیں وہ اہم نہیں، ان میں کوئی نیا پن یا گہرائی نہیں۔" لیکن اخلاق کے سلسلے میں خود کلیم صاحب جو باتیں کہتے ہیں ان میں کوئی نیا پن اور گہرائی نہیں ہر شخص جانتا ہے کہ مختلف ملکوں میں اخلاقی معیار مختلف ہوتے ہیں۔ اس میں کون سی جدت اور گہرائی ہے؟ کلیم صاحب اخلاق کے مختلف معنوں کی تفصیل بتانا بھی ضروری نہیں سمجھتے۔ بہر کیف وہ حالی کا ایک مقطع پیش کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ "جس اخلاق کی جھلک حالی کے اس قطعہ میں دکھائی دیتی ہے" اس سے اور شاعری سے کوئی تعلق نہیں":

تم اے خدمت پرستو طبیعت کے بندو ذرا وصف اپنے سنو کان دھر کے
نہیں کام کا تم کو اندازہ ہرگز جدھر ڈھل گئے ہو رہے بس ادھر کے
جو گانے بجانے پر آئی طبیعت تو چیخ اُٹھے دو دن میں ہمسائے گھر کے
جو بیٹھے ہیں بیٹھو تو اُٹھو نہ جب تک کہ اٹھ جائیں سب ایک ایک کر کے
جو کھانا تو بے حد جو پینا تو ات گت غرض یہ کہ سرکار ہیں پیٹ بھر کے

بے اعتدالی کی مذمت اور اعتدال کی تلقین اس قطعہ میں البتہ ہے لیکن شاعری نہیں۔" لیکن حالی کے نزدیک یہی شاعری ہے جس طرح ڈرائیڈن اور پوپ کے نزدیک ان کا کلام شاعری ہے۔ حالی کا وصف یہ ہے کہ انھوں نے نہایت سادہ اور عام فہم الفاظ میں اخلاق اور شاعری کو ہم آہنگ کر دیا ہے۔ حالی، غالب کے شاگرد بھی تھے اور طرفدار بھی لیکن انھوں نے غالب کا آہنگ نہ اپنا کر اپنا ایک الگ لہجہ اختیار کیا۔ تشبیہ و استعارہ سے ماورا سادہ و پُرکار۔ اس قطعہ میں شاعری کی تینوں خوبیاں سادگی، جوش اور اصلیت موجود ہیں۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ شعریت کیفیت کے اظہار کا نام ہے یہ محسوس

کرنے کی چیز ہے۔ یہ کوئی مادی چیز نہیں کہ دکھلائی جاسکے۔ سنتیانا (SANTAYANA) پوپ کی شاعری کو شاعری کا ڈھانچہ کہتا ہے وہ اس میں شعریت محسوس نہیں کرتا لیکن ڈاکٹر جونسن اور اف۔ آر۔ لیوس پوپ کی شاعری کو سراہتے ہیں اور اس میں شعریت بھی محسوس کرتے ہیں۔ کلیم صاحب نے حالی کے مذکورہ قطعہ میں شعریت نہیں محسوس کی تو کوئی ضروری نہیں کہ ہر شخص محسوس نہ کرے۔ سب سے اچھی اور سچی بات ELIZABETH DREW نے اپنی کتاب POETRY میں کہی ہے :

THE HUMAN EAR IS RARIABLE IN ITS RESPONSES AND DIFFERENT READERS HEAR THE POET'S VOICE DIFFERENTLY.

شاعر کا کام محض انگریزی رومانی شعرا کی طرح قدرت کے مناظر، پرندوں اور لڑکیوں پر نظمیں کہنا نہیں ہے بلکہ سچے شعرا زندگی کی اعلیٰ قدروں کو اپنی شاعری میں پیش کرتے ہیں اور حالی اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں۔ حالی اپنے مذکورہ قطعہ میں اخلاق کے ایک پہلو (اعتدال) کا بین الاقوامی خیال پیش کرتے ہیں۔ ناقدین اب اس بات پر متفق ہیں کہ ایک خیال (THOUGHT) بھی شعر کا جامہ اختیار کر سکتا ہے۔

کلیم صاحب کا یہ کہنا بھی غلط ہے کہ: " شاعری ہمیں نجات کا راستہ نہیں دکھاتی، ہمیں نجات کا مستحق بناتی ہے"۔ شاعری ہمیں نجات کا راستہ بھی دکھاتی ہے اور ہمیں اس کا مستحق بھی بناتی ہے۔ جو شخص صراطِ مستقیم پر نہ چلے وہ جنت کا مستحق کیسے بن سکتا ہے؟

حالی، شاعری کو صرف جذبات کی تہذیب و تربیت ہی کا ذریعہ نہیں سمجھتے بلکہ وہ شاعری کی بھی تہذیب و تربیت چاہتے ہیں۔

کلیم صاحب کہتے ہیں : " شعر کی ماہیئت سے بھی وہی بے خبری ہے جو شعر کی اہمیت سے تھی۔ حالی صرف میکالے کا قول نقل کرتے ہیں۔ میکالے کی نقاد کی حیثیت سے کوئی وقعت نہیں۔ اس کے قول کی بھی کوئی خاص اہمیت نہیں۔ میکالے کے خیال میں (اور یہ خیال بھی ارسطو سے ماخوذ ہے) شاعری ایک قسم کی نقالی ہے۔ یہ نقالی فنِ مصوری یا نقاشی کے مقابلہ میں ناکمل ہے ...." وغیرہ وغیرہ۔

ابھی آپ نے دیکھا کہ شعر کی اہمیت کے سلسلے میں کلیم صاحب نے حالی پر کس قدر

غلط اعتراضات کئے تھے۔ ان کا مدلل جواب اوپر دیا جا چکا ہے۔ اب شعری اہمیت کے سلسلے میں کلیم صاحب کے غلط الزامات کا جواب ملاحظہ ہو۔ کلیم صاحب کہتے ہیں میکالے کے خیال میں شاعری ایک قسم کی نقالی ہے اور یہ خیال بھی ارسطو سے ماخوذ ہے اس کے قول کی بھی کوئی خاص اہمیت نہیں۔" گویا کلیم صاحب کے نزدیک ارسطو کے قول (میکالے کا خیال ارسطو کے قول سے ماخوذ ہے) کی بھی کوئی اہمیت نہیں جبکہ ارسطو کے ہی قول پر پوری انگریزی شاعری اور تنقید کی بنیاد رکھی گئی ہے۔

پہلے لفظ نقالی یا نقل کو سمجھ لینا ضروری ہے۔ شاعری کے لئے سب سے پہلے لفظ نقالی یا نقل کو افلاطون نے استعمال کیا وہ نظریۂ تصور (THEORY OF IDEA) کا ماننے والا تھا۔ اس کا کہنا تھا یہ دنیا عالم مثال کی ایک نقل ہے، اس دنیا کی کوئی بھی شے کی اصلیت اس کے تصور میں ہے اور وہ ایک اصل کی نقل ہے۔ شاعر اسی نقل کا اظہار اپنی شاعری کے ذریعہ کرتا ہے یعنی اس کی شاعری نقل کی نقل ہے اور یہی وجہ ہے کہ شاعری حقیقت سے دو چند دور ہو جاتی ہے۔

ارسطو نے افلاطون کے مذکورہ نظریہ کو یہ کہہ کر رد کر دیا کہ شاعری نقل کی نقل نہیں بلکہ زندگی کی نقل ہے ایک شاعر زندگی سے مواد حاصل کرتا ہے اور تخیل کی مدد سے فطرت کی امکانی صورت گری کرتا ہے۔

سڈنی نے سب سے پہلے شاعری کے لئے نقل کے بجائے تخلیق (CREATION) کا لفظ استعمال کیا۔ اس کا کہنا تھا کہ شاعر نقل نہیں کرتا تخلیق کرتا ہے اور ... اسی وقت سے ادبی و شعری کارناموں کے لئے تخلیق کا لفظ استعمال کیا جانے لگا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ انگریزی زبان کا ہر نقاد ارسطو کا خوشہ چیں رہا ہے اور آج تک ہے۔

بہرکیف حالی میکالے کا قول اس لئے نہیں پیش کرتے کہ وہ اسے شاعری کی ماہیت کے لئے ضروری سمجھتے ہیں وہ میکالے کے علاوہ دوسرے مفکرین کے اقوال کی مثالیں بھی دیتے ہیں تاکہ شاعری کے سلسلے میں مختلف لوگوں کے افکار سے بھی آگاہی ہو جائے۔ "مقدمہ شعر و شاعری" کا جس نے بھی سنجیدگی سے مطالعہ کیا ہے وہ جانتا ہے کہ حالی شاعری کو مصوری، بت تراشی اور ناٹک سے بلند مرتبہ عطا کرتے ہیں۔ انھیں کے الفاظ میں "اس کیفیت کا ظاہر کرنا مصوری، بت تراشی اور ناٹک کی دسترس سے باہر ہے۔"

یعنی حالی کے نزدیک شاعری کا فن مصوری، بت تراشی اور ناٹک سے کہیں زیادہ بہتر اور مکمل ہے۔ وہ مزید وضاحت کے لئے کہتے ہیں، "امید ہے ان مثالوں سے شاعر اور غیر شاعر

کے کلام اور نیز شعر اور مصوری میں جو فرق ہے وہ بخوبی ظاہر ہوگیا ہوگا"
شاعری میں کمال حاصل کرنے کے لئے حالی نے تین شرطیں رکھی ہیں۔ تخئیل کائنات کا مطالعہ اور تفحص الفاظ۔
حالی نے تخیل کی جو تعریف کی ہے کلیم صاحب اسے پیش کرتے ہیں اور حالی پر یہ کہہ کر اعتراض کرتے ہیں: " ایک طرف وہ شاعری کو نقالی کہتے ہیں اور دوسری طرف کہتے ہیں کہ تخیل کائنات کو مکرر ترتیب دے کر ایک نئی صورت بخشتا ہے"
ابھی آپ نے دیکھا کہ حالی نے میکالے کے قول کی نفی کی اور شاعری کی اہمیت کو واضح کیا میں نے اُوپر بھی یہ بتلایا ہے کہ شاعرانہ تخلیق کے لئے پہلے لفظ نقل یا نقالی ہی استعمال ہوتا تھا اور اس کے لئے بھی تخیل کی ضرورت پڑتی تھی۔ مثلاً ارسطو نے شاعری کو زندگی کی نقل کہا اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ امکانی صورت گری کے لئے تخیل کی سخت ضرورت ہے۔
ارسطو کہتا ہے کہ شاعری زندگی کی نقل ہے کیونکہ شاعر زندگی سے مواد حاصل کرتا ہے لیکن شاعری محض فطرت کی صورت گری کا نام نہیں کیوں کہ اصل تو ہر وقت ہمارے سامنے ہوتا ہے ہم تخیل کی مدد سے فطرت کی امکانی صورت گری چاہتے ہیں۔ شاعر حیات و کائنات میں ہونے والے واقعات کو ہو بہو نہیں پیش کرتا بلکہ ان سے شاعرانہ وجدان حاصل کرتا ہے اور اپنی متخیلہ قوت کو بروئے کار لاکر جیسا ہونا چاہیئے ویسا پیش کرتا ہے وہ حیات و کائنات کے انھیں پہلوؤں کو پیش کرتا ہے جن کی قدریں ہمیشہ قائم رہنے والی ہیں۔
آپ نے دیکھا ارسطو شاعری کو زندگی کی نقالی کہنے کے باوجود تخیل کو زبردست اہمیت دیتا ہے۔ حالی نے بھی شاعری کے لئے تخیل کی اہمیت کو سمجھا اور انھوں نے اس کی اپنے طور پر بہتر تعریف پیش کی۔
حالی پر کلیم صاحب کا یہ الزام بھی بیکار محض ہے کہ انھوں نے کالرج کی طرح امیجنیشن اور فینسی میں امتیاز نہیں کیا۔ حالی نے کبھی مغرب کی آنکھ بند کرکے نقل نہیں کی انھوں نے ہر معاملے میں اپنی ذاتی رائے پیش کی ہے۔ آج بیسویں صدی میں انگریزی زبان کا بڑے سے بڑا ناقد بھی امیجنیشن اور فینسی میں فرق بتلانا ضروری نہیں سمجھتا۔ مثلاً ایف۔ آر۔ لیوس ' ایلیٹ ' آئی۔ اے رچرڈس ' سنتیانا وغیرہ۔ حالی نے بھی فرق بتانا ضروری نہیں سمجھا۔
بہرکیف کالرج جو اپنے تخیل کے نظریہ کے لئے بہت مشہور ہے اس نے بھی تخیل کو ارسطو

کے ہی ذریعہ سمجھا۔ کالرج نے تخیل کی جو تعریف پیش کی ہے اس کی وضاحت کلیم صاحب ان الفاظ میں کرتے ہیں :

" یہ اجزا کو ترکیب دینے والی اور سحر آفریں طاقت ہے اسی کا کرشمہ ہے کہ متضاد اور غیر متوازن چیزوں میں توازن اور میل کی جلوہ گری ہے ۔ اسی کے فیض سے پرانی اور جانی ہوئی چیزوں میں نیاپن اور شگفتگی کی لہر دوڑ جاتی ہے اور جذبات میں معمول سے زیادہ خروش کے ساتھ زیادہ اسی کا سکون بھی نظر آتا ہے ۔ تیز اور زندہ فہم اور گہرے اور پُرخروش جذبات اور امنگوں پر مستحکم اختیار بھی اسی کی ودیعت ہے ۔ یہی مترنم سرور کا احساس ہے ۔ یہی طاقت کثرت کو وحدت میں تبدیل کر دیتی ہے ۔ یہی متعدد خیالات کو ایک زبردست خیال یا جذبہ کے زیر اثر کرتی ہے اور اسی میں تغیر پیدا کرتی ہے "

اور اب آپ تخیل کے سلسلے میں حالی کی جامع تعریف ملاحظہ کریں :

" سب سے مقدم اور ضروری چیز جو کہ شاعر کو غیر شاعر سے تمیز کرتی ہے ' قوت تخیلہ یا تخیل ہے جس کو انگریزی میں امیجی نیشن کہتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ وہ قوت ہے جو شاعر کو وقت اور زمانہ کی قید سے آزاد کرتی ہے اور ماضی اور استقبال کو اس کے لئے زمانہ حال میں کھینچ لاتی ہے ۔ وہ آدم اور جنت کی سرگزشت حشر و نشر کا بیان اس طرح کرتی ہے کہ گویا اس نے تمام واقعات اپنی آنکھ سے دیکھے ہیں اور ہر شخص اس سے ایسا ہی متاثر ہوتا ہے جیسا کہ ایک واقعی بیان سے ہونا چاہیئے ۔ اس میں یہ طاقت ہوتی ہے کہ وہ جن اور پری ' عنقا اور آب حیواں جیسی فرضی اور معدوم چیزوں کو ایسے معقول اوصاف کے ساتھ متصف کر سکتی ہے کہ ان کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاے ۔

" وہ ایک ایسی قوت ہے کہ معلومات کا ذخیرہ جو تجربہ یا مشاہدہ کے ذریعہ سے ذہن میں پہلے مہیا ہوتا ہے یہ اس کو مکرر ترتیب دے کر ایک نئی صورت بخشتی ہے اور پھر اس کو الفاظ کے ایسے دلکش پیرایہ میں جلوہ گر کرتی ہے جو معمولی پیرایوں سے بالکل یا کسی قدر الگ ہوتا ہے "

حالی کے یہاں تخیل سے متعلق وہ ساری باتیں ہیں جن کا اظہار کالرج نے کیا ہے لیکن حالی کی تعریف بہتر اور جامع ہے ۔ کالرج کی تعریف سے الفاظ اور پیرایہ بیان کو جدت بخشنے کی جھلک نہیں پڑتی حالی نے اپنی تعریف میں اس کی بھی وضاحت کر دی ہے ۔ کہتے ہیں : تخیل کا عمل اور تصرف

جس طرح خیالات میں ہوتا ہے اسی طرح الفاظ میں بھی ہوتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بعض اوقات شاعر کا طریقۂ بیان ایسا نرالا اور عجیب ہوتا ہے کہ غیر شاعر کا ذہن وہاں تک نہیں پہنچ سکتا۔"

کائنات کے مطالعہ اور تفحص الفاظ کے سلسلے میں حالی نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان میں بھی کلیم صاحب نے زبردستی خامی نکالنے کی کوشش کی ہے۔

"کائنات کا مطالعہ میں" عادتاً یہ خامی نکالی۔ "یہ اوصاف شاعر کے لئے ضروری ہیں لیکن حالی نے مطالعہ کو اتنی وسعت دی ہے کہ اس میں تخیل، حافظہ، غور و فکر، قوت حاسہ، ساری چیزیں سما سکتی ہیں۔" اور تفحص الفاظ کے سلسلے میں کلیم صاحب کا یہ کہنا درست نہیں کہ "خیالات اور الفاظ بیک وقت اس کے (شاعر کے) ذہن میں آتے ہیں۔" اس کی وجہ یہ ہے کہ خیالات تو بے ساختہ آتے ہیں لیکن تخلیق کے وقت جو الفاظ ذہن میں آتے ہیں وہ فنی اعتبار سے ادبی زبان کے معیار پر اکثر نہیں اُترتے۔ فنی اور ادب کی معیاری زبان کے لئے موزوں الفاظ کا انتخاب، محنت اور مشقت کے بعد کرنا پڑتا ہے۔ اسی لئے حالی نے معنی سے زیادہ الفاظ کے انتخاب پر زور دیا اور کہا:

"شاعر کا مدار جس قدر الفاظ پر ہے اسی قدر معانی پر نہیں۔ معنی کیسے ہی بلند اور لطیف ہوں اگر عمدہ الفاظ میں بیان نہ کئے جائیں گے تو ہرگز دلوں میں گھر نہیں کرسکتے اور ایک مبتذل مضمون پاکیزہ الفاظ میں ادا ہونے سے قابلِ تحسین ہو جاتا ہے۔"

مذکورہ تحریر سے حالی کی مراد یہ ہے کہ شاعری کے لئے الفاظ کے انتخاب پر خیال زور دینا چاہیئے اس پر اعتراض بیکار محض ہے۔ حالی خود کہتے ہیں۔ "شعر کی ترتیب کے وقت اوّل مناسب الفاظ کا انتخاب اور پھر ان کو ایسے طور پر ترتیب دینا کہ شعر سے معنی مقصود کے سمجھنے میں مخاطب کو کچھ تردد باقی نہ رہے اور خیال کی تصویر ہو بہو آنکھوں کے سامنے پھر جائے اور باوجود اس کے اس ترتیب میں ایک جادو مخفی ہو جو مخاطب کو مسخر کرلے اس مرحلہ کا طے کرنا جس قدر دشوار ہے اسی قدر ضروری بھی ہے کیونکہ اگر شعر میں یہ بات نہیں ہے تو اس کے کہنے سے نہ کہنا بہتر ہے لیکن شاعر اگر زبان کے ضروری حصہ پر حاوی نہیں ہے اور ترتیب شعر کے وقت صبر و استقلال کے ساتھ الفاظ کا تتبع اور تفحص نہیں تو محض قوت متخیلہ کچھ کام نہیں کرسکتی۔"

"حالی نے ان خصوصیات کا ذکر بھی ضروری سمجھا جو تمام مقبول شاعروں میں پائی

جاتی ہے اور انھوں نے ملٹن کے حوالے سے یوں بیان کیا : " شعر کی خوبی یہ ہے کہ وہ سادہ ہو، جوش سے بھرا ہوا ہو اور اصلیت پر مبنی ہو۔"

ملٹن نے یوں کہا تھا:

'POETRY SHOULD BE ' SIMPLE, SENSUOUS AND PASSIONATE.'

حسبِ دستور حالی نے تینوں لفظوں پر مختلف لوگوں کی آراء کو پیش کیا اور تینوں لفظوں کی اپنے طور پر جامع تعریف پیش کی۔ حالی خود کہتے ہیں : " ملٹن کی تینوں شرطوں کی شرح اگرچہ کسی قدر اوپر بیان ہو چکی ہے لیکن ہمارے نزدیک ابھی اس میں کسی قدر اور تشریح کی ضرورت ہے۔"

سادگی : سادگی کا معیار یہ ہونا چاہیئے کہ خیال کیسا ہی بلند اور دقیق ہو مگر پیچیدہ اور ناہموار نہ ہو اور الفاظ جہاں تک ممکن ہو محاورے اور روزمرہ کی بول چال کے قریب قریب ہوں جس قدر شعر کی ترکیب معمولی بول چال سے بعید ہو گی اسی قدر سادگی کے زیور سے معطل سمجھی جائے گی۔"

حالی نے اپنی شاعری کی بنیاد شعر کی اسی تعریف پر رکھی خواہ غزل ہو یا نظم، ملٹن نے اپنی شاعری میں سادگی سے انحراف کیا تو یہ اس کا قصور ہوا نہ کہ حالی کا۔ ملٹن نے اپنی شاعری کو LETINISM IN SYNTAX اور (INVERSION) کی کثرت سے ناہموار اور گنجلک کر دیا جس کے سبب بہت سے ناقدین کا کہنا ہے کہ اس نے انگریزی زبان کو خراب (CORRUPT) کر دیا ہے اور وحشی بنا دیا ہے BARBARIZED THE LANGUAGE

کلیم صاحب کا اعتراض ہے کہ " حالی کی سادگی کی تعریف سے غالب، اقبال اور شیکسپیئر کے کلام کا حصہ خارج ہو جائے گا۔" میں نے پہلے بھی کہا ہے اور پھر کہنا پڑ رہا ہے کہ کلیم صاحب اکثر لفظوں کے غلط معنی بیان کرتے ہیں، حالی نے پہلے ہی کہہ دیا تھا، " سادگی ایک اضافی امر ہے۔" دوم وہ کہتے ہیں : " خیال کیسا ہی بلند اور دقیق کیوں نہ ہو مگر پیچیدہ اور ناہموار نہ ہو۔" غالب، اقبال اور شیکسپیئر کا کلام بلند اور دقیق ضرور ہے مگر پیچیدہ اور ناہموار نہیں۔ میں یہاں دقیق اور پیچیدہ کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں۔ دقیق اور پیچیدہ دونوں مترادف الفاظ ہیں اور دونوں کے معنی مشکل ہیں لیکن پیچیدہ کا ایک اور معنی ہے " الجھا ہوا " یا " گنجلک "۔

الی نے یہاں لفظ "پیچیدہ" اسی معنی میں استعمال کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ خیال بلند اور دقیق اور پُر زور ہو لیکن گنجلک اور ناہموار نہ ہو۔ ملٹن کا سارا کلام گنجلک اور ناہموار ہے اور روزمرّہ کی بول چال سے بعید ہے۔

حالی نے لفظ جوش کی تعریف میں جو کچھ کہا ہے اُن سے پہلے نہ کسی نے کہا تھا اور نہ اب تک کسی نے اضافہ کیا ہے۔

جوش : جوش سے یہ مُراد ہے کہ مضمون ایسا بے ساختہ الفاظ اور مؤثر پیرایہ میں بیان کیا جائے جس سے معلوم ہو کہ شاعر نے اپنے ارادے سے یہ مضمون نہیں باندھا بلکہ خود مضمون نے شاعر کو مجبور کر کے اپنے تئیں بندھوایا ہے۔ جوش سے مُراد یہ نہیں کہ مضمون خواہ مخواہ نہایت زوردار اور جوشیلے لفظوں میں ادا کیا جائے۔ ممکن ہے کہ الفاظ نرم، ملائم اور دھیمے ہوں مگر ان میں غایت درجہ کا جوش چھپا ہوا ہے۔"

اور (SENSUONS) کے لئے حالی نے اصلیت کا لفظ استعمال کیا ہے اور اس کی تعریف یوں کی ہے :

"اصلیت پر مبنی ہونے سے یہ مراد ہے کہ ہر شعر کا مضمون حقیقت نفس الامر پر مبنی ہونا چاہیئے بلکہ یہ مُراد ہے کہ جس بات پر شعر کی بنیاد رکھی گئی ہے وہ نفس الامر میں یا لوگوں کے عقیدہ میں یا محض شاعر کے عندیہ میں فی الواقع موجود ہے نیز اصلیت پر مبنی ہونے سے یہ بھی مقصود نہیں ہے کہ بیان میں اصلیت سے سرمو تجاوز نہ ہو بلکہ یہ مطلب ہے کہ زیادہ تر اصلیت ہونی ضروری ہے۔"

کلیم صاحب کا اعتراض یہ ہے کہ ملٹن نے اپنے مقولہ میں لفظ SENSUONS استعمال کیا ہے اور اس لفظ کا مفہوم اصلیت سے ادا نہیں ہوتا! اپنی حالیہ تصنیف "میری تنقید ایک بازدید" میں لکھتے ہیں کہ حالی پر SENSUONS کے معنی واضح نہیں تھے، کیوں کہ حالی نے SENSUONS کا ترجمہ بجائے حسی یا احساساتی کے اصلیت کیا ہے۔

اور میں کہوں گا کہ حالی نے SENSUONS کا لفظی ترجمہ نہیں کیا ہے کیوں کہ ان کے نزدیک "کسی قدر اور تشریح کی ضرورت ہے۔" لفظ اصلیت سے حالی کی مُراد یہ ہے کہ شاعری صرف حسی یا احساساتی ہی نہیں۔ حسیاتی تو SENSUONS کا صرف ایک پہلو ہے۔ SENSUONS کا تعلق حس (SENSE) سے ہے اور شاعری میں اصلیت پیدا کرنے کے لئے (SENSE) کے علاوہ تخیل اور

جذبہ کی کارفرمائی بھی ضروری ہے کسی نے بالکل درست کہا ہے :

'SENSE, PASSION AND IMAGINATION ARE THE AVENUES BY WHICH IT SEEKS TO ATTAIN TRUTH

اور شاعری میں جب تک اصلیت کا رنگ نہ ہو وہ موثر ثابت نہیں ہو سکتی۔ ڈاکٹر جانسن نے بھی شاعری میں اصلیت پر زور دیا ہے :

'POETRY IS THE ART OF UNITING PLEASURE WITH TRUTH BY CALLING IMAGINATION TO THE HELP OF REASON.'

شاعری میں اصلیت کا رنگ بھرنے کے لئے تخیل کی سخت ضرورت ہے ملٹن کے لفظ SENSUOUS میں تخیل شامل نہیں لیکن حالی کے لفظ اصلیت میں جس کے ساتھ تخییل اور جذبہ بھی شامل ہے دنیا کے تقریباً سارے ناقدین ارسطو سے حالی تک شاعری کے لئے تخیل کی اہمیت پر زور دیتے رہے ہیں مگر ملٹن اس حقیقت سے آگاہ نہیں تھا۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ حالی ملٹن سے کہیں بہتر شاعری کے نبض شناس ہیں۔

دنیا کے تین بڑے ناقدین ارسطو، لاؤن جائنس اور کالرج کے ساتھ اگر چوتھے نام کا اضافہ کیا جائے تو وہ نام حالی کا ہوگا لیکن ترتیب یوں ہوں گی ارسطو، حالی، لاؤن جائنس اور کالرج۔ اس کی وجہ یہ ہے حالی کے مقدمہ شعر و شاعری میں لاؤن جائنس کی ON THE SUBLIME اور کالرج کی BIOGRAPHIA LITERARIE سے زیادہ کام کی باتیں ہیں اور سب سے بڑھ کر حالی کی تصنیف "یادگارِ غالب" کا کوئی مطلب نہیں۔ اس میں اور ان کی ایک اور تصنیف "حیاتِ سعدی" میں مروجہ تنقید کی ساری قسموں کے نمونے مل جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ عملی تنقید کے بھی۔ لاؤن جائنس اور کالرج کے یہاں ان کے نمونے شاذ و نادر ہی ملیں گے۔

خیالات اپنے، واقفیت وسیع، نظر رفیع، فہم و ادراک غیر معمولی، غور و فکر بے پایاں، تمیز اعلیٰ، دماغ بلند، یہ ہے حالی کی شخصیت اور کائنات۔

طالب خوندمیری

کھٹملوں کی فریاد

ایک دن اِک جونک سے کچھ کھٹملوں نے یہ کہا
دیجئے خالہ ہمیں بھی کوئی ایسا مشورہ
اب بجائے خون کوئی اور ہی شے پی سکیں
آدمی سے دور رہ کر ہم خوشی سے جی سکیں
کیوں کہ اس میں خون اب کم کم ہی پایا جائے ہے
اب نہ چوسا جائے اسکو نہ چاٹا جائے ہے
اس کی شریانوں میں یوں تو خون ملتا ہی نہیں
مِل بھی جاتا ہے تو اس میں ذائقہ کچھ بھی نہیں
کون جانے کیا بلا کھانے لگا ہے آدمی
کِس ملاوٹ کی غذا کھانے لگا ہے آدمی
ہم جو پیتے ہیں اُسے خوں ماننا بیکار ہے
کیوں کہ اس کا رنگ بھی پہچاننا دشوار ہے
اس میں سرخی سے زیادہ ہے سفیدی آجکل
خوں کی صورت ہو گئی ہے دودھ کی سی آجکل
اک زمانہ تھا کہ ہم نے خوں کے دریا بھی پیئے
آج گھنٹوں چوستے ہیں ایک قطرے کے لئے
کیا کہیں خالہ ہماری پیاس بجھتی ہی نہیں
اس سے پہلے یہ گرانی خون کی تھی ہی نہیں

•

اب حسینوں کی رگوں میں بھی لہو باقی نہیں
ان کی محفل میں بھی کوئی خوں بھرا ساقی نہیں
پہلے اُن کا خوں ہوا کرتا تھا مانندِ شراب
یوں مہکتا تھا رگوں میں جیسے گلشن میں گلاب
چوستے ہی ان کو اپنا بھی نکھرتا تھا شباب
اک نئی کروٹ بدلتا تھا بدن میں اضطراب
بوئے خوں سے مست ہو کر جھومنے لگتے تھے ہم
اپنی اپنی کھٹمنی کو چومنے لگتے تھے ہم

•

ہو گئے ہیں آج کل وہ نوجواں بھی بدمزہ
جن کی شریانوں میں بہتی تھی کبھی جوئے طلاء
جن کا خوں پیتے ہی اکثر موج میں آتے تھے ہم
منہ لگاتے ہی جنہیں سرشار ہو جاتے تھے ہم
اب انھیں کو چوس کر بیمار پڑ جاتے ہیں ہم
سوکھ جاتے ہیں، سکڑ جاتے ہیں، سڑ جاتے ہیں ہم
اب کہاں تک ہم کریں اپنے غموں کا تذکرہ
کچھ دنوں پہلے ہمارے ساتھ ایسا بھی ہوا

(صف یہ)

پھوٹ نکلی تھی ہمارے جسم سے گانجے کی بُو
پی لیا تھا بھول کر ہم نے جو ہپّی کا لہُو
کیا کہیں کیا کیا بلاؔ کیا قہر اُن کے خوں میں ہے
ٹِک ٹوئنٹی سے زیادہ زہر ان کے خوں میں ہے
اپنی ساری چاشنی کھونے لگا ہے آدمی
ہائے کتنا بے مزا ہونے لگا ہے آدمی
آپ ہی کہیئے کہ اب خالص لہو پائیں گے کیا
آدمی کے ساتھ رہ کر ہم نہ مرجائیں گے کیا
سُن چکی جب کھٹملوں کی داستانِ تشنگی
اک ادائے خونچکاں سے جونک یہ کہنے لگی
آج تک تم نے پیا ہے صرف جنتا کا لہُو
اب ذرا پی کر تو دیکھو ایک نیتا کا لہُو
اب تو میرا بھی گزارا ہے انہیں کے خون پر
کیا بتاؤں میں کہ اس میں ذائقہ ہے کس قدر
ان کا خوں پی کر بہت مخمور ہو جاتی ہوں میں
عام جونکوں کے غموں سے دور ہو جاتی ہوں میں
منہ لگاتے ہی انھیں چالاک ہو جاتی ہوں میں
بے ضرورت ہی سہی بے باک ہو جاتی ہوں میں
ان کی ہر شریان ہوتی ہے خزانہ خون کا
ایک ایک نیتا ہے گویا کارخانہ خون کا
ایک بھی قطرہ کسی نیتا کا جو پا جائے گا
اسکو جنتا کے لہو کا بھی مزا آ جائے گا

مردم شماری کا مسلمان

محمد یوسف پاپا

میں مسلمان ہوں
میرے باپ کا نام
نور احمد فقہی
اور ماں
شاہدہ پروین بانو
میں بھی ہوں رکن الدین
عید آئے تو سوئیاں لازم
کوئی مرجائے تو اعزاز کے ساتھ
اس کو کر دیتے ہیں دفن
میری اردو میرے ہونٹوں سے بڑی رنگین ہے۔
میر و اقبال مرے ہیرو ہیں
رسم ختنہ مرے ایمان کا جز
گوشت خوری ہے عقیدہ
لیکن
ذکر اللہ و رسول
ایسی باتوں کو سمجھتا ہوں فضول
میرے نزدیک یہ قرآن و حدیث
چند بوسیدہ کتابوں کے سوا کچھ بھی نہیں
پھر بھی قائد ہوں مسلمانوں کا
میرے سینے میں ہے اسلام کی روح

میری لڑکی نہیں پابند نکاح
کسی قاضی کسی ملا کا وہ احسان کیوں لے

میرا داماد کسی دھرم کا پابند نہیں
میرے نزدیک زنا عین ثواب
میرے زیور ہیں دغا، جھوٹ، شراب
عربی نام کے بل بوتے پر
مجتہد کا مجھے رتبہ ہے ملا
تاکہ احکام شریعت کو بدلنے کے لئے
نام جن کے مجھے معلوم نہیں
میرا ہر حرف ہو حرفِ آخر

یوں تو اسلام کا دشمن ہوں میں
کس کی جرأت ہے کہ منکر ہو مرا
چاہتا ہوں کہ عقیدہ و عمل کے بدلے
صرف کلچر کو بنا دو اسلام
وہی کلچر جو کبھی ترکی و فارس سے یہاں آیا تھا
جس کا بھارت سے کوئی میل نہیں
آج تک بس وہی ایمان ہے مرا
اسی کلچر کو بچانے کے لئے
میں مسلمان بنا رہتا ہوں
اس طرح لیڈری اب تک مجھے مل جاتی ہے
تاکہ اسلام کی جڑ کھود سکوں
گر اجازت ہو تو یہ سچ کہہ دوں
صرف سنسس (CENSUS) کا مسلمان ہوں میں

ڈاکٹر محمد افضل اللہ (علیگڑھ)

فیروز بیدری

قادریہ سلسلہ کا ایک بزرگ شاعر

بہمنی سلطنت کے زوال کے بعد بیدر پر برید شاہیوں کا قبضہ ہوگیا تھا۔ اگرچہ برید شاہیوں کی حکومت گیارھویں صدی ہجری کے ربع اول (سترھویں صدی عیسوی کے عشرۂ ثانی) تک قایم رہی تھی لیکن کسی زمانے میں بھی ان کو اطمینان کلی نصیب نہیں ہو سکا اور وہ علم و دانش اور مذہب و معاشرت کے معاملوں کی کما حقہٗ سرپرستی نہ کر سکے۔ برید شاہیوں کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ ناموافق حالات کے باوجود انھوں نے اپنے علاقے میں علوم و فنون اور تہذیب کے فطری ارتقا میں کسی طرح خلل نہیں پڑنے دیا۔

۹۴۹ھ مطابق ۱۵۴۲ء میں علی برید اول تخت نشین ہوا۔ اس کے زمانے میں ہمسایہ ریاستوں میں شیعت کا زور بہت بڑھ گیا تھا۔ لیکن برید شاہی سلاطین اپنے عقیدے پر قایم رہے مذہبی اختلاف کی وجہ سے بیدر ہمسایہ سلطنتوں کی طرف سے ہمیشہ حملوں اور جنگی آویزشوں کا نشانہ بنا رہا۔ شاہ طاہر جو احمد نگر اور بیجاپور میں چھایا ہوا تھا بیدر بھی آیا۔ اس نے یہاں بھی مذہبی بحثوں کا سلسلہ شروع کرنا چاہا لیکن علی برید کے چچا خاں جہاں کی وجہ سے اسے ناکام احمد نگر جانا پڑا۔ احمد نگر کا بادشاہ برہان نظام شاہ اس کے بہت زیادہ زیر اثر تھا۔ اس نے شاہ طاہر ہی کی وجہ سے شیعہ مذہب اختیار کیا تھا۔ شاہ طاہر کے کہنے سے اس نے بیدر پر حملہ کرکے علی برید کے ملک کو بہت تباہ کیا اور اس کی فوجی طاقت کو بھی بہت نقصان پہنچایا۔ علی برید کی کمزوری کی وجہ سے بیجاپور والوں کے بھی حوصلے بلند ہوئے۔ علی عادل شاہ کے مطالبے پر علی برید کو اپنے دو خواجہ سراوں کو بیجاپور بھیجنا پڑا تھا۔ ۹۸۷ھ مطابق ۱۵۷۹ء میں علی برید اللہ کو پیارا ہوا۔ اس کے بعد اس کے خواجہ سراؤں میں سے بڑے نے موقع دیکھ کر علی عادل شاہ کا کام تمام کردیا۔ اس طرح دو شنبہ

۲۴ صفر ۹۸۸ھ مطابق اپریل ۱۵۸۰ء کو علی عادل شاہ راہیٔ عدم ہوا۔
تاریخ کہی گئی کہ ــــ ظلم دید
۹۸۸

علی برید کے وقت میں کہ جب مہدویت اور شخصیت کے اثرات گرد و نواح میں تیزی سے پھیلتے جا رہے تھے، خصوصیت کے ساتھ بیدر کے علاقہ میں سُنّی عقاید کو عوام میں باقی اور جاری رکھنے کے لئے جد و جہد ضرور کی گئی ہوگی۔ اس جد و جہد کو براہِ راست اور بالواسطہ طور پر شاہی سرپرستی بھی حاصل تھی۔ یہ بھی یقینی ہے کہ اسی جد و جہد کے نتیجے میں وہاں پر مذہبی موضوعات سے متعلق بعض طویل اور مختصر تصانیف وجود میں آئی ہوں گی لیکن جیسا کہ ہوتا آیا ہے سلطنت بریدیہ کے زوال کے بعد اسی علاقے کے تمدنی اور معاشرتی ہی نہیں علمی اور شعری آثار بھی یا تو عمداً مٹا دئیے گئے یا دستبردِ زمانہ سے رفتہ رفتہ وہ از خود ضائع ہوگئے۔ البتہ اختلافِ مذہب کے باوجود گولکنڈہ والوں کے ساتھ اہلِ بیدر کے جو روابط تھے ان کے نتیجہ میں گولکنڈہ کے قدیم ادبی سرمائے کے ساتھ بیدر کے بعض قدیم آثار بھی کہیں کہیں مل جاتے ہیں۔

بیدر بہمنی سلاطین کے وقت سے پایہ تخت رہا تھا۔ عہد بہمنی کے اہم ترین واقعات میں سے ایک مفتی غلام سرور لاہوری کے لفظوں میں اس طرح ہے :

" صاحب تواریخ فرشتہ میفرماید کہ چوں فیروز شاہ بہمنی در حق احمد خانخاناں ارادۂ بدکرد و خواست کہ چشمش کور کند و او از ارادۂ شاہ آگاہ شد و لشکر بمقابلۂ شاہ آراست ..... در عین موقع جنگ در خواب دید کہ شخصے بصورت و سیرت نیکو آمدہ، تاج دوازدہ ترکی برنگ سبز بر سرِ وے نہاد و ببادشاہی دکھن بشارت داد و وے در ہماں ایام بجائے فیروز شاہ بادشاہ شد۔ بعد چندے چوں آوازۂ مشیخت شاہ نعمت اللہ عالمگیر شد احمد شاہ شیخ حبیب اللہ جنیدی را با تحفہ ہائے بسیار بخدمت آنجناب فرستاد.... شیخ ہدایائے بادشاہ قبول کرد و تاج سبز دوازدہ ترکی باتفاق شیخ قطب الدین خلیفہ و شاہ نور اللہ.... نزد احمد شاہ فرستاد۔ احمد شاہ فی الفور بشناخت کہ ایں ہماں شیخ است کہ در خواب تاج سبز بر سر من نہاد و ایں ہماں تاج است، اعزاز شاہ نور اللہ کرد و دختر خود بوے داد۔ وفات شاہ نعمت اللہ بقول صاحب تواریخ فرشتہ در سال ہشتصد و سی و چار است "

(خزینۃ الاصفیا ص۱۱)

اس طرح شاہ نعمت اللہ وہ پہلے بزرگ ہیں جن کے واسطے سے ہندستان کے کسی علاقے

میں سلسلۂ قادریہ کا فیض جاری ہوا۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ہندستان میں سبز شملہ کو سلسلۂ قادریہ کی علامت خیال کیا جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ احمد شاہ بہمنی کے وقت سے شاہ نعمت اللہ صاحب کے احترام اور ان کے ساتھ عقیدت کے اظہار کے لئے بارہ گوشوں کی ٹوپی کا چلن ہوا۔ زمانۂ مابعد میں غالباً شیعت کے اثر سے سبز کے بجائے سرخ رنگ کی ٹوپی سپاہ کے لئے رائج ہوئی۔

حضرت عبدالقادر جیلانی کا سالِ ولادت ۴۷۱ھ مطابق ۱۰۷۹ء اور سالِ رحلت ۵۶۲ھ مطابق ۱۱۶۷ء مانا گیا ہے۔ ددھیال کی طرف سے آپ حسنی اور ننھیال کے تعلق سے حسینی تھے۔ اس بناء پر آپ کے سلسلے میں حضرات پنجتن پاک یعنی محمدؐ، فاطمہؓ، علیؓ، حسنؓ اور حسینؓ سے ساتھ عقیدت کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ یہ بھی ایک سبب ہے کہ بیدر کے علاقے میں شیعت کے سیلاب کو روک لینے میں قادریہ سلسلہ کے بزرگ کامیاب ہوگئے۔ بعد میں جب بریدشاہیوں کی ترکی تمام ہوئی اور بیدر کا علاقہ ٹکڑے ٹکڑے ہوکر ایسی سلطنتوں میں ضم ہوگیا جن میں شیعت کو سرکاری مذہب کی حیثیت حاصل تھی تو ان بدلے ہوئے حالات میں پنجتن پاکؑ کے ساتھ عقیدت نے مفاہمت کا راستہ نکال دیا اور قادریہ سلسلے کے بزرگ اپنے عقائد کی تبلیغ و اشاعت کے کام میں حسب سابق کامیابی کے ساتھ مصروف رہے۔

متعین طور پر یہ کہنا مشکل ہے کہ بیدر میں سلسلۂ قادریہ کے کس بزرگ نے سب سے پہلے اقامت اختیار کی تھی۔ مفتی غلام سرور نے اپنے تذکرے میں ایک بزرگ مخدوم جیؒ کے بارے میں لکھا ہے کہ:

"مخدوم جی قادری قدس سرہ، صاحب اخبار الاخیار میفرماید کہ وے بزرگے در شہر بیدر کہ در دیار دکھن است سکونت داشت۔ بزرگے عابد و زاہد و مشن و متبرک و عالی ہمت بود۔ بادنیا و اہل دنیا کارے نداشت۔ شیخ عبدالوہاب متقی میفرمود کہ ویرا از غایت کبرسنی و ضعف طاقتِ نشست و برخاست ہم بنود اما آواز راہ بلند ہمتی تا نصف شب در نوافل ایستادے وبعد نماز تہجد تا فجر در یک اجلاس ختم قرآن کردے۔ آخر در سال نہصد و ہفتاد و سہ ہجری ازیں دار پُر ملال بقرب ایزد متعال پیوست"

(خزینۃ الاصفیا ص۱۲۶)

مخدوم جی قادریؒ کے بارے میں مزید کوئی اہم اطلاع نہیں مل سکی البتہ تذکرہ اولیائے دکن

کے حوالے سے پروفیسر نذیر احمد نے اتنا اضافہ کیا ہے کہ :

" مخدوم جی مخدوم جیو بھی کہلاتے تھے۔ ان کا اصلی نام شیخ محمد ابراہیم تھا۔ ان کے والد محترم بڑے درجے کے عارف و بزرگ تھے۔ جن کا نام شیخ محمد ملتانی اپنے عہد میں نہایت با اثر شخصیت کے مالک تھے گولکنڈہ باوجود اختلاف مشرب و مذہب ان کا اور ان کی اولاد کا بڑا احترام رکھتے تھے۔ مولانا کا قیام بیدر ہی میں تھا اور وہیں ۹۴۰ھ (مطابق ۳۴-۱۵۳۳ء) میں انتقال فرمایا .... تذکرہ اولیائے دکن میں ..... لکھا ہے کہ (مخدوم جی) بیدر ہی میں مدفون ہیں۔

(اردو ادب جون ۱۹۵۷ء)

بظاہر مخدوم جی اپنے والد کی وفات (۹۴۰ھ مطابق ۳۴-۱۵۳۳ء) کے بعد ان کے سجادہ پر بیٹھے تھے اور اسی زمانے سے انھوں نے لوگوں کو مرید بنانا شروع کیا ہوگا۔

مخدوم جی قادری کے مریدوں میں قطب الدین نامی ایک شخص ہوا جو زبان ہندوی میں شعر کہتا تھا۔ فیروز اس کا تخلص تھا۔ تا حال اس کی صرف ایک منظوم تصنیف دستیاب ہوسکی ہے جس کا نام پرت نامہ ہے۔ اس کتاب کو پہلی بار متعارف کرانے کا سہرا پروفیسر سید محی الدین قادری زور کے سر ہے۔

پرت نامے کا پورا متن پروفیسر نذیر احمد نے ایک مختصر سے مقدمے کے ساتھ سہ ماہی اردو ادب علیگڈھ کے جون ۱۹۵۷ء کے شمارے میں پہلی مرتبہ شائع کیا تھا۔ ان کو پرت نامے کا جو نسخہ دستیاب ہوا تھا اس کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے :

"پرت نامے کا موجودہ نسخہ انجمن ترقی اردو کے کتب خانے میں موجود ہے۔ اس میں کل سات ورق ہیں۔ ہر صفحہ میں نو بیت ہیں۔ نسخہ کا سائز ۸ ۱/۸" × ۵" ہے.... کاتب بدخط اور کم سواد ہے اس لئے املا کی غلطیاں بھی جا بجا موجود ہیں۔" (اردو ادب جون ۱۹۵۷ء ص ۹۶)

اس نسخہ پر کتاب کا نام اس طرح تحریر ہے :

" ایں پرت نامۂ حضرت محی الدین عبدالقادر جیلانی "

نسخہ کا سال کتابت معلوم نہیں ہے۔ شاعر نے شعروں کی تعداد اس طرح نظم کیا ہے ؎

صد و بیت و یک جب کیا بیت ہیں دو جگ مرج کی مار یا سیت ہیں

لیکن نسخہ میں صرف ایک سو بیس شعر ہیں۔ ایک شعر شاید نقل ہونے سے رہ گیا ہے۔ ڈاکٹر زور صاحب نے پرتاب نامے کے جس نسخے کا تعارف کرایا تھا وہ ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد میں محفوظ ہے اور وہ ناقص الآخر ہے۔ اس میں کل ایک سو دو شعر ہیں۔ اس میں کتاب کا نام :

"توصیف نامۂ میراں محی الدین"

لکھا ہے۔ بعد میں ڈاکٹر محمد اکبرالدین صدیقی صاحب کو بھی پرت نامے کا ایک ورق دستیاب ہوا لیکن اس سے بھی پرت نامے کا ایک گمشدہ شعر نہیں مل سکا اس طرح اب تک اسی نظم کے کل ایک سو بیس شعر ہی مل سکے ہیں۔ پرت نامہ میں اپنا تعارف کراتے ہوئے شاعر نے کہا ہے ؎

مجھے ناؤں ہے قطب دیں قادری تخلص سو فیروز ہے بیدری

یعنی میرا نام قطب دین یا قطب الدین ہے۔ میں قادری ہوں۔ میرا تخلص فیروز ہے اور میں بیدری ہوں شاعر نے اس نظم میں جتنے بھی اسما نظم کیے ہیں ان میں عربی ترکیب کے "ال" کو حذف کر کے اس کے بجائے فارسی طریقے کے مطابق اضافت دی ہے چنانچہ

محی الدین کو محی دین

قطب الاقطاب کو قطبِ اقطاب

اور غوث الاعظم کو غوثِ اعظم وغیرہ

نظم کیا ہے۔ بیدر میں یہ طریقہ عام معلوم ہوتا ہے چنانچہ فیروز سے پہلے نظامی نے بھی اپنا نام فخرالدین کے بجائے فخر دین ہی نظم کیا تھا۔

جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے پرت نامہ کی تصنیف سے شاعر کو اپنے مرشد سے عقیدت کا اظہار کرنا مقصود تھا۔ اس نے اپنے مرشد کو محی الدین ثانی کہا ہے۔ اور ان کا نام ابراہیم مخدوم جی بتایا ہے۔ ؎

براہیم مخدوم جی جیونا مے صرف وحدت سدا پیونا

بظاہر محی الدین ثانی کہنے کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ فیروز کے خیال میں ایسے وقت میں جب شیعت کا زور ہر طرف بڑھ رہا تھا اس کے مرشد نے سنّی عقیدے کی عام اشاعت کر کے گویا اس دین کو زندہ کر دیا تھا۔ مرشد کی اسی قدر جوش کے ساتھ ستائش غالباً بیعت کرنے کے فوراً بعد کی ہوگی اور اس کا زمانہ یقینی طور سے ۹۷۳ھ مطابق ۶۶-۱۵۶۵ء سے پہلے کا ہے۔ فیروز کے مذکورہ شعر سے پرت نامے کی تصنیف کے وقت مخدوم جی کا زندہ وموجود ہونا ثابت ہے۔ پرت نامے کے بارے میں پروفیسر نذیر احمد کا کہنا ہے کہ:

"یہ بات بلا تامل کہی جاسکتی ہے کہ یہ نظم اتنی بلند پایہ نہیں کہ جس کی بنا پر وہ استاد الشعرا کہلانے کا مستحق قرار پائے۔" (اردو ادب، جون ۵۸ء ص ۹۴)

اسی بنا پر یہ خیال کیا جاسکتا ہے کہ فیروز اوائلِ عمر میں مخدوم جی کا مرید ہوگیا تھا اور اس وقت اس کی شاعری بھی ابتدائی مدارج میں تھی۔

فیروز نے اپنے بارے میں یہ اطلاع بھی دی ہے کہ وہ نسبتاً سید تھا کہتا ہے ؎

جو تیری نظر مجھ پہ یکبار ہوئے — کہ سب خاک میری سو زنگار ہوئے

محب خانداں کا توں اخلاص سوں — کہ سادات کا دوست ہے خاص توں

یعنی وہ اپنے خاندانی (نسبی) تعلق کی بنیاد پر اپنے مرشد سے عنایت کا طالب ہے۔ اس بناء پر غالباً یہ نتیجہ نکالنا بیجا نہ ہوگا کہ فیروز اور اس کے مرشد مخدوم جی کے مابین خاندانی تعلق بھی تھا۔ بخوبی ممکن ہے کہ مرشد کی وفات کے بعد وہی ان کی جگہ سجادہ نشین ہوا ہو اور اس نے خود رشد و ہدایت کے سلسلہ کو جاری رکھا ہو۔

فیروز کے مریدوں میں سے اب تک صرف ایک شخص کا پتہ چل سکا ہے جس کا نام پیار محمد بن عیسا خاں تھا اور جو قریشی تخلص کرتا تھا۔ قریشی نے اپنے مرشد فیروز کی اتباع میں ایک نظم لکھی تھی جس کا عنوان اس طرح تحریر ہے

ولایت نامہ بہ زبانِ ہندوی گفتہ شد

اس نظم میں قریشی نے اپنے مرشد سے عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے ؎

اللہ کی ہے نظر پیراں مدت گیر جھرادیا بیل مڑے قطب دیں پیر

مدد گار چڑھادیں منڈوے

اس میں قطب الدین کو صریحاً "پیر" کہا گیا ہے چنانچہ اس کی اس حیثیت میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔

قریشی نے اس نظم میں یہ شعر بھی کہتے ہیں ؎

قطب دیں اولیا ہے شاہ غازی — جنھوں کے دین و دنیاں بخشش بازی

ہو وہی ہمیں مدت تل تل گھڑی مانجھ — کریں شہ دستگیری صبح ہور سانجھ

یعنی اس کے نزدیک قطب الدین کا شمار اولیا اور غازیوں میں کیا جانا درست تھا۔ ایک اور شعر میں بھی اس نے غازی کا لفظ استعمال کیا ہے ؎

مراداتِ جہاں حاصل بگرداں — بحق غازیاں شاہِ مرداں

امکان اس بات کا ہو سکتا ہے کہ قطب الدین نے جنگی معرکوں میں سپاہیانہ حصہ لیا ہو اور اس بناء پر قریشی نے اسے غازیوں میں شمار کیا ہو۔

ولایت نامہ غرۂ جمادی الاول سنہ ۱۰۰۱ھ مطابق ۱۵۹۲ء میں تصنیف ہوا تھا۔ اس وقت جیسا کہ اشعارِ بالا سے ظاہر ہے قطب الدین فیروز زندہ تھا۔ اس طرح یہ بات یقینی ہو جاتی ہے کہ فیروز اپنے مرشد مخدوم جی کی وفات کے بعد تقریباً تیس برس تک زندہ رہا تھا۔ فیروز کا سالِ وفات متعین نہیں ہے البتہ اس بنا پر کہ مشہور دکنی شاعر وجہی نے اپنی مثنوی قطب مشتری میں اس کو یاد کرتے ہوئے کہا ہے ؎

کہ فیروز محمود اچھتے جو آج تو اس شعر کوں بہوت ہوتا رواج

اس سے ظاہر ہے کہ مثنوی قطب مشتری کی تصنیف (۱۰۱۸ھ مطابق ۱۶۰۹ء) سے پہلے فیروز انتقال ہو چکا تھا۔ بظاہر گولکنڈہ پہونچنے سے پہلے وجہی نے چند سال بیدر میں گذارے تھے۔ وہیں غواصی کی پہلی مثنوی مینا ستونتی دیکھی تھی جس کا جواب قطب مشتری لکھکر اس نے پیش کرنے کی کوشش کی تھی۔ امکان ہے کہ بیدر میں قیام کے زمانے میں وہ فیروز سے متاثر ہوا ہو چنانچہ قطب مشتری میں اس کے ساتھ اپنی عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے اس نے یہ بھی کہا ہے ؎

کہ فیروز آ خواب میں رات کو دعا دے کے چومے مرے ہات کوں
کہیا ہے توں یو شعر ایسا سرس کہ پڑنے کوں عالم کرے سب ہوس

ان شعروں کی روشنی میں یہ خیال کیا جا سکتا ہے کہ ۱۰۱۸ھ مطابق ۱۶۰۹ء تک فیروز کے انتقال کو بہت زیادہ مدت نہیں گذری تھی اور آخر وقت میں شاعری میں اس کی استادانہ حیثیت مسلّم ہو چکی تھی گولکنڈہ کے شعرا بہت بعد تک بھی فیروز کی استادی کا ذکر کرتے رہے ہیں چنانچہ اپنی مثنوی پھولبن میں ابن نشاطی نے بھی کہا ہے ؎

نہیں دو کیا کروں فیروز استاد کہ دنیا شاعری کا کچھ مری داد

اس امکان سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا کہ اوائل عمری میں ابن نشاطی کا بھی کچھ تعلق بیدر سے رہا ہو اور اس نے فیروز سے اس کے آخر زمانے میں کچھ فیض حاصل کیا ہو۔

کہا جا چکا کہ فیروز قادریہ سلسلے سے تعلق رکھتا تھا اور اس سلسلے میں بیعت کا جو طریقہ ہے اس میں یہ بات شامل ہے کہ:

"مرید پیر سے کیئے ہوئے عہد کو اللہ اور رسول کے ساتھ کیے ہوئے عہد کے برابر سمجھیگا اور یہ کہ اس نے جس پیر کا ہاتھ تھاما ہے اس کے متعلق یہ سمجھے کہ اس نے حضرت عبد القادر جیلانیؒ کا ہاتھ تھاما ہے اور یہ کہ وہ بتائے ہوئے تمام اذکار کی پابندی کریگا۔ مرید کے لئے مجاہدے اور مراقبے سے رغبت ضروری ہے۔ تصور شیخ کو قوی ہونا چاہیئے تاکہ مرید فنافی الشیخ کے درجے پر فائز ہو سکے۔"

چنانچہ قریشی نے اپنے ولایت نامے میں اللہ اور رسول کے بعد صرف اپنے مرشد کی مدح کی ہے کسی اور بزرگ کا نام بھی نہیں لیا ہے۔ اپنے عقیدے کا اظہار اس نے اس شعر میں کیا ہے ؎

محمدؐ تھے جدا نیں صاحب اللہ محمد خاص خلقت، خالق اللہ

بالکل یہی عقیدہ فیروز کا بھی ہے۔ اس نے اپنی نظم "پرت نامہ" اس شعر سے شروع کی ہے ؎

تہیں قطب اقطاب، جگ پیر ہے تہیں غوث اعظمؒ، جہانگیر ہے

حضرت غوث اعظم کی ولادت کے سلسلہ میں اس نے ایک حکایت اس طرح نظم کی ہے ؎

مناجات کیتا حسنؓ شہ سوار کہ اے جگ رکھنہار پروردگار
حسینیاں منے توں کیا تو امام ہم اولاد میں فضل اکثر تمام
ندا آئیا حضرت غیب تے کہ اے شاہ توں پاک ہے عیب تے
تج اولاد میں ایک ایسا رتن نبیؐ کا سو دو جگ کرے گا جتن
بزرگی حسینی اماماں منے جو کچھ ہے سو سب جمع ہے اس کنے
جگ اس نانو شہ عبدقادر کہین اسے سیو تے دوی جگ جم سہین
سنے شہ حسن غیب کی بات جب کیے شکر حق کا بہت دھات تب
کہ اپنا محی دین فرزند اہے حسینی اماماں میں نوچند اہے

ان شعروں سے صاف ظاہر ہے کہ فیروز شیعہ عقیدے کے برخلاف حضرت غوث الاعظمؒ کی برتری اور بزرگی کا بیان کر رہا ہے۔ عقیدے کے اس فرق کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ شیعہ سلاطین نے بغداد میں بار بار حضرت غوث الاعظمؒ کے مزار کے گنبد کو شہید کرایا تھا۔ پرت نامے کی تصنیف بریدشاہیوں کے عروج کے زمانے میں ہوئی تھی اس لیے اس نظم میں بہت صراحت کے ساتھ حضرت غوث الاعظمؒ کے بارے میں اس قسم کے شعر کہے گئے ہیں۔

حسنؓ کے سو دریا کا موتی تہیں حسینیاں منے جگ جوتی تہیں
نہ پہنتا جو توں کس دیا تا کریم حسنؓ کوں سبھی کیوں ملا تا کریم

لیکن ولایت نامہ کی تصنیف کے وقت بیدر کی حکومت برائے نام باقی رہ گئی تھی اس میں شاعر نے محض اپنے مرشد کی مدح کی ہے اور اختلافی مضمون نظم نہیں کیا ہے۔

پرت نامے میں مخدوم جی کے ہاتھ پر اپنے بیعت کرنے کا قصہ قطب الدین فیروز بیدری نے اس طرح نظم کیا ہے ؎

سُتا تھا جو یک رات وقت سحر جو سپنے میں دیکھیا کہ یک خوب گھر
کہیا میں کہ یہ کون خانہ رہے محی دین کا آستانہ کہے
مجے آرزو تھی بھتر جاونے اُنن کا سو دیدار چک پاونے

کھڑا تھا سو پر دار اڑیا دار کا بھتر ہیں محرم ہوا بار کا
محی دین میں دیکھ سر بھٹیں دھرا کیتی تھا ربھی سیس یوں ہی رکھیا
رو پیش راکھ، بہت جوڑ، پاوں پڑیا جو میں ڈھونڈتا تھا سو پنچ انپڑیا
مجے بیسنے کی اشارت دئے مرید ہو د سنے کی بشارت دئے
دئے دست پنجہ محی دیں سےمجے کیے پیار سوں ذکر تلقین مجے
بھورتے ہمی ہات دیتے اگال سو نعمت جو پایا سو مجذوب حال

اس آخری مصرع میں لفظ "نعمت" میں ممکن ہے شاعر نے شیخ نعمت اللہ صاحب کے نام کی رعایت بھی ملحوظ رکھی ہو۔ اوپر کے شعروں میں شاعر نے سر جھکانے، ہاتھ جوڑنے اور پاوں پڑنے کا ذکر کیا ہے۔ یہ ہندو رسمیں ہیں۔ اس کی حقیقت یہ کہ قاسم بریدنے جو سلسلہ، بریدیہ کا بانی تھا ایک مرہٹہ سردار کی بیٹی سے شادی کی تھی اور اس کے ساتھ بہت مرہٹے مسلمان ہوئے تھے۔ قاسم برید سے پہلے بھی بیدر کے علاقے میں مقامی باشندے اسلام قبول کرتے رہے ہیں۔ ان نو مسلموں کے اثر سے ان کے طور طریقے اور رسم و رواج بتدریج مسلمانوں میں بھی رواج پانے لگے تھے معلوم ہوتا ہے کہ بعض ہندو رسمیں مسلم معاشرے میں اس حد تک دخیل ہو گئی تھیں کہ ان کے اعمال ہی نہیں، ان کے عقاید کو وہ متاثر کرنے لگی تھیں چنانچہ فیروز نے اپنی نظم میں اپنے مرشد کا ذکر کرتے ہوئے یہ اشعار بھی کہے ہیں ؎

محی دین ہم سونے میں آئیا سو میں جاگ مخدوم جی پائیا
محی دین مخدوم جی جاگنا نہیں جیو اس بیو سوں لاگنا
محی دین ثانی سو مخدوم جیو ارے جیو اس ہت پرم مد پیو
براہیم مخدوم جی جیونا کہ مے صرف وحدت سدا پیونا
اتم بیسل مخدوم جی جائیا محی دین دوجے جنم آئیا

اسلام میں دوسرے جنم کا کوئی تصور نہیں ہے جب کہ آخری مصرعے میں فیروز نے صریحاً دوسرے جنم کا ذکر کیا ہے۔ مرشد کے ساتھ اس کی عقیدت نے اس سے اور بھی بعض ایسی باتیں کہلائی ہیں جو محل نظر ہیں مثلاً

؎ نظر توں کرے تو مواجیو اٹھے وضو بن جو تج ناوں لے سر تیٹے
اور ؎ فرشتے تجھ ازماونے آئے جب پراں جل پرے تھے، سزا پائے تب

خدا اور اس کے پاک رسول صلعم کا نام بھی بغیر وضو لینے میں قباحت نہیں ہے اور یہ یقینی طور سے ایسا جرم نہیں ہے کہ اس پر سر توڑ دیا جائے۔

بیدر بہمنیوں کے وقت سے پایۂ تخت رہا تھا۔ زبان ہندوی کا وہاں چلن بہت پہلے سے تھا قطب الدین فیروز سے پہلے بھی وہاں اس زبان کے قادر الکلام شاعر ہو چکے تھے چنانچہ فخرالدین نظامی کا نام اہمیت رکھتا ہے۔ نظامی نے اپنی مثنوی کدم راؤ پدم راؤ میں فارسی کے عروضی ضابطوں کی پابندی کی تھی۔ اسی مثنوی کی بحر کو فیروز نے بھی اپنی نظم پرت نامے کے لئے اختیار کیا تھا یعنی بحر متقارب مثمن مزاحف جس کا وزن اس طرح ہے۔

فعولن فعولن فعولن فعول
فعَل

نظامی کی طرح فیروز نے بھی قافیے کا التزام کیا ہے بلکہ اس کی نظم میں بعض شعر ذوقافیتین بھی ہیں مثلاً ؎ کہیا میں کہ یہ کون خانا اہے محی دین کا آستانہ کہے

کہیں کہیں پرت نامے میں ردیف کا وجود بھی مل جاتا ہے جیسے ؎

کھڑا تھا سو پردہ اڑیا دار کا بھتر ہیں محرم ہوا یار کا

اس نظم میں عربی اور فارسی کی ترکیبیں عام طور سے استعمال میں آئی ہیں۔

زبان ہندوی میں عربی اور فارسی کے اثرات بتدریج شامل ہوتے رہے ہیں۔ ان زبانوں کی آوازیں بھی رفتہ رفتہ یہاں رائج ہوئی ہیں۔ چنانچہ پرت نامے میں کتنے ہی لفظوں کے تلفظ میں فرق پایا جاتا ہے۔ تلفظ کے اس فرق نے قافیوں کو بھی متاثر کیا ہے۔ پروفیسر نذیر احمد نے اس بارے میں لکھا ہے :

" محی الدین میں ہر مرتبہ علامتِ اضافت وزن سے خارج ہے۔ کون میں واو متحرک ہے۔ راس کا قافیہ خاص ہے۔ بعض جگہ حرف کو مشدد کر دیا ہے۔ ایک آدھ جگہ حرف کو گرا دیا ہے۔"

(اردو ادب جون ۱۹۵۷ء ص ۹۵)

اس کی کیفیت یہ ہے کہ محی الدین کو فیروز نے " محی دین " نظم کیا ہے اور اب تک دکن کے علاقوں میں یہی تلفظ جاری ہے۔ پورب کے علاقوں میں البتہ اس کو مہدّی یا مہدّین بولتے ہیں۔ کون کا تلفظ مراٹھی میں کَونڑ (कौन) بہ فتحتین ہے اور اس لئے فیروز نے بھی کَون کو فتحۂ اول وثانی کے ساتھ نظم کیا ہے۔ یہ لفظ اب بھی پورب کے علاقوں میں اسی طور پر بولا جاتا ہے۔ مَن اور مِن وغیرہ میں عربی اور فارسی کے جاننے والے ضرور فرق کرتے ہیں لیکن روزمرّہ میں قدیم ہندوی میں

ان آوازوں میں امتیاز نہیں کیا جاتا تھا۔

پرت نامے کی زبان پر دکن کی مختلف بولیوں کے اثرات بہت واضح ہیں۔ اس بارے میں تفصیلی بحث کسی اور موقع پر کی جائے گی۔ یہاں صرف اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ حرف انکار "نکو" کا اس نظم میں استعمال ہوا ہے مثلاً ع

دنیا سوں نکو کر گرفتار مج

اسی طرح رہنے کے معنی میں اچھنا کا صَرف بھی ہوا ہے ع

اُنن کو نہ توں جانتا اچ خموش

پرت نامہ اپنے موضوع کے اعتبار سے قصیدے کی ذیل میں آسکتا ہے لیکن ہیئت کے لحاظ سے یہ مثنوی ہے البتہ زبان ہندوی کی قدیم مثنویوں کے برخلاف پرت نامے میں شاعر نے اپنے بیان کی تائید، توضیح اور تصریح کے لئے موقع بہ موقع چھوٹی چھوٹی حکایتیں نقل کی ہیں۔ زمانۂ مابعد میں دکن کے مختلف علاقوں میں اسی طرز کو رواج حاصل ہوا چنانچہ ابن نشاطی اور بحری وغیرہ نے بھی اپنی مثنویوں میں ایسا ہی کیا ہے۔ اس اعتبار سے پرت نامے کی تاریخی اہمیت مسلّم ہے۔ افسوس ہے کہ اس نظم کے سوا فیروز کی کوئی اور تصنیف تاحال دستیاب نہیں ہو سکی ہے۔

بشیر وارثی

غزل

دل مرا سوزِ غم سے جلتا ہے
خونِ دل اشک بن کے ڈھلتا ہے

دوستی دوست کی کھٹکتی ہے
دل کا کانٹا کہیں نکلتا ہے

کیا ملے اس کو منزلِ مقصود
رات دن راہ جو بدلتا ہے

ان کی چشمِ کرم کا ہے صدقہ
دم اکھڑتا ہے اور سنبھلتا ہے

ایسے سارے چراغ گل کردو
جن چراغوں میں خون جلتا ہے

کامیابی اسی کے سر ہے بشیرؔ!
ٹھوکریں کھا کے جو سنبھلتا ہے

کسوٹی

کسوٹی میں تعمیری تنقید کی حوصلہ افزائی کی جائے گی اور اس کے لئے یہ ضروری نہیں کہ ہر تنقید نگار کی رائے مدیر کے زاویۂ نظر سے مطابقت رکھتی ہو۔ مطمحِ نظر صرف یہ ہے کہ اس سے نئی نسل کے ادبا، شعرا نہ صرف استفادہ کر سکیں بلکہ تعمیری اندازِ فکر کی نشو و نما بھی ہو ——— (ادارہ)

سخن فہمی یا طرفداری غالب

کسوٹی کا عنوان اس لئے وضع کیا گیا تھا کہ حقیقی تعمیری تنقید پر مشتمل تحریریں شائع کی جائیں، جس سے نوجوان ادیب و شاعر استفادہ کر سکیں۔ تنقید بذاتِ خود ایک اونچا معیار رکھتی ہے اور اس پر بہت کم لوگ پورے اترتے ہیں۔ عموماً ہوتا یہ ہے کہ تنقید کے نام سے لکھی جانے والی چیز یا تو تنقیص ہو کر رہ جاتی ہے یا پھر تمہید و قصیدہ نگاری کا روپ اختیار کر لیتی ہے۔ نقاد کا فرض یہ ہوتا ہے کہ وہ معائب و محاسن دونوں یکساں طور پر ظاہر کرے۔ ایسی انتہاپسندی بھی نہ ہو کہ اسے کسی ادب پارے میں کیڑے ہی کیڑے نظر آئیں اور ایسا غلو بھی نہ ہو کہ ہر عیب خوبی نظر آنے لگے۔ اسی طرح ایک تنقید نگار پر بھی لازم ہوتا ہے کہ وہ عیوب کو دانستہ نظر انداز بھی نہ کرے بلکہ بحیثیت مجموعی کسی ادب پارے پر حکم لگائے۔ اس کسوٹی پر دیکھئے تو جناب علی احمد جلیلی صاحب کا مضمون پورا نہیں اترتا اس کے باوجود بھی اسے صرف اس لئے شائع کیا گیا کہ کسی کو "ادارہ" کی غیر جانب داری پر شک کرنے کا موقع نہ مل سکے۔

مئی کے شمارے میں حضرت شاذ تمکنت کی غزل پر جو تبصرہ کیا گیا تھا جلیلی صاحب نے اسی پر خامہ فرسائی کی ہے بذاتِ خود انھوں نے غزل پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ دوسرے، تبصرے کے

الفاظ سے یہ صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ انھیں سخن فہمی کی قدروں سے زیادہ طرفداریٔ غالبؔ عزیز ہے۔ اکثر اعتراضات پر ان کی خاموشی گو اس بات کا اظہار ہے کہ وہ اس سلسلے میں صدفی صد مجھ سے متفق ہیں لیکن بحیثیتِ مجموعی عدمِ اعتراض سے یہ بھی ثابت ہو رہا ہے وہ اس باب میں جراتِ رندانہ کے قائل نہیں۔

۱۔ بجھا نہ دے کہیں اے حسن جوئے کم آبی چراغ تشنہ لبی کو ہوائے سیرابی

"حُسن جوئے کم آبی" کو غلط ماننے کے باوجود جلیلی صاحب اس ترکیب کی وکالت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ... "حُسن سے متعلق اس استعارے کو شعر سے نکال دیا جائے تو سیرابی کا تلازم باقی نہیں رہتا اور شعر کا مضمون معلق ہو کر رہ جاتا ہے ..."

ذرا اس شعر کی نثر ملاحظہ ہو۔ "اے حُسن جوئے کم آبی' چراغ تشنہ لبی کو ہوائے سیرابی کہیں بجھا نہ دے۔" علانیہ یہ حقیقت ظاہر ہو رہی ہے کہ "حُسن جوئے کم آبی" کے بغیر ہی مضمون مکمل ہو گیا ہے' مگر موصوف کا خیال ہے کہ اس ٹکڑے کے بغیر مضمون ادھورا رہ جاتا ہے۔ حالانکہ "تشنہ لبی" اور "سیرابی" جیسی واضح ترکیبوں کے بعد "حسن" اور "جوئے کم آبی" کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی' اِلاّ یہ کہ مطلع کی صورت گری مقصود ہو۔ "جوئے کم آبی" واضح طور پر مضمون شعر کے خلاف ہے کیونکہ انتہائی کم آب جو بھی تشنگی کا چراغ بجھا سکتی ہے۔ پھر اس میں لفظ "حسن" اس لئے بھی مناسب نہیں کہ "کم آبی" کسی جو یبار کا نقص تو ہو سکتی ہے لیکن خوبی نہیں ہو سکتی۔ انھیں دلائل کی بنا پر "اے حُسن جوئے کم آبی" کے استعمال کو غیر ضروری قرار دیا گیا تھا۔

۲۔ تمام قہر سخن داد نا شناس ہنر ہماری آبرو اہلِ نظر کی کیا بی

دوسرے شعر کے متعلق لکھتے ہیں کہ نا قدنے ہنر شناس داد کے ساتھ طنز کا ایک نشتر بھی چلا دیا ہے کہ ـــــ "پہلا مصرع اردو کی حدود سے نکل کر فارسی کی قلمرو میں داخل ہو گیا ... یہ چیز غالبؔ کے زمانے ہی میں معیوب سمجھی جاتی تھی۔"

موصوف نے اس تبصرے پر یوں گرفت کی ہے کہ۔ "فارسیت غالبؔ کی غزلگوئی کا ایک پہلو ہے نہ کہ عیب ـــ یہ نتیجہ نکالنا کہ فارسیت کا عنصر کسی شعر یا مصرعے کو معیوب بنا دیتا

ہے درست اور قابل قبول نہیں۔ اگر اسے غالب کے کلام کا عیب بھی سمجھ لیا جائے تو غالب اس عیب کے باوجود سرفہرست ہے۔"

یہ تنقید و تبصرہ ڈپلومیسی کا انداز لئے ہوئے ہے۔ اس میں مبصر نے میرے اعتراض کو بطور کلی نہ تو مانا ہے نہ مسترد کیا ہے۔ کسی ناقد کے متعلق یہ لکھنا کہ اس نے داد بھی دی ہے اور طنز کے نشتر بھی چلائے ہیں' اصولِ تنقید کی رو سے انتہائی نامناسب ہے۔ نقاد کا کام ہی معائب اور محاسن کی نشاندہی کرنا ہے اور اس کے لئے اسے مطعون کرنا دیانت داری کے خلاف ہے۔

غالب کی شہرت کا باعث ان کا وہ فارسی آمیز کلام نہیں جس کا ایک آدھ لفظ بدل دینے سے پورا مصرع یا شعر فارسی ہو جاتا ہے بلکہ وہ کلام ہے جس میں روحِ شاعری بدرجہ اتم موجود ہے۔

نقشِ نازِ بتِ طنّاز بآغوشِ رقیب
پائے طاؤس پئے خامۂ مانی مانگے (غالب)

جیسے اشعار سے غالب سرفہرست قرار نہیں پائے ہیں بلکہ اس قسم کے اشعار پر خود ان کے زمانے میں گرفت کی جاتی تھی جو وہ بیدل وغیرہ کی پیروی میں لکھتے تھے چنانچہ اس قسم کی تعمیری تنقیدوں کا یہ اثر ہوا کہ بالآخر وہ فارسیت اور طرزِ بیدل سے دست بردار ہو گئے۔

۳۔ خود اپنے آپ سے کھائی ہے میں نے زک اکثر
مری حریف رہی میری خوئے سرتابی

اس شعر پر تین اعتراضات میں سے ایک کو غالباً تسلیم کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے کہ اس شعر میں حشو و زوائد کی طرف میں نے اشارہ تو کیا ہے لیکن نشاندہی نہیں کی۔

"... حشو و زوائد کیا ہیں وہ نہیں بتا سکے ..."

اس شعر میں حشو و زوائد اتنے آشکارا ہیں کہ اسے کوئی بھی نومشق شاعر تھوڑے سے انہماک کے بعد دریافت کر سکتا ہے لہٰذا نشاندہی کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی اگر موصوف کو اس شعر میں حشو و زوائد نظر نہیں آئے تو وہ تحریر فرمائیں انشاء اللہ اگر ضرورت ہوئی تو اس کی نشاندہی آئندہ کر دی جائے گی۔

میرے تیسرے اعتراض ــ " شاعر اپنے دعوے کی کوئی معقول دلیل نہیں پیش کرسکا " پر تنقید کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ.... " آج کی غزل کے تعلق سے دعوی اور دلیل کی باتیں بہت فرسودہ ہو چکی ہیں۔ جدید تنقید میں اب یہ اصطلاحیں کہیں نظر نہیں آتیں "۔

یہ رائے نہایت عجیب ہے۔ غزل ایک قدیم صنفِ سخن ہے اور ہر دور میں اس کا لب ولہجہ بدلتا رہا ہے لیکن اس کے بنیادی چوکھٹے میں فرق نہیں آیا لہٰذا غزل کے معائب اور محاسن پر جب بھی گفتگو ہوگی اس میں قدیم و جدید کی بحث، مضامین، شاعر کے نکتۂ نظر یا کسی دور کے مخصوص حالات کے پیشِ نظر تو ہو سکتی ہے لیکن شعری معائب و محاسن پر جب بھی گفتگو ہوگی اس میں قدیم و جدید کی بحث بے معنی ہو کر رہ جائے گی، کیونکہ غزل کی بنیادی اور فنی حدود میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے اگر موصوف اس کے قائل ہیں تو اس کی وضاحت بھی فرما دیں کہ جدید تنقید کے وہ کون سے اصول ہیں جن سے کسی شعر کے معائب یا محاسن کا اندازہ لگایا جائے اور کیا وہ اصول ایسے ہیں کہ ان سے مومن و غالب کی شاعری کے معائب اور محاسن کے متعلق کوئی رائے قائم نہیں کی جا سکتی ؟

۴۔ وہ قربتیں کہ تھیں بیتابیٔ سکوں جیسے
وہ دوریاں کہ ملا ہے سکونِ بے تابی

یہاں بھی انھوں نے قدیم و جدید کی بحث چھیڑی ہے کہ ... " جدید غزل کے شعر کو اگر جدید ذہن سے نہ جانچا جائے تو تنقید نگار کی نظر اس کے حسن و قبح تک نہیں پہونچ سکتی، کیونکہ پرانی غزل میں جو عناصر شجرِ ممنوعہ سمجھے جاتے تھے نئی غزل کا حُسن و وقار بن گئے ہیں... "

یہ تبصرہ بے حد عجیب ہے اور اس کا محتاط ترین مطلب یہی نکالا جا سکتا ہے کہ پرانی غزل کے تمام عیوب جدید غزل میں خوبیوں سے بدل گئے ہیں، حالانکہ موصوف خود لکھتے ہیں کہ:

" جہاں نئی غزل میں شکست و ریخت کا رجحان ہے وہیں
زبان و قواعد کے مروجہ اصولوں سے انحراف کا میلان بھی
صاف واضح ہے۔ لفظوں کے غیر محتاط صرف اور غزل کے

مسلّمہ اصولوں سے روگردانی کی مثالیں بہت ملتی ہیں۔"
(نئی غزل میں منفی رجحانات۔ ص: ۷۷)

لکھتے ہیں کہ — "بیتابیٔ سکوں اور سکونِ بےتابی نہایت خوبصورت ترکیبیں ہیں۔ بعض قربتیں ایسی ہوتی ہیں جن سے دوری کا احساس ہوتا ہے اور بعض دوریاں ایسی ہوتی ہیں جن پر سکونِ بےتابی کا اطلاق ہوتا ہے۔"

سوال یہ ہے کہ سکون اور بےتابی دو مختلف اور متضاد کیفیتیں ہیں لہٰذا یہ اجتماعِ ضدین کیسے ہو سکتا ہے۔ روز و شب، درد و راحت اور سیاہ و سفید کا انضمام ہی جب ناممکن الوقوع ہے تو ان کے مجموعے سے کوئی بامعنی ترکیب کیسے وضع کی جا سکتی ہے اور شاعر نے ایسا کون سا قرینہ پیش کیا ہے جس کی بنا پر یہ اجتماعِ ضدین قرینِ قیاس معلوم ہونے لگے۔ اگر ایسی ترکیبوں کو مان لیا جائے تو بہت سی متضاد اور غیر العقول ترکیبیں وضع کی جانے لگیں گی۔ مثلاً: بیگانگیٔ یگانگی، نورِ ظلمت، ظلمتِ نور، رنگینیٔ بےرنگ، بےکیفیٔ سرور وغیرہ وغیرہ۔

اس شعر کے ضمن میں موصوف نے جو دو شعر ترکیبوں کی وضاحت کے لئے پیش کئے ہیں، اتفاق سے ان دونوں میں "سکونِ بےتابی"، یا "بےتابیٔ سکون" کا دور دور تک پتہ نہیں چلتا۔

پانچویں شعر پر بھی ان کی خاموشی کا یہی مطلب ہے کہ اس شعر پر جو تنقید کی گئی تھی اس سے انھیں اتفاق ہے۔

۶۔ دھرا ہوا ہے مرا زادِ راہ برلبِ جُو
وفورِ تشنہ دہانی دلیلِ غرقابی

اس شعر پر چار اعتراضات میں سے دو پر ان کی خاموشی یہی بتلاتی ہے کہ اس سے انھیں کوئی اختلاف نہیں۔ رہی دو باتیں جن پر انھوں نے گرفت کی ہے اس میں سے فارسی والے اعتراض کا جواب گذشتہ سطور میں دیا جا چکا ہے۔ البتہ "تشنہ دہانی" پر میری گرفت سے وہ متفق نہیں ہیں۔ میں نے دو چیزیں پیش کی تھیں کہ — تشنہ دہانی کا بےضرورت استعمال فصاحت کے خلاف ہے اور اگر اس کا استعمال قافیے میں ناگزیر ہو تو کیا جا سکتا ہے۔ اس کی وضاحت یوں کردوں

گوئی تھی کہ ایسا حکم اس لئے لگایا گیا ہے کہ "دہن" جیسے لفظ کے ہوتے ہوئے "دہان" کا بے ضرورت استعمال مناسب نہیں۔ دہن "دہان" کا مخفف ہے اور اس کے مقابلے میں زیادہ فصیح ہے چنانچہ "غنچہ دہاں" سے "غنچہ دہن" اور "دریدہ دہاں" سے "دریدہ دہن" زیادہ فصیح ہیں اور اسی طرح بہت سی ترکیبیں ہیں۔

میرے تجویز کردہ مصرع "دفور تشنہ لبی ہے دلیل غرقابی" پر انھیں یہ اعتراض ہے کہ لفظ "ہے" سے حشو اور جھول پیدا ہو گیا ہے۔ حالانکہ یہ صحیح نہیں کیونکہ لفظ "ہے" سے جملہ مکمل ہوتا ہے اور ایسے لفظ کا استعمال جس سے جملے کی تکمیل ہوتی ہو فن شاعری کی رو سے حشو نہیں ہو سکتا۔

۷۔ شکن شکن مری کروٹ گواہ ہے اے شاذ
دکھائی ہے کئی خواب میری بے خوابی

مقطع کی تنقید پر علی احمد جلیلی صاحب کا تبصرہ ایک حد تک تسلیم کیا جا سکتا ہے مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ شکن شکن پر مسلسل کروٹیں جہاں بے خوابی کی کیفیت کو مجسم کرتی ہیں اور اس کا مناسب قرینہ بھی شعر میں موجود ہے وہاں ایسی کوئی بات "دکھائی ہے کئی خواب" جیسی کیفیت کی صداقت کے لئے شاعر بہم نہیں پہونچا سکا۔ قوتِ تخیل سے کچھ خوابوں کو مجسم کرنے کے لئے کچھ نہ کچھ بے اضطرابی یا سکون کا ہونا ضروری ہے جو مسلسل بے چینی اور کروٹوں پر کروٹوں کے درمیان مشکل ہے۔

آخر میں ہم موصوف کی کتاب سے ایک اقتباس پیش کرتے ہیں جس سے ہمیں صد فیصد اتفاق ہے۔ انھی حقائق کو منظرِ عام پر لانے کے لئے "کسوٹی" جیسا عنوان وضع کیا گیا تھا مگر حیرت یہ ہے کہ موصوف کا زیر تبصرہ مضمون انھی کے پیش کردہ اصولوں کی عکاسی نہیں کرتا:

"زبان و فن سے جو بے توجہی برتی جا رہی ہے اس سے یہ خطرہ بھی لگا ہوا ہے کہ اس سے غلط نگاری کی مستقل روایت نہ قائم ہو جائے۔ غلطیوں اور بے راہ رویوں کی نشان دہی اس لئے بھی ضروری ہے کہ ان سے استناد نہ ہو سکے۔" (نئی غزل میں منفی رجحانات)
ص: ۱۰۳

بچّوں کا صفحہ

محمد عبدالحمید
قلعہ گولکنڈہ حیدرآباد

فضیلت نماز کی

پیارے بچّو! نماز تو تم ہر روز پڑھتے ہی ہو گے۔ اگر نہیں پڑھتے ہو تو آج ہی سے نماز پڑھنا شروع کر دو پھر دیکھو نماز کی فضیلت و رحمت کا اثر۔ نماز تمام برائیوں سے انسان کو بچاتی ہے۔ ہمارے پیارے رسول حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ نماز دین کا ستون ہے جس نے نماز قائم کی اس نے دین کو قائم کیا اور جس نے نماز کو چھوڑا اس نے دین کو منہدم کیا۔ تو پھر ہمارا یہ اولین فریضہ ہے کہ ہم پابندی سے نماز ادا کریں۔ بچّو! یہ کہانی پڑھو نماز کی فضیلت کی کہانی۔

احمد اور جاوید چھٹی جماعت کے دو ذہین طالب علم ہی نہیں مقابل بھی تھے ان دونوں کا ہمیشہ درجہ اول میں مقابلہ رہتا تھا کبھی احمد کی پوزیشن آتی تو کبھی جاوید آگے نکل جاتا کبھی جاوید کو زیادہ انعامات ملتے تو کبھی احمد جاوید پر حاوی ہو جاتا۔

احمد کا ایک غریب گھر سے تعلق تھا وہ ذہین ہونے کے علاوہ نیک بھی تھا۔ وہ اپنے ابّو کے ساتھ محلہ کی مسجد میں ہر روز پابندی سے نمازیں ادا کرتا۔ جاوید کا تعلق امیر گھرانے سے تھا والدین کے بے جا لاڈ پیار نے اسے ضدی مغرور اور حاسد بنا دیا تھا اور وہ سوائے جمعہ کی نماز اور کوئی نماز ادا نہ کرتا تھا اور جمعہ کی نماز بھی پابندی کے ساتھ نہ پڑھتا اگر احمد درجہ اول میں کامیاب ہو جاتا تو جاوید حسد کی آگ میں جلتے ہوئے احمد کو اپنے اسکول کے ساتھیوں کی مدد سے خوب ستاتا بیچارہ احمد چپ چاپ سب کچھ سہہ جاتا۔

سالانہ امتحان قریب آچکے تھے۔ احمد اور جاوید کتابیں چاٹنے میں مشغول تھے۔ احمد اللہ تعالیٰ سے دن رات نمازوں میں دعا کرتا کہ اس کے پرچے اچھے جائیں اور وہ کامیاب ہو جائے جاوید اس کوشش میں لگا ہوا تھا کہ اس سال احمد فرسٹ کلاس نہ آئے اور اسے خود پر اتنا یقین ہو چلا تھا کہ وہ اپنے دوستوں میں اس بار اپنے فرسٹ کلاس آنے کی باتیں کہتا پھرتا تھا۔

امتحانات شروع ہوئے اور ختم بھی ہو گئے لیکن احمد اور جاوید دونوں ہی پریشان تھے کیونکہ اس بار ان کا سائنس کا پرچہ کٹھن گزرا تھا دوسرے لڑکوں کی بات ہی چھوڑیئے وہ دن رات کی محنت کے باوجود بھی سائنس کے پرچہ میں موجود سوالوں کے جوابات ٹھیک سے نہ دے سکے تھے۔ پھر بھی اللہ کے فضل و کرم سے احمد نے کافی سوالات حل کئے تھے جہاں احمد کو امید تھی کامیاب ہونے کی

وہاں اسے ناکام ہونے کا خوف بھی تھا۔ جاوید تو بڑا دل برداشتہ ہو چلا تھا کیونکہ اس نے بہت کم سوالات حل کئے تھے۔ احمد کو اپنے رب پر بھروسہ تھا۔ وہ دن رات نمازوں میں گڑگڑا کر اپنے رب سے دعائیں مانگتا اپنے کامیاب ہونے کی اور ادھر جاوید مایوسیوں کے سمندر میں غوطے کھا رہا تھا۔
آخر وہ دن آ ہی گیا جس کا اسکول کے ہر بچے کو انتظار رہتا ہے۔ آج نتیجہ نکلنے والا تھا اسکول میں سب بچے جمع تھے کچھ چہروں پر مسرتوں کی گلابی چادر چڑھی ہوئی تھی تو کچھ چہروں پر رنج والم کا غلاف اس سال جاوید فیل ہو چکا تھا اور احمد دوسرے درجہ میں کامیاب تھا۔ نمازوں کی یہ فضیلت تھی کہ اسکی دعائیں مقبول ہوئیں جو کہ وہ امتحان شروع ہونے سے قبل مانگتا آیا تھا۔ مغرور و حاسد جاوید کے خلاف نمازی و صابر احمد کی یہ ایک اور فتح تھی۔

عزیز بچو! تم خود بھی نماز پابندی سے پڑھو۔ اور اپنے ساتھیوں کو بھی نماز کے لئے ساتھ لے چلو نماز پڑھوگے تو دنیا میں بھی کامیاب رہوگے اور آخرت میں بھی۔

بزمِ خیال

اس عنوان کے تحت قارئینِ "ذوقِ نظر" کے دو ایسے سوالوں کے جواب دیئے جائیں گے جو علمی و ادبی موضوعات پر پوچھے گئے ہوں (مدیر)

س :۔ کیا ایران میں تمباکو کی تحریم نے سیاسی بیداری پیدا کی ؟

ج :۔ ایران میں علمائے دین کا جو احترام کیا جاتا ہے۔ وہ اپنی مثال آپ ہے یہاں تک کہ علمائے دین کے احکامات پر عوام سرچشمۂ اقتدار کو بھی خاطر میں نہیں لاتے چنانچہ ۱۳۰۸ء میں جب ایرانی بادشاہ نے ایک انگریزی کمپنی کو تمباکو کی داخلی و خارجی تجارت کے حقوق دیدیئے جس کی رو سے نہ صرف قومی مفادات کو سخت نقصان پہونچا بلکہ ملتِ ایران کی ہتک بھی ہوئی تو اس معاہدے کے خلاف غیور ایرانیوں نے اصفہان۔ شیراز۔ مشہد اور تہران میں مظاہرے شروع کر دیئے بادشاہ نے اس تحریک کو سختی سے کچلنے کے لئے عوام کو گرفتار کرنا شروع کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فریاد مذہبی رہنماؤں تک پہونچی۔ مرزا شیرازی اس زمانے کے سربرآوردہ علمائے دین میں سے تھے انھوں نے جب یہ دیکھا کہ معاہدہ یقیناً مفاداتِ ایران کے خلاف ہے اور اس سلسلے میں ایرانیوں پر ظلم ہو رہا ہے۔ تو انھوں نے بادشاہ کو بذریعہ تار اس معاہدے کی منسوخی پر آمادہ کرنا چاہا مگر خمار اقتدار نے ناصرالدین شاہ قاچار کی آنکھوں پر پردے ڈال دیئے تھے چنانچہ اس نے مرزا شیرازی کے تار کو کوئی اہمیت نہ دی۔ مرزا شیرازی نے مجبور ہو کر تمباکو کی حرمت کا فتویٰ صادر کر دیا۔ اس فتوے نے ایرانی عوام میں ایک قسم کی سیاسی بیداری بھی پیدا کر دی اور علمائے دین کے احترام نے انھیں وہ طاقت عطا کر دی کہ وہ ظالم شہنشاہ سے ٹکرا گئے۔ اور بالآخر تحریم تمباکو سے ایران میں جو انقلاب آیا اس نے شاہی ایوانات کی بنیادیں ہلا دیں اور جمہوریت کی راہیں استوار ہو گئیں۔ دوسری مرتبہ عوام نے علمائے دین سے اپنی بے پناہ عقیدت کا ثبوت ابھی چند سال پہلے دیا ہے جب ایران میں آیت اللہ خمینی کی قیادت میں عوام نے ایک دوسرا سیاسی انقلاب برپا کیا۔

س :۔ کیا "سالن" مرکب لفظ ہے۔ اگر مرکب ہے تو یہ کن لفظوں سے بنا ہے؟

ج :۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ "ساگ" (ترکاری) اور "لون" (نمک) سے مرکب ہے کثرتِ استعمال سے "ساگ لون" کا "گ" اور "و" متروک ہو گئے۔ اس طرح لفظ سالن وجود میں آیا ۔ ایک طبقے کا خیال ہے کہ یہ لفظ "سلون" ہے یعنی وہ چیز جس میں نمک کا تناسب بہتر ہو۔ چنانچہ خوبصورتی کے اظہار کیلئے سلونا اور سلونی جیسے الفاظ ملتے ہیں۔ میرے خیال میں آخرالذکر لفظ "سلون" ہی سے سالن بنا ہے۔

ماہنامہ

ذوقِ نظر

حیدرآباد

ذوقِ نظر

حیدرآباد فون نمبر (525117)

جلد (۱) اگست ۱۹۸۵ء شمارہ (۸)

تعاون :- سالانہ پچاس روپیے فی شمارہ پانچ روپیے

عرب ممالک سے فی شمارہ ۱۵ ریال

بشیر الدین ایڈیٹر، پرنٹر اور پبلشر نے اعجاز پرنٹنگ پریس میں چھپوا کر دفتر ذوقِ نظر ۲۲-۸-۶۱۳ چھتہ بازار سے شائع کیا۔

اس شمارے میں

حرف آغاز

امریکی اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ نے ان اطلاعات پر انتہائی تشویش کا اظہار کیا ہے کہ منشیات کی ناجائز تجارت دنیا کے چپے چپے میں بہیمانہ تشدد کی سرپرست بنی ہوئی ہے خصوصاً لاطینی امریکی ممالک میں منشیات کے تاجروں کی ہمتیں اتنی بڑھ گئی ہیں کہ وہ اس ناسور کی روک تھام کرنے والی ایجنسیوں، عدالتوں کے ججوں یہاں تک کہ انسداد منشیات کے وزیروں کو نشانہ بنوانے سے بھی نہیں چوکتیں۔

یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ منشیات اور تشدد کا چولی دامن کا ساتھ ماضی میں بھی رہا ہے اور آئندہ بھی رہیگا۔ تاریخ کے صفحات گواہ ہیں کہ قلعہ الموت کی باطنی تحریک کے بانیوں نے منشیات کے سہارے کتنے نوجوانوں کو گمراہ کرکے انکے ذریعے تشدد کا بازار گرم کروا دیا تھا۔ یہ نوجوان جو حشیشین کے نام سے مشہور تھے ان منشیات کے اسقدر عادی بنا دئے گئے تھے کہ اسکے لئے ہر قسم کے گھناؤنے جرم کے ارتکاب کے لئے باآسانی تیار ہوجاتے تھے۔ اس تحریک کے سربراہ حسن بن صباح نے سلجوقی اور عباسی حکومتوں کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ منشیات کے عادی اس تحریک کے سرگرم کارکن حسن بن صباح کے چشم و ابرو کی جنبش پر سر دھڑ کی بازی لگا دیتے تھے۔ یہاں تک کہ اپنا گلا خود اپنے ہاتھوں کاٹنے سے بھی دریغ نہ کرتے تھے۔ عرب و عجم کی دو عظیم حکومتیں ہر قسم کے وسائل ہونے کے باوجود اس بہیمانہ تشدد کی سرکوبی میں ناکام رہی تھیں اور آج تاریخ پھر اپنے آپ کو دہرا رہی ہے کہ کرۂ ارض کی ایک عظیم طاقت ناقابل قیاس وسائل اور طاقتوں کے باوجود اس ناسور کو روکنے میں اپنی ناکامیوں کا اظہار کر رہی ہے۔

قلعہ الموت کی تحریک نے اسی دور میں زور پکڑا تھا جب عرب و عجم میں اخلاقی گراوٹ اپنی انتہا کو پہونچ گئی تھی اور آخر کار ہلاکو جیسے ظالم اور خونخوار سردار کو کھڑا کرکے فطرت نے نہ صرف اخلاقی گراوٹوں کی سزا دی بلکہ اسنے گھن کو بھی گیہوں کے ساتھ ہی پیس کر رکھ دیا یعنی قلعہ الموت اور باطنی تحریک کو بھی اس نے نیست و نابود کر دیا۔ اس طرح قدرت کے آہنی ہاتھوں نے بیک کرشمہ دو کار کا فریضہ انجام دیا۔

آج بھی اخلاقی گراوٹ اپنی انتہا کو پہونچ رہی ہے۔ چنانچہ منشیات کے ناجائز تاجروں کو بڑی آسانی کے ساتھ سماج کے تمام طبقات سے کمک حاصل ہو رہی ہے کہیں ایسا نہو کہ پھر قدرت اپنے طریقے سے اسکا سدباب کرنے کیلئے سرگرم ہوجائے اور ظاہر ہے کہ جب قدرت اپنے طور پر کسی نظام کو تباہ کرنے کا فیصلہ کر لیتی ہے تو رطب و یابس کی تخصیص نہیں کی جاتی۔

اس سے پہلے کہ فطرت اپنے طور پر منفی انداز سے اس ناسور کے خاتمے پر آمادہ ہو سماج کے ہر طبقے کو چاہئے کہ وہ مثبت انداز میں اخلاقی اقدار کی سربلندی کے لئے تیار ہوجائے۔ تشدد اور دہشت گردی کی گرم بازاری اس بات کا اعلان ہے کہ وقت بہت کم رہ گیا ہے۔ جو کچھ کرنا ہے وہ پوری طاقت سے کیا جائے۔ مذہبی، تہذیبی اور سماجی اخلاقی تعلیم کو نہ صرف عام کیا جائے بلکہ اس پر سرگرمی سے عمل کرنے کی بھی کوشش گھر گھر اور محلے محلے ہونی چاہیئے۔

"ادارہ"

نعت صلی اللہ علیہ وسلم

گم کردۂ منزل ہوا اغیار کے سائے میں ... آ جاؤ محمدؐ کے کردار کے سائے میں
کیا کم نگہی دیکھے کس کس کا ہے خواہاں ... گنبد کی پناہوں میں مینار کے سائے میں
ہم سایۂ حضرت پر کیوں بحث کریں واعظ ... جز نور نہیں ممکن انوار کے سائے میں
تشریف گرامی پر کھلتے گئے دروازے ... ایوبؓ کا گھر چمکا سرکار کے سائے میں
صدیقؓ کی عظمت کا وہ غار بھی شاہد ہے ... کونین کا سورج تھا جس غار کے سائے میں
اعجاز عمرؓ یہ تھا خطبے میں پکار اٹھے ... اے ساریہؓ آ جاؤ کہسار کے سائے میں
معراج شہادت ہے عثمانؓ کا خوں اب تک ... قرآن نے لب چومے تلوار کے سائے میں
حیدرؓ سے تو سیکھی ہے شمشیر نے انگڑائی ... توقیر شجاعت تھی کرار کے سائے میں

تسنیم یہ سنتے ہیں ایماں کی کسوٹی ہے
کونین کے آقا کی دیوار کے سائے میں

(تسنیم فاروقی)

منقبت حضرت خواجہ بندہ نوازؒ

نور رب العالمیں ہیں خواجہ بندہ نوازؒ ... حامل اسرار دیں ہیں خواجہ بندہ نوازؒ
دیدہ و دل میں مکیں ہیں خواجہ بندہ نوازؒ ... مظہر ذات مبیں ہیں خواجہ بندہ نوازؒ
نور ایمان و یقیں ہیں خواجہ بندہ نوازؒ ... شمع بزم عارفیں ہیں خواجہ بندہ نوازؒ
ان کا دامن جس نے تھاما مل گئی منزل اسے ... رہبر دنیا و دیں ہیں خواجہ بندہ نوازؒ
درس گاہ معرفت ہے آستانہ آپ کا ... پیشوائے کاملیں ہیں خواجہ بندہ نوازؒ
اولیا اللہ نے پائی خلافت آپ سے ... رہنمائے سالکیں ہیں خواجہ بندہ نوازؒ
نام لیتے ہی سکوں پاتا ہے ہر بیمار غم ... راحت قلب حزیں ہیں خواجہ بندہ نوازؒ
وارث ختم الرسلؐ جان علیؓ ناز بتولؓ ... بالیقیں حق کے قریں ہیں خواجہ بندہ نوازؒ

معتبر ارض دکن ہے ذات سے انکی بشیر
دین و ایماں کے امیں ہیں خواجہ بندہ نوازؒ

(بشیر وارثی)

اسلام کا سب سے پہلا مصلوب

حضرت خبیب رضی اللہ عنہ

از:- سید خواجہ معین الدین ایم اے، بی۔ایڈ

اسلام نے اپنے سچے پرستاروں کو محبوبیت کا وہ درجہ عطا کیا کہ دنیا کی کوئی طاقت، کسی فرعون کا جلال و جبروت، کسی شداد کا ظلم و تشدد، روئے زمین کا مال و متاع اور کوئی جان لیوا حادثہ ان کے پایۂ استقلال کو ڈگمگا نہ سکا۔ جب تک مسلمان اس جذبے سے سرشار رہے اسلام کو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوا۔ جب ان کی یہ اسپرٹ ختم ہوگئی تو ہر کس و ناکس مسلمانوں کو بدلی ہوئی نظر سے دیکھنے لگا۔

تاریخِ اسلام فدائیوں کے سرفروشانہ کارناموں سے اٹی پڑی ہے۔ ایک دفعہ جب انھوں نے دینِ اسلام کو سینے سے لگایا، زبان سے اللہ اور رسول کا کلمہ پڑھا، دل میں اللہ کے نور اور نگاہ میں محمدؐ کے جلوے کو بسا لیا تو جسم سے خون کے فوارے کا ابلنا قبول کر لیا مگر ہاتھ سے محمدؐ کا دامن چھوڑنا گوارہ نہ کیا حضرت بلالؓ۔ عامر بن فہیرہؓ۔ ابو فکیہہؓ۔ حضرت زبیرؓ بسینہؓ۔ ہندیہؓ۔ ام عبیسؓ۔ وغیرہ بے کس غلام اور مجبور باندیاں تھیں۔ کوئی انھیں کوڑے مارتا کوئی تپتی ہوئی ریت پر لٹا کر جسم پر پتھر کی بھاری بھاری سلیں رکھ دیتا، کوئی گلے میں رسّی اور پیر میں بیڑی ڈال کر بازاروں میں گھسیٹتا اور چھوکروں سے سنگسار کرواتا تھا مگر اللہ کے ان بندوں نے دین سے پلٹ جانا تو بڑی بات تھی زبان سے اُف تک نہ کی بلکہ دُرّوں کی ہر ضرب پر ان کی زبانوں سے حق کا نعرہ بلند ہوتا تھا اور فضائے بسیط سے گونج کی صدا آتی تھی۔ مجھے آج ویسے ہی ایک سرفروش کا ذکر کرنا ہے۔ جو اسلام کا سب سے پہلا مصلوب کہلایا اور تختۂ دار پر آخری وقت تک ثابت قدم رہا۔ اس کے چہرے پر کوئی پریشانی اور گھبراہٹ کے آثار نمودار نہ ہوئے بلکہ وہ مسکراتا ہوا جان بحق ہوگیا۔ میری مراد حضرت خبیبؓ سے ہے جو زندگی میں مجاہد اور موت کے وقت مسرور تھے۔ اور جب میّت کے ساتھ بے حرمتی کی گھڑی آئی تو بلیغ الارض بن گئے۔ انھوں نے دنیا کو دکھلا دیا کہ اسلام کے نشے میں سرشار اور متوالے سولی کے پھندے سے کھیلتے ہوئے صبر و تحمل اور فدائیت کی ایسی مثال

قائم کرتے ہیں کہ تاریخ ان کا بدل پیش نہیں کر سکتی۔
چوتھی سنہ ہجری تھی، مکّے کے مشرکوں نے احد کے میدان میں جب دوبارہ منہ کی کھائی اور اسلام کے غازیوں نے ان کا سارا کس بل نکال کر رکھ دیا تو ان کی آتشِ حسد اور بھڑکی وہ عیاری اور مکاری جیسے اوچھے ہتھیاروں سے کام لینے پر اتر آئے۔ چنانچہ چند لوگوں کو بہکا کر حضرت رسولؐ کی خدمت میں اس گزارش کے ساتھ حاضر ہوئے کہ ہم نے تو اسلام قبول کر لیا ہے، مگر ہمارے قبیلے کے دیگر لوگ منتظر ہیں کہ آپ کے چند معلّم اور مبلّغ وہاں آئیں اور انھیں دین کی تعلیم دیں۔ تو حضرت رسول اللہ نے دس صحابہ کا انتخاب کیا۔ حضرت عاصم بن ثابتؓ کو امیر مقرر فرمایا اور ان کے ساتھ بھجوایا جب یہ قافلہ مقام رجیع پر پہنچا تو سوچے ہوئے پلان کے مطابق دو سو کافروں نے انھیں آگھیرا اور جنگ و قتال شروع کر دیا۔ آٹھ صحابہؓ نے اپنی بہادری کے جوہر دکھلاتے ہوئے جامِ شہادت نوش کیا۔ دو صحابہ حضرت خبیبؓ اور حضرت زید بن دثنہؓ بچ رہے جنھیں گرفتار کر کے وہ سیاہ بخت مکّے لے گئے اور وہاں حارث بن عامر اور صفوان بن امیہ کے ہاتھوں سو اور پچاس اونٹوں کے عوض بیچ دیا۔ اب یہ دو صحابی ان کے غلام ٹھہرے۔ اُن بدنفسوں نے نبیؐ کے دلاروں کو جی بھر کر ستایا اور جب ستاتا کر تھک گئے تو قید و بند میں رکھ

کر ان پر دانہ پانی حرام کر دیا مگر یہ سرفروش متوالے ایسے نشے میں سرشار تھے جسے کوئی ترشی نہیں اتار سکتی تھی۔ چنانچہ ان کے پائے ثبات کو جنبش نہ ہوئی۔ ایک دن ایسا ہوا کہ حارث کا چھوٹا بچہ کھیلتے کھیلتے حضرت خبیبؓ کے پاس پہنچا، اس کے ہاتھ میں چھری تھی۔ حضرت نے وہ چھری اس کے ہاتھ سے لے لی اور بڑے پیار و محبت سے اس معصوم کو اپنی گود میں بٹھا لیا۔ یہ دیکھ کر حارث کی بیوی چلّا اٹھی اور سمجھا کہ خبیبؓ اس کے بچے کا کام تمام کر دیں گے۔ حضرت نے فرمایا۔ بی بی! گھبراؤ نہیں ہمارے پیارے رسولؐ نے ہمیں سکھایا ہے کہ ہم بچوں سے پیار و محبت کریں معصوموں کی جان کی حفاظت کریں۔ اسلام غدّاری سفّاکی، بے رحمی اور ناانصافی جیسی برائیوں کو مٹانے کی تعلیم دیتا ہے۔ مجھ سے ایسی توقع نہ رکھنا" یہ کہتے ہوئے بچے کو اس کی ماں کی گود میں دیدیا۔ حضرتؓ کی شفقت دیکھ کر ماں کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے اور محسوس کیا کہ اس کے دل میں کوئی تاثیر کروٹ لے رہی ہے۔ مگر شوہر کے ڈر سے چپ تھی۔ اس نے یہ بھی دیکھا کہ "حضرت خبیبؓ کے ہاتھ میں انگور کا خوشہ ہے اور وہ بڑے مزے سے انگور کھا رہے ہیں حالانکہ ان دنوں مکّے میں ایسا کوئی میوہ نہیں مل سکتا تھا یقین ہے کہ یہ تحفہ انہیں غیب سے ملا ہوگا۔"

حارث نے دیکھا کہ اس کی تمام تدبیریں الٹی ہو گئیں اور خبیب رضی اللہ عنہ ٹس سے مس نہ ہوئے تو حضرت رض کو سولی کے تختے پر کھڑا کر کے پوچھا۔ "تمہاری کوئی آرزو ہے؟"

آپ نے فرمایا "دو رکعت نماز کی مہلت دو" حضرت کہتے ہیں کہ "میں نے نماز مختصر کر دی تا کہ دشمن یہ نہ سمجھے کہ میں موت سے ڈرتا ہوں۔ اس لئے نماز کا سہارا لے کر کھڑا ہوں" بستی کے سبھی لوگ وہاں جمع ہوئے اور دیکھا کہ وہ تختہ دار پر بھی ہشاش بشاش نظر آرہے ہیں۔ اور ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی ہے۔ مسکراہٹ کیوں نہ کھیلے گی۔ ان کی نظر میں اللہ کا جلوہ، دل میں رسول ﷺ کی محبت اور سر میں شہادت کا سودا تھا۔ وہ جذب اور محبت بھرے اشعار پڑھ رہے تھے کہ مجھے کوئی گھبراہٹ نہیں، افسوس اس بات کا ہے کہ نبی ﷺ سے دور ہوں ورنہ وہ بھی میرے صبر اور استقلال کو دیکھ کر خوش ہوتے۔ خدا کی قسم میں نے اسلام پر جینے اور ایمان پر مرنے کی آرزو کی ہے۔ خدا میری آرزو پوری کرے گا..."

حارث نے کہا "اب بھی موقعہ ہے" تو جواب دیا "ایک نہیں ہزار جانیں بھی اسلام پر قربان ہو جائیں تو مجھے پرواہ نہیں"

پھر اس نے طعنہ دیا "تیرے دل میں یہ آرزو ہوگی کہ تیری جگہ تیرا نبی دار پر ہوتا اور تو خوش خوش اپنے گھر چلا جاتا کیونکہ اسی نے تجھے یہ دن دکھایا" تو حضرت نے دلیرانہ جواب دیا۔ "مجھے یہ تک گوارہ نہیں کہ میں گھر میں بیٹھا رہوں اور پیارے محمد ﷺ کے پاؤں میں ایک کانٹا بھی چبھے" ادھر کافروں نے حضرت کے جسم کو نیزوں سے چھلنی کر دیا اور ادھر مسجد نبوی میں ترجمان وحی نے سنا دیا کہ جبرئیل نے خبیب رض پر سلام بھیجتے ہوئے خبر دی ہے کہ وہ واصل بحق ہو گئے۔"

حضرت زبیر رض اور مقداد نعش لانے کے لئے بھیجے گئے۔ وہ رات کی تاریکی میں پہرہ داروں کی موجودگی میں نعش کو دار سے اتار کر گھوڑوں پر مدینہ لانے لگے۔ صبح جب خبر ہوئی تو ستر سواروں کو دوڑایا گیا مگر لاحاصل۔

مسلمانو! تم بھی ان فدائیوں کی طرح اپنے میں جذبہ بلکہ جاں نثاری پیدا کرو اور اسلام کی حفاظت کے لئے ہر طرح کی قربانی کے لئے تیار ہو جاؤ، بزرگان سلف کے اسوہ کو اپنے لئے مشعل راہ بناؤ تو اللہ کی تائید اور نصرت تمہارے شامل حال رہے گی۔

عرب لشہ فائد کشمیری

قطعہ

نبی ﷺ کی دل میں محبت نہیں تو کچھ بھی نہیں
اگر نصیب یہ دولت نہیں تو کچھ بھی نہیں
عمل سے تقوے سے کچھ فائدہ نہیں ہوتا
رسول ﷺ پاک سے نسبت نہیں تو کچھ بھی نہیں

نعت

بیدار وارثی
اٹاوہ دیوہی

سربمہر راز تھی مینائے ساقیٔ لم یزل
تھی خمِ توحید میں صہبائے ساقیٔ ازل
تھا نہ کوئی ناقدِ صہبائے ساقیٔ ازل
کون لیتا بے سبب سودائے ساقیٔ لم یزل

میکدہ تھا تھی رندوں کی مگر شورش نہ تھی
جام تھا ساقی تھا لیکن جام کی گردش نہ تھی

عالمِ تقدیر میں تھا عالمِ روحانیات
بے تعلق سی تھی کیفِ سرمدی سے کائنات
حسن کی جانب نہ پڑتی تھی نگاہِ التفات
راز کی صورت میں تھے حسن و محبت کے صفات

جلوۂ حسنِ ازل تھا طالبِ جلوہ نہ تھا
گلشنِ وحدت تھا لیکن بلبلِ شیدا نہ تھا

یک بیک پردے سے نکلی اک شبیہِ نور بار
مائلِ سجدہ جبیں جلوہ طلب چشمِ نزار
ہر تڑپ تھی جس کے دل کی غیرتِ برق و شرار
جلوہ سامانی پہ جسکی ماہِ دو ہفتہ نثار

مطلعِ وحدت کرم کی بارشوں سے دھل گیا
کنت کنزاً مخفیاً کا راز سارا کھل گیا

وہ شبیہِ پاک آئی ناز فرماتی ہوئی
اضطرابِ شوق سے ہر دل کو گرماتی ہوئی
بربطِ عشق و جنوں پر زمزمے گاتی ہوئی
ہستیٔ بے حس میں تازہ روح دوڑاتی ہوئی

تھی محبت ہو گئی بے تاب سازِ حسن پر
رفتہ رفتہ بن گئی مضراب سازِ حسن پر

نغمۂ سوزِ محبت دل سے جاری ہو گیا
گونج اٹھا عالمِ ہو کیف طاری ہو گیا
روح کا ہر جذبہ وجہِ بیقراری ہو گیا
عالمِ تسکین وقفِ آہ و زاری ہو گیا

دے کے چھینٹے اپنے ہی خونِ دلِ ناشاد سے
حسن کا سادہ ورق رنگیں کیا فریاد سے

دیکھ کر رنگِ محبت میں کمالِ زندگی
آ گئی ذراتِ تیرہ بخت میں تابندگی
جب نظر آنے لگی یہ صورتِ پائندگی
کارگاہِ بے ثباتی کو ہوئی شرمندگی

مٹنے والا نقشِ حسن جاودانی ہو گیا
دہرِ فانی میں سراپا زندگی ہو گیا

بیکسوں کی اور یتیموں کی خدائی ہو گئی
طالعِ بیدار سے عقدہ کشائی ہو گئی
غیرتِ شاہی گداؤں کی گدائی ہو گئی
جذبِ دل کی حسنِ مطلق تک رسائی ہو گئی

اللہ اللہ ری محبت کی کرشمہ سازیاں
بڑھتے بڑھتے بن گئی حقا بزمِ کن فکاں

افضل کاظمی
افسر انتظامی محکمۂ زراعت۔ کرنول۔

تعارف کتاب "سراج السالکین"

سراج السالکین اُردو ترجمہ ہے نایاب و نادر نسخہ "معراج السالکین" کا جس کو ۱۱۷۲ ہجری میں حضرت شاہ اعظم علی الحسینی الچشتیؒ نے فارسی میں تالیف فرمایا تھا آپ خلیفہ ہیں حضرت شاہ فقیر علی شاہؒ کے کتاب کا موضوع سلوک اور تصوف ہے۔ چونکہ صاحب تالیف کا مسلک و طریق چشتیہ تھا۔ اس لئے کتاب کا مواد حوالے اور اقوال بزرگان چشت سے ماخوذ ہیں۔ تاہم ہر مسلک و طریق کے حامل اس کتاب سے بغیر کسی تعصب کے خاطر خواہ استفادہ کر سکتے ہیں۔ کتاب کی زبان پیاری انداز تخاطب مربیانہ اور بیان دلپذیر ہے۔ عام طور پر اس موضوع کی کتابوں میں یا تو بزرگان سلف کے حالات ملتے ہیں یا تصوف و سلوک حقائق و دقائق پر دلائل اور بحث اور بعض تو خالص منطقی انداز لئے ہوتی ہیں۔ ویسا اس کتاب میں نہیں۔ بلکہ صاحب تالیف نے اہل ذوق کے لئے درجہ بدرجہ ترقی کرنے اور ایک مقام سے دوسرے مقام کو جانے میں نہ صرف قابل عمل طریقہ تعلیم و تفہیم بلکہ ترغیب کا طریقہ اپنایا ہے اور بہت بڑی بات تو یہ ہے کہ صاحب تالیف نے پہلے خود مقامات سلوک کو طے کیا تب یہ کتاب لکھی جیسا کہ کتاب کی تمہید میں خود ذکر کرتے ہیں۔ سوائے ان چند باتوں کے جہاں استاذ پیر و مرشد کی شخصی تفہیم ضروری ہے۔ ہر بات صاف اور کھول کھول کر بیان کی گئی ہے کہ پڑھنے والے کو تشفی ہو جائے۔ چونکہ موضوع وجدان و حال سے متعلق ہے اس لئے مطالعہ کرنے والوں کے لئے یہ بات باقی رہ جاتی ہے کہ اپنے کتابی علم کو تجربی علم پر لے جائے۔ معلوم کو محسوس میں میں بدل دے اور محسوس کو مشاہدے میں لائے۔

کتاب کی تالیف کے صرف ۱۴ سال بعد ہی حضرت شاہ اسمٰعیل صاحبؒ کے ایک مرید شریف محمد باقر صاحب مرحوم نے صاحب تالیف کے مرید شیخ سعد اللہ صاحب مرحوم کی معرفت کتاب حاصل کر کے محرم ۱۱۸۶ھ میں نقل تیار کی اور یہی منقول قلمی نسخہ آج میرے پاس ہے جس کو میں نے اردو جامہ پہنا کر سراج السالکین سے موسوم کیا ہے تاکہ اردو داں حضرات بھی اس سے استفادہ کر سکیں۔ اگرچہ اخراجات طباعت کی گراں باری مانع ہے پھر بھی اشاعت کی کوشش جاری

ہے کہ اس کو طبع و شائع کیا جائے۔ انشاء اللہ تعالیٰ دھو المستعان۔

آخر میں اس کتاب سے چند اقتباسات ہدیۂ ناظرین کئے جاتے ہیں۔

رُکن اول۔ راہ راست۔ لازم الوجود عنصری

اے برادر! روح میں ایک ایسی صفت رکھی گئی ہے کہ وہ جس کی صحبت اختیار کرے اسی کی مطیع ہو جاتی ہے اس کا رنگ اختیار کر لیتی ہے اور اپنی اصلی حالت کو قطعاً بھول جاتی ہے۔ روح لطیفۂ الٰہی ہے اور حق سبحانہ تعالیٰ کے حکم سے جسم سے تعلق پکڑتی ہے۔ عناصر بے جان اور اپنی صفت کے اعتبار سے مردہ ہوتے ہیں اور آپس میں ایک دوسرے سے مختلف خاصیتیں رکھتے ہیں۔ جب روح تعلق پکڑتی ہے تو ان کو حیات بخشتی ہے اور یہ سب زندہ ہو جاتے ہیں اور علحدٰہ اپنی صفات کے علحدٰہ علحدٰہ ظاہر ہوتے ہیں اور روح ان کی تابع ہو کر لذت حاصل کرتی ہے اور وہ اسی بنا پر حواس خمسہ کی عاشق و فریفتہ و دیوانہ ہو جاتی ہے۔

اے سالک! روح عناصر کا لباس پہن کر یعنی ان کی صفت اور خاصیت اختیار کر کے ان کے تابع ہو گئی اور ان کے صفات ذمیمہ نے جیسے حرص۔ کبر۔ کینہ۔ بغض۔ عداوت۔ غضب، ریا، نفاق، خطرہ شہوت۔ خوب کھانا۔ خوب سونا، اسباب دنیوی میں دل لگانا۔ یادِ حق میں کاہلی علی ہذا القیاس مع دیگر صفات مذمومہ نے اپنے اپنے مرتبہ پر پیدا ہو کر روح کو اپنا مغلوب کر دیا وہ امر حق اور اس کی کمال توجہ سے نمود پائے اور اپنی فطرت پر ہوتے اس لئے بمنزلہ ابلیس پیدا کئے گئے۔ وجود ابلیس خود عناصر سے مرکب ہے۔ صفت تکبر آتش کی خاصیت ہے اور وہ اس پر غالب آئی اس نے حکم حق کے خلاف عمل کیا اور کہا انا خیر منه یعنی میں آدم سے بہتر ہوں اور یہ بھی کہا اس نے خلقتنی من نار و خلقته من طین یعنی پیدا کیا مجھ کو آتش سے اور اس کو (آدم) کو آب و گل سے (پانی اور مٹی سے) کیا اس لئے جمہور محققان رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اس کی ماہیت دریافت ہونے کے بعد اس مرتبہ کا نام مقام شیطانی رکھا۔

اے یار! جملہ عوام اور خلق اپنی صفات کی خواہشات میں گرفتار ہیں۔ اور امر حق بجا نہیں لاتے اور کہتے ہیں کہ شیطان قاطع الطریق ہے۔ افسوس افسوس اتنا نہیں جانتے کہ راہ زنی شیطان خود ہم کرتے ہیں اور بعد ابدی میں گرفتار ہیں اس باب میں نص قرآنی صریحاً اور صاف واقع ہے۔ ان النفس الامارة بالسوء یعنی بے شک نفس امارہ حکم کرنے والا ہے بدی کی طرف لے عزت خوٹے بدرا بہانہ بسیار۔ لکھا جاتا ہے کہ زنا چوری لواطت سحر۔ خون ناحق جنگ کفار سے جی چرانا ریا۔

شراب۔ مال یتیموں کا کھانا۔ ظلم کرنا۔ اور اسی قسم
کے دیگر افعال وغیرہ فریب شیطانی ہیں اور اس فقیر
کے نزدیک کھلنے والے ہیں فریب شیطانی کو دوسرے
یہ کہ صاحب نفس پر اثر ڈالنے والے ہیں اور جو کوئی
نفسانیت سے بری ہے۔ اور ان افعال سے کہ
یہ کس سے سرزد ہوئے ہیں فریب شیطانی سے دور
ہے اور یہ امر حق اسرار سے میں کما حقہ موجود ہے کہ
وہ مومن کیا گیا۔

اے عزیز! اگر معرفت حق کی طلب ہے تو جام
زہد کا جیسا کہ بیان کیا گیا ہے۔ اہتمام کرنا کہ
معرفت حاصل ہو چنانچہ عارف کہتے ہیں ؎

لباس زہد و تقوی نپوشی
شراب معرفت ہرگز ننوشی

جب سالک دفع صفات زبونہ اور حصول شوق
میں مشغول ہو تو چاہئیے کہ جو صفت سب سے کمزور
اور ضعیف تر ہے اس سے شروع کرے اور بعد
ازاں درجہ بدرجہ قوی کی طرف متوجہ ہو اگر اول
قوی سے شروع کرے گا تو ایسا نہ کر سکے گا جب
مشغول اور مجاہد ہو جائے تب ہمیشہ اپنے نفس
کے ساتھ محاسبہ کرتا رہے تاکہ فریب نفس اور
تلبیسات نفس کو دفع کر سکے اور تمام حجابہائے نفس
ماسوی دفع ہو سکیں اور سر معرفت حق کے کشف
تک پہونچ جائے۔

حضرت شرف الدین یحیی منیری کے ملفوظات

"معدن المعانی" میں لکھا ہے کہ حجاب چار ہیں خلق۔ دنیا
نفس۔ شیطان۔ خلق طاعت و عبادت کا حجاب ہے
دنیا آخرت کا حجاب ہے۔ شیطان دین کا حجاب ہے
اور نفس بندے اور خدا کے درمیان حجاب ہے۔
گنتی کے لئے تو یہ حجاب چار ہیں لیکن از روئے تحقیق
معلوم ہوا کہ ان سب کا اصل صرف نفس ہی ہے۔
خلق کے ساتھ اختلاط نفس کے خاطر ہوتا ہے کار دنیا
میں مشغول ہونا بھی نفس کی خاطر ہے۔ شیطان کی
موافقت اور اس کے کہنے پر چلنا بھی خود حظ نفس
کی خاطر ہوتا ہے۔

خواجہ بایزید بسطامیؒ سے منقول ہے کہ ایک
شب آپ کو قرب رب العزت خواب میں حاصل ہوا
آپ نے سوال کیا الٰہی کیف الطریق الیک
الٰہی تیری طرف آنے کا کونسا راستہ ہے تو ارشاد
ہوا دع نفسک تیرے نفس کو چھوڑ دے
(دور کر) یہ نہیں کہا گیا کہ دنیا کو چھوڑ شیطان کو دور
کر نماز پڑھ روزہ رکھ بلکہ ترک نفس کا ارشاد ہوا
اس میں اس بات کا اشارہ ہے کہ نفس اصل ہے تمام
حجابات کا اگر نفس سے اوپر بھی کوئی حجاب ہوتا
تو اس کو ترک کرنے کا ارشاد ہوتا۔ اسی لئے کہتے
ہیں کہ جب تک ترک نفس نہیں کیا جاتا مکاشفہ تک
رسائی ممکن نہیں۔

یہاں مختصر سی فہرست مضامین کتاب ہے۔
(عنوانات) بغرض معلومات درج کی جاتی ہیں۔

کتاب ایک تمہید، مقدمہ، دو ابواب اور خاتمہ پر مشتمل ہے

۱۔ تمہید ۔ مولف نے اپنا تعارف کرایا ہے اور سبب تالیف لکھا ہے۔

۲۔ مقدمہ ۔ صدق ارادت اور اس کے آداب بیان کئے ہیں۔

۳۔ رکن اول ۔ راہ راست۔

ذیلی عنوان ۔ وصل اول ۔ واجب الوجود کے بیان میں۔

وصل دوم ۔ ممکن الوجود کے بیان میں۔

وصل سوم ۔ ممتنع الوجود کے بیان میں۔

وصل چہارم ۔ عارف الوجود کے بیان میں۔

وصل پنجم ۔ واحد الوجود کے بیان میں۔

۴۔ رکن دوم ۔ منزل مقصود جس میں نکات توحید بیان کئے گئے ہیں

۵۔ خاتمہ کتاب جس میں خصوصی ہدایتیں سالکوں کے لئے درج ہیں۔

اقوال بزرگان سلف ۔ شریعت پر عامل ہونے کے لئے نصائح۔ ان صوفیوں کے افکار کی تردید جو شریعت کو عوام کے لئے سمجھتے ہیں اور خود اس کے پابند نہیں ہوتے وغیرہ

علامہ نجم آفندی مرحوم

غزل

قناعت کیا رہے گی مصرفِ نقد و نظر ہو کر
غنیمت ہے جو کوئی عیب رہ جائے ہنر ہو کر

کئی قیدیں بڑھیں منت گزارِ بال و پر ہو کر
دوائے دردِ دل آئی عذابِ دردِ سر ہو کر

سکوں حاصل ہے مجھ کو بندگی میں بھی محبت کی
تمہیں راحت نہیں ملتی خدائے سیم و زر ہو کر

ہزاروں قہقہوں میں گم نہ ہو جائے صدا میری
اکیلا کیا کروں انسانیت پر نوحہ گر ہو کر

نظر آئے ہمیشہ عیب اوروں کے ہنر اپنے
نگاہوں نے دغا دی عارفِ عیب و ہنر ہو کر

اجل ہوگی وہ کیسی جینے والے سوچتے ہونگے
اجل کو ڈھونڈتا ہوں زندگی سے بے خبر ہو کر

ہنرمندوں کا آپس میں حسد اے نجم کیا معنی
ہنر سے دشمنی رکھتے ہیں یہ اہلِ ہنر ہو کر

قسط سوم

شاہنامہ اسلام میں حضورؐ کی سیرت نگاری

ڈاکٹر یعقوب عمر
ریڈر فارسی جامعہ عثمانیہ

شاہنامہ اسلام کی تیسری جلد مکمل طور پر جنگ اُحد کے بیان میں ہے یہ جنگ اکثر سیرت نگاروں کے لئے صبر آزما ثابت ہوئی ہے۔ چنانچہ یہاں پر مورخ اور سیرت نگار کو دم شمشیر پہ چلنا پڑا ہے۔ یہ جنگ مسلمانوں کی ثابت قدمی کا سب سے بڑا اور روح فرسا امتحان تھا جو اللہ تعالیٰ نے لیا تھا دراصل یہ جنگ ایک قوم کو کڑی تربیت سے گزارنے کی ایک عظیم الشان آزمائش تھی۔ نظم وضبط کی اہمیت کو اس کے تمام عملی نتائج وعواقب کے ساتھ ایک اُبھرتی ہوئی قوم پر اجاگر کرنا تھا چنانچہ مسلمان ایسی دو کڑی آزمائشوں سے گزر کر کندن بنے۔ ایک جنگ حنین کی آزمائش اور دوسری جنگ احد کی۔ جنگ احد کی آزمائش سب سے زیادہ کڑی تھی۔ ان دو امتحانوں سے گزر جانے کے بعد نظم وضبط کی حامل اس قوم نے اپنی فرمانروائی کا سکہ عالم آب وگل پہ کئی صدیوں چلایا اور ہر میدان میں کامیاب رہی۔

اس صبر آزما جنگ میں کئی نازک مقام آئے ہیں جہاں حفیظ کا قلم مبہوت ہو کر رہ گیا ہے۔ نامور شاعر کے اندر کے چھپے سیرت نگار نے بڑی مستعدی سے حفیظ کے رہوار قلم کی باگ تھام رکھی ہے۔ چنانچہ اس نے ان دشوار گزار مرحلوں کا ذکر ابتدا ہی میں کیا ہے کہ

قیامت تک لہو ٹپکے نہ کیوں جسم مسلماں سے
احد کی داستاں رنگین ہے خونِ شہیداں سے

مسائل میں اُلجھنا واقعی منصب نہیں میرا
مگر معذور رکھے آج مجھ کو نکتہ چیں میرا

اُحد کی گھاٹیوں میں کچھ مقام ایسے بھی آئیں گے
جہاں رہرو نشانِ منزلِ مقصود نہ پائیں گے

مجھے احساس ہے اے دوست میری ذمہ داری کا
یہ نازک مرحلہ محتاج ہے صحت نگاری کا

صداقت سے اگر معذور ہوں معذور رہنے دے
مجھے قافی خیالی شاعری سے دور رہنے دے

جیسا کہ حفیظ دوسری جلد میں ہی بیان کر چکا ہے کہ مسلمانوں کا لشکر مدینے سے باہر نکل کر میدان اُحد کی طرف گامزن ہوتا ہے۔ اس لشکر میں دو قسم کے لوگ تھے ایک تو منافق ہیں اور دوسرے سچے مسلمان۔ منافقوں کے متعلق حفیظ لکھتا ہے سے

مدینے سے ہی نکلے تھے منافق بھی مدینے کے ؎ سفینے ہی میں بیٹھے تھے مخالف بھی سفینے کے
انہیں دعوائے ایماں تھا مگر ایماں نہ لائے تھے ؎ یہ زحمت کوش بھی گردامن رحمت میں آئے تھے

"یہ اک قبیل منافق تھا نبی کی فوج میں شامل
رہی داستان قسمت راہ چہ سُوواز رہبر کامل"

دوسرا گروہ سچے مسلمانوں کا تھا ۔

شریف انسان اس میدان میں اللہ والے تھے یہ چند اصحاب تھے لیکن زمانے سے نرالے تھے
یقین رکھتے تھے یہ اللہ کی شانِ جلالت پر یہی ایمان لائے تھے محمدؐ کی رسالت پر
گدا و شاہ میں تھی ایک وجہ امتیاز ان کو نظر آتا تھا سجدہ فرقہ برہی سرفراز ان کو
یہی دے کے دنیا میں مددگار محمدؐ تھے یہی بندے مہاجر اور انصار محمدؐ تھے
تہی دامن نہیں آئے تھے دربار شہادت میں
متاع جان و دل لائے تھے بازار شہادت میں

اسلامی شریعت کی رواداری کی بہترین مثال یہ تھی کہ منافقوں کے واضح طرز عمل کے باوجود ان سے باز پرس نہیں کی جاتی تھی ان کے زبانی اسلام پر ہی اعتبار کر لیا جاتا تھا۔ ظلمتوں کی یلغار میں اسلامی طرز عمل کا یہ درخشاں سورج آج بھی اقوام عالم کے لئے راہنما ثابت ہو سکتا ہے اور علانیہ قومی نسلی اور سیاسی تشدد کا خاتمہ کر سکتا ہے۔ اسلام کا زریں اصول یہی ہے کہ جب تک کوئی کھلم کھلا اپنے طرز عمل سے یہ ثابت نہ کر دے کہ وہ باغی ہے جب تک دار و گیر کے ہاتھ اس کے دامن تک پہنچانا شریعت کے خلاف ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ سے یہ حقیقت نمایاں ہے کہ جو ایک ہزار افراد حضورؐ کے ساتھ مدینے سے نکلے تھے ان میں سے تین سو منافقوں کی روش سے بغاوت کا اظہار ہو رہا تھا۔

وہ ان کی نیتوں ان کے ارادوں سے بھی واقف تھا وہ ان فتنوں کے آئندہ فسادوں سے بھی واقف تھا
مگر جب تک زبانیں ان کی تھیں اللہ کی اقراری شریعت ان سے کر سکتی نہ تھی اظہار بیزاری
رسالت نے ہمیشہ رحم کھایا حال پر ان کے کیا شاید فقط اعمال کو اقوال پر ان کے
یہ جذبہ رواداری گمراہ اور بھٹکے ہوئے انسانوں کی تالیف قلب کے لئے ضروری بھی تھا
بجز ان شیطان صفت چند لوگوں کے جو کبھی راہ پر آنے والے نہیں تھے مگر اس قیاس پر پورے
معاشرے کو سزا نہیں دی جا سکتی تھی۔ لہذا رواداری کے ذریعے اصول سے کام لیا گیا کیونکہ اللہ
کے رسول کو امید تھی کہ اسلامی طرز عمل کی رواداری یقیناً بیکار نہیں جائے گی ۔
انھیں کاموں میں امید گل توحید تھی اسکو کہ ان کی نسل سے اسلام کی امید تھی اسکو

جنگ احد بڑی غیر معمولی جنگ تھی اس میں کئی حکمتیں پوشیدہ تھیں۔ اس نے اسلامی تعلیمات کے کئی پہلو اجاگر کئے ہیں۔ حضور کا مشاورت کرنا۔ مدینے سے باہر نکل کر جنگ کرنے کے فیصلے کو قبول کر لینا نوجوان صحابہ کرام کا آنے والے غیر معمولی واقعات کو محسوس کرتے ہوئے تبدیلی فیصلہ کا اصرار۔ فسخ عزیمت سے حضور کا انکار وغیرہ وغیرہ۔ یکے بعد دیگرے ان تمام واقعات میں کئی حکمتیں پوشیدہ تھیں چنانچہ انس، لڑائی سے پہلے تین سو منافقوں پر مشتمل گروپ کا لڑائی سے منہ پھیر کر مدینہ لوٹ جانا بڑا اہم واقعہ تھا۔ اس میں مصلحت اور حکمت عملی کے یہ پہلو سامنے آتے ہیں کہ اگر مدینہ میں رہکر لڑائی ہوتی تو یہ تین سو منافقین مدینہ کے اندر ہی اندر ایک قیامت برپا کر دیتے۔ مدینے سے کافی دور پہ ان کا لشکر اسلام سے علیحدہ ہو کر مدینہ لوٹ جانا بہت اچھا ہوا ورنہ یہ لشکر اسلام میں موجود رہکر بدترین نقصان کا موجب بن جاتے ؎

ہوئے بہر جہاد اسلام کے غازی جو صف بستہ ٭ تو انہوں منافق نے مدینہ کا لیا رستہ
احد میں فوج مسلم پر یہ پہلی ضرب کاری تھی ٭ بقیہ فوج پر اس وقت اک عبرت سی طاری تھی
ابھی ساعت نہیں آئی تھی خنجر آزمائی کی
کہ پورے تین سو افراد نے یوں بے وفائی کی

آنحضرت ؐ نے مجاہدین اسلام کے لشکر کی صف بندی شروع کرنے سے پہلے پچاس ماہر تیر اندازوں کو پچھلی گھاٹی پر متعین کرتے ہوئے نصیحت کی ؎

کہ یہ گھاٹی بہت ہی سخت ہے اللہ کے بندو ٭ سنا لو کہ ڈٹ جاؤ یہاں اے کوہ مانندو
شکست و فتح کی ابھی بری کوئی بھی صورت ہو ٭ تمہاری رائے میں ہم کو مدد کی بھی ضرورت ہو
تمہے رہنا اسی ٹیلے پہ ہر دم باخبر رہنا ٭ کوئی صورت ہو مضبوطی سے اپنا حال پر رہنا

اس کے بعد مختلف حصوں میں فوج کی تقسیم کرتے ہوئے میمنہ، میسرہ اور قلب پر ممتاز صحابۂ کرام کو افسر بنایا۔ حضرت مصعب بن عمیر رضؓ علمبردار مقرر ہوئے جب لشکر کی ترتیب ہوگئی تو آپ نے جو خطبہ ارشاد فرمایا وہ اسلام کی عسکری پالیسی کے خد و خال کو واضح کر دیتا ہے کہ اسلام جبر و تشدد کو مٹانے آیا ہے۔ اور لڑائی برائے ظلم روا رکھنا اس کے اصولوں کے خلاف ہے اور اس اعلان کے لئے خاتم النبیین کی شخصیت کو رحمۃ للعالمین بنا کر خود پروردگار عالم نے اہل عالم کے سامنے پیش کیا تھا حضور نے ؎

کہا جب تک نہ دشمن خود کرے اقدام لڑنے کا ٭ ہماری سمت سے ہرگز نہ آئے نام لڑنے کا
بگوش و ہوش سن لو یہ نصیحت اے مسلمانوں ٭ ہے کہ مخلوقات کا حق اپنے حق سے بھی فزوں جانو

فقط خوشنودیٔ خالق اسی پر ہے مسلمانو ٭ کہ پیغمبر کرے جو حکم لازم اسکو گردانو

خاص طور پر جنگ احد میں قرآن کی جس تعلیم پر عمل پیرا ہونے کی ترغیب حضور نے بطور خاص دی تھی اس کا زبردست امتحان بھی اللہ تعالیٰ نے اسی میدان میں لے لیا ہے

پیمبر جس عمل کا حکم دے کرنے پہ جھک جاؤ ٭ پیمبر روک دے جس کام سے فی الفور رک جاؤ

جنگ کے لئے دونوں طرف فوجیں تیار ہو چکی ہیں اس موقع پر حفیظ نے نہایت پر اثر انداز میں دونوں فوجوں کا تقابل کیا ہے کافروں کی فوج کے متعلق رقم طراز ہیں ؎

گھٹائیں ابر ظلمت بار کی میدان پر چھائیں ٭ زبانیں اژدھوں کی بیرقیں بن بن کے لہرائیں

پناہِ سینہ ہائے کینہ پرور بن گئی ڈھالیں ٭ ضیائے مہر کے مدّ مقابل تن گئی ڈھالیں

اور یہ فوج حق پرستوں کے لشکر کے خلاف صف بستہ تھی ؎

قطاریں پیدلوں کی اور پرے جنگی رسالے کے ٭ یہ سب کس کے مخالف تھے فقط اک کملی والے کے

گروہ کملی والا بھی زمانے سے نرالا تھا ٭ زباں خاموش تھی لیکن اسی کا بول بالا تھا

نہ وہ تیروں سے ڈرتا تھا نہ شمشیر دل آزار سے خائف تھا ٭ مرتب کرکے لشکر محو اوراد و وظائف تھا

ادھر جوشِ نمائش اور اظہار تجمل تھا ٭ ادھر اخلاق عالی تھے متانت تھی تحمل تھا

ادھر تیاریاں تھیں سازشیں تھیں اور تدبیریں

ادھر لاتفسدوا فی الارض کی ہوتی تھیں تقریریں

اس موقعے پر کافروں نے ایک اور چال چلی اور سات سو مسلمان جو ثابت قدم تھے انھیں ورغلانے کے لئے ابو عامر نامی ایک راہب کو بھیجا کہ وہ اپنی چرب زبانی سے اہل مدینہ کو اس جنگ سے الگ ہو جانے پر آمادہ کرے اس نے بہت کچھ اپنی طلاقت لسانی کا مظاہرہ کیا مگر ناکام رہا۔ مایوس ہو کر اس نے اور اس کے غلاموں نے لشکر اسلام پر سنگ باری شروع کر دی ؎

اچانک یوں ہوئے پتھر لشکر اسلام پر برسے ٭ جواب اسلام کو دینا پڑا پتھر کا پتھر سے

بچا کر اپنی جانیں کوئی پیچھے اور کوئی آگے ٭ ابو عامر اور اس کے ساتھ والے ڈر کے بھاگے

اس واقعہ کی منظر کشی کرتے ہوئے بھی حفیظ کے قلم نے اپنے مقصد سے روگردانی نہیں کی اور اسلامی لشکر کی قابلِ تحسین صفات کو اجاگر کیا ہے ؎

بظاہر معرکہ انگیز تھا یہ طرفہ نظارا ٭ صف اسلام نے لیکن نہ اس پر تیغ کو مارا

مزاج کفر واہیات کی یہ تو عادت تھی ٭ کہ دشمن کی ہزیمت سے بھی عبرت ان کو حاصل تھی

ابوعامر کا بیٹا حنظلہؓ مسلمان تھا اور حضورؐ کے لشکر میں موجود تھا اس نے حضورؐ سے اپنے باپ کے مقابلے کی اجازت چاہی۔ دستورِ الٰہی کی رُو سے حق و باطل کی جنگ میں رشتوں کا کوئی لحاظ ممکن نہ تھا اگر حضور چاہتے تو اجازت دے سکتے تھے۔ مگر رحمتِ عالم نے یہ گوارا نہ کیا کہ بیٹا باپ پر تلوار اٹھائے۔ چنانچہ اس کا حضورؐ سے درخواست کا منظر حفیظؔ نے یوں کھینچا ہے ؂

اجازت کی طلب میں وہ رخِ رحمت کو تکتا تھا ٭ پسر لیکن پدر پر ہاتھ اٹھائے ہو نہ سکتا تھا
اسی دستور کی ہر جنگ میں رحمت تھی گرویدہ ٭ پسر کے ہاتھ سے قتلِ پدر تھا ناپسندیدہ

عرب دستور کے تحت قریش کے علمبردار طلحہ نے جنگ مغلوبہ سے پہلے مبارزت طلبی کی اور اپنے زعمِ باطل میں انتہائی سوقیانہ انداز میں طنز کرتا ہوا یوں بولا کہ تمہارے عقائد کی رو سے شہید کو جنت ملتی ہے چنانچہ جس کو جنت میں جانا ہو وہ میرے مقابلے پر آئے یا پھر مجھے جہنم روانہ کردے۔ یہ ایسا وار تھا کہ مسلمان جوشِ غضب سے بھر کر اشتعال میں کوئی ایسا اقدام کر بیٹھتے جس کا لشکرِ کفار فائدہ اٹھا لیتا مگر ایسا کیسے ہو سکتا تھا مسلمانوں کی کمانڈر وہ زبردست ہستی تھی جو نظم و ضبط کا بڑا ابرا خیال رکھتی تھی چنانچہ ان اوچھے حملوں سے مسلمانوں کی ثابت قدمی اور بردباری میں گو کوئی فرق نہ آیا۔ مگر آتشِ غیرت نے دل میں آگ ضرور لگا دی تھی۔ چنانچہ طلحہ کی باتیں سنکر ؂

شہادت کی طلب میں غازیانِ شیر دل جھومے ٭ نبی کی سمت دیکھا اور قبضے تیغ کے چومے
اٹھا سینوں سے شعلہ ہر طرف احساسِ غیرت کا ٭ مگر آئینِ ربط و ضبط آئینہ تھا حیرت کا
رسول اللہ کے رخِ مبارک پہ تبسم تھا ٭ زبان خاموش تھی لیکن نگاہوں میں تکلم تھا
مجاہد منتظر تھے بخت کس خوش بخت کا جاگے ٭ کہ اتنے میں علی المرتضیٰ صف سے بڑھے آگے

یہاں اتنا بتا دینا ضروری ہے کہ بحیثیت پیغمبرِ اسلام آپ جس کو آگے بڑھنے کا حکم دیتے وہ بسر و چشم آگے بڑھ جاتا لیکن اس موقع پر آپ بے حد بلند کرداری کا مظاہرہ کرتے ہیں اور اپنے انتہائی عزیز و قریب ترین ہستی سیدنا علیؓ کو جسے خدا اپنی آغوشِ نبوت میں پالا تھا مقابلے کا اذن دیتے ہیں ؂

پے تعظیم جھک کر اور ہادی کی دعا لیکر ٭ بڑھے شیرِ خدا میدان میں نامِ خدا لے کر
نہ سینے پہ زرہ تھی اور نہ سر پہ خود پہنا تھا
فقط تلوار تھی تلوار ہی مردوں کا گہنا تھا

علمبردار طلحہ کا شمشیرِ حیدری نے صفایا کر دیا۔ علم سرنگوں ہو گیا۔ مگر کچھ دیر کے بعد اس کے بھائی ابو شیبہ

نے علم اٹھایا اور مبارزت طلب کی اب بھی حضرت علیؑ کے آگے بڑھنا چاہتے تھے کہ جناب حمزہؓ نے سبقت کی۔ معلوم ہوتا ہے کہ حضور کے قریبی رشتے دار نگاہ پیغمبر کے اشاروں کو بخوبی سمجھتے تھے اور یہ سرکار دو عالم کی بلند کرداری کا انتہائی اعلیٰ نمونہ تھا کہ جاں نثار انصار کے ہوتے ہوئے آپ کی چشم انتخاب اپنے قریبی عزیزوں پر پڑتی تھی اور اس عمل میں جو تعلیم و تربیت پوشیدہ تھی اس کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

وہ حمزہؓ ناز تھا اہلِ عرب کو جس کی طاقت پہ ٭ فدا ہونے چلا تھا اب بھتیجے کی صداقت پر
رسولِ پاک کے چہرے سے اک رقت نمایاں تھی ٭ وہ رحمت تھی کہ جس کی کوئی غایت تھی نہ پایاں تھی
نگاہیں مضطرب ہلکا تبسم روئے زیبا پہ ٭ تصور مطمئن تھا مرضئ عرش معلیٰ پر
ہوا ارشاد اے عمِ حجستہ نام بسم اللہ ٭ خدا حافظ ہے کیجئے نصرتِ اسلام بسم اللہ
فراق عارضی سب کے لئے اک دن مقرر ہے ٭ ملاقات اب لواء الحمد کے نیچے مقدر ہے
یہ فرما کر دکھائی انتہائی شان رحمانی ٭ کہ بڑھ کر چوم لی سرکار حمزہؓ کی پیشانی

دو نورِ نورِ حق سے چہرۂ حمزہؓ چمک اٹھا
جلا کندن نے پائی یہ زرِ خالص دمک اٹھا

الغرض حضرت حمزہؓ نے اپنی شجاعت کے جوہر دکھائے۔ اسی دوران حضور نے اپنے ہاتھ میں تلوار لے کر کہا کہ یہ اسے ملیگی جو آج اس کا حق ادا کرے گا۔ اکابرین میں سے کئی صحابہ نے اسے لینا چاہا مگر حضور نے انکار کیا۔ اتنے میں حضرت ابو دجانہؓ آگے بڑھے اور کہا سرکار میں اس کا حق ادا کر دوں گا چنانچہ آپ نے انھیں تلوار دیدی۔ ابو دجانہؓ کشتوں کے پشتے لگاتے ہوئے فوج کے پیچھے کھڑے ہوئے ایک زرہ پوش کے سر پہ پہنچ گئے۔ اور وار کرنا ہی چاہتے تھے کہ اس نے آواز دی میں عورت ہوں۔ یہ در اصل ہندہ تھی۔ ظاہر ہے کہ سرکار دو عالم کی عطا کی ہوئی تلوار اگر اس پر اٹھ جاتی تو پھر تلوار کا حق ادا نہ ہوتا چنانچہ انھوں نے تلوار روک کر کہا کہ

کہا معلوم ہے گو مجھ کو تیری فتنہ انگیزی ٭ تری آنکھوں سے ظاہر ہو رہی ہے خوئے خونریزی
یہ شمشیر رسالت ہے ستودہ اور محمود ٭ کروں گا میں نہ عورت کے لہو سے اس کو آلودہ

تلاشِ گردنِ مردان پختہ کار ہے اسکو
ضعیفوں عورتوں بچوں پہ اٹھنا عار ہے اسکو

حفیظ نے اپنے اشعار میں ابو دجانہؓ کی زبانی سرکار دو عالم کی جس پالیسی کو اجاگر کیا ہے

وہی اصلی روح اسلام ہے کہ عین حالتِ جنگ میں جب آتشِ انتقام تیز ہوتی ہے۔ اسلام کس درجہ نظم و ضبط کی عملی تعلیم دیتا ہے۔

دو بدو جنگ کے بعد جس وقت جنگ مغلوبہ شروع ہو جاتی ہے اور گھمسان کا رن پڑتا ہے تو مسلمان جانبازوں نے کشتوں کے پشتے لگا دیتے ہیں اور کفار میدانِ جنگ چھوڑ کر بھاگ اٹھتے ہیں۔ کچھ صحابہ ان کا پیچھا کرتے ہیں اور کچھ مالِ غنیمت لوٹنے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ اسی اثنا میں ٹیلے پر مقرر رسالہ بھی جسے سخت تاکید تھی کہ فتح یا شکست کسی صورت میں بھی ٹیلے کو نہ چھوڑے مالِ غنیمت کے لئے ٹیلا چھوڑ کر میدانِ جنگ میں چلا آیا صرف چند وفادار صحابہ ٹیلے پر رہ گئے خالد بن ولید نے جب ٹیلہ خالی دیکھا تو بھاگتی ہوئی قریشی فوج کے ایک رسالہ کو لے کر مسلمانوں پر پیچھے سے حملہ کر دیا یہ حال دیکھ کر قریشی فوج کے دوسرے رسالے بھی پلٹ پڑے اور نہتے مسلمانوں کو دونوں طرف سے گھیرے میں لے لیا جو اپنے ہتھیار رکھ کر مالِ غنیمت کی طرف متوجہ ہو گئے تھے ؎

کیا تھا فوجِ دشمن نے پلٹ کر یوں ہجوم ان پہ
اچانک آ پڑی ہو جس طرح بادِ سموم ان پہ
عدولِ حکمِ ہادی نے دکھائی تھی یہ نیرنگی
جفے فلک نے پھیر لیں آنکھیں زمیں کرنے لگی تنگی

اسلامی لشکر کے علمبردار حضرت مصعب بن عمیرؓ حضور سے مشابہت رکھتے تھے ایک کافر نوجوان ابن قمیہ انہیں سرکارِ دو عالم سمجھ کر شہید کر دیتا ہے اور ہر طرف پکار دیتا ہے کہ اس نے نعوذ باللہ حضورؐ کو قتل کر دیا ہے۔ علمبردار کا شہید ہو جانا اسلامی علم کا گر جانا اور پھر یہ خبر کہ سرکارِ دو عالم شہید ہو گئے مسلمانوں کی تھوڑی بہت مزاحمت کا گلا بھی گھونٹ گئی۔ اس خبرِ وحشت اثر نے صحابہ کے مختلف گروہ پر مختلف اثر کیا۔ کچھ لوگ ایسے بے خود و ساکت ہو گئے کہ ان کے ہاتھ پاؤں شل ہو گئے مگر کچھ صحابہ ایسے بھی تھے جن کے پائے ثبات میں لغزش نہ آئی۔ اسی دوران وحشی نامی غلام نے ابو سفیان کی بیوی ہندہ کے ورغلانے پر حضرت حمزہؓ پر انعام کی لالچ میں چھپ کر وار کیا اور انہیں شہید کر دیا۔ اور پھر ہندہ نے حضرت حمزہؓ کی لاش کی جو بے حرمتی کی وہ تاریخ کے صفحات پر موجود ہے۔ الغرض حضورؐ کے جانثار ساتھیوں پر حضورؐ کی وفات کی خبر نے نہایت برا اثر ڈالا ان میں سے کچھ بدحواس ہو گئے اور جو ثابت قدمی سے برسرِ پیکار تھے وہ بھی انتہائی رنج و غم سے حضورؐ کو چاروں طرف تلاش کر رہے تھے ؎

یہ نازک مرحلہ محتاج تھا جس کی قیادت کا ۔ احد کی سرزمیں پر شور تھا اس کی شہادت کا

صحابہ ڈھونڈتے پھرتے تھے اپنے ہادیٔ برحق کو ؎ کئے دیتے تھے اپنے خون سے رنگین وادی کو

اتنے میں حضرت کعب بن مالکؓ کی نظر حضور پر پڑتی ہے کہ سرکار جنگی لباس میں چند جانثاروں کے حلقے میں نہایت تندہی سے حملہ کفار کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ ؎

نگاہِ کعب نے دیکھی نرالی شانِ پیغمبرؐ ؎ ہزاروں حملہ آور اور تنہا جانِ پیغمبرؐ
اِدھر سے تیر آتے تھے اُدھر سے تیر آتے تھے ؎ طواف نور کرتے اور قربان ہوتے جاتے تھے
وہیں رہ منظہر حق تھا ثباتِ معجزانہ سے ؎ اسی شان و وقار و شوکت پیغمبرانہ سے
خوشی تھی فتح کی اس کو نہ کوئی غم ہزیمت کا ؎ مثالِ عرش قائم تھا قدم اس کی عزیمت کا
بنائے آسماں بھی جس زمیں پہ ڈگمگا رہی تھی
محمدؐ تھا کہ اس کے پاؤں میں لغزش نہ آتی تھی

حضرت کعبؓ پکار اٹھتے ہیں کہ سرکار زندہ ہیں اے شمع محمدیؐ کے پروانو ادھر آؤ یہ صدا سن کر مسلمان آپ کے پاس جمع ہو جاتے ہیں ؎

کھنچے عاشق اُڑیں جس طرح سوئے کہربا تنکے ؎ نبیؐ کو دیکھ کر پہ لگ گئے ہر مردِ مومن کے
قلم کرتے سروں کو بازوؤں کو چھانٹتے آئے ؎ متاعِ ضرب کاری دشمنوں میں بانٹتے آئے
طوافِ شمع جب کرنے لگے آ آ کے پروانے ؎ اسی نقطے پہ دھاوا کر دیا افواجِ اعدا نے

کافروں کا نرغہ بڑھتا ہی جاتا تھا مگر صحابہ آپ کی حفاظت کے لئے لوہے کی دیوار بن کر کھڑے ہو گئے تھے ؎

ادھر جسموں کی دیواریں اٹھا دیں باوفاؤں نے ؎ بساطِ عشق پر جانیں بچھا دیں جانثاروں نے
زبیرؓ و طلحہؓ تھے سینہ سپر سرکار عالی پہ ؎ یہ پروانے مٹے جاتے تھے حسن بے مثالی پہ

سرکار دو عالم کی محبت صحابہ کرام اور ان کے لواحقین کے دل میں ایسی نقش کالحجر تھی کہ جیسے ہی حضورؐ کی شہادت کی افواہ مدینے پہنچی وہاں کی خواتین جنہوں نے اپنے باپ، بھائی، شوہر اور بیٹے اسلام پر قربان کر دیئے تھے بے قرار ہو کر میدان جنگ کو پہونچ گئیں ان کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے ؎

پدر، شوہر، برادر، پسر اسلام پہ صدقے ؎ خوشی سے کر دیئے تھے گھر کے گھر اسلام پہ صدقے
نہ رشتہ اب نہ کوئی لمحہ مطلوب تھی ان کو ؎ وجودِ پاک صادقؐ کی بقا مطلوب تھی انکو

ان خواتین میں حضرت ام عمارہؓ کا کردار تاریخ اسلام کے صفحات پر ہمیشہ نیر تاباں بن کر چمکتا رہے گا ؎

جدھر بڑھتے ہوئے پاتی تھی یہ محبوب باری کو ؎ ہونچتی تھی وہیں اُمِّ عمارہ جاں نثاری کو
سر و گردن پہ اس بی بی نے تیرہ زخم کھائے تھے ؎ مگر میدان سے اس کے قدم ہٹنے نہ پائے تھے

یہی مائیں ہیں جن کی گود میں اسلام پلتا ہے ؎ اسی غیرت سے انسان نور کے سانچے میں ڈھلتا ہے

کافرانِ قریش لحظہ بہ لحظہ دباؤ بڑھاتے جاتے تھے ؎

پیمبر کی طرف چاروں طرف سے تیر آتے تھے ؎ مگر نورِ مجسم پر نچھاور ہوتے جاتے تھے

اللہ کے نبیؐ کی حفاظت کرتے کرتے حضرت ابو طلحہؓ کا ترکش خالی ہو جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ؎

میرے ماں باپ آپؐ پر قربان ذرا سایہ کار رہیے ؎ ذرا سی دیر جب تک آندھیاں میداں سے چھٹ جائیں ؎

رسول اللہؐ سنکر مسکرائے اور فرمایا ؎ خدا کا نور اس عالم میں چھپنے کو نہیں آیا

اس شدید دباؤ میں ایک واقعہ آ گیا تھا کہ ابن قمیہ نے حضورؐ کے بے حد قریب پہنچ کر وار کیا مگر ام عمارہؓ انتہائی جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے سینہ سپر ہو گئیں ؎

اچانک چھا گئی اک ہول کی چادر زمانے پر ؎ خدا جانے پڑی یہ ضرب کس ہستی کے شانے پر

یہ کس نے آکے گردن زیرِ تیغِ خونفشاں رکھدی ؎ یہ کس بندے نے بنیادِ بقائے جاوداں رکھدی

وہی با حوصلہ شایانِ ہر مدح و ثنا بی بی ؎ وہی ام عمارہؓ ہاں وہی حق آشنا بی بی

وہی نوری فرشتہ تھا کہ بالتعجیل آپہونچا

نبیؐ پر ڈھال بننے کو یہ جبریل آپہونچا

جب کافروں نے دیکھا کہ قریب سے وہ حضورؐ پر کوئی وار نہیں کر سکتے تو ذرا فاصلے سے انھوں نے شدید ترین سنگباری شروع کر دی۔ اس مقام پر آکر حفیظ کے قلم میں وہ تاثیر پیدا ہو گئی ہے کہ بایدو شاید ؎

یہ بارش پتھروں کی اور اس کا تاجِ پیشانی ؎ ادھر تھی ہستیٔ فطرت اُدھر معراجِ انسانی

کڑی ساعت تھی یہ آئینۂ رخسارِ تاباں پر ؎ اِدھر لب ہائے نازک پر اُدھر در ہائے دنداں پر

شکستہ ہو گئیں ملک دُرِ شہوار کی لڑیاں ؎ دو پارہ ہو گئے لب گھس گئیں رخسار میں کڑیاں

فلک تھا چشم استفسار اب کیا ہونے والا ہے ؎ زمیں کہتی تھی شاید حشر برپا ہونے والا ہے

طلسم ربع مسکوں ٹوٹتا معلوم ہوتا تھا ؎ یہ نازک آبگینہ پھوٹتا معلوم ہوتا تھا

وہ شانہ جو علم بردار اصلاحِ زمانہ تھا ؎ اسی پر ضرب آئی تھی وہی شانہ نشانہ تھا

ہدف تھی اس طرح جانِ دو عالم چہرہ دستی کی ؎ کہ چلتے چلتے نبضیں رک گئیں دنیائے ہستی کی

فلک پر مہر آزردہ زمیں پر گل فسردہ تھے ؎ جبیں رخسار لب دنداں و شانہ زخم خوردہ تھے

اگرچہ زانوؤں پر زخم ضربیں ساق پر آئیں ؎ دعائیں ہی زباں مصدرِ اخلاق پہ آئیں

کہ اے پروردگار آمرزگاراں کو معافی دے ؎ نہ کر ان کی خطاؤں کا شمار ان کو معافی دے

نہیں ابھری ابھی یہ قوم جاہل اپنی پستی سے ٭ خداوندا یہ بندے بے خبر ہیں راز ہستی سے
نہ دیکھ ان کے عمل اپنے کرم پر ہی نظر فرما
الٰہی بخش دے ان کو الٰہی در گزر فرما

یہ تھا رحمت عالم کا کردار اور یہ تھی وہ رفعت اخلاق جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے خود قرآن میں ارشاد فرمایا ہے کہ "انک لعلیٰ خلق عظیم"۔

بہر حال جاں نثار صحابہ نہایت جانفشانی سے حضورؐ کو اس حالت میں میدان جنگ سے ایک اونچے ٹیلے کی طرف لے چلے کہ ایک دشمن رسولؐ ابی بن خلف نے خود سرکار دو عالم سے مبارزت طلب کی۔ صحابۂ کرام میں سے ہر ایک اس کے مقابلے کے لئے تیار تھا مگر سرکار نے خود ہی اس زخمی حالت میں اس سے مقابلے کا فیصلہ کیا ؎

تخاطب نام نامی سے کیا جس دم سوالی نے ٭ توجہ منعطف کی اس طرف سرکار عالی نے
فداکاروں نے چاہا بڑھ کے اس کے سامنے جائیں ٭ رسول اللہ کیوں اس کے لئے تکلیف فرمائیں

مگر سرکار دو عالم بلندی کردار اور شجاعت کا ایک اعلیٰ ترین سبق اپنی اُمت کو دینا چاہتے تھے انہوں نے گوارا نہیں کیا کہ جو شخص مجھ سے مبارزت طلب کرتا ہے۔ اس سے مقابلے کے لئے کسی اور کو بھیجوں ؎

ہوا ارشادِ ذات حق توانا اور غالب ہے ٭ یہ دشمن کوئی ہو لیکن محمدؐ ہی کا طالب ہے

سرکار دو عالم خالی ہاتھ اس کے مقابلے کے لئے نکلتے ہیں اور جیسے ہی وہ وار کرتا ہے اس کا نیزہ چھین کر اس کی گردن پر وار کر دیتے ہیں اس کے ساتھ ہی وہ ناری گھوڑے سے زمین کی خاک چاٹتا ہوا نظر آیا ؎

صحابہ کے دہن پر نعرہ تھا اللہ اکبر کا
خدا نے بول بالا کر دیا اپنے پیمبرؐ کا

(باقی آئندہ)

قطعہ

عرب شاہ خالد کشمیری

انا بشر

شجر جو وادیٔ ایمن میں ہے وہ ہر شجر کب ہے
کرم حجر اسود جیسا یارو ہر حجر کب ہے
"انا بشر" کو بھی خالد سمجھ لو ان مثالوں سے
محمد نورِ حق مثل بشر ہے پر بشر کب ہے

حضرت کامل شطاری

غزل

بجھے دے رہے ہیں لیکن وہ مذاقِ غم بدل کر
نکل آئی دل کی حسرت، مرے آنسوؤں میں ڈھل کر

ادب اے جنونِ الفت! یہ مقام بندگی ہے
تما جو قدم بھی اٹھے وہ اٹھے ذرا سنبھل کر

یہ بنی عجیب کچھ شے، مرے عشق کی بدولت
ترے حسن کی خدائی مری بندگی میں ڈھل کر

فقط آرزوئے دل پر ہے مدارِ زندگانی
مجھے بے مزا نہ کر دے کوئی آرزو نکل کر

درِ یار سے اٹھا ہوں، نہ اٹھوں گا تا قیامت
کہیں سکوں ملا ہے مرے دل کو اب تو چل کر

کبھی کچھ نظر ہے ان کی کبھی کچھ نظر ہے ان کی
وہ بلائے جا رہے ہیں مجھے بدل بدل کر

رہوں بے نیازِ مقصد، تری بندہ پروری سے
کہیں لب تک آ نہ جائے کوئی مدعا مچل کر

کوئی ہم سے بڑھ کے ساقی! نہیں مستحق کرم کا
کہ ملے ہیں میکشوں میں ترے میکدے میں پل کر

وہ غرورِ حسنِ خود سر، وہ بعجزِ نیاز کامل
کوئی مسکرا رہا ہے، مری زندگی بدل کر

حضرت کامل شطاری رح

غزل

رعیب اس کے تب نئے اور آئینہ خانے ہزار
مستقل صرف اک حقیقت، اس کے افسانے ہزار

سیکڑوں غم محو کر دوں میں اور پیمانے ہزار
چشمِ ساقی کی عنایت ہے تو مے خانے ہزار

حسن ہی سے عشق کے بنتے ہیں افسانے ہزار
شمع پیدا خود کئے لیتی ہے پروانے ہزار

ہر نظر پر ہے اضافہ اعترافِ عجز میں
فائدہ کیا ہیں اگر اس کے جلو خانے ہزار

کوئی پردہ ہو حقیقت کو چھپا سکتا نہیں
آئے دن بنتے رہے دنیا میں افسانے ہزار

کس نے اس کی کنہ پائی، کس کو عرفاں پر گھمنڈ
یوں تو ہیں صاحب نظر اور جانے پہچانے ہزار

آپ سے ہر سمت آنکھیں چار ہو جاتی تو ہیں
چاہیے حیرت ہی میں ڈالیں آئینہ خانے ہزار

آپ کے جلوے سلامت ہیں تو دیکھا جائے گا
سیکڑوں کعبے بنیں گے اور بت خانے ہزار

کیا ہوا، تیری محبت میں جو کامل مر مٹا
تو رہے دائم سلامت، ایسے دیوانے ہزار

ادیب حیدرآبادی

موازنۂ غالب و مومن

مرزا غالب اور حکیم مومن خاں دونوں اُنیسویں صدی عیسوی کے یگانۂ روزگار شاعر تھے اُن کا تغزل اہلِ ذوق کے لیے غذائے رُوحانی ثابت ہُوا۔ وہ ایک دوسرے کے ہم عصر تھے البتہ غالب نے ۷۲ سال کی عمر پائی اور مومن باون ۵۲ ہی برس میں اللہ کو پیارے ہوگئے۔ فنِ شاعری میں ان دونوں استادانِ سخن کو جو یدِ طُولیٰ حاصل تھا وہ اُن کے مبلغِ علم پر دال ہے۔ مرزا غالب کی شاعرانہ عظمت اس میں ہے کہ انھوں نے نہ صرف حکایات و شکایاتِ حُسن و عشق بلکہ مسایلِ حیات و کائنات کو بھی غزل کے سانچے میں ڈھال ہی لیا اور مومن نے محض وارداتِ قلب اور نفسیاتِ محبت کو ملحوظ رکھتے ہوئے غزل گوئی کی۔ وہ ایک مجلسی فرد تھے جنھیں تہذیب و ثقافت سے گہرا لگاؤ تھا۔

مرزا غالب چونکہ اپنے معاصرین میں سب سے بڑے شاعر مانے جاتے تھے اور اُن کے نزدیک نفسِ شاعری کا ایک صاف ستھرا اور ارفع و اعلیٰ تصوّر تھا اس لیے وہ اپنے کسی ہم عصر شاعر کی شاعرانہ عظمت کے قائل ہی نہ تھے اور اگر تھے بھی تو بس مومن خاں کے کمالاتِ شعری کے مُعترف تھے۔

اہلِ نظر سے یہ بات مخفی نہیں کہ تقریباً سارا کلامِ مومن روشِ عام سے الگ تھلگ ہے اس کا صحیح اندازہ لگانے کے لیے غالب اور مومن کے چند ہم زمین و ہم مضمون اشعار بہ طورِ نمونہ ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

مرزا صاحب باندازِ سلاست کہتے ہیں ؎ کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب ٭ گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا

یہ مضمون مومن کے قلمِ اعجاز رقم سے یوں ادا ہوا ہے ؎

دُشنامِ یار طبعِ حزیں پر گراں نہیں ٭ اے ہم نفس نزاکتِ آواز دیکھنا

غالب کے مذکورۂ بالا شعر میں معشوق کے لبوں کی غیر معمولی مٹھاس کا اظہار کیا گیا ہے جس کی دلیل یہ ہے کہ رقیب پر گالیاں پڑنے کے باوجود وہ انھیں خوشی خوشی انگیز کر گیا اور مومن خاں نے دُشنامِ یار کی تلخی کو نزاکتِ آواز کے ذکر سے گوارا بنا کے محبوب کے حُسنِ صورت کے ساتھ حسنِ صوت کی اہمیت بتا دی۔ اس لحاظ سے مومن کا شعر نسبتاً کثیر المعنی ہو کے غالب کے شعر سے بڑھ گیا۔

اسی طرح غالب نے کہا ہے ؎ درد منت کشِ دوا نہ ہُوا ٭ میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہُوا۔

اسی کے مفہوم کو مومن نے اس طرح ظاہر کیا ہے۔

؎ دردِ جاں کے عوض ہر رگ و پے میں ساری ٭ چارہ گر ہم نہیں ہونے کے جو درماں ہوگا۔

غالب نے اپنے شعر میں یہ لطیف گوشہ نکالا کہ دردِ عشق دوا کا احسان مند نہ ہوا مگر مومن نے اس درد کی وسعت کے اظہار میں اپنی قوتِ متخیلہ سے ایسا کام لیا کہ اُن کے شعر کا ایک ایک لفظ قاری کے دل میں اُتر جاتا ہے۔

مرزا غالب کا مشہور شعر ہے ؎ قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں ؛ موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں
اسی مضمون کو مومن نے معنی خیز پیرائے میں اِس طرح نظم کیا ہے ؎ مومن چھوٹ کر کہاں اسیرِ محبت کی زندگی!
ناصح! یہ بندِ غم نہیں، قیدِ حیات ہے

غالب نے جہاں قیدِ حیات اور بندِ غم کو لازم و ملزوم قرار دے لیا وہاں مومن نے اِن دونوں مشغلوں کو الگ الگ کر کے پہلے مصرعے میں اپنے دعوے کی مضبوط دلیل پیش کر دی کہ قیدِ حیات سے رہائی پانے کے بعد بھی غم سے مفر ممکن نہیں۔

مرزا صاحب فرماتے ہیں ؎ خوب تھا پہلے سے ہوتے جو ہم اپنے بدخواہ۔ کہ بھلا چاہتے ہیں اور بُرا ہوتا ہے۔ اس مضمون کی ادائگی میں مومن نے بڑی شوخ بیانی سے کام لیا ہے، کہتا ہے ؎
؎ مانگا کریں گے اب سے دُعا ہجرِ یار کی۔ آخر تو دشمنی ہے اثر کو دُعا کے ساتھ
غالب کا شعر پڑھنے کے بعد یہ محسوس ہوتا ہے کہ کوئی قسمت کا پیٹا مُنہ ہی مُنہ میں بڑبڑا رہا ہے۔ اِس کے برعکس مومن کے پہلے مصرعے کی اُٹھان ہی اس غضب کی ہے کہ قبولِ دُعا کی خاطر شاعر بد دعا کرنے پر آمادہ نظر آتا ہے کیونکہ اُس کے حق میں دعا کا اثر اُلٹا ہوتا تھا۔

مرزا غالب اور مومن خاں جیسے مُسلّم الثبوت اساتذہ کے ہم مضمون اشعار کے ساتھ ساتھ ان کے دو ایک ہم زمین شعروں کی بھی سیر کر لیجیے۔ مرزا صاحب ایک جگہ فرماتے ہیں۔
؎ میں، اور حظِّ وصل! خدا ساز بات ہے ؛ جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں
اضطراب کا قافیہ مومن نے یوں برتا ہے ؎ بیہم سجود پائے صنم پر دمِ وداع!
مومن! خدا کو بھول گئے اضطراب میں

تغزّل سے بھرپور مرزا صاحب کا شعر بلاشبہ ہمارے ذوق کی تسکین کرتا ہے مگر مومن کے مذکورۂ بالا مقطع میں اہلِ ذوق کی ضیافتِ طبع کا کچھ اور ہی سامان نظر آتا ہے۔

علیٰ ہٰذا غالب کا ایک مقطع ہے ؎ ہم کہاں کے دانا تھے؟ کس ہنر میں یکتا تھے؟ ؛ بے سبب ہوا غالبؔ دشمن آسماں اپنا
مومن خاں کہتے ہیں ؎ دیکھیے پس مُردن حالِ جسم و جاں کیا ہو؟ ۔ مدعی زمیں اپنی دُشمن آسماں اپنا
غالب کے مقطع کا مرکزی خیال آسماں دُشمنی ہے اور بس! یہی "دشمن آسماں اپنا" کا ٹکڑا نظم کرنے کیلئے مومن نے "مدعی زمیں اپنی" کا ایسا بلیغ پیوند لگا دیا اور پہلے مصرعے میں مضمونِ شعر کی بلندی کا اِس قدر اہتمام کیا کہ اگر بار بار اِس شعر کو پڑھیں تو ہر بار نیا لُطف حاصل ہو۔

غالب نے ایک جگہ کہا ہے ؎ بے گانگیِ خلق سے بے دل نہ ہو غالبؔ ؛ کوئی نہیں تیرا تو مری جان خدا ہے
مومن کا مقطع ہے ؎ مومن نہ سہی بوسہ پا، سجدہ کریں گے ؛ وہ بُت ہے جو اوروں کا تو اپنا بھی خدا ہے
غالب کے مقطعے میں "بے گانگیِ خلق" کی شکایت ایک عام بات ہے اور مومن کے مقطعے کا اسلوبِ بیان مضمونِ شعر کو چار چاند لگا گیا۔

مذکورۂ بالا سطور میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے اُس سے یہ مقصود نہیں کہ مرزا غالب کے شاعرانہ کمالات کی نفی کی جائے۔ وہ فارسی عربی کے ایسے جید عالم اور اردو فارسی کے اِس قدر قادر الکلام شاعر تھے کہ دنیائے ادب میں اپنی فارسی دانی کا سکہ بٹھا گئے اور فارسیت ہی کی بدولت اُردو غزل کی وادی میں تنوعِ مضامین کے متعدد سوتے جاری کیے۔ اُن کے احباب نے جب اُن کی مشکل پسندی کو ناپسندیدگی کی نظروں سے دیکھا تو انھوں نے سلیس و عام فہم اردو میں غزلوں کی غزلیں کہنا شروع کیں جو آج آنکھوں پر رکھی جاتی ہیں۔ یہ تھی آپ کی اِعجاز بیانی و جادو نگاری اِس کے ساتھ ساتھ کسی جوہرِ قابل کے پرکھنے میں بھی مرزا صاحب فطرتاً اتنے وسیع القلب اور منصف مزاج واقع ہوئے تھے کہ مومن کے اِس ایک ہی شعر سے متاثر ہوکے اُس کے عوض اپنا آدھا دیوان مومن خاں کی نذر کرنے کا خیال بے جھجکے ظاہر کر دیا۔

مومن ~ تم مرے پاس ہوتے ہو گویا۔ جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا۔

مومن خاں ایک جوانِ رعنا تھے اور اُن کی شاعری رعنائی و زیبائی کا سنگم بن کے نہ صرف اُن کے ہم عصروں کا دل موہ لیتی تھی بلکہ آج کے اِنصاف پسند نقادوں سے بھی خراجِ تحسین وصول کر لیتی ہے۔ مومن خاں ذی علم تھے، طبیب تھے، اختر شناس تھے مگر انھوں نے اپنی شاعری کی غزلیت کو غیر شاعرانہ علمی مسایل سے کبھی مربوط نہیں کیا اور غزل گوئی کا پورا پورا حق ادا کر دیا۔ ان کے کلام کی عجیب و غریب نُدرت اور نازک خیالی ہی اُن کی شاعری کی اہم خصوصیت ہے۔ مومن سے پہلے صنفِ غزل میں وہ دلالی تقریباً مفقود تھی جو کلام مومن میں بہ درجہ اتم پائی جاتی ہے۔ وہ اپنے پیش رووں [illegible] سے کچھ نہ کچھ استفادہ کرتے تھے مگر کسی شاعر کی تقلید نہیں کی حتیٰ کہ اپنے اُستاد شاہ نصیر کے بھی مقلد نہیں ہوئے۔ غزل گوئی کے گُر کو اُستادی کے ساتھ برتنے کا جو مزاج انھوں نے پایا تھا وہ انھیں پر ختم ہو گیا۔

تسنیم فاروقی

غزل

سُروں کے پھول کھلے دل جو باغِ نغمہ ہوا ۔ نشاطِ لمسِ رُخِ گُل دماغِ نغمہ ہوا
رہی نہیں ہے کہ دل آتشِ غزل سے جلا ۔ سُلگ کے سینۂ ہر ساز داغِ نغمہ ہوا
بکھر انگلیوں نے مجھے جل ترنگ کہہ کے چھوا ۔ میں آب سادہ تھا لیکن ایاغِ نغمہ ہوا
وہ اک گلاب سا چہرہ جو مثلِ شعلہ اُٹھا ۔ اُتر کے شیشۂ دل میں چراغِ نغمہ ہوا
میں شہرِ سنگ میں مدفون گنگ آہن تھا ۔ ملا جو سوز تو وجہ سراغِ نغمہ ہوا

تو ہم بھی لفظوں کا سرگم سجائیں گے تسنیم
اگر نصیب ہمیں کچھ فراغِ نغمہ ہوا

منظوم خط

از مضطر خیرآبادی

(عروض کے ارکان جن سے بحریں بنتی ہیں ان کے زحافات میں ایک فعلاتن بھی ہے ذیل کا خط اسی رکن فعلاتن کی تکرار سے موزوں کیا گیا ہے۔ اس تکنیک کو آزاد نظم میں آج برتا جا رہا ہے۔ قارئین کی دلچسپی کیلئے یہ نایاب منظوم خط درج کیا گیا)

(ادارہ)

اجی او یار فدا، مونس و غمخوار فدا، طرفہ وفادار فدا، تم پہ دلِ زار فدا، مضطرِ بیمار فدا! تم کو تغافل کا تکاہل کا تساہل کا تامل کا سبق کس نے پڑھایا، کہ نہ وہ چاہ نہ وہ چیت نہ وہ بات نہ وہ ریت نہ وہ آنکھ نہ وہ پیت، نہ وہ دل ہے نہ وہ میل ، نہ وہ رنگ نہ وہ روپ، نہ وہ شوق کا جھگڑا نہ تمنا کا جھگڑا نہ وہ ارمان کا انبوہ، امید کی یورش نہ امنگوں کی ترقی، نہ وہ اظہار محبت نہ تسلی کی وہ رسمیں، نہ دلاسے کے طریقے نہ تشفی سے غرض ہے نہ تلطف سے سروکار جو ہے بھی تو جفا و ستم و جور کا برتاؤ، تظلم کا طریقہ جسے معشوق یہاں کام میں لاتے ہیں۔ کلیجوں کو دکھاتے ہیں دلِ زار جلاتے ہیں، اگر میں یہ سمجھتا کہ دغا باز ہو غماز ہو وابستۂ انداز ہو تم موجدِ ہر ناز ہو تو دل ہی نہ دیتا۔ نہ سناتا غمِ فرقت کی کہانی قلقِ دل کا فسانہ جگرِ زار کی سوزش، یم اندوہ کا طوفان تمنا کی خرابی ستم چرخ کا برتاؤ نصیبوں کا الٹ پھیر خیالات کی الجھن سرِ شوریدہ کا قصہ تنِ سوزاں کا جلاپا۔ دلِ بریاں کی تپش خارِ جدائی کی خلش، رنج کا دکھڑا، شبِ ہجراں کی کتھا۔ ہائے بڑی چوک ہوئی تم سے تو ملنا ہی نہ تھا کیونکہ جدائی کے جھٹے کچھ دو کج خلق ہو تم خانہ برانداز ہو تم! دل کے لئے درد ہو تم، آنکھوں میں اک گرد ہو تم گرم ہوں میں سرد ہو تم یاد ہو تم خاک ہوں میں سنجیدہ ہو تم چاک ہوں میں خار ہوں میں پھول ہو تم، یاد ہوں میں بھول ہو تم، میری تمہاری نہ نبھی ہے نہ نبھے گی! تمہیں عادت ہے جفاؤں کی میں خوگر ہوں وفا کا۔

مجھے کچھ روز سے دھن ہے کہ چلوں، وادیٔ غربت کی طرف دشتِ مصیبت کی طرف کوئے ملامت کی طرف کوچۂ فرقت کی طرف بزمِ غمِ حسرت کی طرف، تاکہ نہ ہو دل شکنی جوشِ جنوں کی ہے یہ دامن کو ہوس ہے کہ ذرا خار سے لپٹے، غمِ دوری کو ہوس ہے کہ دلِ زار سے لپٹے، وہی صحرا ہو وہی میں وحشت ہو وہی دل وہی کانٹے وہی تلوے وہی اندوہ کے دیدار ہوں، افسوس کے جلوے! اگر اللہ نے چاہا تو

میں دوشنبہ کے دن پانچویں تاریخ وطن چھوڑ کے پردیس سدھاروں گا ذرا دم بھی نہ ماروں گا بڑا بوجھ اتاروں گا۔ مگر ڈر ہے تو اتنا کہ عزیزوں کی جدائی کہیں دم لینے کو تیار نہ ہو جائے جو پڑ جائیں مجھے لینے کے دینے، کہیں برسات کا موسم میری عزت نہ ڈبوئے، کہیں یہ دیدہ مشتاق مرا خون نہ روئے، کہیں یہ پروائی کے جھونکے میری چوٹیں نہ دکھائیں کہیں یورپ کی گھٹائیں میری حسرت نہ بڑھائیں کہیں بجلی کی چمک جان نہ پھونکے میرا ایمان نہ پھونکے۔ میرے اوسان نہ پھونکے۔ میری حسرت نہ جلائے میرے ارمان نہ پھونکے، جو یہ چلتا ہوا دم پھٹ سے نکل جائے۔ سنو تم تو کہو ہائے میرا مضطر دل ریش غم و رنج کا ماتا قلق و سوز کا حامی تپ ہجراں کا سزاوار جفاؤں کا خبر گیر حسینوں کا ستایا غم دوری سے پہاڑوں میں ہوا ٹیچ ہے کہ اس موت نے دیکھا اسے مارا، اُسے مارا جسے تاکا۔

آر ٹی سی بس

ڈاکٹر یعقوب عمر

یہ آر ٹی سی کی بس ہے یارو، چلی ہے مولا علی سے بھر کر ـ بچھڑے کے کھڑکی لٹک رہے ہیں، کہیں مونث کہیں مذکر

نہ چھت پکڑ کر لٹک رہے ہیں، نہ پاؤں ہی فرش پر ٹکے ہیں ـ کہاں ہیں اس وقت کیا بتائیں، نہ ہم زمیں پر نہ آسماں پر

ٹکٹ کی خاطر جو ہاتھ ڈالا، وہ جیب میں دوسرے کی پہنچا ـ ابھی تعجب ہی کر رہے تھے کہ پڑ گیا زوردار تھپڑ!

مہک نرالی تھی خواب میں بھی کسی کے گیسوئے عنبریں کی! ـ میں تیرے صدقے، میں تیرے واری، مشام جاں بس گیا معطر

کسی حسیں نے کیا اشارا، تو ڈرائیور نے بریک مارا ـ نصیب ایسا کہاں ہمارا، جو بس رُکے اپنی چٹکیوں پر

کہیں لگا جو بریک اکدم، تو پھر تماشہ نہ پوچھ ہمدم ـ سوار تھیں شیخ جی پہ میڈم، تو مس کی آغوش میں تھے مسٹر

اگر کہیں راستے میں جو لیس پڑیں، وہ جوتے کہ جیتے نہ بھولیں ـ دعائیں دیتے ہیں لوگ بس کو، کسی کے اس لمس آتشیں کو

بھری ہو یوں بس میں جیسے گاڑی کشتی جو بکروں سے مال گاڑی ـ نہ کچھ من و تو فرق باقی، نہ ہی کا جھگڑا نہ شی کا چکر

سنا ہے اسّی برس کا لڑکا یہ کہہ رہا تھا کسی جواں سے!

کبھی تو اسٹیج پر رکیگی کبھی تو میں بھی چڑھوں گا بس پہ

ہندی افسانچے
ہندی سے ترجمہ
گریجا شنکر تیرما ریڈر ہندی
نظام کالج

موڈرن جمہوریت

چندر موہن پردھان
ڈائرکٹر گیان کلا کیندر
مظفرپور

بات آزادی کے پہلے کی ہے ہمارے شہر سے لگ بھگ آٹھ میل دور کا قصبہ تھا یا زمانہ ٹوٹی چھوٹی سڑک کیچڑ سے بھری موسم بھی برساتی! ایک اناج کے بوروں سے لدی بیل گاڑی کا ایک پہیہ سڑک کے کنارے کیچڑ میں پھنس گیا۔ بیلوں کے لاکھ زور کرنے پر بھی نہ نکلا۔ گاڑی بان نے پہیئے پر زور آزمایا۔ پہیہ کچھ ہلا مگر ابھی تھوڑے زور کی اور ضرورت تھی۔ اس نے آس پاس کے لوگوں سے ہاتھ بٹانے کی درخواست کی مگر کسی نے نہ سنی۔

اتنے میں شہر کی طرف جاتی ہوئی ایک بڑی سی کار وہاں آ کر رکی۔ ایک دو بار ہارن بجے پھر ایک انگریز نیچے اتر آیا ــــ "ویل! یہ کیوں کھڑا ہے؟"

"حضور مائی باپ! پہیہ کیچڑ میں...."

انگریز نے پھنسے ہوئے پہیئے کو دیکھا۔ گاڑی بان نے ہاتھ جوڑ کر کہا "میں تو نکال لیتا سرکار پر کوئی ہاتھ نہیں لگاتا"

"چلو نکالو"

انگریز نے آستین اوپر کیں اور پہیئے پر جٹ گیا۔ گاڑی بان نے بھی پورا زور لگا دیا۔ ہانک کر بیل آگے بڑھے اور ایک جھٹکے کے ساتھ گاڑی باہر نکل آئی۔ جیسے ہی بیل گاڑی ایک طرف ہوئی راستہ ہوا انگریز کار میں جا بیٹھا اور کار شہر کی طرف ہوا ہو گئی بازار کے کچھ لوگ لپک کر آئے اور گاڑی بان سے کہنے لگے۔ "ابے سالے" تیری گاڑی میں خود کلکٹر نے ہاتھ لگایا۔

کلکٹر کا نام سنتے ہی گاڑی بان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ وہ زمانہ انگریز کا تھا۔

ابھی کچھ دنوں پہلے کی بات ہے۔ چناؤ کے دوران لیڈروں کو لادنے شہر میں کاریں دوڑ رہی تھیں پھر بھار میں اینٹوں سے لدی بیل گاڑی کے پیچھے آہستگی سے چلتی ہوئی کار میں بیٹھے نیتا جی صبر کھو بیٹھے باہر سر نکال کر چلائے۔ "ابے سور! گاڑی ہٹا سامنے سے"

"حضور۔ دو منٹ صبر کریں۔ آگے بھیڑ ہے۔ ابھی ہٹاتا ہوں" گاڑی بان نے نرمی سے درخواست کی۔ "دو منٹ! یہ نیتا جی کی کمتی توہین تھی۔ انھیں اس کنگال کسان کے پیچھے دو منٹ ٹھہرنا پڑیگا۔ اتنی دیر میں کہیں دہلی کا تخت پلٹ گیا تو؟"

وہ غصے میں بھرے نیچے اترے اور اسے مارنے کے لئے تیار ہو گئے۔ جمہوریت جو ہے!

آدمی کے ٹکڑے

ڈاکٹر کے ایل ویاس
آرٹس اینڈ سائنس کالج۔ کامارڈی

جنار دھن باغیچے میں پیڑ کی ٹھنڈی چھاؤں تلے بیٹھا چھٹی کے دن بھی آفس کا کام پورا کر رہا تھا۔ دس بارہ برس کا اس کا بیٹا رجنی کانت بار بار آ کر اس سے کئی سوال اور باتیں پوچھ پوچھ کر ڈسٹرب کر رہا تھا۔ جنار دھن بچے کو ٹالنے کے لئے کبھی تتلی پکڑنے تو کبھی پھول توڑنے بھیجتا پر لڑکا تھوڑی ہی دیر میں لوٹ آتا۔ آخر تنگ آ کر جنار دھن نے ایک ترکیب سوچی۔ ایک کتاب پر لپٹا ہوا پرانے اخبار کا کور رکھول کر اس پہ بنے ہوئے دنیا کے نقشے کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے، پھر لڑکے سے کہا۔ "رجنی تم دنیا کے نقشے سے اچھی طرح واقف ہو ان چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو جوڑ کر دنیا کا نقشہ پورا بناؤ۔"

لڑکا کاغذ کے ٹکڑے لیکر ایک پیڑ کے نیچے بیٹھ گیا۔ باپ کو اطمینان ہو گیا کہ کم سے کم اس کام میں آدھا گھنٹہ تو لگ ہی جائیگا مگر اس کی توقع کے برخلاف پانچ منٹ ہی میں لڑکا لوٹ آیا اور کہنے لگا۔

"پتا جی! میں نے ٹکڑے جوڑ کر دنیا کا نقشہ بنا لیا ہے۔"

باپ نے دیکھا تو سچ مچ نقشہ بالکل ٹھیک تھا۔ تعجب سے اس نے پوچھا۔

"آخر اتنی جلدی تم نے یہ کیسے کر لیا۔"

لڑکا بولا۔ "پتا جی! نقشے کے پیچھے آدمی کی تصویر تھی آدمی کے ٹکڑے میں نے جوڑ دیئے اور الٹا دیا۔ بس دنیا کا نقشہ بن گیا۔!"

جنار دھن حیرت سے سوچنے لگا۔ آج اسے ایک بہت بڑی حقیقت معلوم ہو گئی تھی۔ آدمی کے ٹکڑے جوڑ دو! تو دنیا کے بھی ٹکڑے جڑ جائیں گے!!

ترقی کی تلاش

ڈاکٹر امر سنگھ۔
جے پور

ایک دن دوشی ترقی ڈھونڈنے نکلا۔ راستے میں ایک کالا کلوٹا لکڑہارا ملا۔ وہ لکڑی کاٹ کر بازار میں بیچ کے اور اپنے خاندان کی پرورش کرتا۔ "دھت! یہ تو بوڑھا اور کالا کلوٹا ہے۔" بڑبڑاتا ہوا دوشی آگے بڑھ گیا پھر اسے ایک اچھوت عورت ملی سر پہ غلاظت کا ٹوکرا اٹھائے ہوئے۔ "چھی چھی! یہ تو اچھوت ہے غلاظت ڈھونے کا کام کرتی ہے۔" ناک پہ ہاتھ رکھ کر دوشی آگے بڑھ گیا۔ راستے میں جلوس ملا۔ احتجاجی ہڑتالی نعرے لگا رہے تھے۔ جھنڈوں سے سڑک رنگین ہو رہی تھی لیڈر تقریروں کے پل باندھ رہے تھے۔ افتتاحی جلسوں میں فیتے کاٹ رہے تھے تسلیوں اور وعدوں کے سبز باغ دکھا رہے تھے۔ سینوں پہ تمغے لگا رہے تھے۔ دوشی وہیں ٹھہر گیا جب تقریریں ختم ہو گئیں تو ترقی ڈھونڈنا ہی کیسا

کرونا شری واستو
نئی دہلی

ماں یا دیدی

"پاپا، کب آئے گی ممی؟" بستر پر لیٹے ہوئے راجو نے روتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"بس آنے والی ہے، بیٹے... سو جاؤ۔"

پاپا نے تسلی دینی چاہی۔

"نیند نہیں آ رہی ہے پاپا... کچھ سناؤ نا۔"

وہ پاپا سے اور قریب ہو گیا۔

"نا بھائی آج تمہاری ٹرن ہے... ہم تم سے ہی سنیں گے۔" پاپا نے ایک بار اور راجو کو بہلانے کی کوشش کی۔

"ارے ہاں! آج تم بالو کی برتھ ڈے پارٹی پر گئے تھے نا... کیسی رہی پارٹی؟"

"آج پھر ممی نے ہمیں پیٹا تھا، پاپا۔" کہتے کہتے اس کی آواز بھر آئی۔

"سب کے سامنے پیٹا تھا ہمارے بیٹے کو۔ کیا بات ہو گئی تھی۔" پاپا کا من بھر آیا تھا۔

"ممی نے پارٹی میں جانے سے پہلے کہا تھا کہ سب کے سامنے ہمیں ممی کہہ کر نہ پکارنا، دیدی کہنا... ہمیں یاد نہیں رہا، پاپا... اب ہم ممی سے کبھی ممی نہیں کہیں گے۔"

...

کشو چوہان، کرنال

مہاتما جی

مہاتما جی کے چاہنے والوں کی عقیدت بھری آوازیں شامیانے سے ٹکرا ٹکرا کر ہوا میں اڑتے ہوئے سوکھے پتوں کی طرح پھڑ پھڑا رہی تھیں۔ مثلاً

"مہاتما جی بھگوان کا اوتار ہیں۔

پوری طرح قناعت پسند ہیں، موہ مایا، اَن، دھن جیسی خواہشات سے ایکدم دور۔ صبح و شام صرف پاؤ بھر دودھ پیتے ہیں، پھر بھی میلوں پیدل چلتے ہیں، دیوی شکتی کے مالک ہیں۔" آدھی رات کو جب دنیا سکھ کی نیند سوتی ہے تو مہاتما جی کڑی تپسیا میں لگ جاتے ہیں۔

یہ ساری عقیدت مندانہ باتیں مہاتما جی کے چاہنے والوں کی تھیں۔ سجے سجائے اسٹیج پر بیٹھے مہاتما جی جب مائک پر اُپدیش دیتے تو سامعین انتہائی عقیدت سے اس طرح سے جیسے انھیں سانپ سونگھ گیا ہو۔ اپدیش کے بعد مہاتما جی دو گھنٹے آرام کرنے کیلئے ایک کمرے میں چلے جاتے تھے، یہاں کا ایک منظر بھی دیکھ لیجئے۔

"شانتی دیوی جی آج خوش ہیں اور کچھ تو نہیں ڈالا۔" مسکراتے ہوئے مہاتما جی نے اپنی خاص خادمہ کو دیکھ کر ایک پراسرار سا سوال کیا، تو اس نے بھی اسی طرح مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"مہاراج بھلا یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے..."

ہاں ہاں! اب تو عادت سی پڑ گئی ہے اس سسری کے بنا ایک جملہ بھی نہیں بولا جاتا۔" خالی گلاس خادمہ کو تھماتے ہوئے مہا تما جی نے اس کی بات کاٹی اور اپنی بڑی بڑی سرخ آنکھیں باہر جاتی ہوئی خادمہ کی ننگی پیٹھ پہ گاڑ دیں۔

حفیظ النساء حزیں

غزل

ہنگامۂ جہاں سے میں جب آشنا ہوا
میرا وجود مجھکو لگا کانپتا ہوا

یوں ٹوٹ پھوٹ جاؤں گا اسکی خبر نہ تھی
پیدا جہاں میں تو میں اچھا بھلا ہوا

مجھکو رُلا رہا تھا غم آشیاں مگر
صیاد رو رہا تھا یہ کیا ماجرا ہوا

زخمی ہوا ہے ہاتھ بھی گلچیں کا شوق میں
تھا پھول کے قریب ہی کانٹا لگا ہوا

جاگا ہوا تھا روز ازل سے مگر حزیں
اک پل ذرا جو آنکھ لگی کیا سے کیا ہوا

ساجد رئیس وارثی

غزل

جانے کتنے جلتے بجھتے تن بدن رکھتا ہے وہ
اپنی تنہا ذات میں اک انجمن رکھتا ہے وہ

ایک قطرہ ہی سہی آنسو کا ہو یا خون کا
ایک طوفاں اپنے اندر موجزن رکھتا ہے وہ

زندگی جیسے ہو سایا دھوپ ہو جیسے وجود
جسم پہ اپنے شجر سا پیرہن رکھتا ہے وہ

قلب امیدوں کا مقتل ذہن فکروں کی صلیب
اپنے اندر انگنت دار و رسن رکھتا ہے وہ

اس کا پانا اس کا کھونا ہے ہواؤں کا نصیب
موسموں کا رنگ خوشبو سا چلن رکھتا ہے وہ

اس سے مل کر سوچنا پڑتا ہے بس اس کی طرح
جیسے ذہنوں کو بدل دینے کا فن رکھتا ہے وہ

فراقؔ کی شوخیاں

پروفیسر مشتاق نقوی فیروز گاندھی ڈگری کالج رائے بریلی

فراقؔ صاحب اکثر مشاعروں میں اپنے اشعار سنانے سے پہلے ایک آدھ خود ساختہ لطیفہ بیان کیا کرتے تھے۔ وہ اپنی شگفتہ مزاجی بذلہ سنجی اور حاضر جوابی میں بھی اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔

● کلکتہ کے ایک بہت مشہور بیرسٹر اور ملک گیر شہرت کے مالک سی۔آر۔داس کے ایک جونیر جنھوں نے حال ہی میں وکالت شروع کی تھی ایک مقدمے کی پیروی کر رہے تھے۔ انھوں نے کافی محنت کی مگر فیصلہ ان کے خلاف گیا۔ ان کی موجودگی میں عدالت نے فیصلہ سنایا فیصلہ سننے کے بعد ان کے منہ سے نکل گیا۔ I AM SURPRISED جج نے یہ فقرہ سن لیا اور فوراً ان پر توہین عدالت کی کارروائی شروع کرنے کے احکامات جاری کر دیئے۔

وہ جونیر دوڑتا دوڑتا سی آر داس کے پاس گیا اور سارا واقعہ بیان کیا اور گڑگڑاتے ہوئے کہا۔ "میری جان بچائیے۔"

سی۔آر۔داس نے اس کو تسلی دی اور کہا۔ "گھبراؤ نہیں سب ٹھیک ہو جائے گا۔" اور پھر سیدھے اس جج کے چیمبر میں پہونچے اور اپنے جونیر کی طرف سے معافی مانگتے ہوئے کہا۔

HE HAS JUST JOINED THE PROFESSION A LITTLE EXPERIENCE WILL GET HIM RIGHT AND I HOPE AFTER SOMETIME HE WILL BE SURPRISED AT ANY THING THAT HAPPENS IN THE COURT

●

الٰہ آباد ایک زمانے میں ترقی پسند شاعروں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ فراقؔ صاحب اس تحریک کے بانیوں میں تھے۔ مگر کچھ الگ تھلگ رہتے تھے۔ ایک ترقی پسند شاعر جو برابر مالی بدحالیوں میں مبتلا رہتے تھے۔ اور شراب کے بے حد رسیا تھے فراقؔ صاحب کے گھر پہونچے اور پریشان حال صورت بنا کر بولے۔ "دیکھئے انکار نہ کیجئے گا... میری آبرو خطرہ میں ہے۔" فراقؔ صاحب کو اسی دن تنخواہ ملی تھی اندر جا کر انھوں نے تیرڈانی سے تیس روپے نکالے اور ان کے حوالے کر دیئے اور وہ روپے پاتے ہی فوراً فراقؔ صاحب سے رخصت ہو گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد فراقؔ صاحب کے گھر کے سامنے ایک

تانگہ آکر رکا اور اس سے وہی شاعر برآمد ہوئے ۔ اور آتے ہی فراق صاحب سے بولے ۔

" آپ فوراً اس تانگہ میں بیٹھ جائیے ۔"

" کیا بات ہے ؟ کہاں جانا ہے ؟ "

بس آپ دیر نہ کیجئے اور تانگہ میں بیٹھ جائیے ۔ انھوں نے فراق صاحب کو قریب قریب کرسی سے اٹھاتے ہوئے کہا ۔

" ارے بھائی معاملہ کیا ہے ؟ " زیر لب بڑبڑاتے ہوئے فراق صاحب تانگہ میں بیٹھ گئے ۔

تانگہ سیدھا ایک شراب خانہ پہونچا جہاں فراق صاحب کی خاطر تواضع انھیں کے روپیوں سے خوب کی گئی ۔ شراب و کباب کے دور کے بعد ان کو اسی تانگہ میں بٹھا کر واپس ان کے گھر پہونچا دیا گیا ۔

دوسرے دن فراق صاحب نے اپنے ایک قریبی دوست سے بڑے مصیبت زدہ لہجے میں شکوہ کیا ۔

" میرے تیس روپے گئے صاحب ۔۔ میں کس منہ سے اس سے مانگوں گا ۔ وہ سب اس نے میرے ہی اوپر خرچ کر لئے "

●

لکھنو کے ایک مشاعرے میں جب فراق صاحب پہونچے مشاعرہ اپنے پورے شباب پر تھا وہ جھومتے ہوئے مائک پر آئے اور پہلے دس منٹ تک حسب دستور قدیم ان کے اور سامعین کے درمیان نوک جھونک ہوتی رہی اور پھر جب فراق صاحب نے کہا ۔

" اب شعر سنو " تو سناٹا چھا گیا ۔

فراق صاحب نے سگریٹ کا کش کھینچا اور ایک مصرعہ پڑھا ۔ پورا ہال ہمہ تن گوش تھا ۔ فراق صاحب کے بالکل سامنے پہلی ہی صف میں ایک صاحب لنگی باندھے بنیائن پہنے بیٹھے تھے اس اتھاہ سناٹے میں فراق صاحب اپنا مصرعہ ختم بھی نہ کر پائے تھے کہ ان صاحب نے بہت ہی مضحکہ خیز انداز میں صدائے واہ واہ بلند کر دی ہال ہنس پڑا ۔

فراق صاحب رک گئے ۔ ان صاحب کو غصہ اور حقارت کی نظروں سے گھورتے رہے پھر بولے ۔

" میاں صاحب زادے آپ یہاں کہاں آ گئے ۔۔۔ آپ کے والد سبزی منڈی میں اپنی دکان پر اکیلے ہیں ۔ جائیے ان کا ہاتھ بٹائیے ۔ یہ مشاعرہ ہے میاں "

ان صاحب کا حال یہ تھا کہ منہ چھپانے کو جگہ نہیں مل رہی تھی ۔ مجمع سے شور بلند ہوا " آپ شعر سنائیے " آپ شعر سنائیے " اور وہ اس شور میں اپنا منہ چھپائے اس طرح غائب ہوئے کہ پھر نظر نہیں آئے ۔

●

فراق صاحب اور ساحر ہوشیار پوری امرتسر کے ایک ہوٹل میں ایک ساتھ پہونچے ۔ ساحر نے ہوٹل کا رجسٹر بھرنا شروع کیا ۔ فراق صاحب پاس کی ایک کرسی پر بیٹھ گئے ۔

ساحر صاحب پیشہ کے خانہ پر پہونچے تو فراق صاحب کی طرف مڑ کر بولے ۔

" کیوں صاحب میں اپنا پیشہ کیا لکھ دوں ؟ "

" معشوق لکھ دو " فراق صاحب نے انھیں یاد دلایا ۔

اس عمر میں۔ ساحر بولے
"تو کیا ہوا۔ آگے پنشن یافتہ بھی لکھ دو"
فراق صاحب نے برجستہ کہا۔

●

فراق صاحب کا ایک مضمون ایک ادبی رسالے میں شائع ہوا۔ مدیر نے فراق صاحب کو اس کا معاوضہ دو سو روپے روانہ کیا۔
فراق صاحب نے ان کو لکھا۔
"مضمون کا معاوضہ مبلغ دو سو روپے وصول ہوئے ... شکریہ .... میں سمجھتا ہوں تم کتنے ہی لوگوں سے بہتر ہو ...... لیکن اگر تم دو سو روپے اور بھیج دو تو میں تمھیں بہترین آدمی سمجھوں گا۔

●

دہلی کے ایک شاعر جو چھپے شعر کہتے ہیں مگر ہر سال ایک مجموعہ چھپواتے ہیں خوبصورت اور شان دار۔ اعلیٰ سرکاری افسر ہیں۔ پیسہ ہے۔ مجموعہ چھپوانے کا انہیں ایسا شوق ہے جیسے دوسروں کو کبوتر بازی یا بٹیر بازی کا شوق ہوتا ہے۔ فراق صاحب جب دہلی جاتے وہ ان کی خدمت میں ہر وقت حاضر رہتے تھے۔
یہ شاعر ایک بار الہ آباد تشریف لائے اور فراق صاحب سے فرمائش کی کہ وہ ان کے نئے مجموعہ کلام پر کچھ لکھ دیں
فراق صاحب نے مروتاً چند رسمی کلمات لکھ دیئے مثلاً یہ کہ یہ شاعر ہیں۔۔ شعر کہتے ہیں..... دہلی میں رہتے ہیں.... سرکاری ملازم ہیں..... مجموعہ کلام چھپوا رہے ہیں۔

... وغیرہ وغیرہ۔
شاعر نے فرط حسرت سے اسے پڑھا۔ مگر پڑھنے کے بعد کچھ تسلی نہ ہوئی بولے۔
"فراق صاحب بس اس میں ایک جملہ اور بڑھا دیجئے"
انھوں نے قریب قریب گڑگڑاتے ہوئے کہا کہ .... نے اردو غزل کو نیا موڑ دیا ہے"
فراق بولے۔
مگر غزل مڑی تو نہیں "

●

الہ آباد کے ایک مشاعرے میں فراق صاحب کو اپنی عادت کے خلاف کافی دیر بیٹھنا پڑا اور دوسرے شاعروں کو سننا پڑا۔ فراق صاحب کی موجودگی میں جن شاعروں نے پڑھا وہ سب اتفاق سے موٹے تازے پاٹ دار آواز اور داڑھی والے گلے باز تھے۔ وہ باری باری آئے اور پھیکی غزلوں کو سر و تال پہ گا کر چلے گئے۔
فراق صاحب بیٹھے بیٹھے اپنی جگہ پہلو بدلتے رہے اور منہ بناتے رہے۔ ان کا بس چلتا تو وہ وہاں سے اٹھ کر چل دیتے مگر بانیان مشاعرہ انہیں کسی نہ کسی طرح روکے رہے۔
جب فراق صاحب کا نام پکارا گیا وہ سب شاعر ایک قطار سے ان کے سامنے ہی بیٹھے تھے۔ فراق صاحب مائک پر آئے ان شاعروں کی طرف ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی اور اعلان کیا۔
حضرات آپ اب تک قوالی سن رہے تھے.....
اب شعر سنیئے "

جس زمانہ میں فراق صاحب کانگریس کے انڈر سکریٹری تھے اور آنند بھون میں ان کا دفتر تھا ان کو نئے فیشن کے کپڑوں کا شوق ہو گیا۔ انھوں نے ایک پھول دار قمیص بنوائی جس میں رنگ برنگے چھوٹے بڑے پھول بنے تھے۔

پہلے ہی دن جب وہ اس قمیص کو پہن کر آنند بھون گئے تو جواہر لال نے ان کو دیکھتے ہی کہا۔

اگر کسی جانور نے دیکھ لیا تو آپ کو چبا جائے گا۔"

●

فراق صاحب جب تک بالکل معذور نہیں ہو گئے کافی ہاؤس برابر جاتے تھے اور وہاں ان کے پہنچتے ہی ان کے گرد ایک بھیڑ جمع ہو جاتی تھی اور وہاں کی چٹکلیں یادگار اور مشہور ہو کر سارے ملک میں پھیل جاتی تھیں۔

ایک بار ایک کوی جن کی شاعری کی عمر مشکل سے چار سال رہی ہوگی۔ اپنے تخلیقی عمل کا ذکر بڑے شد و مد سے کر رہے تھے بولے۔

جب تک کویتا لکھنے بیٹھتا ہوں تو میرے آگے -KEATS 'KALI DAS. MILTON. WORDSWORTH' SHAKES PERE - سب ہاتھ باندھے کھڑے رہتے ہیں۔"

فراق صاحب چپ چاپ سنتے رہے پھر چپکے سے بولے

آپ جہاں بیٹھ کر لکھتے ہیں ذرا وہاں کی زمین کھدوا کر دیکھئے۔"

کوی نے کہا۔

کیوں؟

"وہاں ضرور کوئی گدھا دفن ہوگا" فراق صاحب نے ان کی بیماری کی تشخیص کر دی۔

●

فراق صاحب کا دستور تھا کہ وہ ریٹائر ہونے کے بعد بھی یونیورسٹی آتے رہتے تھے کچھ دیر شعبہ انگریزی میں بیٹھتے اور پھر شعبہ اردو ضرور جاتے گھنٹوں خوش گپیاں ہوتیں ۔۔۔ نئے ٹیچروں سے ملتے۔ پرانوں سے ہنسی مذاق ہوتا۔

ڈاکٹر اعجاز حسین جو اس زمانہ میں شعبہ اردو کے صدر تھے اپنا کمرہ بند کر کے پڑھاتے تھے کیونکہ ان کا کمرہ بالکل سڑک کے کنارے تھا اور مستقل شور سے معمور رہتا تھا۔

ایک دن جب فراق صاحب پہنچے تو کمرہ اندر سے بند تھا۔ فراق صاحب پہنچے دستک دی۔ اعجاز صاحب نے دروازہ کھولا اور دست بستہ کہا

"میں کلاس لے رہا ہوں آپ اگر تھوڑی دیر۔۔۔"

"تو کیا ہوا" فراق صاحب بولے "میں بھی کلاس میں بیٹھوں گا۔"

"ارے فراق صاحب آپ کہاں۔۔۔"

"نہیں نہیں میں تمھارے کلاس میں بیٹھوں گا۔"

فراق صاحب بضد ہو گئے۔

اس سے پہلے کہ اعجاز صاحب کچھ اور کہیں

فراق صاحب کلاس کے اندر رہے۔ وہ خاموشی سے آخری کرسی پر بیٹھ گئے۔ لڑکے پہلو بدلنے لگے۔ اعجاز صاحب غزل پر بول رہے تھے مجبوراً لکچر جاری رکھا۔ دس منٹ کے بعد فراق صاحب نے ہاتھ اٹھایا۔ پہلے تو اعجاز صاحب نے ان کے ہاتھ کو نظر انداز کیا مگر جب ہاتھ اٹھانے کے ساتھ ساتھ انہوں نے کہا "مجھے ایک سوال پوچھنا ہے" تو اعجاز صاحب کو مخاطب ہونا پڑا۔

فرمائیے۔

فراق صاحب نے سوال کیا۔

"ایسا کیوں کہا جاتا ہے کہ غزل گو شعراء عام طور سے بدکردار ہوتے ہیں؟"

اعجاز صاحب برجستہ بولے۔

"ان کے سامنے آپ کی مثال رہتی ہے۔"

کلاس میں ایک زبردست قہقہہ پڑا اور فراق صاحب کی آواز قہقہوں میں دب گئی جواب میں کچھ کہنا چاہتے تھے۔

●

ایک تباہ شدہ نواب صاحب فراق سے ملنے آئے۔ بہت باوقار، مہذب اور ذی علم افلاس زدہ فراق صاحب نے ان کے شایانِ شان ان کی آؤ بھگت کی باتیں ہوتی رہیں اور فطری طور پر باتوں کا رخ ماضی کی طرف مڑ گیا۔

فراق صاحب بولے۔

تعلقہ داری کے زمانے میں اور جو خرابیاں یا برائیاں رہی ہوں مگر صاحب..... بڑا رنگین زمانہ تھا۔

نواب صاحب کے چہرے پر اداسی کے کئی رنگ چڑھنے اترنے لگے اور قریب قریب ہاتھ ملتے ہوئے بولے۔

"کچھ بھی نہ بچا۔ فراق صاحب کچھ بھی نہ بچا۔"

ایک نئے نئے سرمایہ دار جو وہاں بیٹھے باتیں سن رہے تھے بولے۔

"دو قلمی آم کی باغیں تو ہوں گی ہی۔"

نواب صاحب خاموش رہے مگر فراق صاحب نے مڑ کر ان کی طرف دیکھا اور مسکراتے ہوئے بولے۔

ایسا ایک ہی قلمی پیڑ بچا ہے جس پر ان کی نوالی چل رہی ہے۔

●

گیان پیٹھ ایوارڈ ملنے کے بعد ہندوستانی اکاڈمی کی ایک تقریب میں فراق صاحب شریک ہوئے وہاں ایک معزز خاتون بھی تھیں۔ انھوں نے فراق صاحب سے کہا۔

"فراق صاحب آپ کو انعام ملا اور آپ نے بہنوں کو یاد بھی نہ کیا، کم سے کم ہم بہنیں تو مٹھائی کی حق دار تھیں ہی۔"

فراق صاحب جن کے والد بھی گرہستی چھوڑ کر انتقال کر گئے تھے۔ اور جن کے کاندھوں پر بہت کم سنی میں اپنی بہنوں کی شادی بیاہ کی ذمہ داری آن پڑی تھی گھبرا کر بولے۔

مٹھائی جب چاہو کھا لو۔ مگر میں ایسی ہی بہنوں سے پریشان تھا مجھے اور بہنیں نہیں چاہئیں۔

●

الہ آباد یونیورسٹی میں انگریزی زبان لازمی مضمون تھا اور اس کا ۲۵ نمبر کا زبانی امتحان ہوتا تھا۔ اس زبانی امتحان میں لڑکے کو اپنے ساتھ پانچ مضامین لکھ کر لے جانا ہوتا تھا جو اس کی سال بھر کی محنت سمجھی جاتی تھی۔ رائے صاحب نے کبھی نظر اٹھا کے بھی اس طرف نہیں دیکھا تھا نہ ان کو فرصت تھی کہ وہ بیٹھ کر لکھتے۔

امتحان کے دن صبح آپ اپنے ایک دوست کے یہاں پہنچے اور ایک سادہ کاپی خرید کر ساتھ لیتے گئے اور بولے اس میں پانچ مضمون کہیں سے نقل کردو۔ دوست نے کہا امتحان شروع ہونے میں صرف دو گھنٹے رہ گئے ہیں۔ میں اتنے کم وقت میں پانچ مضمون نہیں لکھ سکتا۔ رائے صاحب بولے کوئی بات نہیں اور یہ کہہ کر غصہ میں چلے آئے۔ دوست سمجھے وہ امتحان میں شامل نہیں ہوں گے۔ مگر رائے صاحب سب سے پہلے موجود تھے۔

جیسے ہی آپ کا نام پکارا گیا آپ نے پان کا ڈبہ چپراسی کو تھمایا اور چھڑی اٹھا کر اندر داخل ہوئے سادی کاپی بغل میں دبی ہوئی تھی سر جھکا کر بہت ہی کمزور اور رقت آمیز آواز میں بولے GOOD MORNING SIR پروفیسر سمجھے لڑکا بیمار ہے پوچھا ARE YOU ALRIGHT?

رائے صاحب نے اسی رقت آمیز آواز میں جواب دیا I AM ALRIGHT SIR BUT MY WIFE DIED THIS MORNING LEAVING BEHIND FIVE DAY OLD CHILD SIR اور یہ کہتے کہتے قریب رو پڑے۔

پروفیسر نے کہا VERY SORRY TO HEAR ... --- YOU MAY GO

رائے صاحب نے جھوٹ موٹ آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ WOULD YOU LIKE TO SEE MY ESSAYS SIR

پروفیسر نے کہا NO NO. ITS ALRIGHT

رائے صاحب باہر نکلے۔ چپراسی سے پان کا ڈبہ لیا۔ سیٹی بجائی اور روانہ ہو گئے۔

نتیجہ نکلا تو پتہ چلا رائے صاحب کو ۲۵ نمبروں میں ۲۰ نمبر ملے ہیں۔

●

یونیورسٹی کے ایک پروفیسر بہت زیادہ پوجا پاٹ کرتے تھے۔ مگر دنیاوی ترقی کے پیچھے پاگل بھی تھے اور جتنی ترقی کی خواہش تیز ہوتی جاتی تھی اتنا ہی پوجا کا وقت بھی بڑھتا جاتا تھا۔

فراق صاحب ایک زمانے میں صبح ٹہلنے کے عادی تھے اور یہی وقت ان پروفیسر کی پوجا کا ہوتا تھا۔ ایک دن فراق صاحب کو شرارت سوجھی اور ٹہلتے ٹہلتے ان کے گھر پہنچ گئے دستک دی تو نوکر برآمد ہوا فراق صاحب نے پوچھا پروفیسر صاحب ہیں نوکر نے کہا "ہیں مگر پوجا کر رہے ہیں"

فراق صاحب نے کہا۔ ان سے ابھی کچھ نہ کہنا جب پوجا ختم کرلیں تو کہہ دینا مہاراجہ بڑودہ کے سکریٹری

بہت ضروری کام سے ملنے آئے تھے۔"

یہ کہہ کر فراق صاحب چلے آئے۔ پوچھا کے بعد یہ وفیسر صاحب کو بتایا گیا تو وہ قریب پاگل ہو گئے۔

"اُلو کے پٹھو مجھ سے فوراً کیوں نہیں بتایا گیا۔"

لوگوں نے کہا۔

آپ ہی کا حکم ہے کہ پوجا میں آپ کو DISTURB نہ کیا جائے۔

بولے:۔ ارے یہ حکم ہر موقع کے لئے نہیں ہے کیا معلوم کیا بات کرنی تھی اسے خدا جانے کیا پیغام تھا مہاراجہ کا اب اسے کہاں ڈھونڈوں ..... اسے بٹھایا کیوں نہیں اس سے پتہ کیوں نہیں لیا کہ وہ کہاں ٹھہرا ہے۔"

اور پروفیسر صاحب تین دن تک سارے شہر میں مہاراجہ بڑودہ کے سکریٹری کی تلاش کرتے رہے۔

●

فراق صاحب کی ساری زندگی تنہائی میں گزری آخر زمانہ میں تو گھر میں نوکروں کے سوا اور کوئی نہیں رہتا تھا۔ کبھی کبھی تو صرف ایک... نوکر اور ایک دن جب نوکر چلا جاتا تھا تو تنہا اتنے بڑے گھر میں خاموش بیٹھے ہوئے سگریٹ پیا کرتے تھے۔ ایسا لگتا تھا صحارا کے لق و دق ریگستان میں ایک آدمی کرسی ڈالے بیٹھا ہے خاص طور سے شام کو یہ تنہائی دردناک حد تک گہری ہو جاتی تھی۔

ایک ایسی ہی شام کو وہ چپ چاپ بیٹھے تھے نوکر بازار گیا ہوا تھا۔ ایک غنڈہ موقع غنیمت سمجھ کر دبے پاؤں گھر میں گھس گیا اس نے چاقو نکال کر فراق کے سینہ پر رکھ دیا اور رقم کا طلب گار ہوا۔ فراق صاحب اس کو چپ دیکھتے رہے پھر بولے۔

" اگر تم جان لینا چاہتے ہو تو میں کچھ کہنا نہیں چاہتا۔ اگر روپیہ چاہتے ہو تو وہ میرے پاس نہیں ہے نوکر بازار گیا ہوا ہے۔ ... بیٹھ جاؤ.... ابھی آجائے گا تو تمھیں روپیہ دلا دوں گا۔"

حملہ آور بیٹھ گیا۔ فراق صاحب نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا اور پھر بولے۔

" اچھا ہوا تم آگئے میں بڑی تنہائی محسوس کر رہا تھا۔

●

علی گڑھ کے مشاعرہ میں فراق صاحب نشہ میں دھت ہو کر پہنچے مشاعرہ اپنے پورے شباب پر تھا فراق صاحب کو دعوت سخن دی گئی وہ جھومتے ہوئے مائک تک آئے اور اُدھر طلبا کی ایک صف سے آواز آئی۔

" باندھ دو "

فراق صاحب نے سوالیہ نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا اور پوچھا " کیوں ؟ کیا ؟ کوئی مضبوط کھونٹا ہاتھ لگ گیا ہے"

●

احمدآباد میں ایک شاعرے کے بعد فراق صاحب شام کے وقت اپنے دوستوں کے ساتھ شراب پی رہے تھے کہ ایک اجنبی نوجوان داخل ہوا اور فراق صاحب کو پوچھتا ہوا ان کے قدموں پہ گر پڑا۔

فراق صاحب آپ بہت مہان ہیں۔ میں اس کے ثبوت میں ایک واقعہ سنانے آیا ہوں اجازت ہو تو عرض کروں ؟

سب ہمہ تن گوش ہو گئے۔ اس نے شروع کیا۔

کل میں سڑک پر جا رہا تھا کہ دیکھا ادھر سے ایک بارات جا رہی ہے۔ آگے آگے دولھا کا ہاتھی تھا۔ ہاتھی چلتے چلتے ایک دم رک گیا۔ مہاوت نے لاکھ کوشش کی مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ باراتی پریشان ہو گئے دولھا کے باپ کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ اتنے میں ایک لڑکے نے دولھا کے باپ سے آکر کہا۔ اگر آپ مجھے پچاس روپے دیں تو میں ہاتھی کو چلا سکتا ہوں۔

دولھا کے باپ نے کہا۔ پچاس کیا میں سو دوں گا۔ جلدی کرو بیٹا۔ لڑکا ہاتھی کے پاس گیا اور اس کے کان میں کچھ کہا اور اس لڑکے کی بات سنتے ہی ہاتھی دم دبا کر سرپٹ بھاگنے لگا۔

لڑکا لمحہ بھر کے لئے رکا فراق صاحب نے پوچھا

"اس لڑکے نے ہاتھی کے کان میں کیا کہا تھا۔۔۔۔"

لڑکا بہت متانت سے بولا۔

اس لڑکے نے ہاتھی کے کان میں کہا تھا۔ ابے سالے چل تیرے پیچھے فراق آکر کھڑے ہیں یہ کہہ کر لڑکا بھاگ کھڑا ہوا۔

●

ایک مشاعرے میں جہاں ہر شاعر قتل کیا جا رہا تھا اور لڑکوں نے بڑے بڑوں کی پگڑی اتار دی تھی فراق صاحب بھی موجود تھے۔ ابھی ایک شاعر مائک پر شہید ہو گیا رہا تھا کہ اناؤنسر صاحب نے پیچھے مڑ کر ایک شاعر سے کہا۔

اس کے بعد میں آپ کو بلاؤں گا۔ تیار رہیئے۔

ان شاعر نے اپنی ایک بیاض نکالی اور اپنے ایک ساتھی سے کہا۔

کیا پڑھوں' اور اپنی بیاض ان کو دیتے ہوئے کہا۔

ذرا چھانٹو تو۔۔۔۔"

فراق صاحب جو پاس ہی بیٹھے تھے بولے۔

وہاں جایئے چھٹ جائے گی۔

●

فراق صاحب جب پاکستان کے دورے سے واپس آئے جہاں ان کی بڑی آؤ بھگت ہوئی تھی۔ تو کچھ لوگ ان سے ملنے آئے جو ان کے دورے کے تاثرات جاننا چاہتے تھا۔ اس زمانے میں دونوں ملکوں میں آمد ورفت پر بڑی پابندیاں تھیں۔ اور لوگ ایک دوسرے کے بارے میں جاننے کے بڑے خواہشمند رہتے تھے۔ فراق صاحب نے ان لوگوں کو پاکستان کے بارے میں بہت سی باتیں بتائیں مگر لوگوں کو سیری نہیں ہوئی۔ ایک صاحب بولے۔

"ویسے وہاں عام لوگوں کا کیا حال ہے؟"

فراق صاحب نے جواب دیا:

"بھائی لوگ بہت اداس ہیں۔ بہت دکھی ہیں"

ان صاحب نے پوچھا۔

"مگر کیوں اداس ہیں؟"

فراق صاحب نے نہایت بھولے پن سے جواب دیا۔

"وہاں ہندو ہی نہیں ہیں۔ کس سے لڑیں"

تسنیمؔ فاروقی

غزل

جب تک بکھر نہ جاؤں اپنوں کا آئینہ ہوں
میں سب کے غم سمیٹے چہروں میں جی رہا ہوں

ہر زخم سر کا خوں میں ہاتھوں پہ لے رہا ہوں
ہر سنگ کہہ رہا ہے مجھ سے کہ میں خدا ہوں

گھیرے میں آگیا ہوں تیروں کو ختم کر لو
کل تم یہیں کہو گے میں جس جگہ کھڑا ہوں

مقتل میں آچکا ہوں لیکن غنودگی ہے
کوئی جگا رہا ہے آواز سن رہا ہوں

چہرے پہ رینگتے ہیں کچھ بے قرار لمحے
اپنی تباہیوں کے اخبار پڑھ رہا ہوں

باتوں میں اس کی نغمہ ہونٹوں میں اسکے صہبا
آنکھوں سے سن رہا ہوں کانوں سے پی رہا ہوں

یہ روشنی نہ مجھ کو تسنیمؔ چھو سکے گی
خوشبو کا مقبرہ ہوں تہذیب کی دعا ہوں

کاشفؔ لکھنوی

غزل

ہم ترے نام سے بکتے رہے بازاروں میں
اس لئے ہو گئے مشہور خریداروں میں

کتنی صدیوں کا لئے کرب ہیں اپنے دل میں
ہائے وہ بت جو تراشے گئے دیواروں میں

جسم بکتے رہے اک جنسِ گراں کی صورت
دل کا طالب نہ ہوا کوئی خریداروں میں

ایک مدت ہوئی جب نام لیا تھا تیرا
اس لئے ہیں سرِ فہرست گنہ گاروں میں

کتنے ہاتھوں پہ عداوت کی لکیریں ابھریں
جب بھی آیا ہے مرا نام وفاداروں میں

ان بھڑکتے ہوئے جسموں پہ مچلنے والو
سوزِ غم بھی تو ہے پازیب کی جھنکاروں میں

یوں مرے ساتھ ہیں کچھ اہلِ نظر اے کاشفؔ
جیسے کچھ لوگ ہیں غالبؔ کے طرفداروں میں

تین افسانچے

ڈی ۔ ایچ ۔ شاہ

دھواں

جب کئی دن ہوگئے اور کھیل تک اڑکر منہ میں نہ گئی تو اس نے بیٹھے بیٹھے محلے کے گھروں کا جائزہ لیا گھوم پھر کر اسکی نظر میں بس ایک ہی گھر آیا۔ کچھ دیر تک تو وہ اپنے آپ سے لڑتی رہی پھر ہمت کرکے اٹھی اور اس کے سرہانے گئی۔ لیکن کس سے پوچھتی۔ وہ تو بیہوش پڑا تھا۔ وہ ایک لمحہ کیلئے ٹھٹکی پھر گھر سے نکل گئی۔

جب اس بیہوش آدمی کی آنکھ کھلی تو اس نے اسے چولھے میں پھونکیں مارتے دیکھ کر کراہتے ہوئے پوچھا کس نے ادھار دیدیا؟ اس نے اسکی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھا اور بولی ــــ شیخ صاحب کے ہاں گئی تھی۔ ان سے ادھار مانگا تھا۔ ان کی منتیں بھی کیں اور .... اور وہ کچھ نہ کہہ سکی۔ اسکی ہچکیاں بندھ گئیں۔

اتنی سی دیر میں چولھا دھوئیں سے بھر گیا تھا۔ کڑواہٹ سے اسکی آنکھیں جلنے لگیں۔ لیکن وہ تو اٹھ بھی نہیں سکتا تھا۔

سکون

جب وہ گھر میں آیا تو دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اس نے چاروں طرف دیکھا وہ بغلی کمرے میں چادر اوڑھے لیٹی تھی۔ اسکا پارہ چڑھ گیا۔ وہ بڑبڑایا یہاں تو تمام دن چلچلاتی دھوپ میں کام کرتے کرتے ہمارا کچومر نکل گیا اور یہ نواب زادی لمبی تانے پڑی ہے۔

اس نے اسے بالوں سے پکڑ کر کھینچ لیا۔ وہ دھڑام سے زمین پر آگری۔ اس کے اکڑے ہوئے جسم پر اسے پیار آگیا۔ اپنے زانو پر اسکا سر رکھ کر اسے غور سے دیکھنے لگا۔ کتنا سکون تھا اسکے چہرے پر۔ کاش یہ میرے چہرے پر ہوتا۔ اس نے سوچا۔ اس خیال کے آتے ہی اس نے اسکا سر اپنے زانو سے اٹھا کر زمین پر پٹخ دیا۔ اسکی آنکھوں سے نفرت ٹپک رہی تھی۔ پھر اس نے اسے اٹھایا اور چارپائی پر ڈال کر اسے چادر اڑھادی۔ ٹھوکر لگنے سے دوا کی شیشی ایک چھناکے سے ٹوٹ گئی۔

جب سب لوگ اسے پرسہ دیکر چلے گئے تو وہ اسی چارپائی پر لیٹ گیا۔ اسے نیند آگئی۔ جیسے اسے سکون مل گیا ہو۔

سہارا

ہر روز کی طرح آج بھی وہ منہ لٹکائے چلا آرہا تھا۔ سورج کی کرنیں سر پر سیدھی پڑ رہی تھیں لیکن وہ اپنے خیالوں میں گم زمین کو گھورتا چل رہا تھا۔ اس کا ذہن زمین کے سینے کو چیرتا ہوا تحت الثریٰ تک جا پہنچا تھا اس نے خود کو گرتا ہوا محسوس کیا۔ اچانک ایک ستون اسکے ہاتھوں میں آگیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اس ستون کو مضبوط پکڑ لیا۔ وہ جتنا گرتا جاتا تھا اسکی گرفت اتنی ہی مضبوط ہوتی جاتی تھی۔ اگلے روز اخباروں نے ایک سرخی لگائی۔

"ایک شخص نے اپنا گلا آپ گھونٹ لیا"۔

ڈاکٹر ثاقب انور
ایم اے پی ایچ ڈی

ترقی پسند اردو شاعری پر رومانوی تحریک کے اثرات

اُردو ادب میں یوں تو حالیؔ، شبلیؔ اور اقبالؔ کی تحریروں سے ترقی پسندی کا دور شروع ہو چکا تھا لیکن ایک ادبی تحریک کی شکل میں اس کا آغاز اپریل ۱۹۳۶ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس منعقدہ لکھنؤ سے ہوا جس کی صدارت پریم چند نے سنبھالی تھی۔ یہ تحریک زندگی کو ایک نامیاتی اور جدلیاتی حقیقت تسلیم کرتے ہوئے اس کی انقلابی اور ترقی پذیر فطرت کا اثبات کرتی ہے اور نئے دور کے تقاضوں کو تسلیم کرتے ہوئے ایسے ادب کی تخلیق پر زور دیتی ہے جو انقلاب اور ترقی کے حصول میں مددگار ثابت ہو۔ اس تحریک کا نصب العین سامراجیت، رجعت پرستی اور قدامت پسندی سے لوہا لیتے ہوئے سماج کے طبقاتی نظام پر ضرب کاری لگانا اور غریب اور متوسط طبقے کے عوام کو معاشی اور سماجی انصاف دلوانا چاہتے ہے اس مقصد کے حصول کے لئے ترقی پسندوں نے کارل مارکس اور لینن کی تعلیمات کو مشعلِ راہ بنایا اور انقلابِ روس سے (INSPIRATION) حاصل کیا تھا اگرچہ کہ اس تحریک کی بعض منافی قدامت پسند حلقوں کی جانب سے شدید مخالفت کی گئی لیکن جلد ہی یہ تحریک اردو دنیا پر چھا گئی اور تقریباً ربع صدی تک ہندوستان میں اس کا سکہ چلتا رہا اس تحریک کے زیر اثر مختلف اصناف میں جو ادب تخلیق کیا گیا اس میں سے کتنا حصہ ادب عالیہ کی شکل میں باقی رہے گا اور کتنا پروپگنڈہ قرار پا کر رد کر دیا جائے گا۔ اس بات کا فیصلہ تو مستقبل ہی کرے گا آج ہمیں صرف اس امر کا جائزہ لینا ہے کہ ترقی پسند اُردو شاعری پر رُومانی تحریک کے کیا اثرات مرتب ہوئے۔ رومانیت ایک خالص علمی اور ادبی اصطلاح ہے جسے عام طور پر تاریخ ثرشہ ہی

محدود مفہوم میں استعمال کرتے ہیں۔ غلطی سے عشق و عاشقی سے متعلق شعری تخلیقات کو رومانی تخلیقات سمجھ لیا جاتا ہے۔ حالانکہ رومانیت اس سے ہٹ کر بھی بہت کچھ ہے۔ اگر عشق سے متعلق مضامین باندھنے کا نام ہی رومانیت ہوتا تو دنیا کی ہر زبان کا ہر شاعر رومانی شاعر کہلاتا حالانکہ حقیقتِ حال اس سے بالکل مختلف ہے۔

آیئے مختصراً دیکھیں کہ " رومانیت " کسے کہتے ہیں اور کیا یہ چیز اردو ادب میں اُن ہی معنوں میں تحریک کی شکل میں موجود تھی جن میں یورپ اور انگلستان کی رومانی تحریکیں ادب پر اثر انداز ہوئیں۔

رومانیت دراصل کلاسیکیت کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرنے کا نام ہے۔ کلاسیکیت چونکہ عقلیت پسندی، اصول پرستی اور ترتیب کی متقاضی ہوتی ہے لہٰذا یہ زندگی اور اس کے حسن کو چند محدود دائروں میں مقید کر لیتی ہے۔ چنانچہ میانہ روی، اعتدال اور تقلید کلاسیکیت کی بنیادی قدریں بن جاتی ہیں۔ اسی اصول پرستی، عقلیت، میانہ روی کے خلاف " صاعقہ بدوش " بغاوت کو رومانیت کہتے ہیں۔

کلاسیکیت چونکہ عقل اور فکر ہی کی برتری تسلیم کرتی ہے لہٰذا اس کے نزدیک انسانی جذبات کی کوئی اہمیت نہیں۔ وہ انتہائی بے رحمی سے انسانی جذبات کو روند ڈالتی ہے اور ان کی لاشوں پر " بے روح سانچوں اور جامد اصولوں کی عظمت کا مینار تعمیر کرنا چاہتی ہے "۔ اس کلاسیکیت کے خلاف علمِ بغاوت بلند کر کے رومانیت نے ایک انقلابی تحریک کا روپ دھار لیا اور بدلے ہوئے حالات میں کائنات کی نئی قدروں کی بازیافت شروع کر دی۔ چنانچہ جلد ہی ہر وہ تحریک رومانیت سے وابستہ سمجھی جانے لگی جو اپنی سرشت میں انقلابیت کا جوہر رکھتی ہو اور " طریقۂ راسخۂ قدما " سے خود کو الگ رکھتے ہوئے نئی قدروں کی بازیافت کا حوصلہ رکھتی ہو۔ غالباً یہی وجہ ہے بریتاں (BRETON) اور ریڈ (READ) جیسے نقاد سوریلزم کو " اعلیٰ رومانیت " کا لقب دیتے ہیں۔ ہڈسن تو اور آگے بڑھ کر حقیقت پسندی، نیچرل ازم، سوریلزم اور اظہاریت کو بھی رومانیت ہی کی مختلف شکلیں قرار دیتا ہے۔

رومانیت کو سائنس کے کسی ضابطے کی طرح چند الفاظ میں بیان کرنا محال ہے۔ چونکہ یہ اصطلاح یورپ کی ان زبانوں سے نکلی ہے جنہیں " رومانس " کہا جاتا ہے لہٰذا اس لفظ کے ساتھ تین خاص مفاہیم وابستہ ہو گئے۔ اول تو یہ کہ ایسی تمام چیزیں رومانوی کہلانے لگیں جن کا تعلق عشق

اور محبت سے ہو۔ دوم یہ کہ ہر " محاکاتی تفصیل پسندی" "آرائش" "آراستگی" فراوانی اور شان و شوکت کے اظہار کو" رومانیت کہا جانے لگا اور سوم یہ کہ ماضی پرستی ' قدامت پسندی اور عہدِ وسطیٰ سے متعلقہ تمام چیزوں سے لگاؤ کو رومانیت کہا جانے لگا۔

رومانیت ہر جذبے کو اس کی انتہائی شکل میں پسند کرتی ہے۔ اقبال کی اصطلاح میں "رومانیت" ایسی خودی کی یاد دلاتی ہے جو اطاعتِ نفس سے آشنا نہیں ' اسی لئے رومانیت کا جہاں فرد کا جہاں ہے۔ جماعت کی حیثیت یا تو ضمنی ہے یا سرے سے مفقود ہے۔

اس پس منظر کو سمجھ لینے کے بعد یہ جان لینا بھی از بس ضروری ہے کہ اردو ولوپ میں رومانیت کسی تحریک کی شکل میں کبھی بھی موجود نہیں رہی لیکن ایک "زاویۂ نظر" کے طور پر یہ ہمیشہ موجود رہی ہے۔

اردو شاعری میں رومانیت کی سب سے دلآویز شکل ہمیں اختر شیرانی کے کلام میں ملتی ہے انھوں نے اپنی نظم "اے عشق کہیں لے چل" میں دور افتادہ موہوم بستیوں کی تلاش کی ہے جو ساری دنیا و مافیہا سے علیحدہ ہوں۔ اختر کی قرار پا سکنے والی اس رومانیت پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد حسن رقمطراز ہیں: "رومانیت دنیا کو رنگینیوں کی عینک سے دیکھنے کی عادی ہے۔ وہ زندگی کی دشواریوں سے بر سرِ پیکار ہونے اور انھیں زیر کرنے کی نشریت برداشت نہیں کر سکتی کیونکہ وہ معمول سے بغاوت کر کے غیر معمولی روش اختیار کرتی ہے۔" اسی وجہ سے اختر کو دوسری دنیا کی تلاش ہے۔

ترقی پسند شاعروں میں جوش کو "شاعرِ انقلاب" کہنا بقول سردار جعفری غلط بات ہے۔ ان کے خیال میں جوش سو فیصدی رومانی شاعر ہیں اور ان کے انقلاب کا تصور بھی رومانی ہے۔ جوش کی رومانیت جو وطن کی محبت اور آزادی کی خواہش سے پیدا ہوئی صحت مند اور انقلابی عناصر کی حامل ہے۔ وہ سماج کے ظلم ' فریب ' ریاکاری کا پردہ چاک کرتی ہے اور عدل و انصاف اور محبت کی ترغیب دیتی ہے اور انسان دوستی کی اس منزل پر پہنچ جاتی ہے جہاں شاعر کہتا ہے ؎

کوئی حد ہی نہیں اس احترامِ آدمیت کی — بدی کرتا ہے دشمن اور ہم شرمائے جاتے ہیں

جوش ورڈسورتھ کی طرح سحر کے جلووں سے خدا کے وجود کا ثبوت حاصل کرتے ہیں۔ اُن کی شبابیاتی شاعری جذبے کی بے باک سرکشی کی قائل ہے۔ شاعری میں انھوں نے جذبات اور احساسات پر اپنا تمام زور صرف کیا ہے۔ اپنے حکیمانہ شعور کے باوجود جوش کبھی بھی مفکر یا فلسفی شاعر نہ ہو سکے۔ بنیادی طور پر وہ رومانی نغموں کے شاعر ہی کہلائیں گے۔

اُردو رومانوی شعرا کی صف میں ہمیں ایک ایسا جری اور بے باک شاعر بھی نظر آتا ہے جس نے اپنی سیاسی اور عملی زندگی میں سامراج دشمنی اور بغاوت کو اپنا شعار بنائے رکھا۔ اس شاعر آتش نفس کو ہم حسرت موہانی کے نام سے جانتے ہیں جنھوں نے اپنی عشقیہ شاعری کو اس کی ارضیت اور جسمانیت کے باوجود پاکیزہ بنائے رکھا۔ یہی وہ اردو کا نامور شاعر ہے جس نے غزل کو لکھنؤ کے انحطاطی مکتب سے آزاد کیا اور اس کی ترقی کی نئی جہتیں متعین کیں۔ ان کا یہ شعر مقبول عام ہے:

خرد کا نام جنوں پڑ گیا جنوں کا خرد جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

غالباً جگر مرادآبادی کو مارکسزم کا مبلغ نہ ہونے کی وجہ سے شاید ترقی پسندوں کی صف میں شامل نہ کیا جاسکے تاہم وہ ایک طویل عرصے تک مشاعروں کے ہیرو بنے رہے۔ ویسے انھیں "لہرا کے پی گیا" جیسی غزلوں کی وجہ سے کافی شہرت ملی لیکن ان کے پاس ایسے رومانی اشعار بھی مل جاتے ہیں جن میں جذبات کی شدت اور فکر کی گہرائی پائی جاتی ہے۔ مثلاً:

کبھی شاخ و سبزہ و برگ پر کبھی غنچہ و گل و خار پر میں چمن میں چاہے جہاں رہوں میرا حق ہے فصلِ بہار پر

یا

آ کہ تجھ بن اس طرح اے دوست گھبراتا ہوں میں جیسے ہر شئے میں کسی شئے کی کمی پاتا ہوں میں

۱۹۴۷ء کے بعد جگر کے اشعار میں سماجی اور سیاسی حقائق کی عکاسی ہونے لگی، مثلاً:

کہاں کے لالہ و گل کیا بہار توبہ شکن کھلے ہوئے ہیں دلوں کی جراحتوں کے چمن

یا

سلامت تو ترا میخانہ تیری انجمن ساقی مجھے کرنی ہے اب کچھ خدمتِ دار و رسن ساقی

جگر کے بعد اگلا نام حفیظ جالندھری کا ہے۔ جنھیں ان کی ہلکی پھلکی خوبصورت رومانی نظمیں ہمیشہ ادب میں زندہ رکھیں گی۔ سردار جعفری "شاہنامہ اسلام" کو حفیظ کا سب سے بڑا کارنامہ ماننے کی بجائے اس بات کو ان کا عظیم کارنامہ تسلیم کرتے ہیں کہ انھوں نے اردو بحر ولا کو مترنم طریقے سے استعمال کیا ہے اور اس طرح شاعری کی نئی راہیں اور اظہار و بیان کی نئی گنجائشیں پیدا کی ہیں۔ "ابھی تو میں جوان ہوں" جیسی رومانی سرمستی میں ڈوبی ہوئی نظمیں بھلا کسے یاد نہیں۔

مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ اُردو شاعری میں جس جدید رومانی تحریک کا آغاز اختر شیرانی اور جوش کی شاعری سے ہوتا ہے اس نے مجاز، فراق، حفیظ، اختر انصاری اور سکندر علی وجد ہی کو متاثر نہیں کیا بلکہ کیفی اعظمی، ساحر، ظہیر کاشمیری، مخدوم محی الدین، احمد ندیم قاسمی، جاں نثار اختر،

اور فیض احمد فیض کو بھی بے انتہا متاثر کیا جس کا اعتراف سردار جعفری نے ان الفاظ میں کیا ہے:

"پہلی جنگِ عظیم کے بعد اختر شیرانی نے عورت کو معشوقہ اور محبوبہ بنا کر پیش کیا اور اردو شاعری میں ہمیشہ کے لئے اس کی جگہ بنا دی یہ کام انھوں نے اس وقت کیا جب اقبال اور جوش بھی اپنی شاعری میں معشوقہ کو چھپانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ترقی پسند شاعروں نے اختر شیرانی کی اس روایت کو آگے بڑھا کر اردو شاعری کو زیادہ فطری بنا دیا ہے۔"

محمود حسین ادیب مرحوم

تظمین بر غزلِ داغ

تو رہے آباد کیوں کیسی کہی — ہو عدو برباد کیوں کیسی کہی
وہ کریں پھر یاد کیوں کیسی کہی — "غیر ہو ناشاد کیوں کیسی کہی

چاہتا ہوں داد کیوں کیسی کہی"

زاہدا تجھکو خدا ایمان دے — نیک و بد کی پھر تجھے پہچان دے
بات پکی ہے لا مجھے قرآن دے — "تو بھی اے ناصح کسی پر جان دے

ہاتھ لا استاد کیوں کیسی کہی"

تھی تری طرزِ ادا ایسی عجیب — داد دیتے ہیں تجھے دل سے رقیب
ہاں خلوصِ دل سے کہتا ہے ادیب — "داغ تجھکو باغِ جنت ہو نصیب

خانماں برباد کیوں کیسی کہی"

ایڈیٹر سید وحید اشرف ۔ مدراس یونیورسٹی

کسوٹی

کسوٹی میں تعمیری تنقید کی حوصلہ افزائی کی جائے گی اور اس کے لئے یہ ضروری نہیں کہ ہر تنقید نگار کی رائے مدیر کے زاویہ نظر سے مطابقت رکھتی ہو۔ مطمح نظر صرف یہ ہے کہ اس سے نئی نسل بالخصوص ادبا شعراء نہ صرف استفادہ کرسکیں بلکہ تعمیری انداز فکر کی نشو و نما بھی ہو۔

ادارہ

قارئین سے التماس ہے کہ گذشتہ مئی جون اور جولائی کے ذوق نظر میں کسوٹی کے زیر عنوان شاذ تمکنت کی غزل پر تبصروں کو پیش نظر رکھیں۔ زیر نظر تبصرے میں گزشتہ تبصروں کی طرف اشارے کئے گئے ہیں ان سے اقتباس کرنے سے اجتناب کیا گیا ہے۔

بجھا نہ دے کہیں اے حسنِ جوئے کم آبی
چراغِ تشنہ لبی کو ہوائے سیرابی

اس شعر پر یعقوب عمر کے دو اعتراضات ہیں۔ ایک یہ کہ اے حسنِ جوئے کم آبی غیر ضروری ٹکڑا ہے۔ دوسرے یہ کہ یہ ترکیب ہی غلط ہے۔ صحیح ترکیب ہے جوئے کم آب۔ پہلے اعتراض کا جواب علی احمد جلیلی نے یوں دیا ہے کہ ہوائے سیرابی کا ماخذ ہونا ضروری ہے اور وہ حسن ہے جس کے بغیر شعر مکمل نہیں ہوسکتا۔ جلیلی صاحب کا یہ جواب ادھورا ہے کیونکہ ان کی یہ بات مان لینے کے بعد بھی شعر کو درست نہیں قرار دیا جا سکتا۔ شعر کی نثر اس طرح ہوگی : اے حسن جوئے کم آبی (میرے) چراغ تشنہ لبی کو (تجھ سے) سیرابی کی ہوا۔ (یعنی خواہش) کہیں بجھا نہ دے۔ قوسین میں الفاظ کا اضافہ راقم کی طرف سے ہے جو قرینے سے ظاہر ہے شاعر نے حُسن کو خطاب کیا ہے لہذا حسن ہی ہوائے سیرابی کا ماخذ قرار پائے گا اور اگر بالکل درست ترتیب قائم کیجئے تو ہوائے سیرابی کا ماخذ عشق (چراغ تشنہ لبی) اور عشق کا ماخذ حُسن ہے۔ لیکن شعر میں ترکیب حُسن جوئے کم آبی نے شعر کے مفہوم کو ضبط کر دیا ہے یہ ترکیب لفظی اور معنوی دونوں اعتبار سے نادرست ہے۔ لفظی غلطی کو یعقوب عمر نے پہلے ہی بتا دیا ہے۔ معنوی اعتبار سے یوں درست نظر نہیں آتا کہ ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ شاعر جس حُسن کا اسیر ہے وہ نہ آئیڈیل ہے اور نہ صوفیہ کا حسن حقیقی ہے جو لامتناہی ہے جبھی تو اُسے اندیشہ ہے کہ ہوائے سیرابی

اس کے آتشِ عشق کو کہیں بجھا نہ دے یہ تصوّر عشق نہ صرف ہماری بلند قدروں کو پامال کرتا ہے بلکہ اس میں کوئی شاعرانہ حُسن یا ندرتِ بیان بھی نہیں ہے۔ شعر میں صرف رعایتِ لفظی کا لحاظ رکھا گیا ہے لیکن رعایتِ لفظی کے چکّر میں شعر کی معنویت نگاہوں سے اوجھل ہو گئی ہے۔

۲۔ تمام قہرِ سخن داد ناشناسِ ہنر
ہماری آبرو اہلِ نظر کی کمیابی

اس شعر میں دوسرا مصرعہ بڑا برجستہ ہے۔ اگر پہلے مصرعہ میں ترکیبیں مغلوط اور معنویت سے بے بہرہ نہ ہوتیں تو فارسیت کے باوجود شعر قابلِ داد ہوتا۔ اس مصرعہ کی نثر کیجئے تو یوں ہوگا "دادِ ناشناسِ ہنر تمام قہرِ سخن ہے"۔ شاعر صائب تبریزی ہی کی بات کو کہنا چاہتا ہے یعنی جو سخن فہم نہیں ہیں ان کی داد شعر کے لئے قہر و مصیبت ہے۔ لیکن یہاں شاعر نے "ناشناسِ سخن کے بجائے "ناشناسِ ہنر" استعمال کیا ہے۔ سخن خاص ہے اور اس کے مقابلے میں ہنر عام ہے یعنی لفظ ہنر زیادہ وسیع ہے مثلاً نقاشی، حجاری، معماری، موسیقی وغیرہ سب ہنر ہیں سخن کی داد صرف سخن شناس دے سکتا ہے نہ کہ ہر ہنر شناس مثلاً موسیقی کا ماہر اگر سخن فہمی سے عاری ہو اور شعر کی داد دے تو کیا اس کی داد قابلِ اعتنا ہو سکتی ہے؟ اس لئے خاص سخن کے لئے یہاں مصرعہ میں ایک عام لفظ ہنر کا استعمال موزوں نہیں ہے۔

اب قہرِ سخن کی ترکیب پر غور کیجئے۔ غالباً شاعر کے ذہن میں اس کا مفہوم ہوگا "سخن کے لئے قہر" لیکن اس کا صحیح مفہوم ہے سخن کا قہر یعنی وہ کلام جس کی تاثیر سننے والوں کے لئے قہر و مصیبت ہو۔ ایک تو یہ ترکیب خود بھدّی ہے جب کہ ترکیب استعمال کرنے کا مقصد ایجاز کے ساتھ کلام میں حُسن پیدا کرنا ہوتا ہے دوسرے یہ کہ شاعر نے اپنی مراد کے لئے کوئی قرینہ نہیں چھوڑا ہے۔ ایسی ترکیبوں کا مفہوم متعین ہونا چاہئے جیسے عذابِ جان کا مفہوم متعین ہے یعنی جان کیلئے عذاب۔ اسی طرح عذابِ الٰہی کا مفہوم متعین ہے یعنی وہ عذاب جو خدا کی طرف سے نازل ہوا ہو قہرِ سخن کا بھی متعین مفہوم ایک ہی ہوگا یعنی سخن کا قہر جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا۔ اگر اس شعر کا پہلا مصرعہ درست ہوتا تو یہ اچھا شعر ہوتا اور کہا جا سکتا تھا کہ شاعر نے صائب کے مشہور شعر کے سلیقہ سے فائدہ اٹھایا ہے۔

۳۔ خود اپنے آپ سے کھائی ہے میں نے زک اکثر
مری حریف رہی میری خوئے سرتابی

میں نے اس شعر کو زیادہ توجہ اور ہمدردی کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کی کیونکہ یعقوب عمر کے نزدیک یہ شعر گویا مجہول ہے اور علی احمد جلیلی کے نزدیک اس کا مفہوم واضح اور درست ہے۔ راقم کی سمجھ میں جو آیا ہے وہ نذرِ قارئین ہے۔ شاعر نے ہمیشہ نہیں بلکہ اکثر اپنے آپ سے شکست کھائی ہے اور اس

شکست کا سبب دوسرے مصرعہ میں یوں بیان کیا ہے کہ میری خوئے سرتابی میری حریف یا دشمن وہی ہے شاعر نے دوسرے مصرعہ میں دو چیزوں کو مشخص کیا ہے۔ ایک تو خود اس کی ذات یا اس کا نفس ہے اور دوسرے اس کی خوئے سرتابی جو اس کی ذات کی صفت ہے تو اب مفہوم یہ ہوا کہ جب بھی اس کے نفس نے کوئی خواہش یا ارادہ کیا تو اس کی خوئے سرکشی نے اس کی مخالفت کی اور نتیجۃً شاعر اپنے ارادے یا خواہش کی تکمیل نہ کر سکا۔ اس طرح شاعر نے اپنی محرومیوں اور ناکامیوں کا سبب بیان کیا ہے لیکن اس بیان میں اتنی عمومیت پیدا کر دی ہے کہ شعر کسی اچھے ایہام کا حامل نہ رہ سکا اور اس نے حسن وذم یا مدح وقدح کا امتیاز ختم کر دیا ہے مثلاً شاعر کا کوئی بلند ارادہ، بلند خواہش، اولوالعزمی، پرخلوص جذبہ یا عشق ظہور میں نہ آسکا کیونکہ اس کی خوئے سرتابی نے اس شدت سے اس کی مخالفت کی کہ وہ ہمت ہار بیٹھا۔ مگر چونکہ اکثر ایسا ہوا ہے ہمیشہ نہیں یعنی کبھی کبھی اس کے نفس نے اپنی خوئے سرکشی پر فتح پائی ہے اس لئے کہہ سکتے ہیں کہ بزدلی، کم ہمتی اللہوس وغیرہ کی کیفیات سے جب اس کی طبیعت نے سرتابی کی تو وہ اس پر فتح پا گیا یعنی اس کی بزدلی کم ہمتی اور ہوس وغیرہ ظاہر ہو گئے۔ اس تعمیم کی معنویت کو سمجھ لینے کے بعد ان دو موزوں مصرعوں کو شعر کہنا کیا عظیم ادبی گناہ نہ ہوگا؟

۴۔ وہ قربتیں کہ تھیں بیتابی سکوں جیسے
یہ دوریاں کہ ملا ہے سکونِ بیتابی

علی احمد جلیلی نے اس شعر کے دفاع میں جو اشعار پیش کئے ہیں وہ برمحل نہیں ہیں۔ اصل بحث اس شعر میں دو ترکیبوں سے ہے۔ یعنی بےتابی سکوں اور سکونِ بیتابی۔ میرے نزدیک مسئلہ یہ نہیں ہے کہ ان ترکیبوں میں تضاد کیوں ہے یا اس تضاد کا جواز کیوں نہیں پیش کیا گیا ہے سوال یہ ہے کہ ان ترکیبوں کی معنویت کیا ہے؟

پہلے مصرعہ میں شاعر کہتا ہے کہ قربتیں میرے لئے بیتابی سکون تھیں یعنی قربتیں میرے سکون کے لئے بیتابی تھیں، مراد ہے وہ بیتابی تھیں۔ دوسرے مصرعہ میں شاعر نے بیان کو برعکس کر دیا ہے اس مصرعہ میں بعض الفاظ محذوف ہیں جو قرینہ سے ظاہر ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ یہ وہ دوریاں ہیں کہ (جن سے مجھ کو) سکونِ بیتابی ملا ہے۔ اگر بات یوں ہوتی کہ دوریاں سکونِ بیتابی ہیں تو پہلے مصرعہ کی طرح یہاں بھی بات بن جاتی جس کا مفہوم یہ ہوتا کہ دوریاں وجہ سکون بیتابی ہیں (دوریاں بیتابی کے لئے سکون تھیں) لیکن شاعر نے سکونِ بیتابی کو ایک مجرد ومطلق ترکیب کے طور پر استعمال کیا ہے جو جملہ میں مفعول کا کام دے رہی ہے۔ اس طرح سکونِ بیتابی ایک بےمعنی ہو کر رہ جاتی ہے یہ مصرعہ یوں درست ہو سکتا تھا

ع۔ یہ دوریاں کہ ملی ہے سکوں کو بیتابی۔

۵۔ نگاہ میں ہے بہم زندگی کی گہرائی
مگر ہے پاؤں میں زنجیر ہیچ پایائی

یہ ایک شعر ہوجاتا مگر فارسی ترکیب کی غلطی نے شعر کو تباہ کردیا۔ غلطی کی طرف یعقوب عمر پہلے ہی اشارہ کر چکے ہیں۔

۶۔ دھرا ہوا ہے مزار در راہ برلبِ جو
وفورِ تشنہ دہانی دلیلِ غرقابی

اس پر چند اعتراضات وارد ہوتے ہیں۔

(۱) کیا وفورِ تشنہ دہانی ہمیشہ غرقابی کی دلیل ہوتی ہے؟ یا الفاظِ دیگر کیا بغیر غرقاب ہوئے وفورِ تشنہ دہانی نہیں ہوسکتی؟ اگر شاعر کا یہ بیان صحیح نہیں ہے اور تجربہ بتاتا ہے اور عقل بھی کہتی ہے کہ صحیح نہیں ہے تو یہ بیان خلافِ واقعہ ہے اور واقعہ ... ایک بات کہا شاعر نے اسی کو پہلے مصرعہ میں ہی نئی بات کی دلیل کے طور پر پیش کیا ہے اس سے اس شعر کا مفہوم خبط ہو کر رہ گیا ہے

۲۔ بقول یعقوب عمر "برلبِ جو" کے بجائے صرف لبِ جو کہنا کافی ہے۔ یہاں بر کا استعمال حشو بھی ہے اور بارِ طبیعت بھی۔

۳۔ فارسی ترکیب کے ساتھ جملہ "دھرا ہوا ہے" بے جوڑ سا معلوم ہوتا ہے جو ذوقِ سلیم پر بار ہے جیسا کہ یعقوب عمر کہہ چکے ہیں۔

۴۔ شاعر نے تشنہ دہانی استعمال کیا ہے جس کے مقابلے میں تشنہ لبی یقیناً فصیح تر ہے علی احمد جلیلی کا کہنا ہے کہ تشنہ دہانی کے استعمال سے مصرعہ میں ایک حرف "ہے" کی بچت ہوجاتی ہے جب کہ "تشنہ لبی" کے ساتھ "ہے" کا استعمال ناگزیر ہوجاتا ہے۔ یہاں یعقوب عمر کا جواب میری نظر میں صائب تر ہے یعنی فصیح تر لفظ کا استعمال اس صورت میں بھی قابلِ ترجیح ہے جبکہ اس کے ساتھ ایک ایسے حرف کو ظاہر کرنا پڑ رہا ہے جو حشو نہیں ہے بلکہ جزوِ جملہ ہے

۷۔ شکن شکن مری کروٹ گواہ ہے اے شاد
دکھائی ہے کئی خواب میری بے خوابی

علی احمد جلیلی نے شاعر کا دفاع کرتے ہوئے لکھا ہے کہ خواب دیکھنے کیلئے سونا ضروری نہیں ہے اور یہ درست ہے شاعر نے دوسرے مصرعہ میں اپنی ایک ذاتی کیفیت کا بیان کیا ہے اور اس کیلئے پہلے مصرعہ میں ایک شہادت پیش کی ہے اور وہ ہے بستر کی شکن جو بے خوابی میں کرب کے عالم میں کروٹ بدلنے سے پیدا ہوگئی ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ یہ شکن اس بات کی دلیل ہے کہ میں نے بہت سے یا کئی خواب دیکھے ہیں یا شکن نے مجھ کو (زبردستی) خواب دکھائے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اس شکن کا خواب کی شہادت سے کیا تعلق ہے جسے خواب کی دلیل سمجھا جائے۔

اس غزل میں معنی و بیان کی وضاحت کے بعد اس پر مزید کوئی تبصرہ کرنا فضول اور غیر ضروری ہوگا۔ اس غزل میں شاعر سے غلطیاں زیادہ ہوگئی ہیں۔ آج کل کے اردو رسالوں میں اغلاط سے پُر غزلوں کا چھپ جانا ایک عام دستور ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا اس کی ذمہ داری تنہا شاعر پر عائد ہوتی ہے؟ میرے خیال میں اس کی ذمہ داری شاعر سے زیادہ ان نقادانِ فن پر عائد ہوتی ہے جن کی تعداد اس زمانہ میں شاعروں سے بھی زیادہ ہے۔ اہلِ نظر و ہمدرد و بہی خواہانِ اردو ادب کیلئے یہ مسئلہ قابلِ ...

اساتذۂ سخن

قافیہ کی میزان میں

وصفِ چشمِ حور کرتا ہے خدا قرآں میں — گلشنِ فردوس میں بھی دخل ہے صیاد کا — آتش
رنگِ عشرت باغِ عالم میں نظر آتا نہیں — گل کو گلچیں کا خطر بلبل کو غم صیاد کا — ناسخ
ہے قفس سے شور اک گلشن تلک فریاد کا — خوب طوطی بولتا ہے ان دنوں صیاد کا — ذوق
چشمِ مستِ یار میری فکر سے غافل نہیں — الحذر اے مرغِ دل یہ خواب ہے صیاد کا — امیر
یہ حسینانِ چمن میں رنگ ہے بیداد کا — مرغِ گلشن ڈھونڈتے پھرتے ہیں گھر صیاد کا — اشک
ہمصفیرو دیکھیے تقدیر میں لکھا ہے کیا — آشیاں میرا بھی ہے گھر ہے جہاں صیاد کا — ہجر
آشیاں میرا جلا کر وہ بھی ایذا پائے گا — پھونک دیگی آتشِ گل جھونپڑا صیاد کا — رند
ہاتھ آنا غیر ممکن طائرِ آزاد کا — دیکھتا ہے دور سے قابو نہیں صیاد کا — نسیم
جمع ہوتے ہیں مری آواز پہ گلرو ہزار — غیرتِ گلشن کیا ہے میں نے گھر صیاد کا — شہیدی
عشقِ بیجاں کا چمن میں جال پھیلا دیکھ کر — بلبلوں کو سرو پر دھوکا ہو صیاد کا — امانت
پر نہ باندھے پاؤں باندھا بلبلِ ناشاد کا — کھیل کے دن ہیں لڑکپن ہے ابھی صیاد کا — داغ
کس قدر رہتا گرم نالہ بلبلِ ناشاد کا — آگ پھولوں میں لگی گھر جل گیا صیاد کا — جلیل

بخت چمکا ہے قفس میں بلبلِ ناشاد کا — اب نہ کھٹکا باغباں کا ہے نہ غم صیاد کا — اختر مینائی
فصلِ گل میں اس قدر شوقِ اسیری بڑھ گیا — بلبلیں خود ڈھونڈتی پھرتی ہیں گھر صیاد کا — تسلیم

دیکھنا ذوقِ اسیری بلبلِ ناشاد کا — آشیاں میں خار و خس لے ہے خانۂ صیاد کا — ظہیر
یہ رہائی سے گرفتاری میں پایا ہے مزا — پڑھتے ہیں کلمہ اسیرانِ قفس صیاد کا — خلیل

(ادارہ)

بچوں کا صفحہ

سید محمد عباس ساجد

پنڈت رتن ناتھ سرشار

پنڈت رتن ناتھ نام سرشار تخلص۔ آپ منشی مظفر علی خاں اسیر کے شاگرد تھے۔ سرشار ۱۸۴۶ء میں پیدا ہوئے سرشار کا کلام عاشقانہ ہے طبیعت کی شوخی اور زبان کی پاکیزگی ان کا حصہ خاص تھی۔ سرشار نے زبانِ اردو بیگمات اودھ سے سیکھی۔

ایک مرتبہ بچپن میں مشاعرہ میں شریک ہوکر یہ شعر پڑھا تو مشاعرہ الٹ گیا۔

حال سب میری سخت جانی کا
باڑھ کہتی ہے مڑ کے خنجر کی

پنڈت رتن ناتھ سرشار اودھ کے دور شباب کے نامہ نگاروں میں سے تھے پھر ۱۸۷۸ء میں سرشار اودھ اخبار کے ایڈیٹر رہے۔ سرشار کے فسانہ آزاد کو اودھ اخبار کے صفحات سے منتقل کیا گیا جو ۱۸۸۰ء میں لکھنو میں طبع ہوکر شائع ہوا تھا۔

پنڈت رتن ناتھ سرشار ۱۸۹۵ء میں تلاش معاش کی خاطر حیدرآباد آگئے تھے۔ سرشار کا تعلق والیتکان شاد سے تھا۔ مہاراجہ کشن پرشاد ان کو کافی رقمی امداد ماہانہ دیا کرتے تھے مدارالمہامی کے دور تک پنڈت رتن ناتھ سرشار کو ہی مہاراجہ کشن پرشاد نے اپنی تصانیف کی اشاعت کا کام سپرد فرمایا تھا۔ اور ماہنامہ دبدبۂ آصفی بھی شروع میں ان کے ہی اہتمام سے طبع و شائع ہوتا تھا۔ گلدستہ محبوب الکلام، ہیرالعل جو نتھا کے سپرد تھا۔ جو ان کی برادری میں تھے۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار اخبار لکھنو میں عرصہ تک کام کر چکے تھے۔ اہل نظر کا خیال ہے کہ ان کی اردو عامۃ الناس کو پسند آتی تھی اور عوام کے مذاق اور معیار کو مدنظر رکھتے ہوئے۔ رتن ناتھ سرشار مضمون آرائی کیا کرتے تھے وہ طرز تحریر اس زمانے کے سخن سنج اور بلند پایہ مذاق سلیم رکھنے والوں کو چنداں پسند نہ تھا۔

ایک مرتبہ مولوی ظفر علی خاں صاحب نے اپنے رسالہ دکن ریویو میں مہاراجہ کشن پرشاد کی تالیفات پر تبصرہ کرتے ہوئے جو کچھ لکھا تھا

اس کا ماحصل یہ ہے کہ

"پنڈت رتن کے مذاق طبیعت کے لحاظ سے مہاراجہ بہادر کی تحریر پر بھی اثر پڑا ہے جو طرز تحریر سرشار کا ہے اس کا عکس مہاراجہ کشن پرشاد کی شاعری و نثر میں بھی نظر آتا ہے"

یہ تنقید بظاہر ایک حد تک درست نظر آتی ہے

پنڈت رتن ناتھ سرشار کے ایک شعر پر مہاراجہ کشن پرشاد نے اس طرح اصلاح دی تھی۔ "مہاراجہ کشن پرشاد" مولفہ مہدی نواز جنگ میں اس شعر کی اصلاح کا خط جو سرشار کے نام پہ مہاراجہ نے لکھا تھا موجود ہے۔

مہاراجہ لکھتے ہیں۔

سرشار ذی وقار پنڈت رتن ناتھ صاحب

مجھے آپ کی اس رائے سے کہ طرز کا لفظ مونث ہے۔ ضرور اختلاف ہوتا اور میں تعجب کرتا کہ اتنا بڑا طبیعت دار آدمی اور طرز کی جمع طرزیں لکھے۔ سنا تو یوں ہی ہے کہ ان کی روش۔ ان کا رنگ۔ آپ کا طرز آپ کا رویہ۔ مگر جب آپ نے اپنے استاد گرانمایہ تدبیر الدولہ منشی مظفر علی خاں اسیر لکھنوی۔ اور جہاں استاد فصیح الملک بہادر داغ دہلوی اور منشی امیر احمد صاحب مینائی لکھنوی کی مثالیں دیں کہ وہ طرز کو مونث مانتے ہیں تو پھر گنجائش اعتراض کیجئے چہ

لیکن پنڈت جی اچھی طرز کہنا کانوں کو اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ اور اس کے تو آپ قائل ہیں کہ اہل لکھنو آجکل طرز کو بالاتفاق مذکر بولتے ہیں۔ ہاں صاحب خوب یاد آیا۔ آپ نے جو بند بطرز مراثی تصنیف کئے ہیں مجھے روضہ شریف میں دکھائے تھے ان میں سے ٹیپ کا شعر مجھے یاد ہے۔ آپ کہتے ہیں ؎

ہو سب کو عشق میرے کلام نفیس کا
ہر شعر میں ہو طرز دبیر و انیس کا

سرشار

بندگی۔ پنڈت جی۔ اب کہئے آپ نے طرز کو مذکر باندھا ہے یا نہیں اور آپ اس کو کیا کیجئے۔ پبلک کا میلان طبع بھی آج کل یہ سب ہے۔ اگر برا نہ مانو ایک بات کہوں۔ میں نے ایک ٹیپ کے مصرع ثانی میں ایک لفظ بدل دیا ہے آپ نے لکھا ہے ؎

ہر شعر میں ہو طرز دبیر و انیس کا

میں نے یوں بدل دیا ہے۔

ہر شعر میں ہو رنگ دبیر و انیس کا

سرشار

بجد ایہ بطریق اصلاح نہیں ہے۔ ایک بات ذہن میں آگئی لکھدی۔ — شاد عفی عنہ

شاد کی غزلیں سرشار اکثر مشاعروں میں پڑھا کرتے تھے۔ سرشار کا مختصر تذکرہ اردو کے "ہندو ادیب" میں موجود ہے آپ کی تصانیف یہ ہیں۔

۱۔ فسانۂ آزاد
۲۔ جام سرشار
۳۔ سیر کہسار
۴۔ خدائی فوجدار
۵۔ پی کہاں وغیرہ وغیرہ

پنڈت رتن ناتھ سرشار ۶۷ برس کی عمر میں ۱۹۰۲ء میں شہر حیدر آباد دکن میں انتقال کر گئے۔

نمونہ کلام سرشار ۔

پینے پہ جو آئے ہیں تو پھر بس نہیں کرتے
میخانہ میں سنتے نہیں سرشار کسی کی

سیہ بخت و سیاہ روزگار ہم بھی ہیں
جواب زلف پریشانِ یار ہم بھی ہیں

نصیب جاگیں گے اک روز حضرت سرشار
لپٹ کے سوئیگا وہ گل گلے لگائے ہوئے

عرب شاہ خالد کیفی

قطعہ

کچھ صدقۂ حسن اپنا اتارو تو سہی
لو طائرِ دل قدموں پہ وارو تو سہی
خالد کو پریشان نہ کرو بہرِ خدا
اُلجھی زلفوں کو سنوارو تو سہی

علامہ تجمل آفندی مرحوم

غزل

زیست جب منزلِ مقصود پہ لے آئی ہے
پھر اجل کیا ہے جوانمرد کی انگڑائی ہے

لہلہاتا ہے چمن پھول ہنسے دیتے ہیں
خونِ حبیب ہو گیا پانی تو بہار آئی ہے

روشِ حسن پہ ارباب خرد کیا سمجھیں
ہم سے دیوانوں کو اندازۂ لیلائی ہے

غیر کے در پہ نہیں اپنوں کی چوکھٹ پہ سہی
کل جو تھی آج بھی وہ ناصیہ فرسائی ہے

کون ہے پوچھنے والا مری تنہائی کا
ہر زباں پر ترا افسانۂ یکتائی ہے

نعمتِ عشق کو افسانہ بنا رکھا ہے
ہائے کیا درد خداداد کی رسوائی ہے

راہ آسان میں بھی مشکل سے اٹھاتا ہوں قدم
جس قدر بارِ گراں دولتِ دانائی ہے

تجمل یہ مصرعہ ترے دل عارف کا خلاصہ
شکر احق حضرت کامل نے شفا پائی ہے

علامہ کامل حضرت شیخ احمد شطاری مرحوم

بزمِ خیال

اس عنوان کے تحت قارئینِ "ذوقِ نظر" کے دو ایسے سوالوں کے جواب دیئے جائیں گے جو علمی و ادبی موضوعات پر پوچھے گئے ہوں (مدیر)

س :- اشاعرہ اور معتزلہ صفات الٰہیہ کے بارے میں کیا عقیدہ رکھتے ہیں۔

ج :- معتزلہ کے نزدیک صفات الٰہیہ عین ذات ہیں۔ چنانچہ انھوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ قدیم صرف ایک ہی ہے اور وہ ہے ذات خدا۔ ان کا خیال ہے کہ خدا ذی علم ذی قدرت اور ذی حیات نہیں مگر وہ اس بات کے قائل ہیں کہ ذاتِ الٰہی صفاتِ الٰہی کی جانشین ہو سکتی ہے چنانچہ خدا ذی علم نہ ہونے کے باوجود علمی امور پر قادر ہے ذی قدرت نہ ہونے کے باوجود ہر امر اس کے اختیار میں ہے اسی طرح ان کے بہت سے خیالات ہیں جنھیں صحیح العقیدہ مسلمان فرقے ہمیشہ رد کرتے آئے ہیں۔

اشاعرہ اس مکتبِ خیال کے حامل ہیں کہ اللہ کی صفات حقیقیہ بذاتِ خود حاملِ حقیقت ہیں اور یہ ذاتِ الٰہی کے علاوہ ہیں۔ یعنی خدا کی ہستی ایک وجود ہے جب کہ علمِ الٰہی ایک دوسرا وجود ہے وغیرہ وغیرہ۔ ان کے عقائد کی رو سے سات ایسی حقیقی صفات ہیں جو ذاتِ الٰہی کے علاوہ ہیں اور قدیم بھی ہیں۔ ان سب کو ملا کر وہ جملہ آٹھ چیزوں کے قائل ہیں جنھیں اصطلاحاً "قدمائے ثمانیہ" کہا جاتا ہے۔

ان اشاعرہ پر سب سے بڑا اعتراض یہی کیا جاتا ہے کہ عیسائی "اقانیم ثلاثہ" (باپ، بیٹا اور روح القدس) کا عقیدہ رکھنے کی بنا پر مشرک سمجھے جاتے ہیں۔ اسی طرح اشاعرہ بھی "قدمائے ثمانیہ" پر اعتقاد کی بناء پر مشرک قرار پاتے ہیں کیونکہ وجود ایک ہی ہے۔

س :- حضرت فصاحت جنگ جلیل کے کچھ خوبصورت اشعار کی نشاندہی کیجئے۔

ج :- حضرت جلیل مانکپوری مسلم الثبوت استادِ سخن تھے اور ان کے بعض اشعار نے بقائے دوام کے دربار میں جگہ پائی ہے وہ بہت کم شعراء کے حصے میں آئی ہے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

اب تو کہتے ہیں قیامت وہ بپا ہے دیکھئے روزِ قیامت کیا کریں

آنکھوں کا ہے یہ رنگ محبت میں اے جلیل پوچھا کسی نے حال تو دریا بہا دیا

سب باندھ چلے کب کے سرِ شاخِ نشیمن ہم ہیں کہ گلستاں کی ہوا دیکھ رہے ہیں

آج کوئی پھول گلشن میں نظر آتا نہیں ہائے وہ دل جب نظر آتا تھا گلشن ہوں میں

اہلِ غرض کو منہ نہ لگاؤ بلا کے ہیں یوسف کبھی تم کو پیمبر بنائیں گے

یہ یاد کام محبت نے دئیے ہیں مجھ کو دل ہے بے یاد تری آنکھ ہے لیق ترا

عجب حوصلہ ہم نے غنچے کا دیکھا تبسم پہ ساری جوانی لٹا دی

مکتوبات

اس عنوان کے تحت سربرآوردہ قارئین کے خطوط کے اقتباسات شائع کئے جائیں گے۔

گورنر اتر پردیش جناب محمد عثمان عارف کا خط

راج بھون لکھنؤ۔ ۲/جولائی ۱۹۸۵ء

مکرمی تسلیم۔

ماہنامہ "ذوق نظر" کی ۵ جلدیں مجھے موصول ہوئیں۔ شکریہ۔ "ذوق نظر" کے خصوصی نمبروں میں معیاری مضامین بشمول نعتیں اور منقبتیں بڑے ہی روح پرور اور دین وایمان کو تازہ کرنے والے ہیں۔ ان میں شامل مقالات عمیق مطالعے کے بعد قلم بند کئے گئے ہیں۔ جو بڑے بصیرت افروز اور پڑھنے والے کو بڑی معلومات فراہم کرتے ہیں نیز قاری کے علم میں بھی اضافہ کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ آپ کو اور مجلس ادارت کے اراکین کو بہترین اجر عطا کرے کہ آپ دین و ملت کی اچھی خدمت فرماتے رہیں۔

تمام حضرات کو جو اس رسالے سے متعلق ہیں نام بہ نام میرا پرخلوص سلام اور دعائیں پہنچا دیں۔

دعاگو

محمد عثمان ۔ گورنر اتر پردیش

جناب شانتی رنجن بھٹاچاریہ کا خط

اشوک نگر کلکتہ ۔ ۴/جولائی ۱۹۸۵ء

محترمی تسلیم۔

آپ نے ازراہ محبت "ذوق نظر" کے جو دو شمارے (شمارہ نمبر ۴ اور شمارہ نمبر ۵ ؍ ۶) روانہ کئے وہ ملے۔ پڑھ کر دیکھا کہنا درست نہیں صرف الٹ پلٹ کر اور ہر دو شمارے سے ذوق کے مطابق ایک دو ادبی تخلیقات کو سرسری طور پر دیکھا ۔۔ آپ نے نہ صرف اظہار رائے بلکہ قلمی معاونت کی

دعوت بھی دی ہے۔ شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے اس لائق سمجھا۔ رسالے کے سلسلے میں میری رائے یہی ہے کہ ذوق نظر کو آپ ایسا بنانا چاہتے ہیں کہ ہر ذوق والے کو اس کے دامن میں کچھ نہ کچھ ملے۔ اس میں مذہبی (اسلامیات) مضامین، افسانے، نظمیں، اور غزلیں، اور پھر ادبی مضامین حتیٰ کہ بچوں کا صفحہ بھی ہے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا آپ ہر ایک کو خوش رکھ سکیں گے۔؟

اردو والے نہایت باہمت ہیں کہ اس دور میں بھی کسی نہ طرح آئے دن نئے نئے رسائل نکالنے کی ہمت کرتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ زمانے کی ہوا راس نہیں آتی اور وہ رسالے عموماً دو چار شماروں کے بعد بند ہو جاتے ہیں۔ حکومت یا اردو اکادمیوں کے رسائل کے علاوہ غالباً پورے ہندوستان میں (پاکستان کی حالت بھی کچھ بہتر نہیں) ایک دو ادبی رسالے ہی ہوں گے جو نکلا کرتے ہیں۔ یہ رسالے بھی اردو کے نام پر روتے ہیں اور اردو والوں سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ اردو کے رسائل خرید کر پڑھیں۔ دیگر زبانوں کا تو مجھے علم نہیں ہے۔ لیکن بنگلہ جو میری مادری زبان ہے اس میں ایسے ہفتہ وار اور ماہنامے کم از کم دس ضرور ہیں جن میں سے ہر ایک کی تعداد اشاعت ۳۰ ہزار سے زیادہ ہو گی۔ اردو میں ایسے ادبی رسائل نہیں ہیں کہنا ہی درست ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بنگلہ زبان کے رسائل محض بنگلہ زبان کے ادبا و شعراء ہی نہیں خریدتے بلکہ پڑھے لکھے ہر بنگالی گھر میں ایک دو رسائل ضرور خریدے جاتے ہیں لیکن اردو کے رسائل محض اردو کے چند ادیب یا شاعر ہی خریدتے ہیں۔ عام پڑھے لکھے گھرانوں میں اردو کے علمی ادبی رسائل خریدے نہیں جاتے (میں فلمی، جاسوسی یا رومانی رسائل کی باتیں نہیں کر رہا ہوں) جس سے صاف ظاہر ہے کہ اردو پڑھے لکھے گھرانوں میں بھی ادبی ذوق نہیں ہے۔ اور وہ لوگ ادبی رسائل یا کتابیں خریدنا روپیوں کو برباد کرنا سمجھتے ہیں۔ اگر آپ کسی درمیانی طبقہ کے بنگالی گھر میں جائیں گے تو ان گھروں میں ۲۵ یا ۳۰ علمی ادبی غیر نصابی کتابیں اور ایک نہ ایک ادبی ہفتہ وار یا ماہنامہ ضرور پائیں گے لیکن اردو والوں کے گھروں میں ریڈیو اور ٹی وی تو ہو سکتے ہیں لیکن ادبی کتابیں ہرگز نہیں ہوں گی۔ یہ فرق ہے تہذیبی معیار کا ذوق کا ــــ اب اردو رسائل زندہ رہیں تو کیسے؟ کیا صرف اردو کے اہل قلم اردو رسائل کو زندہ رکھ سکتے ہیں جب کہ اردو ادب سے اردو کے اہل قلم حضرات کو کوئی مالی فائدہ نہیں ہوتا۔ ہندوستان میں بھی ایسا ادیب نہیں ہوگا جو یہ کہہ سکے کہ اس کی زندگی کا دارومدار اس کی ادبی تخلیقات پر ہیں۔ ہر وہ قلمکار جو زندہ ہے اس کی آمدنی کا کوئی نہ کوئی اور ذریعہ ہے ــــ یا تو وہ ملازمت کرتا ہے یا وہ پروفیسر ہے یا کاروباری ہے۔ یا پھر وہ فلم انڈسٹری میں مکالمے، کہانی یا گانے وغیرہ لکھا کرتا ہے یعنی محض ادیبا

پر اس کی زندگی کا دارومدار نہیں ہے۔

اب ادیب، ایسے ادیب جن کو واقعی زبان و ادب سے محبت ہے وہ کتنے رسائل کی خریداری قبول کر سکتے ہیں۔ بس دو یا تین! اس سے زیادہ ہرگز نہیں۔ لہٰذا صاف ہے کہ ادبی رسائل اس وقت تک زندہ نہیں رہ سکتے جب تک کہ ایسی کوئی تحریک نہ چلائی جائے جس سے عام کھاتے پیتے، پڑھے لکھے اردو داں گھرانوں میں اردو ادب سے دلچسپی پیدا نہ ہو، اور جب تک ہر اردو داں کے گھر میں کم از کم ایک ادبی رسالہ خریدا نہ جائے۔ اس وقت تک نہ اردو کے رسائل زندہ رہ سکتے ہیں اور نہ اردو کی علمی ادبی کتابیں بک سکیں گی۔ لہٰذا اگر اردو ادب کو زندہ رکھنا ہے تو اردو کی ادبی انجمنوں کو اس بات پر غور کرنا پڑے گا کیوں کہ اردو داں حضرات کے گھر گھر میں ایسا ذوق و شوق پیدا کیا جائے کہ وہ اردو کتابیں اور رسائل خریدیں اردو کی علمی ادبی انجمنوں کو اپنے اپنے حلقے میں سروے کرنا ہو گا۔ دیکھنا ہو گا ان کے علاقے میں کتنے گھر اردو والوں کے ہیں۔ ان گھروں میں کوئی اردو کا رسالہ خریدا جاتا ہے یا نہیں۔ وہ گھر والے سال بھر میں اردو کی دو چار ادبی کتابیں خریدا کرتے ہیں یا نہیں اور پھر گھر گھر گھوم کر پڑھے لکھے لوگوں کو بیدار کرنا ہو گا اور صاف کہنا ہو گا کہ اگر واقعی ان کو اپنی زبان سے محبت ہے تو وہ اپنی آمدنی میں سے ہر ماہ کم از کم دس روپے اردو کے نام پر خرچ کریں۔ ان کے ہاں رسائل اور کتابوں کے لئے بھی بجٹ ہو، اور اگر ایسی تحریک چلائی جائے اور دو چار سال تک ایسے گھروں میں رسائل و کتابیں خریدیں جائیں تو پھر ان گھروں میں اردو کا ادبی ماحول پیدا ہو جائے گا اور آئندہ کی نسلوں پر بھی اس کا اثر پڑے گا۔ اگر آج ہم اس مسئلہ پر سنجیدگی سے نہ سوچیں اور عملی قدم نہ اٹھائیں تو آج اردو کتابیں اور ادبی رسائل کا جو حال ہے وہ روز بروز اور خراب ہوتا رہے گا۔ اور آج سے ۲۰ ۲۵ سال کے بعد کیا ہو گا اس کا تصور ہی بھیانک ہے۔

شہر حیدرآباد اردو کا ایک اہم مرکز ہے۔ آج بھی وہاں لاکھوں گھروں میں اردو جاننے والے ہیں۔ کیا آج کم از کم حیدرآباد میں ایسی کوئی تحریک شروع نہیں کی جا سکتی۔ کیا وہاں کی کوئی ادبی انجمن اس سلسلے میں عملی قدم اٹھانے کی ہمت کرے گی۔ اگر ہندوستان کے آٹھ دس بڑے شہروں جہاں اردو والوں کی کثیر آبادی ہے۔ مثلاً حیدرآباد۔ لکھنؤ۔ دہلی۔ پٹنہ وغیرہ کی ادبی انجمنیں اس طرف دھیان دیں اور ہر گھرانے کو ان کے ذوق کے مطابق اردو کا ایک ادبی رسالہ اور سال بھر میں صرف چار کتابیں خریدنے پر پابند کیا جا سکے تو میرے خیال سے یہ بہت بڑی کامیابی ہو گی۔

خیر طلب
شانتی رنجن بھٹاچاریہ

"ذوقِ نظر"

حیدرآباد — فون نمبر (52 5117)

جلد (۱) — ستمبر ۱۹۸۵ء — شمارہ (۹)

مدیرِ اعلیٰ :- محمد بشیر الدین بشیر وارثی

مدیرِ انتظامی :- خورشید جنیدی

مدیرِ اعزازی :- ڈاکٹر یعقوب عمر

ناظمِ نشر و اشاعت :- عابد قادری — مشیرِ قانونی :- محمد شمیم ایڈوکیٹ

مجلسِ مشاورت

ڈاکٹر عبدالستار خاں

ڈاکٹر وحید اشرف

مبشر احمد

علی احمد جلیلی

ڈاکٹر عقیل ہاشمی

زرِ تعاون سالانہ پچاس ۵۰ روپیئے فی شمارہ پانچ روپیئے

عرب ممالک سے فی شمارہ ۵ ریال

محمد بشیر الدین ایڈیٹر، پرنٹر اور پبلشر نے اعجاز پرنٹنگ پریس میں چھپوا کر دفتر ذوقِ نظر ۱۳-۱۱-۹ حیدرآباد سے شائع کیا۔

اس شمارے میں

حرفِ آغاز

شاید دنیا جب سے وجود میں آئی ہے تدبیر و تقدیر کا تصور موجود ہے۔ ہر مکتب خیال نے اس دلچسپ تصور میں کئی رنگ آمیزیاں کیں۔ ان سب کا ماحصل یہ ہوا کہ اس سلسلے میں تین واضح فریق بن گئے۔ ایک فریق وہ ہے جو صرف تقدیر کا قائل ہے اور تدبیر پر کسی قسم کا تکیہ کرنے کیلئے راضی نہیں۔ اس مکتب فکر کے لوگ ترقی یافتہ زمانے میں کم ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ دوسرا مکتب فکر تقدیر یا مقدر کا نام سننے کیلئے بھی تیار نہیں ہے۔ وہ تدبیر کی کامیابی یا اسکی ناکامی کا معتقد ہے اور یہ مانتا ہے کہ قنوطیت پسند لوگوں نے اسکو دو مختلف نام دے رکھے ہیں ورنہ تدبیر کے سوا دنیا میں کچھ بھی نہیں۔ اعتدال پسند مکتب فکر نے بیچ کا راستہ کھوج نکالا وہ تدبیر اور تقدیر دونوں کا معتقد ہے اور مناسب حد تک تدبیر سے کام لیکر نتیجے کو تقدیر کے حوالے کر دیتا ہے۔ اس مکتب فکر کے ماننے والوں کی تعداد بھی کم ہوتی جا رہی ہے مگر ان میں سے اکثر سماج اور حکومت میں اونچے مقامات پر فائز ہو جاتے ہیں۔

ابھی ایک دلچسپ سروے کیا گیا تھا اور اسکے لئے تین گروپ کے لوگوں کا مڈیکل چک اپ کیا گیا۔ پہلے گروپ کے لوگوں میں ایک خاص بات یہ محسوس کی گئی کہ وہ نہ صرف اعصابی کمزوری کے شکار تھے بلکہ انہیں قوت ارادی بھی کمزور تھی۔ یہ خالص تقدیر کے ماننے والے تھے۔ دوسرے گروپ کے لوگوں میں قوت ارادی کمزور نہ تھی لیکن وہ ایسے عوارض میں مبتلا پائے گئے جن سے انھیں کسی قسم کا ذہنی سکون میسر نہ آتا تھا۔ بے خوابی، بلڈ پریشر، اختلاج قلب اور ذہنی ہیجان جیسی شکایتیں ان میں عام تھیں۔ یہ وہ لوگ تھے جو صرف تدبیر کے قائل تھے۔ تیسرے گروپ کے لوگوں میں شاذ و نادر ہی کوئی ایسا تھا جو مذکورہ بالا عوارض کا شکار ہو۔ ان لوگوں کی نہ صرف قوت ارادی مضبوط تھی بلکہ انتہائی ہنگامی حالات میں بھی وہ پرسکون رہتے تھے۔

اس سروے سے کوئی بات ثابت ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو البتہ اتنا ضرور واضح ہو گیا کہ اعتدال پسند لوگ کسی صورت حال میں بھی اپنا ذہنی توازن نہیں کھوتے اور غالباً دنیا کا نظام اسی قسم کے لوگوں سے قائم ہے۔ یہ ایک حقیقت بھی ہے کہ اعتدال میں جو حسن ہے وہ افراط و تفریط میں نہیں۔ اگر اس مکتب فکر کے لوگوں میں اضافہ ہو جائے تو نہ صرف سماج اور سیاست میں بلکہ ہر میدان عمل میں ایک قسم کی بہتری نمایاں ہوگی۔ بیجا ذہنی تناؤ سے نجات مل جائیگی اور ایک صالح معاشرہ عالم وجود میں آئیگا اور یہ دنیا درحقیقت جنت نشان بن جائیگی شرط صرف یہی ہے کہ صحیح سمت میں قدم اُٹھایا جائے۔

جنابِ شاذ تمکنت

حیدرآباد کے نامور، مشہور اور باصلاحیت شاعر جناب شاذ تمکنت کی بے وقت رحلت نے اردو دوست حلقوں میں جو رنج و غم کی لہر دوڑا دی ہے ہم بھی انھیں برابر کے شریک ہیں اور دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ انھیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔

سرودِ سرّ ازل

فضا ابن فیضی

دُعا کا وقت ہے، اے روحِ سرورِ کونین
اے برگ و سازِ دو عالم، اے دلبرِ کونین
حبیب ہے تو خدا کا، خدا سے میرے لئے
دُعائیں مانگ، درِ کبریا سے میرے لئے
ترے مریض پہ جو رات ہے بہت بھاری
کسی طرح وہ الم ناک رات کٹ جائے
پگھل تو جائے کسی طرح پاؤں کی زنجیر
گھٹا جو سر پہ ہے ادبار کی وہ چھٹ جائے
وہی خلافتِ ارضی جو اپنا ورثہ تھی
پھر ایک بار مری سمت کو پلٹ آئے
تمام سطوتِ کج خسروی و سلطانی
پھر ایک بار مرے پاؤں میں سمٹ آئے

مجھے یقین ہے، خدا تیری بات سن لے گا
وہ میرے اشکوں کو پلکوں سے تیری چن لے گا
کہ تو حبیب ہے اس کا، شفیعِ اُمت ہے
کلاہِ عرش ہے، تاجِ سرِ رسالت ہے
نوائے سازِ حرا، حرفِ خیر و برکت ہے
سرودِ سرِّ ازل، نغمۂ حقیقت ہے
نویدِ قدس ہے تو، نور کی بشارت ہے
ترے وجود سے پھیلی وہ خوشبوئے الہام
کہ جس سے تازہ ابھی تک مشامِ امت ہے
ترا خمارِ نگہ، بوذری و سلمانی
ادائے خوش تری ملتزمِ آدمیت ہے

شعورِ دین کی تشکیل و تربیت تجھ سے
متاعِ جاں ہے تو، سرمایۂ سعادت ہے
زباں، صحیفہ طرازِ الوہیت تیری
نظر، دریچۂ کشف رموزِ فطرت ہے
تری شمیمِ نفس، موجِ سینۂ جبریل
تری بساطِ قدم، مسندِ خلافت ہے
دقیقہ سنج و حق آگاہ و کاشفِ اسرار
مرے لئے تو کلیدِ یقین و حجت ہے
ترا جو اسوہ ہے، آئینۂ شریعت ہے
کہاں تھی دشتِ جنوں میں یہ ٹھنڈی چھاؤں
تو نخلِ زارِ صفا، چشمۂ ہدایت ہے

گناہ گار زباں اور تیرا ذکرِ جمیل
میں جانتا ہوں کہ یہ بھی بڑی جسارت ہے۔
دفورِ درد تھا ایسا کہ ضبط ہو نہ سکا
خود اپنی وضعِ جسارت پہ مجھ کو حیرت ہے
یہ حرف، حرف نہیں، آرزو کے آنسو ہیں۔
یہ لفظ، لفظ نہیں، جذبۂ عقیدت ہے
تو چھپ گیا ہے سراپردۂ ازل میں کہاں
یہ تجھ سے اُمتِ مرحوم کو شکایت ہے
ہوئیں اداس مدینے کی بولتی گلیاں
بہت دنوں سے تہی خیمۂ رسالت ہے
جو شرع دے یہ اجازت، تو میں یہ تجھ سے کہوں
اے موجِ نور! حجابِ ازل سے باہر آ
ہٹا کے پلکوں سے چاندی کی جھالریں اب تو
حریم و حجلۂ خوابِ ازل سے باہر آ۔
کہ میرے دور کو اب پھر تری ضرورت ہے
تری نوا، ترے پیغام کی ضرورت ہے۔

حبیبی، خوش لقبی! تجھ پہ سو درود و سلام
رسولِ مطلبی، تجھ پہ سو درود و سلام
[illegible] عربی، تجھ پہ سو درود و سلام

نعت شریف

آگیا ہے جسدن سے نورِ مصطفےٰ دل میں ؛ دل نے زندگی پائی دیکھکر خدا دل میں
ضو فشاں ہوا جب سے نورِ کبریا دل میں ؛ ہے بہت ترقی پر عشقِ مصطفےٰ دل میں
نور ہے محمدؐ کا یا کہ ہے خدا دل میں ؛ اب میں کس سے پوچھوں یہ کون آ چھپا دل میں
ہے شفیعِ محشرؐ کو علم میرے عصیاں کا ؛ اس خیال سے ہے اک تہلکہ بپا دل میں
اُن کے نام پر جینا اُن کے نام پر مرنا ؛ کرلیا ہے ہم نے تو بس یہ فیصلہ دل میں
میری نبض رک رک کر دیتی ہے صدا شاہا ؛ جاں کنی کا عالم ہے آیئے ذرا دل میں
میرا دفترِ عصیاں دھو دیا ہے نسبت نے ؛ ان کی چشمِ رحمت سے آگئی جلا دل میں

ساتھ لیکے جائیں گے ہم بشیرؔ دنیا سے
عمر بھر کا سرمایہ حبِّ مصطفےٰ دل میں

بشیر وارثی

منقبت بندہ نواز

مظہرِ شانِ علیؓ مشکلکشا بندہ نوازؒ ؛ دلبر و دلدارِ محبوبِ خدا بندہ نوازؒ
خواجۂ ہندوستاں کی اک نگاہِ فیض سے ؛ ہیں دکن میں تاجدارِ اولیاء بندہ نوازؒ
روشنی خواجہ نصیرالدینؒ نے بخشی آپکو ؛ شمعِ دہلی کی، دکن میں ہیں ضیاء بندہ نوازؒ
سنتِ پیغمبری کی پیروی کر کے حضورؒ ؛ خلق کو تم نے بنایا با خدا بندہ نوازؒ
آپکے سایہ میں روشن ہے چراغِ دینِ حق ؛ ورثہ دارِ علمِ محبوبِ خدا بندہ نوازؒ
اپنے بندوں کو خدا سے بخشوا لینگے حضورؒ ؛ سرورِ دیں کے کرم سے رہا بندہ نوازؒ
آپکی جو ہے حضوری میں وہ ہے حق کے حضور ؛ آپکی یہ شان ہے یہ مرتبا بندہ نوازؒ
مانگیئے اِن کے وسیلے سے دعا ہوگی قبول ؛ یا محمدؐ، یا علیؓ، یا غوثؒ یا بندہ نوازؒ

سچ یہ ہے سب کچھ بشیرؔ وارثی کو مل گیا
مل گئے ہیں آپکے جب نقشِ پا بندہ نوازؒ

بشیر وارثی

مفتی عبدالحمید صاحب سابق شیخ الجامعہ نظامیہ

خطبہ عید الاضحیٰ

اللہ اکبر اللہ اکبر لا الہ الا اللہ واللہ اکبر اللہ اکبر وللہ الحمد

اللہ تبارک تعالیٰ نے ہر قوم کے لئے ایک طریقہ عبادت مقرر فرمایا ہے تاکہ اللہ کو ہمیشہ یاد کرتے رہیں۔ اور اس کی نعمتوں کا اس کے بتائے ہوئے طریقہ سے شکر ادا کریں۔ بے شک وہ ایک و یکتا ہے اس کا کوئی ہمتا نہیں۔ وہی عبادت کے لائق ہے۔ اس کے سوا کسی کی عبادت درست نہیں اور آج عید میں ہم اسی کی بندگی ادا کرنے کے لئے جمع ہوں گے اور دو رکعت نماز ادا کریں گے۔ اپنی عاجزی اور بندگی کا اقرار ہوگا۔ اور اس کی عظمت و کبریائی کا اظہار کیا جائیگا۔ اس پر ہم خوش ہیں اور اس خوشی کا تعلق حج اور قربانی سے ہے۔ اللہ کے لاکھوں بندوں نے دعوتِ حج پر لبیک کہا اور اپنی ہر ادا اور ہر حرکت سے یہ واضح کیا کہ وہ اپنے آقا اور مالک کے اشاروں پر کس طرح اپنا آرام اپنی خواہشات اور اپنے مال کی قربانی کے لئے تیار ہیں۔ بندے کی اس سے بڑی کیا سعادت ہوسکتی ہے کہ وہ اپنے آقا اور مالک کا حکم بجا لائے اور اس کو خوش کرے۔ غلام کے لئے اپنے آقا کی خوشی سب سے بڑی دولت ہے۔ حج کی دولت تو ان کے حصے میں آئی جو اس سفر پر جاسکے۔ اللہ اس کو قبول فرمائے اور اس سعادت کے حصول کی ہم کو بھی توفیق دے اور سہولت پیدا کرے۔ یہ اس کا بڑا فضل ہے کہ اس نے تمام مسلمانوں کے لئے قربانی اور نماز کو تقرب کا ذریعہ بنایا۔ اس کے حضور تو بندے کا خلوص اور اپنے مالک سے سچا تعلق سب سے زیادہ قیمتی چیز ہے چاہے وہ حج و قربانی کی شکل میں ہو یا نماز اور تسبیح کی شکل میں۔

بھائیو! مسلمانوں کا مقصد وجود نیکی اور بھلائی کی اشاعت برائی اور بدی کو مٹانا اور دور کرنا ہے۔ اور اسی ایک اہم کام کی وجہ سے اُمتِ محمدیہ کو تمام اُمتوں سے بہتر و برتر قرار دیا گیا ہے اس کام کی ضرورت و اہمیت آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد گرامی سے بخوبی واضح ہوتی ہے۔ جس میں خطاب تو صحابہ کرام کو کیا گیا مگر در اصل قیامت تک پوری امت مخاطب و مامور رہے۔ ارشاد فرمایا خدا کی قسم جس کے دست قدرت میں میری جان ہے تم ضرور معروف یعنی نیکی اور بھلائی کا حکم کرتے رہوگے۔ منکر یعنی بدی اور برائی سے روکتے رہوگے۔ اور اگر ایسا نہ کروگے تو اللہ تعالیٰ تم پر اپنا عذاب نازل کرے گا۔ پھر تم اس کے بعد دعاؤں پر دعائیں کریں گے قبول نہیں کی جائیں گی۔ بھائیو! غور کرو اس وقت مسلمانوں نے اس اہم کام کو چھوڑ رکھا ہے جس کے نتیجہ میں آج تمام دنیا کے مسلمان مختلف قسم کے آفات و مصائب و حیرانی و پریشانی میں گرفتار ہیں۔ منبروں اور وعظ کے مجالس اور دیگر تقاریب میں دعائیں کی

جاتی ہیں، مگر سب بے سود ثابت ہو رہی ہیں۔ رحمتِ الٰہی سے مایوس ہونا مسلمان کی شان نہیں۔ مسلمانوں کے لئے ابھی وقت ہے کہ وہ کروٹ بدلیں اور اپنے مقصدِ زندگی کو سامنے رکھ کر حکم کی پابجائی کریں اور ہر شخص اپنی صلاحیت و استوار کے مطابق ہر میں حصہ لے، مگر یہ کام انتشاری حالت میں فرداً فرداً انجام نہیں پاسکتا اور نہ اس طرح نصرتِ الٰہی شامل حال ہوسکتی ہے یَدُ اللّٰہِ عَلَی الْجَمَاعَۃِ۔ اللہ کی تائید جماعت کے ساتھ ہے لہٰذا مرکزیت سے وابستگی ضروری ہے۔ کتاب و سنت کی روشنی میں جو ہدایات ہیں ان کو سن کر ان پر عمل پیرا ہوں تو حسب وعدہ الٰہی اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰہَ یَنْصُرْکُمْ وَیُثَبِّتْ اَقْدَامَکُمْ اگر تم اللہ کے دین کی مدد کروگے تو اللہ تمہاری مدد کرے گا۔ اور تمہارے قدم جما دے گا۔ آئیے آنے والی مبارک عید کی نوید میں ہم رب سے عہد کریں کہ ہم اسی زندگی کو اختیار کریں گے جو اسلام نے ہمارے لئے پسند کی ہے۔ ہم محبت رواداری اور وابستگی کو اختیار کریں گے اور اجتماعی نظم کو استوار و مستحکم بنائیں گے اور اس کے لئے ہر قسم کی جدوجہد سے دریغ نہیں کریں گے۔ محلہ میں ہونے والی تمام برائیوں کو حکمت اور موعظت سے دور کریں گے۔ مغازعت باہمی اور آپسی جھگڑوں کا خود ہی تصفیہ کرلیں گے۔ ہم تمام اہالیانِ محلہ ایک خاندان کے افراد کی طرح مل جل کر رہیں گے

اب عید الضحیٰ سے متعلق ضروری احکام سماعت فرمائیں ارشاد الٰہی وَلِتُکَبِّرُوا اللّٰہَ عَلٰی مَا ھَدٰکُمْ "حسب ہدایت اللہ کی بڑائی بیان کرو۔ اس سے مراد نمازِ عید ہے۔ عید کی نماز عید گاہ میں ادا کرنا سنّت ہے تاکہ ہر محلہ کے مسلمان سال میں دو مرتبہ یکجا جمع ہوں عید الضحیٰ کی نماز میں افضل یہ ہے کہ جلدی کی جائے۔ لہٰذا نمازِ فجر کے بعد سے نہادھو کر نیا یا دھویا ہوا لباس پہنیں، خوشبو لگائیں اور بجز کچھ کھائے پیئے گھر سے بآوازِ متوسط اَللّٰہُ اَکْبَرُ اللّٰہُ اَکْبَرُ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاللّٰہُ اَکْبَرُ وَلِلّٰہِ الْحَمْد کہتے رہیں۔ عید گاہ پہنچ کر ختم کردیں۔ عید گاہ میں نفل نماز نہ پڑھیں۔ نمازِ عید کیلئے امام جب مصلّٰی پر آجائے اور اللہ اکبر کہے گا تو مقتدی بھی نمازِ عید کی نیت کرکے اللہ اکبر کہہ کر ہاتھ باندھ لے پھر اس کے بعد امام کے ساتھ اللہ اکبر کہہ کر کانوں تک ہاتھ اٹھا کر چھوڑ دے، پھر دوسری مرتبہ اسی طرح اللہ اکبر کہہ کر کانوں تک ہاتھ اٹھا کر چھوڑ دے پھر تیسری مرتبہ اللہ اکبر کہہ کر کانوں تک ہاتھ اٹھا کر باندھ لے۔ امام سورہ فاتحہ اور ایک سورہ پڑھے گا خاموشی کے ساتھ سنتے ۔۔ پھر رکوع اور سجدہ۔ اس کے بعد امام قیام میں سورہ فاتحہ اور کوئی سورہ پڑھے گا۔ خاموشی سے سماعت کریں، سورہ ختم کرنے کے بعد امام مسلسل وقفہ وقفہ سے تین مرتبہ اللہ اکبر کہہ کر کانوں تک ہاتھ اٹھا کر چھوڑ دے گا مقتدی بھی تین بار اسی طرح ہاتھ اٹھائے اور چھوڑ دے، چوتھی مرتبہ بغیر ہاتھ اٹھائے اللہ اکبر کہہ کر رکوع میں چلا جائے اور بعد فراغت نماز امام دو خطبہ دے گا ہر دو خطبوں کے وقت خواہ آواز سنائی دے یا نہ دے اپنی جگہ خاموش بیٹھے رہے۔ اپنی جگہ سے اٹھ کر ادھر ادھر نہ جائیں خطبہ میں جو احکام سنائے جاتے ہیں ۔ وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

قربانی ۔ ہر مقیم صاحب نصاب پر واجب ہے۔ صاحب نصاب وہ شخص ہے جس کے پاس اصلی ضرورتوں کے علاوہ بحساب [illegible] تولہ یا [illegible] تولہ ساڑھے پانچ ماشہ چاندی یا پانچ تولہ ڈھائی ماشہ سونا یا اتنی رقم جو ان کی قیمت کے برابر ہو اس کی قیمت [illegible] کا مالک ہے اس پر سال [illegible] قربانی [illegible] دسویں ذالحجہ نماز [illegible]

عید کے بعد سے بارہویں کے آخر وقت تک ہے اگر ان تاریخوں میں کسی وجہ سے قربانی نہ کی جائے اور قربانی کا جانور خرید لیا گیا ہے تو اس کو خیرات کر دیں اور اگر خریدا نہیں گیا ہے تو اس کی قیمت خیرات کر دیں۔ قربانی کا جانور موٹا تازہ بکرا بکری ہو تو ایک سال کا اور دنبہ ہو تو چھ ماہ کی عمر کا بھی کافی ہے۔ قربانی کا جانور صحیح وسالم ہو۔ اندھا۔ کانا۔ لنگڑا۔ بہت دبلا جو چل نہ سکے۔ تہائی سے زیادہ کان یا دم کٹا ہوا نہ ہو۔ بے دانت کا نہ ہو۔ جانور کو خود ذبح کرنا مستحب ہے۔ قربانی کے گوشت کے تین حصے کئے جائیں۔ ایک حصہ محتاجوں کو خیرات کر دیں۔ دوسرا حصہ قرابت داروں اور ہمسایوں میں تقسیم کر دے اور تیسرا قربانی دینے والا مع اہل وعیال استعمال کرے۔ قربانی کی کھال خیرات کر دیں۔ اس کو خود اپنے لئے فروخت نہ کرے۔ آنحضور کا ارشاد ہے کہ جو کھال کو فروخت کریگا اس کی قربانی نہ ہوگی۔ بصورت فروخت اس کی خیرات کر دے۔ کھالوں کی قیمت کو جمع کر کے قرضہ دینے کا انتظام صحیح نہیں۔ دینی مدارس میں کھال بھجوا دیں تو اس میں دو اجر ہیں۔ ایک خیرات کا، دوسرا علم دین کی اشاعت میں مدد کرنے کا۔

عموماً عید کے روز عید کی مسرت سینما بینی میں گزاری جاتی ہے۔ یہ ایک معصیت ہے۔ اس سے مسلمانوں کو پرہیز کرنا چاہیئے۔ اس سے زیادہ مضرت رساں بات یہ ہے کہ غیر مسلموں پر اس کا جو اچھا اثر مرتب ہونا چاہیئے وہ نہ ہوگا۔ بلکہ وہ یہ سمجھنے پر مجبور ہوں گے کہ مسلمانوں کی عیدیں بھی ہماری تہواروں کی طرح ہیں۔ لہذا مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ ہر ایسی بات سے دور رہیں جس کی وجہ سے اسلام کی تصویر غیر مسلموں کو بری دکھائی دے۔ جس کی بہت بڑی ذمہ داری ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم قربانی کے احکام سنانے کے بعد قرآن حکیم کی چند آیتیں تلاوت فرماتے تھے۔ ایک آیت کا ترجمہ یہ ہے "لوگو! اپنے رب کی ناراضی سے بچتے رہنا جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا بنایا اور ان دونوں کے ذریعہ بہت سے مرد اور عورت دنیا میں پھیلائے اور اپنے پالنے والے مالک کی ناراضی سے بچنے کی پوری پوری کوشش کرتے رہنا جس کا واسطہ دیکر تم ایک دوسرے سے اپنا حق مانگتے ہو۔ رشتہ اور قرابت کے تعلقات بگاڑنے سے پرہیز کرو۔ یقین جانو اللہ تمہارے ہر حال سے واقف و نگراں ہے اس آیت سے اللہ تعالیٰ یہ بات ذہن نشین کرنا چاہتے ہیں کہ خوشی اور غمی میں اس کے مقررہ احکام سے تجاوز مت کرو۔ اور خواہشات کی تکمیل سے خود کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔ اور یاد رکھو تمام انسان اصل کے اعتبار سے ایک ہیں۔ سب ایک دوسرے کے انسانی بھائی ہیں اور ایک دوسرے کا خون اور گوشت و پوست ہیں" اور اصل انسان یعنی آدم علیہ السلام مٹی سے پیدا کئے گئے تھے۔ لہذا کسی کو کسی پر کوئی برتری نہیں۔ اللہ کے نزدیک معزز وہ ہے جس کا اللہ تعالیٰ سے زائد تعلق ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو تقویٰ کی زندگی اختیار کرنے توفیق دے۔ آمین۔

والحمد للہ رب العالمین

آر۔ بانو

تاثراتِ لطیف

پھر کچھ اک دل کو بے قراری ہے
سینہ جویائے زخم کاری ہے
پھر جگر کھودنے لگا ناخن
آمدِ فصلِ لالہ کاری ہے
(غالب)

خواہر محترمہ من آمنہ!

وعلیک السلام و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ

عرصہ دراز بعد نامۂ کرم نظر نواز ہوا۔ بہت خوشی ہوئی۔ شکریہ! دوستوں سے میل ملاپ اور ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رکھنا بھی بہت بڑی نیکی ہے، خواہ نصف ملاقات ہی کیوں نہ ہو۔

بہن! حج کیلئے قافلوں کی روانگی اور حرمین شریفین کی زیارت سے متعلق جو آپ نے لکھا ہے، کیا بتاؤں، دل کی کیا حالت ہوئی! تصورات جاگ اٹھے، جذبات و احساسات نے انگڑائی لی۔ نظریں اپنے کھوئے ہوئے محبوب نظاروں کو ڈھونڈنے لگیں

پھر حرم کے بام و در آئے نظر
پھر کلیجہ تھام کر ہم رہ گئے

بہن۔ اس وقت آنکھوں سے بے اختیار آنسو رواں ہیں۔ ادھر قافلوں کی روانگی، ادھر اشکوں کی روانی!! آہ ؎

"کس کی تلاش میں مرے اشک رواں چلے"

بہن! آج میں اسی تذکرۂ لطیف سے اپنے غمِ دل کو ہلکا کرنا چاہتی ہوں کیونکہ

ذکرِ حبیب کم نہیں وصلِ حبیب سے

خانۂ کعبہ (بیت اللہ شریف) میں جس طرح پروردگارِ عالم کی عظمت و جلال کے آگے ہماری روح تو مثلِ بید کی طرح کانپ کانپ اٹھتی اور اپنی سرکشیوں نافرمانیوں اور سیہ کاریوں کو یاد کر کے عرقِ ندامت میں غرق ہو جاتی ہے۔ سرکارِ نامدار کے دربارِ فیض آثار میں یک گونہ سکون و طمانیت پاتی ہے۔ افسردہ دلوں کو ایسی شگفتگی اور تازگی ملتی ہے کہ زندگی میں پہلی بار زندگی کا احساس ہوتا ہے۔ ایک فانی اور ناکارہ وجود جو زندگی بھر، زندگی سے بیزار رہا، برگشتہ رہا۔ اس ارضِ مقدس پر پہنچ کر اپنی خوش نصیبی پر اتنا شاداں و فرحاں، اتنا نازاں ہوتا ہے جیسے

"ہمچو من دیگرے نیست"

یقین ہی نہیں آتا کہ ایک ذرۂ ناچیز کی رسائی بھی آفتابِ عالم تاب تک ہو سکتی ہے۔ حیرت و استعجاب کے عالم میں کہہ اٹھتا ہے ؎

ایں کہ می بینم بہ بیداریست یارب یا بخواب

اللہ کے گھر میں ایک طرف جہاں رو رو کر تڑپ تڑپ کر خدائے عزّوجل کی صفتِ عفو و درگذر کا حوالہ دیتے ہوئے "اَللّٰھُمَّ اِنَّکَ عَفُوٌّ کَرِیْمٌ تُحِبُّ الْعَفْوَ فَاعْفُ عَنِّیْ" کی رٹ لگائی جاتی ہے اور اسکے رحم و کرم کے واسطہ سے ؎ برمنِ تنگدل برکرم ہوش نگر

کی التواشہ پیہم ہوتی ہے۔ اسی طرح گنبدِ خضرا پر نظر پڑتے ہی فرطِ مسرت سے دل کی دھڑکنیں بڑھ جاتی ہیں۔ دیدار کے لئے مدت سے ترسی ہوئی آنکھیں غمِ فراق کی داستان سناتی ہوئی اشک ریز ہو جاتی ہیں۔ آرزوئیں پھولی نہیں سماتیں، تمنائیں رنگ لاتی ہیں۔ افسردہ روح میں نئی بالیدگی پیدا ہوتی اور نہ جانے کیا کیا ہو جاتا ہے کہ

آدمی محسوس کر سکتا ہے کہہ سکتا نہیں

گنبدِ معلیٰ کو دیوانہ وار تکتے ہوئے سر و پا کا ہوش نہیں رہتا آدمی دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتا ہے۔ کیف و سرور فرحت و انبساط کا وہ عالم ہوتا ہے کہ کیا بتائیں کہ

لطف این بادہ نہ دانی بخدا تا نہ چشی

جسم کا ایک ایک رواں، روح کا ایک ایک گوشہ فرطِ انبساط سے جھوم اٹھتا ہے۔ کسی نے کہا تھا ؎

عجب اپنا حال ہوتا جو وصالِ یار ہوتا
کبھی جان صدقے ہوتی کبھی دل نثار ہوتا

مگر یہاں تو مر جائیں اور ہزار دل بھی ہوں تو تصدق اور نثار ہونے کیلئے کافی نہ ہوں۔ وارفتگیِ شوق کا عجیب رنگ ہوتا ہے وہ تو کہئے کہ ایک طرف اگر

لَا تَرْفَعُوْا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ کی ہدایت باری تعالیٰ کار فرما نہ ہوتی اور دوسری طرف علامہ اقبال

ادب پہلا قرینہ ہے محبت کے قرینوں میں

کہہ کر مادۂ فریاد دلوں کو خموش نہ کر دیتے تو دیوانے جوشِ جنوں میں نہ جانے کیا کیا کر گذرتے! چیخ و پکار گریہ و زاری، نالہ و فریاد، چاک داماتی اور حشر سامانی وغیرہ وغیرہ اور خود محبوب کی طبع نازک کب اسکی متحمل ہو سکتی! یہاں تو ایک خاموشی خود سپردگی، ایک دستِ بستہ حضوری اور پرسکوں جاں نثاری کی ضرورت ہے کہ

عشق کاریست کہ بے آہ و فغاں نیز کنند

اگرچہ کہ مدتوں کی تمنا ہوتی ہے ؎

وہ دن خدا کرے کہ مدینے کو جائیں ہم
خاکِ درِ رسول کا سرمہ لگائیں ہم
جالی پکڑ کے روضۂ اقدس کی بار بار
سب حالِ دل رسولِ خدا کو سنائیں ہم

مگر جب سنانے کا دن آتا ہے تو فورِ شوق میں سب کچھ بھول جاتے ہیں۔

زِ شادی دست و پا گم میکنم خود را نمی یابم

خیر، زباں سے نہ سنا سکیں نہ سہی، دل سے دل کو راستہ ہوتا ہی ہے۔ یہ کسی شاعر کا محبوب تو نہیں جو یہ کہتا ہوا انجان ہو جائے کہ ؎

جانوں کسی کے جی کی میں کیونکر کہے بغیر

یہاں تو نہ طاقتِ سخن کی ضرورت ہے، نہ قوتِ فریاد کی حاجت!

ظاہر ہے اپنا حال سب ان پر کہے بغیر

یہاں صرف ایک روحِ پاکیزہ، دلِ درد آشنا اور جذبِ صادق چاہئے۔

خانۂ کعبہ میں زباں جس طرح "سبحان اللہ والحمد للہ" کے ورد میں لگی رہتی ہے۔ سرکارؐ کے دربار میں درود و سلام کا وظیفہ جاری رہتا ہے۔ روح فرطِ شوق میں رقصاں، دل عالمِ نشاط میں سرشار، آنکھوں کو دیدار سے سیری نہیں ہوتی، نہ خانۂ خدا کے دیدار سے نہ گنبدِ خضرا کے نظارے سے۔ دیکھتی ہیں، دیکھتی رہتی ہیں، دیکھتی ہی چلی جاتی ہیں مگر آخر تک پھر تشنگی باقی رہ جاتی ہے کہ ؎

ابھی ہم نے جی بھر کے دیکھا نہیں ہے

اس کیف و سرور میں اس خود فراموشی میں پلک جھپکنا تک بار گذرتا ہے ؎

در بزمِ وصالِ تو بہ ہنگامِ تماشا
نظارہ ز جنبیدنِ مژگاں گلہ دارد

بہن! حرم شریف میں وہ گذاری ہوئی راتیں یاد ہیں نا! عشاء کی نماز اور طواف کے بعد ہم سب اپنی اپنی رہائش گاہ لوٹنے

تھی کہ پوری رات حرم شریف میں گذارنے اور طواف کرتے رہنے کی تحریک اللہ کے حکم سے آپ کی طرف سے ہوئی تھی۔ ہم دونوں سب کو سوتا چھوڑ کر دبے پاؤں چپکے سے حرم مبارک کی طرف چل نکلی تھیں - نفل نمازوں اور طوافوں کے بعد حطیم میں ہم نے صلوٰۃ التسبیح ادا کی تھی - جس کی یاد میں آنکھیں بند کر کے تصور میں ہمیشہ میں یہ نماز ادا کرتی ہوں اسی جگہ، اسی مقام پر، اور اسی گوشہ میں مگر وہ لطف کہاں

ع بات تیری تجھ میں ہے تصویر کی تصویر میں!

بہن! وہ راتیں تو زندگی بھر نہ بھولینگی، نہ بھولی جا سکیں گی آہ! کیا سماں تھا وہ بھی! کسی شاعر نے کہا تھا ؎

ہجر کی یہ رات بھی کیا رات ہے
ایک میں ہوں یا خدا کی ذات ہے

مگر یہ تو ہماری وصل کی رات تھی بہن! جہاں - ہم ہی ہم تھے اور خدا کی ذات تھی - "ہجوم میں تنہائی" اسی کو کہتے ہیں ہر شخص "ذاتِ واحد" میں گم - نہ اسے گردوپیش کا ہوش نہ ماحول سے تعلق، عجیب عالم تھا وہ بھی جس کا نشہ و سرور اب تک باقی ہے ؎

کبھی ان مدھ بھری آنکھوں سے پیا تھا اک جام
آج تک ہوش نہیں، ہوش نہیں، ہوش نہیں

ایک بات اور سنو! وہاں کے کبوتروں کی زندگی پر اتنا رشک آتا تھا مجھے - دن رات حرمینِ مبارک پر ان کی جانثاری و شیفتگی کا عالم دیکھ کر بار بار میں ان سے کہا کرتی! ؎

تو اے کبوترِ بامِ حرم چہ می دانی!
تپیدنِ دلِ مرغانِ رشتہ برپا را

کاش! یہ "مرغانِ رشتہ برپا" بھی کبوترانِ بامِ حرم کی طرح آزاد ہوتے! دن رات بارگاہِ الٰہی اور آستانۂ نبی الہیؐ پر قربان و نثار ہوتے رہتے!!

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

ہاں میں تو ان دنوں، ان ایامِ حج میں طوافوں، عبادتوں اور دعاؤں میں خیالی و تصوراتی طور پر سب حاجی صاحبان کے ساتھ شریک رہتی ہوں - اور دعا کرتی رہتی ہوں کہ ع

خدایا! ایں کرم بار دگر کن

اقبال نے شاید ایسی ہی کسی صبح شام کی یاد میں خواہش ظاہر کی تھی ؎

اے مقدر پھر سے دکھلا دے وہ صبح و شام تو!
دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو!

جوں جوں حج کے دن قریب آتے جا رہے ہیں۔ قافلوں کی آمد آمد سے صحنِ حرم میں بڑی "چہل پہل" بڑی ہماہمی ہوگی - کسی کو کسی کی خبر نہیں - ہر شخص ایک جنتِ خیال کی سیر کر رہا ہوگا - نئی دنیا میں پہونچ کر جیسے اس دنیائے دوں سے کوئی تعلق ہی نہ ہو -

۸ ویں ذوالحجہ سے جب مناسکِ حج کا آغاز ہوجاتا ہے تو کچھ اور ہی کیفیت ہوتی ہے - حرم شریف سے منیٰ، منیٰ سے عرفات کا میدان، عرفات سے مزدلفہ اور مزدلفہ سے پھر منیٰ! کافی دوڑ دھوپ رہتی ہے - بڑے لطف، بڑے انہماک بڑی وارفتگی کے ساتھ والہانہ انداز میں یہ منازلِ شوق طے ہوتی ہیں - حاجیوں کے صبر و استقامت اور جذبۂ ایمانی کی آزمائش کا وقت ہوتا ہے یہ بھی - جدھر کا حکم ہوا، بے چون و چرا چل پڑے یعنی ؎

رشتہ در گردنم افگندہ دوست
می برد ہر جا کہ خاطر خواہِ اوست

بہن! زیادہ کیا لکھوں! دل میں جذبات کا طوفان امنڈ آیا ہے بس اب اس دعا پر اجازت چاہتی ہوں کہ - پروردگار جمیع حجاج کرام کو حج مقبول و حج مبرور نصیب کرے اور دنیا کے ہر مسلمان کو اس دولت دارین سے سرفراز فرمائے آمین یا رب العالمین

ایں سعادت بزورِ بازو نیست - تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

سب بھائی بہنوں کو سلام دعا - خدا حافظ، فی امان اللہ!

ڈاکٹر یعقوب عمر

سہروردی صوفیا کا سیاسی اثر و رسوخ

(شہاب الدین سہروردی سمینار منعقدہ ابوالکلام آزاد انسٹیٹوٹ میں پڑھا گیا)

سہروردی سلسلے کے بانی اگرچہ حضرت ضیاء الدین ابو نجیب سہروردیؒ ہیں مگر اس سلسلے کو صحیح معنوں میں وسعت دینے والے ان کے بھتیجے حضرت شہاب الدین سہروردیؒ تھے ہندوستان کے طول و عرض میں جن چار صوفی سلسلوں نے اہمیت حاصل کی ان میں سہروردی سلسلہ ایک ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔

عام طور پر صوفیائے کرام کے متعلق یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ زاہد خشک، گوشہ نشیں اور خلق خدا سے آزادانہ میل جول کو ناپسند کیا کرتے تھے ہو سکتا ہے کہ یہ بات بعض سلاسل کی حد تک درست ہو لیکن سہروردی سلسلے کے صوفیائے کرام نے ہمیشہ اپنے آپ کو اس سلسلے میں ممتاز رکھا۔

جہاں تک شریعت کا تعلق ہے سہروردی صوفیا کے یہاں چشتیہ اور قادریہ سلسلے سے زیادہ اس کا اہتمام کیا جاتا رہا ہے۔ اس پر زیادہ زور دینے کی بناء پر اکثر ایسا بھی ہوا کہ چشتیہ سلسلے کے بزرگوں میں اور سہروردیوں میں ایک قسم کی نظریاتی کشمکش پیدا ہوئی مگر تاریخ کا غائر مطالعہ بتاتا ہے کہ سہروردیوں نے ہمیشہ وسعت نظر سے کام لیا اور اتباع شریعت کے معاملے میں چشتیوں کے خلاف کبھی اپنا سیاسی اثر و رسوخ استعمال نہیں کیا۔ ارباب اقتدار نے جب کبھی چشتیہ سلسلے کے اکابرین سے شریعت کی کم اہتمامی کے بارے میں باز پرس کی تو سہروردی سلسلے کے بزرگوں نے ہمیشہ مصالحت کنندہ کا رول ادا کیا چنانچہ چشتیہ اور سہروردیہ میں نظریاتی اختلاف کے باوجود ایک باہمی میل ملاپ کا رشتہ باقی رہا۔

چشتیہ سلسلے کے بعد ہندوستان میں جو عروج سہروردی سلسلے نے پایا وہ دوسرے سلاسل میں نظر نہیں آتا۔ خصوصاً خاندان غلاماں کے عہد کو اس سلسلے کے صوفیاء کا سنہری دور کہا جا سکتا ہے جب حضرت شہاب الدین سہروردیؒ نے ہندوستان کی عرفاں طلب سرزمین کو حقائق و معارف کے لئے زرخیز دیکھا تو یہاں رشد و ہدایت کے تناور درخت لگانے کے لئے اپنے بہترین خلفاء کو ہندوستان روانہ کیا جن میں حضرت نورالدین مبارکؒ غزنوی۔ شیخ حمیدالدینؒ ناگوری اور شیخ بہاء الدین زکریاؒ قابل ذکر ہیں

شیخ حمیدالدینؒ چشتیہ سلسلے میں چلے گئے البتہ سید نورالدین مبارک غزنویؒ نے حلقہ ارباب اقتدار میں وہ عروج پایا کہ سلطان التمش کے عہد تک شیخ الاسلام کے عہدے پر فائز رہے۔ عمائدین شہر پر ان کے اثر و رسوخ کا یہ عالم تھا کہ بقول صاحب اخبار الاخیار وہ امیر دہلی کہلاتے تھے۔

سیف الدین مبارک غزنوی کا تمول اور سیاسی اثر و رسوخ کوئی انفرادی واقعہ نہیں۔ یہ سہروردی سلسلے کی ایک خصوصیت رہی ہے چنانچہ حضرت شہاب الدین سہروردی بھی کوئی زاہد خشک نہیں تھے نہ انھوں نے طویل مدتیں گوشہ نشینی میں گزاریں ان کی یہ خصوصیت تھی کہ وہ سوسائٹی کے اعلیٰ ترین طبقے میں اٹھتے بیٹھتے تھے اور یہ روش انھوں نے آخر دم تک جاری رکھی وہ صرف بغداد کے امراء اور روساء سے محبت نہ رکھتے تھے بلکہ ایران میں حکمراں مختلف چھوٹی چھوٹی حکومتوں کے شہزادے اور امراء بھی آپ کی صحبت سے فیض حاصل کرتے تھے۔ آپ کے اسی اثر و رسوخ کی بناء پر عباسی خلیفہ الناصر الدین اللہ کو خیال آیا کہ حضرت کے ذاتی تعلقات سے امور ملکی و سیاسی میں جو استفادہ کیا جا سکتا ہے وہ کسی دوسری شخصیت سے ممکن نہیں چنانچہ اس نے حضرت پر خاص الطاف جو عنایت کی نظر رکھی یہاں تک کہ انھیں اپنے خاص مصاحبین میں شامل کر لیا یہی نہیں بلکہ سفیر کی حیثیت سے سلجوقی بادشاہ علاؤالدین کیقباد اول کے دربار میں بھیجا۔ آپ کی سفارتی صلاحیتوں کی کامیابی کی بناء پر خلیفہ نے پھر انھیں الملک العادل اور خوارزم شاہ کے دربار میں بھی اپنا سفیر خاص بنا کر بھیجا۔

آپ کی جامع الکمال شخصیت میں شریعت و طریقت کی ہم آہنگی دیکھ کر خلیفہ عباسی نے نہایت اہتمام کے ساتھ آپ کے لئے ایک عالی شان خانقاہ تعمیر کروا دی۔ اس عمارت کی وسعت و جلال کا اندازہ صرف اس ایک امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ نہ صرف اس کی مرکزی عمارت بڑی تھی بلکہ اس میں ایک حمام اور پائیں باغ بھی حضرت اور ان کے خاندان کے لئے مختص تھا۔

کڑی ریاضتوں پر عمل کرنے یا کروانے کے بجائے حضرت تصوف کی نظری تعلیم سے زیادہ سروکار رکھتے تھے چنانچہ وہ عرفانیات کے ایک بہترین معلم تھے انھوں نے صوفیوں کی ہدایات ـ ـ ـ ـ کے لئے اصولوں پر مبنی کتاب عوارف المعارف تحریر کی جو آج تک تقریباً تمام سلاسل کے لئے مشعل ہدایت بنی ہوئی ہے۔ دنیا کے طول و عرض سے طالبان عرفان ان کے پاس آکر اپنی پیاس بجھاتے تھے وہ خود بھی حلب اور دمشق کی خانقاہوں میں طویل قیام کر کے طالبان راہِ حقیقت کو درس دیتے تھے۔

حضرت شہاب الدین سہروردی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اس عرفانی سلسلے کا مسلک شریعت کی پیروی میں کچھ ایسا رکھا کہ اکثر علماء بھی اس سلسلے سے راضی تھے۔

ٹرمی منگھم نے اپنی کتاب SUFI ORDERS IN ISLAM میں لکھا ہے کہ سہروردی صوفیا کا رجحان دنیا کی طرف تھا شہزادوں سے صحبت اور حصول انعام و اکرام کی کثرت نے انھیں خاصا متمول بنا دیا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ شریعت پر بھی سختی سے عامل تھے علماء ظاہر سے بھی کبھی انھیں کوئی نقصان نہیں پہنچا البتہ چشتیوں کے برخلاف وہ سماع کے دلدادہ نہیں تھے۔

جہاں تک تاریخی حقائق کا سوال ہے یہ صحیح ہے کہ سہروردی صوفیاء کے یہاں انتہائی تمول اور مال و دولت کی کثرت نظر آتی ہے خصوصاً قدیم صوفیائے سلسلہ کے واقعات میں یہیں شیخ حمید الدین ناگوری کی جو چشتیہ میں شامل ہو گئے تھے۔ حضرت بہاؤالدین زکریا ملتانی سے خط و کتابت ملتی ہے جس میں حصول دنیا کا تذکرہ ہے ایک مرتبہ انھوں نے

حضرت بہاؤالدین کو لکھا کہ "مجھے ٹھیک معلوم ہے کہ آپ واصلان خدا میں سے ہیں (یہ پہلا جملہ بیحد اہم ہے) اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ (دولت) دنیا کو خدائے تعالیٰ نفرت سے دیکھتا ہے۔ پھر کیا بات ہے کہ آپ جیسا بزرگ اس دشمن خدا کو دور نہیں کرتا۔"

شیخ بہاؤالدینؒ نے جواباً تحریر کیا۔

"یہ بھی معلوم ہے کہ دنیا کسے کہتے ہیں اور اس میں سے میرے پاس کتنی رہے گی۔"

غرض یا حضرت بہاؤالدینؒ نے حقارت دنیا کی کئی تمثیلیں لکھیں مگر شیخ حمیدالدین کو اطمینان نہ ہوا وہ ہمیشہ یہی سوچا کرتے تھے الضدان لا یجتمعان (یعنی اجتماع ضدین ناممکن ہے۔ چنانچہ سیرالاولیاء کے مولف کا بیان ہے کہ وہ اس خیال کے تحت انھیں لکھتے رہے اور اس مسئلے پر غور و خوض کرتے رہے۔ جب انھوں نے بہت زور لگایا تو بیان کیا جاتا ہے کہ اس مسئلہ کا حال ان پر غیب سے ظاہر ہوگیا اور وہ مطمئن ہوگئے۔

اس مراسلت کے پہلے جملے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شیخ حمیدالدین باوجود اس اختلاف رائے کے حضرت بہاوالدینؒ کو واصلان حق میں سے تسلیم کرتے تھے اور اس باب میں انھیں کوئی شک نہیں تھا بلکہ دونوں کے درمیان انتہائی خلوص و محبت پائی جاتی تھی۔ یہ تھے ہمارے اکابرین! ـــــ اور یہ تھا ان کا اسوہ! جس کی آج شدت سے کمی محسوس کی جا رہی ہے اگر آج بھی اختلاف رائے رکھنے والے آپس میں ایک دوسرے کے لئے یہی جذبہ رکھیں تو دنیا کے اکثر جھگڑے ختم ہو جائیں۔ صوفیائے کرام کی سیرت کے ان پہلوؤں کو خاص طور پر اجاگر کرنے کی ضرورت ہے تاکہ آج کے دور میں بھی انسان اپنے آپ میں توازن پیدا کر سکے۔

ایسا لگتا ہے کہ چشتیہ سلسلے میں تمول اور سیاسی اثر و رسوخ کو نظریاتی طور پر پسند نہیں کیا جاتا تھا چنانچہ اکثر چشتی بزرگوں اور سہروردیوں کے مابین اس ایک مسئلے کو لے کر بات کبھی کبھی طنز و تشنیع کی سرحدوں تک بھی پہونچ جاتی تھی اس کے برخلاف سہروردی اتباع شریعت میں چشتیوں پر تشدد کرتے تھے اس میں سے بطور نمونہ دو مثالوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

سیرالاولیا میں لکھا ہے کہ حضرت بہاؤالدین زکریاؒ کے ایک فرزند ناگور میں آئے اور جب انھوں نے سنا کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے خلیفۂ اعظم شیخ حمیدالدینؒ نماز جمعہ میں شریک نہیں ہوتے تو چند ظاہربین عالموں کو لے کر ان کے مکان پر پہونچ کر یامرون بالمعروف کے مصداق انہیں معروف کی طرف بلانے لگے۔

دوسری مثال حضرت خواجہ بندہ نوازؒ کی کتاب جوامع الکلم میں ملتی ہے جس میں نام لئے بغیر اشارتاً اور کنایتاً سہروردیوں کا ہی تذکرہ کیا گیا ہے لکھتے ہیں۔ ملتان کے مشائخ مال دنیا جمع کرنے کے لئے کوشاں رہتے ہیں۔ خراسان کے مشائخ تجارت اور سوداگری سے تعلق رکھتے ہیں لیکن ہمارے خواجگان دنیا کے مال و اسباب کی طرف کبھی توجہ نہیں کرتے۔

ان جملوں کی شدت بتاتی ہے کہ حضرات چشتیہ کو فقر کتنا عزیز تھا جبکہ سہروردی اور نقشبندی جائز مال دنیا کے حصول اور تجارت و سوداگری میں حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کی طرح مشغول رہتے تھے تاکہ ان کا گزارہ بھی [illegible] بلکہ کسب حلال کی صورت وہ جو اسلامی شریعت [illegible]

حضرت بہاؤالدین زکریا ملتانیؒ کی سیرت کے

مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے عامتہ الناس کی فلاح و بہبود کے لئے زراعت و تجارت کے کام کو آگے بڑھایا افتادہ جنگلوں کو آباد کرایا نہریں اور کنویں کھدوائے۔ خصوصاً تجارت کی طرف بہت توجہ دی۔ صرف حصول دولت سے عوام کو اتنا فیض نہیں پہونچ سکتا تھا کیونکہ حکومتیں شخصی تھیں لہذا خود حضرت بہاؤالدین اور ان کے متبعین نے سیاسی اثر و رسوخ بھی حاصل کیا۔ اور بعض دفعہ اپنی فراست مومنانہ سے کام لیتے ہوئے سیاسی امور میں مداخلت بھی کی لیکن یہ امر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اس کے پس پشت بھی عوام کی بھلائی کارفرما تھی۔

حضرت بہاؤالدین کے زمانے میں ناصرالدین قباچہ ملتان کا گورنر تھا۔ قطب الدین ایبک کی وفات تک وہ مرکزی حکومت کا وفادار رہا لیکن التمش کے بادشاہ ہوتے ہی اس نے خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ شیخ بہاؤالدین اور قاضی شریف الدین نے خط لکھ کر التمش کو اس کی اطلاع دینی چاہی مگر اتفاقاً دونوں خطوط پکڑے گئے قباچہ نے قاضی کو فوراً قتل کروا دیا البتہ شیخ کے روحانی اثر و نفوذ اور عامتہ الناس میں ان کے قبول عام کو دیکھتے ہوئے وہ انہیں کوئی نقصان پہونچانے کی جرأت نہ کر سکا اور صرف باز پرس کی۔ شیخ نے صاف کہہ دیا کہ یہ خط میں نے ارشاد الٰہی کے مطابق لکھا ہے تمہاری کوششوں سے سوائے مسلمانوں کی خونریزی کے اور کچھ نہ ہوگا وہ جدید ذہن جو کشف و کرامات پر یقین نہیں رکھتا اس کے سامنے اگر ان کے بے لوث سیاسی کردار کا پہلو آجائے تو وہ یقیناً اس بات کا تو قائل ہو جائے گا کہ یہ واقعہ ان کی سیاسی سوجھ بوجھ اور دوراندیشی کا بین ثبوت تھا جس نے مسلمانوں کو ایک بہت بڑے فتنے سے بچانے کی کوشش کی اور اس سوجھ بوجھ بالفاظ دیگر فراست مومن کی صحت یوں ثابت ہوئی کہ ناصرالدین قباچہ التمش کے ہاتھوں مارا گیا اور کشت و خون

جس طرح اکثر سیاسی حکومتوں میں موروثی جانشینی پائی جاتی ہے۔ اسی طرح ہندوستان میں بھی غالباً سب سے پہلی موروثی جانشینی سہروردی سلسلے میں ہوئی یہ تھے شیخ صدرالدین جو اپنے والد شیخ بہاؤالدین کے جانشین ہوئے حالانکہ چشتیہ سلسلے میں موروثی جانشینی شاذ و نادر ہی پائی جاتی ہے۔

شیخ صدرالدین کے بعد ان کے صاحبزادہ شیخ رکن الدین ابوالفتح ان کے جانشین ہوئے۔ انہیں سلطان علاؤالدین خلجی کے دربار میں بڑا اثر و رسوخ تھا دو مرتبہ وہ دہلی آئے اور دونوں مرتبہ بادشاہ نے ان کا استقبال نہایت عقیدت سے کیا اس کے برخلاف چشتیہ سلسلے کے بزرگ سلاطین شہزادوں اور امراء کی صحبت کو ناپسند کرتے تھے چنانچہ جب بادشاہ وقت نے حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ سے ملاقات کی بڑی تمنا ظاہر کی تو وہ راضی نہ ہوئے یہاں تک کہ بادشاہ نے خود حاضر ہونا چاہا تو صاف جواب دے دیا کہ آپ ایک دروازے سے آئیں گے تو میں دوسرے دروازے سے نکل جاؤں گا۔

شیخ رکن الدینؒ کو تمام بادشاہوں یہاں تک کہ محمد تغلق جیسے صوفی بیزار بادشاہ کے دربار میں بھی نہایت اثر و رسوخ حاصل تھا محمد تغلق نے تلکوٹی کے محل میں جو دعوت ترتیب دی تھی اس میں شیخ رکن الدینؒ شریک تھے اور بادشاہ کے ہم طعام تھے۔ اچانک وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور بادشاہ کو فوراً باہر نکلنے کے لئے کہا مگر بادشاہ نے کہا آپ چلئے میں کھانا ختم کر کے آتا ہوں شیخ رکن الدین باہر نکلے ہی تھے کہ محل بیٹھ گیا۔

یہ واقعہ بھی اس امر کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ شیخ رکن الدینؒ کو غیاث الدین تغلق کے دربار میں کتنا اثر و رسوخ حاصل تھا کہ ولیعہد کی طرف سے دی گئی دعوت میں وہ بادشاہ کے ہم طعام تھے۔

کشلو خاں نے بغاوت کی اور بادشاہ نے اسے شکست دے کر حکم دیا کہ اہل ملتان کے خون سے شہر کو لالہ زار کر دو ایسے موقع پر بھی بادشاہ کے غیظ و غضب کو حضرت کے سیاسی اثر و رسوخ نے ہی کم کیا کیونکہ محمد تغلق صوفیوں کو بالکل خاطر میں نہ لاتا تھا یہ حضرت کا سیاسی اثر تھا کہ جہاں قاضی شہر کریم الدین کی کھال کھنچوا دی گئی وہاں ملتان کے مشہور صوفی بزرگ سہروردی سلسلے کے شیخ رکن الدین ننگے پاؤں بادشاہ کے پاس جا کر اہل ملتان کی سفارش کرتے ہیں اور محمد تغلق مان لیتا ہے۔

شیخ اکرام نے لکھا ہے کہ خلجیوں اور تغلقوں کے عہد میں سہروردیوں کا اثر و رسوخ چشتیوں سے کم نہ تھا بلکہ سلطان علاؤالدین خلجی اور محمد تغلق جس حد تک شیخ رکن الدین کا پاس ادب کرتے تھے اتنا انھوں نے کسی اور شیخ کا حتی کہ حضرت سلطان المشائخ کا بھی نہیں کیا۔ (آب کوثر)

سیرالاولیا میں لکھا ہے کہ شیخ رکن الدین جب پالکی میں سوار ہو کر سلطان المشائخ سے ملنے گئے اور معتقد کے واپس جب پالکی میں شیخ کے لئے لکھا بار کھنے لگے تو پالکی میں ہر طرف کاغذ ہی کاغذ پڑے ہوئے تھے۔ شیخ نے انھیں بتایا کہ یہ حاجتمندوں کی عرضیاں ہیں جو وہ مجھے اس لئے دیدیتے ہیں کہ میں بادشاہ تک پہنچادوں۔

یہاں آکر راز کھلتا ہے کہ آخر سہروردی صوفیائے کرام ارباب اقتدار کے قریب کیوں رہتے تھے اس لئے کہ نہ صرف بادشاہ وقت کو امر بالمعروف کرسکیں اور اس کے مظالم کو حتی المقدور روک لیں بلکہ غریبوں اور مظلوموں کی حاجت روائی میں بھی اپنے سیاسی اثر و رسوخ کو عملاً استعمال کریں اور اپنی نظروں کے سامنے ان کے لئے بادشاہ سے مناسب احکام جاری کروائیں اس سے بڑھ کر اور کیا خدمت خلق ہو سکتی ہے چنانچہ سیر العارفین میں لکھا ہے کہ آپ کا قاعدہ تھا کہ آپ تمام درخواستوں کو جو ضرورتمند آپ کے تخت رواں پر ڈال دیتے تھے۔ بادشاہ کے پاس پہونچنے کے بعد ایک خادم کے ذریعے اس کے روبرو رکھوادیتے تھے۔ بادشاہ آپ کی موجودگی میں سب عرضیاں پڑھواتا اور ہر عرضی پر حکم لکھواتا جب تک لوگوں کی مطلب براری نہ ہو جاتی آپ وہاں سے نہ ہلتے

حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت کے متعلق شیخ اکرام لکھتے ہیں۔

"انھیں اپنے زمانے میں بڑا اقتدار حاصل تھا۔ سلطان محمد تغلق نے آپ کو شیخ الاسلام کا لقب اور سیوستان میں خانقاہ محمدی اور اس کے مضافات کی سند عطا کر دی تھی۔ فیروز تغلق بھی آپ کا بیحد ادب کرتا تھا چنانچہ اہل ٹھٹھہ جنھوں نے کئی مرتبہ سرکشی کی انھیں صرف آپ کے کہنے سے معاف کر دیا حالانکہ وہ ان سے بہت نالاں تھا۔

تاریخ فیروز شاہی کے مطابق آپ ہر دوسرے تیسرے سال بادشاہ سے ملاقات کرنے کے لئے اُچ سے فیروز آباد تشریف لاتے تھے۔ فیروز آباد کے باہر بادشاہ سند تک حضرت کے استقبال کو جاتا اور نہایت اعزاز و اکرام کے ساتھ شہر لاتا۔

حضرت کبھی تو منارے سے متصل کوشک معظم کے اندر اور کبھی شہزادہ فتح خاں کے خطیرے میں قیام فرماتے۔ وہاں سے مقررہ طریقے کے مطابق بادشاہ سے ملاقات کے لئے تشریف لاتے اور جیسے ہی حضرت ممدوح محل حجاب میں پہونچکر سلام کرتے۔ بادشاہ تخت گاہ پر احتراماً کھڑا ہو جاتا اور نہایت انکساری کے ساتھ حضرت سے ملاقات کرتا اور اس کے بعد

دونوں اوپر بالا خانے پر تشریف فرما ہوتے جب حضرت واپس ہوتے اس وقت بھی فیروزشاہ اوپر بالا خانے پر تعظیماً اس وقت تک کھڑا رہتا جب تک حضرت محل حجاب تک نہ پہونچ جاتے۔ وہاں سے حضرت سلام کرتے۔ بادشاہ سلام کا جواب دیتا اور جب تک حضرت نگاہوں سے اوجھل نہ ہوجاتے بادشاہ نہ بیٹھتا۔

بادشاہ بھی ہر دوسرے تیسرے دن جناب سیدؒ کی قیام گاہ پر حاضر ہوتا۔ الغرض ان ملاقات کا جو اصلی منشاء تھا وہ صرف یہی تھا کہ اُچ اور دہلی کے باشندے اپنے اپنے حالات و مسائل حضرت مخدوم سے عرض کرتے اور حضرت خادم کے ذریعے انھیں قلمبند کروالیتے پھر بادشاہ سے ہر حاجت مند کے معروضے کے مطابق کارروائی کا حکم اجراء کرواتے۔ اسی طرح چند روز رہ کر اُچ روانہ ہوجاتے بادشاہ اسی طرح ایک منزل تک چھوڑنے آتا۔ سہروردی صوفیائے کرام نے اپنی بے لوث خدمات سے عوام کا دل جیت لیا تھا۔ یہ شریعت اور طریقت کے ہر محاذ پر کامیاب تھے ایک طرف علماء سے ان کے تعلقات خوشگوار تھے تو دوسری طرف بادشاہوں، امیروں سے ان کا ربط دور رس اثرات کا حامل تھا۔ ایک طرف ان کا سکہ ارباب اقتدار پر چلتا تھا تو دوسری طرف عوام کے دلوں پر۔ ماضی قریب کے بااثر شخصیتیں میں اور ان میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ جو تھوڑا بہت سیاسی اثر و رسوخ حاصل کرنے کے بعد اسے صرف اپنا جاہ و مال بڑھانے کے لئے استعمال کرتے تھے اور عوام سے دور ہوجاتے تھے آخر میں ایک واقعہ پیش کرتے ہوئے اپنا یہ مقالہ ختم کردوں گا کہ سہروردی صوفیائے کرام نے عوام کا اتنا زبردست خیال رکھا کہ ان کی حاجت براری کے لئے اپنی عزت نفس کی بھی پرواہ نہ کی۔

سیر العارفین کے مصنف شیخ جمالی نے یہ واقعہ لکھا ہے کہ :-

"فیروزشاہ تغلق کا وزیر خان جہاں تلنگی حضرت مخدوم کا شروع شروع میں بیحد مخالف تھا۔ ایک دفعہ اس نے کسی منشی کے لڑکے کو کسی جرم میں قید کرلیا۔ اس کا باپ حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا کہ حضرت اسے سفارش کے ذریعے رہائی دلوائیں۔ حضرت خان جہاں کے پاس گئے مگر اس نے نہ صرف آپ سے ملاقات نہ کی بلکہ کہلا بھیجا کہ نہ ملوں گا نہ آپ کی سفارش مانوں گا۔ آپ میرے دروازے پر نہ آئیں۔ شیخ انیس ۱۹ مرتبہ خان جہاں کے دروازے پر گئے اور ہر دفعہ یہی جواب۔ انیسویں مرتبہ تنگ آکر خان جہاں نے یہاں تک کہلا بھیجا کہ :

اے سید! کیا تم میں ذرہ برابر بھی غیرت نہیں کہ میں نے اتنی مرتبہ کورا جواب دیا اور تم بار بار چلے آتے ہو۔ حضرت نے جواب دیا کہ میں جتنی مرتبہ بھی آتا ہوں مجھے اس کا اجر مل جاتا ہے مگر ایک مظلوم کا مقصد پورا نہیں ہوتا۔ میں چاہتا ہوں کہ اس مظلوم کو تمھاری قید سے رہا کروادوں تاکہ تمھیں بھی اجر ملے۔ یہ سنتا تھا کہ خان جہاں کا دل نرم ہوگیا اور وہ شیخ کے حلقہ ارادت میں داخل ہوگیا اور لڑکے کو بھی رہا کردیا۔"

یہ واقعہ دلیل ہے کہ سہروردی صوفیاء کرام کا سیاسی اثر و نفوذ عوام کی فلاح و بہبود کے لئے تھا۔

حضرت کاملؔ شطاری

غزل

بیمارِ محبت ہوں ترساؤ نہ صورت کو
بھولے سے کبھی آؤ تم بھی تو عیادت کو

مختار ہو تم صاحب! جو چاہو کرو لیکن
اتنا بھی ستاؤ ہم! مجبورِ محبت کو؟

اس قادرِ مطلق کے بندے ہی جو ہم ٹھہرے
ہنستے ہوئے سہنا ہے ہر جبرِ مشیت کو

جس حال میں وہ رکھیں اس حال میں ہم خوش ہیں
ملت ہوئی ۔ ۔ ۔ احساسِ مصیبت کو

جو غم میں مسرت کی گھلنے کو ہوئے پیدا
بدبخت وہ کیا جانیں خود غم کی مسرت کو

اک بعد خیالی سے ہٹ کر ہمیں قربت کیا؟
مفلوج نہ ہونے دو احساسِ معیت کو

وہ پشت پناہی پہ آجاتے ہیں قوت سے
چھیڑے نہ کوئی ان کے پروردۂ نسبت کو

سرکار کے بندے کا بس دل ہی بھر آتا ہے
آنکھوں کی نمی بس ہے تحریکِ عنایت کو

افسانۂ ہستی میں مضمر ہے حقیقت بھی
بھولو نہ کہیں کاملؔ تم اپنی حقیقت کو

غزل

مرا سر اور تیرا آستاں ہے
تو پھر میرا امکاں بھی لامکاں ہے

چکائے کون جھگڑے غیریت کے
تصور سے ترے فرصت کہاں ہے

یگانہ بھی کہیں بیگانہ ہوگا
یہ کیسا وہم ہے؟ کیسا گماں ہے

وہی ہم ہیں، وہی آہیں، وہی سوز
یہ کیسی آگ ہے؟ کیسا دھواں ہے

نہ پوچھو زندگی اہلِ وفا کی
زمیں بھی ان کے حق میں آسماں ہے

یہ پہلو تو نظر آتا ہے خالی
خدا جانے ہمارا دل کہاں ہے

کسی اک قوم کا ورثہ نہ سمجھو
متاعِ مشترک اردو زباں ہے

بھروسہ کیا ہے دو دن کی ہوا کا
وفائے دہر جھوٹی داستاں ہے

ہماری خوش خیالی کچھ نہ پوچھو
ہوا پر آج کل اپنا مکاں ہے

کوئی کاملؔ نہیں اپنا کہ دیکھے
جدھر دیکھو اُدھر سارا جہاں ہے

ڈاکٹر محمد علی اثر

سراج کا رنگِ تغزل

سراج اورنگ آبادی (۱۷۱۵ء - ۱۷۶۳ء) اس پر عظمت شعری اور ادبی روایات کے آخری علمبردار ہیں۔ جو کم و بیش تین صدیوں تک بیدر، گولکنڈہ اور بیجاپور کے دبستانوں میں نشوونما پا رہی تھیں۔ نظامی بیدری کے معاصرین لطفی اور مشتاق سے لے کر ولی اور سراج تک یہ ادبی روایت نئی منزلیں طے کرتی رہی۔ سراج کے بعد دکنی شاعری کے صحت مند رجحانات میں ضعف آتا گیا اور اس کی جگہ فارسی شاعری کی روایات نے لے لی۔

۱۷۰۰ء کے بعد شمالی ہند میں فارسی شاعری کے زیر اثر نئے خطوط پر اردو میں شعرگوئی کا آغاز ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے اردو شاعری میں بتدریج تصنع، تکلف، مبالغہ آرائی اور تخیل پرستی (IDEALISM) کا غلبہ ہونے لگتا ہے اور حقیقت پسندی (REALISM) یا واقعہ نگاری کے عناصر تقریباً مفقود ہو جاتے ہیں۔ ولی اور سراج سے قبل دبستانِ دکن کے معروف متغزلین میں فیروز، محمود، وجہی، محمد قلی، غواصی، عبداللہ قطب شاہ، نصرتی، ہاشمی، علی عادل شاہ شاہی، ہاشمی، حسن شوقی، شاہ سلطان وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔
سراج صحیح معنوں میں محمد قلی، غواصی، حسن شوقی اور ولی کے جانشین ہیں۔ وہ ولی کے بعد اردو غزل کے سب سے بڑے شاعر سمجھے جاتے ہیں۔ ان کی غزل کا نمایاں وصف سادگیٔ بیان، سوز و گداز اور تاثر کی فراوانی ہے۔
سراج کے کلام میں جو کیف، وارفتگی اور رعنائی نظر آتی ہے۔ وہ ایک طرف ان کے خلوص اور جذبے کی شدت کی دین معلوم ہوتی ہے تو دوسری طرف اس میں وہ اسلوبِ بیان بھی برابر کا شریک ہے۔ جو ہندوستانی اور ایرانی عناصر کے دلکش اور متوازن امتزاج کا نتیجہ ہے۔ فارسی زبان و ادب میں ماہرانہ قدرت اور قدیم دکنی شاعری کے بنیادی رجحانات سے وابستگی کی وجہ سے ان کی شاعری میں ایک رچی ہوئی کیفیت کا احساس ہوتا ہے۔
عشق سراج کی شاعری کا محور ہے جس کو

وہ خلاصۂ کائنات اور حاصلِ حیات سمجھتے ہیں جس طرح میرؔ کے والد بزرگوار نے انھیں "مذہبِ عشق" اختیار کرنے کی تلقین کی تھی۔ بالکل اسی طرح سراجؔ کے "استادِ مہرباں" نے ان سے کہا تھا کہ "علمِ عشق" سے بہتر کوئی علم نہیں ہے۔ میرؔ ہی کی طرح سراجؔ اس جہاں سے سرسری گذرنے کے قائل نہیں تھے۔ بلکہ ہر جا جہانِ دیگر دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ اس دنیا کی ہر شئے کو ایک عاشق کی نظر سے دیکھتے تھے۔

مذہب زاہداں سے برتر ہے
عاشق پاکباز کا مذہب

کیا ہے عشق کے ہادی نے مجھ کوں
محبت کی ہدایت سب نہایت

سراجؔ یہ مجھے استادِ مہرباں نے کہا
کہ علمِ عاشقی سے بہتر نہیں ہے کوئی علوم

عشق اور عقل میں ہوئی ہے شرط
جیت اور ہار کا تماشا ہے

سراجؔ کو عام طور پر صوفی شاعر کہا جاتا ہے اس میں شک نہیں کہ انہوں نے اپنی عمر کا بڑا حصہ صاحبِ دل صوفیوں کی خدمت میں بسر کیا تھا۔ وہ مزاجاً اور عملاً صوفی تھے۔ ان کے کلام میں روحانی تجربات کی حرارت بھی ملتی ہے لیکن ان کے ضخیم کلیات میں جو تقریباً تین ہزار پانچ سو اشعار پر مشتمل ہے۔ سو دو سو اشعار کو چھوڑ کر تصورِ عشق خالصتاً مادی اور مجازی ہے۔

سراجؔ کا تصورِ محبوب قدیم دکنی کے دیگر شعرا کی طرح ایک منفرد حیثیت کا مالک ہے۔ یہ محبوب محض خیالی اور روایتی نہیں ہے بلکہ اسی دنیا میں رہنے بسنے والا جیتا جاگتا انسان ہے ۔۔۔ سراجؔ نے اپنے محبوب کی جنس کو مبہم نہیں رکھا' بلکہ برملا انداز میں اس کے لئے صیغۂ تانیث کا استعمال کیا ہے۔ سراجؔ کے کلام کے مطالعے سے ایک ایسا محبوب سامنے آتا ہے جو تمام نسوانی محاسن کا مجسمہ اور جس کو انہوں نے پری' حور' موہن' من ہرن' جانِ سراج' گل بدن' پیو' جانی ناموں سے یاد کیا ہے۔ محبوب کو وہ براہِ راست مخاطب کرتے ہیں۔ اور دلکش پیرائے میں' اس سے اپنے قلبی واردات اور کیفیاتِ عشق کا اظہار کرتے ہیں۔[9]

اے جانِ سراج ایک غزل درد کی سن جا
مجموعۂ احوال ہے دیوان ہمارا

جان جاتی ہے اب تو آ جانی ...
ہجر کی آگ پہ چھڑک پانی

سنو تو خوب ہے ٹک کان دھر میرا سخن پیارے
کہ عاشق پہ نہ ہونا اس قدر بھی دل کٹھن پیارے

قدیم دکھنی کے دوسرے کلاسیکی شاعروں کے برعکس سراجؔ کے کلام کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ان کے ہاں داخلی جذبات کی ترجمانی اتم ملتی ہے جب کہ قدیم دکنی کے دوسرے شعرا کا

میلان زیادہ تر خارجیت کی طرف نظر آتا ہے۔
سراج کی غزلوں میں یہ داخلیت کہیں کہیں میرتقی میر کی طرح خود کلامی کی صورت اختیار کرلیتی ہے۔

تجھے کہتا ہوں اے دل عشق کا اظہار مت کیجو
خموشی کے مکاں میں بات اور گفتار مت کیجو

تجلی ہماری نین جھروکے میں بیٹھ کے
بیکل ہو جھانکتی ہے پیارا کب آئیگا

تڑپنا تلملانا غم میں جلنا خاک ہو جانا
یہی ہے افتخار اپنا یہی ہے اعتبار اپنا

سراج کی شاعری کا ایک اہم موضوع تصوف ہے۔ عشق میں ان کی از خود رفتگی مجاز اور حقیقت کی حدوں کو ایک کر دیتی ہے اور محبت کا دائرہ وسیع ہو کر کائنات کو اپنے اندر سمیٹ لیتا ہے۔

سراج ابھی بارہ برس ہی کے تھے کہ ان پر جذب و مستی کی کیفیت طاری ہو جایا کرتی تھی۔ بے خودی کے عالم میں وہ گھر سے نکل کھڑے ہوتے، رات دن صحرا نوردی کرتے اور اپنا زیادہ تر وقت حضرت برہان الدین غریبؒ کے آستانے پر گزارتے جذب و مستی کی کیفیت جب ان پر طاری ہوتی تو فارسی شعر بے ساختہ منہ سے جاری ہو جاتے۔ ان کا بیان ہے کہ "اگر ان اشعار تمام بہ تحریر آمد دیوانے ضخیم ترتیب می یافت"۔

سراج ۱۷۳۴ء میں ۱۹، ۲۰ سال کی عمر میں حضرت شاہ عبدالرحمن چشتی سے بیعت ہوئے اس زمانہ میں انہوں نے اردو میں شعر گوئی کا آغاز کیا تھا اور ۱۷۳۹ء کے بعد مرشد کے حکم کی تعمیل میں شاعری ترک کر دی۔

اردو شاعری میں تصوف کی روایت بہت عام ہے۔ متعدد شاعروں کے کلام میں تصوف کے مسائل کا تذکرہ مل جاتا ہے۔ اردو غزل گو شاعروں کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو سینکڑوں شاعر ایسے مل جاتے ہیں جنھیں عملاً تصوف سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اسی وجہ سے ان کے کلام میں تصوف کے مسائل خشکی پیدا کرنے والے مسائل بن جاتے ہیں۔ اس کے برخلاف سراج کے کلام میں روحانی کیفیات اپنے پورے حسن و جمال کے ساتھ نمایاں ہیں۔ انھوں نے تصوف کے مسائل کو عشقیہ لب و لہجہ میں سادہ، موثر اور دلنشیں انداز میں پیش کیا ہے۔ سراج کے ہاں فلسفہ و تصوف کے مسائل بھی ملتے ہیں اخلاق و حکمت کی باتیں بھی ہیں۔ دنیا کی ناپائیداری کا ذکر بھی ہے۔ پند و نصیحت بھی اور بلند اخلاقی معیاروں کو اپنانے کی تلقین بھی۔

چند شعر ملاحظہ ہوں :-

تو فنا ہوا گر بقا چاہے بے نیستی ہستی ہو تو دیکھ سکتی ہے
دو رنگی خوب نئیں یک رنگ ہو جا سراپا موم ہو یا سنگ ہو جا

شراب معرفت پی کر جو کوئی مجذوب ہوتا ہے
در و دیوار اس کوں مظہر محبوب ہوتا ہے

روشن ہے اسے سراج کہ فانی ہے سب جہاں
مطرب غلط ہے جام غلط انجمن غلط

راہ خدا پرستی اول ہے خود پرستی
ہستی میں نیستی ہے اور نیستی میں ہستی

سراج کے کلام میں جذبے کی شدت فکر کی گہرائی تاثر اور سوز و گداز کو دیکھ کر میر تقی میر جیسے نازک مزاج اور حساس شاعر کو کہنا پڑا کہ "سخن او خالی از مزہ نیست" بقول ڈاکٹر جمیل جالبی۔

"پوری اردو شاعری کے پس منظر میں سراج کی شاعری کو رکھ کر دیکھا جائے تو وہ اردو شاعری کے راستے پر ایک ایسی مرکزی جگہ کھڑے ہیں جہاں سے میر۔ درد۔ مصحفی۔ آتش مومن۔ غالب اور اقبال کی روایت کے راستے صاف نظر آ رہے ہیں۔ سراج نے اردو شاعری کے بنیادی راگ کو جگایا ہے۔ اس لئے ان کی آواز سارے بڑے شاعروں کی آواز، لے اور لہجے میں موجود ہے۔"

آخر میں سراج کے کلام سے چند ایسے اشعار نقل کئے جاتے ہیں جن کے خیال اور مضامین کو بعد کے شاعروں نے اپنے اپنے انداز میں دہرایا ہے۔ قدامت اور افضلیت بہرحال سراج ہی کو حاصل ہے۔

سراج

ہوئی جوش محبت میں زباں بند
صنم کا درمیاں جب نام آیا

میر

ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا
دل ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

سراج

ہرگز نہ سناؤ اسے زنجیر کی آواز
کہیں ایسا نہ ہو کہ پھر غش ہو

میر

سرہانے میر کے آہستہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

سراج

ہم فقیروں پہ ستم جیتے رہو
خوب کرتے ہو بجا کرتے ہو تم

میر

ہم فقیروں سے بے ادائی کیا
آن بیٹھے جو تم نے پیار کیا

غالب

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

سراج

ہمیشہ دور عالم مختلف ہے
کہ گردش میں ہے ہر دم نیلگوں طاس

سراج

جس کوں راہ چشم میں خون جگر جاری نہیں
یوں ہوا معلوم اس کوں زخم غم کاری نہیں

سراج

مت کرو شمع کو بدنام جلاتی وہ نہیں
آپ سیں شوق پتنگوں کو ہے جل جانے کا

غالب

رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکے تو پھر لہو کیا ہے

ذوق

شمع نے آگ رکھی سر پہ قسم کھانے کو
بخدا میں نے جلایا نہیں پروانے کو

غزل

پرنس سعادت جاہ

گلوں سے شرارے شراروں سے شعلے ۔ فلک پر فروزاں ستاروں سے شعلے
حقیقت کے ہم پہ کھلے جب دریچے ۔ بھڑکنے لگے ہیں نظاروں سے شعلے
میں تنگ آگیا ہوں غم زندگی سے ۔ خزاؤں سے دہشت بہاروں سے شعلے
کبھی اُن کے آگے چمکنے نہ پائے ۔ بجھے سے رہے ماہ پاروں سے شعلے
تمنا نے ہے آگ ایسی لگائی ۔ کہ شعلے بنے دل فگاروں سے شعلے
نہ پوچھو وہ کیا تھی نظر آزمائی ۔ تڑپتے کنایے اشاروں سے شعلے
اگر لغزشوں نے قیامت اٹھائی ۔ نکالے نہ یاں ہیں سہاروں سے شعلے
مرے دامنِ دل کا اللہ حافظ ۔ لپکنے لگے ہیں کناروں سے شعلے

سعادت مری آتشِ شوق دیکھو
نکلتے تو ہیں شعلہ زاروں سے شعلے

بھگت جی کی درگت

ہری شنکر پرسائی
ترجمہ
گرجا شنکر شرما
ریڈر ہندی
نظام کالج

اس دن جب بھگت جی کی موت ہوئی تھی تب ہم سب نے کہا تھا کہ بھگت جی جنت کو سدھارے پر ابھی مجھے معلوم ہوا کہ بھگت جی کو جہنم میں ڈال دیا گیا۔ اگر یہ بات میں کسی سے کہوں تو کوئی اعتبار نہیں کرے گا لیکن یہ حقیقت ہے کہ انھیں دوزخ میں ڈال دیا گیا ہے اور ان پر ایسے سنگین گناہوں کے ارتکاب کا الزام لگایا گیا ہے کہ ان کے جہنم سے جلدی چھوٹنے کی کوئی امید نہیں۔ ہم ان کی آتما کی شانتی کے لئے چاہے کتنی بھی دعائیں کریں کچھ نہیں ہوگا۔ بڑے سے بڑا تعزیتی جلسہ بھی انھیں دوزخ سے نہیں نکال سکتا۔

سارا محلہ ابھی تک یاد کرتا ہے کہ بھگت جی مندر میں آدھی رات تک بھجن کرتے تھے۔ ہر دوسرے دن وہ کسی صاحب حیثیت عقیدت مند سے مندر میں لاوڈ اسپیکر لگوا دیتے اور پھر اپنی منڈلی کے ساتھ بھجن کیرتن میں لگ جاتے تہواروں پر تو چوبیس گھنٹے لاوڈ اسپیکر پر اکھنڈ کیرتن ہوتا۔ ایک دو مرتبہ محلے والوں نے اس اکھنڈ غل غپاڑے کی مخالفت کی تو بھگت جی بھگتوں کا مجمع کرکے دنگا فساد کرنے پر اتر آئے۔ وہ بھگوان کے لاوڈ اسپیکر کے لئے جان دینے اور جان لینے پر تل گئے تھے۔

بھگوان کے ایسے زبردست بھگت نے اربوں بار بھگوان کے نام کی مالا جپی تھی دوزخ میں بھیجے گئے اور اجامل جس نے ایک بار بھول سے بھگوان کا نام لے لیا تھا اب بھی جنت کے مزے لوٹ رہا ہے! اندھیر کہاں نہیں ہے!

غرض بھگت جی بڑے اعتماد سے اس دنیا میں پہونچے بہت دیر تک یہاں وہاں گھوم کر دیکھتے رہے پھر ایک پھاٹک پر پہونچ کر چوکیدار سے پوچھا۔

"جنت میں داخل ہونے کا دروازہ یہی ہے نا؟"

چوکیدار نے کہا۔ "ہاں یہی ہے"

وہ اندر داخل ہونے لگے تو چوکیدار نے روکا۔

"پہلے اندر جانے کا ٹکٹ بتلائیے"

بھگت جی کو غصہ آگیا۔ بولے۔ "مجھے بھی ٹکٹ لینا پڑے گا یہاں؟ میں نے آج تک کبھی ٹکٹ نہیں لیا۔ سینما بھی بنا ٹکٹ دیکھتا تھا اور ٹرین میں ٹکٹ کے بغیر سفر کرتا تھا کسی نے مجھ سے ٹکٹ نہیں مانگا۔ اب یہاں جنت میں ٹکٹ مانگتے ہو؟ مجھے جانتے ہو! میں بھگت جی ہوں۔

چوکیدار نے نہایت سکون سے کہا "ہونگے!

پر میں بنا ٹکٹ کے نہیں جانے دوں گا آپ پہلے اُس دفتر میں جایئے وہاں آپ کی نیکی بدی کا حساب ہوگا تب آپ کو ٹکٹ ملے گا۔

بھگت جی نے اُسے دھکیل کر آگے بڑھنے کی کوشش کی تو چوکیدار نے انھیں نہایت آسانی کے ساتھ اٹھاکر دفتر کی سیڑھی پر کھڑا کر دیا۔

بھگت جی دفتر میں پہونچے وہاں کوئی بڑا دیوتا فائلیں لئے بیٹھا تھا۔ بھگت جی نے انھیں دیکھ کر ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا "آہا! میں پہچان گیا بھگوان کارتیکے ہیں۔" فائل سے سر اٹھا کر اس نے کہا "میں کارتیکے نہیں ہوں۔ جھوٹی چاپلوسی مت کرو۔ جیون بھر وہاں تو بُرے کام کرتے رہے اب یہاں آکر "ہیں ہیں" کرتے ہو! نام بتاؤ؟

بھگت جی نے نام پتہ بتایا۔

اس افسر نے کہا "تمھارا معاملہ بڑا پیچیدہ ہے ہم ابھی تک طے نہیں کر پائے ہیں کہ تمھیں جنت دی جائے یا جہنم رسید کیا جائے! تمھارا فیصلہ خود بھگوان کریں گے۔"

بھگت جی نے کہا "میرا معاملہ تو بالکل سیدھا ہے۔ میں سولہ آنے مذہبی آدمی ہوں۔ باقاعدہ روز بھگوان کا بھجن کرتا رہا ہوں۔ کبھی جھوٹ نہیں بولا نہ کبھی چوری کی۔ مندر میں اتنی عورتیں آتی تھیں مگر میں سب کو ماں سمجھتا تھا۔ میں نے کبھی کوئی پاپ نہیں کیا ہے تو آنکھیں بند کر کے آپ جنت میں بھیج سکتے ہیں۔"

افسر نے کہا۔" بھگت جی آپ کا معاملہ اتنا سیدھا نہیں ہے جتنا آپ سمجھ رہے ہیں۔ پرماتما خود اس میں دلچسپی لے رہے ہیں۔ آپ کو میں ان کے سامنے حاضر کئے دیتا ہوں۔"

ایک چپراسی بھگت جی کو بھگوان کے دربار میں لے چلا۔ بھگت جی نے راستے ہی سے مالا جپنی شروع کر دی جب وہ بھگوان کے سامنے پہونچے تو اونچی آواز میں بھجن کرنے لگے۔ بھجن پورا کر کے انتہائی عاجزی سے عرض کرنے لگے۔

"اہا جنم جنم کی دلی تمنا آج پوری ہوئی پربھو! آپ کا روپ بے مثال ہے۔ آپ کے جتنے فوٹو دنیا میں چل رہے ہیں ان میں سے کسی سے نہیں ملتا۔"

بھگوان ان کے بھجن کیرتن سے بور ہو رہے تھے بیزاری سے کہنے لگے۔" اچھا اچھا ٹھیک ہے اب کیا چاہتے ہو بولو؟ ۔۔"

بھگت جی نے گزارش کی۔" بھگوان آپ سے کیا چھپا ہوا ہے؟ آپ تو سب کی دلی تمنائیں جانتے ہیں۔ کہتے ہیں ۔۔

رام جھروکے بیٹھ کے سب کا مجرا لے
جاکی جیسی چاکری تا کو تیسا دے

پربھو! مجھے جنت میں کوئی اچھی سی جگہ دلا دیجئے۔"

پربھو نے کہا۔" تم نے ایسا کیا کیا ہے۔ جو تمھیں جنت ملے

بھگت جی کو اس سوال سے گہری چوٹ لگی جس کے لئے اتنا کیا وہی پوچھتا ہے کہ تم نے ایسا کیا کیا!

بھگوان پر ناراض ہونے سے کوئی فائدہ نہیں۔ یہ سوچ کر بھگت جی غصہ پی گئے اور عاجزی سے کہنے لگے " میں روز آپ کا بھجن کرتا رہا "

بھگوان نے پوچھا " لیکن لاؤڈ اسپیکر کیوں لگاتے تھے ؟ "

بھگت نے لجاجت سے " وہاں سبھی لاؤڈ اسپیکر لگاتے ہیں۔ سینما والے، مٹھائی والے، کاہل بیچنے والے سبھی اسے استعمال کرتے ہیں تو میں نے بھی کر لیا۔ "

بھگوان نے کہا۔ وہ تو اپنی چیزوں کو مقبول بنانے کیلئے یوں اڈورٹائز کرتے پھرتے ہیں تم کیا مجھے اڈورٹائز کرتے تھے ؟ کیا میں کوئی بکاؤ مال ہوں ؟ "

بھگت جی سناٹے میں آگئے سوچا بھگوان ہو کر کیسی باتیں کرتے ہیں۔

بھگوان نے پوچھا " تم مانتے ہو نا کہ میں دلوں کا حال تک جانتا ہوں ؟ "

بھگت جی بولے " جی ہاں "

پھر مجھے سنانے کے لئے لاؤڈ اسپیکر کیوں لگاتے تھے ؟ میں کیا بہرا ہوں ؟ یہاں سب دیوتا میری ہنسی اڑاتے ہیں میری پتنی تک مذاق کرتی ہے کہ یہ بھگت تمھیں بہرا سمجھتا ہے "

بھگت جی جواب نہ دے سکے۔

بھگوان کو اور غصہ آیا۔ کہنے لگے۔ تم نے کئی سال تک سارے محلے کو تنگ کیا ہے۔ تمھارے روغل سے وہ نہ کام کر سکتے تھے۔ نہ چین سے بیٹھ سکتے تھے اور نہ سو سکتے تھے ان میں سے آدھے تو مجھ سے نفرت کرنے لگے ہیں، سوچتے ہیں اگر بھگوان نہ ہوتا تو بھگت اتنا ہلہ نہ مچاتا تم نے مجھے کتنا بدنام کیا ہے "

بھگت نے ہمت کر کے کہا " بھگوان! آپ کا نام لوگوں کے کانوں میں پڑتا تھا یہ تو ان کے لئے اچھا ہی تھا انھیں مفت میں ثواب مل جاتا تھا۔

بھگوان کو بھگت کے بھولے پن پر ترس آگیا۔ بولے " پتا نہیں یہ روایت کب سے پڑ گئی کہ بھگت کا بیوقوف ہونا ضروری ہے اور کس نے تم سے کہا کہ میں چاپلوسی پسند کرتا ہوں کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ تم میری تعریف کرو گے تو میں کسی بیوقوف افسر کی طرح خوش ہو جاؤں گا ؟ میں اتنا بیوقوف نہیں ہوں بھگت جی کہ تم جیسے مدھووں کی باتوں میں آجاؤں میں چاپلوسی سے خوش نہیں ہوتا عمل دیکھتا ہوں۔

بھگت جی نے کہا " بھگوان میں نے کبھی کوئی برا کام نہیں کیا۔ "

بھگوان کو ہنسی آگئی۔ بولے " تم نے آدمیوں کو قتل کیا ہے۔ ادھر کی عدالت سے بچ گئے پر یہاں نہیں بچ سکتے۔

بھگت جی کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ وہ اپنے بھگوان کی نیت پر شک کرنے لگے۔ سوچا، یہ بھگوان ہو کر جھوٹ بولتا ہے۔ ذرا طیش میں آکر بولے۔ آپ کو جھوٹ بولنا زیب نہیں دیتا۔ میں نے کسی آدمی کی جان نہیں لی۔ ابھی تک میں خاموش رہا۔

مگر اس جھوٹے الزام کو برداشت نہیں کرسکتا۔ آپ ثابت کیجئے، کہ میں نے قتل کروائے ہیں ! ۔"

بھگوان نے کہا ۔" میں پھر کہتا ہوں کہ تم قاتل ہو ابھی ثبوت دیتا ہوں ۔"

پھر ایک ادھیڑ عمر کے آدمی کو بلاکر بھگوان نے بھگت سے پوچھا ۔ اسے پہچانتے ہو؟

" ہاں ۔ یہ میرے محلے کا رما ناتھ ماسٹر ہے پچھلے سال بیماری سے مرا تھا ۔ بھگت نے اعتماد سے کہا ۔

بھگوان بولے ۔" بیماری سے نہیں تمہارے بھجن سے مرا ہے ۔ تمہارے لاؤڈ اسپیکر نے اسے مارا ہے رما ناتھ ! تمہاری موت کیوں ہوئی ؟ ۔"

رما ناتھ نے کہا ۔" پربھو ، میں بیمار تھا ڈاکٹر نے کہا تھیں پوری طرح نیند اور آرام ملنا چاہیئے مگر میں بھگت جی کے لاؤڈ اسپیکر پر اکھنڈ کیرتن کی بنا پر نہ سو سکا نہ آرام کرسکا دوسرے دن میری حالت بگڑ گئی اور چوتھے دن میں مرگیا ۔

بھگت سن کر گھبرا گیا ۔

اتنے میں ایک بیس اکیس سال کا لڑکا بلایا گیا ۔ اس سے پوچھا گیا ۔

" سریندر تم کیسے مرے ؟ ۔"

" میں نے خودکشی کی تھی ۔" اس نے جواب دیا ۔

" خودکشی کیوں کی ؟ بھگوان نے پوچھا ۔

" سریندر نے کہا ۔ میں امتحان میں فیل ہوگیا تھا ۔"

" امتحان میں فیل کیوں ہوگئے ؟ "

" بھگت جی کے لاؤڈ اسپیکر کی وجہ سے میں پڑھ نہیں سکا ۔ میرا گھر مندر کے پاس ہی تھا ۔"

بھگت جی کو یاد آگیا کہ اس لڑکے نے درخواست کی تھی کہ کم سے کم امتحان کے دنوں میں لاؤڈ اسپیکر نہ لگائے ۔

بھگوان نے انتہائی ناراضگی سے کہا ۔" تمہارے پاپوں کو دیکھتے ہوئے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ تمھیں جہنم میں ڈال دیا جائے ۔

بھگت جی نے بھاگنے کی کوشش کی لیکن جہنم کے بھیانک داروغہ نے انھیں پکڑ لیا اپنے بھگت جی جنھیں ہم دھرماتما سمجھ رہے تھے آخر دوزخ میں ڈال دیئے گئے ۔

(ہندی سے ترجمہ)

عرب شاہ خالد گیلری

قطعہ

ہم چاکِ گریبانِ تمنا نہیں سیتے
اوروں کی توجہ کے سہارے نہیں جیتے
ساقی تیرے میخانے میں آئے تو ہیں لیکن
ہم بادۂ الفت کے سوا کچھ نہیں پیتے

غزلیں

حضرت علامہ نجمؔ آفندی مرحوم

صلوٰۃ و صوم کو اسبابِ سرکشی نہ بنا
خدا کے نام کو سرمایۂ خودی نہ بنا

تجھے مکارمِ اخلاقِ آدمی کی قسم
کسی حقیر تمنّا کو زندگی نہ بنا

میں اپنے زعمِ بلندی میں مٹ گیا لیکن
کبھی نشانۂ احساسِ کمتری نہ بنا

عمل سے پہلے عطا کر خیال کو قوّت
خیال کچا ہی رہا، جو بگڑا وہ پھر کبھی نہ بنا

بڑی نوازشِ فطرت ہے روحِ زندہ دلی
اسے تمسخرِ دربارِ خسروی نہ بنا

دکھائے کون خدا کو یہ عہدِ خونخواری
کسی نے خوب کہا تھا کہ آدمی نہ بنا

ہر ایک در پہ نہ جا نجمؔ داد کی خاطر
کمالِ شعر و سخن کو گداگری نہ بنا

دلی جذبات کے برعکس یہ صورت گری کب تک
بنامِ زندگی آخر فریبِ زندگی کب تک

رہے گا نامکمل یہ نظامِ دلبری کب تک
خدایا! تیری دنیا میں محبت اجنبی کب تک

کسی دن یہ پہیلی بوجھنی ہے حضرتِ دل سے
پرائی عقل میں اور اپنی دولت میں کمی کب تک

فقیر اللہ کے سمجھے ہوئے تھے اس حقیقت کو
سرِ انساں پہ ٹھہرے گی کلاہِ خسروی کب تک

عمل کی راہ سے بھی ربط ہے کچھ عزمِ محکم کو
خیال و خواب کے ماحول میں آوارگی کب تک

کبھی تو ایک سجدہ اس کا ہنستے کھیلتے کر لیں
خدا کی راہ میں یہ بندگی بے چارگی کب تک

بہت میکش جہاں دو گھونٹ میں آپے سے باہر تھے
کسے معلوم ہے ہم نے وہاں آنکھوں سے پی کب تک

سرِ منبر نظر تھی دل تھا سجدہ میں محبت کے
نخوت سے بچاتا جان اپنی آدمی کب تک

فرشتہ ہوں کوئی جو درد سمجھوں گا نہ دشمن کا
بھلا انساں سے انساں کی بیگانگی کب تک

کبھی یہ سوچتا ہوں نجمؔ میرے اشعار پر اپنے
چڑھیں گے ان کی نظروں پر یہ آیاتِ جلی کب تک

سید خواجہ معین الدین ایم۔ اے۔ بی ایڈ

ڈاکٹر سیموئل جانسن کے چند عجوبے

سیموئل جانسن آج سے لگ بھگ کوئی تین سو برس پہلے انگلستان کے ایک گاؤں لیچ فیلڈ میں پیدا ہوا۔ لندن سے تھوڑے فاصلے پر آج بھی خواص و عوام کی زیارت گاہ بنا ہوا ہے۔ اس کا گھر قومی یادگار کے طور پر محفوظ رکھا گیا ہے۔ جہاں دور دور سے لوگ آتے ہیں اور انگریزی زبان کے ہر شہرۂ آفاق ادیب، شاعر اور فلسفی کو خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔ یہ وہی جانسن ہے جسکو آکسفورڈ یونیورسٹی نے اس کی ناداری کی بنا پر اپنے ہاں داخلہ دینے میں تامل کیا تھا، کیمبرج یونیورسٹی نے ایم اے کی ڈگری دینے سے انکار کیا تھا۔ ڈبلن یونیورسٹی نے بھی انگلستان کے مشہور شاعر پوپ کی سفارش کے باوجود اعزاز دینے سے گریز کیا تھا۔ مگر بعد میں ان ہی یونیورسٹیوں نے ان کی ادبی خدمت کے عوض ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگریاں پیش کرنے میں فخر محسوس کیا۔

اس نے لندن پر ایک لمبی نظم لکھی تھی جو آج بھی انگریزی ادب کا درخشاں نگینہ مانی جاتی ہے۔ وہ مشہور صحافی بھی تھا۔ وہ راتوں میں ایک ٹمٹماتے چراغ کی روشنی میں بیٹھ کر خون پسینہ ایک کرکے "ریمبلر اور جنٹلمین" اخبار کے صفحات پر اپنے جگر کے ٹکڑے جوڑتا تھا وہ ایک آنکھ کا معذور تھا اور دوسری آنکھ کے آشوب کے باوجود رات دن ایک کرکے آٹھ سال کے عرصے میں انگریزی زبان کی سب سے پہلی اور جامع لغت ترتیب دی۔ یہ کام کوئی دیو ہی کرسکتا تھا مگر اس نے اللہ کے بھروسے پر اور اپنی محنت کے بل بوتے پر کر دکھایا۔ وہ غریب تھا مگر محنتی تھا۔ اس نے ادب کی خدمت کے لئے بڑی بڑی مصیبتیں جھیلیں، کئی دن کے فاقے کئے، لندن کی گلی کوچوں کی خاک چھانی۔ کئی بڑے لارڈ اور امیر الامراء کی ڈیوڑھیوں پہ حاضری دی تاکہ اس کا ایک آدھ ادبی کارنامہ چھپ کر منظر عام پر آجائے تو اسے کچھ سہارا ملے مگر اسے ہر جگہ ناکامی ہوئی۔ پھر بھی اس نے ہمت نہ ہاری اور ادب کی خدمت کے لئے اپنے آپ کو وقف کردیا۔ دنیا نے بعد میں اسے سر آنکھوں پہ بٹھایا۔ اور "ویسٹ منسٹر ایبی" میں اس کی آخری خوابگاہ کے لئے جگہ دی۔

جانسن انگریزی زبان کا بہت بڑا ادیب تھا وہ غریب تھا لیکن اس نے فقیری میں شاہی کی۔ اس کا دربار شاہانہ تھا۔ صبح سویرے ہی گھر کا دروازہ کھلتا، دربار عام شروع ہوجاتا۔ اپنے کمرے میں ادب کا شہنشاہ بیٹھا ہوا ہے تقریباً نیم برہنہ، یا ابھی بستر پہ ہی پڑا ہوا ہے، اِدھر چائے کا دور چل رہا ہے۔ اُدھر اس کی زبان

چل رہی ہے۔ وہ بلا نوش چائے کی پیالیوں پر پیالیاں اتارتا جا رہا ہے۔ اور ہر مسئلے پر سیر حاصل بحث کئے جا رہا ہے۔ شاعر آیا تو اس سے نپٹ لیا۔ ادیب آیا تو اس سے اس کی بات کی۔ فلسفی آیا تو اسے حیران کر دیا۔ ناشر آیا تو اسے مطمئن کر دیا۔ ایڈیٹر آیا تو اسے مطمئن کر دیا۔ غرض اس کے دربار میں جو بھی آیا گوہر مراد پایا۔ صبح سے شام تک گھر پر لوگوں کا میلہ لگا رہتا تھا۔ بڑے سے بڑا آدمی اس کے در کی حاضری کو اپنے لئے فخر سمجھتا تھا۔

بڑے لوگوں کی پسند یا تیں بھی عجیب ہوتی ہیں۔ جو عجوبے سے کم نہیں ہوتی ان سے عجیب و غریب حرکتیں سرزد ہوتی ہیں۔ جن پر انھیں خود بھی کوئی قابو نہیں ہوتا وہ بے وقت اور بے ہنگم ہوتی ہیں۔ جانسن ان سے مستثنیٰ نہیں تھا۔ وہ گردن کو کچھ عجیب طریقے سے گھماتا تھا۔ اس کے جسم کے بے عمل جھٹکوں کو دیکھ کر لوگ خواہ مخواہ اس کی طرف ہو جاتے اور ہنسنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ ان ہی حرکتوں کی بنا پر وہ جہاں جاتا ایک تماشہ بن جاتا تھا۔

سڑک پر جب وہ چلتا تو کبھی کبھی جوں کی طرح آہستہ آہستہ چلتا پھر ساتھ ہی تیز گام ہو جاتا تھا جیسے کوئی پریشانی کی خبر سن کر بے تحاشہ دوڑتا ہے۔ دیکھنے والے حیران ہو جاتے کہ چہل قدمی کرنے والا ایک دم تیز گام کیوں ہو گیا۔ لوگ سبب پوچھنے اس کے پیچھے دوڑتے تو سبب بتائے بغیر پھر آہستہ چلنے لگتا کبھی سانپ کی طرح بل کھا کر چلتا تو کبھی شتر مرغ کی طرح لمبے لمبے قدم ڈال کر آگے نکل جاتا تھا کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ وہ سڑک کے کنارے کسی درخت یا بجلی کے کھمبے پر اوپر ہی اوپر چڑھ جاتا اور پھسل کر زمین پر آ رہتا۔ کبھی تو بجلی کے کھمبوں کو گنتا ہوا چلتا، درمیان میں کوئی کھمبا چھوٹ جاتا تو لوٹ کر پھر سے گنتی شروع کرتا ایک دن بڑے مزے کی بات ہوئی وہ اپنے ایک دوست کے ساتھ قریب کی پہاڑی پر چڑھا، چوٹی پر پہنچ کر اس نے کہا۔ لڑھکنے کو جی چاہتا ہے۔ یہ کہتے ہوئے اپنی جیبیں خالی کیں۔ اور چٹان پر لیٹ کر اس زور سے پلٹا کھایا کہ لڑھکتے لڑھکتے پہاڑی کے دامن میں پہنچ گیا۔

ایک دن ایک خاتون نے اسے دوپہر کے کھانے پر بلایا۔ وہ وہاں پہنچ کر دیکھا کہ گھر کی بڑی پھاٹک بند ہے اور چھوٹی پھاٹک کھلی ہے کچھ دیر ٹھہر کر اس نے بڑی پھاٹک پر چڑھنا شروع کیا۔ خاتون نے گھبرا کر پکارا "چھوٹی پھاٹک کھلی ہے۔" تو پکار کر جواب دیا "مجھے معلوم ہے کہ بڑی پھاٹک بند ہے تو چھوٹی پھاٹک سے لوگوں کو اندر آنا چاہیئے۔ میں نے بچپن میں ایسی کئی پھاٹکیں چڑھی ہیں۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ آج بھی مجھے پھاٹک چڑھنا آتا ہے یا نہیں"

جانسن کے جسم پر ایک لمبا کوٹ رہتا تھا۔ اس میں کئی جیبیں لگے ہوتے تھے۔ کسی میں کنجیاں، چاقو، قلم، پنسل، ڈوریاں، موسمی کے چھلکے اور کسی میں چھوٹی موٹی کتابیں بھری رہتیں۔ ان تمام چیزوں کے ساتھ جب وہ چلتا تو سڑک پر ایک مسخرا جیسا دکھائی دیتا۔

ایک دن کسی اخبار والے نے ایک سرخی چھاپ دی۔ جانسن ناچ سیکھ رہا ہے۔ یہ دیکھ کر اس نے کہا اس میں بڑی بات کیا ہے۔ سقراط نے بھی آخری عمر میں ناچ سیکھا تھا۔ اخبار نویس کو یوں لکھنا چاہئے تھا کہ ایک ہاتھی رسی پر ناچ رہا ہے۔

وہ بڑا بلا خور اور پیٹو تھا۔ کھانے پر آتا تو پلیٹ کے پلیٹ چٹ کر جاتا اور ڈکار نہ لیتا۔ چنانچہ جب وہ باسول کے ساتھ ہاروچ جا رہا تھا تو اسے خوب بھوک لگی۔ وہ دونوں ایک ہوٹل میں گئے۔ اس نے بڑے بڑے نوالے بنا کر پلیٹ کے پلیٹ اتار دے۔ منہ سے لوہار کے بھتے کے جیسی آواز نکل رہی ہے۔ زبان قینچی کی طرح چل رہی ہے۔ اور دانت مشین کی طرح ہیں دل فکر میں پڑ گیا تو کہا۔ تم میری فکر نہ کرو۔ مجھے ہر چیز کا اندازہ ہے اور جو کرتا ہوں سوچ سمجھ کر کرتا ہوں۔"

ایک دن بگھی میں بیٹھے ہوئے مسافروں میں کیتھولک فرقے کے بارے میں بحث چھڑ گئی۔ جانسن بھی انہیں مسافروں میں تھا اور اپنی عادت کے مطابق درمیان میں شوشے چھوڑنے لگا۔ تمام مسافر مشتعل ہوئے اور اسے مارنے تیار ہوئے۔ اس نے اس وقت اپنی جیب سے ایک کتاب نکالی اور انجان بن کر مطالعہ میں لگ گیا۔

ایک ہوٹل میں کھانے کی میز پر ایک آئرستانی بھی تھا۔ وہ کالا تھا۔ تو اس سے جانسن نے پوچھا تمہارے لوگوں کو کالے بچے کیوں پیدا ہوتے ہیں؟ آئرستانی سٹپٹا یا کہ جان نہ پہچان خالہ اماں سلام" پھر ایسی گفتگو کا موقع ہی کیا تھا۔ یہ نکی گفتگو جو چلی تو آئرستانی اس پر بہت برہم ہوا۔ جانسن اپنی جگہ سے اٹھا اور اپنے کسی دوست سے مصروف گفتگو ہو گیا۔ جیسے کچھ جانتا ہی نہیں۔ جب وہ جزیرہ اسکائی پر پہنچا تو انگلستان کے جلاوطن بادشاہ کے سونے کی جگہ پر پہنچ کر خود بھی تھوڑی دیر کے لئے اس جگہ لیٹ گیا ایک کھنڈر سے دوڑتا ہوا نکل آیا اور کہا کہ میں نے وہاں شیطان دیکھا ہے۔

جزیرہ اسکائی پر رہبر نے کہا کہ فلاں جگہ پرانے انسانوں کی ہڈیاں محفوظ ہیں تو وہاں چلنے سے صاف انکار کر دیا۔

کسی گاؤں میں اس کو پڑھنے کے لئے ایک دو کتابیں نہ ملتیں تو وہاں کے لوگوں کو بیذوق کہہ دیتا۔ اگر معلوم ہو جاتا کہ فلاں جگہ پرانی اور نئی کتابیں ہیں تو فوراً چلنے آمادہ ہو جاتا۔

ساحل احمد
الہ آباد

ریاضِ سخن

"ریاضِ سخن" ماہ اکتوبر سنہ ۱۸۹۶ء میں مارہرہ سے جاری ہوا تھا۔ اس کے مرتبین میں احسن مارہروی اور آزاد مارہروی جیسے مشہور و معروف شعراء کے نام شامل ہیں۔ ارشاد علی خاں کے زیرِ اہتمام مرقع عالم پریس ہردوئی میں اس کی طباعت کا اہتمام کیا گیا تھا نفیس کتابت و طباعت کی وجہ سے اس نے تھوڑے ہی عرصہ میں ملک کے نامور شعرا اور ادب نوازوں کو اپنی جانب ملتفت کر لیا تھا اس گلدستہ کی کتابت کی ذمہ داری مجید حسین جلال آبادی نے قبول فرمائی گلدستے کو بھیکم پور (علی گڑھ) کے نواب محمد عبدالجلیل خاں صاحب اثر کی سرپرستی حاصل تھی۔

رسالہ معنوی اور صوری دونوں لحاظ سے مقبولِ خواص و عام تھا۔ ٹائیٹل رنگین اور جدول کے درمیان ریاضِ سخن خطِ گل میں لکھا جاتا تھا اور درج ذیل شعر سے ٹائیٹل کو آراستہ کیا جاتا تھا۔

پھولے ہیں اب تو مردمِ دیدہ چمن کے پھول
آنکھوں سے چن رہے ہیں ریاضِ سخن کے پھول

ٹائیٹل کے صفحہ پیشانی پر یہ جملہ لکھا ہے۔ جن حضرات کے ذمہ قیمت باقی ہے وہ قیمت نکال رکھیں پرچہ دیلو آئے گا" ٹائیٹل ہی کے صفحہ ۲ پر رسید زر اور شکریہ ادا کیا گیا ہے ۳۵ حضرات کے نام ملتے ہیں جن میں ۶ ہندو اور بقیہ مسلمان ہیں ٹائیٹل کے صفحہ ۳ پر روہیلکھنڈ گزٹ اور سید محمد عبداللہ علم جنرل مرچنٹ کانپور کے اشتہارات ہیں۔ پہلا اشتہار جو کانپور کا ہے اس میں ٹرکی اور یونان کی جنگ سے متعلق ایک ناول شروع کرنے کا ارادہ ظاہر کیا گیا ہے ایک اخبار کے ذریعہ جس کی سالانہ قیمت ایک روپیہ رکھی گئی ہے۔ اس کے لئے ۱۰۰ سو خریداروں کی فراہمی کے لئے اشتہار دیا گیا ہے اور ایک جز میں ناول کی قسط شائع کرنے کی خبر دی گئی ہے

دوسرا اشتہار "رضیہ اور مسعود" نام کے ناول کا ہے جس میں علی گڑھ کی زندگی اور ماحول کو موضوع بنایا گیا ہے قیمت چار آنے رکھی گئی ہے۔ ٹائیٹل کے آخری صفحہ پر سنہ

کے اغراض و مقاصد اور اصول درج کئے گئے ہیں جن کا خلاصہ یوں ہے کہ یہ گلدستہ جس کے ۱۶ صفحوں میں نظم اور ۸ صفحوں میں نثری تحریر شامل ہے۔ ہر انگریزی مہینے کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے عام خریداروں سے ۱۸؁ (ایک روپیہ آٹھ آنے قیمت سالانہ پیشگی معہ محصول ڈاک اور گورنمنٹ والیان ملک و ریاست اور روساسے بہ حیثیت قدردانی کا اصول مقرر ہے۔

اس گلدستہ کے دو ضمیمے اور ہیں ایک کلیات فارسی مصنفہ سید شاہ عالم قدس سرہ سجادہ نشیں درگاہ مارہرہ۔ جس کے چار صفحے گلدستے کے ساتھ شائع ہوتے ہیں۔ اس کی علٰحدہ قیمت ۱۲ آنے سال مقرر ہے اور معہ گلدستہ کے ۲ روپے اسی گلدستے کے ساتھ ۱۶ صفحہ پر مشتمل ایک ناول "نورعلیٰ نور" کی قسط بھی شامل اشاعت ہے یہ ناول نومبر ۱۸۹۶ء سے شروع کیا گیا ہے جس کی علٰحدہ قیمت ایک روپیہ چار آنہ معہ محصول ڈاک مقرر کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ جو حضرات گلدستہ معہ کلیات و ناول ایک ساتھ خرید فرمائیں گے ان سے ۳ روپیہ سالانہ قیمت معہ محصول ڈاک لینے کا اختیار رہے گا۔ دس خریدار بنانے والے خریدار کو ایک سال گلدستہ معہ کلیات و ناول مفت دینے کا اعلان کیا گیا ہے۔

اشاعت کلام میں خریدار او رغیر خریدار کی کوئی قید نہیں تھی۔ غیر طرحی کلام کی اشاعت بہ شرط گنجائش رکھی گئی تھی جس کے لئے ایک آنہ فی شعر کے حساب سے اجرت مقرر تھی اشتہار کے سلسلے میں دو آنہ فی سطر کی اجرت ایک بار کے لئے مقرر مقرر تھی اس سے زائد اشاعت کے لئے معاملات بہ ذریعہ خط و کتابت طے کرنا تجویز ہوا تھا۔ جواب کے لئے جوابی کارڈ یا ٹکٹ کی قید تھی۔ تمام قسم کی خط کتابت اور ترسیل زر کے لئے احسن مارہروی کو مجاز کیا گیا تھا۔

جلد ۱ شمارہ نمبر ۸ بابت ماہ مئی ۱۸۹۷ء کے صفحہ ۱ سے ۱۶ صفحہ تک طرحی غزلیں شائع کی گئی ہیں اور ایک جزو "نور علی نور" کا شامل ہے جس پر ۷۳ سے ۸۰ صفحہ تک کی نمبرنگ کی گئی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اب تک ۷۲ صفحہ یعنی ۹ جزو (فارم) شائع ہو چکے ہیں اس میں کلیات شامل نہیں ہے۔ قبل کے شماروں میں سید افتخار عالم آزاد مارہروی کے مقالے ملا معظہ کی اقساط شائع ہوئی ہیں۔

"پہلو ٹٹولتے ہو مگر دل کہیں نہیں"۔

کے مصرعۂ طرح پر ۳۵ حضرات نے طبع آزمائی کی ہے اس طرح پر رہ جانے والے باقی شعراء کی غزلیں جون ۱۸۹۷ء کے شمارے میں صفحہ ۱۵ سے صفحہ ۲۰ تک شائع کی گئی ہیں۔ اس جاریہ (مئی ۱۸۹۷ء) شمارے میں اشخاص کے نام کے

ساتھ ہی تحسین میں اشعار کی تعداد بھی درج کی گئی ہے
امیر مینائی (۱۷) احسان شاہجہان پوری (۲۵)
احسن مارہروی (۱۹) ابو الفخر محمد عبد الحی بن ڈپٹی محمد دار
از جبلپور (۹) منشی محمد امین خاں برادر بیدل شاہجہانپوری (۶)
منشی نیاز حسن خاں بیدل شاہجہان پوری (۱۵)
منشی ابو الخیر قطب الدین علی تسلی شاگرد علوی از حیدرآباد (۱۵)
منشی نثار احمد خاں تائب شاہجہان پوری (۱۸) جلال
لکھنوی (۱۳) حکیم ابو جعفر حسن جعفر منیجر ریاست
رائے پور مربی گلدستہ (۱۰) داغ دہلوی (۲۰) منشی
محمد رفیق حبیب شاگرد مضطر میرٹھی از راولپنڈی (۱۴)
مولوی سید محمد مصطفیٰ خورشید مالک گلدستہ انتخاب
از لکھنو (۲۴) سید اطہر حسین دل گیر برادر دوست شاگرد
دلیر مارہروی (۱۳) منشی سید امیر حسن دلگیر مارہروی شاگرد
داغ معاون گلدستہ (۱۵) منشی اشفاق حسین ذکی
از بدایوں (۶) منشی ریاض حسن ریاض شاہجہانپوری (۳)
منشی سلامت اللہ سلامت شاگرد تائب از شاہجہان پور (۵)
منشی سید محمد سلیم شاگرد شہیر مچھلی شہری (۱۰) منشی
شیخ احمد علی شوق از بھوپال (۱۱) صاحبزادہ ہمن خاں
شہرت رام پوری شاگرد داغ (۱۶) سید محمد نوح
شہیر مچھلی شہری تعلقدار مچھلی شہری مربی گلدستہ (۱۴)
منشی سید محمد ہاشم صابر مچھلی شہری (۹) منشی عزیز الرحمن خاں
عزیز شاگرد احسان شاہجہان پوری (۵) منشی محمد اللہ خاں
عشق شاگرد احسان شاہجہان پوری (۷) سید محمد
شاہجہان پوری شاگرد امیر مینائی (۱۶) چودھری عترت حسین
مضطر عرف منا میاں رئیس مارہرہ معاون گلدستہ (۱۲)

منشی سورج بھان ملکش حیدرآبادی شاگرد علوی (۹)
منشی محمد محفوظ اللہ محفوظ نائب رجسٹرار انگریزیم و مولانا
نثار اکبرآبادی از علی گنج (۸) منشی مستجاب اللہ خاں
مقبول رئیس بلونہ معاون گلدستہ (۷) منشی محمد مکین خاں
مکین شاگرد تائب شاہجہاں پوری (۳) منشی امتیاز
احمد خاں فائق و فا شاگرد دلیر مارہروی (۱۴) منشی
ذاکر حسین ہنر غازی پوری مقیم دیوریا (۱۷)
جون سنہ ۱۸۹۷ء میں شریک شعرا میں منشی محمد اللہ
آشفتہ مارہروی شاگرد داغ (۲) منشی اعجاز رقم حضرت
برق تجلی شاہجہاں پوری (۱۷) منشی یاسر لو سہاد
بلند از گنگیری علی گڑھ (۵) منشی محمد حسین راز
جلال آبادی شاگرد احسان (۷) سید ضمیر حسین قمر
مچھلی شہری (۸) مولانا محمد حسین حنفی کامل جو
مولانا احمد حسین ماقل مچھلی شہری (۱۳) سید علی حسین
لائق مچھلی شہری از جونپور (۶) منشی محمد متین الدین
احمد متین مچھلی شہری شاگرد داغ (۳۱) احمد منشی
محمود خاں محمود شاہجہاں پوری (۶)

آئندہ کی طرحیں حسب ذیل ہیں۔

اس گلدستہ طلتے ہی ہی اللہ نہ دے عشق کسی پردہ نشیں کا
(۱) ۱۵ جون تک۔ تدبیر ہی تک دل ہیں مگر یوں کہا
(۱۱) ۱۵ جولائی تک۔ دل جلے تو ہم جانے کی پروا نہیں کرتے

انتخاب گلدستہ:

سر کیسا رہے کریم کی ساقی کی بارگاہ
جو آئے جھک کے جائے کسی سے غرض نہیں
امیر مینائی

آنسو شبِ فراق میں پوچھیں تو کس طرح
دامن ہمارے پاس نہیں آستیں نہیں
احسان شاہجہانپوری

سب بھول جاؤ گے یہ براتی کہہ نہ تھاں
تم نے ہمارے عشق کی باتیں سنیں نہیں
احسن مارہروی

کعبہ میں اور دیر میں ہم مدتوں رہے
پایا مگر وہاں یہ بھی تجھ سا حسیں نہیں
اعجاز جبلپوری

اک میں کہ میری طرح نہیں کوئی دل فگار
اک وہ کہ ان کی طرح کوئی مہ جبیں نہیں
امین شاہجہانپوری

میرا وہ دستِ شوق بڑھانا شبِ وصال
ان کا وہ بار بار یہ کہنا نہیں نہیں
بیدل شاہجہانپوری

یہ بھی کہوں گا تم سا نہیں کوئی سنگدل
یہ بھی کہوں گا تم سا کوئی نازنیں نہیں
تسلی حیدرآبادی

بلبل کے سوزِ دل نے جھلک کر جلا دیا
کلیاں قبائے گل میں نہیں آستیں نہیں
ثاقب شاہجہاں پوری

گل کی قبا جنوں میں ہے پیراہن جلال
دامن بھاڑ دیا جیب نہیں آستیں نہیں
جلال لکھنوی

کچھ ایسا انقلاب زمانے میں ہو گیا
گویا وہ آسمان نہیں وہ زمیں نہیں
جعفر رکسپوری

خلوت میں یوں ہے وہ کہ تلاشی ہے چشم شوق
خلوت میں اس طرح ہے کہ خلوت گزیں نہیں
داغ دہلوی

نازو ادا و شکل و شمائل میں آپ سا
کیسی زمیں فلک پہ بھی کوئی حسیں نہیں
چمک میرٹھی

بجلی تڑپ کے تھم گئی موجوں نے دم لیا
لیکن مرے قرار کی صورت کہیں نہیں
خورشید لکھنوی

اس طرز سے وہ چلتے ہیں وقتِ خرام ناز
گویا کہ ان کے پاؤں کے نیچے زمیں نہیں
دلگیر مارہروی

اے نور دیدہ تیری یہ نظارہ بازیاں
آوارہ تجھ سا کوئی بھی گوشہ نشیں نہیں
دلیر مارہروی

سن کر یہ بار بار تمھاری نہیں نہیں
ہاں کا بھی اعتبار اب آنا زمیں نہیں
ذکی مارہروی

دل پھر گیا ہے دیکھ کے لعلِ شکر فشاں
ہم کو پسند چاشنیٔ انگبیں نہیں
ریاض شاہجہاں پوری

روزِ ازل وہ جامۂ ہستی ملا ہمیں
دامن کا نام جس میں نہیں آستیں نہیں
سلامت شاہجہاں پوری

بدخو مزاج دار جفا کار خود پسند
ہر رنگ میں جواب تمہارا کہیں نہیں
سلیم مچھلی شہری

یہ ہے تمہارے حسن کی تعریف مختصر
گر تم حسیں نہیں ہو تو کوئی حسیں نہیں
شوق بھوپالی

جامِ جہاں نما ہے اگر دل تو خاک ہے
ہاں نام کا مکاں ہے وہ جس کا مکیں نہیں
شہرت رام پوری

مضمونِ سرنوشت کا ظاہر ہو کس طرح
کھلتا کبھی لفافۂ خطِ جبیں نہیں
شبیر مچھلی شہری

اے چرخ زیرِ سایہ ترے اک جہان ہے
مشقِ ستم کے واسطے کچھ اک ہمیں نہیں
صابر مچھلی شہری

بالائے آسماں نہیں زیرِ زمیں نہیں
ہم جس کو ڈھونڈتے ہیں وہ ملتا کہیں نہیں
عزیز شاہجہاں پوری

پھونکے گی اپنی آہِ جگر سوز کچھ نہ کچھ
یا آج آسماں نہیں یا زمیں نہیں
عشق شاہجہاں پوری

فطرت نہ ہوگا ہم سے کوئی بدنصیب بھی
سب ہیں شریکِ بزم مگر اک ہمیں نہیں
فطرت کاکوری

آئینے میں وہ روئے درخشاں کو دیکھ کر
بولے یہ ناز سے مرا ثانی کہیں نہیں
کامل شاہجہاں پوری

وہ بھی ہے کوئی آنکھ نہیں ہے جو اشکبار
وہ دل بھی کوئی دل ہے جو اندوہگیں نہیں
مختار شاہجہاں پوری

خلوت میں بات بات پہ ہو دے نہیں نہیں
اندھیر ہم نے ایسا تو دیکھا کہیں نہیں
مضطر بارہروی

اچھی نہیں ہے ہم سے کدورت کی گفتگو
ہم سینہ صاف رکھتے ہیں کچھ اہلِ کیں نہیں
میکش دکنی

سچ جان لو اسے جو کہے غیر جھوٹ بھی
میں سچ اگر کہوں بھی تو میرا یقیں نہیں
محفوظ اکبرآبادی

دل پر جگر پہ جان پہ قبضہ ہے آپ کا
وہ کونسی جگہ ہے جو زیرِ نگیں نہیں
مقبول بلونوی

جلوہ فروزِ حسنِ ازل خود بخود ہوا
سچ ہے کہ جو حسین ہے وہ پردہ نشیں نہیں
مکین شاہجہاں آبادی

تیرا بُرا ہو دستِ جنوں قہر ہو گیا
دامن نہ تھا نہ تھا مگر آستیں نہیں
وفا خاقانی

کیا جانے کیا سلوک کرے اب ہمارے ساتھ
غافل ہماری فکر سے چرخِ بریں نہیں
ہنر غازی پوری

بقیہ طرح ماہ مئی سنہ ۱۸۹۶ء

وہ دل نہیں کہ جس میں تو اے مہ جبیں نہیں
زینت نہیں مکاں کی جب تک مکیں نہیں
آشفتہ مارہروی

گیسو لٹک کے مصحفِ عارض کو چھو گئے
ان کافروں کی کس لئے شکلیں کسی نہیں
برق شاہجہاں پوری

ساغر بھی ہے شراب بھی ہے اور کباب بھی
کیا لطف میکشی کا جو وہ نازنیں نہیں
بلند گنگوری

جھونکا خزاں کا آ گیا فصلِ بہار میں
بُلبل اداس بیٹھی ہے کلیاں کہیں نہیں
راز جلال آبادی

کعبے میں وہ نہیں سرِ عرشِ بریں نہیں
سمجھو تو ہر جگہ ہے نہیں تو کہیں نہیں
ضمیر مچھلی شہری

ہر روز سینکڑوں کو ملاتی ہے خاک میں
سچ یوں ہے آسماں سے کچھ کم زمیں نہیں
کامل مچھلی شہری

رگ رگ میں اے طبیب محبت کی ہے کسک
یہ درد وہ نہیں جو کہیں ہو کہیں نہیں
متین مچھلی شہری

ان ابروؤں میں آج ہی کیا پڑ گئے ہیں بل
تیغیں ہمارے قتل پہ کس دن کھنچیں نہیں
محمود شاہجہاں پوری

اطبائے قدیم کی تشخیص و تدبیر

چند نمونے

(از: حکیم ایس۔ اے۔ حسین، ریسرچ اسسٹنٹ، یونانی انڈین انسٹیٹیوٹ آف ہسٹری آف میڈیسن)

اگر ہم اس دور جدید میں ہزاروں تجربوں کے بعد کسی مرض کی صحیح تشخیص کسی آلے کے ذریعے کرالیں یا کسی مرض کے لئے کوئی مناسب و موزوں دوا تجویز کر دیں تو کوئی کمال کی بات نہیں کیونکہ ہمارے سامنے ہزاروں مشاہدے اور سائنسی تحقیقات موجود ہیں۔ کمال تو ان کا تھا جن کی فکر رسا نے بغیر کسی سائنسی آلے کے حیرت انگیز علاجات کئے جس کے چند دلچسپ نمونے پیش کئے جاتے ہیں۔

علوی خاں کا اعجاز

مولانا رہبر فاروقی نے اپنی کتاب "اسلامی طب" میں اس سرخی "علوی خاں کا اعجاز" کے تحت ایک واقعہ لکھا ہے کہ جب نادر شاہ نے دلی کی لوٹ اور غارت گری کے بعد دیار ایران کا قصد کیا تو یہاں کے اہل کمال کو بھی چن چن کر ہمراہ لے لیا ان میں علوی خاں بھی دست بدست دیگرے چلے جا رہے تھے۔ ایک منزل پر پہنچ کر حکیم علوی خاں کو نادر شاہ نے بلایا اور کہا کہ میں مریض ہوں علاج کرو مگر شرط یہ ہے کہ میں کوئی دوا پیوں گا نہ کوئی بیرونی طور پر ضماد وغیرہ لگاؤں گا حتی کہ نبض و قارورہ تک نہ دکھاؤں گا ان سب باتوں کے باوجود مجھے صحت ہو جانی چاہیئے۔ ورنہ تمہارے ساتھ مناسب تدارک کیا جائیگا۔ حکیم صاحب اس حکم نادری کو سن کر مضطرب ہو گئے مگر خداداد عقل و ذہن پایا تھا کسی مناسب تدبیر کی دھن میں لگ گئے اور عرض کی کہ انشاءاللہ ایسا ہی ہوگا۔ دربار برخاست ہونے سے قبل بادشاہ کے چہرے پر ایک غائر نظر ڈالی تو دیکھا کہ آنکھیں سرخ ہیں چہرے پر یبوست و بدمزاجی کی کیفیت پیدا ہے۔ اس روز گرمی کی شدت بھی تھی۔ حکیم صاحب نے صرف ان معمولی علامتوں ہی سے تاڑ لیا کہ اس وقت بادشاہ کو درد سر لاحق ہے عرض کی کہ اجازت ہو تو گھر جا کر علاج کے لئے غور و فکر کروں نماز ظہر کے بعد بارگاہ عالی میں حاضر ہوں گا۔ حکیم صاحب

نے دربار سے آکر نماز ادا کی اور خدمت گار کو حکم دیا کہ صندل گلاب کا ایک پنکھا تیار کرو اور اسے عطر خس میں معطر کر دو۔ جب یہ تیار ہو گیا تو خود علوی خاں اسے لے کر نادر شاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ علاج کی فکر کر رہا ہوں۔ مجھے پنکھا جھلنا بہت اچھا آتا ہے۔ اگر حکم ہو تو خدمت سلطانی بجا لاؤں اجازت ملنے پر حکیم صاحب پنکھا جھلنے لگے پھولوں کی خوشبو بادشاہ کے دماغ میں پہنچی اور عطر کے قطرے غیر محسوس طریقے پر بادشاہ کے چہرے اور پیشانی پر ٹپک پڑے جس کی وجہ سے روح اور قلب کو فرحت پہنچی اور نادر شاہ پر اس پنکھے کی خوشگوار ہوا کی وجہ سے غنودگی کے آثار طاری ہو گئے۔ یہاں تک کہ وہ غفلت کے ساتھ سو گیا۔ ادھر علوی خاں نے جب بادشاہ کو سوتا پایا تو اپنے خیمہ میں واپس چلے آئے۔ جب نادر شاہ سو کر اٹھا تو درد کا مطلق اثر نہ تھا۔ علوی خاں کو بلا کر ان کی دانائی کی تعریف کی اور کہا کہ جو چاہیے مانگ لو۔ حکیم صاحب نے پہلے تو ایفائے عہد کا پیمان لیا اور پھر عرض کی کہ غلام آرزو مند ہے کہ اس کو دلی واپس جانے کی اجازت مل جائے۔ نادر شاہ یہ سن کر بیحد متاسف ہوا اور کہنے لگا کہ افسوس ہے کہ تجھ جیسا طبیب اس چیلے سے جدا ہوتا ہے۔ اور نہایت اعزاز و اکرام کے ساتھ واپسی کا حکم دیا۔

یہ صحیح ہے کہ درد سر کا علاج کوئی مشکل امر نہیں مگر شرائط ایسی کٹھن تھیں کہ ذہانت ہی اس کی صحیح تدبیر بتا سکتی تھی اور یہ حکیم علوی خاں کا کمال تھا جو انہوں نے صرف چہرے کی سرخی اور موسم کی گرمی وغیرہ جیسی معمولی علامتوں سے بادشاہ کے مزاج اور مرض کو پہچان لیا اور صحیح تدبیر تجویز کی آج کل دواؤں پر تحقیق کافی ترقی پر ہے مگر بغیر کسی آلے کے صحیح تشخیص اور مناسب تدبیر سابقین کا کمال تھا "اسلامی طب" مولفہ مولانا رہبر فاروقی سے ایک اور واقعہ پیش کیا جاتا ہے جس کو

ایک اور واقعہ

مولانا نے فارسی کی ایک مشہور اور معتبر کتاب "چہار مقالہ" کے حوالہ سے تحریر کیا ہے۔ یہ واقعہ شیخ بو علی سینا کی مناسب و موزوں تجویز سے تعلق رکھتا ہے اور نہایت دلچسپ بھی ہے

شیخ الرئیس کا ایک نادر علاج

آل بویہ کا ایک شہزادہ مرض مالیخولیا میں مبتلا ہو گیا تھا اور وہ اس بیماری کی وجہ سے یہ سمجھتا تھا کہ وہ گائے ہو گیا ہے۔ ہر روز آوازیں نکالتا اور ہر شخص سے کہتا کہ مجھے ذبح کر کے ہریسہ تیار کرو مرض کا اسقدر غلبہ ہو گیا تھا کہ اس وہم و تخیل کی وجہ سے شہزادے نے کھانا پینا چھوڑ دیا تھا۔ اور حالت بدتر ہونے لگی تھی۔ سارے اطباء علاج سے عاجز آ گئے تھے۔ بو علی سینا اس زمانہ میں تصنیف و تالیف میں منہمک تھا کچھ سلطنت اور ملک کے معاملات میں بھی مصروف تھا۔ الغرض اسکو علاج معالجہ کی طرف متوجہ ہونے کی فرصت نہ تھی چونکہ معاملہ شہزادے کا تھا اطباء نے علاء الدولہ سے معروضہ کیا کہ یہ علاج ابن سینا ہی سے ممکن ہے چنانچہ حسب فرمان

تاہی علاج ابن سینا کے سپرد ہوا۔ بوعلی سینا نے لوگوں سے کہا کہ اچھا جاؤ اس مریض سے جاکر کہہ دو اور خوشخبری دیدو کہ تمہارے ذبح کرنے کے لئے قصاب آتا ہے چنانچہ مریض یہ سن کر بیحد مسرور ہوا اس کے بعد بوعلی سینا دو آدمیوں کے ہمراہ اس مریض کے پاس گیا اس کو دور سے دیکھنے کے باوجود لوگوں سے پوچھنے لگا کہ بتاؤ وہ گائے کہاں ہے؟ تاکہ اسے ذبح کردوں اس مریض نے جب یہ باتیں سنیں تو گائے کی طرح آوازیں نکالنے لگا۔ بوعلی سینا نے حکم دیا کہ اس کے ہاتھ پیر گائے کی طرح باندھ دو اور جانور کو جس طرح ذبح کرنے کے لئے لٹاتے ہیں اسکو لٹادو چنانچہ جب ایسا ہی کیا گیا تو شیخ بوعلی سینا اس کے قریب پہنچا اور چھری پر چھری رگڑنی شروع کی جیسا کہ قصابوں کی عادت ہوتی ہے اس کے بعد ذبح کرنے کے لئے بیٹھا گلے پر چھری رکھنے سے پیشتر اس کا جسم دیکھ کر کہنے لگا کہ گائے بہت دُبلی ہے اس کو ذبح کرکے کیا فائدہ۔ چارہ کھلاؤ تاکہ خوب موٹی ہوجائے اور گوشت بھی خوب نکلے۔ یہ کہکر مریض کے پاس سے اٹھا اور ہدایت کردی کہ ہاتھ پیر کھول دو۔ جب موٹاپے کے لئے غذائیں اور دوائیں بھیجی جانے لگیں تو مریض شوق سے کھاتا گیا یہاں تک کہ اچھا ہوگیا۔

مالیخولیا کے مریض آج بھی سڑکوں پر پھرتے نظر آتے ہیں کوئی اپنے آپ کو پہلوان سمجھتا ہے تو کوئی بادشاہ وقت وہ اپنی مرضی کے خلاف کوئی بات برداشت نہیں کرتے آج بھی ان کا علاج بغیر الکٹرک شاک کے دشوار ہی ہے۔ اس زمانہ میں شہزادوں کے آداب بھی زیادہ ہی تھے انہیں پچھاڑ کر دوائیں پلانا آسان نہ تھا یہ تو شیخ بوعلی سینا کی فراست تھی جو اس نے ایسی تدبیر نکالی کہ دیکھنے میں ایک معمولی بات نظر آرہی ہے

—— اپنے بزرگوں سے سنا ہوا ایک اور واقعہ اس ضمن میں مناسب و موزوں معلوم ہوتا ہے جو ایک حکیم صاحب کی حذاقت اور صحیح تجویز کا آئینہ دار ہے یہ کوئی صدیوں پرانا واقعہ نہیں بلکہ نصف تا پون صدی قبل کے درمیانی عرصے کا ہے۔

حیدرآباد میں ایک قابل حکیم تھے جن کا نام تھا حکیم میر محمود علی جو یونانی طبابت کے ناظم بھی رہ چکے ہیں۔ ان کا مکان اور دواخانہ بیرون دبیر پورہ واقع تھا۔ ایک بار ان کے ہاں ایک صاحب اپنے نوجوان بچے کو سواری میں بٹھا کر لائے اور کہنے لگے کہ بچہ دن میں سوگیا تھا بہت دیر سوتا رہا۔ جب اٹھا تو اُسے کچھ دکھائی نہیں دے رہا ہے اچانک اندھا ہوگیا ہے۔ حکیم صاحب نے کہا کہ علاج کروں یا دوا دوں؟ تو مریض کے والد نے کہا کہ ہم تو شفا چاہتے ہیں آپ جو چاہیں کریں پھر حکیم صاحب نے کہا کہ آپ اپنی سواری لوٹا دیجئے اور بچے کا ہاتھ پکڑ کر پیدل گھر جائیے۔ کسی دکان سے دو پیسے کی سونف خرید لیجئے بچہ سے کہئے کہ تھوڑی تھوڑی سونف چباتا جائے اور راستے میں جہاں کہیں نل ملے تھوڑا تھوڑا پانی گھونٹ گھونٹ پلادیجئے بس یہی علاج ہے یہ دوا بھی ہے ماکنتہ

لیکن حکیم صاحب نے دوا دینے سے انکار کر دیا۔ حسب ہدایت حکیم صاحب یہ وہاں سے نکلے ان کا گھر چنچل گوڑہ میں تھا، سونف خریدی اور حسب ہدایت کھلاتے ہوئے گھر کو میرے خسر جو مریض کے والد کے ملاقاتی تھے

کہتے ہیں کہ یہ واقعہ خود مریض کے والد نے ان سے بیان کیا تھا اور کہا تھا کہ جب ہم گھر کے قریب پہنچے تو بچے کو دور سے مکان مدھم مدھم نظر آنے لگا تھا اور جب ہم گھر پہنچ گئے تو مریض کو مکمل صحت ہو چکی تھی۔ سنا کہ مریض کے والد نے دوسرے روز حکیم صاحب سے اس کا سبب دریافت کیا۔ پہلے تو حکیم صاحب نے ٹالنا چاہا جب یہ مصر ہو گئے تو کہا کہ بچہ جوان ہے گرم بخارات دماغ کی طرف چڑھ کر منجمد ہو گئے تھے اس کے لئے سونف سے بہتر کوئی چیز نہیں اس لئے میں نے یہ تدبیر تجویز کی۔

حکیم ھلال آغائی ابوالعلائی

غزل

ہر اک کو دھن ہے چراغِ وفا جلانے کی
ہوا لگی نہیں شاید ابھی زمانے کی

چلے تھے ایک ترے در کی آرزو لیکر
ہزار ٹھوکریں کھانی پڑیں زمانے کی

تمہاری راہ میں آنکھیں بچھائی جاتی ہیں
ہماری راہ میں دیوار ہے زمانے کی

کسی کے لب پہ عبارت ہے حسن فسانے کی
بہت سی باتیں ہیں اس میں مرے زمانے کی

وفا خلوص دیانت شعور خود داری
تمہیں بتاؤ یہ باتیں ہیں کس زمانے کی

قدم قدم پہ یہاں حادثے مقابل ہیں
یہ دور ہے گزرتے ہوئے زمانے کی

بڑی امید ھلال آپ کو ہے دنیا سے
چھپی ہوئی ہے یہ بے دردی اک زمانے کی

شارب ردولوی

حسرت کی شاعری میں حسّی تلازمے

حسرت موہانی نے اپنی طبیعت کو 'چکی کی مشقت' اور 'شاعری' کے تضاد میں خود ایک "طرفہ تماشا" قرار دیا ہے لیکن اگر دیکھا جائے تو ان کی زندگی اور شاعری کا کوئی پہلو "طرفگی" سے خالی نظر نہیں آتا لیکن بعض وقت غیر ارادی طور پر یا کسی خاص معنی میں استعمال کیا ہوا کوئی لفظ زندگی میں بہت اہم ہو جاتا ہے۔ ماہرین نفسیات اس طرح کے الفاظ کی کیا تاویلیں پیش کریں گے اور تحت الشعور و لاشعور کے کیسے کیسے نہاں خانوں کی پردہ داری کریں گے" مجھے نہیں معلوم لیکن حسرت کی زندگی اور شاعری کا مطالعہ یہ ضرور ظاہر کرتا ہے کہ یہ بے ضرر سا لفظ ان کی زندگی میں ایک کلیدی اہمیت رکھتا ہے۔

حسرت بڑی پہلودار شخصیت کے حامل تھے۔ ان کی شخصیت کا ایک پہلو ان کی سیاسی زندگی میں نظر آتا ہے اور دوسرا پہلو ان کی شاعری میں۔ وہ صحافی بھی تھے اور محقق بھی۔ صوفی بھی تھے اور نقاد بھی۔ اسی لیے ان کی شخصیت کا مطالعہ بہت آسان نہیں ہے۔ حالانکہ یہ ان کی بہت بڑی خوبی ہے کہ شخصیت کے ان مختلف پہلوؤں میں ان کے یہاں کوئی تضاد نہیں ہے۔ یہ ان کے کردار کی ایک بہت بڑی صفت ہے جو عام طور پر کم نظر آتی ہے۔ حسرت ہر جگہ اپنے ایک کردار، ایک رویّے کے ساتھ ہی نظر آتے ہیں۔ ان کا ایک رویّہ دوسرے رویہ کا مخالف ہونے کی بجائے معاون ہے اور اس میں ان کی "طرفگی" کی شان دکھائی دیتی ہے۔ وہ ایک سادہ، سچے اور ایمان دار شخص تھے۔ کسی نے ان کے لیے 'کھرے انسان' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ میرے خیال میں حسرت کے کردار کے اظہار کے لیے اس سے

بہتر لفظ ملنا مشکل ہے۔ "کھرے" میں سچائی کی تلخی بھی ہے، سادگی کی نرمی بھی۔ اپنے نظریے پر اڑے رہنے کی ضد بھی اور مصلحتوں سے سمجھوتہ نہ کرنے کی کج کلہی بھی۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی تمام سادگی، نرمی اور احساس جمال کے باوجود جہاں نظریے کی بات آجاتی ہے وہاں وہ ٹوٹ تو سکتے ہیں لیکن جھک نہیں سکتے۔ ظاہر ہے کہ ایسا شخص قابل احترام اور ہر دلعزیز صوفی اور درویش تو ہو سکتا ہے لیکن ہر دلعزیز صحافی یا سیاستداں نہیں ہو سکتا۔ جہاں سچائی، نظریہ اور دوستی وقت کی مناسبت اور مصلحت کے مطابق معنی بدلتے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حسرت سیاست میں صرف صعوبتیں برداشت کرتے رہے۔ وہ کانگریس میں رہے لیکن تقسیم ملک کے مخالف رہے۔ 'کٹر مسلمان' ہونے کے باوجود کمیونسٹ پارٹی کی ہم نوائی کی، لیکن اگر بین السطور کو دیکھا جائے تو محسوس ہوگا کہ یہ مخالفت یا موافقت پارٹی یا اشخاص سے نہیں تھی بلکہ سچ کی ہمنوائی تھی۔ وہ پارٹی اور پارٹی ڈسپلن سے بلند تھے اور ان کی نگاہ میں صرف حق پیروی کے قابل تھا، خواہ وہ کہیں بھی ہو۔ وہ چونکہ ذاتی مفاد اور مصلحت سے بلند تھے اس لیے ہمیشہ نڈر اور بے باک رہے۔

حسرت کی شاعرانہ اہمیت کے بارے میں متضاد رایوں کا اظہار کیا گیا ہے۔ کسی نے حسرت کی غزل کو اردو غزل گوئی کا معیار[1] قرار دیا اور کسی نے ان کی شاعری کو استادانہ تقلید[2] اور اساتذہ کا تتبع[3] کہا۔ بعض لوگوں کی رائے میں وہ بڑے آرٹسٹ[4] نہ تھے اور بعض کے خیال میں ان کی شاعری میں تفکر اور گہرائی[5] نہیں ہے اور کسی کی نگاہ میں وہ رئیس المتغزلین[6] اور کسی کی نگاہ میں اردو غزل کا احیا کرنے والے ہیں۔ ناقدین کی ان رایوں میں اختلاف کا اصل سبب یہ ہے کہ ان رایوں میں حسرت کی شاعری کے کسی ایک پہلو کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ اگر مجموعی حیثیت سے حسرت کے کلام کا مطالعہ کیا جاتا تو اس طرح کا تضاد نہ نظر آتا۔

حسرت کے بڑے شاعر ہونے میں شبہ کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ انہوں نے اس وقت اردو غزل

---

۱ رشید احمد صدیقی بحوالہ راج بہادر گوڑ اردو ادب حسرت نمبر ۲ مجنوں گورکھپوری بحوالہ حامدی کاشمیری اردو ادب حسرت نمبر ص ۹۵ ۳ حامدی کاشمیری اردو ادب حسرت نمبر ص ۹۵ ۴ سید محمد عقیل نقادی حسرت نمبر ص ۱۴۲ ۵ اردو ادب حسرت نمبر ۶ نیاز فتح پوری آج کل حسرت نمبر ص ۳۔

کے نئے انداز اور نئے لب و لہجے سے آشنا کیا جب کہ وہ تہذیبی زوال کا شکار ہو چکی تھی۔ حسرت اردو غزل کا ایک اہم موڑ ہیں جنھوں نے جدید غزل کو تصنع اور خارجی لوازمات سے بڑی حد تک پاک کیا۔

حسرت غزل کے شاعر ہیں۔ انہوں نے غزل کو جس نئے اسلوب اور سادگی' بے تکلفی سے آشنا کیا ہے وہ حسرت کے عہد میں یا ان کے قریبی پیش روؤں کے یہاں نہیں ملتی۔ حسرت نے غزل کو حقیقی جذبات سے قریب تر کرنے کی کوشش کی۔ حسرت سے پہلے کی غزل عام طور پر رعایتِ لفظی' جذبات کے پر تصنع اظہار' معاملہ بندی اور خارجی لوازمات کے اظہار کے لیے مخصوص ہو کر رہ گئی تھی۔ جرأت' انشاء' مصحفی' داغ اور امیر کے عہد میں غزل نے جو صورت اختیار کی اس کی تفصیل میں جانے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ اس عہد میں غزل کا تفکر' رعایت لفظی اور معاملہ بندی کے خم و پیچ میں الجھ کر رہ گیا تھا۔

جمنا میں کل نہا کر جب اس نے بال باندھے ہم نے بھی اپنے دل میں کیا کیا خیال باندھے

امیر اتنا نہ چھیڑ اس کو سرِ شام کہ شب بھر پیار کرنے کو پڑی ہے (امیر)

خیال کی یہ پہلوداری یا "چھیڑ چھاڑ" اکثر اوقات حدود سے تجاوز کر جاتی ہے۔ اس کے علاوہ محبوب کا تصور بھی حقیقی نہیں ہے جس میں محبوب عیار' دغاباز' حیلہ ساز' قاتل' جفاجو' ستمگر اور بے حیا نظر آتا ہے۔ دراصل غزل میں محبوب کا یہ تصور یا معاملہ بندی اور رعایتِ لفظی کے مضامین کی کثرت' ان کا براہِ راست تعلق ہماری سماجی زندگی سے ہے۔ اس وقت کے سیاسی اور سماجی حالات نے ایک شاہد بازاری کلچر کو جنم دیا تھا' جو ایسے تمام لوگوں کی آماجگاہ تھی' جو نئے حقائق سے آنکھ ملانے کی جرأت یا تبدیلیوں سے مقابلہ کرنے کی ہمت نہیں رکھتے تھے۔ اسی نے محبوب کے تصور کو بالاخانے کی 'فاحشہ' کے تصور سے وابستہ کر دیا۔ ظاہر ہے کہ جب محبوبہ کا تصور' ایک بازاری عورت کا تصور ہوگا تو عیاری' دغابازی' ستمگری' وعدہ خلافی کی باتیں اور ناف و کمر' لب و رخسار' دشنۂ مژگاں' زلفِ پیچاں اور تیرِ نظر کا ہی ذکر ہوگا۔ اردو غزل میں حسرت سے پہلے یہ لے اس قدر بڑھی کہ امیر مینائی جیسا صوفی شاعر بھی اس سے دامن نہ بچا سکا۔ حسرت نے محبوب کے اس تصور کو تبدیل کیا اور جذبے کی صحیح عکاسی کر کے غزل کو زیادہ موثر اور دلکش بنایا۔ یہ کہنا شاید صحیح نہ ہو کہ حسرت کے یہاں محبوب کے تصور

جو شاہد بازاری کی کلچر کی جھلک ملتی ہی نہیں، اس لیے کہ ماضی قریب کی شعری روایت کو یکلخت تبدیل کر دینا ممکن نہیں تھا اس لیے حسرت کے یہاں اس کے اثرات کا پایا جانا ایک فطری بات ہے۔ لیکن حسرت نے جذبات نگاری اور معاملہ بندی کے فرق کو ملحوظ رکھا ہے۔ جذبات نگاری اور معاملہ بندی کے درمیان بہت تھوڑا سا فرق ہے۔ ذرا احتیاط کا دامن چھوٹ جائے تو دونوں کی سرحدیں مل جاتی ہیں۔ حسرت جذبے کی تصویر کشی میں شوخ تو ہو جاتے ہیں، لیکن اعتدال سے آگے نہیں بڑھتے۔ شوخی اور اعتدال کے اسی امتزاج نے حسرت کے یہاں ایسی جمالیاتی لطافت اور دلکشی پیدا کر دی ہے کہ سننے والا اُسے اپنے دل کی آواز محسوس کرتا ہے۔

حسرت نے محبوب کا جو تصور پیش کیا وہ ان سے پہلے اُردو شاعری میں عام نہیں تھا۔ ان کا محبوب ہماری دنیا کا چلتا پھرتا اور جیتا جاگتا محبوب ہے جو محبت کی کلفتوں اور عشرتوں میں برابر کا شریک ہے جو غیر معمولی نہ ہوتے ہوئے بھی اہم ہے۔ اس لیے کہ اس میں ہمیں جانی پہچانی شکلیں دکھائی دیتی ہیں۔ حسرت نے کہا تھا:

سمجھا جو ترا حال ہے اتنا تو نہیں وہ　　　کیا جانیے تو نے اُسے کس آن میں دیکھا

حسرت کا محبوب بھی اسی طرح ایک عام فرد ہے جو دوپہر کی دھوپ میں کوٹھے پر ننگے پیر اُس کے لیے آ سکتا ہے۔ نیاز فتح پوری نے لکھا ہے کہ "ان کا محبوب وادیٔ ایمن یا کوہِ طور کی مخلوق نہیں بلکہ انھیں کی سوسائٹی کا فرد ہے جو چلمن کی اوٹ، پردے کی آڑ، جھروکوں اور جھلملیوں سے کوٹھے پر آ کر اور موقع ہو تو نقاب الٹ کر بھی فریفتہ ہو سکتا ہے۔" [۱]

حسرت بے حد حساس شاعر ہیں اور حسن ہر رنگ انھیں متاثر کرتا ہے وہ تمام کیفیتوں اور جذبات کو جس طرح محسوس کرتے ہیں اسی طرح اور اسی شدت کے ساتھ بیان کر دیتے ہیں۔ احساس کی اسی شدت اور جمالیاتی لطافت نے ان کے کلام میں خوب صورت حسی تلازمے پیدا کیے ہیں۔ حسی تلازمات کا تعلق جمالیاتی احساس اور جذبے کی شدت سے ہے۔ یوں تو محسوس کرنے کی قوت جبلی طور پر ہر شخص

---

۱ "آج کل" حسرت نمبر ص ۱۹

...ہے لیکن جذبہ اور ذوقِ جمال اس پر جلا کا کام کرتا ہے۔ حسرت کے یہاں ان حِسّی تلازمات کی شکل ...ی دلکش اور خوبصورت ہے، جو بعض جگہوں پر حِسّی پیکر کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ حِسّی پیکر ...اشی اور حِسّی تلازمے مختلف شعرا کے یہاں تلاش کئے جا سکتے ہیں۔ میر، غالب، مومن اور دوسرے ...رانے بھی اس سے کام لیا ہے لیکن جیسے جیسے غزل خارجیت اور معاملہ بندی کا شکار ہوتی گئی ...تا تلازمے کی لطافت اور احساس کی لطافت کم ہوتی گئی۔ حسرت نے ایک بار پھر حواس پر حسن ...اثراندازی کو بڑے خوبصورت انداز میں پیش کیا۔ حسرت کی شاعری میں رنگ اور خوشبو کو بڑی ...یت حاصل ہے۔ انھوں نے دوسری حسّوں کے تلازمے بھی استعمال کئے ہیں لیکن حسِ شامہ اور ...باصرہ کے تلازمے زیادہ کثرت سے ملتے ہیں۔ اس کا یہ بھی سبب ہو سکتا ہے کہ حسرت کا (AESTHETIC SENSE) بہت بلند تھا اور یہ دونوں حسّیں لطیف احساسات کی محرک ہیں، ...لیے جذبے کے اظہار میں حسرت نے ان سے زیادہ کام لیا۔ مثلاً حسِ شامہ سے متعلق یہ تلازمے ملاحظہ ...ں:

خوشبو ترے ملبوس کی لائی ہے کہاں سے — تجھ تک تو ہوا تھا نہ گزر بادِ صبا کا!

...لگی تھی جو اک بار وہ خوشبوئے گریباں — اب تک ہے وہی بوئے گریباں کا نشا ہے

...ج تک جس سے معطر ہے محبت کا مشام — آہ کیا چیز تھی وہ پیرہنِ یار کی بو

اک بار بس گیا جو کہیں اس کی باس میں — خوشبوئے حسن برسوں رہی ہے لباس میں

...بسے عطر نہ تھا جسمِ خوب یار — خوشبوئے دلبری تھی جو اس پیرہن میں تھی

پائی ہے جگہ پاکیٔ دامانِ نظر میں — خوشبوئے حیا آتی تری چادر سے نکل کر

یہی لائی ہے اُڑا کر ترے ملبوس کی بو بے خودی ہائے تمنّا کی صبا ہے باعث

حسرت کے لیے حسن خوشبو ہے۔ اُنھیں خوشبو کا نشا ہے۔ وہ محبوب کے لباس کی خوشبو اس کے جسم کی خوشبو' اس کے گریبان کی خوشبو ہی کو محسوس نہیں کرتے بلکہ خوشبوئے دلبری اور خوشبوئے حیا سے سرشار ہیں۔ خوشبو ان کی کمزوری ہے' ان کی مستی ہے۔ ان کی بے خودی اور سرمستی کا سبب ہے۔ خوشبو سے متعلق تلازمات کا جتنا خوب صورت استعمال حسرت نے کیا ہے' مشکل سے ان کے کسی ہم عصر کے یہاں نظر آئے گا۔ خوشبو سے یہ لگاؤ حسن اور محبت کی اس لطافت کی نشان دہی کرتا ہے جو حسرت کے لاشعور میں بسی ہوئی تھی یعنی حسن ان کے لیے ایسی چیز ہے جس میں کسی قسم کی کثافت کا شائبہ بھی نہیں ہے اسی لیے وہ شامّہ کا تلازمہ کا استعمال بار بار مختلف انداز میں کرتے ہیں :

مشک و عنبر میں یہ تفریح کا سامان کہاں پیرہن ان سے بھی کچھ بڑھ کے ہے خوشبو تیرا

محبت کی جو یہ پھیلی ہے نکہت باغِ عالم میں ہوئی ہے منتشر خوشبوئے یار آہستہ آہستہ

کیا کیا ہوس کو آتی ہے خوشبوئے آرزو آنکھیں جب اپنی ملتے ہیں ان کی ردا سے ہم

آشنا ہو کے بوئے یار سے ہم سخت بیزار ہیں قرار سے ہم

ہے بوئے شوق سے جو معطر مشامِ جاں ارماں نہیں ہوائے جناں کی شمیم کا

"گیسوئے دوست کی خوشبو" حسرت کے لیے "دو عالم کی بہار" ہے اور بوئے شوق سے ان کا "مشامِ جاں" اس طرح معطر ہے کہ خوشبوئے جناں کا بھی ارمان نہیں۔

حسرت نے حسِ باصرہ کے تلازمات کو بھی بڑی خوبی سے پیش کیا ہے۔ وہ باصرہ کے تلازمے کو عموماً رنگ کے ذریعے ظاہر کرتے ہیں۔ حسرت کے یہاں رنگ کی بھی بڑی اہمیت ہے وہ رنگ اور خوشبو دونوں لطافتوں سے اپنے شعر میں دل کشی پیدا کرتے ہیں۔ انھوں نے بعض اشعار میں شامہ اور باصرہ دونوں کے تلازمات کو یکجا استعمال کیا ہے اور رنگ و خوشبو سے اشعار میں ایک عجیب کیفیت پیدا کر دی ہے۔ باصرہ اور شامہ دونوں کے تلازمے جن اشعار میں استعمال ہوئے ہیں، ان کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

ہوس انگیز تمنا ہے لبِ یار کا رنگ　　روشنی بخش نظر ہے مئے گلنار کی بو

تم نے بال اپنے جو پھولوں میں بسا رکھے ہیں　　شوق کو اور بھی دیوانہ بنا رکھا ہے

حسرت کے جمالیاتی احساس اور حسی تلازمے کی یہ بھی بہت اچھی مثال ہے:

کیا کیجئے بیاں اس تنِ نازک کی حقیقت　　خوشبو میں ہے گل بُو تو لطافت میں ہے سب رنگ

اسی طرح حسرت نے باصرہ اور شامہ کے تلازمات، خوشبو اور رنگ سے جو گل کاری کی ہے وہ ان کے شدید احساس اور لطیف ذوقِ جمال کی نشاندہی کرتی ہے۔ حسرتؔ نے بصری تلازمات کو علیحدہ بھی استعمال کیا ہے، جو ان کی انفرادیت کو ظاہر کرتے ہیں۔ مندرجہ ذیل اشعار میں رنگوں کی کیفیت ملاحظہ ہو۔

زلفِ شب رنگ میں گلنار لباسی کی بہار　　آج حسرت نے رُخِ یار میں کیا کیا دیکھا

دیکھا جو مجھے گرم نظر بزمِ عدو میں　　وہ ڈانٹ گئے مجھ کو برابر سے نکل کر

رونقِ پیرہن ہوئی خوبیٔ جسمِ نازنیں　　اور بھی شوخ ہو گیا رنگ ترے لباس کا

روشن جمالِ یار سے ہے انجمن تمام　　دہکا ہوا ہے آتشِ گل سے چمن تمام

پیراہن اس کا ہے سادہ رنگین ‏ یا عکس مے سے شیشہ گلابی

رنگ تیری شفق جمالی کا ‏ اک نمونہ ہے بے مثالی کا

حسرت نے بصری تلازمات کو رنگ اور روشنی کے بنیادی تلازمے سے ترتیب دیا ہے، جسے کہیں وہ زلفِ شب رنگ کہتے ہیں کہیں لباس کے رنگوں کی شوخی، کہیں شفق جمالی کہتے ہیں کہیں گلنار لباسی اور کہیں آتشِ گل کا دہکنا، رنگوں اور روشنی کے اس امتزاج کا اگر جائزہ لیجئے تو حسرت کے جذبے کی شدت کا احساس ہوگا۔ ان کے بعض کم مشہور اشعار میں بھی یہ شدت محسوس کی جاسکتی ہے۔

غربت کی صبح میں بھی نہیں ہے وہ روشنی ‏ جو روشنی کہ شامِ سوادِ وطن میں تھی

چمن میں بادِ بہاری بھی گل کی آنکھوں سے ‏ چلی کہ دیکھئے تماشا تری سواری کا

برق کو ابر کے دامن میں چھپا دیکھا ہے ‏ ہم نے اس شوخ کو مجبورِ حیا دیکھا ہے

کھل گیا ہے تیرے جمال سے رنگ ‏ ترے ملبوسِ ارغوانی کا!

ان مثالوں سے حسرت کے یہاں جذبے کو حسوں کے مختلف تلازمات کے ذریعے پیش کرنے کی لطیف کوشش ظاہر ہوتی ہے، لیکن یہ مثالیں صرف شامہ اور باصرہ سے متعلق ہیں۔ جب کہ حسوں میں سامعہ، لامسہ اور ذائقہ بھی شامل ہیں۔ حسرت کے کلام کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ محسوس ہوتا ہے کہ ان کے کلام میں جس شدت سے شامہ اور باصرہ تلازمے ملتے ہیں اس کا ایک حصہ بھی دوسری حسوں سے متعلق تلازمے نہیں ہیں۔ ان کے انتخابِ کلام میں ذائقے سے متعلق کوئی تلازمہ نظر نہیں ہوتا اور لمسی اور سمعی تلازمے کے صرف دو دو اشعار مل سکے۔ ان کے مکمل دیوان میں ہو سکتا ہے کہ اس

موضوع پر ایک دو شعر اور مل جائیں، لیکن اس سے یہ ضرور اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے جب کہ ان کے پیش رووں کے یہاں لمسی اور سمعی ہی نہیں بلکہ ذائقے سے متعلق تلازمے بھی بڑی تعداد میں مل جاتے ہیں، مثلاً :

ذائقہ ہونٹوں کا بدلے گا نہ مستی کے ملے   ہوں گے یہ قندِ سیہ اب تو شکر پارے ہیں

اس غیرتِ ناہید کی ہر تان ہے دیپک   شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو (مومن)

دھول دھپہ اس سراپا ناز کا شیوہ نہ تھا   ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن (غالب)

یا بہ زنجیر رقص کر تلوار کی جھنکار پر   یا مسلسل نغمہ خلخالِ محبوبہ پہ ناچ

اس کے علاوہ شکر لب، فردوسِ گوش وغیرہ کی تراکیب ہماری شاعری میں بہت عام ہیں لیکن حسرت کے یہاں یہ نہ ہونے کے برابر ہیں اور جہاں سمعی یا لمسی تلازمے آئے ہیں، ان میں جذبے کی وہ شدت نہیں ہے جو اپنی طرف خصوصیت کے ساتھ متوجہ کر سکے۔ مثلاً لمسی تلازمے کے یہ دو شعر ملاحظہ ہوں :

بزمِ اغیار میں ہر چند وہ بیگانہ رہے   ہاتھ آہستہ مرا پھر بھی دبا کر چھوڑا

سکھا دی ہیں نرالی شوخیاں کچھ لطفِ جاناں نے   مرے دستِ تمنا کی شرارت بڑھتی جاتی ہے

یا سمعی تلازمے کے یہ دو شعر دیکھیے :

اک بلد سنی تھی سو مرے دل میں ہے موجود   اے جانِ تمنا تری تقریر ابھی تک

بن جاتی ہے دل میں خلشِ خارِ تمنا   جھنکار ترے پاؤں کے زیور سے نکل کر

ان اشعار میں دستِ تمنا کی شرارت اور ہاتھ کا دبا دینا لمسی تلازمہ ہے اور تقریر اور جھنکار سمعی۔ یہ اشعار بھی حسرت کے اچھے انتخاب میں نہیں آتے۔ سوائے لمسی تلازمے کے ایک شعر کے جو

کے شوخیٔ بیان کے ذکر میں کبھی کبھی پیش کیا جاتا ہے۔ یہاں پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حسرت کے یہاں سمعی، لمسی اور ذائقہ سے متعلق حسّوں کے تلازمے کیوں نہیں ہیں جبکہ ان سے پہلے کے لکھنؤ اور دہلی دونوں جگہ کے شعرا کے یہاں اس طرح کے اشعار اچھی خاصی تعداد میں مل جاتے ہیں۔ اس کا ایک سبب تو نفسیاتی ہو سکتا ہے یعنی ہر شخص میں ہر حِس یکساں طور پر شدت نہیں رکھتی۔ اس لیے ہو سکتا ہے کہ حسرت کی زندگی میں ذائقہ اور لمس کی وہ اہمیت نہ رہی ہو جو شامّہ اور بصارت کی تھی اس لیے اس کا ذکر ان کے یہاں نہیں ملتا لیکن تصوّف کے رشتے سے سماع سے انھیں بیحد دلچسپی تھی۔ خوش الحان اور اچھی آواز کو وہ پسند کرتے تھے۔ اس کے باوجود سمعی تلازمات ان کے یہاں نہیں ملتے۔ میرے خیال میں حسرت کے یہاں ان حسّوں کے تلازمات نہ ہونے کی وجہ نفسیاتی سے زیادہ سماجی ہے۔ چونکہ سمعی اور لمسی دونوں حس اردو شاعری اور بالخصوص غزل کی حد تک اس تہذیبی احاطے سے قریب ہیں جسے شروع میں شاہد بازاری کلچر کا نام دیا گیا ہے اور حسرت غزل کو اس احاطے سے باہر لائے تھے اس لیے مومن سے ایک تعلق ہونے کے باوجود ان کے یہاں نہ غیرتِ ناہید کی تان ہے اور نہ دیپک راگ اور پائل کی جھنکار۔ اسی طرح جب تک محبوب بالفاسقہ کی زینت تھا اس وقت تک ڈھول دھپا بھی تھا اور دستِ و بازو کا امتحان بھی۔ لیکن حسرت نے محبت کو ایک نئی فضا دی۔ جس میں گھر کی چار دیواریاں تھیں۔ معصوم اظہارِ تمنا تھا اور ناتجربہ کار عشق کی دھڑکنیں تھیں۔ اس لیے ان کے یہاں وہ کلچر اور وہ تلازمات بھی نہیں ملتے۔ حالانکہ "ادعائے اتقا" کے باوجود میر کی طرح "تاکنا جھانکنا" ان سے کبھی نہیں گیا، جو صرف زندگی ہی کی علامت نہیں، حسرت کی عظمت کی بھی علامت ہے۔

اقبال اور کشمیر

مصنف: جگن ناتھ آزاد
قیمت: پندرہ روپے
میسرز علی محمد اینڈ سنز، بک سیلرز اینڈ پبلشرز، لال چوک، سری نگر، (کشمیر)

کسوٹی

ڈاکٹر یعقوب عمر

> کسوٹی میں تعمیری تنقید کی حوصلہ افزائی کی جائیگی اور اسکے لئے یہ ضروری نہیں کہ ہر تنقید نگار کی رائے ...ر کے نقطۂ نظر سے مطابقت رکھتی ہو۔ مطمعِ نظر صرف یہ ہے کہ اس سے نئی نسل ادبا و شعراء نہ صرف استفادہ ...سکیں بلکہ تعمیری اندازِ فکر کی نشو و نما بھی ہو۔
>
> ادارہ۔

شاذ تمکنت

مفاہمت

ورقِ انتخاب کی بہترین نظم

...زیست سے تم نے نباہ کر لی ہے ؛ مفاہمت کا یہ سودا کہیں گراں تو نہ تھا
...ری تو نہ ٹھہری بلاکشی کے عوض ؛ کوئی فریفتہ کوئی کشاں کشاں تو نہ تھا

...سکو تو بتا دو ہمیں بھی راز کی بات ؛ یہ بات کیسے بنی، کیسے کاروبار ہوا،
...ن دین کا جھگڑا چکا تو کیسے چکا ؛ پتہ چلے تو سہی کون کس پہ بار ہوا،
...ہے تو ہونگے، پرانے، نئے، گلے شکوے ؛ نگاہ کس کی جھکی کون شرمسار ہوا،
...ری کونسی شرطیں تھیں، کیا تقاضے تھے ؛ اُدھر سے کونسا پیمان اُستوار ہوا،

شمارِ حسرتِ ناکام بھی ہوا ہوگا،
اگر ہوا تو ہمارا بھی کچھ شمار ہوا،

...ت شعروں پر مشتمل اس نظم کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ یہ شدتِ تاثیر اور وفورِ جذبات کے ساتھ ساتھ توازن لئے ہوئے ہے۔ انا کا گلا گھٹنے کے باوجود شاعر کے ہاتھ سے رہوارِ ضبط کی لگام نہیں چھوٹی۔ معاشرتی ...کا جو کرب ناک ادراک اسمیں نظر آتا ہے اسکے باوجود طنز کی تلخی چھپ نہ سکی علاوہ بریں یہ اور بات ہے کہ میں تلوار کی کاٹ ...ی کھنک موجود ہے اور اسی توازن نے نظم میں بے پناہ تاثیر پیدا کر دی ہے۔

...ی خصوصیت، خوش خرام روانی کے ساتھ ساتھ جو اُٹھان ہے اسمیں کہیں بھی جھول نظر نہیں آتا۔ اور ...سکے ساتھ اس منزل تک پہونچ گئی ہے جہاں تاثر اپنے کلائمکس پر نظر آتا ہے چنانچہ نظم کا آخری شعر ...بر محل اور موثر ہے جیسے کامیاب رباعیوں کا چوتھا مصرعہ

تیسری خصوصیت یہ ہے کہ پرانی روایاتی شاعری کے پیمانے استعمال کرنے کے باوجود شاعر نے ایک جدید
نظم کرنے میں جو کامیابی حاصل کی ہے وہ نہ صرف فکر انگیز ہے بلکہ معنی خیز بھی ہے۔
چوتھی خصوصیت، عنوان اعتبار برمحل ہے کہ ہر شعر میں اسکی بازگشت سنائی دیتی ہے۔
پانچویں خصوصیت یہ ہے کہ اس نظم میں تغزل موجود ہے جو بقول پروفیسر جگن ناتھ آزاد ـــ ساری شاعری کی

اب ہم شاذ تمکنت کی غزلوں سے چند منتخب اشعار پیش کرتے ہیں

۱ - مسافر راہ میں ہیں شام گہری ہوتی جاتی ہے ـــ سلگتا ہے تری یادوں کا بن آہستہ آہستہ
مضمون گو پرانا ہے لیکن جس ندرت سے ادا کیا گیا ہے وہ خاصے کی چیز ہے۔ اس مضمون پر موجودہ عہد میں اس شعر
بڑی شہرت حاصل کی ہے ؎
اجالے اپنی یادوں کے ہمارے ساتھ رہنے دو ـــ نہ جانے کس گلی میں زندگی کی شام ہو جائے
"سلگتا ہے تری یادوں کا بن" اگر شاذ اسمیں استعمال نہ کرتے تو شعر میں خوبی پیدا ہوتی نہ ندرت ـــ
شعرا کو چاہیئے کہ جب وہ کوئی پرانا مضمون باندھیں تو اس امر کو بطور خاص ملحوظ رکھیں۔
۲ - شب و روز جیسے ٹھہر گئے، کوئی ناز ہے نہ نیاز ہے۔

ترے ہجر میں یہ پتہ چلا مری عمر کتنی دراز ہے

یہ مضمون بھی اتنا ہی پرانا ہے جتنا کہ جذبۂ محبت کہن سال ہے۔ اکثر اساتذۂ سخن نے اسے طرح طرح
سے باندھا ہے چنانچہ غالب کہتے ہیں ؎

کیا جانے کب سے ہوں میں جہانِ خراب میں
شب ہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں

شاذ نے اس مضمون میں بھی ندرت پیدا کی ہے اور اسے تقریباً اپنا لیا ہے۔ شب و روز کا ٹھہ
اور "مری عمر کتنی دراز ہے" کے ٹکڑوں نے شعر میں جان ڈالدی ہے۔
۳ - یہ کائنات سوالات کا دھندلکا ہے ـــ جواب مل نہ سکا آج تک ٹھکانے کا۔ یہ ایک ایسا
ہے جو ہر دور اور ہر زبان کی شاعری میں مل جاتا ہے۔ رازہائے کائنات کی گتھیاں سلجھانے
ناکام ہو کر اکثر حکمائے وقت نے انہی خیالات کا اظہار کیا ہے چنانچہ حافظ شیرازی کہتے ہیں ؎

حدیث از مطرب و مے گو و راز دہر کمتر جو
کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معمارا

اسی مضمون کو فغانی نے ایک نئے انداز سے یوں ادا کیا ہے اور تقریباً اپنا لیا ہے ؎

آں کہ ایں نامۂ سربستہ نبشت است نخست
گرہے سخت بسر رشتۂ مضمون زدہ است

شاذ تمکنت نے "سوالات کے دھندلکے" اور "ٹھکانے" جیسے الفاظ بروئے کار لاکر نہ صرف جد

سے کام لیا ہے بلکہ لطف زبان بھی پیدا کر دیا ہے۔

۴ - فردوس بدر ہو کے پھر سوئے زمیں لوٹیں ـــــ پھر ساتھ جئیں ہم تم پھر صبح ازل آئے۔ شاذ کی شاعری میں محبت اور حبیب کا جو تصور ملتا ہے وہ ماورائی نہیں بلکہ اسی دنیا کی چیز ہے وہ جس زمین پر بستے ہیں وہیں کی بات کرتے ہیں۔ حواس خمسہ کی حدود میں رہکر جو چاہت کی جاتی ہے اسکا بھرپور اظہار شاذ کی شاعری میں ملتا ہے اس شعر کا مرکزی مضمون بھی محبت ارضی ہی کا پہلو لئے ہوئے جسکا اظہار ہندی شاعری میں طرح طرح سے کیا جاتا ہے۔ شاذ نے اس شعر میں "فردوس بدر" اور صبح ازل" کی ترکیب کے ذریعے جن تحیقانہ تلمیحات سے کام لیا ہے اُس نے شعر میں ندرت پیدا کر دی ہے۔

- گناہ اور حسین اہرمن کے بس میں نہیں۔

ستم ظریف کوئی بندۂ خدا ہی نہ ہو۔

اس شعر میں مضمون آفرینی کے ساتھ لطف زبان نے شعر کو بے پناہ خوبصورتی عطا کر دی ہے۔ مصرعے کی برجستگی اور روانی سے زمینِ شعر بلند ہو گئی ہے۔

لَا تَقْنَطُوا مِن رَّحْمَةِ اللّٰهِ

تاریخِ وفات حسرت آیات جناب شاذ تمکنت صاحب مرحوم

موت کا ہے محاذ اے ساقی
ہے جزا کا نفاذ اے ساقی
شاہِ کونین کے وسیلے سے
خلد میں اب ہیں شاذ اے ساقی

۱۹۸۵ء

نتیجۂ فکر بشیر الدین بشیر وارثی

بچوں کا صفحہ

محمد عبدالحمید بادل
قلعہ گولکنڈہ

اور وہ بھٹک گیا!

خالد، بیوہ مریم کا اکلوتا چشم و چراغ تھا وہ دسویں جماعت کا طالب علم تھا۔ بڑا ذہین نیک اور ماں کا اطاعت گزار بیٹا تھا مریم بستی کے لوگوں کے کپڑے سی کر خالد کی پڑھائی اور گھر کا خرچہ چلا رہی تھی اسے اُمید تھی کہ ایک دن خالد ضرور کچھ بن جائیگا اور پھر مجھے آرام ہی آرام ملے گا۔ مریم شادی کے ایک سال بعد ہی اپنے شوہر کو ایک کار کے حادثہ میں گنوا چکی تھی اور تب سے مریم بیوہ کا روپ لئے اپنے دل کے ٹکڑے خالد کو سینے سے لگائے دن گزار رہی تھی اپنے ماں باپ کے بیحد اصرار کے باوجود بھی مریم نے دوسری شادی کرنے سے انکار کر دیا تھا خالد ہی اس کے جینے کا مقصد بن چکا تھا مریم اپنی ساری زندگی خالد کے لئے وقف کرنے کی ٹھان چکی تھی۔

لیکن چند دنوں سے خالد بدل سا گیا تھا۔ اپنے بیٹے کو دن بدن بگڑتا دیکھ کر مریم حیران بھی تھی اور پریشان بھی اسے اپنے سپنے ٹوٹتے بکھرتے نظر آ رہے تھے۔ خالد کے آوارہ ہونے کی وجہ تھی اس کا ایک سنیما بینی کے بھیانک مرض میں مبتلا ہو جانا۔ خالد نے جب 3D فلم کی اپنے دوستوں سے تعریفیں سنی تو اس کا من بھی 3D فلم دیکھنے کو مچل اٹھا تھا وہ اس طوفان کو دبانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن آخرکار دوستوں کے مسلسل اصرار پر اور اپنے دل کے کسی گوشے میں جاگے 3D فلم دیکھنے کے شوق نے اس کے قدموں کو تھیٹر کی طرف موڑ دیا تھا یہ اس کی زندگی کی پہلی فلم تھی۔

پھر تو خالد فلموں کا ایسا دیوانہ ہو گیا تھا کہ اپنی ماں کے صندوق سے روپئے چرا چرا کر فلم دیکھنے لگا تھا اور آوارہ دوستوں کے ساتھ رہنے لگا تھا وہ خالد جسے یہ سن کر حیرت ہوتی تھی کہ لوگ فلم دیکھنے کی خاطر بھوکے بھی رہتے ہیں اور آج وہ خود ایسا ہو چکا تھا کہ اس کے آوارہ دوست بھی حیران تھے۔

سچ مچ فلمیں ہمارے معاشرہ میں بُری طرح زہر گھول رہی ہیں۔ خالد اسکول جانے کے بہانے آوارہ لڑکوں کے ساتھ تھیٹر پہنچ جاتا اور کبھی اسپیشل کلاس (SPEciL cLASS) کا بہانہ کر کے فلمیں دیکھتا تو کبھی فلم دیکھنے کی خاطر ماں سے جھوٹ کہتا کہ

آج شام مجھے دعوت میں جانا ہے تم اپنے لئے ہی کھانا بنا لینا" اب خالد پر اپنی ماں کی نصیحتوں کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا فلموں نے خالد کو آوارہ بنا دیا تھا۔

دن یوں ہی گزر رہے تھے ایک دن رات بھر جب خالد گھر نہیں آیا تو مریم کا پریشانی سے عجیب حال ہو گیا۔ اسے طرح طرح کے خیالات پاگل بنا رہے تھے صبح وہ ناشتہ کئے بغیر ہی پریشانی کے عالم میں صحن میں ادھر سے اُدھر ٹہل رہی تھی کہ دفعتاً دروازہ پر دستک ہوئی مریم امید بھرے تیز قدموں سے دروازہ کی طرف لپکی اور دروازہ کھولا.........

لیکن وہاں خالد کا ایک ساتھی کھڑا تھا آنے والے نے جو اطلاع دی اسے سن کر مریم کا سر چکرا گیا یہ صدمہ مریم کا دل برداشت نہ کر سکا مریم پہلے تو لڑکھڑائی اور پھر آسمان سے ٹوٹتے ہوئے کسی ستارے کی مانند فرش پہ دھڑام سے گر پڑی۔ خالد اور اس کے ساتھی نے کل رات سیٹھ جمنا داس کے ہاں تجوری سے تقریباً بارہ ہزار روپے چوڑ کر راہ فرار اختیار کی تھی انھوں نے یہ چوری ایک فلم میں دیکھی ہوئی ڈاکہ زنی کی ترکیب کو اپناتے ہوئے کی تھی اور پولس بہت جلد چابکدستی اور ہوشیاری سے کام لیتے ہوئے آج دن کی اولین ساعتوں میں خالد اور اس کے ساتھی کو گرفتار کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ اس طرح آج فلموں نے ٹھیک خالد کو ایک مجرم بھی بنا دیا تھا۔

عزیز بچو! ٹی وی بھی کوئی اچھی چیز نہیں ہے لوگوں نے ٹی وی اپنے گھر لا کر گھر کو تھیٹر بنا لیا ہے سینما بینی یقین جانو ایک بھیانک مرض ہے۔ اور وہ بھی لاعلاج۔ سینما بینی اچھے ذہنوں کو بھی خراب کر دیتی ہے اور جنت کے حقدار کو بھی جہنم کا مستحق بنا دیتی ہے شاید کہ آج کا انسان بزرگوں کا یہ قول بھول بیٹھا کہ "وقت کی قدر کرو گیا وقت لوٹ کر آتا نہیں" وقت گزارنے کی خاطر فلم دیکھنا کوئی دانشمندی نہیں بلکہ انسان کی سب سے بڑی نادانی اور بیوقوفی ہے۔

غزل

عرفی خالد گیرو

تری دوری کا اتنا غم نہیں ہے
مگر جینا بھی ہے کچھ کم نہیں ہے

سلیقہ مند ہنس کر جی رہے ہیں
جہادِ زندگی ماتم نہیں ہے

محبت کرنے والو مسکراؤ
کہ مفہومِ محبت غم نہیں ہے

مری قسمت کا بل ہے کیا کھلیگا
یہ تیرے گیسوؤں کا خم نہیں ہے

تسلسل ٹوٹ جاتا ہے تڑپ کا
ستم بھی آپ کا پیہم نہیں ہے

سوا تیرے کسی کے پاس آ دوست
دلوں کے زخم کا مرہم نہیں ہے

نہ جانے کس پہ کب آ جائے خالد
طبیعت کا کوئی عالم نہیں ہے

بزم خیال

(اس عنوان کے تحت قارئین کے دو علمی یا ادبی سوالوں کے جواب دیئے جائینگے)

س - ایرکولر اور ایرکنڈیشنر کی ایجاد سے پہلے ہندوستان میں گرمی کا مقابلہ کسطرح کیا جاتا تھا؟

ج - جہاں تک غریبوں کا معاملہ ہے وہ پہلے بھی گرمی برداشت کرتے تھے اور اب بھی کرتے ہیں البتہ آسودہ حال لوگ طرح طرح سے گرمی کا مقابلہ کیا کرتے تھے - امراء اور بادشاہوں کے محلوں میں بڑے بڑے باغات ہوا کرتے تھے جن میں دن رات فوارے چلا کرتے تھے - درختوں اور پانی کی کثرت سے مرکزی عمارت کا درجہ حرارت بڑھنے نہیں پاتا تھا مگر شدت گرما کے مقابلے کے لئے عموماً زیرزمین تہہ خانے یا پائیں باغ میں حوض کے قریب خس خانے بنائے جاتے تھے - تہہ خانوں میں زمین کی نمی کے باعث درجہ حرارت کم رہتا تھا مگر تہہ خانوں میں ہوا کی آزادانہ آمد و رفت کا کوئی انتظام نہ ہونے کی بناء پر خس خانوں کو ترجیح دی جاتی تھی - خس خانے خس نامی خوشبودار گھاس کے چھپروں سے بنائے جاتے تھے اسی گھاس کی تاثیر بہت ٹھنڈی ہے - حوض قریب ہونے کی بناء پر خدمتگار ان کو متواتر پانی سے نم رکھا کرتے تھے - اسمیں بالکل ایرکنڈیشنر کی طرح ٹھنڈک محسوس ہوتی تھی اور خس کی لطیف مہک سے دل و دماغ میں ایک قسم کی فرحت دوڑ جاتی تھی -

س - یہ شعر کس کا ہے

آزردہ رفت از لب تشنہ حسین
اے آب خاک شو کہ ترا آبرو نماند

ج - یہ شعر راجہ رام نرائن موزوں کا ہے جو شجاع الدولہ ناظم بنگال کے درباری ملازم تھے بعد میں ترقی کرتے ہوئے پٹنہ کے ناظم ہو گئے تھے - جب میر قاسم والی بنگال بنا تو ۱۷۶۳ء میں دیگر امراء کے ساتھ انھیں بھی قید کر دیا گیا تھا - تین دن بے آب و دانہ قید رکھنے کے بعد انھیں پانی دیا گیا تو انھوں نے فی البدیہہ یہ شعر پڑھا اور پانی پھینک دیا -

مکتوبات

(اس عنوان کے تحت سربرآوردہ قارئین کے خطوط پیش کئے جاتے ہیں)

بدیع الزماں، اڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ (موظف) کا خط

پھلواری شریف - ۳۱ جولائی ۱۹۸۵ء

مکرمی، سلام مسنون! شمارۂ جولائی بہت پسند آیا۔ یہ بھی تاریخ کا المیہ ہے کہ شمالی ہندوستان جو اردو کا گہوارہ تھا وہاں کوئی رسالہ دو تین شماروں کے بعد زندہ نہیں رہتا مگر جنوبی ہندوستان میں پائے کے رسالے برابر نکلتے ہیں اور زندہ رہتے ہیں۔

نیازمند، محمد بدیع الزماں

ڈاکٹر مجید بیدار - شعبۂ اردو مولانا آزاد کالج کا خط

اورنگ آباد - ۱۰ اگست ۱۹۸۵ء

معزز و عالی قدر ایڈیٹر صاحب، تسلیم و نیاز

ذوقِ نظر کے جولائی کے شمارے کے مطالعے کے بعد دل و دماغ کو جو روحانی تازگی ملی اُسے الفاظ میں بیان کرنے سے قاصر ہیں۔ "مقامِ صوفیا" کے ذریعے جس روحانی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اسکی تاثیر دل کی گہرائیوں میں گھر کر گئی۔ نیز عبد بیدری پر ڈاکٹر محمد انصار اللہ کا مقالہ تحقیق کے نئے دھارے کو وسعت دیتا ہے۔ ہر مضمون اور شعری تخلیقات معیاری ہونے کے علاوہ اثر انداز ہونے کی خاصیت رکھتے ہیں۔ خاص طور پر "الرسالہ" سے انتخاب الجواب۔ خدا کرے کہ یہی معیار قائم رہے اور عمدہ تخلیقات کے مطالعے کے مواقع دستیاب ہوتے رہیں۔

خلوص کیش۔ (ڈاکٹر) مجید بیدار

جناب تسنیم فاروقی کا خط

مئو - ۸ راگست ۱۹۸۵ء

جناب مدیر! تسلیم و نیاز

شمارہ جولائی موصول ہوا۔ دورِ موجود کے پرچے آنکھوں کو خوش کر دیتے ہیں مگر دل و دماغ ان کے مخالف رہتے ہیں۔ میرے خیال سے ذوقِ نظر میرے پاس آنے والے ان جریدوں میں سے ہے جو دل و دماغ کو بھی رجوع کرانے میں کامران ہے۔ آپ کا اداریہ "حرفِ آغاز" ایک خصوصی مقصود و اور ...

...رنے کی کوشش ہے۔ طرز استعادہ تحریر بہت پسند آیا۔
...نثری مضامین میں "مقام صوفیا" ڈاکٹر سید وحید اشرف صاحب کا ایک مفصل اور مکمل...
...ہے۔ بڑے دلچسپ، سہل اور نیم تاریخی پیرائے کے ساتھ ہے۔ حصۂ نظم بھی ایسا ہے کہ بس بہت اچھا ہے۔
...تاج پیامی صاحب کا مضمون بھی حقیقتاً قابل ذکر ہے۔ بس ذرا عنوان بہت تیز ہوگیا ہے۔ مولانا حالی کے...
...تنقید کو خواہ مخواہ غیر ملکی مصنفین اور ناقدین کے اقوال و فلسفے میں الجھایا گیا ہے جو ماحول، حقائق اور...
...بیان کے منافی ہے۔ کلیم الدین احمد کے نفس تنقید پر جو بحث ہے وہ ضرور بہت معقول ہے۔

تسنیم فاروقی

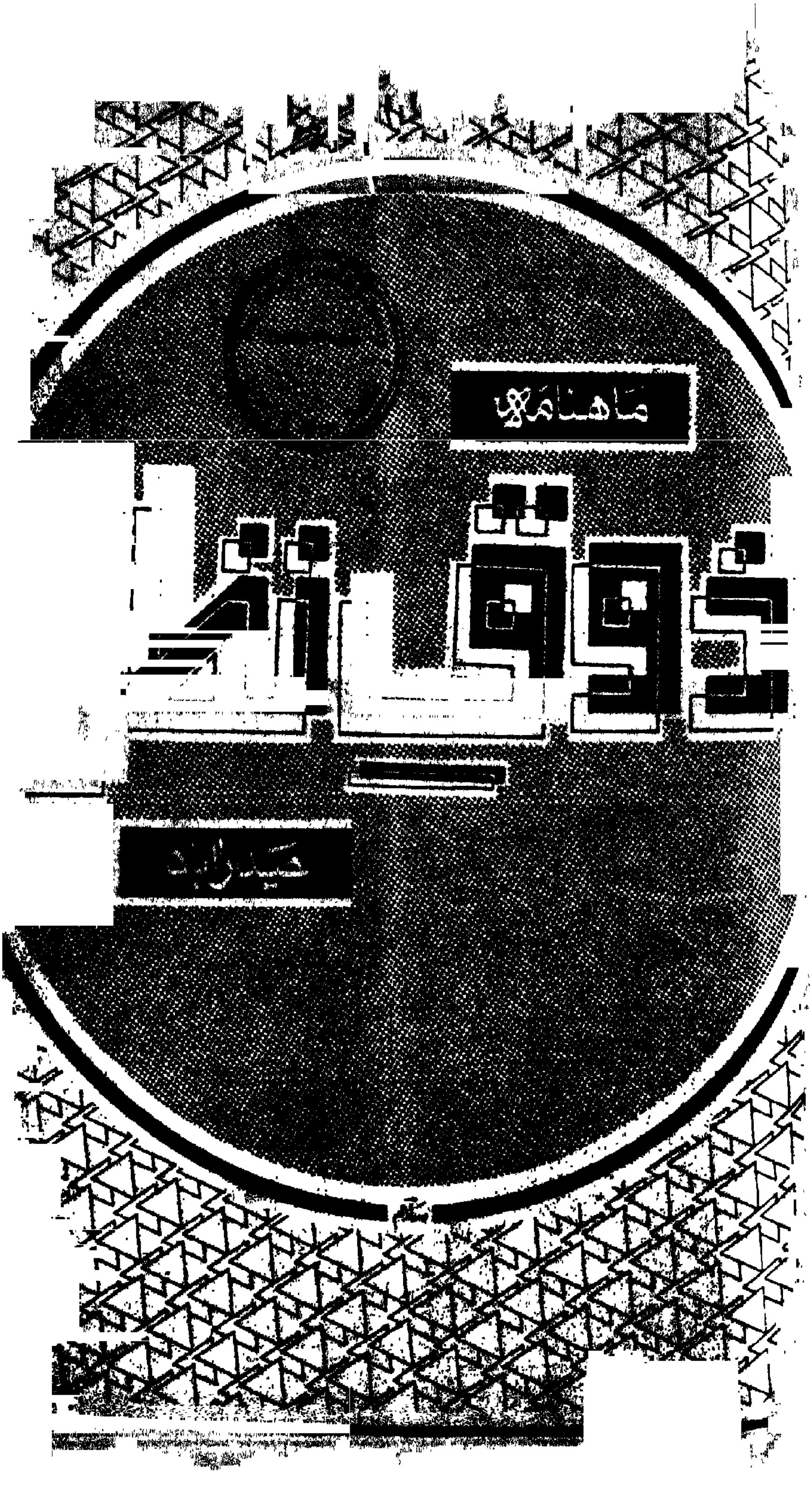
جناب مہدی پرتاپ گڑھی کا خط

۲۷ جولائی ۱۹۸۵ء۔ پرتاپ گڑھ

برادرم۔ سلام مسنون

ذوق نظر کے دو شمارے باصرہ نواز ہوئے۔ رسالے میں شریک ادبی اور مذہبی دونوں حصے گراں قدر ہیں اور آپ کی ژرف نگاہی کی دلیل بھی۔ مقطعہ خلیل رحمٰن ثاقب اور تاج پیامی کے مضامین پسند آئے۔ امید ہے کہ آپ اسے مزید نکھارنے کی سعی کریں گے۔

مخلص۔ مہدی پرتاپگڈھی


ماہنامہ
حیدرآباد

آرمی پریشر کوکرز

آج ہی خرید یئے۔ پکوان اب کوئی مسئلہ نہیں رہ گیا۔ بس
آرمی پریشر کوکرز پر کم وقت میں بیک وقت دو ۲ تین ۳ اقسام کی لذیذ ڈشس
تیار کر لیجئے۔ وقت رقم اور ایندھن کی خاطر خواہ بچت کا ضامن آرمی پریشر کوکرز
مختلف سائز اور گنجائش کے مختلف ماڈلس

۵ سالہ گیارنٹی کے ساتھ

سول ڈسٹری بیوٹرس: سپریم ایجنسیز

شاپ نمبر 20-4-1199 بلال مارکٹ، لاڈ بازار۔ چارمینار، حیدرآباد ۲

بنانے والے:

امر برادرس اینڈ کمپنی

اسٹاکسٹ:

مظہر برادرس عثمانیہ بازار

حیدرآباد، اے پی

ذوقِ نظر

حیدرآباد

فون نمبر (525117)

جلد (۱)

اکتوبر ۱۹۸۵ء

شمارہ (۱۰)

مدیر اعلیٰ :- محمد بشیر الدین بشیر وارثی

مدیر انتظامی :- خورشید جنیدی

مدیر اعزازی : ڈاکٹر یعقوب عمر

ناظم نشر و اشاعت : عابد قادری

مشیر قانونی :- محمد شمیم ایڈوکیٹ

مجلسِ مشاورت

ڈاکٹر عبدالستار خان

ڈاکٹر وحید اشرف

مبشر احمد

علی احمد جلیلی

ڈاکٹر عقیل ہاشمی

تعاون : سالانہ پچاس روپے فی شمارہ پانچ روپے
عرب ممالک سے فی شمارہ ۵ ریال

بشیر الدین ایڈیٹر پرنٹر و پبلشر نے [illegible] پریس [illegible] سے چھپوا کر دفتر [illegible] حیدرآباد سے شائع کیا

اس شمارے میں

حرف آغاز

یہ کوئی بہت پرانی بات نہیں ہے صرف نصف صدی قبل ایسی جامع العلوم ہستیاں پیدا ہوتی تھیں جو صرف کسی ایک شاخ میں نہیں بلکہ کئی کئی علوم میں مہارت حاصل کرتی تھیں پچھلے پچاس سال میں یہ کیسا انقلاب برپا ہو گیا ہے کہ اب ہستیوں کو دیکھنے کیلئے آنکھیں ترستی ہیں۔

ایسا لگتا ہے کہ میدان علم و ہنر میں جو انحطاط آیا ہے وہ ساری قوم کو لے ڈوبے گا پہلے کمال حاصل کرنے کیلئے علم سیکھا جاتا تھا اور آج صرف ڈگری حاصل کرنے کیلئے سیکھا جاتا ہے رفتہ رفتہ اسمیں بھی اتنی گراوٹ آ گئی ہے کہ اب جس قدر جد و جہد کی جاتی ہے وہ صرف سند حاصل کرنے کیلئے ہوتی ہے علم حاصل کرنے کیلئے نہیں۔ اسمیں بھی جائز طریقوں کو خیرباد کہہ دیا گیا ہے ہر اس دروازے پر دستک دی جانے لگی ہے جہاں سے کسی بھی طرح ڈگری حاصل ہو جائے۔

ہر عمل کا کوئی نہ کوئی رد عمل ہوتا ہے چنانچہ میدان علم و ہنر کی کم عیاری کا یہ نتیجہ سامنے آیا ہے کہ زندگی کے ہر شعبے میں نا اہلوں کی کثرت ہو گئی ہے اور سب سے زیادہ تعلیم و تدریس کے شعبے متاثر ہوئے ہیں۔ تعلیم و تدریس کسی بھی قوم کی ریڑھ کی ہڈی ہوتا ہے اور اگر یہ کم عیاری کے ناسور سے متاثر ہو جائے تو ساری قوم زوال پذیر ہو جاتی ہے

آج کی انتہائی تیز رفتار دنیا میں مغربی ممالک نے جو ترقی کی منزلیں طے کی ہیں وہ یقیناً اس امر کا ثبوت ہے کہ انھوں نے میدان علم و ہنر میں نہ صرف اعلیٰ معیار قائم رکھا ہے بلکہ اس سلسلے میں کڑی محنت سے بھی دریغ نہیں کیا ہے۔ مگر اس عمل میں انھوں نے جو کچھ کھو دیا ہے وہ بڑا زبردست نقصان ہے اور مشرقی قومیں اسکی متحمل نہیں ہو سکتیں مغربی دنیا نے اخلاقی اور روحانی اقدار کو مادی کامیابی کی قربانگاہ پر بھینٹ چڑھا دیا ہے۔ یہ ہم نہیں کہیں گے ہمیں اپنے اسلاف کی علمی و اخلاقی دونوں تعلیموں کو سامنے رکھکر قدم آگے بڑھانا ہے اس سے رہنمائی حاصل کرنا ہے ہمارے پاس جو بزرگوں کا بیش بہا سرمایہ ہے وہ مغربی دنیا کے پاس نہیں ہے وہ صرف نظم و ضبط کی بنیاد پر مادی ترقی میں آگے بڑھ گئے ہیں اگر ہم بھی نظم و ضبط پر عمل پیرا ہو جائیں تو اُن سے آگے بڑھ جائینگے کیونکہ اخلاقی اقدار کی جو دولت ہمارے پاس ہے وہ انکے پاس نہیں ہے۔

آج جبکہ نا اہلوں کی سر بلندی کی بنا پر نہ صرف اخلاقی زندگی بلکہ انسانی زندگی بھی عظیم خطرے سے دوچار ہو گئی ہے اور قوم کے قعر مذلت میں گر جانے کا اندیشہ قوی ہو گیا ہے ہمارے ارباب دانش کی ذمہ داری بڑھ گئی ہیں انھیں صرف نظریاتی تعلیم پر اکتفا نہیں کرنا ہے بلکہ اپنی ذات و شخصیت میں عملی نمونہ بھی پیش کرنا ہے۔ آج ارباب دانش چوک گئے اور انھوں نے اپنا فرض منصبی پورا نہیں کیا تو نہ صرف آئندہ نسل بلکہ آئندہ صدیاں انھیں معاف نہیں کرینگی اور جو چیز تاریخ کے صفحات پر درج ہو جاتی ہے اسے قیامت تک کوئی نہیں مٹا سکتا۔

ربّ العالم ربّ العالم	۲۷ جولائی کو آستانہ چشتیہ نظامیہ دانا پور کے سجادہ نشین حضرت شاہ محمد قاسم قتیل داناپوری کا ۸۵ سال کی عمر میں انتقال ہو گیا۔ موصوف اردو اور فارسی کے جید شاعر اور بہترین خطیب و مقرر تھے۔ اردو اور فارسی دیوانوں کے علاوہ وہ موصوف تقریباً چالیس کتب کے مصنف تھے۔

شدم ... دل ... مسلم ... جنت ... نگر ... تیرت ... سے

نعت شریف

روشن ہے مہر سے بھی کہیں آج کی سحر ⁂ ظلمت کے بت پڑے ہیں شکستہ ادھر ادھر
آتش کدے ہیں سرد تو ناقوس ہیں خموش ⁂ توحید کی صدا سے لرزتے ہیں بام و در
کسریٰ کی شان روم کی عظمت بھی مٹ گئی ⁂ صحرا نشیںؐ کی نطق کا ایسا ہوا اثر
بے جان کنکری نے کہا یہ رسولؐ ہیں ⁂ انگلی کے اک اشارہ سے شق ہو گیا قمر
چشم زدن میں فرش سے تا عرش تھے حضورؐ ⁂ جبریل بھی پہنچ نہ سکے جس مقام پر
چھوٹے بڑے کا فرق جہاں سے مٹا دیا ⁂ انؐ کا کرم کہ بڑھ کے ملائک سے ہے بشر
حیراں تھا آدمی کہ الٰہی یہ کیا ہوا ⁂ دنیا بدل گئی تھی اٹھی جس طرف نظر
شمع جمالِ قدس کے پروانے بن گئے ⁂ عثمانؓ ہوں علیؓ ہوں ابوبکرؓ یا عمرؓ

اوصاف آپؐ کے ہوں بیاں اور تاج سے!
بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

تاج پیامی
دارالادب
مہادیوا محلہ آرا (بہار)

منقبت

○

کربل کے واقعہ کو زمانے گذر گئے
شاید ہم اپنے جذبۂ حق سے مکر گئے
بچے گئے، جوان گئے، گھر کے گھر گئے
اک ایک کر کے سارے بہتر گذر گئے
جانباز سن رسیدہ کے عزم جوان سے
شمر لعین کے سبھی لشکر بکھر گئے
اے موجۂ فرات تڑپ عمر بھر تڑپ
شبیرؓ تیرے سامنے پیاسے گذر گئے

منظر محی الدین منظر (کرناٹک)

خواجہ شوقؔ

سلام

الحسین منی کا ہیں جلوہ کمال حسینؑ
حق مزاج و حق نظر حقدار و حق منزل حسینؑ

اہلِ دل آواز دیں کس کو بجز مشکل حسینؑ
آپ کے قدموں میں ہے ایمان کی ہر منزل حسینؑ

کیوں نہ کرتے کربلا سازی میں گھر شامل حسینؑ
دین اسی گھر سے چلا اور ہو گیا ضم فی الحسینؑ

دینِ حق کا ہیں سراپا بحر ہے ساحل حسینؑ
جاں حسینؑ ایماں حسینؑ و دیں حسینؑ و دل حسینؑ

شانِ ختم المرسلینؐ پوری دکھائی آپ نے
ورنہ یہ میدان تھا نبیوں سے بھی مشکل حسینؑ

ظلم و آفت کی ہوئی دنیا میں فریاد آج تک
آپ کا ایثار ہے فریاد کے قابل حسینؑ

اہلِ بیتِ پاک کے جوہر زمانے پر کھلے
کربلا ہے آپ کے کردار کی محفل حسینؑ

بات رکھ لی رحمۃ اللعالمینی خون نے
تاب کیا لاتی تھی یہ دنیائے آب و گل حسینؑ

آپ کے آگے کسی کا جل نہ سکتا تھا چراغ
آپ کی عظمت ہوئی ہے آپ کی قاتل حسینؑ

جو نہ ہونا تھا وہ سب کچھ کربلا میں ہو چکا
اب اگر شرمندہ ہے باطل تو کیا حاصل حسینؑ

شوقؔ ہمت کس کی ہے جو لب کشائی کر سکے
خطِ فاصل بن گئے بینِ حق و باطل حسینؑ

سلام

مٹا کے خود کو سیادت کی آبرو رکھ لی ؛ حسینؑ تم نے نیابت کی آبرو رکھ لی
وفا کی راہ میں سرگرم کارزار رہے ؛ ہٹے نہ پیچھے شجاعت کی آبرو رکھ لی
لگا کے راہِ صداقت میں جان کی بازی ؛ حسینؑ آپ نے ملّت کی آبرو رکھ لی
رکھا نہ کوئی قدم مرضئ خدا کے خلاف ؛ خدا کا شکر اطاعت کی آبرو رکھ لی
یزید فاسق و فاجر کے ظلم کو سہہ کر ؛ حسینؑ تم نے شرافت کی آبرو رکھ لی
شکن نہ آئی جبیں پر ہزار ظلم سہے ؛ شہید ہو کے شہادت کی آبرو رکھ لی

علیؑ کے لعل، محمدؐ کی آلؑ نے زاہد!
گلا کٹا کے شجاعت کی آبرو رکھ لی

سید غوث الدین علیخاں زاہد قادری

ڈاکٹر یعقوب عمر
(ریڈر فارسی، نظام کالج)

(جشنِ سعدی منعقدہ ابوالکلام آزاد انسٹی ٹیوٹ کے آخری سشن کا خطبۂ صدارت)

حیاتِ سعدی کے مختلف پہلو اس عہد کے سماجی پس منظر میں

سعدیؒ شیرازی کی انقلابی شخصیت ایران، افغانستان اور برصغیر کی گذشتہ آٹھ سو سالہ سیاسی، سماجی اور تہذیبی زندگی پر جتنی محیط رہی ہے وہ بذاتِ خود حیرت انگیز ہے جو بقائے دوام انھوں نے حاصل کیا ہے وہ فردوسی، رومیؒ اور حافظ بھی حاصل نہ کرسکے۔ فردوسی، رومیؒ اور حافظ کے اثرات سے انکار نہیں کیا جاسکتا مگر وہ کسی نہ کسی ایک گوشۂ حیات تک ہی محدود رہے۔ فردوسی کا زیادہ سے زیادہ اخلاقی اور رزمیہ پہلو پر محیط رہا۔ رومیؒ کا اثر صوفیانہ زندگی اور عارفانہ مکتبِ فکر کے دائرے میں رہا اور حافظ جہاں ایک طرف اہلِ عرفان کے لئے سرمایۂ وجدان بنے وہیں رندی و ہوسناکی سے رغبت رکھنے والوں نے بھی انھیں اپنا منظورِ نظر بنائے رکھا، مگر حضرتِ سعدیؒ کا یہ کارنامہ ہے کہ وہ مہد سے لے کر لحد تک زندگی کے ہر پہلو پر گذشتہ آٹھ صدیوں سے محیط رہے ہیں اور جب تک فارسی زبان باقی رہے گی وہ اس منصب پر بلا شرکتِ غیرے قابض رہیں گے۔

جس طرح قوسِ قزح میں اس کائنات کی تمام رنگینیاں سمٹ گئی ہیں اسی طرح سعدی کے کلام میں ہر رنگ جلوہ گر ہے۔ انھوں نے دنیا کو جس جس پہلو سے دیکھا، نہ صرف بلا کم و کاست بیان کردیا بلکہ ہر پہلو پر اپنا تبصرہ، تجزیہ اور مخصوص حالات میں ان سے عہدہ برآ ہونے کے گر بھی واضح طور پر بتادیئے۔

سعدی کا سب سے بڑا وصف صاف گوئی و حقیقت نگاری کے علاوہ ایسا واضح ابلاغ ہے جسے معمولی سوجھ بوجھ رکھنے والے اور حکیم دقت نہ صرف سمجھ سکتے ہیں بلکہ عمل بھی کرسکتے ہیں۔

سعدی کا اندازِ فکر نہایت انقلابی ہے۔ چنانچہ گزشتہ آٹھ صدیوں پر ہی ان کی فکر محیط نہیں

رہی بلکہ وہ سفر کرتے ہوئے ہمارے دور میں بھی پہونچی ہے اور اتنی ہی موثر ہے جتنی کہ عہد سعدی میں تھی۔ گزشتہ چند مہینوں میں ہمارا ملک جس ہلچل سے گزرا ہے اس کے پسِ منظر میں سعدی کا یہ شعر کتنا بلیغ ہے۔

؎ چواز قومی یکے بیدانشی کرد نہ کہہ را منزلت ماند نہ مہہ را یعنی: اگر قوم کا ایک فرد بھی حماقت کر بیٹھتا ہے تو پوری قوم رسوا ہو جاتی ہے۔

سعدیؒ شیراز اپنے عہد سے بہت آگے نکل گئے۔ یہاں تک کہ آج مسئلہ آبادی پر بھی ان کے خیالات کا انطباق بخوبی ہو سکتا ہے۔ اہل و عیال کی کثرت کا ایک مرقع وہ اس طرح پیش کرتے ہیں ؎

اے گرفتار پائے بندِ عیال دگر آزادگی مبند خیال
غم فرزند و نان و جامہ و قوت بازت آرد ز سیر در ملکوت
ہمہ روز اتفاق می سازم کہ بشب با خدائے پردازم
شب چو عقد نماز بر بندم چہ خورد بامداد فرزندم

یعنی۔ اہل و عیال میں گرفتار لوگ آزادی کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ بچوں کی فکر، ان کو لباس اور غذا بہم پہنچانے کے مسائل صوفی کو بھی عالم ملکوت سے اس دنیا میں واپس کھینچ لاتے ہیں۔ ہر روز یہی پروگرام بناتا ہوں کہ آج رات اللہ کی عبادت کروں گا مگر جیسے ہی نماز شروع کرتا ہوں یہ خیال ستانے لگتا ہے کہ صبح میری آل اولاد کیا کھائے گی۔

عہد سعدی میں جمہوریت کا کوئی تصور نہ تھا۔ مطلق العنانیت کا دور دورہ تھا اس کے باوجود سعدی کی دور اندیشی کی داد دینی پڑتی ہے کہ وہ حاکم میں وہی خوبیاں دیکھنا چاہتے تھے جو آج کا ترقی یافتہ جمہوری نظام چاہتا ہے۔ کہتے ہیں:

"بدانکہ ملوک از بہر پاسِ رعیت اند، نہ رعیت از بہر طاعت ملوک۔"

؎ گوسپند از برائے چوپان نیست بلکہ چوپان برائے خدمت اوست

یعنی۔ رعایا بادشاہ کی اطاعت گزاری کے لئے نہیں بلکہ بادشاہ رعایا کی خدمت کیلئے ہوتے ہیں۔ بھیڑیں چرواہے کے لئے نہیں ہوتیں بلکہ چرواہا ان کی دیکھ بھال کے لئے ہوتا ہے۔

ان کی اخلاقی تعلیم سے بھی واقف ہیں چنانچہ اس سے صرف نظر کرتے ہوئے اس تعلیم کے ایک انقلابی پہلو کی طرف اشارہ کروں گا جو واقعی چونکا دینے والا ہے کہ سعدی شیرازی کی دوربین نگاہیں نہ صرف دل کی گہرائیوں تک پہونچ جاتی تھیں بلکہ مختلف کرداروں کا نفسیاتی تجزیہ کرکے ان کے خیالات کو حق بجانب بھی ٹھہراتی تھیں چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ بخیل شخص کی اولاد اس کے مرنے کی تمنا کرے تو حق بجانب ہے ؎ چو در زندگانی بدی باعیال گرت مرگ خواہند ایشاں منال

کہیں کہیں تو ان کی فکر آج کے انقلابی خیالات کے بالکل ہم پلہ دکھائی دیتی ہے جس میں جابرانِ وقت کے سامنے سر جھکانا سب سے بڑا گناہ ہے چنانچہ سعدی ایک لڑکے کی زبانی اس کے والد پر اس لئے تنقید کرواتے ہیں کہ اس نے عزتِ نفس کا سودا کر لیا تھا۔ لڑکا اپنے والد کو حاکم وقت کے سامنے زمین بوسی کرنے پر اس طرح تنقید کرتا ہے کہ "آپ نے مجھے قبلہ دوسری جانب بتایا تھا اور آج آپ کسی اور طرف سجدہ کر رہے ہیں!" ؎

نہ گفتی کہ قبلہ است خاک حجاز چرا کردی امروز ازیں سو نماز

تصوف اور عرفانیات میں بھی ان کے خیالات اپنے زمانے سے بہت آگے ہیں۔ میدانِ تصوف میں گندم نما جوفروشوں کی بہتات اور فرقۂ ملامتیہ کے اثر و نفوذ نے اس مقدس تحریک کو جو نقصان پہنچایا اس کے خلاف انھوں نے اعلائے کلمۃ الحق کیا یہاں تک کہ اپنے عہد کے سماجی حالات اور فضا کو بھی نظر انداز کر دیا جو ان گندم نما جوفروشوں کے اثر و رسوخ سے بھرپور تھی۔ اپنے سیدھے سادے سچے خیالات نڈر ہو کر بیان کر دیئے کہ جامۂ تصوف پہن لینے کا نام سلوک نہیں ہے ؎

در عمل کوش و ہر چہ خواہی پوش تاج بر سر نہ و علم بر دوش
ترک دنیا و شہوت است ہوس پارسائی نہ ترک جامۂ و بس

یعنی — عمل شرط ہے اگر وہ ہے تو بادشاہی اور سپہ سالاری میں بھی حقیقت کا عرفان ہو سکتا ہے پارسائی دنیوی لہو و لعب اور خواہشات ترک کر دینے کا نام ہے دنیوی لباس ترک کر دینے کا نام نہیں ہے۔ ایک جگہ کہتے ہیں ؎

دلقت بچہ کار آید و تسبیح و مرقع خود را ز عملہائے نکوہیدہ بری دار

حاجت بکلاہِ برکی داشتنت نیست درویش صفت باش و کلاہ تتری دار

یعنی ۔ سجادہ و تسبیح اور صوفیانہ لباس کچھ کام نہیں آئے گا لہٰذا اپنے آپ کو برائیوں سے بچاؤ، فقیری ٹوپی ضروری نہیں۔ تاج شاہی بھی سر پر رکھتے ہوئے صفت درویشانہ رکھی جاسکتی ہے۔"

یہ عین ممکن ہے کہ حضرت سعدی کے ان خیالات کی بنا پر علامہ اقبال کو درویشی میں جلال و جبروت کی شرکت کا خیال آیا ہو چنانچہ وہ تصوف کے سرچشمے "نبوت" کے متعلق فرماتے ہیں

وہ نبوت ہے مسلماں کیلئے برگِ حشیش جس نبوت میں نہ ہو قوت و شوکت کا پیام

سعدی کا زمانہ وہ تھا کہ عامۃ الناس کا مذہب اوہام کے تانوں بانوں میں الجھا ہوا تھا۔ ایمان کی تابناکی مدھم ہوتے ہوتے تیسرے درجے پر پہنچ چکی تھی۔ حق پرست لوگ بھی امر بالمعروف کے سلسلے میں برائیوں سے صرف دل ہی دل میں نفرت کے مرحلے پر آگئے تھے۔ مگر سعدی ہیں کہ نہ صرف باآواز بلند، جو کہنا ہے کہہ دیتے ہیں بلکہ صحیفہ در صحیفہ قلمی اشاعت بھی کرتے ہیں۔

روزہ نمائشی بن چلا ہے۔ اس کی صحیح اسپرٹ سے لوگ بیگانہ ہوتے چلے جارہے ہیں ایسے میں سعدی نہایت سخت الفاظ میں اعلائے کلمۃ الحق کرتے ہیں ۔

خورندہ کہ خیرش برآید ز دست بہ از صائم الدھر دنیا پرست

مسلم کسے را بود روزہ داشت کہ در ماندہ را دہد نان چاشت

دگر نہ چہ حاجت کہ زحمت بری زخود باز گیری و ہم خود خوری

یعنی ۔ روزہ رکھنا ان کو زیب دیتا ہے جو اس کی حقیقی روح پر عمل کرتے ہیں ورنہ ایسی زحمت سے کیا فائدہ کہ روزہ رکھنے سے جو کھانا بچ گیا وہ کسی غریب کو دینے کے بجائے کچھ دیر بعد خود ہی کھالیتے ہیں ۔

تصوف کا دور دورہ ہے ۔ پیری مریدی کا بازار گرم ہے۔ آج ہی کی طرح جاہل مشائخ زادے اپنی رونق بازار بڑھانے کے لئے نسبت کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں کہ دامن تھام لو، باقی سب پیر دیکھ لیں گے۔ تمہاری اُخروی نجات بے حساب و کتاب ہوجائے گی مگر سعدی ہیں کہ باآواز بلند للکارتے ہیں ۔

خلاف پیمبرؐ کسے رہ گزید که هرگز بمنزل نخواهی رسید

یعنی ــ جو پیغمبرؐ کے راستے سے ہٹا وہ کبھی منزل تک نہیں پہونچ سکتا۔

انھوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ اُخروی نجات صرف شریعت کی پیروی سے حاصل ہو سکتی ہے اور کوئی راستہ نہیں ؎

پیمبرؐ کسے را شفاعت گرست که بر جادۂ شرع پیغمبرؐ است

یعنی ـ حضورؐ اس کی شفاعت کریں گے جو ان کے راستے پر ہے۔

انھوں نے گلستاں میں وضاحت کے ساتھ یہ حقیقت عیاں کر دی ہے کہ

"یا بنیّ انک مسئول یوم القیامت ما ذا اکتسبت ولا یقال من انتسبت۔"

یعنی : اے بیٹے قیامت کے دن تجھ سے تیرے عمل پوچھے جائیں گے نسبت نہیں پوچھی جائیگی۔

؎ چو کنعاں را طبیعت بے ہنر بود پیمبر زادگی قدرش نیفزود یعنی : نوحؑ کے بیٹے کی فطرت ہی بے عمل تھی اس لئے پیغمبر زادگی بھی اس کے کام نہ آئی۔

جہاں پیغمبر زادہ ہونے سے بھی کوئی فیض حاصل نہیں ہو سکتا وہاں مرکب پیغمبر ہونے سے بھی قدر و منزلت میں کوئی اضافہ نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ انھوں نے اس موضوع پر جو شعر کہا ہے وہ زبان زدِ عام ہے کہ ؎

خر عیسیٰ گرش بمکہ برند چون بیاید ہنوز خر باشد

غیب دانی اور کرشمہ نمائی پر جب آج کے ترقی یافتہ دور میں بھی توہم پرستی عجیب عجیب مباحثے پیدا کر دیتی ہے تو ظاہر ہے کہ سعدی کے دور میں جب کہ اوہام پرستی شباب پر تھی اس قسم کے عقائد پر ضرب کاری لگانا کوئی معمولی کام نہ تھا چنانچہ انھوں نے تمثیلاً اور تخیلاً دونوں طریقوں سے اس قسم کی بلند پروازیوں کو روکا ہے اور ایک توازن قائم کر کے بتلایا ہے کہ اس عقیدے کی حقیقت کیا ہے۔ کہتے ہیں ؎

نعوذ باللہ اگر خلق غیب داں بودے کسی بحال خود از دست کس نیاسودے

یعنی : نعوذ باللہ اگر مخلوق غیب داں ہوتی تو پھر کسی کو چین نصیب نہ ہوتا۔

دوسری جگہ حضرت یعقوبؑ کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ لوگوں نے ان سے پوچھا کہ اے پیر خردمند آپ نے مصر سے پیراہن یوسف کی خوشبو محسوس کرلی مگر چاہ کنعاں میں حضرت یوسفؑ کو نہ دیکھ سکے۔

یکی پرسید ازاں گم کردہ فرزند　　کہ اے روشن گہر پیر خردمند
ز مصرش بوے پیراہن شنیدی　　چرا در چاہ کنعانش ندیدی

تو انھوں نے فرمایا کہ ہاں کبھی کبھی پیغمبروں کے ساتھ بھی ایسا ہوتا ہے کہ کوئی چیز ظاہر کردی جاتی ہے اور کوئی نہیں ــــ　　بگفت احوال ما برقِ جہان است
دمی پیدا و دیگر دم نہان است

یہاں ایک بات کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ سعدی بھی بہرحال انسان تھے اور انسان ہونے کے ناطے وہ اپنے سماج اور معاشرے میں مشہور بعض ضعیف اور موضوع باتوں کو بھی قلم بند کر گئے ہیں اور اس سلسلے میں انھوں نے زیادہ تحقیق سے کام نہیں لیا ہے مثلاً حضرت ابراہیم والی حکایت کہ انھوں نے ایک آتش پرست مجوسی کو اپنے دسترخوان سے اٹھا دیا اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو تنبیہ کی اس حکایت میں کئی باتیں ناقابل تسلیم ہیں۔ ایک تو دین زرتشت کا اس زمانے میں ہونا جو بہت بعد کی چیز ہے اور دوسرے قرآن مجید میں حضرت ابراہیم کی اعلیٰ ظرفی کے جو بیانات ملتے ہیں یہ حکایت اس کے برخلاف معلوم ہوتی ہے۔

اپنے عہد کی سماجی اور سیاسی قدروں کے خلاف علانیہ جہاد عملاً ناممکن تھا پھر بھی حضرت سعدی نے جو کر دکھایا وہ ہر کسی کے بس کی بات نہ تھی۔ مبالغہ عجمیوں کی گھٹی میں پڑا ہوا تھا۔ درباری روایات نے اس آگ کو بہت تیز کردیا تھا۔ قصیدوں میں زمین وآسمان کے قلابے ملائے جاتے تھے۔ سعدی اس روش کو فطرتاً ناپسند کرتے تھے۔ چنانچہ ظہیر فاریابی کے قصائد پر سعدی کی گرفت کا ذکر ملتا ہے۔ ظہیر نے سلجوقی بادشاہ کی مدح میں مبالغہ کیا تھا ــــ

نہہ کرسیٔ فلک نہد اندیشہ زیر پا　　تا بوسہ بر رکاب قزل ارسلاں دہد

یعنی: خیال کو قزل ارسلاں کی رکاب کو بوسہ دینے کیلئے نو آسمانوں کو پاؤں کے نیچے رکھنا پڑا۔ اس پر سعدی نے ناگواری سے گرفت کی کہ ایسے مبالغے کی کیا ضرورت تھی ــــ

چہ حاجت کہ نہہ کرسیٔ آسماں　　نہی زیر پائے قزل ارسلاں

یہ حضرت سعدی کے اوّلین خیالات ہیں جب وہ زیادہ تر سیر و سیاحت میں مشغول رہتے تھے اور آزادانہ زندگی گزارتے تھے لیکن جب انھوں نے شیراز میں مستقل سکونت اختیار کرلی اور دربار سے ان کے تعلقات ہوگئے تو درباری روایات سے وہ بھی اپنا دامن نہ بچاسکے اور سلطان شیراز اتابک ابوبکر بن سعد کی مدح میں اس سے بھی زیادہ مبالغہ کرگئے جو ظہیر فاریابی نے کیا تھا ؎

توئی سایۂ لطفِ حق بر زمیں　　پیمبر صفت رحمۃ العالمیں

عورتوں کے معاملے میں حضرت سعدی کے خیالات کو اکثر تنقید نگاروں نے غلط انداز میں پیش کیا ہے اور انھیں نہ صرف عورت بیزار بلکہ ان کا استحصال کرنے والا بھی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے علامہ شبلی نعمانی جو ہر قدم پر سعدی کی تعریف کرتے ہیں، دبی زبان سے ایک شعر کی بناء پر انھیں ملزم گردانتے ہیں مگر یہ حقیقت نہیں ہے حضرت سعدی کے کلام کا غائر مطالعہ کرنے کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ وہ عورتوں کے معاملے میں حُسنِ صورت اور حسنِ سیرت دونوں کے معترف تھے ؎

زنِ خوب فرماں بر و پارسا　　کند مردِ درویش را پادشاہ

یعنی: نیک، فرماں بردار اور خوبصورت عورت مفلس کو بھی رئیس بنا دیتی ہے۔

لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ بری عورتوں سے بھی پناہ مانگتے ہیں ؎

دل آرام باشد زنِ نیک خواہ　　ولیکن زنِ بد، خدایا پناہ

یعنی: نیک بیوی دل آرام ہوتی ہے لیکن بری شریکِ حیات! اللہ کی پناہ!!

اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی پہلی شریکِ حیات نے انھیں بہت دکھ دیا تھا مگر اُسے بھی سعدیؒ جس حوصلے سے انگیز کیا وہ ان کی بلند کرداری کی دلیل ہے مگر بوستان میں ایک الحاقی شعر نے انھیں خواہ مخواہ بدنام کردیا اور وہ مشہور شعر اس طرح ہے ؎

زنِ نو کن اے دوست در ہر بہار　　کہ تقویم پارینہ نیاید بکار

یعنی: ہر موسمِ بہار میں نئی شادی کرنی چاہیئے کیونکہ گزشتہ سال کا کلنڈر موجودہ سال میں کام نہیں آتا۔

ناقدین نے غضب یہ کیا کہ آنکھ بند کرکے اس شعر کو وجہ ملامت بنالیا۔ کسی نے سیاق و

سیاق دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ بوستاں میں جہاں یہ شعر موجود ہے اپنے اگلے پچھلے شعروں سے بالکل غیر مربوط ہے۔ آگے اور پیچھے جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس سے اس شعر کا دور کا بھی واسطہ نہیں ہے چنانچہ غور کرنے پر یہ معلوم ہوجاتا ہے یہ شعر الحاقی ہے اور قصداً کسی نے حضرت سعدی کو بدنام کرنے کے لئے بوستاں کے شعروں میں اسے ملا دیا ہے۔ اس سے پہلے سعدی نے دو عام آدمیوں کا عورتوں کے بارے میں خیالات بتائے ہیں اور انھیں غلط ٹھہراتے ہوئے یہ ظاہر کیا ہے کہ عورتوں کے بارے میں وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں نہ صرف غلط ہے بلکہ خلافِ مشاہدہ بھی ہے چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ ؎

زناں شوخ و فرماندہ و سرکش اند　　　ولیکن شنیدم کہ در برخوش اند

یعنی: مانا کہ عورتیں شوخ، ناز اٹھوانے والی اور سرکش ہوتی ہیں۔ پھر بھی ان کی قربت سب کو بھلی معلوم ہوتی ہے۔

کسے را کہ بینی گرفتار زن　　　مزن سعدیا طعنہ بروے مزن

یہ خیالات کس قدر فراخ دلی لئے ہوئے ہیں کہ اے سعدی کسی شوخ ناز نیں کے ناز اٹھانے والے پر طعنہ زنی کرنا کوئی اچھی بات نہیں ہے اور ان خیالات سے یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ اس سلسلے میں حضرت سعدی کو مفت میں بدنام کیا گیا ہے اور وہ بھی ایک الحاقی شعر کی بنا پر

الغرض حضرت سعدی نے زندگی کے ہر پہلو کو نہ صرف دیکھا بلکہ برتا اس سلسلے میں ایک ماہرِ فن کی طرح اپنے تجربات سے رہنمائی کے اصول متعین کئے۔ چاہے وہ سیاست ہو انتہائی حساس سفارتی معاملات ہوں، نفسیات ہو یا جہانگیری کے اصول، ہر میدان میں انھوں نے گراں قدر ذخیرہ بہم پہونچایا ہے آخر میں ایک ایسا قطعہ پیش کیا جاتا ہے جو ان کی تمام تعلیمات کا نچوڑ ہے۔

قطعۂ سعدی

گلی خوشبوئی در حمام روزی
رسید از دست محبوبی بدستم
بدو گفتم کہ مشکی یا عبیری

ترجمہ

ابھی کچھ روز پہلے اتفاقاً یار کے ہاتھوں
نہانے کے لئے میں نے جو خاکِ مشکبو پائی
تو میں نے اس سے یہ پوچھا کہ تو ہے مشک یا عنبر

که از بوئے دلاویزِ تو مستم
بگفتا من گلِ ناچیز بودم
ولیکن مدتی با گل نشستم
جمالِ ہم نشیں در من اثر کرد
وگرنہ من ہمان خاکم کہ ہستم

تری دلکش مہک سے ذہن و دل پر تازگی چھائی
کہا اس نے کہ میں ناچیز مشتِ خاک ہوں لیکن
گلوں کے ساتھ رہنے سے مہک مجھ میں چلی آئی
کرشمہ یہ جمالِ ہمنشیں کا ہے فقط، ورنہ
وہی مٹی ہوں میں جس میں نہیں ہے کوئی رعنائی

علامہ نجم آفندی

غزل

جو اپنے دل کے تلاطم کا ترجماں ہوتا — زباں پہ جس کی ہے نغمہ وہ نوحہ خواں ہوتا
حریفِ عزم نہ ہوتی جو پستیٔ ہمت — نہ جانے کتنی بلندی پہ آشیاں ہوتا
کبھی تو جا کے خدائی سے بندگی ملتی — بُرا ہی کیا تھا جو سجدہ نہ درمیاں ہوتا
تمہارے ذوقِ تکلم کا یہ تقاضا ہے — تمہاری بزم میں ہر شخص بے زباں ہوتا
مزاج پوچھ لیا اس نے راہِ مسجد میں — جنابِ شیخ سے پھر سامنا کہاں ہوتا
گناہ اور ہے جبرِ گناہ ہے کچھ اور — جو معترض ہے وہ اے کاش نکتہ داں ہوتا
بہار آئی تھی کچھ زخمِ دل ہرے ہوتے — یہ سوز و ساز کا موسم نہ رائیگاں ہوتا
بُرا کہا مجھے دشمن نے خیریت گذری — زبانِ دوست کا اک حرف بھی گراں ہوتا

شریکِ حال نہ ہوتی جو نجم خودداری
ہمارے غم کا فسانہ غمِ جہاں ہوتا

سلام

جن منزلوں سے صابر دشا کر گذر گئے ؛ اُن منزلوں کو زندۂ جاوید کر گئے
پہنچانے والے کون تھے اکبرؑ کی لاش تک ؛ سبطِ نبیؐ رسولؐ کی آواز پر گئے
بڑھتا گیا جو دبدبۂ صبرِ اہلبیتؑ ؛ بیداد کے چڑھے ہوئے دریا اُتر گئے
آئی ہے شامِ درد جنھیں ڈھونڈھتی ہوئی ؛ وہ چاند کیا ہوئے، وہ ستارے کدھر گئے

عابدؔ! کسے نصیب ہے یہ ربطِ معنوی
یاد آ گئے نبیؐ علی اصغرؑ جدھر گئے

عابدؔ قادری

ڈاکٹر سید مجاور حسین رضوی
شعبۂ اردو، سنٹرل یونیورسٹی آف حیدرآباد۔

حسینؑ اور انسانیت

اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو کائنات کا ذرہ ذرہ اس کے قدموں سے لپٹنے کے لئے بے چین و بیقرار نظر آیا۔ پہاڑوں نے اپنے سینے کشادہ کر دیئے۔ دریا کی گہرائیاں پایاب ہو گئیں۔ بیقرار سمندر اس کے لئے خود ساحل بنانے لگے۔ آفتاب نے اس کی عظمت و بزرگی کے اعتراف میں اپنی روشنی پیش کر دی کہ یہ انسان عظیم ہے صرف مظاہرِ فطرت نے ہی اس کی عظمت کا اعتراف نہیں کیا۔ بلکہ وہ بھی انسان تھا جو مسجودِ ملائک بنا۔ وہ بھی انسان تھا کہ جس نے کشتی بانی اور جب اُبلتے ہوئے پانی کی طوفانی لہروں نے عالم کو زیر و زبر کر رکھا تھا یہ بے چین و بیقرار موجیں اس کی گرفت میں تھیں۔ وہ بھی انسان تھا جس کے لئے آگ گلزار بنی۔ وہ بھی انسان تھا جو آسمان کی چوتھی منزل تک پہونچا اور وہ بھی انسان تھا جو ہر آسمان کو اپنی گزرگاہ بنا کر اس منزل تک جا پہونچا جہاں فرشتے کے پر جلتے ہیں۔ جس نے پتھروں سے گفتگو کی اور چاند کو شق کر دیا۔ وہ بھی انسان تھا جس کے اشارے پر آفتاب پلٹ آیا تھا اور اسے بھی انسان ہی کہیں گے جس کے دروازوں کی چوکھٹ کو ستاروں نے بوسہ دیا۔ وہ بھی انسان ہی تھا جس نے ان کو سیراب کیا جو اس کے خون کے پیاسے اور پانی کے لئے جاں بلب تھے اور یہ انسان وہ ہے جسے زمین پر کبھی اپنا نائب کہہ کر متعارف کروایا جاتا ہے اور اگر وہ خود کو عالمین کا رب کہتا ہے تو ایک انسانِ کامل ہی کو عالمین کے لئے رحمت قرار دیتا ہے۔ یہ ہے انسان جو شاہکار ہے خلاقِ عالم کے فضل و کرم کا لیکن کیا وہ بھی انسان تھا جو اپنے بھائی کو قتل کر کے کوّے کو دیکھ کر یہ کہہ رہا تھا "ہائے میں اس سے بھی گیا گزرا ہو گیا؟"

کیا وہ بھی انسان تھا جس کا باپ اسے پکار رہا تھا اور وہ یہ سوچ کر کہ پہاڑ کی بلند چوٹیاں اسے بچا لیں گی! اپنے باپ کی آواز بھی نہیں سنتا۔ کیا وہ بھی انسان تھا جس نے خود پرستی اور انانیت کو اس حد تک بڑھا لیا کہ مخلوق ہو کر خالق کا دعویٰ کر بیٹھا؟ کیا وہ بھی انسان تھا جو بنی اسرائیل کے بچوں اور حاملہ عورتوں کو قتل کروا رہا تھا۔ کیا ان میں سے ایک اس کی سرکوبی کرنے والا ہو گا؟

خائف، ڈرا ہوا، بزدل، سہما اور ترسا ہوا، کیا یہ بھی انسان تھا؟ کیا وہ بھی انسان تھا جس نے جھوٹی گواہی دی تھی؟ کیا وہ بھی انسان تھا جو صدائے حق کو دبانے کے لئے پتھر برساتا تھا، کانٹے بچھاتا تھا؟ کیا اُسے بھی کوئی انسان کہے گا جس نے مسجد میں عبادت کے بجائے افضل ترین مخلوق کو اپنی تلوار کا نشانہ بنایا؟ کیا وہ بھی انسان کہے جائیں گے جنھوں نے چھ مہینے کے بچے پر تیر چلائے اور ان پر پانی بند کیا جنھوں نے پانی سے سیراب کیا تھا۔ زندگی کے یہ دو متضاد پہلو ہیں۔ یہ دو قوتیں ہیں جنھیں حق و باطل خیر و شر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ کبھی چراغِ مصطفوی اور کبھی شرارِ بولہبی کا نام لیا جاتا ہے اور کبھی شاعر کہتا ہے کہ ؎

موسیٰؑ و فرعون بہ شبیرؑ و یزید
این دو قوت از حیات آمد پدید

زندگی کی ان دو طاقتوں کے تصادم آویزش اور کشمکش میں اس آدرزکو، قوت کو پہچان لینا، ان کی شناخت اور تشخص کر لینا جس پر نعمتیں تمام کی گئیں اور جن کا راستہ سیدھا ہے۔ دراصل انسانیت ہے اور ان سے برأت اور اجتناب کرنا جو بارگاہ الٰہی میں مغضوب اور معتوب ہیں اور جن کا راستہ ضلالت اور گمراہی کا ہے۔ جب یہ کہا گیا کہ آج کے دن تم پر اپنی نعمتیں تمام کر دی گئیں۔ اور تمہارے لئے دینِ اسلام جو سلامتی کا دوسرا نام ہے اور جس کا تسلسل علامت ہے آدمؑ سے لیکر خاتمؐ تک کے پیغام کی اساس ہے، انسان کا احترام جو قانونِ الٰہی کی حدود میں ہو۔ خودساختہ قانون جو خود پرستی کی طرف لے جائے اس میں انسان کا کلی حیثیت سے احترام ممکن نہیں بلکہ اس خودساختہ قانون کا مقصد ہی یہی ہوتا ہے کہ اپنی یا اپنے طبقہ یا اپنے رنگ یا اپنی نسل اور اپنے مفادات کا احترام کرائے اور اس کے علاوہ دوسروں کی نسل، رنگ اور طبقہ کی اہانت اور تحقیر کرائے لیکن جو خدا کا بنایا ہوا قانون ہے وہ ان تمام انسانوں کے احترام کا سبق سکھاتا ہے جو قانون کے دائرے میں صراطِ مستقیم پر چل رہے ہیں اس طرح اگر غور کیا جائے تو آج کے دور میں جو نام نہاد اخلاقیات ہے وہ کتنی فرسودہ اور سڑی گلی اور انسان کی توہین کے مترادف ہے۔ اس اخلاقیات کی اساس دوہرے معیاروں پر ہے

ہم کریں گے، تم نہ کرو۔ ہم کہیں گے تم نہ کہو۔ ہم جارحیت کا ارتکاب کریں گے تم صلح کر لو۔ اپنا کھویا ہوا علاقہ مت واپس مانگو۔ اس لئے کہ اس سے جنگ بڑھے گی۔

اپنے خام مال سے ہمارے گھروں کو منور کر دو۔ ہم تمہاری رگوں سے بھی تیل نکال لینا چاہتے ہیں۔ قاتلوں کو سزا مت دو۔ اس لئے کہ اس میں ہماری گردنوں کے بھی کٹنے کا اندیشہ ہے۔ ہاں اگر ہم نے بیروت میں ہزاروں آدمیوں کو مار ڈالا تو امن قائم رکھنے کے لئے اور لڑائی کے موقع پر مٹھائیاں نہیں بٹتیں۔ سر کٹتے ہیں لیکن اگر تم ہمارے دو سو آدمیوں کو مار ڈالو گے تو یہ انسانیت سے گری ہوئی حرکت ہوگی۔ ہم کو اس وقت ظالم و جابر مت کہو اگر ہم گرینیڈا میں امن کے استحکام کے لئے قتل و غارت گری کرتے ہیں۔ یہ کتنی انسانیت سے گری ہوئی حرکت ہے کہ ہماری کلائی مروڑ کر ہمارے ہاتھ سے خنجر کھینچ رہے ہو۔

دیکھو ہمارے ہاتھ میں موچ آجائے گی اگر تم مر گئے تو کیا ہوا؟ ہاں! ہاں! ہم خنجر چلائیں تو بہادر ہیں اور تم خنجر چلاؤ تو ہم تمھیں فسادی کہیں گے ہم نے تاریخ میں چنگیز نادر ہلاکو، انسانیت کا دشمن قرار دیا۔ ہم نے ہٹلر کو بھیڑیا کہا کیونکہ یہ سب طاقت کا حکم اور جنگل کا قانون چلانا چاہتے تھے۔ ہم یہ کہتے نہیں مگر آج ہم بھی وہی سب کچھ کر رہے ہیں۔ اگرچہ ہم بھی طاقت کا مظاہرہ کرتے ہیں اور من مانی کرتے ہیں، ہم فرعون وقت بن گئے ہیں اور یہ کیوں اس لئے کہ ہم انسانیت کے ٹھیکہ دار ہیں بلکہ ہم خدائی فوجدار ہیں ہماری قابلیت ہی ہماری قابلیت ہے لہٰذا یہ ہیں خود ساختہ قوانین اور ان کی سڑی گلی بدبودار نام نہاد اخلاقیات جو انسانیت کی پیشانی پر کلنک کا ٹیکہ ہیں۔ جن کے لئے "تلبیس" طاغوتیت منافقت جیسے الفاظ استعمال کئے جائیں تو شاید ان الفاظ کو بھی شرم آئے۔

آج کی نام نہاد انسانیت کا سب سے بڑا المیہ یہی ہے کہ خدائی قانون کی پابندیوں کے حدود میں انسانیت کے احترام کا جنازہ نکالنے کی کوشش کرنے والے خود اپنے بنائے ہوئے قوانین کے تضادات کے عذاب کا شکار ہیں اور عام آدمی انسانیت کو مشرق و مغرب میں تلاش کرتا پھر رہا ہے۔ انسانیت کھو گئی ہے! ملت کی گمشدہ جنت بن گئی ہے۔

اندھیرا ہے۔ روشنی گم ہے!

لیکن انسانیت زندہ تھی، انسانیت درخشندہ ہے اور انسانیت درخشندہ رہے گی۔ اس کا آفتاب آج بھی روشن ہے اگر ہمیں اس انسانیت کے نقوش نظر نہیں آتے تو یہ ہماری آنکھ کا قصور ہے۔ ہماری بصارت کمزور ہے۔ اور یا پھر ہم جاگ رہے ہیں۔ مگر آنکھیں بند کئے پڑے ہیں، کان کھلے ہیں مگر سننا نہیں چاہتے۔ زبان موجود ہے مگر بولنا نہیں چاہتے کہ کہیں صداقت کو سننا، دیکھنا اور سچ کہنا نہ پڑے۔

لیکن۔ ایسا نہیں ہے کہ خدا کے قانون کے پابند۔ انسان کا احترام کرنے والے بیدار نہیں ہیں، وہ اٹھ کھڑے ہوئے ہیں حق کو دیکھ بھی رہے ہیں۔ وہ ندائے صداقت انسانی کو سن بھی رہے ہیں اور ان کی زبانیں اس پیغام کو دہرا بھی رہے ہیں وہ پیغام جو کبھی بدر، احد، حنین، خیبر و خندق میں زبان شمشیر نے سنایا تھا اور وہی پیغام جو کبھی میدان مباہلہ میں پیکر صداقت اور حق کے مجسمے بن کر سامنے آیا تھا اور وہ پیغام جو کبھی کربلا میں حق کے آفتاب کے چہرے کو سرخی دے گیا تھا۔ اور جس کے بعد نے سربلند ہو کر گویا یہ سمجھا دیا کہ انسانیت کو اگر پہچاننا ہے تو ہمارے عمل اور کردار سے صرف ہماری زندگی تک نہ پہچانو بلکہ یاد رکھو دنیاوی اعتبار سے بھی مرنے کے بعد حلق بریدہ سورہ کہف کی تلاوت کرتا ہے پیغام حق سناتا ہے اور صرف اس دور کے یزید کو شکست فاش نہیں دیتا بلکہ آج کے دور کے یزید بھی "ہیہات منا الذلۃ"

کے نعرے سن کر اپنی شکستوں کی لاش لئے ہوئے اپنے اپنے مرقد میں دفن ہوتے جا رہے ہیں۔

حسینؑ اور انسانیت کے موضوع پر عرض کرتے ہوئے یہ ضروری تھا کہ دور حاضر کے ان التباسات کا پردہ بھی چاک کیا جائے اور ساتھ ہی ساتھ انسانیت کیا ہے اس کے مفہوم کی حد بندی بھی کر دی جائے۔

حضرت امام حسینؑ نے خدائی قانون کے حدود میں انسانی احترام کا پیغام دیا اور یہ سمجھایا کہ یہی انسانیت ہے اور اس پیغام کو دنیا کے سامنے اس طرح پیش کیا کہ آپ کی حیات طیبہ انسانیت کے فروغ کے لئے جہاد مسلسل بن کر سامنے آئی کبھی شریک کار مصطفیٰؐ بن کر کبھی شریک کار سیدہؑ بن کر۔ کبھی شریک کار علی مرتضیٰؑ بن کر، کبھی شریک کار حسن مجتبیٰؑ بن کر۔ حسینؑ اس پیغام کو دنیا کو سناتے رہے۔ آئیے میدان مباہلہ چلیں۔ ایک میدان ہے! جو لڑنے والے آئے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں تلواریں نہیں ہیں۔ مگر تلواروں سے زیادہ خطرناک حربہ ان کے پاس ان کے نظریہ کا ہے وہ اپنے کو خدا پرست بھی کہتے تھے۔ حضرت عیسیٰؑ کی نبوت کے قائل ہیں۔ سچائی کے دعویدار ہیں۔ ان سے مقابلہ ہے پانچ نورانی شکلیں دکھائی دیتی ہیں۔ یہ وہ افراد ہیں جو مقابلے کے لئے آئے ہیں۔ جھوٹوں پر لعنت کرنے اور یہ قرآن کے الفاظ ہیں اور قرآن ہمیشہ رہے گا۔ اس لئے یہ وہ لوگ ہیں جنوں نے نہ جھوٹ بولا ہوگا اور نہ زندگی کی آخری سانس تک جھوٹ بولیں گے۔ انہیں پانچ افراد میں علیؑ و فاطمہؑ حسنؑ حسینؑ بھی شریک کار مصطفیٰؐ ہیں اور نصاریٰ نجران کو یہ سمجھا رہے ہیں کہ دیکھو انسان کی احترام کرو انسانیت کو داغدار نہ بناؤ۔ ایک مقدس بندہ خدا کو خدا کا بیٹا نہ کہو۔ یہ عیسیٰؑ کا احترام نہیں ہے۔ یہ عیسیٰؑ کی توہین ہے

پھر ایک موقع وہ بھی ہے علیؑ روزے سے ہیں۔ حسنؑ روزے سے ہیں۔ مسکین آتا ہے۔ یتیم آتا ہے۔ اسیر آتا ہے۔ پانی سے افطار کرتے ہیں اور روٹیاں دے دی جاتی ہیں۔ ان روٹیوں کے دینے والوں میں حسینؑ بھی ہیں اور شریک کار کی حیثیت سے سمجھا رہے ہیں انسان کا احترام کرو۔ سائل دروازے پر آئے تو اسے واپس نہ لوٹاؤ۔

حسینؑ صفین کے میدان میں ہیں۔ فرات پر پہرے بٹھا دیئے گئے ہیں۔ علی مرتضیٰؑ کی فوجیں فرات پر قبضہ کر لیتی ہیں۔ مگر اب پہرے نہیں بٹھائے جاتے۔ انسانیت کا احترام، پانی سب کے لئے ہے پھر بیس سال تک سکوت کہ انسانوں کے درمیان اگر معاہدہ ہو اگر صلح ہو تو پھر اس کی پاسداری ہونی چاہئیے۔ عہد شکنی انسانیت کا احترام نہیں ہے۔ اور حسینؑ یہ سمجھانا چاہتے تھے کہ انسان اور انسانیت کے احترام کا ایک رخ یہ بھی ہے کہ سکوت اختیار کیا جائے۔

حسینؑ شریک کار مصطفیٰؐ، شریک کار سیدہؑ، شریک کار مرتضیٰؑ، شریک کار مجتبیٰؑ۔

حسینؑ کربلا میں اکیلے مگر وارث ہیں آدم سے لے کر عیسیٰؑ تک، محمدؐ سے لے کر عیسیٰؑ تک: وہ خدائی قوانین کی حدود میں انسان کا احترام، انسانیت کا سبق سکھانے والے۔ حسینؑ اکیلے نہیں ہیں۔ اگر محمدؐ نہیں ہیں تو حسینؑ خود ان کے وارث ہیں۔ اگر سیدہ نہیں ہیں تو زینبؑ ہیں۔ اگر مرتضیٰؑ نہیں ہیں تو عباسؑ ہیں، اگر مجتبیٰؑ نہیں ہیں تو قاسمؑ ہیں اور حسینؑ کربلا میں

ہمارے جہاد مسلسل کا نقطۂ عروج پیش کر رہے ہیں۔ انسانیت کے اعلیٰ اقدار کا تحفظ کرتے ہوئے حُر کا لشکر پیاسا ہے حسینؑ کے خون کا بھی اور ایک قطرہ آب کا بھی مگر پانی پلایا جائے گا۔ مشکیزے کھول دیئے جائیں گے۔ اس لئے کہ انسان انسانوں پہ پانی نہیں بند کرتے مجبوری سے ناجائز فائدہ نہیں اٹھاتے۔ جو لڑنے کے لئے آمادہ نہ ہو اس سے نہیں لڑتے۔ انسان کا احترام اور انسانیت مگر خدائی قانون سے اندرا اسی لئے حسینؑ دریافت کرتے ہیں یا آپ نے شریعت میں کوئی تبدیلی کی ہے؟ کیا میں نے حلال حرام کو بدل دیا ہے۔ واضح الفاظ میں حسینؑ بتانا چاہتے کہ جس نے ایسا کیا ہے وہ انسانیت سے گر گیا۔ اور جس نے ایسا نہیں کیا وہی انسان ہے۔

کربلا میں ایک ایک لمحہ انسانی تاریخ کو اپنی گرفت میں لئے ہوئے ہے۔ ماضی کے تسلسل کو اپنے دوش پہ اٹھائے ہوئے ہے۔ حال کو اپنے زخموں سے سمیٹے ہوئے ہے اور مستقبل کو اپنے خون کی سرخی دے رہا ہے۔ کہیں وہ پھیکا نہ پڑ جائے۔

حضرت میرے پاس فکر ہے نہ الفاظ ہیں۔ جو ان تمام باتوں کا احاطہ کرے اس لئے صرف دو لمحے یا تین لمحے اور۔ انسانیت میں کمزوری ہوتی ہے۔ انسان کو اجازت دی گئی ہے کہ وہ اپنی جان بچا لے۔ لیکن کبھی کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ دل اور نگاہ میں ہم آہنگی نہیں رہ جاتی۔ نگاہ مروت اور احسان سے جھکی جاتی ہے۔ دل جان بچانا چاہتا ہے۔ آیئے کربلا میں ایک رات آئی ہے۔ قیامت کی رات حسینؑ چراغ بجھا دیتے ہیں۔ یہ نہیں چاہتے کہ نگاہ و دل میں ہم آہنگی نہ رہ جائے۔ اگر روشنی میں کوئی ساتھ چھوڑ جائے گا تو شاید اسے کوئی طعنہ دیدے بزدلی کا اور کوئی اگر کچھ بھی نہ کہے تو بھی جانے والی نگاہ تو شرم سے جھک جائے گی اور حسینؑ انسان کا احترام کرنا چاہتے ہیں۔ انسان کو شرمندہ کرنا نہیں چاہتے اس لئے اندھیرے میں جس کا جدھر جی چاہے چلا جائے۔

اور حسینؑ یہ بھی بتانا چاہتے ہیں کہ انسانیت عمل و کردار سے بنتی ہے۔ عمل و کردار صراط مستقیم پہ چلنے سے خدائی قانون کی پابندی کرنے والا راہ حق پہ ہوتا ہے اور جو راہ حق پہ ہوتا ہے موت اس کے لئے شہد سے زیادہ شیریں اور خوشگوار ہوتی ہے۔ قرآن کہتا ہے ہر نفس موت کا ذائقہ چکھے گا۔ ذائقہ ترش اور تلخ بھی ہوتا ہے۔ شیریں اور خوشگوار بھی ہوتا ہے۔ کربلا میں قاسمؑ اور علی اکبرؑ کی زبان نے حسینؑ کے توسط سے دنیا کو سمجھا دیا کہ موت سے وہ ڈرتے ہیں جو انسان کا احترام کرنا نہیں جانتے۔ جو خدائی قانون کے پابند نہیں ہوتے۔ ان کے لئے موت عذاب ہے تلخ ہے آب ضمیم ہے نار جحیم ہے۔ مگر صراط مستقیم والوں کیلئے موت کا ذائقہ شیریں اور خوشگوار ہے اور کہنے والے جب یہ کہہ رہے ہیں تو قرآن کی سند بھی ان کے پاس ہے کہ خبردار جنہوں نے ہجرت کی جان و مال سے جہاد کیا اور خدا کی راہ میں شہید ہوئے۔ انہیں مردہ مت کہو وہ حیات جاوید پا چکے ہیں۔

وہ جو کامیاب ہوئے حق کے مراتب بلند ہوئے چاہے یہ کہئے کہ ان کی موت شاندار تھی چاہے یہ کہئے کہ انہوں نے شہادت اختیار کی مگر انہوں نے حضرت امام حسینؑ کے اس قول کی عملی تفسیر پیش کر دی کہ عزت کی موت کا ایک لمحہ ذلت کی زندگی سے بہتر ہے۔

ذلت کی زندگی کیا ہے؟ انسان کی توہین اور انسان کا احترام نہ کرنا پس جب انسانیت پر وقت پڑ جائے۔ انسانیت کو ذلیل اور رسوا کیا جانے لگے تو ایسے موقع پر انسانیت کو رسوا کرنے والوں کا مقابلہ کر کے شہادت اختیار کر لو زندگی کے ایسے آب تلخ سے موت کا یہ شیریں خوشگوار پانی کہیں بہتر ہے۔

پھر یہ وقت وہ نہیں جب دست قاتل کو صرف جھٹک دیا جائے بلکہ یہ وہ وقت ہے کہ خود رگ گلو سے خنجر کی دھار کند کر دی جائے بتا دیا کر بشر کا وقار کیا شئے ہے کہ گلا ہو پاس تو خنجر کی دھار کیا شئے ہے

حسینؑ اور انسانیت کے موضوع پر بہت سے گوشے آپ کی خدمت میں پیش کئے جا چکے مجھ سے بیشتر مقررین نے واقعہ کربلا کو انسانیت کے وسیع تر مناظر میں پیش کیا۔ اب تک جتنے پہلو پیش کئے گئے ہو سکتا ہے کہ کوئی یہ کہے کہ انسانیت کے یہ نقوش بیشک اہم اور قابل قدر ہیں لیکن کیا انسانیت کا لطیف انسانی جذبات سے کوئی تعلق نہیں ہے؟ کیا انسانیت اور انسان کا احترام صرف میدان جہاد ہی تک محدود ہے۔

یہ درست ہے کہ زندگی جہاد مسلسل کا نام ہے اور یہ بھی درست ہے کہ سچا انسان ہر لمحہ اپنے کو میدان جہاد میں پاتا ہے لیکن ایک فاضل دوست نے ایک بار کہا تھا فرض کرو عالمی تاریخ میں ایک ایسا دور بھی آئے جب خدائی قانون کے اندر سب انسان کا احترام کرنے والے رہ جائیں گے جب ابولہبی اور نمرودیت ختم ہو جائے گی اس دور کے لئے حسینؑ کا کیا پیغام ہے۔ یہ تو وہ دور ہے جب یزیدیت نہیں ہے کسی مقابلے کا سوال ہی نہیں۔ ٹھہر یئے! آیئے کربلا چلیں! حسینؑ کو رزم گاہ میں دیکھ چکے۔ قتل گاہ میں دیکھ چکے ایک نظر خیمہ گاہ بھی دیکھ لیجئے۔

یہ ہے انسان کا احترام کرنے والا۔ انسانیت کے اعلیٰ ترین مدارج پر فائز ہے جو کبھی یتیم بچی کے سر پر دست شفقت رکھنے والا بھائی۔ بہن کے وقار کو ظاہر کرتے ہوئے دنیا کے تمام مردوں کو عورت کی صحیح منزلت سے آگاہ کرنے والا رہبر اور پیاسے دلوں کی ڈھارس!! مختصر سی مدت میں دنیا کے سامنے ایک ایسا معاشرہ پیش کرنے والا جس کی بنیاد میں صرف محبت ہی محبت ہے۔ جو انسان کو گداز قلب کے صحیح مفہوم سے آشنا کرنا چاہتا ہے کیا یہ اس کا اعجاز کم ہے کہ آج تک اور رہتی دنیا تک جب بھی اس کا نام لیجئے دل بھر آتا ہے۔ آنسو چھلک پڑتے ہیں۔

یہ ہو سکتا ہے کہ رت بدل جائے موسم بدل جائے پھولوں کے نام بدل جائیں دریاؤں کے رخ اور سمتیں بدل جائیں۔ پہاڑ ریگستان ہو جائیں۔ ریگستانوں میں سرسبزی آ جائے۔ نئی دنیا میں دریافت ہوں نئے ستارے آباد ہوں۔ لیکن ہر شئے کو تغیر اور انقلاب سے دوچار ہونے کا امکان ہے مگر جب تک انسان کے پہلو میں دل دھڑکتا رہے گا انسان کو انسان کے احترام کا سلیقہ یاد آتا رہے گا۔ جب تک دریاؤں میں پانی رہے گا۔ کربلا کے پیاسے امام اور ان کے اصحاب اسلام اور انسانیت ایک ہی سمجھے جاتے رہیں گے

مناجات بہ بارگاہِ بابُ المراد قمرِ بنی ہاشم حضرت ابوالفضل العباس علیہ السلام

دلِ آفت زدہ کے راز و نیاز
آج سنتا ہے ایک بندہ نواز
کیا حقیقت سے مل گیا ہے مجاز
تیری درگاہ اور مری آواز

ذرّہ ہم بزمِ آفتاب ہوا
مجھ سا ناچیز باریاب ہوا

مجھ کو دیکھو بھلا مری اوقات
طالبِ نور ہو اندھیری رات
لیکن اے جلوۂ تمام صفات
ہر فنا کو ہے جستجوئے حیات

آستانِ شہید پر دل ہے
ذرہ یوں مہر کے مقابل ہے

نور ہی نور ہے حیاتِ شہید
بندگی میں وہی فرید و وحید
حاصلِ زندگی تھی قتل کی عید
موت نے کر دیا ہے قائلِ دید

اذنِ رب سے جہاں شہادت ہے
پھر وہی باعثِ شفاعت ہے

اس شہادت سے ہے حضور مُراد
یعنی حاضر سے کیجئے استمداد
جو ہو موجود وہ سنے فریاد
مانے بات اس کی ربِ عباد

زندگی کا وہ مدعا بن جائے
مظہرِ لطفِ کبریا بن جائے

قربِ حق سے ہوا یہ راز عیاں
علم، قدرت، حیات سب ہے عیاں
اِذنِ رب سے عطا ہے شرک کہاں
کیوں نہ روشن ہو پھر مِرا عرفاں

بنی ہاشم کے چاند جلوہ گر کر
اس اندھیرے میں آپ آجا کر

اس افق پر ہوا ہے تیرا ظہور
ہے ولایت سے جو فضا معمور
اس جگہ کا رہا یہی دستور
کوئی سائل پھرا نہیں مہجور

ایک اِک آہ کا صِلہ دے دیں
بے طلب حسبِ حوصلہ دے دیں

پھر بھی حکمِ طلب مشیت ہے
یعنی اِذنِ دُعا عنایت ہے
احتیاج آدمی کی فطرت ہے
یہ فقیر آج محوِ طاعت ہے

ہو اجازت تو اب سوال کروں
تم جو سن لو تو عرضِ حال کروں

بے قراروں کا اک قرار ہو تم
دلِ مومن کا اعتبار ہو تم

آلِ طٰہٰ کا افتخار ہو تم
نائبِ شیرِ کردگار ہو تم

جو بلا آئی تم نے رد کی ہے
تم نے شبیرؑ کی مدد کی ہے

وہ دو عالم کا مقتدا شبیرؑ
وہ خدائی کا رہنما شبیرؑ
وہ محمدؐ کا لاڈلا شبیرؑ
فاطمہؑ کا وہ مہ لقا شبیرؑ

کام امت کے جو سنوارتا ہے
وہ مدد کو تمہیں پکارتا ہے

لٹ چکی جب حسینؑ کی سرکار
نہ رہے کوئی یار و انصار
ایک مظلوم تھا ہزاروں وار
گھر گیا ابنِ حیدرِ کرار

پشتِ مرکب پہ جھک گئے شبیرؑ
بھائی کو ڈھونڈتے چلے شبیرؑ

دی صدا بھائی اب مدد کو آؤ
آؤ عباسؑ دشمنوں کو ہٹاؤ
یہ ضعیفی یہ دل جگر کے گھاؤ
اے مرے شیر کیا کروں بتلاؤ

فوج کا رنگ اب بگڑتا ہے
آؤ زہرا کا گھر اجڑتا ہے

گئی آواز جب یہ نہر کے پاس
تڑپ اٹھا کوئی یہ درد و یاس
رو کے بولے یہ شاہِ درد اساس
رب کی مرضی ہے سو رہو عباس

نہ ہوئے چین چین آتا ہے
دو گھڑی میں حسینؑ آتا ہے

تم نے کی ہے حسینؑ کی نصرت
قربِ حق سے ملی عجب قوت
اے علیؑ عزم کربلا ہمت
رہ گئی حشر تک یہی طاقت

جسمِ ایماں میں تم سے دم باقی
کٹ گئے ہاتھ ہے علم باقی

دین و دنیا میں اے ولیِ حیات
سب کی بخشش ہے اب تمہارے ہات
نازشِ فاطمہؑ ہے یہ سوغات
روزِ محشر یہی ہے وجہِ نجات

قولِ معصومؑ آشکارا ہے
دستِ عباس کا سہارا ہے

اے علیؑ ولی کے نورِ نظر
دخترِ مصطفٰےؐ کے قلب و جگر
ہے تمہاری ہی یاد شام و سحر
میری دنیا بھی ہے عجب محشر

تم جو چاہو تو پھر ہے کیا مشکل
ابنِ مشکل کشا کو کیا مشکل

کٹ چلی زندگی بری کہ بھلی
سب حقیقت حضور پہ ہے جلی
شیرِ حق نائبِ علیِ ولی
اب تو آجایئے کہ جان چلی

صبرِ مظلومِ کربلا کی قسم
آپ کو آپ کی وفا کی قسم

...ری ہستی کا یہ ورق فریاد
...ے رہا ہے غم و قلق فریاد
...ہے سینہ ہے میرا شق فریاد
اے علمدارِ فوج حق فریاد

اپنے دامن میں اب چھپا لیجئے
مر رہا ہوں شہا بچا لیجئے

اے شہیدِ فلک وقار سنو
ابن حیدرؑ کے غم گسار سنو
...ت زہراؑ کے پردہ دار سنو
...ہ درد ایک بار سنو

کچھ سنا لوں تو دل بہل جائے
غم کا مارا ہوا سنبھل جائے

...ہ صدق و صفا، فراتِ وفا
...ر بازوئے سیدالشہداؑ
...ل زینبؑ کی مستجاب دعا
...ت قلبِ حضرتِ زہراؑ

اے حسینی یقین کے وارث
عہدِ صالح زمین کے وارث

...ں کے گھر پہ میں ناتواں جاؤں
...ر بدر ہو کے نیم جاں جاؤں
...م جہاں کہہ دو میں وہاں جاؤں
...ن میرا ہے میں کہاں جاؤں

اب میں کیا جاؤں گا کسی در پہ
زندگی کٹ گئی اسی در پہ

...ئی ہے ظلم کی گھٹا ہر سو
...نے عازمِ حید جو

نکتہ چیں دوست طعنہ زن ہیں عدو
اے سکینہؑ کے شیفتہ عمو

شکوۂ رنج دہر لایا ہوں
اک وسیلے کے ساتھ آیا ہوں

شام کی قید میں وہ اک بچی
آکے دروازے پر کھڑی ہوتی
دن جو ڈھلتا تو وہ پکارتی تھی
اے چچا جان آؤ رات ہوئی

اسی بچی کا واسطہ عباسؑ
قیدِ غم سے کرو رہا عباسؑ

بند تھی قید یاس و حرماں میں
یس چچا ہی تھے قلبِ نالاں میں
کیسا کٹتا تھا وقت زنداں میں
چھپتی تھی جا کے ماں کے داماں میں

جب تھی تھی طمانچے کھا کھا کر
اے چچا جان دیکھئے آ کر

اے ابوالفضلؑ! میری شہزادی
لطفِ شبیرؑ کی تھی جو عادی
ہائے اس کی ہوئی یہ بربادی
قید میں ہے یتیمی سے فریادی

کان زخمی ہیں لال چہرا ہے
خون رخسار سے ٹپکتا ہے۔

واسطہ ہے مرا یہی رخسار ہے اس کے صدقہ میں اے شہِ ابرار
غم سے مجھ کو نکالئے اک بار ہے اب شفا پائے یہ دلِ بیمار
دل کو راحت پئے حسینؑ ملے
ہائے عباسؑ اب تو چین ملے

نتیجہ فکر۔ علامہ رشید ترابی مرحوم

مرثیۂ قاآنی شیرازی

ڈاکٹر یعقوب عمر

قاآنی شیرازی نے صنعت سوال و جواب میں جو مرثیہ تحریر کیا تھا۔ فارسی سے اسکا ترجمہ اسی صنعت سوال جواب کو ملحوظ رکھتے ہوئے کیا گیا ہے۔

کیا برسا؟ خون آنکھوں سے! کس طرح؟ رات دن! — کیوں؟ غم میں! کسکا غم؟ غمِ سلطانِ کربلا!
کیا نام تھا؟ حسینؑ! پدر کون تھے؟ علیؑ! — نانا تھے کون؟ مصطفےٰؐ! ماں کون؟ فاطمہؑ
کیا ہوگئے؟ شہید! کہاں؟ کربلا کے پاس! — تاریخ؟ دس! مہینہ؟ محرم کا! دن؟ جمعا
پیاسے ہوئے شہید؟ نہیں! کچھ پیئے؟ پیئے — کس نے پلایا؟ شمر نے! کیا؟ شربت ذ
مظلوم تھے؟ درست! کوئی جرم؟ کچھ نہیں! — کیسے تھے؟ حق شعار! کوئی یار تھا؟ خدا!
ان پر یہ ظلم کس نے کیا تھا؟ یزید نے! — پوتا تھا کس کا؟ ھند کا! وہ کون؟ پرجفا
اس نے یہ خود کیا؟ نہیں اک خط لکھا! کسے؟ — ابن زیاد کو، جو مجسم فریب تھا!
ابن زیاد کون تھا؟ مرجانہ کا پسر! — حکم یزید پر کیا اس نے عمل؟ کیا!
شبیرؑ کو شہید اسی نے کیا؟ نہیں! — بھیجی تھی اس نے فوج! کہاں؟ سوئے کربلا!
سالار فوج کون تھا؟ ابن سعد پلید! — قاتل یہی تھا انکا؟ نہیں شمر بے حیا!
خنجر چلا گلو پہ؟ چلا! کچھ حیا نہ کی؟ — کی! پر قضا و قدر سے مجبور ہوگیا!
وہ کیوں ہوئے شہید؟ شفاعت کے واسطے! — کچھ شرط بھی ہے اسکی؟ فقط نالہ و بکا!
بیٹے بھی کچھ شہید ہوئے؟ دو! کچھ اور لوگ؟ — نو بھائی کام آگئے! کچھ اور؟ اقربا!
بیٹے تھے کوئی اور بھی؟ سجاد دردمند! — اسوقت انکا حال تھا کیسا؟ خراب تھا!
ٹھہرے وہ کربلا میں؟ نہیں! شام تک گئے! — عزت کے ساتھ؟ جی نہیں، ذلت میں مبتلا!
تنہا؟ نہیں، زنان حرم ساتھ تھیں! وہ کون؟ — زینب، سکینہ، فاطمہ، کلثوم بے نوا!
تن پر تھا کچھ لباس بھی؟ ہاں راستے کی دھول! — سر پر عمامہ کیسا تھا؟ لاٹھی کی ضرب کا!
بیمار تھے؟ درست! دوا کیا تھی؟ اشک تھے! — خوراک کیا تھی؟ صرف لہو اپنے قلب کا!
ساتھی تھے کوئی اور بھی؟ ہاں، کچھ یتیم تھے! — دیگر؟ بخار! جو کبھی ہوتا نہ تھا جدا!
زیور کچھ عورتوں کا بچا تھا؟ فقط یہی! — پیروں میں بیڑیاں تھیں تو گردن میں طوق تھا!
ظلم یہود تھا یہ؟ نہیں! گبر کا؟ نہیں! — کفار کا؟ نہیں نہیں! اف اسقدر جفا!!

قاآنی! تونے شعر کہے؟ ہاں! کچھ آرزو؟
رحمت خدا کی! کس گھڑی؟ جب حشر ہو بپا!

بُتِ نفس

مشرف عالم ذوقی
بہادیوا روڈ آرہ

کمرے میں طویل خاموشی ہے.. سر جھکائے بیٹھا ہوں... اندھیرے کمرے میں کتنی یادیں سمٹ آئی ہیں... اور ایک ہلکی سی دردناک سی چیخ... اور جب بھی یہ چیخ اٹھی ہے.. میں سرسبز پہاڑیوں کے پیچھے دعاؤں کی تلاش میں چلا گیا ہوں... اور جب بھی مٹھی بھر دعائیں ہاتھوں میں لیے لوٹا ہوں... میرا پورا وجود ہی لہولہان ملا ہے.. چہرہ.. آنکھیں... اور پیر... کل ملا کر سب ایک بت بن گئے ہیں... سر نیچا کر لیتا ہوں... آنکھیں جھک گئی ہیں.. میں پھر پرانے مناظر کی زد میں ہوں... اور دادی اماں وجد میں آکر مولانا رومیؒ کے اشعار گنگنا رہی ہیں.....

"آں جہودِ سگ بہ بیں چہ رائے کرد
پہلوئے آتش بتے برپائے کرد
کانکہ ایں بت را سجود آرد برست
ورنیارد در دلِ آتش نشست
چوں سزائے آں بتِ نفس او نداد
از بتِ نفسش بتے دیگر بزاد
مادرِ بتہا بتِ نفس شماست
زانکہ آں بت مار وایں بت اژدہاست

چہرے پہ دنیا جہاں کا نور سمٹ آیا ہے آنکھیں بند ہیں.. ہونٹ لرز رہے ہیں... دیکھو یہودی کُتّے نے کیا تدبیر کی... آگ کے پاس ایک بُت کھڑا کر دیا کہ جو کوئی اس بُت کو سجدہ کرے گا چھوڑ دیا جائے گا۔ اور جو نہیں کرے گا اُسے آگ کے حوالے کر دیا جائیگا...؟"

باہر لٹّو کا کھیل ہو رہا ہے... چودہ پندرہ سال کی عمر لٹّوؤں میں کھیل رہی ہے... میں ہوں میرا چھوٹا بھائی منّو ہے.. ہاشم ہے... مٹی میں گڈے ہو گئے ہیں... عمر کی کتنی دہلیز پار کر چکے... کچھ پتہ ہے...؟ باورچی خانہ سے امّی حضور کے بڑبڑانے کی آواز باہر رینگ رہی ہے... لٹّو ناچ رہا ہے... اور لٹّو کے ارد گرد بے خبری میں ہمارا بچپن گھوم رہا ہے... اور دادی اماں وجد میں آکر گنگنا رہی ہیں... "چونکہ اس نے اپنے نفس کے بُت کو سزا نہ دی تھی اس لئے اس کے نفس کے بُت سے ایک دوسرا بُت پیدا ہو گیا... تمہارا نفس تمام بتوں کی ماں ہے کیونکہ وہ بُت سانپ ہے اور یہ بُت اژدھا ہے..."

پھر دادی اماں وجد کی کیفیت سے باہر نکل آئیں.. آنکھوں میں آنسوؤں کے موٹے موٹے قطرے جھلمل کر رہے ہوتے.... عمر کا کون ٹھکانا؟ آج پلکیں کھلی ہیں تو کل موند بھی سکتی ہیں... مجو ادھر آؤ... لٹّو خاموش ہو گیا ہے... دادی اماں نے وضو کے لئے بدھنے میں پانی

مانگا ہے۔۔ اور جب میں پانی لے کر کمرے میں داخل ہوتا ہوں تو دادی اماں سجدے میں گر چکی ہیں پھر جلد ہی نماز سے فارغ بھی ہو جاتیں۔۔ دنیا جہاں کا نور چہرے پر سمیٹ کر کہتیں۔۔۔ تم نے دیر کر دی۔ میں نے تیمم کر لیا۔ دادی اماں اسٹول پر رکھے مٹی کے بڑے سے ڈھیلے کی جانب اشارہ کرتی ہیں۔ آنکھوں میں کتنے خواب تھر آ جاتے ہیں۔۔۔ ان خوابوں کو سلامت رکھیو اللہ۔۔۔ کوئی غم نہیں ہے اس گھر میں۔ ابّی حضور۔ امی حضور کی شفقتوں کا پیارا پیارا آسمان ہے۔۔۔ بھائیوں کی محبت ہے۔۔۔۔۔

دادی امّاں کے پوپلے منہ سے گنگناتے ہوئے نغمے ہیں۔۔۔ اور ایک ہمارا بچپن ہے جو لٹو کی طرح گھوم رہا ہے۔ یہاں سے دالان۔۔ دالان سے دادی امّاں کا کمرہ۔۔۔ امّی حضور اور ابّی حضور کی سنجیدہ جھڑکیاں۔۔۔ اسکول جاتے ہوئے قدم۔۔۔۔ یعنی بس ایک محدود دائرہ ہے۔ اور ہم گھوم پھر کر وہیں واپس آ جاتے ہیں۔۔۔۔۔"

وقت سب سے بڑا دوزخی ہے کہ وہ ہمارے کمزور ہاتھوں میں پکڑی ہوئی دعائیں اُچک لیتا ہے تو اس وقت ہمارے ہاتھ کھیلوں میں سنے تھے۔ اور چہرے پہ ہلکی ہلکی مونچھیں اُگنے لگی تھیں۔ شہر مصنوعیت کی چمک آنکھوں میں رینگنے لگی تھیں۔ ہم رنگین کپڑے تبدیل کرتے۔۔ تیل چپوڑتے ترچھی مانگیں نکالتے اور کسی نئی فلم کا تازہ چلتا پھرتا گانا گنگناتے ہوئے شاہراہوں کی بھیڑ میں گم ہو جاتے۔۔۔ کتابیں لحاف پہ سجی تھیں اخلاق اندر کے بت نے ہڑپ لئے تھے۔۔۔ گھومتے سیر سپاٹا کرتے ہوئے شام تلک واپس آتے تو ابّی حضور کے چہرے پر گہری سنجیدگی بچھی ہوتی۔ اور آنکھوں میں شرارے رقص کر رہے ہوتے۔۔۔ پھر وہ شرارے ہماری آنکھوں میں اتر جاتے کہ ان آنکھوں کا اخلاق پڑھو۔۔۔ اپنی بلند حیثیت پڑھو مٹی میں سنے ہوئے ہاتھ اور پیر کبھی ہماری ریاست اور وہ عزت اور وہ وقار جواب تک ہمارا خاندانی ترکہ ہے۔ اب یہ تمھارے دم سے قائم ہو گا۔۔ کہ بس ہم باقی بچے ہیں جو میں تمہیں سونپ کر ہمیشہ کیلئے آنکھیں بند کر

اور آنکھوں میں ایسے کتنے ہی دھواں دھواں نقطے سے گئے کہ ہم چپ سادھے ابّی حضور کی سنا کرتے۔۔۔ جیسے کی ترنگیں اندر اندر داخل ہو گئی ہوں۔۔ اور سارے کو کوٹ رہی ہوں۔۔ ہم تھر آ جاتے۔۔۔۔ آنکھوں میں پھیل جاتی۔۔۔ امّی حضور کی کانپتی نگاہیں ہم تک اٹھتیں جھک جاتیں۔ اور ابّی حضور دیر تک کمرے میں ٹہلتے رہتے اور ہم ہاتھ باندھے سر جھکائے کھڑے ہوتے۔۔۔ اور امّی حضور کے ذریعے پھینکا گیا ایک اور تیر دل کے ہو جانا۔۔۔" غلطی تمھارے نفس کی ہے بیٹو! جس کا اختیار ہے۔۔ مگر بہادری یہ ہے کہ تم اس کو اپنے اختیار میں اصل بت ازل سے انسان کا ہی نفس رہا ہے جو اور ہزاروں بتوں کو پیدا کرتا ہے۔۔۔"

اچانک ابّی حضور خاموش ہو جاتے مگر آنکھیں کتنا کہتی ہوئی محسوس ہوتیں۔۔۔ شناخت سے محروم اپنی آ دوبارہ زندہ کر دو کہ نفس کے پیدا کردہ بت کو فنا کئے جائے لیکن نفس کی وہ طاقت جو بتوں کو بناتی ہے اس کا ازالہ ہے۔۔۔ اور دادی اماں بستر پہ لیٹی لیٹی گنگنا رہی گنگنا رہی

چوں شرائے آں بت نفس او ولدلہ ازبت نقش تیسے دیگر بزاد

کیا معلوم تھا کہ یہ آوازیں گم ہو رہی ہیں۔ یہ آوازیں وداع کی بہاڑیوں میں کھو رہی ہیں۔۔ اور اندر بیٹھے ہوئے سیکڑوں بُت مٹی میں سنے ہوئے ہاتھوں اور پیروں کو دیکھ کر قہقہہ بلند کر رہے ہیں... پل میں کتنے ہی منظر آنکھوں کے آگے رینگ گئے۔۔ ان میں میرا دوست ہاشم بھی تھا جو پتنگ لوٹنے کے بہانے دوسرے کے گھر میں چلا گیا تھا... اور پردگی کی رسم توڑنے کے جرم میں اس کے دس سالہ کمزور جسم پر مکّوں کا قہر ٹوٹ پڑا تھا۔ بھائی جان بھی تھے۔ جن کی اسکول سے دیر سے واپسی امّی حضور کے غیض و غضب کی وجہ بنی تھی۔ مولوی نظیر کا بیٹا جمّن تھا جو رنگین مرغوب رنگوں والی تصویر کی کتاب خریدنے کے جرم میں پورے ایک دن کے لئے گھر سے باہر نکال دیا گیا تھا۔۔

پشیمانی کے آنسوؤں میں صداقت ہوا کرتی ہے۔۔ سو ہم بھی چپ ہو گئے۔۔ اور امّی حضور کی آنکھوں میں جھانک کر پہلی بار آہستہ سے مضبوط آواز میں بولے... ہم لوٹ رہے ہیں امّی حضور۔۔ اب بُت ٹوٹیں گے۔۔ آپ دیکھ لیں گے۔ یہ بُت ٹوٹ کر رہیں گے۔

ادھر دادی اماں کے گنگناتے لب خاموش ہوئے اور ادھر پہلا بُت ٹوٹ گیا۔" آنکھیں ڈبڈبا گئیں... اندر سے ایک تیز لہر اٹھی... یہ ہمیشہ کے لئے واپسی تو سارے کے سارے قدموں کا ازل سے مقدّر رہا ہے۔۔ گھر لوٹے تو سب کے چہرے کی جھریاں کچھ اور بڑھ گئی تھیں..... امی حضور کی آنکھوں کے سوتے سوکھ گئے تھے۔۔ اور بُت ٹوٹتے جا رہے تھے...!

پھر سارے بُت ایک ایک کر کے ٹوٹ گئے۔ گھر میں سنّاٹا چھا گیا۔۔ اندر کے ان بتوں کو توڑنے کے بعد ہم اس لائق ہو چلے تھے کہ اپنے پیروں پر کھڑے ہو جائیں۔۔ اور وقت بڑا دوزخی ہے اچانک امّی حضور خاموش ہو گئے۔۔ پھر امّی حضور کی باری آئی... خاندانی وقار کی اینٹ سنبھالتے سنبھالتے کمر جھک گئی۔ اور جب چونکے تو آسمان پر لہو ہی لہو پھیلا ہوا تھا۔ اور کمروں میں سے نقرئی قہقہے باہر نکل رہے تھے۔ یہ میرا بیٹا راشد تھا.. بیٹی انیسہ تھی۔ اور ان کے دوست لڑکے لڑکیوں کی ٹولی تھی۔ جو قہقہوں کا ساز لے کر آتے۔ جی بھر کر جاتے۔ اور ہنستی گاتی بنجاروں کی یہ ٹولی غروبِ آفتاب کے بعد اپنے اپنے گھر روانہ ہو جاتی۔ کتنی بار اندر سے ایک ہوک اٹھی۔۔ آگے بڑھ کر انہیں روک لوں... مگر اب جھرّیوں بھرے ہاتھوں میں دم ہی کہاں رہا۔ کہتے ہیں وقت کی رفتار بڑی تیز ہو گئی ہے۔ پاگل ہم ہی تھے کہ بزرگوں نے جو کہا صدقِ دل سے مان لیا کہ وقت تو ہم میں اور وقت ہماری مٹھیوں میں ہے۔ ہماری تہذیب کا وہ دانہ ہے جس کے گرتے ہی خاندانی وقار کا طائر زخمی ہو جائے گا...

اور پل پل خاندانی ہونے کا یہ احساس اندر کے سیکڑوں بُت توڑے جا رہا تھا۔" بت سیہ آب است در کوزہ نہاں۔ آں بُت منحوت چوں سیل سیاہ"۔ مگر یہ... جو چمکتے ہوئے سورج کے درمیان ہیں۔ شارعِ عام کے رنگین ٹھٹھول سُن رہے ہیں۔ اور نئے مزاج کے اس شہر میں گم ہو گئے ہیں...

اور شارعِ عام کے کنارے فٹ پاتھ پر دونوں ہاتھ پسارے دریوزہ گر چیختا ہے...

ان کی آنکھیں واپس کرو.....؟؟

ان کی آنکھیں لاؤ... لاؤ....؟؟

مگر اب کون سنے کہ سب بے آنکھ ہی چلے جا رہے ہیں۔۔

نیا لباس کسے پسند نہیں... بیٹے ارشد... تیرا کہنا

بالکل صحیح ہے۔ پاگل ہم ہی تھے کہ اپنے وقت میں نئے لباس کی پہچان نہ کر سکے۔۔ پھر کیا فائدہ اپنے آپ پہ پتھر اچھالنے سے ۔۔ اپنے آپ کو زخمی کرنے سے اب سانس ہی کتنی بچی ہے۔ مگر افسوس اس کا ہے کہ خاندانی وقار کی جن اینٹوں کو ڈھوتے ڈھوتے اپنے کاندھے زخمی کئے تھے۔ اپنے ہی بچوں نے وہ اینٹیں توڑ ڈالی ہیں ۔۔۔"

میں اپنے کمرے سے چپ چاپ باہر چلا آیا ہوں۔ مگر شور سے نجات کہاں۔ بھلے ہی کمرے کے اندر کا شور سنائی نہ دے۔ مگر وہ شور جو کمروں سے ہوتا ہوا۔ اندر اندر بس گیا ہے۔ اس سے قرار کہاں نصیب ہے۔ اور مولوی ہاشم اندھیرے گھر میں آنسو بہا رہے ہیں کہ بیٹوں نے بُرے وقت میں سہارا نہ دیا۔ اب بزرگوں کی بات بھی بُری لگنے لگی۔۔ اور بوڑھے باپ کو اکیلا چھوڑ کر بیٹا اپنی بیوی کے ساتھ عرب چلا گیا۔۔"

سوائے تسلی کے اور کیا دے سکتا ہوں۔۔۔ کہ مت رو مولوی ہاشم "مت رو" سوچ کر چپ ہو لو کہ جو بت ہم نے توڑ ڈالے تھے وہ سیکڑوں ہزاروں کی تعداد میں ان کے اندر روز بروز پیدا ہوتے جا رہے ہیں۔ اب ہمارے تمہارے جیسے لوگ ان بتوں کو توڑنے نہیں آیا کریں گے۔۔۔ اب بس یہ سوچو کہ زوال کی جس اندھیری سرنگ میں یہ داخل ہو چکے ہیں۔۔ اس سے باہر نکلنے کا کونسا راستہ ہے۔۔۔؟

خیالات کی ٹوٹتی اور بنتی لہریں ہوا کرتی ہیں۔ اور یہ لہریں سیلاب کی صورت بوڑھے نحیف بدن میں داخل ہو رہی تھیں۔۔ نہیں معلوم یہ غم کس کا کس کا ہے؟ صرف میرا ہے۔۔ مولوی ہاشم ہے۔ تجمل کا ہے۔۔ یا واقعی یہ غم ہے بھی یا نہیں۔۔ ہمارے سوچنے سمجھنے میں کہیں بھول ہو گئی کہ بیٹوں نے خاندانی وقار کی نقش نہیں ڈھائیں اپنے زمانہ کا سیکھ ہی لیا ہے۔۔۔ میں یہ سب کچھ بھی نہیں جانتا۔۔ مگر۔۔ بوڑھی آنکھیں۔ یہودی کے کتے" کی تدبیر کی تعریف کر رہی ہیں جس نے آگ کے پاس ایک بت کھڑا کر دیا تھا کہ جو کوئی اس بت کو سجدہ کرے گا۔ اس کی نجات کس ہو گی اور جو کوئی نہیں کرے گا۔۔۔۔؟

اور دادی اماں کی ڈوبی ہوئی آواز ہلکے ہلکے کمرے کے ویران ویران ماحول میں اتر رہی ہے۔

چوں سزائے آن بتِ نفس او نداد
از بتِ نفسش بتے دیگر بزاد

منقبت

شبیر کا مقام پیمبر سے پوچھئے ؛ ہے حوصلہ تو داورِ محشر سے پوچھئے
سجدے میں سر کٹا کے ہوئے کتنے سربلند ؛ حق کی یہ بات حق کے پیمبر سے پوچھئے
آلِ نبی تو مقصدِ ذبحِ عظیم ہے ؛ یہ کیوں ہے کیا ہے خالقِ اکبر سے پوچھئے
راہِ رضا میں کتنی اٹھائی ہیں سختیاں ؛ عابد کا حال زینبِ مضطر سے پوچھئے
بنیاد لا الٰہ کی کیونکر حسین ہیں ؛ ہندوستاں کے خواجۂ سنجر سے پوچھئے
مومن کا عشق عشقِ الٰہی بشیر ہے
عرفانِ ذاتِ فاتحِ خیبر سے پوچھئے

بشیر وارثی

ڈاکٹر اسد انصاری

سلام

نہ تھا غم فی الحقیقت غم، غمِ شبیرؑ سے پہلے
مقامِ صبر کیا تھا، عابدِ دلگیر سے پہلے

رسول اللہ کے دامن سے، جو وابستگی چاہے
کرے وابستہ خود کو، دامنِ شبیرؑ سے پہلے

علی اکبرؑ کی آوازِ اذاں سے جاگ اٹھی دنیا
تہہ و بالا ہوا رَن، نعرۂ تکبیر سے پہلے

حبیب ابن مطاہر کو، بنائیں راہنما اپنا
جواں درسِ عمل، حاصل کریں اس پیر سے پہلے

کیا ہے خیر مقدم موت کا کس خندہ روئی سے
تبسّم آگیا، اصغرؑ کے لب پر، تیر سے پہلے

کرے جس پر عبادت ناز، جو معیارِ طاعت ہو
نہیں ہے کوئی سجدہ، سجدۂ شبیرؑ سے پہلے

غمِ شبیرؑ سے ہر غم زمانے کا ہوا مکمل
سبھی غم، نامکمل تھے، غمِ شبیرؑ سے پہلے

بگوشِ دل، سنا ہے میں نے زنجیروں کے ماتم میں
صدا سجادؑ کی آئی ہے، ہر زنجیر سے پہلے

مکمل ہو گئی تشریح، مفہومِ طہارت سے
ہزاروں آیتیں تھیں، آیتِ تطہیر سے پہلے

اسدؔ شبیرؑ نے ان کو دکھائی راہِ جنّت کی
نہ تھے حُرؑ، باخبر، کچھ خوبیٔ تقدیر سے پہلے

محمد بدیع الزماں
ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ (موظف)

"بالِ جبریل" کی غزلوں کا آہنگ و آب و رنگ

شاعری میں آب و رنگ سے کسی شعر کے الفاظ، عبارات، اس کے استعارات و تشبیہات اور اس کا وہ مخصوص اندازِ بیان مراد لیا جاتا ہے جو کسی شعر کو شعر کا درجہ دیتا ہے۔ اس کو جب موزوں ترین الفاظ کے ذریعہ شعر کے قالب میں ڈھال دیا جاتا ہے تو شعر کے حسن میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس میں پاکیزہ خیالات کو زود اثر بنانے کے لئے زبان کی آرائش و مشاطگی کرنی پڑتی ہے۔ مگر جاودان شاعری کے لئے محض زبان و بیان کی چاشنی یا طرزِ اظہار ہی کافی نہیں۔ معانی اور مواد کی اہمیت پھر بھی اپنی جگہ پر مسلّم ہے۔ شعر و ادب کی اصل روح اس کا خیال ہے۔ اندرونی وحدت، ہم آہنگی اور تناسب کے بغیر الفاظ بذاتِ خود کچھ نہیں۔ اس لئے آب و رنگ کی قدر و قیمت مواد اور موضوع پر منحصر ہے۔ محض نغمہ و سرود کی لطافت میں کھو کر رہ جانا شعر کو پُرتاثیر نہیں بنا سکتا۔

اس طرح آہنگ سے مراد صرف صوتی گردہوں کا تسلسل نہیں بلکہ اس کو باہمی مربوط کرنے والے کسی نفسیاتی اصول کے مطابق تخلیق کو کہہ سکتے ہیں۔ کسی شاعرانہ تخلیق کے آب و رنگ اور آہنگ کا تجزیہ کرتے وقت ہمیں یہ خیال رکھنا ہو گا کہ شاعر نے مجرد احساسات کو اندازِ بیان کا لباسِ فاخرہ پہنا کر کہاں تک کمالِ شدت سے دوسروں کے سوز دروں تک اسے پہنچایا ہے اور اس سے دوسروں کے لئے خوشدلی اور انبساط کے مواقع کہاں تک فراہم کئے گئے ہیں۔ لہٰذا آب و رنگ اور آہنگ منحصر ہے مواد اور ہیئت، معانی اور صورت کے ساحرانہ امتزاج پر، جو ایک دوسرے سے الگ نہیں کئے جا سکتے اور شاعری کے جمالیاتی پہلو کا راز اسی حسین امتزاج پر منحصر ہے۔ معنی سے قطع نظر حسنِ ادا ہی سب کچھ نہیں ہے۔ اس کی روحِ رواں تخیل ہے جو آب و رنگ اور آہنگ میں مل کر قوسِ قزح کی دلکشی اور لطافت

پیدا کرتی ہے۔ ایک عظیم شاعر کے خیالات اگر اعلیٰ وارفع ہیں تو اس کے خیالات ہی حسنِ ادا میں رنگ بھر لیتے ہیں، جس کو اقبال نے اس طرح واضح کیا ہے ؂

مری مشاطگی کی کیا ضرورت حسنِ معنی کو
کہ فطرت خود بخود کرتی ہے لالے کی حنابندی

صنفِ غزل کے مخالفین کا کہنا ہے کہ غزل کا آرٹ تسلسل اور مربوط اور منتظم فکر کے لئے موزوں نہیں اور یہ کسی واضح اور روشن نظریے کی متحمل نہیں ہوسکتی۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ غزل کا دامان تنگ ہے اور اس کے گلِ حسن، محدود ہیں۔ جہاں تک دامانِ تنگ ہونے کی بات ہے غالب نے، جنھیں اپنے بیان کے لئے کچھ اور وسعت چاہیئے تھی، بہت حد تک اس میں وسعت بخشی اور بڑے بڑے فلسفیانہ خیالات کے اظہار کے قابل اسے بنایا مگر پوری طرح وہ کامیاب نہ ہو سکے لیکن اس وسعت کا رچا ہوا اظہار صرف اقبالؒ کے یہاں ملتا ہے جس کی نمائندہ "بالِ جبریل" کی غزلیں ہیں جو لیسے تو سمندر کی سطح دیکھنے سے معمولی اور بے شعور نظر آتی ہیں مگر اس کے نیچے ہزاروں لہریں موجزن ہوتی ہیں۔ زندگی میں رونما ہونے والے سارے خارجی تغیرات ان کی ان غزلوں میں پورے آب و تاب کے ساتھ رونما ملتے ہیں۔ ان میں ہمیں اس عہد کی ساری سیاسی، معاشی اور تہذیبی تبدیلیوں کا پرتو صاف نظر آتا ہے۔ ان غزلوں میں انسانیت کا سوز و گداز، اس کی دردمندی، زندگی اور اس کے مسائل کی متفکرانہ اور نفسیاتی تحلیل کا رجحان ملتا ہے۔ ان کے خیالات میں رنگارنگی اور موضوعات میں تنوع ہے اور اسی رنگارنگی اور تنوع، وسعت اور ہمہ گیری کی بنا پر "بالِ جبریل" کی غزلیں اردو شاعری میں اپنا الگ مقام رکھتی ہیں۔ اس میں فکر کی گہرائی، ماحول کی اثراندازی، صوتی آہنگ، مشاہدہ کی ہمہ گیری اور شدتِ احساس ایک دوسرے پر سبقت لیتے نظر آتے ہیں۔

اقبال نے ان غزلوں کی ہیئت کی تکنیک میں بہت سے نئے تجربے کئے اور انھیں بدلتے ہوئے ماحول اور حالات کے سانچے میں ڈھال کر ان میں مطابقت اور ہم آہنگی پیدا کی۔ انھوں نے ان غزلوں میں یہی نہیں کہ نئے الفاظ، نئی تراکیب، نئی تلمیحات اور تشبیہات سے صرف زبان کا ذخیرہ وسیع کیا، ان میں معنویت اور تاثیر پیدا کی بلکہ ان کو بزمِ خاص سے اٹھا کر اصلاحاتِ قوم...

و ملت کی تعمیری تحریکوں میں کار آمد موقعوں پر استعمال کیا۔ ہمیں " بالِ جبریل " کی ان غزلوں کی ہیئت کے تجربوں میں ایک نئی لے سنائی دیتی ہے، نئے لہجہ کا احساس ہوتا ہے، نئی اشاریت ملتی ہے۔ اقبال کی بیباکی، جرأت آموزی، خلوص و صداقت جذبات نے غزل کی ہیئت میں ایک کھلی فضا قائم کی اور متناسب الفاظ کے انتخاب، اس کی نغمگی اور غنائی کیفیت، بحر کا ترنم اور اس پر مستزاد تخیل کی گہرائی نے انداز بیان کا نیا شعور عطا کیا جو دوسروں کے لئے مشعل راہ بنا۔

" بالِ جبریل " کی غزلوں کا لب و لہجہ اقبال کی انفرادیت کے مزاج کو تعین کرنے میں بہت حد تک کار فرما ہے۔ ان کی ان غزلوں کا اثر زیادہ تر لب و لہجہ کی بنا پر بھی ہے جو نہایت فنکارانہ ہے۔ مندرجہ ذیل غزل کا تصور، انداز بیان اور لب و لہجہ دیکھیے جس میں ایک قسم کی توانائی اور ایسا ولولہ ہے جو بیک وقت حیات پرور بھی ہے اور حیات آفریں بھی۔

میری نوائے شوق سے شور حریم ذات میں!
غلغلہ ہائے الاماں بتکدۂ صفات میں!

یہ کہ شاعری جذبات کی تصویر کشی کا دوسرا نام ہے یہ غزل اس کلیہ پر پوری اترتی ہے اس غزل کے اشعار میں جو چیز تخیل اور تصور کو حرکت میں لاتی ہے وہ اس کے الفاظ اور ان کی بندشیں ہیں۔ اسی قوتِ تحریک کو زور کہیے یا حالی کے الفاظ میں جوش مگر یہ ان کے جذبات کی شدت کی بھرپور نمائندگی کرتی ہیں اور جن جذبات کو وہ ابھارنا چاہتے ہیں وہ پورے طور پر ابھر کر سامنے آجاتی ہیں۔ قافیوں کے التزام نے فکر کی یکسوئی کے لیے مرکزی نقطہ کا کام کیا ہے۔ خیالات کے طوفان اقبال کے ذہن میں گرجتے اور گونجتے ہوئے اٹھتے ہیں اور یہی قافیے چٹان بن کر طوفان کے دھاروں کو صحیح سمت موڑ دیتے ہیں۔ یہ قافیے معراج کے زینے ہیں۔ جہاں تک مطلع کا سوال ہے اس غزل کا مطلع ذہن اور جذبات میں ایک تموج کی کیفیت پیدا کرتا ہے اور غزل کے مجموعی اور بھرپور تاثر کا پس منظر پیش کرتا ہے۔

اپنے جذبات کی شدت، ذہنی ہیجان، پرسوز کیفیت اور مزاج کی شورش کے اظہار کے لئے اقبال کے لب و لہجے اور تیور کی ایک اور مثال اس غزل میں ملاحظہ ہو:

یہ کون غزل خواں ہے پُرسوز و نشاط انگیز
اندیشۂ دانا کو کرتا ہے جنوں آمیز!

صنفِ غزل کی مخالفت میں اکثر یہ کہا گیا ہے کہ غزل گو شعرا کسی بات کو تسلسل اور ترتیب کے ساتھ نہیں کہہ سکتے اور جیسا کلیم الدین احمد صاحب نے کہا کہ غزل میں تسلسل تو جرم ہے۔ غالب نے بھی چند مسلسل غزلیں کہیں مگر "بالِ جبریل" کی غزلیات جو گو نسبتاً بہت تھوڑی ہیں مگر وہ زیادہ تر مسلسل غزلیں ہی ہیں۔ ان غزلوں میں اقبال کے جذبات اور خیالات مربوط ہو کر ایک دوسرے میں فطری طور پر پروتے چلے جاتے ہیں اور تسلسل کا باطنی رشتہ ان کے موڈ اور عام کیفیت پر طاری ہو کر شاعرانہ تخلیق کے عمل سے خود بہ خود ناطہ جوڑتا چلا جاتا ہے اور ایک شعر کے بعد دوسرے شعر میں اس کی لَے تیز سے تیز تر ہوتی چلی جاتی ہے۔ ان کی مسلسل غزلوں میں ایک مشہور غزل ہے: اگر کج رو ہیں انجم، آسماں تیرا ہے یا میرا؟
مجھے فکرِ جہاں کیوں ہو، جہاں تیرا ہے یا میرا؟

اس غزل میں ایک ہی سرور، جذبہ اور شدتِ احساس ساری غزل میں کارفرما ہے اور اُن کی اس انفعالی وحدانیت نے غزل میں ایک خاص ترنم اور ایک مفکرانہ قطعیت پیدا کر دی ہے اس غزل کے لب و لہجہ میں اقبال کی شخصیت کی گونج زیادہ اثر انداز ہوتی ہے۔ اشعار کے تیور اور کلام کی روانی و آہنگ بھی عناصرِ ترکیبی اس میں موجود ہیں۔ ان ہی صفات سے معمور ایک اور مسلسل غزل ہے: عالم آب و خاک و باد! سرِّ عیاں ہے تو کہ میں؟
وہ جو نظر سے ہے نہاں، اس کا جہاں ہے تو کہ میں؟

ان سارے معنوی محاسن کے علاوہ جو ان غزلوں میں نظر آتے ہیں صوری بیان میں بھی انداز بیان کے تیکھے پن اور لب و لہجہ کے استفہامیہ انداز کے لحاظ سے یہ دونوں اپنی مثال آپ ہیں۔ خدا سے شوخی بہتوں نے کی مگر اقبال کی جرأت آموزی قابلِ دید ہے۔ ان دونوں غزلوں کی ردیفیں: "تیرا ہے یا میرا" اور "تو کہ میں؟" غیر مانوس ضرور ہیں مگر قافیوں کی مدد سے

اسے اتنے لطیف طرح سے سجایا گیا ہے کہ اگر ان غزلوں کو مخصوص لب ولہجہ سے پڑھا جائے تو پڑھنے والے پر بھی وجدانی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ ردیف کی تکرار نے دو آتشہ، سہ آتشہ کا کام کیا ہے۔ ان غزلوں میں قافیے اور ردیف کے امتزاج سے جو آب و رنگ اقبال نے بھرا ہے اس میں شوخی و طنز، جرأت آموزی، توانائی اور ولولہ، سب کو یکجا کر کے سب کے محاسن کو قائم اور نمایاں رکھا ہے۔ اپنے جذبات و حسیات کو مربوط کر کے ہر شعر کا دوسرے سے باطنی رشتہ اپنی جگہ پر موجود ہے اور پوری غزلوں میں ایک موڈ اور کیفیت کی ہم آہنگی قائم رہتی ہے۔

"بالِ جبریل" میں کچھ اور بھی ایسی مسلسل غزلیں ہیں جن میں موڈ کی ذہنی اور جذباتی کیفیت کی ہم آہنگی اور وحدت کا تسلسل اشعار کے انتشار کے باوجود قائم رہتا ہے اور معنوی تسلسل کا فقدان نہیں ملتا اور موضوع اور جمالیاتی پہلو پوری طرح ہم آہنگ رہتے ہیں۔ جیسے یہ غزل:

گیسوئے تابدار کو اور بھی تاب دار کر

ہوش و خرد شکار کر، قلب و نظر شکار کر

فقر جیسے پیچیدہ اور خشک نکتہ کو ایک مسلسل غزل میں سمو کر اقبال نے تقدس اور پاکیزگی، تفکر اور فلسفہ، سب کو یکجا کر دیا ہے اور اس آمیزش نے اقبال کے فلسفہ کو شعر اور شعر کو فلسفہ بنا کر ایک کلی تصویرِ حیات کا نقشہ پیش کیا ہے۔ غزل یہ ہے:

فقر کے ہیں معجزات تاج و سریر و سپاہ

فقر ہے میروں کا میر، فقر ہے شاہوں کا شاہ

ایک دوسری مشہور مسلسل غزل ہے:

اپنی جولانگاہ زیرِ آسماں سمجھا تھا میں

آب و گل کے کھیل کو اپنا جہاں سمجھا تھا میں

اس غزل میں اذہان مادیت سے گذر کر اپنے حیز اصل و نورِ ربانی اور جلوۂ حقیقی سے ہم آغوش ہو جاتے ہیں۔

"بالِ جبریل" کی غزلوں میں جب باتیں آہنگ اور آب و رنگ کی آتی ہیں تو ان غزلوں

ہیں دوسری ساری خصوصیات کے ساتھ الفاظ کا قرینگی کے ساتھ دروبست اور ان کی تراکیب نغموں کے اعتبار سے ایسی شگفتگی پیدا کرتی ہیں جو قاری کے ذہن کی طرف خود بخود رہبری کرنے لگتی ہیں۔ آہنگ اور آب و رنگ کا حسین امتزاج مندرجہ ذیل غزل میں دیکھئے جہاں بہت سیدھے سادھے اور جانے پہچانے الفاظ کو تراکیب کی دلآویزی، برجستگی، سلاست و روانی اور پھر ردیف کی سبک روی اور موزوں بحر کے انتخاب سے اقبال نے جو صوتی ہم آہنگی پیدا کی ہے وہ اتنی لطیف ہے کہ ہر صاحب ذوق کو گانے یا گنگنانے پر مجبور کرتی ہے :

پریشاں ہو کے میری خاک آخر دل نہ بن جائے!
جو مشکل اب ہے یا رب، پھر وہی مشکل نہ بن جائے!

ایسی ہی ایک دوسری غزل ہے :

پھر چراغِ لالہ سے روشن ہوئے کوہ و دمن
مجکو پھر نغموں پہ اُکسانے لگا مرغِ چمن

اس دوسری غزل میں فطرت اور اس کے مظاہر سے بے شمار خوبصورت تشبیہات اور استعارات مستعار لے کر اور ان کے ذریعے متحرک تصاویر بنا کر اقبال نے حسن سے والہانہ عقیدت اور حسن و عشق کی معصوم جستجو کا اظہار کیا ہے اور تخیلات و کیفیات کو اسیر کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس میں اظہارِ بیان کی نئی آراستگی اور بحر و ترنم کی ایک نئی ترتیب ملتی ہے۔ اس کی صوتی تنظیم سے ایک مخصوص آہنگ اور خاص سماعی کیفیت پیدا ہوتی ہے جو اس غزل کے مزاج کی مخصوص کیفیت سے مناسبت رکھتی ہے۔ یہاں بھی الفاظ، تشبیہات اور مناسب بحر نے شعر کی دلآویزی اور دلفریبی میں اضافہ کیا ہے۔

یوں بھی عام طور سے سوا اقبال کے کسی بھی اُردو شاعر نے قافیہ پر تان نہیں توڑی ہے اور نہ آج توڑ رہے ہیں کیونکہ یہ سب کے بس کی بات نہیں مگر اقبال اکثر ردیف اڑا جاتے ہیں اور ایک ہی لفظ سے قافیہ اور ردیف دونوں کا کام لے کر حسن پیدا کرتے ہیں جیسے مندرجہ بالا غزل میں کہا جاتا ہے کہ ردیف کی سُبک روی شعر کو پڑھنے اور سمجھنے میں مدد کرتی ہے اور یہ بھی

کہ اس کا صوتی آہنگ شیرینی اور لطافت پیدا کرتا ہے مگر اسی غزل "پھر چراغِ لالہ سے روشن ہوے کوہ و دمن" کو دیکھئے۔ اقبال نے بغیر ردیف کے بہت چھوٹے چھوٹے آسان اور عام فہم الفاظ کو بطور قافیہ استعمال کر کے کتنا خوش الحان صوتی آہنگ پیدا کیا ہے جو ہمارے ذوقِ جمال کو تسکین و مسرت سے ہم آغوش کرتا ہے۔ ردیف کی مجبوری سے ان کی کسی بھی غزل کے کسی بھی شعر کا مضمون دب نہیں گیا ہے اور نہ ان میں کرختگی اور بد نمائی آئی ہے۔ بحروں کے انتخاب نے دوسروں کو بھلے رسوا کیا ہو مگر اقبال کی ہر غزل خواہ وہ کسی بھی بحر میں ہو، ترنم اور موسیقیت سے عاری نہیں اور نہ ان کے مخصوص فلسفے کے اظہار میں حارج۔ ہر بحر ان کی قد آور شخصیت کی انمٹ چھاپ چھوڑے بغیر نہیں رہتی۔

اقبال نے جہاں غزل گوئی کی تنگ دامنی کے باوجود اپنے پیچیدہ فلسفیانہ نکتوں کے اظہار کے لئے وسعت تلاش کرنے کا اجتہادی کارنامہ انجام دیا وہاں قدیم کردار اور موضوعات سے بھی بے اعتنائی نہیں برتی جیسے ساقی کا کردار یا تصوف کا موضوع جن پر پوری اردو شاعری کا وجود عمل میں آیا۔ ایک ساقی کو لیجئے : اسے ہر شاعر نے اپنے اپنے مذاق کے مطابق استعمال کیا۔ کہیں یہ مے فروش ہے اور کہیں یہ پیرِ مغاں بنا بیٹھا ہے۔ کوئی ساغر پٹک پٹک کر چشمۂ زمزم نکال رہا ہے تو کوئی ساقی پر دین و ایمان تک لٹا دینے کو تیار ہے، یہ سب اس لئے کہ اردو غزل اختصار کی بنا پر "بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر" والی بات تھی مگر شباب و شعر کی اس محفل میں ایک مردِ قلندر نے اس کردار کو الگ فرائض سونپے، اس سے مخاطبت کا نیا طریقہ وضع کیا۔ مگر قبل اس دشت کی سیاحی کے اقبال نے دو ٹوک کہا ہے

حدیثِ بادہ و مینا و جام آتی نہیں مجھکو
نہ کر خارا شگافوں سے تقاضہ شیشہ بازی کا

اس لئے کہ ان کا کہنا تھا کہ اس دور میں مے اور ہے، جام اور ہے، جم اور ساقی نے بنا کی روشِ لطف و کرم اور

ساقی سے اقبال کی کیا مانگ ہے، انہوں نے اسے اپنی مثنوی "ساقی نامہ" میں بہتر طور پر واضح کیا ہے مگر "بالِ جبریل" کی غزلوں میں پورا "ساقی نامہ" کوزہ میں بند ہے۔ پہلی غزل ہے :

دگرگوں ہے جہاں، تاروں کی گردش تیز ہے ساقی !
دل ہر ذرّہ میں غوغائے رستا خیز ہے ساقی !

اس غزل میں افکار، خیالات اور جذبات کے تسلسل کے ساتھ ساتھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی مریض طبیب سے وہ ساری کیفیات بیان کر رہا ہے جن کی بنا پر اس کے قوا مضمحل ہو گئے ہیں۔ وہ طبیب سے "آبِ نشاط انگیز" پانے کا ملتجی ہے۔ "آبِ نشاط" کا استعارہ گو روایتی ہے مگر اس غزل کے آہنگ اور آب و رنگ میں یہ ایک نئے اندازِ فکر کی ترجمانی کرتا ہے۔ اس غزل میں شاید ان کے دل کی بات پوری نہ ہو سکی تو دوسری غزل میں وہ اس کی وضاحت کرتے ہیں کہ اس "آبِ نشاط انگیز" سے وہ اپنے کس کس قوا کو توانائی بخشنے کا کام لیں گے۔ وہ غزل یہ ہے :

لا پھر اک بار وہی بادہ و جام اے ساقی !
ہاتھ آ جائے مجھے میرا مقام اے ساقی !

اس غزل کے متذکرہ بالا مطلع کا دوسرا مصرع اور اس میں خاص کر الفاظ "میرا مقام" ان کی پوری نفیس شاعری کا نچوڑ ہے۔ اسی مقام کو حاصل کرنے کے لئے اقبال نے چالیس برسوں سے زائد شعر و سخن کی محفل گرم رکھی۔ اسی غزل میں انھوں نے اس کی بھی وضاحت کی کہ اس "مقام" کو حاصل کرنے کے لئے شعر و سخن کہاں تک ممد و معاون ہو سکتے ہیں مگر انھوں نے ایک کڑی شرط لگا دی اور وہ یہ کہ اگر سینہ روشن ہے تب ہی سوزِ سخن عینِ حیات ہے ورنہ یہ مرگِ دوام کے مترادف ہے۔ سینہ روشن نہ رہنے پر یہ "آبِ نشاط انگیز" سمِ قاتل بھی ثابت ہو سکتا ہے۔ اسی "مقام" کے حاصل کرنے کی طرف انھوں نے دوسری جگہ اس طرح اشارہ کیا ہے ـــ

میں کہ مری غزل میں ہے آتشِ رفتہ کا سُراغ
میری تمام سرگذشت کھوئے ہوؤں کی جستجو !

ان دونوں غزلوں میں اقبال نے انسانی شخصیت کی بالیدگی اور اس کی عظمت اور احترام کو بلند کر کے

بشارت کی آواز بلند کی اور ایک نئے شعور، ولولے اور حوصلہ افزا روشن مستقبل کے تصور کو پیش کیا۔ ان دونوں غزلوں میں جذبات کا ایک تسلسل ہے اور ہر شعر ایک دوسرے سے مربوط۔ علاوہ ازیں موضوع، مواد اور ہیئت کی ہم آہنگی اور مخاطبت کا والہانہ انداز اپنے معراج پر ہے۔

روایت سے رشتہ رکھتے ہوئے ساقی کو اردو شاعری میں نیا رنگ و روپ دینے، اس کے کردار کی نئی تدوین کرنے میں اقبال نے اپنی انفرادیت یہاں بھی قائم رکھی۔ یہ سب کچھ کیونکر ممکن ہوا؟ اس لئے کہ ان کی خودی سوزِ دروں کی بھٹی سے تپ کر نکلی تھی۔ مگر ساقی سے التجا میں بھی ان کی شانِ بے نیازی میں کوئی فرق نہیں آتا۔ وہ اپنے خیالی پیالوں کو لئے ہوئے شراب کی بھیک نہیں مانگتے بلکہ خودداری کا تو یہ عالم ہے کہ "بالِ جبریل" ہی کی ایک غزل میں کہتے ہیں ؎

گدائے میکدہ کی شانِ بے نیازی دیکھ
پہنچ کے چشمۂ حیواں پہ توڑتا ہے سبُو!

اقبال کی یہ خودداری ان کی سرشت میں داخل تھی، اس لئے کہ اس شعر سے بہت پہلے وہ "بانگِ درا" کی نظم "شمع اور شاعر" میں کہہ چکے تھے کہ ؎

تو اگر خوددار ہے منّت کشِ ساقی نہ ہو
عین دریا میں حباب آسا نگوں پیمانہ کر

یہ وضع داری شاید اقبال نے غالب سے لی ہو جن کے وہ بہت معتقد تھے کہ ؏

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے، ہم اپنی وضع کیوں بدلیں

ساقی کی طرح تصوّف نے بھی اردو شاعری کو امتیازی سوز و گداز عطا کیا۔ اقبال اور تصوّف ایک لمبی بحث ہے مگر مختصر یہ کہ اقبال اس تصوّف کو جو اردو شاعری کا اوڑھنا بچھونا بن گئی تھی منفی تصوّر کرتے تھے جس میں نہ حرارت تھی اور نہ سوز و گداز، نہ تو ترغیبِ عمل کے رجحانات فروغ پا سکتے تھے اور نہ روح میں بالیدگی آ سکتی تھی۔ اقبال کا تصوّف عمل کی روحِ رواں ہے۔ جس سے مذہب میں انہماک، خلوص اور پختگی آتی ہے۔ وہ ایسے مافوق البشر کے متمنی تھے

جس میں خودی پوری آب و تاب کے ساتھ تکمیل پا چکی ہو۔ وہ فرد کی تکمیل کو سارے خیر اور کائناتی نظام کی درستی کا حل قرار دیتے تھے جو جذبہ، وجدان، آرزو مندی اور عشق کے ذریعہ تکمیل پا چکا ہو۔ عشق کی فلسفیانہ اور نفسیاتی تحلیل "بالِ جبریل" کی اس غزل میں دیکھئے:

کیا عشق ایک زندگیٔ مستعار کا　　کیا عشق پائدار سے ناپائدار کا!
وہ عشق جس کی شمع بجھا دے اجل کی پھونک　　اس میں مزا نہیں تپش و انتظار کا
میری بساط کیا ہے؟ تب و تابِ یک نفس　　شعلے سے بے محل ہے الجھنا شرار کا
کر پہلے مجھ کو زندگیٔ جاوداں عطا　　پھر ذوق و شوق دیکھ دلِ بیقرار کا

کانٹا وہ دے کہ جس کی کھٹک لازوال ہو
یا رب وہ درد جس کی کسک لازوال ہو

وحدت و کثرت، جزو و کل، غیب و شہود، تجلی و مشاہدہ، علوئے فطرت و عروجِ روح، غرض عرفانِ نفس کی کوئی ایسی منزل نہیں جو "بالِ جبریل" کی غزلوں کے حدود سے باہر ہو۔ چند اشعار پیش ہیں:

خودی سے اس طلسمِ رنگ و بو کو توڑ سکتے ہیں
یہی توحید تھی جس کو نہ تو سمجھا نہ میں سمجھا!

نہ بادہ ہے نہ صراحی نہ دورِ پیمانہ
فقط نگاہ سے رنگیں ہے بزمِ جانانہ

میں کہاں ہوں، تو کہاں ہے؟ یہ مکاں کہ لامکاں ہے
یہ جہاں مرا جہاں ہے کہ تری کرشمہ سازی

تو ہے محیطِ بیکراں، میں ہوں ذرا سی آبجو
یا مجھے ہمکنار کر یا مجھے بے کنار کر!

عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام
اس زمین و آسماں کو بیکراں سمجھا تھا میں!

اقبال نے "بالِ جبریل" کی غزلوں میں سماجی اور سیاسی اثرات کی ترجمانی اور اپنے خیالات

کے اظہار کے لئے فن کی لطافتوں میں طنز کی تیزی شامل کی جس نے بیداری و عمل کے لئے اذانِ سحرگاہی کا کام کیا۔ انہوں نے بالواسطہ اور بلاواسطہ طنز کا استعمال کیا ہے۔ ان میں لطافت و تلخی، خطیبانہ ہیجان و طغیانی، سیاسی کرب و بےچینی اور مغربی تہذیب کے بڑھتے ہوئے مضر اثرات پر ضرب کاری ملتی ہے۔ ان میں ایک مستقل چبھن اور نشتریت ہوتی ہے۔ ان کے ترکش سے نکلے ہوئے یہ تیر خود ان کی اور سننے والے دونوں کی جذباتیت کو تقویت پہنچاتے ہیں۔ زیادہ تر صوفی و مُلّا ان کے طنز کا نشانہ ہے اس لئے کہ یہ ملّتِ بیضا کی رہنمائی کرنے سے معذور تھے۔ اقبال نے اپنے تیکھے طنز کے آب و رنگ سے متذکرہ بالا سبھی موضوعات پر اُردو غزل میں فکر کا ایک نیا آہنگ پیدا کیا جو دوسروں کے لئے مشعلِ راہ بنا۔ "بالِ جبریل" کی غزلوں کے چند ایسے اشعار ملاحظہ ہوں:

مجھ کو تو سکھا دی ہے اُفرنگ نے زندیقی — اس دَور کے مُلّا ہیں کیوں ننگِ مسلمانی

حاضر ہیں کلیسا میں کباب و مئے گلگوں — مسجد میں دھرا کیا ہے بجز موعظہ و پند

قلندر جُز دو حرفِ لا الٰہ کچھ بھی نہیں رکھتا — فقیہہ شہر قاروں ہے لغت ہائے حجازی کا

یہ حوریانِ فرنگی دل و نظر کا حجاب — بہشتِ مغربیاں جلوہ ہائے پابہ رکاب

میخانۂ یورپ کے دستور نرالے ہیں — لاتے ہیں سرور اوّل دیتے ہیں شراب آخر

"بالِ جبریل" کی غزلوں میں سماجی، سیاسی اور اخلاقی مسائل اور اجتماعی تفکر کے بیان کے لئے اقبال نے حکیمانہ آہنگ اختیار کیا۔ ان غزلوں میں سیاسی انقلاب کا تصور اور جذبۂ آزادی کی عکاسی بھی ہے اور ایک خوش کُن مستقبل کا پیام بھی جن کی تقلید میں "ترقی پسند شعراء" کی ایک لمبی قطار سامنے آ گئی۔ چند ایسے اشعار پیش ہیں:

یا رب یہ جہانِ گذراں خوب ہے لیکن — کیوں خوار ہیں مردانِ صفا کیش و ہُنرمند؟

گو اس کی خدائی میں مہاجن کا بھی ہے ہاتھ — دُنیا تو سمجھتی ہے فرنگی کو خُداوند

وہ آنکھ کہ ہو سُرمۂ افرنگ سے روشن — پُرکار و سخن ساز ہے! نمناک نہیں ہے

نظامِ کارا گر مزدور کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا طریقِ کوہکن میں تو وہی حیلے ہیں پرویزی!
جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

نہ کر افرنگ کا اندازہ اس کی تابناکی سے کہ بجلی کے چراغوں سے ہے اس جوہر کی براقی

غزل کی اجزائے ترکیبی میں ایک مقطع بھی ہے۔ اُردو شعراء نے ولیؔ سے لے کر حسرتؔ تک ایک بھی ایسی غزل نہیں کہی جس میں مقطع نہ ہو، اس لئے کہ اس میں اُن کو اپنی اَنا کا اظہار کرنا رہتا تھا حالانکہ مقطع کو بھرتی کا شعر کہا گیا ہے۔ کہنے والے نے تو یہاں تک کہا ہے کہ مقطع میں شاعر گویا دربار کی آخری صف میں سگِ دربار کی طرح بیٹھا ہے۔ اُردو شعراء کی ساری معرکہ آرائیاں اور چشمکوں کی تان مقطع ہی پر ٹوٹتی تھی۔ غالبؔ کو اپنے اندازِ بیان پر فخر کرنا تھا تو اس کا اظہار مقطع میں کیا گیا۔ داغؔ کو اگر یہ کہنا تھا کہ ہندوستان میں دھوم اُن کی زباں کی ہے تو یہ بھی مقطع کا شعر ہو گیا۔ برعکس اس کے چونکہ اقبالؔ کا خمیر' بہ حیثیت شاعر' بالکل دوسری مٹی سے بنا تھا اس لئے "بالِ جبریل" کی قریب ۷۵ غزلوں میں مشکل سے چار یا پانچ غزلوں میں ہی مقطع ہیں مگر پھر بھی وہ ان مقطعوں میں اپنی انا کو تسکین نہیں دیتے بلکہ انتہائی عجز اور انکساری سے اپنی شخصیت کو بے نقاب کرتے ہیں اور وہ انھیں اپنے جذبات اور ذہنی کیفیات کے مجموعی اظہار کا وسیلہ بناتے ہیں۔ وہ مشاطگی کے قائل تو تھے نہیں۔ وہ تو اس کے قائل تھے کہ شعر کی بنیاد اگر اصلیت پر ہے تو وہ چاہے مطلع ہو یا مقطع، اس میں زور و اثر کا پایا جانا ضروری ہے۔ جیسے ان کے یہ مقطعے:

بڑا کریم ہے اقبالؔ بے نوا لیکن عطائے شعلہ شرر کے سوا کچھ اور نہیں
راز حرم سے شاید اقبالؔ باخبر ہے ہیں اس کی گفتگو کے انداز محرمانہ!
اِکا اقبالؔ کی میں جستجو کرتا رہا برسوں بڑی مدت کے بعد آخر وہ شاہیں زیرِ دام آیا

ان کی عجز و انکساری اور جذبات کی صداقت کا تو یہ عالم تھا کہ وہ تو سرے سے اپنے کو شاعر کہلوانے ہی کو تیار نہ تھے "بالِ جبریل" ہی کی غزلوں کا ایک شعر ہے ۔

خوش آگئی ہے جہاں کو قلندری میری
وگرنہ شعر مرا کیا ہے شاعری کیا ہے!

اور پھر اپنی غزلوں کے متعلق فرماتے ہیں ؎

نہ زباں کوئی غزل کی نہ زباں سے آشنا میں
کوئی دلکشا صدا ہو عجمی ہو یا کہ تازی!

الغرض "بالِ جبریل" کی غزلیں آہنگ اور آب و رنگ کے لحاظ سے دوسرے شعراء کی ادبی تخلیقات سے بالکل الگ ہیں۔ یہ بلند پیغامات کا مجموعہ ہیں اور ہر پیغام اپنی جگہ انفرادی حیثیت رکھتا ہے۔ بیشتر غزلوں کے اشتعال انگیز تیور ہمارے تخیل میں سنگ و آہن کی سختی پیدا کرتے ہیں ان کے موضوعات نفسِ انسانی سے متعلق ہیں اور اندازِ بیان شگفتہ، دلربا اور دلبر ہے۔ مخصوص علامات الفاظ اور تشبیہات نے ہر موضوع کو بلیغ معنوں کا حامل بنا دیا ہے۔ ان غزلوں کے ذریعے اقبال نے فرشتوں کو آدم کی تڑپ اور آدم کو آدابِ خداوندی سکھانے کا کام لیا اور اُن کی جذب و مستی نے تو آسمان عرشیوں میں کھلبلی مچا دی۔ شکایت حضورِ حق تک پہنچی کہ ع یہ بندہ وقت سے پہلے قیامت کر نہ دے برپا۔ اقبال بھلا نچلے کب بیٹھنے والے تھے، جھٹ دو بدو کہہ بیٹھے ؎

اب کیا جو فغاں میری پہنچی ہے ستاروں تک
تو نے ہی سکھائی تھی مجھ کو یہ غزل خوانی!

غزل کی خوبیوں اور خامیوں پر حالی سے لے کر کلیم الدین احمد تک دفتر کے دفتر لکھے جا چکے ہیں۔ نقادوں نے اردو شاعری کے لئے فنِ نقد کا جو بھی معیار اب تک متعین کیا ہے اس کسوٹی پر ولی سے لے کر حسرت تک سبھوں کو پرکھا گیا مگر تاجِ زریں کی مستحق اقبال کی شاعری مجموعی طور پر اور بالِ جبریل کی غزلیں خصوصی طور پر قرار پائیں۔ کلیم الدین احمد سرے ہی سے بحیثیت صنف، غزل ہی کے قائل نہیں تھے مگر ان کی کڑی کسوٹی پر بالِ جبریل کی غزلیں کہاں تک پوری اترتی

ہیں ان ہی کی زبان سے سنیے تو لطف آئے گا:

"اقبال نے غزل کی فضا بالکل بدل دی۔ ایک نئی راہ نکالی جس پر دوسرے بھی چلنے لگے لیکن یہ بھی بھول گئے کہ یہ راہ اقبال نے کھولی ہے۔ جیسے ترقی پسند شعراء۔ یہ بھی غزل میں نئے مضامین باندھتے ہیں اور اس پر فخر کرتے ہیں لیکن مضامین وہی ہیں جو ترقی پسند لکھنے والوں کی مشترکہ جاگیر ہیں۔ ان کے خیالات کی دنیا بھی محدود ہے۔ وہ اس مختصر دائرے میں خوش نظر آتے ہیں۔ ان میں یہ سکت نہیں کہ اقبال کی طرح ایک نئی دنیا بنائیں۔" (از: کتاب: "اردو شاعری پر ایک نظر" حصہ دوم)

بالِ جبریل کی غزلوں کے آہنگ اور آب و رنگ کو خراجِ تحسین پیش کرنے والے نے تو یہاں تک کہا ہے کہ:

"علامہ اقبال نے تو اپنے فلسفے، عقیدے اور سماجی و سیاسی مضامین کو خوب اچھی طرح گھلا کر اپنی غزلوں میں ایسا سمیٹ دیا ہے کہ اگر اردو غزل میں اور کچھ نہ رہ جائے صرف اقبال کی چند غزلیں رہ جائیں تو ایک صدی تک اردو غزل کی بقا کا سامان یہی کافی ہے۔ انہی سے اور کونپلیں پھوٹیں گی اور ان کونپلوں سے اور غنچے نکلیں گے پھر یہ گلبن اپنے ارتقائی شکلوں کے ساتھ اور رنگا رنگ پھولوں کے ساتھ ہرا بھرا رہے گا۔"

(از کتاب: "زبان و بیان")

یہ ہیں الفاظ ملک کے مشہور نقاد ڈاکٹر ظ۔ انصاری کے، جن کی تبحرِ علمی کا قائل نہ ہونا، اپنے ذوقِ سلیم کی توہین ہے۔

اردو شعرا کی آپس کی رقابتوں اور اپنے ہمعصروں سے عناد کو صاحبِ "آبِ حیات" نے تفصیلی طور پر بیان کیا ہے۔ مگر اقبال کو ان کے دو ہمعصر شعرا نے کن نظروں سے دیکھا ان کا ذکر نہ کرنا شاید اس مقالے سے ناانصافی ہوگی۔ یہ ہیں جوش اور فراق۔ ایک نے اقبال کے متعلق یہ رائے ظاہر کی:

"اقبال قدرت کی طرف سے ایک سمندر بن کر پیدا ہوئے تھے۔ لیکن یہ ایک ادبی المیہ ہے کہ وہ ایک تالاب ہو کر مر گئے۔ ان سے میں قطعی متاثر نہیں ہوں۔"

(از ماہنامہ: "جمالستان" دہلی، جنوری ۱۹۶۴ء)

یہ تھے "جنگل کی شہزادی" کے مصنف جوش ملیح آبادی جن کی نظریں فرش ہی پر ٹکی رہ گئیں۔ دوسرے ہیں فراق گورکھپوری جو صحیح معنوں میں غزل گوئی میں اقبال کو اپنا حریف سمجھ سکتے تھے مگر ان کی وسیع النظری یہ کہے بغیر نہ رہ سکی کہ:

"سائنس، جدید سوشیالوجی، جدید فلسفہ، جدید فضا اور ماحول، مغرب اور مشرق کا تصادم اور ان کا امتزاج جس طرح غزل میں رونما ہوا اس کی نمایاں مثال اقبال کی غزلیں ہیں اور یہ اثر بالِ جبریل اور ضربِ کلیم میں اتنا تیز اور نمایاں ہے کہ اقبال کی غزلیں اردو شاعری میں انقلاب کا حکم رکھتی ہیں۔"

(از ماہنامہ "نگار" لکھنؤ۔ جنوری، فروری ۱۹۵۰ء)

اب آخر میں بالِ جبریل کی غزلوں میں آہِ سرد کی بجائے نفسِ گرم کی چنگاریاں بھی دیکھتے چلئے ہے

اقبال کے نفس سے ہے لالے کی آگ تیز
ایسے غزل سرا کو چمن سے نکال دو ..

قمقام ابن فیضی

غزل

دریا بنے جاں کم آب سہی ڈوب جاؤں گا
اب کے جو کوئی موج اٹھی ڈوب جاؤں گا

ترد ط کو نہ قطرۂ قلزم سے تو مجھے
مٹی ہے جو اسی میں کبھی ڈوب جاؤں گا

سانسوں کا یہ بساط بھی چادر ہے موج کی
اس کو سمیٹ لوں تو ابھی ڈوب جاؤں گا

باقی ابھی ہے دونوں کناروں کے درمیاں
کچھ اور آگہی جو بڑھی ڈوب جاؤں گا

تقدیر ہیں صدف کی یہی تہ نشینیاں
پا ایں کمال بے گہری ڈوب جاؤں گا

پائی ہے کب کسی نے یہاں ساحلوں کی تھاہ
ہے لمحہ لمحہ گہری ندی ڈوب جاؤں گا

معیار حرف و صوت کرو اور کچھ بلند
نیچی اگر یہ سطح رہی ڈوب جاؤں گا

میرے لئے ہے موت یہ تحسین ناشناس
پھیلا نہ دام کم نفسی ڈوب جاؤں گا

سرتاقدم ہوں جوشِ طبیعت سے موج موج
ہوگا فضا مآل یہی ڈوب جاؤں گا

س۔ عشرت

تین شعر

رات غم گزیدہ ہے زخم ناشناسی ہے
زندگی کے چہرے پر کس قدر اداسی ہے

آج زخم سی لیں گے کون جانے کل کیا ہو
یہ زمین صدیوں سے خون کی پیاسی ہے

کس قدر تعجب ہے تیرگی سے گھبرا کر
اپنا گھر جلاتے ہیں کیسی بدحواسی ہے

غزل (نامکمل)

ان کی محفل ہو کہ ویرانہ کوئی فرق نہیں
حیب بھٹکنا ہی مرے غم کا مقدر ٹھیرا

میں تو اک موج ہوں چپکے سے گزر جاؤں گا
اس کا کیا ذکر کریں وہ تو سمندر ٹھیرا

اشک آنکھوں میں رہا گوہر نایاب بنا
اور دامن پہ جو ٹپکا تو وہ پتھر ٹھیرا

ایک لمحے کے لئے رک سی گئی نبضِ حیات
کوئی دیوانہ جو اس راہ میں دم بھر ٹھیرا

اب نہ راہوں کی خبر ہے نہ شعورِ منزل
قافلہ لوٹ لیا جس نے وہ رہبر ٹھیرا

●

بوچھار

ڈاکٹر یعقوب عمر

حکیم صاحب

ایک دن ہماری شامت اعمال ہمیں ایک حکیم صاحب کے پاس لے گئی۔ بلڈ پریشر نے عاجز کر دیا تھا ایلوپیتھی کی دوائیں کھا کر جہاں ہمارے معدے کی قوت ہاضمہ درجۂ صفر کو پہونچ گئی تھی وہیں ان دواؤں کے بلوں مے ہماری جیب کا بلڈ پریشر نارمل سے بھی ڈاؤن ہو چکا تھا ایک دوست نے کہا کہ میاں یونانی میں بلڈ پریشر کی تیر بہدف دوائیں پائی جاتی ہیں اور کوڑیوں کے مول ملتی ہیں۔

ہم ڈرتے ڈرتے ایک ایسے یونانی دواخانے پہونچے جس نے "مشورہ مفت" کا نہ صرف بورڈ لگا رکھا تھا بلکہ اخبارات میں بھی متواتر ایسے ہی اشتہارات اس کے چھپتے تھے۔ ہم دل ہی دل میں اس کے جذبۂ خدمت خلق سے متاثر ہو چکے تھے کہ واہ صاحب حکیم ہو تو ایسا ہو کہ جس کے اشتہارات دیکھ کر ہی آدھا مرض غائب ہو جائے۔ پہونچتے ہی ایک دس سال پیشتر ریٹائرڈ طبیب سے مڈبھیڑ ہوئی جو طبیب کم اور معمر زیادہ معلوم ہوتے تھے دو تین مسکین مریضوں کے بعد بندے کا نمبر آیا تو انھوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ سیدھے ہاتھ کی نبض شہادت کی انگلی اور انگوٹھے کے درمیان یوں دبوچ لی جیسے چٹکی لینے کی ناکام کوشش کر رہے ہوں ہم نے کچھ عرض کرنا چاہا تو اپنے دوسرے ہاتھ سے اشارتاً روک دیا اور آنکھیں بند کر کے نبض کی دھڑکنوں میں گم ہو گئے دل میں خیال آیا کہ واہ حکیم ہو تو ایسا! کتنے انہماک سے نبض دیکھی جا رہی ہے ہم ان کی مہارت پر ایمان لانے ہی والے تھے کہ ان کے نیم وا ہونٹوں سے خراٹے کی ہلکی سی آواز نے ہمیں آسمان سے زمین پر لا پھینکا۔ بے ساختہ زبان سے لاحول نکل گیا اور اس کے ساتھ ہی ہم نے ہاتھ جھٹک دیا۔ حرکت سے حکیم کی آنکھ کھل گئی تو انھوں نے پوچھا "پچھلی دوا باقی ہے یا ختم ہو گئی"۔

اب تو ہماری ہنسی چھوٹ گئی عرض کیا۔ "حکیم صاحب آج زندگی میں پہلی بار شرف نیاز حاصل کر رہا ہوں لہذا کسی اگلی پچھلی دوا کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا"۔

فرمایا۔ "میں ذرا اونچا سنتا ہوں زور سے بولئے"۔

اب زبان سے لاحول کے بجائے "اناللہ" نکل گیا! حکیم صاحب سمجھے میں اپنی کیفیت بیان کر رہا ہوں۔ چنانچہ کان میرے ہونٹوں کے قریب لے آئے جیسے ہی "اناللہ" سنی فوراً میری نبض چھوڑ کر کہنے لگے۔

"موت سے کس کو رستگاری ہے ۔ آج تم کل ہماری باری ہے"

بیٹا! میں تمہیں غلطی سے مریض سمجھ بیٹھا۔ شاید تمہارے کسی قریبی رشتہ دار کا علاج چل رہا تھا صبر کرو صبر! شفا تو خدا کے ہاتھ میں ہے، ہم تو صرف دوا تجویز کرتے ہیں، حکم قضا و قدر پر کسی کا بس نہیں چل سکتا اگر کچھ پرانا بل باقی ہے تو ادا کر دو! تاکہ مرحوم کی نجات میں کوئی دشواری پیش نہ آئے"

ہماری کیفیت نہ پوچھیے وہ تو خیریت ہوئی کہ کوئی ٹھوس چیز آس پاس نہ تھی ورنہ ہمارے ہاتھوں بے ساختہ حکیم وقت کی تاجپوشی ہو جاتی۔ یہاں وہاں نظر دوڑائی تو جنوبی گوشے میں ایک خالی مرتبان نظر آیا، ہم اٹھ کر اس کی جانب چلے ہی تھے کہ حکیم وقت نے آواز دی۔" ادھر نہیں، بائیں جانب، دروازے کے اندر کلرک بیٹھا ہے اس کے پاس جاکر حساب صاف کر دیجئے۔ اور اس ایک واقعے سے دل برداشتہ نہ ہوئیے گا۔" یہ کہہ کر انہوں نے پوپلے منہ سے شعر پڑھا:

دارا رہا نہ جم نہ سکندر سا بادشاہ ۔ تخت زمیں پہ سینکڑوں آئے چلے گئے

اب ہمارا پیمانۂ صبر لبریز ہو چکا تھا چنانچہ رسیاں تڑا کر بھاگے وہ دن اور آج کا دن ہم نے کبھی اس دوا خانے کی صورت نہیں دیکھی اور اگر کبھی اخبار میں اشتہار پر نظر پڑ بھی جاتی ہے تو ہم تیزی سے اخبار کا صفحہ الٹ دیتے ہیں۔

جگجیون پرشاد جیون

غزل

مجھے گیسوؤں میں پھنسایا گیا ہے! ۔ مجھے دامِ الفت میں لایا گیا ہے!

نگاہوں سے دنیا کی بچنے بچانے ! ۔ تصور میں مجھ کو بلایا گیا ہے!

عدو کا اشارہ وہ پائے ہیں شاید! ۔ مجھے بزم سے جو اٹھایا گیا ہے!

سنور کر وہ بیٹھے رقیبوں کے آگے! ۔ سلیقہ سے مجھ کو جلایا گیا ہے!

مرے قتل کی سب یہ سازش ہے جیون! ۔ جو محفل میں مجھ کو بلایا گیا ہے!

ہمدردی

ڈاکٹر بیدار وارثی اٹاوی

تیرہ سامانی کا شب کی صبح نے الٹا نقاب
پو پھٹی، چمکی کرن، نکلا فلک پہ آفتاب

خوشنما کرنوں نے آخر نور سا پھیلا دیا
تیرگی رخصت ہوئی رنگِ سحر پیدا ہوا

جلوہ گر ذرات کو دیکھا جو قلبِ خاک میں
چھپ گئے روشن ستارے پردۂ افلاک میں

خاک پر ہونے لگی برسات پیہم نور کی
بن گئی ساری زمین تصویر بزمِ طور کی

صفحۂ ہستی پہ جاری ہو گیا دریائے نور
ربطِ موجِ نور کا طوفان پہنچا ذرّہ ذرّہ پر

گلستاں میں ہے بہارِ صبحِ نو آئی ہوئی
وہ نکل آئی کلی پتّوں سے شرمائی ہوئی

غنچہ و گل ہمنفس کے ہمدردِ گلستاں ہو گئے
یعنی آپس میں شریکِ دردِ پنہاں ہو گئے

یہ ہوا انجام کارِ ارتباطِ باہمی !
پھونک دی صحنِ چمن میں ایک روحِ تازگی۔

پتّہ پتّہ کو شمیمِ خلد سے مہکا دیا
طائرانِ خوشنوا کو باغ میں چہکا دیا

ڈالی ڈالی جھک کے ہم رنگ و بو ہونے لگی
شاہدانِ گلستاں میں گفتگو ہونے لگی

"پردۂ فطرت میں چھپ کر جانچ کر ایمان کو"
"دے رہا ہے درسِ ہمدردی خدا انسان کو"

طائرانِ شاد پر اڑتے ہیں یہ جوڑے ہوئے
ہر خیالِ خام کی جانب سے رخ موڑے ہوئے

ہیں فضا پیما قطاریں یہ بھی اک انداز ہے
رازدارِ راز گویا جنبشِ پرواز ہے

جذبۂ ہمدردیٔ ہم جنس حیوانوں میں ہے
آہ کیوں یہ لعنتِ تفریق انسانوں میں ہے

گر نہ ہوں تیرے قدم اے راہرو تیرے حبیب
تو پہنچ سکتا نہیں واللہ منزل کے قریب

گردشِ پیہم ہے خوں کی جسم میں جاں آفریں
کائناتِ رزمِ ہستی جس کے ہے زیرِ نگیں

اصل میں ربطِ عناصر سے ہے تزئینِ حیات
اختلافِ آئینِ ہمدردی کا ہے رازِ ممات

آمد و شد ہے نفس کی انحصارِ زندگی
دوشِ ہمدردی پہ ہے غافل یہ بارِ زندگی

اے اسیرِ دامِ ہستی اے سراپائے مرض
تو نہ سمجھا حیف ان پُر درد اعضا کی غرض

یہ علالت تیری تجھ کو درس ہے مردِ خدا
تو اگر سمجھے تو سب کچھ کہہ رہی ہے برملا

کرب کی بے چینیوں میں ساتھ دے کر آس کو
جنبشیں دیتی ہے بڑھ بڑھ کر خلشِ احساس کو

رازدارِ فتنۂ نیرنگیٔ دوراں نہیں
جس میں ہمدردی نہیں بیدار وہ انساں نہیں

لکھنو میں شاذ تمکنت کی یاد میں لائبریری

لکھنو۔ ۵ر ستمبر ۱۹۸۵ء یہاں تلسی داس مارگ پر تسنیم فاروقی کی قیام گاہ "خیمہ میں" ادبی شہر" کے زیر اہتمام ایک جلسہ "یادِ شاذ" ہوا جس کی صدارت حاجی محمد رفیع صدیقی سابق ایم ال اے نے فرمائی۔

آغاز انعقاد میں شاذ مرحوم کے سلسلے میں جو ملکی پیمانے پر خاص خاص تعزیتی جلسے ہوئے ان کی تجاویز اور اخباری رپورٹوں پر کیف صدیقی سلطان پوری نے جائزہ پیش کیا۔

ڈاکٹر عصمت ملیح آبادی نے شاذ تمکنت کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے۔ ان کے دواوین اور ادبی شخصیت پر روشنی ڈالی اور آخر میں انھوں نے کہا کہ میں لکھنو کی تمام انجمنوں اور اترپردیش کے ان سارے اداروں کو داد دیتا ہوں جنھوں نے اردو کے اس اہم شاعر کا غم منایا بلکہ لکھنو کے حساس احباب فن کو لائق رشک سمجھتا ہوں کہ انھوں نے شاعر کی شناخت کا بہت بڑا ثبوت اپنے متعدد جلسوں کے ذریعے پیش کیا۔

بزم کے نگران اسلم صدیقی نے کچھ تعزیتی تجاویز پیش کیں۔ جن پر آئندہ غور و خوض کئے جانے کے بارے میں طے ہوا۔

اس کے بعد تسنیم فاروقی نے گلوگیر لہجے میں شاذ تمکنت کے فنی خدمات۔ دکن میں ان کے ندریسی محاسن، ان کی خوش لباسی، وضعداری نیز صباحت و نفاست کا ذکر کچھ یوں کیا۔

حضرات! چونکہ حیدرآباد جانے کا مجھے اکثر اتفاق ہوتا ہے۔ اور یوں بھی شاذ صاحب ملک کے مختلف حصوں کے مشاعروں میں ملتے رہتے تھے۔ ان کی خاص قربت مجھے حاصل تھی۔ میں ان سے علم و عمر میں واقعی بہت چھوٹا ہوں۔ پھر بھی وہ بڑی محبت سے پیش آتے تھے۔ ایک دو بار تو انھوں نے بڑے ہوتے ہوئے میرے اعزاز میں خصوصی نشستیں دکن کے اہالیان علم و دانش کے درمیان منعقد کرائیں میں ان کے کلام کا معترف ہی نہیں مداح بھی ہوں وہ ہندوستان کے اردو شعر و سخن پر کرنیں بکھیرنے والے اس سورج کی طرح تھے جس کی آب و تاب دکن کی حالیہ نصف صدی سے کچھ زیادہ ہی افق علم پر اجاگر ہوئی تھی۔

میں آج کے جلسے میں شریک مصنفین، ناقدین، ادبا و شعراء سے التماس کرتا ہوں کہ وہ شاذ صاحب کے کارناموں پر اپنے قلمی احسانات کا سلسلہ تیز کریں۔ آخر میں تسنیم فاروقی نے اپنے ذاتی لائبریری کو جو کہ فن کار کے نام سے موسوم تھی اسے شاذ لائبریری کر دیئے جانے کا اعلان کیا۔ ان کے اس جذبے کو جلسے کے صدر رفیع صدیقی ایم ال اے نے اپنی صدارتی تقریر میں نہایت تحسین و ستائش کے عمل کے نام سے تعبیر کیا اور شکریہ ادا کیا تمام حاضرین جلسہ کا۔

●●

بشیر وارثی

تصویرِ درد

کیا کروں اخلاص کی تفسیر شاذؔ | لوحِ دل پہ نقش ہے تصویرِ شاذؔ!
روشنی شعر و سخن نے تجھ سے لی | فکر میں تیری وہ تھی تنویر شاذؔ!
عمر مرنے کی ابھی تھی ہی کہاں | دوستوں کو کر گیا دلگیر شاذؔ!
آج معنی کو ترستی ہے غزل | کون دے گا اب نئی تعبیر شاذؔ!
شاہدؔ و مخدومؔ و جامیؔ کی طرح | چھپ گیا ہے چھوڑ کر تحریر شاذؔ!
تھا ستارہ اوج پہ تیرا مگر | لے گئی سوئے عدم تقدیر شاذؔ!
زندگی زندہ دلی سے کی بسر | کر گیا اک راستہ تعمیر شاذؔ!
شاعری میں ہے ترا پایندہ نام | مر نہیں سکتی تری تحریر شاذؔ!
جیتے جی تھا تو جہاں میں محترم | بڑھ گئی اب اور بھی توقیر شاذؔ!

کیوں نہ ہو گریاں بشیرؔ وارثی؟
دیکھ کر دل میں تری تصویر شاذؔ!

فکر انگیز افسانچے

ہندی سے ترجمہ
ڈاکٹر یعقوب عمر

روزگار

ارچنا ارچی
دوسا۔ جے پور راجستھان

سیلاب زدہ علاقوں سے بچ کر آئی ہوئی کچھ عورتوں کو درد بھری آواز میں اس نے بھیک مانگتے ہوئے اسکول کے احاطے میں دیکھا تو اس کی نگاہوں کے سامنے پچیس برس پرانا منظر گھوم گیا جب وہ پندرہ سال کی تھی۔ سیلاب کے تیز و تند دھاروں نے اس کا سب کچھ چھین لیا تھا اسے پیٹ پالنے کے لئے ہاتھ پسار پسار کر بھیک مانگنی پڑی تھی۔ سڑکوں پر۔ پلیٹ فارموں پر۔ بھوکی نگاہیں اس کی بھرپور جوانی کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتی تھیں اور بدلے میں کچھ بھیک مل جاتی تھی۔ اس سے اس کا پیٹ تو بھر جاتا تھا مگر دل نفرت کی ابکائیوں سے متلانے لگتا تھا۔ عاجز آکر وہ ایک دن بستی کی طرف مڑ گئی۔ نصیب اچھے تھے جن لوگوں نے اسے گھر کے کام پہ نوکر رکھ لیا تھا وہ بہت نیک تھے انہوں نے نہ صرف پالا پوسا بلکہ اتنی تعلیم بھی دلوائی کہ وہ آج ایک مڈل اسکول کی ٹیچر بن گئی تھی۔ اپنے رحمدل مالک کو یاد کرکے اس کی آنکھیں نم ہو چلی تھیں اس نے سوچا کیوں نہ میں بھی ان مصیبت زدہ عورتوں کی زندگی سدھاروں نزدیک بلا کر اس نے کہا۔

"سنو یہ تمھارے لئے مناسب نہیں میرے پاس رہو، یہاں کچھ سیکھ کر اور محنت کر کے تمھیں بہت کچھ مل جائے گا۔ میں تمھاری پوری مدد کروں گی۔"

ایک بھکارن نے بڑی شان سے کہا۔

اے بہن جی! تم دیکھ سکو تو ٹھیک ہے ورنہ ہم تو محنت کئے بغیر ہی ہر رات پچاس ساٹھ روپے کما لیتی ہیں۔" اتنا کہہ کر وہ سب مڑ گئیں۔

وہ بیچاری پلک جھپکائے بغیر ان جاتی ہوئی عورتوں کو حیرت سے دیکھنے لگی۔

عیسیٰ اور میں

کشور کابرا
شاہپور۔ احمد آباد

ڈرائینگ روم میں رونق بڑھ جاتا۔ سولی پہ ٹنگا عیسیٰ کا کھلونا، بڑا اسلونا، مگر کھلونا تو بہرحال کھلونا ہوتا ہے اور بچے آخر بچے ہی ہوتے ہیں! بچوں نے عیسیٰ کو سولی پر سے اتار دیا۔ پوچھا تو بولے "بیچارہ صدیوں سے لٹکا ہے بڑی تکلیف ہوتی ہوگی"۔ میں جل اٹھا "تم کل کے چھوکرے کیا جانو کہ بڑوں کی عزت کیسے کی جاتی ہے اور عیسیٰ تکلیف سہیگا یا نہیں سہیگا مگر کوئی یہاں آکر دیکھیگا تو کیا کہیگا۔۔۔؟"

اور میں نے عیسیٰ کو پھر سے سولی پر لٹکا دیا میرا ڈرائنگ روم چمک اٹھا۔

کرشن بنسل، نالاگڑھ
ہماچل پردیش

خواب

ماسٹر جی کا لڑکا ڈاکٹر بن گیا تھا۔ شادی کے لئے کئی رشتے آنے لگے۔ ایک صاحب جب ان کے پاس پیام لے کر آئے تو وہ کہنے لگے۔ کل بھی دلّی سے لڑکی والے آئے ہوئے تھے وہ پچاس ہزار تک خرچ کرنے کے لئے تیار تھے۔ لڑکی بھی گریجویٹ تھی۔ مگر لڑکا تو کم از کم ایم اے پاس لڑکی چاہتا ہے۔"

کچھ دنوں بعد ایم اے پاس لڑکی کے والد آئے تو گول مول باتیں کرنے لگے: "کچھ دن پہلے بھی ایک رشتہ آیا تھا لڑکی والے لاکھ روپے خرچ کرنا چاہتے تھے، مگر لڑکا ڈاکٹر لڑکی چاہتا ہے"۔

ان کے بیٹے کا مول دن بدن بڑھتا چلا جاتا تھا۔ پھر ایک دن ایم بی بی ایس لڑکی کا رشتہ آیا تو یہ کہہ کر ٹال دیا کہ لڑکا ابھی شادی نہیں کرنا چاہتا پہلے اپنا نرسنگ ہوم کھولیگا۔

آج دو لاکھ روپے والی میٹرک پاس لڑکی سے اسکی شادی ہو رہی ہے یہ سن کر چپراسی کے سامنے دو لاکھ روپے گھوم گئے کیونکہ اس کا لڑکا بھی اسی سال ڈاکٹر ہونے والا تھا۔!

انور شمیم۔ بمعرفت
شری عبدالعزیز۔ دھباد (بہار)

پچھتاوا

لڑکی کی آنکھیں کمرے کی دیواروں پر ٹنگی مذہبی تصویروں سے رینگتی ہوئی لڑکے کے ویران اور خاموش چہرے پر آکر ٹھہر گئیں۔ کچھ دیر بعد خاموشی توڑتے ہوئے لڑکی نے سوال کیا۔

"تم مسلمان ہو"؟

"ہاں! ہوں تو؟ لڑکا آہستگی سے مسکرایا اور لڑکی کے چہرے پر ویرانی سی چھا گئی۔

"مجھے اب جانے دو" لڑکی نے کہا اور اٹھکر کپڑوں کی سلوٹیں درست کرنے لگی۔

"تم نے رات بھی کچھ نہیں کھایا، اب تک بھوکی ہو ٹیبل پر تمھارا کھانا رکھا ہے کھالو! پھر چلی جانا۔" لڑکا ایک بار پھر مسکرانے میں ناکام ہو گیا۔ لڑکی نے غصیلی نگاہوں سے لڑکے کی طرف دیکھا اور تلخ لہجہ میں بولی۔ "تمھارے ساتھ اگر عزت تو گئی اب کیا تمھارا چھوا ہوا کھانا کھا کر دھرم بھی تباہ کر لوں؟" وہ ایک جھٹکے کے ساتھ کمرے سے باہر ہو گئی لڑکا اس کی دور جاتی ہوئی پرچھائیں کو دیکھتا ہی رہ گیا دس دس کے تین چار نوٹ بھی وہ فرش پر ہی چھوڑ کر چلی گئی تھی۔

فرق

ڈاکٹر اپیندر دشواس (گرایا)

کورٹ نے طلاق کی ڈگری منظور کردی۔ وہ ہارے ہوئے جواری کی طرح بے سدھ ہو کر مسہری پر گر پڑا تھا۔ چوٹ بہت گہری تھی۔ آنکھیں نم ہو گئی تھیں کتنی چھوٹی سی بات کا بتنگڑ بن گیا تھا۔ نبیے تلے اور رسمی تعلقات سے اسے نفرت سی ہونے لگی تھی ایسے کچے رشتوں پر اسے رنج ہو رہا تھا۔

اچانک اس کی نگاہوں کے سامنے تیس سال پہلے کا منظر گھومنے لگتا ہے۔ جب وہ صرف پندرہ سال کا تھا۔ بابوجی اور اس کی ماں کی زندگی کا ایک منظر کسی فلم کے فلیش بیک کی طرح دکھائی دینے لگا اس دن بابوجی نے اس کی ماں کو کسی غلطی پر بیحد پیٹا تھا۔ اس نے بابوجی کو ایسا کرنے سے روکنے کی بہت کوشش کی مگر وہ نہیں مانے تو انتہائی غصے میں وہ بابوجی کی بندوق اٹھا لایا اور ان کی طرف تانتے ہوئے انھیں پھر مار پیٹ سے روکنے کی کوشش کی۔ اس حرکت پر اس کی ماں غصے سے لال بھبوکا ہو گئی اور اپنی پٹائی کو بھول کر کسی بھوکی شیرنی کی طرح اس پر ٹوٹ پڑی تھی اس کی ماں کا آخری جملہ ابھی تک اس کے کانوں میں گونج رہا تھا۔

—" تو کون ہوتا ہے ہم دونوں کے بیچ میں بولنے والا؟ یہ تو ان کا حق ہے۔ انھیں اختیار ہے میرا شوہر میرے ساتھ کچھ بھی کر سکتا ہے۔ تو کون ہوتا ہے بیچ میں بولنے والا؟ چلا جا یہاں سے!"

شکایت

او دھیش تاراچند بھٹناگر۔ مرادآباد

لوگوں نے اس سے شکایت کی ۔" تمہارا لڑکا سڑکوں پر گھومتا ہے"۔

جواب ملا ۔" کسی سے کیا لیتا ہے؟"

لوگوں نے پھر شکایت کی ۔" تمہارا لڑکا سڑکوں پر... کھلے عام سگریٹ پیتا ہے"۔

اس نے پھر جواب دیا ۔" کیا کسی کا خون پیتا ہے؟"۔

اب کی بار لوگ غصے میں تھے انھوں نے پھر کہا ۔" تمہارا لڑکا سڑکوں پر لڑکیوں کو چھیڑتا ہے" ۔۔۔ اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔

اس نے سنجیدہ لہجے میں کہا ۔" پولیس میں رپورٹ کر دو ۔"

لوگوں نے تھانے میں شکایت کی... لڑکا پکڑا گیا... اس دن لوگ حیران تھے ۔ جب انہوں نے دیکھا کہ ایک باپ اپنے بیٹے کے خلاف گواہی دے رہا تھا!!!

کسوٹی

کسوٹی میں اس ماہ برصغیر ہندوپاک کے مشہور شاعر جناب احمد ندیم قاسمی کی غزل تنقید و تبصرے کیلئے پیش کی جارہی ہے ؎

صلائے عام ہے یاران نکتہ دان کیلئے

کسوٹی کا مقصد تعمیری تنقید کی حوصلہ افزائی ہے تاکہ اس سے نہ صرف نئی نسل کے ادبا و شعراء استفادہ کرسکیں بلکہ تعمیری انداز فکر کی نشوونما بھی ہو (ادارہ)

غزل

احمد ندیم قاسمی

چھٹی شراب، مگر تہمت شراب رہی
عذاب ٹل نہ سکا، لذت عذاب رہی

کچھ آج ہی نہیں تقدیر میری مست خرام
یہ ساری عمر یونہی خانماں خراب رہی

ترا قصور نہیں، یہ تو عین فطرت ہے
مجھے بھی شام و سحر خواہش نقاب رہی

کہیں یہ تیرا تبسم نہ ہو تجلی ریز
چمک یہ کس کی سر پردۂ سراب رہی

کسی کی اٹھتی جوانی تو ہو گئی آباد
ندیم اپنی جوانی اگر خراب رہی

بچوں کا صفحہ

فاروق عارفی متعلم بی کام
انوار العلوم کالج

حضرت فصاحت جنگ جلیل رح

حضرت فصاحت جنگ جلیل بہت مشہور شاعر گزرے ہیں جو ۱۸۶۲ء میں شمالی ہند کے قصبہ مانک پور میں پیدا ہوئے آپ کا اسم گرامی جلیل حسن تھا۔ جلیل تخلص فرماتے تھے۔ آپ حافظ قرآن بھی تھے۔ آپ کو ابتدا سے علوم دینی اور شاعری سے خاص دلچسپی تھی۔ اس وقت حضرت امیر مینائی کے تقدس۔ علم وفضل اور بالخصوص ان کی شاعری کی ہندوستان بھر میں شہرت تھی۔ حضرت جلیل کو حضرت امیر مینائی سے خاص عقیدت و محبت تھی۔ اس لئے آپ حضرت امیر کے تلامذہ میں شامل ہوگئے۔ اور اپنا کلام خط و کتابت کے ذریعہ حضرت کی خدمت میں پیش فرمانے لگے۔ ابتدا میں حضرت امیر حضرت جلیل کے کلام پر عام شاگردوں کی طرح اصلاح دے کر واپس کر دیتے تھے۔ رفتہ رفتہ حضرت جلیل نے حضرت امیر کے دل میں گھر کر ہی لیا۔ بالآخر حضرت جلیل کو حضرت امیر نے اپنے یہاں بُلا لیا۔ کچھ عرصہ بعد دفتر امیر اللغات کے سکریٹری بھی بنا دیئے گئے۔ حضرت جلیل نے امیر اللغات کی ترتیب و تدوین کے ساتھ ساتھ شعر و شاعری کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ امیر کی "نگاہ فیض" سے حضرت جلیل کا ذوق سخن ترقی کی منزل طے کرتا گیا۔

حضرت جلیل کے تقوے کا یہ عالم تھا کہ آپ ہمیشہ باوضو رہا کرتے تھے۔ آپ سے تہجد کی نماز دم آخر تک قضا نہ ہوئی۔ حضرت جلیل جیسے شاگرد رشید کی سعادت مندی نے حضرت امیر کو ایسا متاثر کیا کہ انہیں حضرت جلیل کی جدائی ایک پل بھی گوارا نہیں تھی۔ ایک مرتبہ حضرت جلیل نے کچھ دن کے لئے اپنے وطن رام پور جانے کے لئے اجازت مانگی تو آپ نے بادل نخواستہ اجازت دیدی۔

حضرت امیر کی محبت و شفقت کا پتہ آپ کے ایک خط سے ظاہر ہوتا ہے۔ جو انہوں نے اپنے ایک شاگرد میر عابد علی کوثر کو لکھا تھا۔

"آدمی ایسے ہیں کہ جہاں ہوں وہاں اسلامی برکات پھیلیں ان کی علحدگی کو اپنی بدقسمتی جانتا ہوں"۔

حضرت جلیل کی مشق سخن اتنی بڑھ گئی تھی کہ آخر زمانے میں حضرت امیر نے اپنے تمام شاگردوں کے کلام کی اصلاح کا کام حضرت جلیل ہی کے سپرد کر دیا۔ البتہ اصلاح کے بعد ایک نظر آپ بھی دیکھ لیا کرتے تھے اور بہت خوش ہوتے تھے۔ رام پور میں حضرت جلیل کو استاد محترم حضرت امیر مینائی کے علاوہ منظفر علی اسیر۔ شیخ امداد علی بحر۔ داغ۔ جلال۔ تسنیم۔ منیر۔ قلق۔ عروج۔ شرف جیسے ممتاز شعراء کی صحبت حاصل رہی۔

شعر و شاعری کا جہاں تک تعلق ہے سب سے زیادہ حضرت جلیل کو اپنے استاد کی خدمت کا موقع ملا۔ اور دل لگا کر مستفید ہوئے۔ لغت کی تالیف 'عروض کی تعلیم۔ شعر و شاعری۔ تلامذہ کی غزلیں سنا سنا کر اصلاح لینا۔ خطوط جو استاد لکھوائیں لکھنا۔ یہی رات دن کا مشغلہ تھا۔ روز بروز استاد کے قریب ہونے لگے۔ یہاں تک کہ جلیل اپنے شاگردوں سے فرمایا کرتے تھے کہ حضرت امیر مینائی میرے استاد محترم ہی نہیں بلکہ میں ان کو اپنا شفیق باپ تصور کرتا تھا۔

مشق سخن میں ترقی ہوتی گئی۔ رامپور کی ادبی محفلوں

میں شریک ہو کر خوب خراجِ تحسین حاصل کرتے تھے۔ حضرت جلیل کو اپنے استادِ محترم سے اس قدر عقیدت تھی جس کی مثال آج ملنا دشوار ہے۔ حضرت امیر مینائی جب رام پور سے حیدرآباد آئے تو حضرت جلیل کو بھی ساتھ لائے۔

حضرت جلیل بلند کردار کے حامل تھے۔ آپ کی خصوصیت یہ تھی کہ آپ ہر ایک سے کھڑے ہو کر سلام لیا کرتے تھے۔ جب حضرت جلیل سے ملنے کے لئے کوئی آتا تو حتی الامکان فوراً یہ آمد ہوتے اور ان کے لئے پان منگواتے اور خاطر تواضع کرتے۔ حضرت جلیل حضرت امیر کے ساتھ بھوپال سے ہوتے ہوئے ۱۸ جمادی الثانی ۱۳۱۸ھ حیدرآباد تشریف لائے اور جناب امیر کے انتقال کے بعد آپ یہیں مقیم ہوئے۔ شاگردوں کو معلوم تھا کہ حضرت امیر نے اپنی زندگی میں ہی حضرت جلیل کو اپنا جانشین مقرر فرما دیا تھا اس لحاظ سے آپ ہی جانشین منتخب ہوئے۔ جانشینی کے بلند و برتر مقام کے بعد حضرت جلیل کا ستارہ اوراوج پر آ گیا۔ ۱۳۲۲ھ میں اعلیٰحضرت نواب میر عثمان علی خاں کے جشن جوبلی کے سلسلہ میں ایک عظیم الشان مشاعرہ ترتیب دیا گیا تھا جس میں حضرت جلیل کے علاوہ ہندوستان کے مشہور شعراء مدعو تھے۔ جلیل نے اعلیٰ حضرت کی شان میں ایک قصیدہ سنایا اور خوب دادِ تحسین حاصل کی اس قصیدے کا مطلع دیکھئے کتنا خوب ہے۔ ؎

جشنِ شاہی میں عجب رنگ اچھلتے دیکھا
ساغرِ عیش کو بے پاؤں کے چلتے دیکھا جلیل

اس تہنیت پر بارگاہ حضورِ نظام سے آپ کو لقب جلیل القدر سے سرفراز فرمایا گیا اور ارشادِ شاہانہ ہوا۔ ؏

جلیل القدر ہو صاحب تمہاری بات کیا کہنا

اس ارشادِ شاہانہ پر حضرت جلیل نے ان الفاظ میں اپنی عقیدت و محبت کا اظہار فرمایا۔ ؎

جلیل آ ؤ ذرا کو دیکھو جلیل القدر کو دیکھو
لقب جو شاہ سے ملتا ہے زیبا ہو ہی جاتا ہے

۱۳۲۷ھ میں حضرت جلیل کو اعلیٰ حضرت کی استادی کا شرف حاصل ہوا۔
۱۳۳۵ھ میں اعلیٰ حضرت نے حضرت جلیل کو فصاحت جنگ کے خطاب سے سرفراز فرمایا اور ۱۳۵۲ھ میں لقب امام الفن سے اور اعزاز بڑھایا گیا۔

حضرت جلیل اعلیٰ حضرت کی بہت تعظیم کرتے تھے۔ میرے دادا حضرت قاضی میر لطف علی عارف ابو العلائی جو حضرت جلیل کے شاگرد رشید تھے۔ حضرت جلیل کے تعلق سے لکھتے ہیں کہ میں جب کبھی حضرت جلیل مرحوم کے پاس اعلیٰحضرت کا ذکر کرتا تو حضرت جلیل تعظیماً اٹھ کھڑے ہوتے اور پھر اس کے بعد بیٹھ کر ارشاد فرماتے کہ اعلیٰحضرت کی مثال ہندوستان بھر میں نہیں ہے۔ یہی ایک ایسا مدبر بادشاہ ہے جو جملہ علوم و فنون میں یکتائے روزگار ہے۔ یہ تو سرکار کی ذرہ نوازی ہے جو اپنا کلام بغرضِ اصلاح میرے پاس روانہ فرماتے ہیں۔

حضرت جلیل کو ۱۳۶۲ھ میں سلطان العلوم کی بارگاہ میں سلطان الشعراء کا لقب پیش کرنے کی عزت حاصل ہوئی اس مسرت میں اعلیٰحضرت کی طرف سے عصرانہ ترتیب دیا گیا۔ اور مشاعرہ بھی منعقد کیا گیا جس میں میرے دادا حضرت قاضی لطف علی عارف ابو العلائی کو بھی کلام سنانے کا شرف حاصل ہوا۔ یہ مشاعرہ خاص بصدارت شہزادہ ذی شان نواب معظم جاہ بہادر شجیع بمقام ٹاؤن ہال منعقد ہوا جس میں حضرت جلیل بھی شریک تھے۔

۱۳٦۲ھ میں بمسرت جشنِ فتح حضرت قاضی میر لطف علی عارف ابو العلائی نے حضرت جلیل کی اجازت سے ایک مشاعرہ منعقد کیا تھا۔ حضرت جلیل نے اپنی صحت کی ناسازی کی بنا پر اپنے فرزند مولوی صدیق احمد اثر کو صدارت کی اجازت دی اور اس مشاعرہ میں خاص خاص شعراء کو مدعو کیا گیا جس میں ممتاز شعراء نے بھی حصہ لیا۔ اس

مشاعرہ کے لئے حضرت جلیل نے چار قطعات اور ایک غزل روانہ فرمائی تھی۔ ایک قطعہ پیش کر رہا ہوں ؎

چلے دکن میں ہوائے بہار کے جھونکے
یہ کیسے جھومتے آئے بہار کے جھونکے
جلیل سازِ ظفر سے ندا یہ آتی ہے
پیام فتح کا لائے بہار کے جھونکے

اس کے علاوہ غزل کے بھی کچھ شعر ہیں ؎

خوشی کی روشنی میں بھی سوادِ غم نمایاں ہے
مری صبحِ وطن پروردۂ شامِ غریباں ہے
ستم سب توڑ لیکن محتسب ٹوٹے نہ دل میرا
اسی شیشے میں سارے میکدے کا راز پنہاں ہے
جلیل الطافِ شاہانہ کی ہے تفسیر یہ مصرع
مقدر پر مجھے نازش مقدر مجھ پہ نازاں ہے

اس غزل کے ہر شعر پر صدائے آفریں و تحسین بلند ہو رہی تھی۔ وجدانی کیفیت میں مشاعرہ برخاست ہوا بالآخر شعر و سخن کے تاجدار نے یکم صفر المظفر ۱۳۶۵ھ کو شب کے دس بجے انتقال فرمایا۔ ۲ صفر کو تدفین عمل میں آئی۔ اعلیٰ حضرت نواب عثمان علی خاں نے بھی شرکت فرمائی اور میت کو دیکھ کر ارشادِ شاہانہ ہوا۔

"زاہد و عابد کے چہرے ایسے ہی ہوا کرتے ہیں منہ خود بخود جانب قبلہ ہے"

میں جلیل کے اس شعر پر ان کو خراجِ عقیدت پیش کرتا ہوں ؎

بعد فنا ہے نام بلند اپنا اے جلیل
زیرِ زمیں بھی جا کے رہے آسمان پر

ہائے شبیرؑ نہ پائیں لبِ دریا پانی

ہائے شبیرؑ نہ پائیں لبِ دریا پانی
بات ایسی ہے کہ ہوتا ہے کلیجا پانی
آؤ فیضِ خلفِ ساقیٔ کوثر دیکھو
یہ جگہ وہ ہے جہاں بھرتے ہیں دریا پانی
نامِ شبیرؑ سے ملتی ہے وہ لذت دل کو
جیسے پیاسے کو مزہ دیتا ہے ٹھنڈا پانی
پیاس میں صبر تھا مقصودِ شہِ دیں ورنہ
قدمِ پاک کے نیچے سے اُبلتا پانی
ایسے تر دست تھے شمشیر زنی میں عباسؑ
جس پہ اک ہاتھ پڑا اس نے نہ مانگا پانی
بُھوکے پیاسوں کے جو قاتل تھے نہ سوچے اتنا
ذبح کرتے ہیں تو دے دیتے ہیں دانا پانی
ذکرِ شبیرؑ سے ہوتا ہے یہ حال آنکھوں کا
جس طرح پھوٹ کے دینے لگے چھالا پانی
ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں کے میں قربان جلیل
ان پیالوں میں ہے کوثر کا چھلکتا پانی

حضرت جلیل مانکپوریؒ

بزم خیال

اس عنوان کے تحت قارئین کے دو علمی یا ادبی سوالوں کے جواب دیے جاتے ہیں :-

---

س :- کیا کیلا ایک ہندوستانی پھل ہے ؟

ج :- کیلا سو فیصدی ہندوستانی پھل ہے چنانچہ اسکا ذکر ہندوستان کی قدیم علمی کتابوں میں ملتا ہے اس کے علاوہ اسکے درخت اور پتے صدیوں سے مذہبی تقریبات میں استعمال ہوتے آئے ہیں۔ کیلے میں دوائی اور غذائی دونوں خصوصیات موجود ہیں۔ کیلے کے استعمال سے جسم لاغر میں فربہی آتی ہے۔ اسمیں غذائیت کثرت سے موجود ہے کچے کیلے کی ترکاری عام طور پر جنوبی ہند میں زیادہ کھائی جاتی ہے۔ کیلا معدے اور آنتوں کے زخم مندمل کر دیتا ہے پیچش میں اسکے استعمال سے آنتوں کی سوزش میں کمی واقع ہوتی ہے۔ کچے کیلے کی ترکاری السر میں بیحد نافع ثابت ہوتی ہے۔ صبح کے وقت دودھ کے ساتھ پختہ کیلوں کے استعمال سے خون کے دباؤ میں بھی فائدہ ہوتا ہے۔

کیلے کے پھول کی ترکاری معدہ اور آنتوں پر مسکن تاثیر کرتی ہے۔ اسکے تنے اور جڑ کے پانی میں بھی کافی طبی فوائد موجود ہیں۔ یونانی اطبا اور وید اس خیال کے حامل ہیں کہ کیلے کے تنے کا رس خون بند کر دیتا ہے۔ تنے کے پانی سے پیشاب کھل کر آتا ہے اور سوزش ختم ہوجاتی ہے۔ گرمی سے جو آشوب چشم واقع ہوتا ہے۔ وہ کیلے کے پتے آنکھوں پر باندھنے سے ختم ہوجاتا ہے۔ نرم کیلوں سے قبض کی شکایت دور ہوجاتی ہے طبیعت کے لحاظ سے کیلا تر اور گرم ہے۔ جنوبی ہندوستان میں عموماً اور حیدرآباد میں خصوصاً اسے "موز" کہتے ہیں۔

س :- گلاب کی خصوصیات کیا ہیں ؟

ج :- گلاب کا پھول ہندوستانی تہذیب کی رنگارنگی کا نمائندہ ہے۔ سہرے میں یہ براجمان - مزاروں کی شان اس سے دوبالا۔ مذہبی تقریبات میں اسکی خصوصی اہمیت، حسینوں کے گیسوؤں اور کاکلوں کا ہم نشیں یہ پھول واقعی پھولوں کی محفل کا صدر نشیں ہے۔ تمام گلابوں میں سرخ گلاب کو بیحد اہمیت حاصل ہے۔ یہ ساری دنیا میں کاشت کیا جاتا ہے۔ اس کی جملہ اقسام میں ایک قسم سدا بہار گلاب کی بھی ہے جسمیں پتیاں بہت کم ہوتی ہیں جارجیا (روس) میں ایک خاص قسم کی کاشت کی جاتی ہے جو غالباً اور کہیں نہیں ہوتی اور یہ گلاب سیاہ رنگ کے ہوتے ہیں۔

طب میں اس سے بننے والی مشہور دوا گل قند کہلاتی ہے جو دل کے جملہ امراض میں نافع ہے۔ گلاب کا پھول فرحت پیدا کرتا ہے اعضائے رئیسہ کو تقویت دیتا ہے اور گل قند کی صورت میں قبض کشا بھی ہے۔

ایک من پھولوں سے دو تولے خالص عطر نکلتا ہے جسمیں روغن صندل ملا کر استعمال کیا جاتا ہے اسکا مزاج سرد خشک ہے تازہ گلاب کی خوشبو مقوی دماغ ہے لیکن کمزور اشخاص اسے سونگھ کر نزلے میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔ اسکا زیرہ گرم خشک تاثیر رکھتا ہے اور دستوں کو روک دیتا ہے۔ ہندوستان میں سب سے بہترین گلاب علی گڑھ کا ہوتا ہے۔

مکتوبات

جناب تاج پیامی صاحب کا خط

آگرہ، ۲ ستمبر ۱۹۸۵ء

محبی، تسلیمات

ذوق نظر کے کئی شمارے ملے۔ شکریہ۔ کسوٹی کے تحت جوشاد تمکنت کی غزل کا جائزہ لیا گیا تھا وہ پسند آیا۔ افسانہ "قاز کے کباب" بہت پسند آیا۔ ترجمہ اتنا عمدہ تھا کہ اس پر طبع زاد ہونے کا گمان گزرتا تھا۔

مئی ۱۹۸۵ء کے ذوق نظر میں "بزم خیال" کے تحت رزمیہ شاعری پر ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں۔ "رزمیہ شاعری عربی سے فارسی میں اور فارسی سے اردو میں آئی۔" جواب دینے والے نے یہ نہیں لکھا کہ رزمیہ شاعری عربی میں کب لکھی گئی اور کس نے لکھی۔ عربی شاعری میں پہلا رزمیہ شاعر کون ہے اور اسکے بعد کس کس نے رزمیہ شاعری کی اور انکی رزمیہ کے نام کیا ہیں!!!

نیازکیش۔ تاج پیامی

جناب مظہر محی الدین صاحب کا خط

بیدر — ۲۸ اگست ۱۹۸۵ء

محترمی و مکرمی۔ سلام مسنون!

ذوق نظر کے دو شمارے فردوس نظر ہوئے۔ ذوق نظر میں دینیات کا حصہ وقت کے ایک اہم تقاضے کو پورا کرتا ہے وقار خلیل صاحب کا مضمون "اردو میں نعتیہ شاعری" خاصے کی چیز ہے۔ "بزم خیال" معلومات آفریں ہے۔ شعری حصے کی تزئین و ترتیب توجہ طلب ہے۔

شمارہ نمبر ۸ میں شعری حصے کی تزئین و ترتیب بہ نسبت شمارہ ۵ و ۱ کے خاصی اچھی ہے پرچے کا مزاج اس بات کا اشارہ کرتا ہے کہ آپ کی ادارت میں "ذوق نظر" اردو دنیا میں بہت جلد اپنا ایک منفرد مقام بنا لیگا۔

خلوص کیش۔ مظہر

جناب مشرف عالم ذوقی صاحب کا خط

آگرہ۔ اگست ۱۹۸۵ء

مکرمی۔ عقیدت نامہ۔ ذوق نظر کا تازہ شمارہ دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ شروع میں میں اس رسالے کی جانب سے مطمئن نہیں تھا کہ آپ اتنا اچھا ادبی مواد دے پائینگے۔ تازہ شمارے نے اس بات کا امکان پیدا کر دیا ہے کہ مستقبل قریب میں آپ بہتر سے بہتر کی جستجو میں اسے اور زیادہ معیاری بنا کر پیش کر سکیں گے "کسوٹی" اور اسطرح کے دیگر عنوانات کی روشنی میں یہ بات سامنے آتی ہے کہ آپ صالح اور تعمیری ادب و تنقید کی روشنی میں صرف کام ہی نہیں کرنا چاہتے ہیں بلکہ قارئین کا ایک ایسا حلقہ بھی پیدا کرنا چاہتے ہیں جو ادب کی صحیح سمت و رفتار کا تعین کر سکیں اور معیاری تخلیقات کو سمجھنے نیز تعمیری قسم کے کاموں کیلئے ذہن بھی ہموار کر سکیں۔ تاج صاحب کا مضمون دعوت فکر دیتا ہے۔ فقط

مشرف عالم ذوقی

آہ نذیر احمد خاں ایڈوکیٹ

میری نذیر احمد خاں صاحب سے پہلی ملاقات ۱۹۵۶ء میں ہوئی جبکہ وہ چھتہ بازار میں اپنا دفتر وکالت قائم کر چکے تھے۔ ۱۹۵۸ء سے ۱۹۶۶ء تک گاہے گاہے ان سے ملاقاتیں ہوتی رہیں ۱۹۶۶ء میں جب میں نے اپنا دفتر قائم کیا تو روزانہ ملاقات کی صورت نکل آئی۔ ان ملاقاتوں سے ہمیں ایکدوسرے کو سمجھنے کا اچھا موقعہ ملا۔ نذیر احمد خاں صاحب بے شمار خوبیوں کے حامل تھے وہ سماجی ادبی اور مذہبی امور پر گہری نظر رکھتے تھے اکثر مباحثوں میں میں نے ان سے نہایت عالمانہ باتیں سنی ہیں۔ وہ اپنے موکلوں سے نہایت خندہ پیشانی سے معاملہ کرتے تھے تیس سالہ پریکٹس میں انھوں نے اپنے ہر موکل کو گرویدہ بنا لیا تھا۔ وہ نہایت اعلیٰ ظرف انسان تھے صبح وشام روزانہ ملاقاتوں میں وہ ہمیشہ سلام میں سبقت کرتے تھے یہ انکی نیازمندی کی قوی دلیل ہے چنانچہ وفات کے دن بھی وہ حسب قاعدہ میرے آفس کے سامنے ٹھہرے اور علیک سلیک کے بعد آگے بڑھے اور ایسے گئے کہ دل انکی یاد میں گریاں و بریاں ہے اللہ مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے وہ درحقیقت بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْت

قطعہ تاریخ رحلت جناب نذیر احمد خاں صاحب ایڈوکیٹ

قطعہ

پاکیزگی نفس کی خو تھی سرشت میں
نیکی کا بیج بویا ہے دنیا کی کشت میں
سنتا ہوں گوش دل سے میں ہاتف کی یہ صدا
اے اہلِ دین کہ نذیر احمد بہشت میں

۱۹۸۵ء

نتیجۂ فکر: محمد بشیر الدین۔ بشیر وارثی

ماهنامه

ذوق نظر

حیدرآباد

۴۸۶
۴۹۲

ذوقِ نظر

حیدرآباد — فون نمبر (525117)

جلد (۱) — نومبر ۱۹۸۵ء — شمارہ (۱۱)

زرِ تعاون: سالانہ پچاس روپیے فی شمارہ پانچ روپیے
عرب ممالک سے فی شمارہ ۵ ریال

محمد بشیر الدین ایڈیٹر، پرنٹر اینڈ پبلشر نے اعجاز پرنٹنگ پریس میں چھپوا کر دفتر ذوقِ نظر ۶۱۳-۸-۲۲ چھتہ بازار حیدرآباد سے شائع کیا

اس شمارے میں

حرفِ آغاز

شمالی امریکہ کے ملک میکسیکو میں جو ہولناک زلزلہ آیا اُس نے بیسویں صدی میں پائی جانے والی انسانیت اور اخلاق کے چہرے سے کئی پردے اٹھا دئیے ہیں زیادہ تر ایسی عمارتیں زمین دوز ہوگئیں جو پچھلے چالیس برسوں میں تعمیر کی گئی تھیں اور زیادہ تر سرکاری ٹھیکیداروں نے تعمیر کی تھیں۔ اس مشاہدے سے واضح ہوگیا کہ زیادہ سے زیادہ منافع کمانے کیلئے نہ صرف تمام اخلاقی حدود توڑ دی گئی ہونگی بلکہ اقل ترین معیارِ تعمیر کا خیال بھی نہ رکھا گیا ہوگا۔ میکسیکو برصغیر کی طرح کوئی مفلس ملک نہیں بلکہ تیل کی دولت سے مالا مال ملک ہے اور جسکی بدولت وہاں مُن برستا ہے۔ وہاں کی فی کس آمدنی اتنی زیادہ ہے کہ ہندوستانی خواب میں بھی اسکا تصور نہیں کرسکتے کسی مجبوری یا جائز احتیاج کی عدم تکمیل کا دور دور تک امکان نہیں یہاں یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ۔

الفقر سواد الوجہ فی الدارین (مفلسی دو جہاں میں رسوا کرتی ہے)

پھر معیار میں انحطاط، اخلاق میں گراوٹ اور کوتاہی ظرف کہاں سے آئی کہ مصیبت زدہ لوگوں کی امداد کے لئے جو چند گروپ بنائے گئے تھے ان میں سے کچھ نے مصیبت زدہ لوگوں کی امداد کرنے کے بجائے انھیں لوٹنا شروع کردیا۔ لاشوں پر سے گزرتے ہوئے ٹوٹے پھوٹے مکانوں میں جو کچھ ملا اُس پر بھی امدادی دستوں نے ہاتھ صاف کرنا شروع کردیا۔

جب مفلسی اور بے مائگی اُس انتہائی گراوٹ کی یقیناً ذمے دار نہیں ہے تو پھر نتیجہ نکالنا آسان ہوجاتا ہے کہ ترقی یافتہ ممالک میں جہاں دولت کی ریل پیل ہے اخلاقیات اور روحانیت کے فقدان نے انسانیت کو اتنا ذلیل و رسوا کردیا ہے کہ وہ بہائم کے درجے سے بھی نیچے چلی گئی ہے۔ لوگوں کے دلوں سے خوفِ خدا نکل گیا ہے اور اسی کی وجہ سے ایک ایسا خلا انسانی زندگی میں پیدا ہوگیا ہے کہ ہر چیز حاصل ہونے کے باوجود وہ سکون قلب کیلئے تڑپتی ہے۔ ان حالات میں ہمیں مشرقی بزرگوں کی وہ اخلاقی تعلیم یاد آتی ہے جو مفلسی میں بھی انسان کو صابر و شاکر بنائے رکھتی ہے اور انہیں اخلاقی گراوٹ نہیں آنے دیتی اور وہ کامل انسان جو اسکا عملی نمونہ پیش کرتے ہیں انھیں زیب دیتا ہے کہ وہ

"الفقر فخری" (مجھے اپنی فقیری پہ ناز ہے)

کا نعرہ بلند کریں۔ ایسی ہستیوں نے انسانوں اور انسانیت کی جو خدمت کی ہے وہ آج بھی مشرقی ممالک کی عرفانی تاریخوں کے صفحات پر ملاحظہ کی جاسکتی ہے ؎

بنانے والے آئینہ بنا دیتے ہیں پتھر کو

تاریخ گواہ ہے کہ وہ تہذیبیں جو بامِ عروج پر پہونچ گئی تھیں صرف اخلاقی انحطاط کی بنا پر زوال پذیر ہوگئیں اور جس روحانی تعلیم اور اخلاقی بلندی نے ہماری ملت کا شیرازہ منتشر نہ ہونے دیا اسکی طرف علامہ اقبال نے بجا طور پر اشارہ کرتے ہوئے خراجِ عقیدت پیش کیا ہے کہ ؎

یونان و مصر و روما سب مٹ گئے جہاں سے

اب تک مگر ہے باقی نام و نشاں ہمارا

دُعائیہ

عروجِ تیرہ شبی کو زوال دے یا رب ۔ مرے نصیب کا سورج اچھال دے یا رب
مرا سفینہ بھنور سے نکال دے یا رب ۔ میں ڈگمگانے لگا ہوں سنبھال دے یا رب
میں خالی جیب ہوں مالک تو مؤمنوں سے نواز ۔ میں بے کمال ہوں مجھکو کمال دے یا رب
مجھے بھی کر دے عطا عشقِ مصطفےٰؐ کی ضیا ۔ مرے بھی شیشۂ دل کو اُجال دے یا رب
ترے علاوہ کسی اور کی طرف نہ بڑھے ۔ کرم سے اپنے وہ دستِ سوال دے یا رب
بہ شکلِ حسرت و ارماں جو چبھتے رہتے ہیں ۔ وہ خار تو مرے دل سے نکال دے یا رب

حیات سے رہے رشتہ تری رضا کے لئے
حیات کے لیئے رزق حلال دے یا رب

حیات وارثی

نعتِ مُبارک

سید حیات وارثی

درِ رسولؐ پر جھکا جو سر وہ سر بلند ہے ۔ زمیں کی پستیوں کے پاس عرش کی کمند ہے
جو بارگاہِ مصطفےٰؐ سے فیضیاب ہو گیا ۔ یہاں بھی سر بلند ہے وہاں بھی سر بلند ہے
نجات کی طلب ہے تو مدینۃ النبیؐ چلو ۔ یہ ایک راہ چھوڑ کر ہر ایک راہ بند ہے
ازل جمالِ مصطفےٰؐ ابد کمالِ مصطفےٰؐ ۔ خدا کو میرے مصطفےٰؐ کی ہر ادا پسند ہے
تمام عظمتیں نثار ہیں اس ایک ذات پر ۔ تمام کائنات کے لئے جو فکر مند ہے

طلسم تیرگی کا اے حیات توڑ دینگے ہم
بہ فیضِ نورِ حق ہمارا حوصلہ بلند ہے

حیات وارثی

حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ

رجب سنہ ۶۰ھ میں یزید نے حکومت سنبھالتے ہی یہ ارادہ کر لیا تھا کہ وہ بہر صورت امام حسینؓ سے بیعت لیکر رہیگا چنانچہ اس نے حاکم مدینہ ولید بن عتبہ کو لکھ بھیجا کہ جیسے بھی ہو امام حسینؓ سے بیعت لے لو۔ ولید نے آپ کو بلایا مگر آپ نے بیعت کا سوال حکمت عملی سے ٹال دیا کیونکہ آپ یزید کی بیعت کو دل سے سخت ناپسند کرتے تھے۔ اسکا اقتدار پر قابض ہونا انتہائی غیر شرعی اور قیصر وکسریٰ کے طرز کی موروثی حکومت کا آغاز تھا دوسرے اہل عراق کے خطوط برابر چلے آرہے تھے کہ آپ ظالم حکومت کے مقابلے میں خلافت قبول کیجیے۔ اسی کشمکش میں آپ نے مدینہ چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔

محمد بن حنفیہ کا مشورہ

محمد بن حنفیہ نے مشورہ دیا کہ مجھے اندیشہ ہے کہ اگر آپ اس پر آشوب زمانے میں کسی مخصوص شہر یا کسی مخصوص گروہ کے پاس جائینگے تو انمیں اختلاف پیدا ہو جائے گا یہ آپس میں لڑینگے اور آپ انکے نیزوں کا پہلا نشانہ بنینگے۔ امام حسینؓ نے پوچھا۔ پھر میں کہاں جاؤں۔ انھوں نے مشورہ دیا۔ مکہ۔ اگر وہاں بھی اطمینان حاصل نہ ہو تو مسلسل سفر کرتے رہئیے۔

سفر مکہ

چنانچہ شعبان سنہ ۶۰ھ میں آپ معہ اہل وعیال مکہ روانہ ہو گئے۔ مکے میں آپ شعب ابی طالب میں مقیم ہوئے لوگ جوق در جوق آپ سے ملنے کیلئے آنے لگے۔ کوفیوں کے بے شمار خط آپ کو ملے یہاں تک کہ عمائدین کوفہ نے آکر آپ سے درخواست کی کہ آپ فوراً کوفہ چلیں وہاں مسند خلافت آپ کیلئے خالی ہے اور ہماری گردنیں آپ کے لئے حاضر ہیں۔

مسلم بن عقیل کی کوفے کو روانگی

امام حسینؓ نے تحقیق حال کیلئے مسلم بن عقیل کو روانہ کیا کہ وہ کوفے جاکر حالات کی صحیح اطلاع دیں۔ مسلم دو آدمیوں کے ساتھ روانہ ہوئے دونوں ہمراہی راہ کی شدتوں اور پانی کی قلت کی وجہ سے ہلاک ہو گئے۔ مسلم کا کوفے میں شاندار خیر مقدم ہوا۔ اسکے ساتھ ہی یزید نے بھی اپنی ریشہ دوانیاں شروع کریں۔

ابن زیاد کا استبداد

یزید نے ابن زیادہ کو حاکم کوفہ بھی مقرر کر دیا اور اسکے ساتھ حکم دیا کہ وہ بصرے سے کوفہ جاکر مسلم بن عقیل کو شہر بدر کر دے اگر وہ مزاحمت کریں تو قتل کر دے۔ کوفے والے امام حسینؓ کے لئے چشم براہ تھے اور ہر نووارد کو دیکھ کر مرحبا یا ابن رسول اللہ کا نعرہ لگاتے تھے ابن زیاد کو ہر گلی کوچے میں یہی نعرہ سنائی دیا جس سے وہ زیادہ برافروختہ ہو گیا۔ اور مسجد میں جاکر ایسی تقریر کی کہ اہل کوفہ خوفزدہ ہو گئے۔ مسلم نے کوفے کی ہوا بدلی

ہوتی دیکھی تو ایک محب اہل بیت ھانی کے گھر میں پناہ لی ۔ ابن زیاد مسلسل انکی تلاش میں تھا چنانچہ اس نے ایک جاسوس مقرر کیا جس نے ہانی کے گھر میں روپوش مسلم بن عقیل کا پتہ لگا کر ابن زیاد کو اطلاع دی ابن زیاد نے ہانی کو اپنے شکنجے میں کس لیا جس سے ہانی کے قتل کی افواہ پھیل گئی۔

اہل کوفہ کی غداری

ہانی کے قتل کی افواہ سن کر مسلم بن عقیل نے ابن زیاد کے محل پر اٹھارہ ہزار لوگوں کے ساتھ حملہ کر دیا۔ ابن زیاد نے انتہائی عیاری سے کام لیتے ہوئے مسلمؓ کے حامیوں کو جبر و تخویف اور فریب سے منتشر کروا دیا۔ لوگ مسلمؓ بن عقیل کا ساتھ چھوڑنے لگے یہاں تک کہ مسلم تنہا ہوکر کوفے میں پناہ ڈھونڈنے لگے ایک عورت نے انھیں گھر میں پناہ دی اور چھپا لیا۔ کسی طرح اس خاتون کے لڑکے کو اس کا علم ہوگیا وہاں ابن زیاد نے اعلان کر دیا کہ جس گھر سے مسلم برآمد ہونگے وہاں کے اہل خانہ کو جوابدہی کرنی پڑیگی لڑکا گھبرا گیا اس نے یہ راز فاش کر دیا چنانچہ ابن زیاد نے ستر سپاہیوں کو بھیجا کہ وہ مسلم کو گرفتار کر لائیں انھوں نے انتہائی دلیرانہ مقابلہ کیا مگر چالاکیوں کے سامنے انھیں سپر ڈالنی پڑی انتہائی زخمی حالت میں انھیں ابن زیاد کے سامنے پیش کیا گیا ۔ ابن زیاد نے بڑی تلخ گفتگو کی اور قتل کا حکم دیا تو مسلم نے وصیت کی اجازت مانگی ۔ اور عمر بن سعد سے وصیت کی کہ میرے سات سو درہم کا قرض ادا کر دینا۔ میری لاش دفن کر دینا اور امام حسینؑ کوفہ آرہے ہونگے انھیں یہاں کے حالات بتا کر راستے ہی سے لوٹا دینا۔

وصیت کے بعد پھر ابن زیاد نے مسلمؓ بن عقیل سے تلخ کلامی کی ۔ مسلم نے دندان شکن جواب دیئے تو ابن زیاد مغلظات پر اتر آیا اور حکم دیا کہ انھیں محل کی بالائی منزل پر قتل کر کے ان کا دھڑ نیچے پھینک دیا جائے۔ حضرت مسلم کی اس دردناک ہلاکت سے حضرت حسینؑ کا ایک قوی بازو ٹوٹ گیا۔

امام حسینؑ کا سفر کوفہ

مسلمؓ نے اپنی گرفتاری سے قبل کوفے کے ظاہری حالات کی اطلاع امام حسینؑ کو بھیج دی تھی کہ سارا شہر منتظر ہے فوراً تشریف لائیے۔ حضرت نے خط پانے کے بعد سفر کوفہ کی تیاریاں شروع کر دی تھیں۔

یہ خبر سن کر حضرت عبداللہ ابن عباسؓ نے آکر کہا کہ آپ اس ارادے سے باز آجائیں میں آپ کو خدا کا واسطہ دیتا ہوں مجھے یقین ہے کہ عراقی آپ کو دھوکا دینگے اور بے یار و مددگار چھوڑ دینگے حضرت عبداللہ زبیرؓ نے بھی آپ کو روکنا چاہا مگر آپ نے تسلیم نہیں کیا۔ پھر حضرت عبداللہ ابن عباسؓ آئے اور انھوں نے مشورہ دیا کہ عراقیوں کی قوم فریبی ہے آپ مکے ہی میں رہیں اور اگر یہاں سے جانا ہی چاہتے ہیں تو یمن جائیے وہاں آپ کے والد کے حامی ہیں ۔ مگر حضرت حسینؑ نے جانے کا مصمم ارادہ ظاہر کیا تو حضرت ابن عباسؓ نے کہا اچھا اگر آپ جاتے ہی ہیں تو اہل و عیال کو نہ لیجائیں مگر کارکنان قضا و قدر کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ حضرت عبداللہ ابن عمرؓ نے بھی آپ کو روکنے کی کوشش کی آپ نے تسلیم نہیں کیا۔

الغرض ترویہ کے دن ذی الحجہ ۶۰ھ میں اہل بیت کا قافلہ مکے سے روانہ ہوا وہاں بنوامیہ کے زرخریدوں نے آپ کے اقدام کے خلاف مہم شروع کر دی ۔ کوفے کی ایسی ناکہ بندی ہوئی کہ امام حسینؓ کو وہاں کی اعدا اہل کوفہ کو امام کی جانب سے مراسلت رک گئی۔ امام حسینؓ نے ایک قاصد

قیس بن مسہر کو روانہ کیا اُسے بھی ابن زیاد نے قتل کروا دیا۔

راہ میں ایک جانباز زہیر آپ کے ہمراہ ہوگئے اور آپ نے سفر جاری رکھا۔

حُر کی فوج

محرم ۶۱ھ کا آغاز ہو چکا تھا کہ شامیوں نے حر بن تمیمی کو اسلئے بھیجا کہ وہ حسینی قافلے کو گھیر کر کوفے لے آئے۔ جب حر کا سامنا ہوا تو حضرت حسینؑ نے کوفیوں کے خطوط اور قاصدوں کا ذکر کیا اور فرمایا کہ اگر اہل کوفہ اپنے عہد و پیماں سے پھر گئے ہیں تو میں جہاں سے آیا ہوں مجھے وہیں لوٹ جانے دو۔ حر نے جواب دیا جن لوگوں نے آپ کو خطوط لکھے ہیں ان سے ہمارا کوئی تعلق نہیں۔ ہمیں تو یہ حکم ملا ہے کہ جہاں آپ سے ملاقات ہو جائے وہاں سے آپ کو ابن زیاد کے پاس پہونچا دیں۔ راستے میں کوفے سے آتے ہوئے حضرت حسینؑ کے چار مددگار ملے ان میں سے مجمع بن عدی نے کہا —— اشراف کوفہ کو بڑی بڑی رشوتیں دی گئی ہیں اسلئے وہ سب آپ کے خلاف ہو رہے ہیں گو عوام کے دل آپ کی طرف مائل ہیں لیکن کل انکی تلواریں آپ پر کھنچی ہونگی —۔

جیسے ہی حضرت حسینؑ کا قافلہ نینوا میں اترا حُر کو ابن زیاد کا حکم ملا کہ حسینؑ کو گھیر کر ایسی جگہ اتارو جہاں کوئی قلعہ اور پانی کا چشمہ وغیرہ نہ ہو۔ یہاں حسینی قافلے کے کچھ لوگ برافروختہ ہوگئے لیکن حضرت حسین نے روک دیا اور کہا —— میں اپنی طرف سے لڑائی کی ابتدا نہ کرونگا۔ غرض جمعرات ۲ محرم کو نینوا کے میدان کرب و بلا میں قافلہ خیمہ زن ہوا۔

عمر بن سعد اور رے کی حکومت

اسی دوران دیلمیوں کی سرکوبی کے لئے عمر بن سعد کی سرکردگی میں لشکر جارہا تھا ابن زیاد نے ابن سعد کو واپس آنے کا حکم دیا اور کہا کہ حسینؑ سے مقابلہ کرنا زیادہ اہم ہے پہلے یہ کام کرلو پھر حکومت رے کا پروانہ لیکر اپنے منصب پر چلے جانا۔ ابن سعد نے بہت کہا کہ اُسے مہم سے معاف رکھا جائے تو ابن زیاد نے دھمکی دی کہ رے کی حکومت نہیں ملیگی۔ ابن سعد نے بہت کچھ پس و پیش کیا لیکن رے کی حکومت کا لالچ غالب آیا چنانچہ حضرت امام حسینؑ سے مقابلے کیلئے چار ہزار کی فوج لیکر ابن سعد ۳ محرم کو نینوا پہونچا۔

پانی کی بندش

ابن سعد جتنا اس مقابلے سے بچنا چاہتا تھا اتنا ہی ابن زیاد مشتعل ہوتا جاتا تھا رے کی حکومت کے خواب نے ابن سعد کا ایمان بھی ڈگمگا دیا تھا اسی دوران ابن زیاد کا حکم آیا کہ حسینؑ اور انکے ساتھیوں پر پانی بند کردو۔ اس حکم پر ابن سعد نے پانچ سو سواروں کا دستہ فرات پر مقرر کردیا جس کی وجہ سے سات محرم سے پانی بند ہوگیا۔ جب پیاس کا غلبہ ہوا تو عباس بن علیؓ چند سواروں کے ساتھ فرات پر پہونچے شدید حملہ کرکے پہرے داروں کو پسپا کردیا اور اپنے سامنے پانی کے مشکیزے خیموں پر بھجوا دیئے۔

اس دوران ابن سعد برابر ڈھیل دیئے جارہا تھا۔ دنیوی جاہ و حشم نے گو اسے مقابلے پر آمادہ کردیا تھا مگر دل کی آواز اسے برابر ملامت کررہی تھی۔ ابن زیاد نے یہ ڈھیل محسوس کی تو آخر میں نہایت سخت فرمان بھیجا۔ میں نے تمھیں اسلئے نہیں بھیجا کہ تم حسینؑ کے سفارشی بن کر انکی سلامتی کی تمنا کرو۔ فوراً حملہ کردو اور اگر تم سے یہ کام نہ ہوسکے تو فوج کی کمان شمر کے حوالے کردو

آخر رے کے پروانۂ حکومت نے ابن سعد کو اس ناپاک کام پر آمادہ ہی کر دیا۔ چنانچہ ۹ محرم کو حملے کی تیاریاں ہوگئیں

ایک شب کی مہلت

جب ابن سعد آغاز جنگ کا اعلان سنانے کیلئے آیا اور حضرت عباسؑ نے امام حسینؑ کو شکر ابن سعد کے ارادوں سے آگاہ کیا تو امام نے فرمایا۔ "آج رات بھر کی مہلت اور لے لو تا کہ اس آخری رات کو اچھی طرح نمازیں پڑھ لیں دعائیں مانگ لیں ۔۔۔" ابن سعد کا شکر لوٹ گیا۔

خطبۂ امام حسینؓ

شکر کے جانے کے بعد امام نے اپنے ساتھیوں کو جمع کر کے نہایت بلیغ خطبہ دیا کہ یہ شکر صرف میرا دشمن ہے تم میں سے ہر شخص آزاد ہے اس رات ایک ایک اونٹ لیکر ایک ایک آدمی میرے ایک ایک اہل بیت کو ساتھ لے لے اور تم سب اپنے اپنے شہروں کو چلے جاؤ۔

تمام ساتھیوں کا جواب یہی تھا کہ

"ہم لوگ جان و مال اور اہل و عیال سب آپکے اوپر قربان کر دینگے"۔

شب عاشورہ

جمعرات کا دن گزرنے کے بعد عاشورے کی وہ تاریک رات نمودار ہوئی جسکی صبح کو میدان کربلا میں قیامت بپا ہونے والی تھی۔ امام حسینؓ نے منتشر خیموں کو ایک جگہ ترتیب سے نصب کروایا انکی پشت پر خندق کھدوا کر آگ جلوادی کہ دشمن پیچھے سے حملہ نہ کر سکے۔ ہتھیاروں کی صفائی کروائی۔ تلوار صاف کرتے وقت جب آپ نے چند عبرتناک اشعار پڑھے تو سیدہ زینب آپ کی جاں نثار بہن سے ضبط نہ ہو سکا۔ امام نے بہن کی بیقراری و اضطراب دیکھا تو انھیں صبر کی تلقین کی۔ زینب نے کہا کہ بھائی میں آپ پر سے قربان ہو جاؤں۔ یہ سُن کر صبر و ثبات کے کوہ عظیم امام حسینؓ کا دل بھی بھر آیا اور آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔ زینب پر شدت غم سے غشی طاری ہوگئی۔ غرض امام نے تمام اہل خانہ کو نہایت صبر کے ساتھ ضبط کی تلقین کی حفاظت کے ضروری انتظامات کے بعد سب لوگ صبح صادق تک نماز دعا اور تضرع و زاری میں مشغول رہے۔

صبح عاشورہ

بعد نماز فجر حسینی قافلہ شہادت کیلئے تیار ہو گیا۔ بہتر جاں نثاروں کی ایک مختصر جماعت تھی۔ میمنہ پر زھیر بن قین۔ میسرہ پر حبیب ابن مظاہر۔ علم حضرت عباس کے ہاتھوں میں تھا۔ ادھر یہ مٹھی بھر جاں نثار اور دوسری طرف چار ہزار شامی تھے۔

تکمیل حجت

آپ نے مدافعت سے پہلے شامی فوج کے قریب جا کر فرمایا ۔۔۔ لوگو! میرے نسب پر غور کرو میں کون ہوں؟ پھر اپنے گریبانوں میں منہ ڈال کر خود کو ملامت کرو۔ سوچو کیا میرا قتل اور بے عزتی تمہارے لئے زیبا ہے۔ کیا تم کو نہیں معلوم کہ رسولؐ نے میرے اور میرے بھائی کے متعلق یہ فرمایا تھا کہ یہ دونوں نوجوانان جنت کے سردار ہیں۔ مجھے بتاؤ تم لوگ میرے خون میں کیوں ہاتھ رنگنا چاہتے ہو؟ کیا میں نے کسی کو قتل کیا ہے؟ کسی کو زخمی کیا ہے؟ کسی کا مال ضائع کیا ہے آپ نے کوفیوں کو للکارا کیا تم نے مجھے خطوط لکھکر نہیں بلایا؟ مگر سب مکر گئے اور پھر آپ سے یزید کی بیعت کا مطالبہ کیا اس پر امام نے فرمایا ۔۔۔ "تم کیا چاہتے

ہو کہ بنو ہاشم مسلم بن عقیل کے خون علاوہ تم سے اور دوسرے خون کے بدلے کا مطالبہ بھی کریں۔ خدا کی قسم میں اسکے ہاتھ میں اپنا ہاتھ نہ دونگا اور غلام کی طرح اسکا اقرار نہیں کروں گا۔"

زھیر ابن قین نے اپنے ہم وطن کوفیوں کو سمجھانے کی بہت کوشش کی مگر وہ نہ مانے۔ شمر نے گستاخی کی تو زھیر نے جواب دیا۔۔۔ خدا کی قسم حسینؑ کا ساتھ دینا مجھ کو ظالموں کے ساتھ دائمی زندگی سے زیادہ پسند ہے ۔۔۔ پھر کوفیوں کو مخاطب کرکے کہا ۔۔۔ تم اس ظالم کے فریب میں نہ آو خدا کی قسم جو لوگ محمدؐ کی اولاد اور انکے اھلِ بیت کا خون بہائینگے وہ شفاعت سے محروم رہینگے۔

حُر کی آمد

کوفیوں کی آنکھوں پر پردے پڑ چکے تھے چنانچہ کسی پر کوئی اثر نہ ہوا ابن سعد نے پیش قدمی کی ہی تھی کہ حُر کی آنکھوں سے تاریکی کا پردہ ہٹ گیا اور حق کا جلوہ نظر آنے لگا وہ ابن سعد کی فوج سے نکل کر امام حسینؑ کے قدموں میں آگئے اور اپنی گستاخیوں کی معافی چاہی۔

حضرت امام حسین نے معاف کردیا اور بشارت دی کہ تم دنیا اور آخرت دونوں میں حُر (آزاد) ہو حُر نے بھی کوفیوں کو سمجھانے کی کوشش کی اور کہا کہ اگر تم توبہ کرکے اپنی روش نہ چھوڑو گے تو خدا تمھیں قیامت کے دن پیاسا تڑپائے گا۔

جنگ

حُر کی تقریر کے بعد ابن سعد نے تیر چلا کر جنگ کا آغاز کردیا۔ شروع میں دو بدو جنگ ہوتی رہی مگر اسمیں جو شامی مقابلے پر آیا زندہ واپس نہ جاسکا۔ یہ دیکھکر ابن سعد نے عام جنگ شروع کردی۔ عمرو بن حجاج حضرت حسینؑ پر حملہ آور ہوا۔ اس کشمکش میں امام کے جاں نثار مسلم بن عوسجہ شہید ہوئے۔ حبیب ابن مظاہر اور امام حسین سرہانے پہونچے تو مسلم نے حبیب کو وصیت کی کہ امام کے لئے جان دیدینا اور انکی روح پرواز کرگئی

بچہ ناز رفتہ باشد ز جہاں نیاز مندے ؎ کہ بوقت جاں سپردن بسرش رسیدہ باشی

دوسرے ریلے میں حسینی فوج کے جانباز عبداللہ الکلبی نے کئی آدمیوں کو قتل کرکے جام شہادت نوش کیا۔ حسینی فوج کے ۳۲ آدمیوں نے شامیوں کے چھکے چھڑا دئے تو ابن سعد نے پانسو سواروں کا دستہ بھیجکر حسینی لشکر پر تیروں کی بارش کردی۔ جب گھوڑے زخمی ہوگئے تو جاں نثاروں نے گھوڑوں سے اتر کر وہ لڑائی کی کہ دوپہر تک شامیوں کے دانت کھٹے ہوگئے۔ شامی اس جنگ کو جلد ختم کرنا چاہتے تھے۔ مگر حسینی خیموں کی ترتیب ایسی تھی کہ صرف ایک طرف سے حملہ ہوسکتا تھا۔

خیموں میں آگ

یہ صورت حال دیکھکر ابن سعد نے خیمے اکھاڑنے کا حکم دیا۔ شامی آگے بڑھے تو حسینی جانبازوں کی زد میں آگئے۔ یہ دیکھکر ابن سعد نے خیموں کو آگ لگوادی۔ امام نے دیکھا تو فرمایا یہ اچھا ہوا اب یہ لوگ پیچھے سے حملہ نہ کرسکینگے شمر نے اہل خیمہ کو جلانے کا ارادہ کیا تو امام نے بد دعا دی۔ شمر لوٹ گیا۔ جنگ کی شدت بڑھ گئی جانثار ایک ایک کرکے شہید ہوتے جارہے تھے۔ کوفیوں نے نماز ظہر کی بھی مہلت نہ دی۔ اس دوران حبیب ابن مظاہر نے نہایت تندہی سے حملہ کیا اور ایک انبوہ کثیر سے مقابلہ کرنے لگے مگر کب تک۔ انکے

شہید ہونے سے حضرت حسین کا ایک اور بازو ٹوٹ گیا۔ اس مرحلے پر زھیر ابن قین اور حرؒ نے حملہ شروع کیا حرؒ بڑی بہادری سے لڑے اور امام پر نثار ہو گئے۔

جاں نثاروں کی آخری جماعت

اب ظہر کا وقت آخر ہو رہا تھا۔ امام نے صلواۃ خوف پڑھی۔ نماز کے بعد اس گھمسان کا رن پڑا کہ زمین کربلا تھرا گئی۔ کوفیوں کا ہجوم حضرت کے قریب آگیا۔ تیروں کی بارش میں مشہور جانباز حنفی سینہ سپر ہو گئے بالآخر یہ بھی سینہ چھلنی کرکے امام پر قربان ہو گئے۔ پھر زہیر بن قین شہید ہوئے۔ نافع بن بلال کو کوفیوں نے گرفتار کرکے شہید کیا۔ عبداللہ، عبدالرحمٰن، دونوجوان سیف بن حارث، مالک بن عبد نکلے وہ بھی شہید ہو گئے۔ آخر ایک ایک کرکے سبھی جاں نثار شہید ہو گئے۔

علی اکبر کی شہادت

جاں نثاروں کے بعد اھل بیت کی باری آئی اور سب سے پہلے ریاض امامت کے گل تر علی اکبر میدان میں آئے اور اپنی شمشیر کے جوہر دکھانے لگے ایک کوفی نے تاک کر ایسا نیزہ مارا کہ جسم اطہر میں پیوست ہو گیا۔ نیزہ لگتے ہی ظالم ہر طرف سے ٹوٹ پڑے اور اس گلبدن کے جسم نازک کو مشق ستم بنایا۔ سیدہ زینبؓ سے دیکھا نہ گیا اور یا ابن اخاہ کہتے ہوئے خیمے سے نکل کر جسم اطہر کے ٹکڑوں پر گر پڑیں ستم رسیدہ بھائی نے دکھیاری بہن کو انتہائی رنج واندوہ کے ساتھ پھر خیمے میں پہونچایا۔

یہ بھی عجیب بے کسی کا عالم تھا ایک طرف جاں نثاروں کی لاشیں دوسری طرف علی اکبر کا پاش پاش بدن تیسری طرف زینبؓ خستہ حال پر غش طاری ہے۔ اس بے کسی کے عالم میں کبھی علی اکبر کی لاش کو دیکھتے ہیں اور کبھی آسمان کی طرف نظر اٹھاتے ہیں کہ آج تیرے ایک وفادار بندے نے تیری راہ میں سب سے بڑی نذر پیش کرکے سنت ابراہیمی پوری کی ہے تو اسے قبول فرما۔ اس وقت بھی زبان پر صبر و شکر کے الفاظ ہیں شکایت کے نہیں ؎

من ازیں در دگرانمایہ چہ لذت یابم — کہ بہ اندازۂ آں صبر و ثباتم دادند

نونہالوں کی شہادت

علی اکبر کی شہادت کے بعد مسلم کے صاحبزادے عبداللہ شہید ہوئے انکے بعد جعفر طیارؓ کے پوتے عدی نے جام شہادت نوش کیا۔ انکے بعد عبدالرحمٰن بن عقیل اور محمد بن عقیل شہید ہوئے۔ اب حضرت حسنؓ کے صاحبزادے قاسم نے میدان میں جانبازی دکھائی انکے بعد انکے بھائی ابوبکر نے بھی جنت کا راستہ لیا۔ حضرت عباس نے اپنے بھائیوں کو آگے بڑھایا کہ آقا کے سامنے سینہ سپر ہو جاؤ۔ تینوں بھائی عبداللہ، جعفر اور عثمان نے امام کو بچاتے ہوئے تیروں کی بوچھار اپنے سینوں پر لی۔ ان تینوں کی شہادت کے بعد خود حضرت عباس نے آپ کی حفاظت کی اور جام شہادت نوش کیا۔ عباس کے بعد اہل بیت میں سے بجز امام حسین اور عابد بیمار کے کوئی نہ رہا تھا۔

سردار جنت کی شہادت

فلک امامت کا آفتاب میدان جنگ کے افق پر

طلوع ہوا سیدنا امام حسینؑ شامی فوج کی طرف بڑھے۔ جب تک عباس علمدار زندہ تھے جان پر کھیل کر پانی لے آتے تھے۔ اہل بیت کے خیموں میں جو پانی تھا وہ ختم ہو چکا تھا۔ امام پیاسے تھے اعزہ اور جاں نثاروں کی شہادت سے جی چھوٹ چکا تھا۔ کوفیوں کیلئے آپ کا کام اتمام کر دینا بہت آسان تھا ہمت کر کے بڑھتے تھے لیکن جگر گوشۂ رسول کے خون کا بار عظیم اپنے سر لینا نہیں چاہتے تھے جرأت نہ پڑتی تھی ضمیر ملامت کرتا تھا اور پلٹ پلٹ جاتے تھے۔ حسینؑ کی پیاس بڑھ چلی تھی رہوار کو فرات کی طرف موڑا کہ ذرا حلق نم کریں لیکن کوفیوں نے نہ جانے دیا۔ جنگ بدر میں سرکار دوعالم کافروں کو پانی پینے دیں اور ٹھیک باون برس بعد مالک کوثر کا نواسہ اور یوں تشنہ کام ہو تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو!

پیاس کی شدت بڑھ گئی تو نرغۂ اعدا سے بچ کر کسی طرح ساحل فرات پر پہونچ گئے پانی پینا ہی چاہتے تھے کہ حصین بن نمیر نے ایسا تیر مارا کہ دہن مبارک سے خون کا فوارہ پھوٹ نکلا آپ نے چلو میں پانی لیکر آسمان کی طرف اچھال دیا ہے

بجرم عشق توام میکشند غوغائیست　　——　　تو نیز بر سر بام آ کہ خوش تماشائیست

میدان کربلا میں قیامت برپا تھی ہر طرف سے امام پر تلواریں لہرا رہی تھیں کہ دفعتاً مالک بن شبر کندی نے سیدنا امام حسینؑ پر ایسا وار کیا کہ تلوار کاسۂ سر تک پہونچ گئی سارا بدن خون میں نہا گیا۔ پیراہن مبارک کی رنگینی پکار اٹھی ہے

حلّہ ھا سوختہ اند اہل بہشت از غیرت　　——　　تا شہیدان تو گلگوں کفنی ساختہ اند

شیرخوار کی شہادت

امام کے صبر و ثبات میں اسکے باوجود کوئی فرق نہ آیا اس مرحلے پر یعقوبی کا بیان ہے کہ میدان کربلا میں ایک بچہ پیدا ہوا تھا اذان کیلئے امام کے پاس لایا گیا۔ کسی نے عین اسی وقت تیر چلایا وہ آپ کو لگنے کے بجائے بچے کے حلقوم میں پیوست ہو گیا۔ اور معصوم نے جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔

شمر کے اکسانے پر چاروں طرف سے شامی امام پر ٹوٹ پڑے۔ کسی نے تیر مارا۔ ابھی تیر گردن سے نکالا ہی تھا کہ زرعہ نے بائیں ہاتھ پر تلوار ماری پھر گردن پر وار کیا۔ پیہم زخموں سے آپ نڈھال ہو گئے آپ اٹھنے کی کوشش کرتے تھے مگر گر گر جاتے تھے عین اسی عالم میں سنان نے ایسا نیزہ مارا کہ فلک امامت زمین بوس ہو گیا۔ سنگدل خولی بن یزید سر کاٹنے کیلئے بڑھا لیکن ہاتھ کانپ گئے پیچھے ہٹ گیا اور سنان بن انس نے اس سر کو جو بوسہ گاہ سرکار رحمۃ اللعالمین تھا جسم اطہر سے جدا کر لیا۔ اور دس محرم ۶۱ھ مطابق ستمبر ۶۸۱ء کو خاندان نبوت کا یہ نیر عالمتاب ہمیشہ ہمیشہ کیلئے غروب ہو گیا۔ اس شقاوت اور سنگدلی پر زمین کانپ اٹھی عرش الٰہی تھرا گیا ہوا خاموش ہو گئی پانی کی روانی رک گئی۔ آسمان خون رویا زمین سے خون کے چشمے پھوٹے، شجر و حجر سے نالہ و شیون کی صدائیں بلند ہوئیں جن و انس نے سینہ کوبی کی ملائکہ میں صف ماتم بچھ گئی کہ آج ریاض نبوی کا گل سرسبد مرجھا گیا علیؑ کا چمن اجڑ گیا اور فاطمہؑ کا گھر بے چراغ ہو گیا۔ ہے

چوں خوں زحلق تشنۂ او بر زمیں رسید ——— جوش از زمیں بہ ذرۂ عرش بریں رسید
نخل بلند او چو خساں بر زمیں زدند ——— طوفاں بآسماں زغبارِ زمیں رسید
باد آں غبار چوں بمزار نبیؐ رساند ——— گرد از مدینہ بر فلک ھفتمیں رسید
گرد ایں خیال وہم غلط کارکاں غبار ——— تا دامنِ جلالِ جہاں آفریں رسید

ھست از ملال گرچہ بری ذات ذوالجلال
او در دلست و ہیچ دلی نیست بے ملال

(ماخوذ از سیر الصحابہ
جلد ششم مرتبہ معین الدین احمد ندوی)

سلام

کعبہ کے ساتھ ساتھ مدینا ہے کربلا ؛ اہلِ نظر کے واسطے کیا کیا ہے کربلا
راکب نبیؐ کے دوش کا پیاسا ہے کربلا ؛ فیضانِ لاالٰہ کا دریا ہے کربلا
شبیرؑ آگہی کا تصور بھی تھا محال ؛ شبیرؑ تک رسائی کا جادا ہے کربلا
حجت تمام ہوگئی ذبحِ عظیم کی ؛ مکّے کے امتحاں کا نتیجا ہے کربلا
دیدارِ رب نصیب ہوا ہر شہید کو ؛ قربِ خدائے پاک کا زینا ہے کربلا
خیمے جلے ہیں جس جگہ آلِ رسولؐ کے ؛ نیرنگئ جہاں کا وہ نقشا ہے کربلا
دنیا یزید، دین ہیں شبیرِ ذی وقار ؛ روزِ ازل سے حق کا یہ منشا ہے کربلا
ہیں مستحق درود کے سبطِ رسولؐ پاک ؛ اُن پر درود حق کا تقاضا ہے کربلا
وہ سربلند، روزِ ازل سے ہیں سربلند ؛ اسلام جن کے خون سے زندہ ہے کربلا
انکی وِلا، وِلائے رسولِؐ انام ہے ؛ وابستہ اُن سے سارا زمانا ہے کربلا

کرب و بلا سے بن گیا فردوس جو بشیر
دنیا میں وہ مقام انوکھا ہے کربلا

بشیر وارثی

قسط دوم

آر۔ بانو

تاثراتِ لطیف

جوابِ خط ـــ حکایت از قدِ آں یارِ دلنواز کنیم ؎ ازیں بہانہ مگر عمرِ خود دراز کنیم

عزیزہ بہن طاہرہ!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

عین انتظار میں نامہ کرم نے مسیحائی کی۔

طاہرہ! تمھاری (مجھے "آپ" سے" زیادہ "تم" میں یگانگت نظر آتی ہے) ایک ایک بات میری روح کی گہرائیوں میں فرقت زدہ اور بیقرار روح کی گہرائیوں میں اترتی چلی گئی۔ جی چاہتا ہے تم یوں ہی کہتی رہو، میں یوں ہی سنتی رہوں! بھلا یہ باتیں، سفرِ حجاز کی باتیں، بارگاہِ الٰہی اور دیارِ حبیبؐ کی باتیں، کوچۂ محبوب کی باتیں کہیں بھلائی جا سکتی ہیں بقول تسکین ـــ ؎

قدم قدم پہ جہاں خود کو بھول آیا ہوں ؎ وہ رنگ و نور کی دنیا میں کس طرح بھولوں!

اللہ کے فضل سے اب قافلے واپس ہو رہے ہیں۔ اپنے وطن اور اہل و عیال کی طرف لوٹنے سے سب ہی خوش اور مسرور ہوں گے مگر دل کی کیفیت کچھ اور ہی ہوگی۔ جیسے روح کو وہیں تڑپتی ہوئی چھوڑ آئے ہوں! جاں وہیں رہ گئی ہو!

وہاں سے مراجعت کا سماں کتنا دل دوز اور روح فرسا ہوتا ہے۔ یہ تو تم جانتی ہی ہو طاہرہ! ؎

تر دیدہ دست چہ گویم بہ چہ عنوان رفتم ؎ ہمہ شوقِ آمدہ بودم، ہمہ حرماں رفتم

مگر مالک کی مرضی کے آگے مجالِ دم زدن نیست۔ مرضی مولیٰ از ہمہ اولیٰ۔ کتنے خوش نصیب ہیں وہ لوگ جنھیں دیار کی مٹی نصیب ہوئی ہے۔ کسی نے جنت المعلیٰ کو آرام گاہ بنایا کسی نے جنت البقیع میں استراحت فرمائی۔ ع

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را!

کہتے ہیں کہ حج کے ارادہ سے گھر سے نکل جانے کے بعد اگر راستہ میں بھی موت واقع ہو جائے تو حج کا ثواب مل جاتا ہے۔ بلکہ ہر سال ان کی روح حج میں شریک رہتی ہے۔

اِنَّمَاالاَعمَالُ بِالنِّیَات ۔ اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔ مگر میں - میں تو راستہ میں بارہا یہ دعا کرتی تھی کہ "بارِ الٰہا! صحت و سلامتی کے ساتھ مجھے اپنا اور اپنے حبیب پاکؐ کا دربار ضرور دکھائے۔"

چنانچہ بحری جہاز میں جہاں ہر طرف سمندر ہی سمندر یا پانی ہی پانی نظر آتا ہے۔ جس پر آسمان جھکا ہوا دکھائی دیتا۔ مجھے کبھی کبھی غالب کا یہ شعر ؎

ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا، نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

یاد آجاتا۔ تو میرا دل کانپ اٹھتا اور بے اختیار میں یہ کہہ اٹھتی۔ یا اللہ! میری یہ خواہش بالکل نہیں ہے۔ میں تو چاہتی ہوں کہ دیارِ حبیبؐ میں، کوئے جاناں میں میرا جنازہ بھی اٹھے اور مزار بھی بنے! ایک بار نہیں ہزار بار" مگر اَنَّہٗ لِلِانسَانِ مَا تَمَنّٰی!۔

اس مرتبہ عرفات کے میدان میں بہن ایک تنہا گرد کی موت کس قدر قابلِ رشک ہوئی ہے۔ اخبار دیکھ کر میں تو بہت دیر تک خوشی کے آنسو بہاتی رہی۔ واہ! کیا اچھی موت، کیسی اچھی جگہ کتنا اچھا دن۔

عرفات کے میدان میں ہر آدمی "اَلدِّیْنُ الخَالِص" کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس کی زندگی بھر کی آرزوں اور تمناؤں کا یہی تو ماحصل ہے، یہی تو ملجا و ماویٰ ہے۔ یہاں وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر اور بے تعلق ہو جاتا ہے۔ زندگی میں پہلی بار پوری قلبی اور روحانی قوتوں کے ساتھ، شدید اخلاص اور کامل خشوع اور خضوع کے ساتھ رجوع الی اللہ ہوتا ہے۔ دل و دماغ، روح، احساسات اور جذبات میں مکمل ہم آہنگی پائی جاتی ہے اور ؎

ترا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں

جیسے شاعرانہ" فلسفے دھرے رہ جاتے ہیں۔ آقا اور غلام کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں رہتا۔ "من تو شدم تو من شدی" کا عالم ہوتا ہے۔ بھلا اس عالم میں روح کا قفسِ عنصری سے پرواز کر کے معبودِ حقیقی سے جا ملنا کتنا قابلِ رشک نہ ہوگا۔ خوش نصیبوں کو ہی یہ دولت ملتی ہے۔ دوسرے منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں ؎

چن لیا اس کی محبت نے مجھے ہے اور دنیا ہاتھ ملتے رہ گئی

ہر ایک کو یہ مقام کہاں ملتا ہے! یہ درجہ کہاں نصیب ہوتا ہے۔ ہم جیسے بدنصیب تو بس اسی حسرت میں رہ جاتے ہیں کہ

دو گز زمیں بھی نہ ملی کوئے یار میں!

مگر مالکِ کون و مکاں کے الطافِ بے کراں اور کرم ہائے بے پایاں سے جو کچھ بھی مل جاتا ہے، جتنا بھی مل جاتا ہے، ہماری بساط سے بڑھ کر، ہماری امیدوں سے سوا ہوتا ہے۔ کوئے یار تک، درِ جاناں تک رسائی بھی کچھ کم خوش نصیبی نہیں۔ انسان کی فطرت میں ناشکری تو ہے ہی۔ اِنَّ الاِنسَانَ لَکَفُورٌ مُّبِین۔

اس وقت آخری جہاز کے کچھ حاجی صاحبان سرکار کے دربار میں ہوں گے۔ یہاں کا کچھ اور ہی رنگ رہتا ہے

روضۂ اقدس، جالی مبارک اور گنبدِ خضرا، پر جب بھی نظر پڑتی جاتی ہے۔ دل کی ایک نئی کیفیت ہوتی ہے ؎

ہر لحظہ جمالِ تو نوعِ دگر آراید ؎ شوریدہ دگر انگیزد شوقِ دگر افزاید

مواجہ شریف کے روبرو درود شریف گزارتے ہوئے گھنٹوں بیٹھ جائیں بھی تو اٹھنے کو جی نہیں چاہتا۔ اب تو اسی تصور میں دن گزارتے ہیں۔ بقول فیض ؎

ہم نے دل میں سجا لئے گلشن ؎ جب بہاروں نے بے رخی کی ہے

یہاں سے یعنی درِ حبیبؐ سے مراجعت کا وقت بھی بڑا جانکاہ اور صبر آزما ہوتا ہے۔ دل کا اضطراب پیہم آنسوؤں کا طوفانِ بے پناہ! مگر مجبوری، بندگی و بیچارگی! حکم الٰہی کے آگے سرِ تسلیم خم کرنا ہی پڑتا ہے۔ رخصت تو ہو ہی جاتے ہیں مگر کیسے؟

یوں اٹھے آہ اس گلی سے ہم ؎ جیسے کوئی جہاں سے اٹھتا ہے

ہاں ایک بات یاد آگئی طاہرہ! مدینہ منورہ میں بلیوں کو بسکٹ کھلانے کی بات۔ ہندوستان کی بہ نسبت وہاں کی بلیاں ذرا بڑی ہوتی ہیں۔ خوبصورت، خوش رنگ، لطیف اور پاکیزہ! جس جانور کو سرکارِ دو عالمؐ نے پسند کیا ہو، بھلا اس کی خوبیوں کا کیا کہنا۔ نماز کے بعد روزانہ حرم شریف کے راستہ سے میں بسکٹ خرید لاتی اور اپنے کمرہ میں پہونچ کر بلی کو کھلایا کرتی تھی۔ روزانہ وہ میرے انتظار میں رہتی اور میرے پیچھے پیچھے پھرا کرتی تھی۔ دیکھو طاہرہ! جانوروں کا یہ حال ہے۔ بلیاں اور کتے ہمارے ہاتھ سے ایک لقمہ بھی کھالیں تو ہمیشہ پیچھے پیچھے پھرتے رہتے ہیں کتنے وفادار ہوتے ہیں۔ مگر ہمارا کیا حال ہے! مالک کی بے شمار نعمتوں سے متمتع ہوتے ہیں۔ ہماری زندگی سرتاپا اس کی نعمتوں سے تعبیر ہے۔ بے پایاں اور بے کراں نعمتوں سے۔ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰہِ لَا تُحْصُوْھَا۔

"سورۃ الرحمٰن" میں اللہ تعالیٰ نے اپنی ایک ایک نعمت کا حوالہ دیتے ہوئے، ایک ایک عنایت کا ذکر کرتے ہوئے۔ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ کی تنبیہ کو بار بار دہرایا ہے۔ اس کی نعمتوں کا ہم اندازہ نہیں لگا سکتے۔ کائنات کی ہر چیز اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے پیدا کی ہے۔ سورج، چاند، دریا پہاڑ، ہوا، پانی وغیرہ وغیرہ۔ مگر ہم کو اس کا احساس نہیں ؎

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک در کار اند ؎ تا تو نانے بکف آری و بہ غفلت نہ خوری

ہمہ از بہرِ تو سرگشتہ و فرماں بردار ؎ شرطِ انصاف نباشد کہ تو فرماں نبری

کائنات کی ہر چیز ذرہ سے لے کر آفتاب تک اللہ کے حکم سے ہماری خدمت میں حاضر ہے۔ مگر ہم کس کی خدمت میں ہیں؟ نفس اور شیطان کی خدمت ہیں۔ ما بتو مشغول و تو با عمر و زید۔

حیف، صد حیف! اَوْلٰی لَکَ فَاَوْلٰی۔ ثُمَّ اَوْلٰی لَکَ فَاَوْلٰی۔

ہر سال قافلوں کی تعداد میں، عازمین حج کی تعداد میں ماشاء اللہ اضافہ ہی ہوتا جارہا ہے۔ مادی وسائل کے ذریعہ سفر آسان ہوگیا ہے جس قدر مادی وسائل میں زیادتی ہوتی جارہی ہے۔ روحانیت میں کمی واقع ہو رہی ہے۔ پروردگار عالم کا کرم ہے کہ اپنے بندوں کو توبہ کرنے کا گناہوں سے پاک ہونے اور ایک نئی اور پاکیزہ اسلامی زندگی اختیار کرنے کا موقع عطا فرما رہے ہیں۔ کیونکہ حج کے بعد آدمی ایسا ہوجاتا ہے جیسے ابھی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا

مسلم تو تھا ہی، حج کے بعد کاش کہ وہ مومن بن جائے ہم سب ہی اہل اسلام ہیں مگر بقول اقبال ؎

زباں سے کہہ بھی دیا لا الٰہ تو کیا حاصل ٭ دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

حج پہ ہی کیا موقوف ہے مہد سے لے کر لحد تک مسلمان کا ہر عمل عبادت ہے۔ معاملات دنیوی کے ماسوا اس کا کھانا پینا سونا جاگنا اور چلنا پھرنا تک عبادت ہے۔ بشرطیکہ وہ حدود شرعی کے اندر سنت رسول ﷺ کی روشنی میں ہو۔ ہم کو اس کا احساس بالکل نہیں۔ ارکانِ دین کی مقررہ اصول کے تحت ادائی کو ہی ہم عبادت سمجھے ہوئے ہیں بقول جگر ؎

محوِ تسبیح تو سب ہیں مگر ادراک کہاں ٭ زندگی خود ہی عبادت ہے مگر ہوش نہیں

ہوش میں آنے کا موقع ملے بھی تو کیسے ملے جب کہ ہمارے دو دشمن نفس اور شیطان ساتھ لگے ہوئے ہیں۔ نفس امّارہ نے تو ہم کو کہیں کا نہ رکھا۔ کیا ہی اچھا ہو کہ حج کے بعد ہمیں نفس مطمئنہ نصیب ہو جائے! مگر افسوس ہمارا کمبخت نفسِ امارہ نفس لوامہ تک بننے راضی نہیں ہوتا۔ یہ تو رہی نفس کی بات اب ذرا شیطان کی کارستانیاں سنو!

آدم ؑ کو پیدا کرنے کے بعد انھیں سجدہ کرنے کا اللہ تعالیٰ نے سب فرشتوں کو حکم دیا۔ فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ سب نے سجدہ کیا۔ اِلَّآ اِبْلِيْسَ۔ اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ۝ اللہ تعالیٰ نے وجہ دریافت فرمائی تو کہا۔ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۝ خَلَقْتَنِىْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ۔

پروردگار نے خفا ہو کر کہا۔ نکل جا مردود یہاں سے، قیامت تک تجھ پہ لعنت رہے گی۔ مردود نے درخواست کی کہ مجھے قیامت تک ڈھیل دی جائے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی درخواست قبول کر لی۔ اِلٰى يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ۔ منظوری ملتے ہی ظالم نے کہا۔ فَبِعِزَّتِكَ لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝ "آپ کی عزت کی قسم میں ان سب کو بہکاتا رہوں گا۔ دائیں سے بائیں سے، آگے سے پیچھے سے ہر طرف سے میں ان پہ حملہ کرتا رہوں گا۔ مگر سوائے آپ کے مخلص بندوں کے۔" چنانچہ اس دائمی اجازت نامہ کے ذریعہ شیطان لعین ہر وقت سایہ کی طرح ہمارے ساتھ لگا رہتا ہے۔ سایہ تو پھر بھی تاریکی میں جدا ہوتا ہے۔ مگر یہ کمبخت تو تاریکی میں بھی ہمارے قریب آجاتا ہے۔ گمراہی کی نئی نئی ترکیبیں بتاتا ہے۔ "آؤ اس وقت کون دیکھ رہا ہے۔ چوری، ڈکیتی، رہزنی، قتل، خون اور یہ اور وہ" حتیٰ کہ آجکل اس کی جرأت اتنی بڑھ گئی ہے کہ دن دھاڑے قتل و غارتگری ہو رہی ہے۔ کوئی روک نہیں ٹوک نہیں۔

حد ہو گئی کہ کمبخت شیطان مردود اللہ و رسول کے گھر میں بھی ہمارا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ کیونکہ آدم کی وجہ سے جنت سے نکالا گیا۔ معتوب ہوا۔ راندہ گیا۔ رجیم ہو گیا۔ اس لئے سب سے پہلے کمبخت نے آدم ؑ کو ہی جنت سے نکلوا دیا۔ اور انتقام کی آگ بجھائی۔ اللہ نے آدم علیہ السلام کو دعا سکھلائی رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ۔ اللہ تعالیٰ نے یہ دعا قبول کی۔ وہ دوبارہ جنت میں داخل ہو گئے۔ بنی آدم ؑ کے اس دشمن ازلی کو زمین پہ ہی چھوڑ دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا میرے مخلص بندے میری ہی طرف آئیں گے۔ جن کے لئے میں نے جنت النعیم یعنی بے شمار نعمتوں والی جنت تیار کر رکھی ہے۔ جو تیری پیروی کریگا اس کے لئے سخت عذاب والی دوزخ ہے۔"

مگر افسوس اس کے بندوں کا میلان شیطان کی طرف زیادہ ہے اسوقت مجھے داغؔ کا مشہور شعر یاد آرہا ہے سہ

رُخِ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں ۔ اِدھر آتا ہے دیکھیں یا اُدھر پروانہ جاتا ہے

افسوس کہ پروانے کا رُخِ روشن کو چھوڑ کر (حُسنِ ازل کو چھوڑ کر) شمع کی طرف ہی لپکتے جارہے ہیں۔ جس کی ظاہری روشنی ہر قسم کے لہو ولعب اور گناہوں کے راستے دکھارہی ہے۔ شمع کی چکاچوند پیدا کرنے والی روشنی، بجھ جانے اور فنا ہوجانے والی روشنی ہم کو فنا کے گھاٹ اتار رہی ہے۔ زلزلے آرہے ہیں۔ آندھیاں چل رہی ہیں۔ بجلیاں گر رہی ہیں۔ طوفان امنڈ رہے ہیں۔ قتل، خون، تباہی، غارت گری، ہاں جیسا کہ پہلے میں نے کہا شیطان ہمارے ساتھ ہر جگہ ہر مقام پر حتیٰ کہ عرفات کے میدان میں بھی لگا رہتا ہے۔ مگر میدانِ عرفات میں ہم کامل خشوع و خضوع کے ساتھ رجوع الی اللہ ہوجاتے ہیں۔ اس لئے شیطان صاحب ہم سے ذرا دور دور رہتے ہیں۔ آیندہ کے لئے نئی اسکیمات بناتے ہوئے نئی تدبیریں سوچتے ہوئے۔ دشمنی جو ہے وہ ازل سے! دانت پیس پیس کر کہتے ہیں " اجی ہم سے بچ کر کہاں جائیے گا۔ اچھا حدودِ حرم سے ذرا باہر تو نکل جاؤ! میں دیکھ لوں گا۔ سب سے پہلے تو کسٹم آفس پر ہی تمھارا کس بل نکال دوں گا۔ کچھ چھپا کر، کچھ بنا کر، کچھ جھوٹ کچھ سچ بولو تو کسٹم کی ڈیوٹی دو۔ ایک طرح کی رشوت، جھوٹ بولو تو سامان ادھر ادھر پھیلنے اور ضمیر کا گلا گھونٹنے کی مصیبت سے

ہوئے ہیں پاؤں پہلے ہی نبردِ عشق میں زخمی ۔ نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے

شیطان کی کارستانیاں کہاں تک گنائی جائیں۔ کوئی حد نہیں اسکی ــــ دُعا ہے کہ پروردگار ہم کو اس کے شر سے بچائے۔ صراطِ مستقیم پر چلنا نصیب کرے اور سچا مومن بنائے۔ آمین۔

خط ذرا طویل ہوگیا ہے۔ طاہرہ۔ معاف کرنا۔ حضرت عروجؔ قادری کے تاثرات بہ عنوان "وداعِ کعبہ" سناتی ہوئی اجازت چاہتی ہوں۔ رخصت اے رکنِ یمانی رخصت اے سنگِ سیاہ۔ یاد رکھنا میرے آنسو یاد رکھنا میری آہ۔ اے حطیمِ پاک رخصت تجھ سے بھی ہوتا ہوں میں۔ لب پہ آہ سرد ہے، دھنتا ہوں سر روتا ہوں میں۔ رخصت اے میزابِ رحمت الوداع اے بام و در۔ رخصت اے دیوارِ کعبہ۔ الوداع اے پاک گھر الفراق اے رکنِ شامی۔ الوداع اے مستجار۔ چبھ رہے ہیں دل میں کانٹے، ہو رہا ہوں بیقرار، چھوٹ کر سب سے چلا ہوں، رخصت اے رکنِ عراق۔ مختصر یہ ہو رہا ہے ہجرِ کعبہ دل پہ شاق الوداع اے بابِ کعبہ الوداع اے ملتزم۔ یاد رکھنا گریۂ شب نالہ ہائے صبح دم۔ آ لپٹ لوں خوب تجھ سے آج یا قلبِ حزیں۔ نہ جانے تجھ سے پھر لپٹنا ہے کہ قسمت میں نہیں۔ الوداع اے حفرۂ جبرئیل رخصت اے مطاف۔ چھوٹتا ہوں ہاتھ سے یا جسمِ پرنم اب غلافِ زمزمی! رحمت ہو تجھ پہ میں تو اب واپس چلا۔ روبروئے کعبہ مجھ کو کاش آ کر لیا۔ الوداع اے چاہِ زمزم رخصت اے آبِ طہور۔ تجھ کو پینا دل کی ٹھنڈک دیکھنا آنکھوں کا نور ہے"

اے الٰہ العٰلمین معبود ربِّ دو جہاں ۔ یہ دعا ہے آخری میری کہ پھر لانا یہاں

پڑھ چکا میں آخری حبِ واجب طوف المقام ۔ ذرہ ذرہ کو کیا میں نے وداعی السّلام

خدا حافظ طاہرہ۔ فی امان اللہ۔　　تمھاری عرفاتی بہن۔ آمنہ مفتی

ڈاکٹر سید وحید اشرف
دانشگاہ مدراس

تصوف اور ترک دنیا

یہ مقالہ حضرت بندہ نواز گیسو دراز کے سالانہ عرس کے موقع پر منعقد ہونے والے سمینار مورخہ ۵ ؍ اگست ۸۵ء کیلئے لکھا گیا۔

اسلام دین فطرت ہے۔ اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ اس کے عقائد، اصول اور اعمال انسانی فطرت کے موافق ہیں اور جو چیز فطرت کے خلاف نہ ہوگی وہ عقل کے خلاف بھی نہ ہوگی۔ مثلاً نکاح کرنا۔ تجارت، وحرفت میں مشغولیت، کھانا پینا اور سماجی وسیاسی زندگی میں شریک ہونا۔ یہ تمام باتیں انسانی فطرت کے تقاضے ہیں۔ اسلام ان امور میں ہمیں جائز اور ناجائز طریقوں سے آگاہ کرتا ہے۔ وہ یہ نہیں کہتا کہ آدمی مجرد رہکر جنگل میں جاکر پوجا پاٹ میں زندگی بسر کردے دین فطرت کا ایک اور مفہوم یہ ہے کہ ہر انسان اسلام کی تعلیمات پر عمل کرکے ہدایت پاسکتا ہے اور خدا کی رضا حاصل کرسکتا ہے جب کہ فیثاغورثی فلسفہ اور ہندوستان کے اکثر مذاہب میں ایسا نہیں ہے بلکہ ان کے نزدیک وہی انسان نجات پاسکتا ہے جو ایک خاص روحانی بلندی تک پہنچ چکا ہو، جہاں تک پہنچنے کے لئے علایق دنیوی سے کنارہ کشی کرنا پڑتی ہے اگر وہ اس خاص معیار تک نہیں پہنچ سکا تو مرنے کے بعد اس کو دوسرا جنم دیا جائے گا تاکہ وہ اپنی روحانیت کی تکمیل کرسکے اور اس وقت تک بار بار جنم لیتا رہے گا جب تک کہ وہ اپنی روحانیت کی تکمیل نہ کرلے۔ بدھ مذہب کے مطابق انسان کا عمل کسی بھی شکل میں جنم لے سکتا ہے مثلاً مچھر، مکھی کتا، بلی، پتھر یا انسان وغیرہ لیکن بعض دوسرے مذاہب میں انسان اپنے آیندہ جنم میں بھی انسان ہی رہتا ہے لیکن اسلامی عقیدہ یہ ہے کہ جس کو خدا نے جو صلاحیتیں دی ہیں وہ اپنی طاقت وصلاحیت کے مطابق خدا کے احکام کی پیروی کرے۔ یہی اس کی نجات کا ضامن ہے کیونکہ جس کو خدا نے صلاحیت ہی نہ دی اس کے لئے عمل کا بلند ترین روحانی معیار مقرر کرنا فطرت کے خلاف ہے اس لئے شریعت نے کم سے کم معیار مقرر کردیا ہے۔ جس پر ہر شخص عمل کرسکتا ہے۔ توحید پر ایمان، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، حقوق العباد اور برائیوں سے اجتناب یہ وہ اعمال ہیں جو ہر مسلمان پر فرض ہیں۔ رسالت و آخرت اور جزئیات پر ایمان عقیدہ توحید ہی کے تابع ہے۔ ان میں بھی بعض عبادات مشروط ہیں اور حالات کے مطابق بعض میں نرمی کی گئی ہے لیکن ایسا بھی ہے کہ بہت سے لوگ عقل وفہم میں بڑھے ہوئے ہوتے ہیں، ان کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ قرآن میں تدبر سے کام لیں اور کائنات کی حکمت پر غور کریں۔ کچھ لوگ یہ بھی مطالبہ کرسکتے ہیں کہ توحید و رسالت و آخرت کے کیا دلائل ہیں اور ان پر کیوں ایمان لائیں

ان لوگوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ قرآن میں تدبر سے کام لیں اس کے بعد ان کا ایمان زیادہ مدلل اور مستحکم ہوگا۔ بعض اشخاص ایسے بھی ہو سکتے ہیں کہ قرآن کے اس دعوے کو وہ عملی شکل میں دیکھنا چاہیں کہ وَمَن یَتَّقِ اللّٰہَ یَجۡعَل لَّہٗ مَخۡرَجًا وَّ یَرۡزُقۡہُ مِنۡ حَیۡثُ لَا یَحۡتَسِبُ ؕ

یعنی اگر تم تقویٰ اختیار کرو تو اللہ تعالیٰ تمھیں ایسی جگہ سے روزی دے گا جس کا تمھیں وہم گمان نہ ہو۔ اور کچھ ایسے ہو سکتے ہیں جو یہ دیکھنا چاہیں گے کہ خدا ان کے لئے کسی طرح کافی ہو جاتا ہے جو اپنے کو مکمل طور ۔۔۔۔۔ یہ اپنے کو خدا کے سپرد کر دیتے ہیں۔
(و من یتوکل علی اللہ فھو حسبہ)

مطلب یہ ہے کہ جہاں تمام لوگوں کے لئے اسلام نے نجات کے لئے ایک کم سے کم معیار مقرر کر دیا ہے۔ وہاں روحانی ترقی کی راہیں بھی کھول دی ہیں تاکہ جو لوگ صاحب استعداد اور باہمت و بلند حوصلہ ہوں اور روحانی ترقی کی تڑپ رکھتے ہوں وہ اعلیٰ روحانی مدارج حاصل کر سکیں اور جب یہ لوگ اپنی عملی زندگی کا نمونہ لوگوں کے سامنے اس طرح پیش کرتے ہیں کہ جس سے عیاں ہوتا ہے کہ ان کا توکل صرف خدا پر ہے۔ وہ لوگ قرآن کی اس آیت کا گویا عملی نمونہ ہوتے ہیں۔ اور قرآن کی صداقت ان کی عملی زندگی سے ظاہر ہوتی لگتی ہے اور جب یہ لوگ مشاہدہ کرتے ہیں کہ خدا کس طرح ان کا مددگار ہو جاتا ہے تو اس کی محبت ان کے دلوں میں تیز سے تیز تر ہو جاتی ہے اور خدا کا عشق پوری طرح ان کے دلوں پر چھا جاتا ہے۔ تقویٰ اور توکل کی اس راہ میں کوشاں رہنے والے یہ عاشقان الٰہی صوفیہ کہلاتے ہیں۔ لیکن یہ تصوف کی بلند منزل ہے۔ دراصل ہر وہ عمل تصوف کے دائرے میں آتا ہے جو اللہ کے لئے خالص کر لیا جائے۔ جیسا کہ قرآن میں ہے۔ قُلۡ اِنَّ صَلَاتِیۡ وَنُسُکِیۡ وَمَحۡیَایَ وَمَمَاتِیۡ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ۔ اے رسول کہدو کہ میری نماز، میرا حج، میری زندگی اور میری موت سب اللہ کے لئے ہے جو رب العالمین ہے۔

اس مسئلہ کو ایک دوسرے رخ سے دیکھئے۔ بدھ مذہب کے سوا ہر مذہب میں خدا پر عقیدہ لازمی ہے۔ مذہب والوں کے لئے اس دنیا میں خدا کی عبادت اور اطاعت ضروری ہے۔ ہر مذہب یہ بتاتا ہے کہ خدا کی اطاعت کا صلہ انعام کی شکل میں آخرت میں ملے گا اور خدا کی نافرمانی کا انجام عذاب ہے۔ مختلف مذاہب میں اس انعام و عذاب کی جو بھی صورتیں ہوں بہرحال انسان اپنے اعمال کا جوابدہ ہے۔ عذاب کا تصور انسان کے دل میں خدا کا خوف پیدا کرتا ہے اور خدا کے خوف سے وہ اس کی اطاعت میں لگ جاتا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ انعام کے لالچ میں خدا کی اطاعت کرے۔ لیکن بندہ خدا کی اطاعت کرے یا نہ کرے، اس سے خدا کی ذات میں کچھ فرق نہیں پڑتا۔ اس پر ایمان نہ لانے سے بھی یہ نہیں ہو سکتا کہ اس کی حقیقت میں کوئی فرق پڑ جائے گا چاہے ہم اس کو رب مانیں یا نہ مانیں وہ بہرحال رب العالمین ہے۔ یہ تصور کہ وہ ہمارا رب ہے۔ رزاق ہے، پالنہار ہے۔ ہماری شرافت نفس کو جگاتا ہے۔ جنھیں خدا کے

انعامات اور اپنی شرافتِ نفس کا احساس ہے وہ خدا کی محبت میں غرق ہو جاتے ہیں۔ اگر جنت اور جہنم نہ بھی ہو تب بھی وہ اپنے سب سے بڑے محسن اور رب العالمین کی اطاعت کو شرافتِ نفس کا تقاضا سمجھتے ہیں۔ وہ اگرچہ خدا سے سب سے زیادہ ڈرتے ہیں۔ کیونکہ خدا غنی، بے نیاز اور مالکِ حقیقی ہے۔ لیکن وہ اس کی عبادت اس لئے کرتے ہیں کہ بہر حال وہی معبودِ حقیقی ہے، وہی حق ہے، اسی کے زندہ رکھنے سے سب زندہ ہیں، اسی کے انعامات سے سب بہرہ مند ہیں اور اسی کے پاس لوٹ کر پھر سب کو جانا ہے۔ یہ جذبہ فطری طور پر محبت کا داعیہ پیدا کرتا ہے۔ ایک بچہ اپنے والدین سے محبت کرنے لگتا ہے۔ اس کا سبب صرف اس کا یہ احساس ہے کہ وہی اس کے مربی اور جائے پناہ ہیں۔ لیکن حقیقی پناہ تو خود خدا ہے اور وہی رب ہے۔ یہ تصور صوفیا کے دل میں محبت و اطاعت کا بے پناہ جذبہ پیدا کر دیتا ہے۔ خدا کی محبت میں عبادت کرنے والے یہ لوگ صوفیہ کہلاتے ہیں جن سے اللہ بھی محبت کرتا ہے جیسا کہ خود خدا کا فرمان ہے۔

قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ۔ اے اللہ کے رسول کہہ دو کہ اگر تمھیں اللہ سے محبت ہے تو میری اتباع کرو تو اللہ تم سے محبت کریگا۔

شریعت اور عشق کے مجموعہ کا نام طریقت ہے۔ اور صوفیہ عاشقانِ الٰہی۔ تمام صوفیہ کی زندگیاں اس پر گواہ ہیں۔ حضرت بندہ نوازؒ کی زندگی عشق کا نہایت ممتاز نمونہ ہے یہاں تک کہ انہیں وجود میں عشق کے سوا کچھ نظر نہیں آتا اور ان کا وہ روحانی فیض تھا کہ ان کے مریدین کے دلوں میں بھی عشق کی شمع روشن ہو جاتی تھی جیسا کہ خود حضرت بندہ نوازؒ کے مرشد حضرت چراغ دہلیؒ کا ارشاد ہے۔

ہر کہ مرید سید گیسو دراز شد
واللہ خلاف نیست کہ او عشقباز شد

تصوف کی تعریف جو صوفیہ نے مختلف انداز میں کی ہیں، یہاں ان کے اعادے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہاں صرف یہ عرض کرنا ہے کہ ان تعریفوں میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ ایک ہی چیز کی تعریف مختلف طریقوں سے کی جا سکتی ہے

یہاں تصوف کا تعارف مختصر طریقہ سے کرایا گیا ہے اس میں جس نقطۂ نظر کو سامنے رکھا گیا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ یہ معلوم ہو جائے کہ تصوف دینِ فطرت کے مطابق ہے اور اس کے بنیادی اصول قرآن سے ماخوذ ہیں لیکن جب اس کی تفصیلات سے بحث کی جاتی ہے تو بہت سے موضوعات کے ساتھ اس کا ایک موضوع ترکِ دنیا بھی آتا ہے، کیونکہ توکل سے ترکِ دنیا کا گہرا رشتہ ہے۔ دنیا کیوں پیدا کی گئی ہے؟ انسان کی تخلیق کا مقصد کیا ہے؟ دنیا کے ساتھ انسان کا کیا رویہ ہونا چاہئیے؟ یہ سب تعلیمات ہمیں قرآن و حدیث میں ملتی ہیں۔ اور قرآن و حدیث سے ہٹ کر تصوف میں دنیا کا کوئی تصور نہیں ہے۔ صوفیہ نے دنیا سے متعلق جو باتیں کہی ہیں وہ سب ہمیں قرآن و حدیث میں ملتی ہیں مثلاً قرآن میں اس طرح کی آیات

ہیں۔ دنیا آزمائش کی جگہ ہے تاکہ یہ عیاں ہو جائے کہ کس نے اچھے اعمال کئے اور کس نے بُرے‘ اور مال اور اولاد تمہارے لئے آزمائش ہیں‘ اور اے رسول کہدو کہ میری نماز‘ میرا حج‘ میری زندگی اور میری موت صرف اللہ کے لئے ہے‘ اور تمام دنیا کی پونجی بہت تھوڑی ہے‘۔ دنیا کی پونجی دھوکہ ہے۔ احادیث بھی بہت ہیں۔ ایک حدیث ہے دنیا کی محبت برائیوں کی جڑ ہے (حب الدنیا راس کل خطیئۃ) ان تمام آیات و احادیث کا نچوڑ یہی ہے کہ دنیا دار عمل ہے۔ وہ عمل جو صرف اللہ کے لئے ہو دنیا کی محبت کے لئے دل میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ اسی کا نام ترک دنیا ہے۔ لیکن صوفیہ کے خلاف پروپگنڈہ کرنے والے ترک دنیا کی اصطلاح سے غلط فائدہ اٹھا کر اس طرح کی غلط فہمیاں پیدا کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ صوفیہ بے عمل تھے۔ اور انھوں نے تمدنی زندگی میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ اگر ان کی تعلیمات پر عمل کیا جائے تو دنیا مادی دوڑ میں پیچھے رہ جائے گی۔ ان اعتراضات میں بڑی غلط فہمیاں ہیں۔ ہم اس مضمون میں زیادہ تفصیل میں نہیں جا سکتے۔ جو لوگ اس موضوع سے دلچسپی رکھتے ہیں ان کے لئے میں سفارش کروں گا کہ وہ میرا مضمون ”مقام صوفیہ“ ملاحظہ فرمائیں جو گزشتہ ماہ جولائی میں ماہنامہ ”ذوق نظر“ حیدرآباد میں شائع ہوا ہے۔ یہاں ہم صوفیہ کی عملی زندگی اور ان کی بعض تعلیمات کو پیش کرکے یہ دکھائیں گے کہ صوفیہ نے دنیا کی عملی زندگی میں کس طرح حصہ لیا۔ البتہ یہ نہ بھولنا چاہئے کہ ان کا ہر عمل خالصۃً للّٰہ ہوا کرتا تھا

صوفیہ نے بالعموم کوئی نہ کوئی پیشہ کسب کے لئے استعمال کیا ہے اور جو لوگ فتوح پر بسر کرتے تھے وہ اس لئے تھا کہ ایک تو یہ جائز ہے دوسرے بعض حالات میں ان کا قبول نہ کرنا خدا کی ناراضی کا سبب بن سکتا ہے تیسرے وہ اس میں سے صرف اتنا لیتے تھے جو اُن کی نہایت اہم ضرورتوں کے لئے کافی ہو‘ باقی دوسروں پر خرچ کر دیتے تھے اور دوسرے دن کے لئے بچا کر نہ رکھتے تھے۔ دراصل رسول اکرمؐ کے کامل اتباع کا نام تصوف ہے۔ رسول اکرم کے اعمال و اقوال تین طرح کے ہیں۔ ایک وہ اقوال جن پر آپؐ نے خود عمل کیا اور دوسروں کو ان پر عمل کرنے کا حکم بھی دیا۔ دوسرے وہ اقوال جن میں بہت سے کاموں کے کرنے سے منع کیا ہے۔ یعنی یہ دونوں آپؐ کے اوامر و نواہی ہیں۔ تیسرے وہ اعمال جنھیں آپ نے کیا لیکن نہ ان کے کرنے سے منع کیا اور نہ ان کے کرنے کا حکم دیا۔ مثلاً آپ اپنے لئے کل کے لئے کچھ بچا کر نہ رکھتے تھے [۱] یہ توکل کا بہت بلند مقام ہے۔ قرآن میں مال خرچ کرنے کا پہلا حکم یہ آیا ہے کہ جو کچھ بچے وہ دوسروں پر خرچ کردو بعد میں یہ حکم منسوخ ہو گیا اور کہا گیا کہ نہ اپنے ہاتھوں کو بالکل بند کردو اور نہ بالکل کھول دو لیکن دوسرے حکم کے آنے کے بعد بھی پہلے حکم کا استحباب باقی رہا۔ اس لئے اجلّہ صوفیہ نے پہلے حکم پر عمل کیا جو معالی الامور سے ہے [۲]

اب غور کیجئے کہ ایک مدرس درس دیتا ہے تو اس کا معاوضہ لیتا ہے۔ سپاہی، تاجر، صنعت

(۱ ۲ کا حاشیہ ص پر ملاحظہ ہو)

حاشیہ ۵ (۸)

"فتح خیبر کے بعد رسول اکرمؐ نے اپنی ازواج میں سے ہر ایک کے لئے ۸۰ وسق کھجور اور ۲۰ وسق جو سالانہ مقرر کر دیے تھے اور دودھ کے واسطے ہر ایک کے لئے ایک ناقہ شیردار ملا کرتی تھی۔ لیکن ازواج مطہرات کا بھی یہ حال تھا کہ مایحتاج رکھ کر بقیہ یتیموں اور بیواؤں میں تقسیم کر دیتی تھیں (رحمتہ للعالمین از قاضی سلیمان حصہ اول) لیکن رسول کریمؐ کا یہ حال تھا کہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ آپ نے کبھی شکم سیر ہو کر نہیں کھایا اور کبھی فاقہ کا شکوہ کسی سے نہیں کیا۔ ناداری حضورؐ کو غنا سے زیادہ پیاری تھی بھوک کی حالت میں بھی اگلے دن روزہ رکھ لیتے۔ میں حضور کے فاقے کی حالت دیکھ کر رو پڑتی اور کہا کرتی دنیا میں سے اتنا ہی قبول کر لیجئے کہ جسمانی طاقت رکھنے کو کافی ہو تو جواب میں فرماتے؛

عائشہؓ مجھے دنیا سے کیا کام، میرے بھائی اولوالعزم رسول تو اس سے زیادہ حالت پر صبر کیا کرتے تھے وہ اسی چال پر چلے اور خدا کے سامنے گئے، خدا نے ان کا اکرام کیا اور ان کو پورا پورا ثواب دیا۔ اب اگر میں آسودگی کی زندگی بسر کرتا ہوں تو مجھے یہ شرم آتی ہے کہ کل ان سے کم رہ جاؤں۔ دیکھو مجھے جو چیز سب سے زیادہ پیاری ہے وہ یہ ہے کہ اپنے بھائیوں اور خلیلوں سے جاملوں (رحمتہ اللعالمین حصہ دوم)

اس واقعہ کے ایک ماہ بعد رسول اکرم دنیا سے پردہ فرما گئے۔" (رحمتہ اللعالمین حصہ دوم)

یعنی رسول اکرمؐ کی ساری زندگی اختیاری فقر میں گذری۔

حاشیہ ۶ (۹)

حضرت بندہ نوازؒ ایک مکتوب میں اپنے مرید و خلیفہ شیخ علاء الدین کو لکھتے ہیں۔

"بذل و ایثار کمترین حال صوفی باشد و اقل من کل قلیل بذل مال باشد، ہر چہ بدستش افتد وہم آں نبرد کہ اگر امروز بتمام خرچ شود فردا چہ تواں کرد بیشہ، توکل علی اللہ شود، کار خود سازد۔"

یعنی عطا کرنا اور ایثار کرنا صوفی کا کمترین حال ہے اور کمترین حال میں سے بھی سب سے کمتر چیز مال کا خرچ کرنا ہے، جو کچھ اس کے ہاتھ میں ہو اس کا وہم بھی نہ آنے پائے کہ اگر آج خرچ کر دیا تو کل کیا ہوگا۔ اپنا پیشہ اور طریقہ کار توکل علی اللہ بنائے۔"

حرفت والے بھی اپنے نفع کے لئے کام کرتے ہیں۔ صوفیہ نے روحانی اور اخلاقی تعلیمات دیں اور کوئی معاوضہ نہیں لیا انھوں نے رسول اکرم کا اتباع کیا کہ آپؐ اپنے کاموں کا کوئی معاوضہ نہیں لیتے تھے۔

صوفیہ کے اہم ترین اصولوں میں ہے کہ فرض عبادات کے بعد سب سے زیادہ ضروری اور بڑا کام خدمت خلق ہے۔ خدمت خلق اور دوسروں کی حاجت روائی اور وہ بھی صرف رضائے الٰہی کے لئے وہ عمل ہے جس پر ایک صالح معاشرہ اور بابرکت تمدن کا انحصار ہے درحقیقت صوفیہ نے تمدنی زندگی کی ان بنیادوں کی آبیاری کی ہے جس سے شجر انسانیت ہرا بھرا رہ سکتا ہے آج اس کی کمی کے سبب انسانیت کراہ رہی ہے۔ خدمت خلق کا ہی ایک خاصہ ہے کسی کے دل کو تکلیف نہ دینا کیونکہ جب دوسروں کے دل کو راحت پہنچانا فرض عبادت کے بعد سب سے بڑی نیکی ہے تو دوسروں کے دل کو تکلیف پہنچانا سب سے بڑی برائی ہے یہ وہ زریں اصول ہے کہ جس کی بنیاد پر ہی انسانی سماج میں انسانیت کا احترام ممکن ہے جس کی آج دنیا کو سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ خدمت خلق ہی کا وہ تصور ہے جس کی وجہ سے صوفیہ نے عوام کے لئے ان اعمال پر زور دیا ہے جن سے لوگوں کی ضروریات پوری ہوتی ہیں۔ مثلاً زراعت، تجارت، صنعت و حرفت وغیرہ۔ صوفیہ میں ہر شخص کو جس طرح کے مواقع حاصل رہے انھوں نے خدمت خلق کا فریضہ انجام دیا۔ صوفیہ نے بادشاہوں، امیروں، وزیروں، حاکموں، عالموں، جاہلوں تاجروں اور کسانوں سبھی کو اپنی ہدایات و تعلیمات سے نوازا ہے۔ اور سبھی صوفیہ کے معتقد تھے لیکن یہ کوئی ثابت نہیں کر سکتا کہ صوفیہ نے ان لوگوں کو دنیاوی امور سے کنارہ کشی کی تعلیم دی ہو۔ وہ علماء جن کو تزکیۂ نفس کے لئے ریاضت و مجاہدہ کی تعلیم دی گئی۔ وہ اس لئے زیادہ ضروری تھا تاکہ وہ لوگوں میں تبلیغ و ارشاد کا کام بہتر طور پر انجام دے سکیں۔ صوفیہ کی تعلیمات سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ عشق حقیقی کی لذت، قلب کے سوز و گداز اور دوسروں سے ہمدردی کے بغیر ریاضت اور مجاہدہ سود مند نہیں ہوتا۔

صوفیہ نے عملی زندگی پر کس طرح زور دیا ہے اس کے لئے ہم ان کی تحریروں سے صرف دو اقتباسات پیش کرتے ہیں۔

شیخ علاؤ الدولہ سمنانی ؒ کی کتاب العروہ لاہل الجلوہ والخلوہ میں ہے جس سے سید اشرف جہانگیر سمنانی نے بھی نقل کیا ہے۔ اس کا ترجمہ درج ذیل ہے۔

" جو لوگ زراعت اور صنعت و حرفت کے دوسرے کاموں میں مصروف ہیں وہ اتنے ثواب کا کام کرتے ہیں۔ جس کا بیان نہیں ہو سکتا۔ خدا نے دنیا اس لئے پیدا کی ہے تاکہ یہ آباد رہے اور ترقی کرتی رہے۔ اور لوگ اس سے فائدہ اٹھا سکیں اگر لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ دنیا کے لوگوں کی بھلائی کے کام کرنا کتنا بڑا کار ثواب ہے تو لوگوں کی فلاح کے کام ترک کرنا کوئی پسند نہ کریگا۔ اور اگر یہ معلوم ہو جائے کہ قابل کاشت زمین کو بیکار اور بغیر کاشت کے چھوڑ دینا کتنا بڑا گناہ ہے

تو کوئی بھی تخریب کے کام کرنا پسند نہ کرے گا۔

اگر کسی کے پاس اتنی زمین ہے کہ اس سے ایک ہزار من غلہ پیدا کیا جا سکتا ہے لیکن صرف اس کی کاہلی یا بے توجہی کی وجہ سے ایک سو من کم غلہ پیدا ہوا تو اس کے لئے قیامت میں اسے جواب دہ ہونا پڑے گا۔ اس سے صرف وہی شخص مستثنیٰ قرار دیا جا سکتا ہے جو خدا کی محبت میں ایسا جذب ہو جیسے خود اپنا ہی ہوش نہ ہو۔ اور وہ دنیاوی امور کی طرف توجہ دینے کے قابل نہ رہ گیا ہو۔ لیکن اگر وہ صرف اپنی کاہلی کی وجہ سے ان امور کی طرف توجہ نہ دے سکا اور اسے وہ زہد وتصوف کہتا ہے تو وہ مقلدِ شیطان ہے اور دنیا کی تمام مخلوق میں سب سے زیادہ بیکار شخص کاہل ہے۔ دنیا کی خوشحالی اور ترقی بادشاہوں اور حاکموں کی کوششوں اور ان کی نیک دلی سے بہت زیادہ وابستہ ہے

اسی کتاب میں دوسری جگہ ہے۔

تمام بادشاہ، امراء، وزراء، کسان، اور تمام لوگ جو مختلف صنعت وحرفت اور پیشوں میں لگے ہوئے ہیں درحقیقت وہ عبادت میں مصروف ہیں اور راہِ سلوک کے سالک ہیں بشرطیکہ وہ خدا کے فرمانبردار ہوں اس کو ایک مثال سے سمجھ سکتے ہیں دنیا کو ایک خانقاہ فرض کرو۔ خدا اس کا مرشد ہے انبیا خدا کے خلفاء اور نائب ہیں۔ اولیا خدا کے دوست ہیں جو انبیاء کے پیچھے اور ان کے تابع ہیں۔ بادشاہ اور وزراء ملازمین ہیں۔ انبیاء اور اولیاء کے جو خانقاہ کی ضرورتوں کو پورا کرنے میں مصروف ہیں، کسان مزدور اور تمام پیشہ والے مختلف قسم کی خدمات انجام دیتے ہیں۔ اس طرح انسانوں کا کوئی گروہ ایسا نہیں ہے۔ جو خدا کے دوستوں کی خدمت میں مصروف نہیں ہے۔

محبوب یزدانی سید اشرف جہانگیر سمنانی کے ایک مرید سیف خاں جو اودھ میں کہیں کے حاکم تھے۔ انہوں نے امارت ترک کرکے گوشہ نشینی اور فقر کی زندگی اختیار کرنی چاہی تو آپ نے منع کیا اور فرمایا کہ اصل مقصد زندگی کے ہر شعبہ میں خدا کی اطاعت وفرمانبرداری کرنا چاہئے یہی مقصود ہے۔ (لطائف اشرفی)

اور پھر انہوں نے غنا کی فضیلت پر ایک رسالہ بھی لکھا۔ شیخ سعدیؒ نے گلستاں میں فقر وغنا پر ایک دلچسپ مکالمہ لکھا ہے اور غنا کی فضیلت بتلائی ہے حضرت بندہ نوازؒ اور ان کے معاصر صوفیہ میں بہت سے ایسے تھے جو امراء اور بادشاہوں کی اصلاح میں مصروف تھے۔

حضرت سید اشرف جہانگیر فرماتے ہیں کہ مجھے یہ صرف ہندوستان میں نظر آیا کہ یہاں کے بہت سے پیرزادے محنت اور کسب کو عیب سمجھتے ہیں اور اسی وجہ سے مفلوک الحالی میں مبتلا ہیں حالانکہ کسی پیشے کی توہین کرنا گویا کفر ہے۔ کیونکہ جتنے بنیادی صنعت وحرفت کے کام ہیں ان میں سے ہر ایک کو کسی نہ کسی نبی نے کیا ہے۔ (مثلاً زراعت، تجارت، حدادی، نجاری وغیرہ) آج کے بہت سے پیشے جو اس زمانہ میں نہ تھے وہ سب اسی اصل کی فرع ہیں) اور نبی کے کاموں کی توہین نبی کی توہین ہے اور نبی کی توہین کفر ہے (لطائف اشرفی)

ہندوستان میں ابتداء میں صوفیہ نے تصنیف و تالیف کی طرف خاص توجہ نہ دی۔ سید علی ہجویریؒ نے البتہ کئی کتابیں لکھیں جن میں سے اس وقت صرف کشف المحجوب موجود ہے۔ لیکن کشف المحجوب بھی ان کے بہت بعد منظر عام پر آسکی۔ ان کے بعد چشتی صوفیہ کے بعض مختصر ملفوظات کا پتہ لگتا ہے۔ لیکن تصنیف و تالیف، مکتوبات و ملفوظات کے اعتبار سے ہندوستان میں بندہ نوازؒ کا زمانہ سب سے زیادہ تابناک ہے۔ اس دور میں شیخ شرف الدین یحییٰ منیری متوفی ۷۸۲ھ اور سید محمد گیسو دراز (متوفی ۸۲۵) سید علی ہمدانی متوفی ۷۸۶ھ سید اشرف جہانگیر (متوفی در حدود ۸۲۹ھ) یہ چار شخصیتیں اہم ستون کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان بزرگوں کی تحریروں کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے بادشاہ، حکام اور امراء کی اصلاح، خدمت خلق اور لوگوں کی حاجت روائی علماء کی روحانی تعلیم و تربیت عوام کی اخلاقی و دینی جذبۂ انسانیت اور ہمدردی کے فروغ، مخلوق سے محبت، انسانیت کے احترام کو عام کرنے میں اپنی زندگیاں صرف کردیں اور انھوں نے جو کچھ کیا اس کا مقصد صرف خدا کی خوشنودی تھا۔ ان کا مقصد نہ جاہ و اقتدار تھا۔ نہ دولت و ثروت نہ اعزاز و اکرام۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ کی تعلیمات یہی ہے کہ جو کہ تمام چشتی صوفیہ کا طریقہ رہا ہے کہ سورج کی طرح فیاض۔ زمین کی طرح بردبار اور پانی کی طرح خاکسار ہو۔

(اخبار الاخیار در ضمن حالات شیخ علاء الدین بنڈوئیؒ)
صحیح دنیا کو صوفیہ کے دکھائے ہوئے راستے کی سخت ضرورت ہے اور اسی راستے سے دنیا فلاح پا سکتی ہے۔

ترجمہ۔ پروفیسر شعیب اعظمی۔ جامعہ ملیہ۔ نئی دہلی

محی الدین ابن عربی

شخصیت اور فکر

مسلمان صوفیا اور عارفوں میں ابن عربی وہ پہلی ممتاز و معروف شخصیت ہیں جنھوں نے وحدت الوجود کو اپنا نظریہ تسلیم کیا اور اپنی تعلیمات کی اساس قرار دیا۔ محی الدین ابوبکر محمد بن علی ابن عربی حاتمی طائی اندلس کے باشندے تھے اور آج انھیں ایک مختصر نام ابن عربی سے یاد کیا جاتا ہے۔ درحقیقت بایزید کے وسیلہ اور حوالہ سے جو کچھ نقل ہے کہ یہ وہ باتیں ہیں جو انھوں نے سکر کی حالت میں کی ہیں نہ کہ صحو میں چنانچہ اسی بنا پر یہ باتیں ان کے اصل مذہب اور تعلیم کی حکایت بیان نہیں کرتی ہیں اور خصوصاً اس صورت حال میں جب کہ وحدت وجود کے بارہ میں ابن عربی کا اعتقاد اور ان کے اقوال جو ان کا عرفانی مذہب اور مشرب ہے اور ان کے ان اصولوں پر مبنی ہے جنھیں ان کے اساسی نظریات میں شمار کیا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں بایزید اور منصور حلاج جیسے لوگوں کے اقوال اصطلاحاً وحدت وجود نہیں بلکہ یہ حلول اور اتحاد کی باتیں ہیں یعنی لاہوت کا ناسوت میں حلول یا ان دونوں کا اتحاد دوسرے معنوں میں ابن عربی کا مذہب اصلی وحدت ہے یعنی یہ خیال کہ وجود ایسی چیز ہے جو حق ہے اور جو کچھ ماسوا کہا جاتا ہے وہ مستقل نہیں ہے اور نہ ہی کوئی حقیقت ہے۔

ایسی صورت میں جب کہ بایزید اور منصور حلاج کا طریقہ دوئی کی اصل پر مبنی ہے یعنی یہ کہ دو مستقل وجود جداگانہ حیثیت رکھتے ہیں اور جن میں سے ہر ایک دوسرے کا خالق ہے۔ ایک لاہوت اور دوسرا ناسوت پھر لاہوت ناسوت میں حلول کر گیا ہے اور یا پھر اس سے متحد ہو گیا ہے۔ در ہر صورت ابن عربی کا مذہب اسپینوزا کے مذہب سے مشابہ ہے جو خود وحدت الوجود کا قائل ہے لیکن پھر بھی ابن عربی کے کلام سے اس کے اقوال بہت مختلف ہیں۔

یہ ابن عربی جیسا کہ ان کے معاصرین کی تحریروں اور امام شعرانی کی تصنیف اور بیان سے معلوم ہوتا ہے مسلمانوں کے بزرگ صوفیا میں شمار ہوتے ہیں اور انھیں "الشیخ الاکبر" اور "ابن افلاطون" کے لقب سے نوازا گیا ہے اور پھر "حاتم" بھی کہا گیا ہے وہ ۱۱۶۵ء رمضان ۵۶۰ھ میں اندلس کے جنوب مشرقی علاقہ "مرسیہ" میں پیدا ہوئے۔ ان کا خاندان امیر کبیر لیکن دیندار اور پاکباز لوگوں کا تھا۔ وہ ابھی فقط آٹھ سال کے تھے کہ موحدین کے مرسیہ شہر پر قابض ہو جانے کی بنا پر خاندان اشبیلیہ منتقل ہو گیا۔ ان کے بچپن کا زمانہ یہیں گزرا اور وہ یہیں دونوں ابتدائی علوم کی تحصیل

میں مشغول رہے اور ابن حزم کے پیرودوں کی خدمت میں فقہ اور حدیث پڑھی اپنے جوانی کے ایام میں جس وقت وہ قرطبہ میں تھے اندلسی فلسفی ابن رشد کی خدمت میں حاضر ہوئے جو اس وقت قرطبہ کے قاضی تھے۔

جب ابن عربی کی شادی ہوئی تو بیوی اور والد کے اصرار نے زہد دین اور حدیث کے بجائے ادب تفریح اور شکار سے دلچسپی رکھنے والے نوجوان کو زہد اور معرفت کی طرف کھینچ بلایا۔ اسی دوران وہ بیمار پڑے اور بہت دنوں کی صاحب فراشی کے زمانہ میں خواب دیکھے کہ ان پر جہنم کے عذاب نازل ہو رہے ہیں۔ ان کے والد کا انتقال بھی ہو گیا ہے۔ اور انھوں نے اس واقعہ سے دو ہفتہ قبل اس حادثہ کے واقع ہونے کی خبر بھی دی تھی۔ ان حادثات نے انھیں زہد اور تصوف کی طرف مائل کیا۔ لیکن والد کے انتقال سے پہلے ہی تصوف اور عرفان کا شوق ان کے دل میں پیدا ہو چکا تھا۔ اگرچہ ان ایام میں انھوں نے بعض صوفیا سے رسم و راہ پیدا کر لی تھی۔ اور ان کے رشد و ہدایت سے باطنی مراقبت اور محاسبہ نفس کی طرف متوجہ ہو چکے تھے لیکن یہ عزلت اور گوشہ تنہائی تھا جو ان کی صحیح مربی اور مرشد حقیقی ہے۔ قبرستانوں میں تنہا گھومتے اور زندگی کی کشمکش اور طور طریقوں کے بارہ میں غور و فکر کیا کرتے تھے دن میں مقبروں میں خلوت گزیں ہو جاتے اور مُردوں سے راز و نیاز کی باتیں کیا کرتے۔ خضر سے ملاقات کا واقعہ پیش آیا اور اس کے بعد ہی سیر و سیاحت کے لئے باہر نکل پڑے۔ مغرب میں ابو مدین صوفی اور تیونس میں ابو القاسم بن قسی سے ملاقات ہو گئی۔ تھوڑے دن مغرب کے نواح اور اندلس میں گھومے پھرے فاس کے علاقہ میں گئے اور وہاں اقامت اختیار کی۔ کچھ دنوں قیام کرنے کے بعد ریاضت کا شغل شروع کیا اور وہیں ان پر روحانی   کا نزول شروع ہوا۔

جب وہ مرسیہ لوٹے تو وہاں اپنی پہلی تصنیف مواقع النجوم لکھی اس میں بیان کیا کہ مبتدی کو بغیر شیخ اور مرشد کی ضرورت کے سلوک کی راہ میسر آ جانا ممکن ہے وہ وہاں سے مراکش گئے اور اس شہر میں بھی ان پر روحانی کیفیات نازل ہوئیں اور عجیب و غریب خواب دیکھے۔ ان سارے خوابوں میں سے ایک خواب یہ بھی تھا کہ وہ ستاروں اور سیاروں میں شامل ہو گئے ہیں اور جب لوگوں نے ان کے اس خواب کو ایک معبّر سے بیان کیا تو اس نے بتایا تھا کہ اس کا دیکھنے والا ایک لامتناہی سمندر ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اس کو علوم اسرار الٰہی سے بہرہ ور کیا ہے۔ ایسے ہی خوابوں اور غیبی اشارات اور خضر سے ملاقات کے واقعات نے ان کو دیار مغرب ترک کرنے پر مجبور کیا اور وہ دوبارہ اندلس آ گئے اور پھر مکہ کے سفر اور زیارت پر آمادہ ہوئے وہاں سے مشرق کی طرف چل پڑے۔ مکہ کے قیام کے زمانہ میں وہاں شیخ مکین الدین ابو شجاع زاہر الاصفہانی کی صاحبزادی پر عاشق ہو گئے اور اس لڑکی کے لئے جس کا نام نظام تھا اپنا دیوان "ترجمان الاشواق" نظم کیا۔ اگرچہ اس دیوان میں انھوں نے اعتراف کیا ہے کہ یہ اشعار انھوں نے لڑکی کے عشق میں نظم کئے ہیں۔ مگر قارئین سے درخواست کی ہے کہ وہ لوگ ان کے بارے میں کسی بدگمانی کا شکار نہ ہوں۔ ساتھ ہی غالباً اسی دیوان کی تالیف کی بنا پر وہ مکہ چھوڑنے پر مجبور ہو گئے اور سیاحت کے لئے دوبارہ آمادہ ہو گئے ان کی بار بار کی

کہ کی آمدورفت اس حکایت کی غمازی کرتی ہے کہ وہ بعد میں بھی عشق کی گرمی اور غلبہ سے اپنا دامن نہیں بچا سکے ہیں اور نظام کا عشق کبھی بھی ان کے دل و دماغ سے نہیں نکل سکا۔

محی الدین کچھ زمانہ تک بغداد اور موصل میں سیاحت کرتے رہے اور علوم و معارف کے حصول میں جد و جہد کرتے رہے۔ حلب پہونچ کر دیوان "ترجمان الاشواق" کی شرح میں مشغول رہے اور عرفان و حکمت سے بھرپور اس شرح کو "الذخائر والاعلاق فی شرح ترجمان الاشواق" کا نام دیا۔ بہرحال ابن عربی نے اس سیاحت میں کچھ روز قاہرہ اسکندریہ۔ قونیہ۔ اور حلب میں گزارے اور درمیان میں کئی بار مکہ گئے اور بالآخر دمشق میں سکونت پذیر ہو گئے اور ۶۳۸ھ میں عالم فانی سے عالم بقا سدھارے اور دمشق میں صالحیہ کے مقام پر جو صلحا اور فقرا کا مشہور مدفن تھا مدفون ہوئے۔

حکمت و عرفان کی دنیا میں شہرت پانے کے علاوہ ابن عربی شعر و ادب کی دنیا میں بھی اعلیٰ مقام رکھتے ہیں انھوں نے معرفت و حکمت کے ذوق کو اور مذاق شعری کو اکٹھا کر دیا تھا۔ جیسے غزالی کہ ان کی فتوحات مکیہ کو ان کی احیاء العلوم کی صدا اور عکس کہا گیا ہے۔ شریعت طریقت دونوں ہی میں صاحب نظر تھے۔ لیکن شرعی معاملات میں امام غزالی کی مانند محتاط اور باریک بین نہ تھے۔ اور گویا فقہ اور شریعت کو دلی کیفیات کا مقدمہ سمجھتے تھے باوجودیکہ صاحب تقویٰ اور گوشہ نشیں تھے لیکن جاہ و حشم مال و دولت اور قبولیت عام جیسی خواہشات سے پاک تھے جس شہر میں جاتے وہاں کے صوفیا سے ملتے جلتے۔ وہ اہل توکل میں سے تھے اور بغیر کسی توشے اور زادِ راہ کے ایک شہر سے دوسرے شہر میں چلے جایا کرتے تھے۔ جب کبھی امرائے شہر ان کی بارگاہ میں ہدیہ یا نذرانہ پیش کرتے وہ اسے غربا و حاجتمندوں میں تقسیم کر دیتے جیسا کہ لوگوں کا کہنا ہے کہ اگر کوئی سائل ان کے پاس گیا اور ان سے کسی چیز کا طالب ہوا تو اسے اپنے رہائشی مکان کو بھی اسے دیدینے میں کوئی عار نہیں تھا جہاں کہیں قیام ہوتا وہاں کے فقہا اور صوفیا سے ملتے اور تبادلہ خیال کرتے اسی زمانہ میں وہ عالم اسلام کے بیشتر شہروں میں اہل علم و فکر کے حلقوں میں مشہور ہو چکے تھے اور بیشتر ہم عصر علماء سے ملاقات اور مراسلت رکھتے تھے۔ ان تمام مشاہیر میں فخرالدین رازی بھی ہیں جن کو خط لکھکر دعوت دی تھی کہ وہ رسمی علوم کو بھلا کر علوم الٰہیہ کی طرف رجوع کریں اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ شیخ نے ابن فارض سے اجازت مانگی کہ وہ ان کا مشہور تائیہ قصیدہ شرح کر دیں۔ انھوں نے جواب لکھا کہ فتوحات مکیہ ہی اس کی شرح ہے۔

محی الدین فقہ و شریعت میں بھی صاحب نظر تھے۔ اور اگرچہ عبادات میں اہل ظاہر کا مذہب رکھتے تھے پھر بھی اپنے آپ کو اہل سیر و رموز میں شمار کرتے تھے۔ ان کے نزدیک شریعت ایک طرح سے احوال قلبی کا مقدمہ تھی اور اسی بنا پر ان کی باتیں گاہ گاہ شطحیات اور دعاوی سے مملو رہتی تھیں اور یہ بات کہ انھوں نے اپنے آپ کو خاتم الاولیا سمجھا ہے اور اپنا مقابلہ خاتم الانبیا سے کیا ہے یہ سب ان کے اسی قسم کے دعوے ہیں جیسے کہ رویت محمدی۔ ملاقات خضر، معلومات اسم اعظم اور علم کیمیا کے بارہ میں انھوں نے دعوے کئے ہیں۔

بلکہ ان کی باتیں اسی قسم کی ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ یہی باتیں اس کا سبب بنیں کہ جب وہ ایک بار مصر میں اہل شریعت

نے ان کے اوپر سخت اعتراضات کئے اور ان کے قتل تک پر آمادہ ہوگئے اور بالآخر شیخ   نے ان کو اس جھگڑے سے نجات دلائی۔

محی الدین کی باتوں میں ایسے مطالب ہیں جو بظاہر الحاد ہے اور یہی چیز مسلمانوں کے درمیان ان سے متعلق سخت اختلاف کا باعث بنی ہے۔ بعضوں نے ان کو ملحد گردانا۔ اور کچھ دوسروں نے انھیں قطب اور ولی بھی کہا ہے۔

جن لوگوں نے ان کو سراہا ہے ان میں شہاب الدین سہروردی صاحب قاموس فیروزآبادی۔ فخرالدین رازی اور سبکی ہیں اور مذمت کرنے والوں میں حافظ ذہبی، ابن ایاس تفتازانی۔ اور خصوصاً علامہ ابن تیمیہ، ہیں۔ موخرالذکر نے ابن عربی کے ذکر کے ساتھ منکرین کے اقوال نقل کئے ہیں اور ان پر طعن و تشنیع بھی کی ہے۔ فیروزآبادی نے جن کی تحریروں میں شیخ کے بیشتر اقوال نقل ہیں لکھا ہے کہ محی الدین کے لقب اور ان کے بارہ میں لوگوں نے قاضی بیضاوی سے فتویٰ مانگا انھوں نے لکھا کہ وہ شیخ اور امام ہیں اور   اور پھر ان کی تعریف و توصیف کی۔ امام شعرانی بھی لکھتے ہیں کہ تمام محققین نے ان کے مقام و مرتبہ کی عظمت کو تمام علوم میں تسلیم کیا ہے جن حضرات نے جنھوں نے ان کو منکر اور ملحد کی نگاہ سے دیکھا ہے وہ شیخ کے کلام کی باریکی اور اشکال کی بنا پر ہے کیونکہ ایسے لوگوں نے ان کے کلمات اور عبارات کے معنی صحیح طور سے نہیں سمجھے ہیں۔

صدرالدین محمد بن اسحق قونوی متوفی ۶۷۳ ہجری محی الدین عربی کے شاگرد اور پروردہ تھے۔ ان کی والدہ محی الدین کی زوجیت میں آگئیں تھیں اور اسی بنا پر وہ شیخ کی تربیت میں آگئے تھے اور یہی سبب تھا کہ وہ ابن عربی کے عقاید اور نظریات کی تشریح پر آمادہ ہوگئے اور انھیں شریعت کی روشنی میں بیان کیا۔ "مفتاح الغیب اور فصوص و فکوک و نفحات الہیہ" جیسی معروف کتابیں شیخ کے فکر اور خیال کے مطابق تصنیف کیں ان کے شاگرد فخرالدین عراقی نے بھی فصوص اور فتوحات جیسی کتابیں شیخ صدرالدین قونوی کے حضور میں بطور درس پڑھیں اور اسی تحصیل کے دوران انھوں نے شیخ اکبر کے اصولوں کے مطابق اپنی کتاب "لمعات" تالیف کی اور شیخ کے فکر و عقیدہ کو شاعرانہ انداز بیان دے کر اس کی تائید و توثیق کی۔

ابن تیمیہ اور ابن قیم الجوزی جیسے بہت سے فقہا اور محدثین کی شیخ اکبر کے مسلک پر طعن و تشنیع کے علاوہ صوفیہ میں بہت سے لوگ ان کے مخالف رہے ہیں۔ علاؤالدولہ سمنانی نے ان کے رد میں بہت کچھ لکھا ہے اور عبدالرزاق کاشانی جنھوں نے ابن عربی کی علانیہ تائید کی ہے۔ اس باب میں مراسلت اور مکاتیب کی ہے یہ مراسلے مولانا جامی کی "نفحات الانس" میں موجود ہیں۔

محی الدین ابن عربی کی تصنیفات بکثرت ہیں وہ بہت سارے موضوعات حتی کہ ادب، تاریخ، تفسیر اور اسرار و رموز کے علوم پر بھی بے نظیر کتابیں لکھ گئے ہیں۔   نے ان کی کتابوں کی تعداد ایکسو پچاس لکھی ہے۔ جب کہ دوسرے حضرات نے یہ تعداد اور زیادہ بتائی ہے۔ اور مولانا جامی کے بقول ان کی پانچسو کتابیں ہیں اور پھر رسالے مزید ہیں لیکن "معجم المطبوعات" میں ان کی ۲۸ عدد کتابوں کا تعارف

کرایا گیا ہے جن میں سے بعض رسائل کے مجموعے ہیں۔

یہ تمام تصانیف زیادہ تر تصوف کے مسائل سے متعلق ہیں جن میں بہت دقیق قصائد اور اہم لطائف بیان ہوئے ہیں اور ان میں بہترین تصنیف "الفتوحات المکیہ" ہے جو چار بڑی ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے اور متصوفانہ علوم پر ان کی اہم تصانیف میں سے ہے اور دوسری "فصوص الحکم" ہے جو شیخ اکبر کے مخصوص مسائل کے خلاصہ پر مشتمل اور ساتھ ہی وحدت الوجود سے متعلق ان کے مکمل پختہ اور دقیق عقائد کی حامل ہے لیکن یہ ایسی کتاب ہے جو انتہائی مشکل رموز و غوامض سے پُر اور محتاج تشریح ہے۔ دوسری معروف تصنیف "ترجمان الاشواق" ہے جو ان کے عاشقانہ اشعار کا مجموعہ ہے اور شیخ اسے سراسر معارف الٰہی کا مخزن گردانتے ہیں پھر بھی انسانی عشق کی خوشبو پھوٹتی نظر آتی ہے۔

اسی کتاب کی شرح "الذخائر والاعلاق" ہے جو صوفیانہ انداز بیان رکھتی ہے اور جس میں شاعر نے جا بجا عشق انسانی جو کہ خود ان کا اپنا عشق رہا [illegible] کا پردہ ڈال دیا۔ دوسری کتابیں "محاضرات الابرار و مسامرات الاخیار" اور اسی طرح "التدبیرات الالٰہیہ فی اصلاح المملکۃ الانسانیہ" ہیں پھر "مشکوٰۃ الانوار فیما روی عن اللہ عزوجل من الاخبار" "مواقع النجوم" اور اسی طرح "روح القدس" وغیرہ ہیں۔ "محاضرۃ الذکر" دیوان [illegible] ہے۔ اور ان سب کے علاوہ جیسا کہ گزشتہ صفحات میں ذکر ہوا ان کے رسائل اور کتابیں بہت ہیں۔ جن کے بارے میں معروف مستشرق نیبرگ نے ایک مقالہ بھی لکھا ہے۔

فصوص الحکم میں ابن عربی کا طریق نگارش یہ ہے کہ وہ کوئی حدیث منتخب کر لیتے ہیں اور اس کی تاویل کرتے ہیں اور پھر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں اور بالکل اسکندری کی مانند پھر ایک نئی تاویل کے طور پر کچھ اور اظہار خیال کرتے ہیں۔ اسی لئے اس تصنیف میں ان کی آراء کا سمجھنا دشوار ہے اور اس سے کہیں زیادہ ان آراء کی تاویل و توضیح مشکل ہو جاتی ہے کیونکہ جو زبان و بیان وہ استعمال کرتے ہیں وہ خاص اصطلاحات کا حصہ ہیں اور زیادہ معاملات میں تعقیدی اور مجازی ہیں اور ہر قسم کی لفظی تفسیر اس کے معنی کو تباہ کر دیتی ہے۔ اور اگر ان اصطلاحات سے بچا جائے تو اس شکل میں بھی اس کا مفہوم کافی دشوار ہو جاتا ہے اور ان کے مقاصد کا حاصل کرنا ممکن نہیں رہ جاتا ہے۔ یہی وہ سبب ہے جس کی بنا پر قاری کو غلط فہمی کا شکار ہونا پڑتا ہے اور اس طرح اس کتاب میں تصوف کے معانی گویا دوسری صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ یعنی فلسفہ کی وہ صورت جو انتہائی عمیق ہو جاتی ہے۔

یہ ستائیس نصوص جن میں سے ہر ایک قرآنی آیات سے اور سنت اور حدیث سے مستند ہے اور ہر حدیث ہر نبی کے خاص کلمات سے منسوب ہے اور اسی نص میں اس کی جو منسوب حکمت بھی بیان ہے اسی سے متصل اور مربوط کر دیتے ہیں۔ شیخ نے نبی سے منسوب حکایت کو اخبار کے مطابق رموز و اسرار کے پردوں میں اور اشاروں اور کنایوں میں بیان کیا ہے لیکن ہر قصہ واقعتاً ایسا نظر آتا ہے کہ گویا مصنف اس نبی کے خاص نقش اور مخصوص معرفت کو اپنے اعتقاد کے مطابق اور اخذ کردہ نتائج کے لحاظ سے پیش کرتا ہے۔ یہ سارے

نبیاء کی شکل میں بھی پیش کئے گئے ہیں حقیقتاً ایسے نمونے ہیں کہ ان میں کا ہر ایک اپنے مکمل انسان ہونے کی بنا پر اپنے خاص خیال کے تحت خدا کو حقیقی معنوں میں پہچانتا ہے۔ جیسے مثال کے طور پر حضرت آدم علیہ السلام انسان کو اپنے خلیفہ بنائے جانے کے وجود کی تفسیر بیان کرتے ہیں اور اسی طرح حضرت ایوبؑ ایسے انسان کامل کا مظہر ہیں جو خدا تعالیٰ کی جانب سے شرمندگی کی بنا پر ابتلا اور عذاب میں مبتلا ہوا ہو۔ انھیں مطالب کے دوران عربی آیات واحادیث کی تاویل کرتے ہیں اور اپنی پسند کے مطابق ماخذ اور معانی بیان کرتے ہیں اور واقعہ تو یہ ہے کہ یا الہی کی زبان سے گفتگو کرتے ہیں۔ اگر چہ بعض معاملات میں وہ خود ایسا ظاہر کرتے ہیں کہ وہ تاویل سے اجتناب برت رہے ہیں۔

دنیائے تصوف میں فصوص الحکم ابن عربی کی اہم ترین اور مشکل ترین کتابوں میں سے ہے اور بے شبہ ان کے ہمعصر اور بعد کے صوفیا کے عقاید اور افکار پر بہت اثر انداز ہوئی ہے۔ اس تصنیف میں ابن عربی نے وحدت وجود کے مذہب کو مکمل دلائل کے ساتھ بیان کیا ہے اور اس کے معانی اور اصطلاحات کی توضیح و تشریح کی ہے اور اس مسلک کی تشریح میں تمام ماخذ اور مصادر یعنی قرآن' حدیث' کلام اشراقیین حکمت مشائیین' افکار مسیحی' یہودی' اسماعیلی۔ و باطنی' تحریک اخوان الصفا اور قدیم صوفیا کے اقوال و اشعار کا بھر پور استعمال کیا ہے۔ پھر ان سارے اقتباسات اور اقوال کو اپنے وحدت وجود کے مذہب کے مطابق مناسب رنگ اور موزوں ڈھنگ بخشا ہے خلاصہ یہ کہ اپنی کوشش سے معروف صوفیہ کی اصطلاحات' الفاظ معانی اور افکار کا ایک بیش بہا خزانہ دیا ہے جس نے تصوف کی میراث پر خاطر خواہ اثرات ڈالے ہیں اور بعد کے آنے والے صوفیا کم و بیش ان کی ان تمام اصطلاحات اور مخصوص الفاظ و معانی سے بہر حال بہرہ ور ہوئے ہیں۔

ہر چند یہ فواید اور مطالب زیادہ تر فتوحات مکیہ سے حاصل کئے گئے ہیں لیکن اس کے باوجود یہ فصوص الحکم دوسرا مرتبہ رکھتی ہے اور محی الدین ابن عربی کے افکار و معارف عطر اور زبدہ ہے۔ خصوصاً وہ تحقیق جو وحدت وجود کے مسائل سے متعلق ہے اس کتاب میں جامع اور مکمل ہے اور فصوص الحکم صوفیہ کے مسلک وحدت وجود کا خلاصہ ہے اور ابن عربی کے بعد کے بیشتر صوفیا خصوصاً محقق اور صوفی شعرا نے اس سے امکانی حد تک استفادہ کیا ہے۔

اس کتاب کے معانی بسا اوقات قاری کی نظر سے پنہاں رہتے ہیں اور غالباً نظر ثانی کے بعد ظاہر ہوتے ہیں اور الفاظ و اصطلاحات کے پردہ سے آہستہ آہستہ باہر آتے جاتے ہیں اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے یہ سب کچھ عارفانہ الہام و وحی کی ایک خاص قسم کی تاثیر کے تحت لکھا ہے خود شیخ اکبر جیسا کہ اس کتاب کے مقدمہ اور متن سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس امر کے معتقد اور دعویدار ہیں کہ انھوں نے اس کتاب کو ۶۲۷ھ میں دمشق میں دیکھے گئے ایک خواب کے اندر حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر املا کیا تھا۔ اور وہ خود اس خواب اور کشف کے مترجم ہیں اور درحقیقت فتوحات مکیہ کی مانند فصوص بھی اُن الہامات اور مکاشفات کی ترجمانی ہے جو ان پر غیب سے وارد ہوئے یا منکشف ہوئے ہیں نہ کہ دوسرے مصنفین کی تصانیف کے مانند کسی غور اور فکر کا نتیجہ ہوں خلاصتاً یہ کہا جا سکتا ہے کہ فصوص الحکم ایسی کامل ترین اور جامع ترین تصنیف ہے جس میں محی الدین شیخ اکبر نے قوت فکر

اور حکمت ذوق کو یکجا کر دیا ہے اور دوسرے الفاظ میں معنی و مضامین کے لحاظ سے اور طرز و اسلوب کے اعتبار سے بھی شیخ کے تمام آثار میں ممتاز و منفرد ہے۔

ابن عربی کی اس کتاب فتوحات مکیہ کو امام شعرانی ( ) نے ملخص کیا ہے اور یہ تلخیص معروف عرفا کے عقائد کے سلسلہ میں بہت مفصل اور پانچسو ساٹھ صفحات فصلوں پہ پھیلی ہوئی ہے اور جس میں شیخ نے ان ۵۵۹ فصلوں میں اپنی کتاب کے تمام مندرجات کا خلاصہ بیان کیا ہے۔ وہ لوگ جنھوں نے اس تصنیف کو تنقیدی نقطۂ نظر سے دیکھا ہے ان پہ تنقید کی ہے ان تمام نکات میں جن میں ابن عربی کے نفسانی جذبات کا واقعہ بیان ہوا ہے، وہ اُن کے عجیب و غریب وعدوں کا موجود ہونا ہے جن میں وہ غیبی مکاشفات اور حیرت انگیز خواب بھی جو انھوں نے اپنے حالات کے ضمن میں بیان کئے ہیں مثالاً انھوں نے کتاب میں بہ تکرار بیان کیا ہے کہ انھوں نے اپنی شیر خوار بچی سے پوچھا کہ فلاں مسئلہ میں فقہ میں کیا ہے؟ بچی نے سنا اور جواب بھی دیا۔ دوسرا واقعہ کہ کسی عورت کے شکم میں بچہ تھا، ماں نے چھینک لی۔ تو اندر سے بچہ نے یرحمک اللہ کہا اور یہ آواز ایسی تھی کہ تمام حاضرین نے کانوں سے سنا۔ ابن عربی اس قسم کے عجیب و غریب دعووں کا بیان اس شدت سے کرتے ہیں کہ گویا ان میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اصل مسلم امر یہ ہے کہ کتاب ایسے عجیب و غریب دعاوی کی حامل ہے، متوسط ذہن و دماغ والے اور وہ لوگ جو ان واقعات کو بغیر کسی تاویل کے عموماً رموز و اسرار سمجھ کر دیکھنا چاہتے ہیں ایسی باتوں کو برداشت نہیں کر سکتے اور گویا ان میں ایک قسم کی عقابی تربیت

موجود ہے جسے سوائے اعلیٰ ذہن اور بلند و پاکیزہ خیال والے حضرات کے دوسروں کا ان مطالب کو سمجھ لینا آسان نہیں ہے۔

محی الدین ابن عربی کی ادبی تصنیفات کے بارہ میں نقادوں کا اختلاف رائے ہے غالباً ان کی نثر کو اعلیٰ بیان اور معانی کی بہتات کی بنا پر سراہا گیا ہے ان کا طرز یہ مزید خاصیت رکھتا ہے کہ قاری کو الفاظ میں گم کرنے کے بجائے معانی میں غرق کر دیتا ہے لیکن یہی معانی بسا اوقات ان کے مفہوم کو ادق، مغلق، مرموز، پُر از تاویل اور شرح و بسط کا محتاج بنا دیتے ہیں۔ ان کے اشعار بھی کبھی بے اثر اور سُست نظر آتے ہیں اور بسا اوقات موعظانہ اور مدرسانہ مقصود شعر کی کیفیت کو اس سے چھین لیتا ہے۔ بعض قطعات میں وزن تک موزوں نہیں ہے اور لفظی خامیاں بھی ہیں لیکن یہ چند عیوب اور غلطیاں ان کے کلام کی قدر و قیمت کو کم نہیں کرتے ہیں ان کے اشعار کا مطالعہ اس بات کا پتہ دیتا ہے کہ ان کا بیشتر حصہ حقیقی سوز اور درد و شوق کی تاثیر کے تحت لکھا گیا ہے۔ اشعار لطیف معانی اور اعلیٰ خیالات سے بھرپور ہیں اور بعض موارد میں فارسی شاعری کی خو بو ان کے کلام میں پائی جاتی ہے اور بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایران کے بعض اور خصوصاً آٹھویں صدی ہجری کے بعد کے شعرا کے افکار اور خیالات اور اسلوب تک سے دور نہیں رہے ہیں۔ بہرحال محی الدین اپنی اس نظم و نثر کی بدولت صوفیہ کے اعلیٰ ترین مقاصد و معانی کے بیان کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔ اور اسی قسم کے بہت سے شعرا کے مانند ان کے معانی کے بیان کرنے میں کامیاب رہے ہیں اور اسی قسم

کے بہت سے شعرا کے مانند ان کے معانی کا سمجھنا ان کے انداز بیان کے ساتھ مربوط ہے اور اسے ابہام اور مشکل پسندی کا نام نہیں دیا جا سکتا ہے اور نہ ہی انہیں تنقید کا نشانہ بنایا جا سکتا ہے۔

محی الدین ابن عربی کی بعض مذکورہ کتابوں کے رموز و اسرار کو بعض محققین نے ڈانٹے کی معروف (
) کے معانی اور اسلوب سے مناسبت اور مشابہت دی ہے۔ جیسے ورجل کو ڈانٹے کی کتاب میں شاعر کی رہنمائی میں بہشت و دوزخ کی سیر میسر آئی ہے ویسے ہی محی الدین کے اشراقات میں بار بار خضر رہنما ہوتے ہیں اور اسرار پر سے پردہ ان پر منکشف کرتے ہیں۔ ڈانٹے اور محی الدین میں بڑی مشابہت ہے کیونکہ تمام باتوں کے علاوہ اس اندلسی عارف کی مانند فلورنس کا شاعر بھی اپنے عاشقانہ اشعار کی تشریح پر مجبور ہوا ہے اور اس عشق کی نشاندہی کی ہے جس میں سوز و ساز ہے اور جسے جسمانی عشق پر محمول نہیں کرنا چاہیے۔

دراصل صورت محی الدین نے تصوف کو ایک قسم کا فلسفیانہ رنگ دیا ہے اور حکمت کی مانند اسے خالق اور مخلوق سے مشابہت دے کر اسے اخلاق الٰہی کا نام دیا ہے۔ ان کا یہ فلسفہ اشاعرہ کے عقاید کی تلفیق سے عبارت ہے اور جو حکمت اسکندریہ اور نوافلاطونیت سے مماثلت رکھتا ہے اور جیسا کہ دیگر محققین نے لکھا ہے کہ ان کے فلسفہ میں مسیحیت کا عنصر بھی شامل ہے لیکن وحدت وجود کی بات جو ان کی عرفانی تعلیمات کی اساس ہے اور ان کی تمام تر تصانیف اور خصوصاً فصوص الحکم میں مختلف پیرایوں میں بیان ہوئی ہے اور جو اسی فکر پر مبنی ہے کہ وجود ایک واحد اور ازلی حقیقت ہے اور تنہا وجود ازلی خدا ہے اور چنانچہ یہ عالم خود اپنا کوئی اصلی مستقل وجود نہیں رکھتا ہے صرف ایک وہم اور خیالی ہے اور وجود حقیقی ایک شے سے بیشتر نہیں ہے یہ عالم باوجود تمام اختلافات اور تضادات کے جو اس کائنات کی اشیاء اور میں ہے کوئی چیز نہیں لیکن اس حقیقت کے گوناگوں مظاہر جو اس وجود الٰہی کی بدولت ہیں اور اصلاً ابن عربی کے نظریہ کی بنا پر یہ تمام آراء اس سے خالی رہی ہیں اور یہی فکر ان کے فلسفہ کی بنیاد ہے اسی بنیاد پر دو جداگانہ وجود کا قائل نہیں ہو جا سکتا' یعنی ایک خالق دوسرے مخلوق بلکہ صرف وجود واحد کا قائل ہونا چاہیئے کہ اگر ایک طرف سے دیکھیں تو خلق اور دوسری جانب سے حق ہے اور ان دونوں طرفوں کے درمیان کوئی ذاتی غیریت یا فرق نہیں ہے لیکن یہاں قدرتی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کائنات عالم کا حدوث جو ناچار محسوس اور مشہور ہے اور کسی وجہ سے بھی اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا ہے وہ کس قسم کا ہے اور حدوث جو ہماری نظروں تک کے سامنے پیش آتا رہتا ہے اور نتیجتاً جو چیز موجود اور دوامی نہیں ہے' وہ قائم اور موجود ہو جاتی ہے۔ اس کی توجیہہ کس طرح کی جاتی ہے ؟

جب وجود ایک واحد حقیقت ہے پھر حادث اور قدیم کے درمیان تفاوت کیسا ہے؟ اور دنیا کے حادثات اور کام جو کہ عرصہ ہستی میں نہیں ہیں کیسے واقع ہو جاتے ہیں اور ہستی کا لباس پہنتے ہیں!

ابن عربی اس سوال کا جو جواب دیتے ہیں وہ یہ کہ وجود ایک واحد حقیقت ہے اور وہ حدوث تعداد اور کثرت نہیں رکھتا ہے یہ واحد حقیقت اسی ذات حق سے ہے جو ازلی ہے اور یہ عالم واقعتاً وجود حقیقی نہیں رکھتا ہے۔ بلکہ فقط ایک نمود وہم اور نمائش محض ہے اور وجود اتنی ذات حق سے مختص ہے بہرحال محی الدین کے عقیدہ کے مطابق یہ حقیقت واحد جو وجود حق ہے ایک ازلی تجلی کی حامل ہے جسے ابن عربی فیض حق کا نام دیتے ہیں اور ممکنات کی تمام چیزوں میں ذات الٰہی کی تجلی سے تعبیر کرتے ہیں۔ ممکنات کی اس صورت کو وہ ایک امر معقول قرار دیتے ہیں جو وجود عینی سے بَرا ہے اور یہ وہی ہے جسے ہم الاعیان الثابتہ فی العدم" کا نام دیتے ہیں' ابن عربی کا اعتقاد ہے کہ ممکنات کی یہ صورت خدا کے علم میں ثابت ہے ویسے ہی جیسے کہ عقل انسانی میں معانی بھی اسی صورت میں موجود ہیں اور روقت ضرورت یہ ظاہر ہو جاتے ہیں اور معدوم بھی ہیں جب کہ ان کا خارجی وجود کوئی حیثیت نہیں رکھتا ہے بہرحال یہ اعیان ثابتہ در علم" محی الدین کی نظر میں بڑی اور مکمل اہمیت رکھتے ہیں یعنی انہیں کے عقیدہ کے مطابق خداوند بزرگ انھیں اعیان کے طریقہ سے ثابت ہے جو کائنات عالم کے حالات کا علم رکھتا ہے لیکن موجودات اس طریقہ کے بجائے کہ انھیں اعیان ثابتہ سے ان کا علم رکھتا ہے اسے ظہور میں نہیں لاتا ہے اور ایسا ہے کہ اشیاء ثابتہ سے تجاوز نہیں کرتا

ہے۔ خیر ابن عربی کے عقیدہ کے تحت اعیان ثابتہ در علم البتہ بر حسب اقتضا عالم معقول سے عالم محسوس میں ظاہر ہوتے ہیں اور یہ ظہور وہی ہے جسے وہ فیض مقدس کہتے ہیں اور ان کا عقیدہ ہے کہ عالم وجود میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو مرحلہ ظہور میں اس حال کے برخلاف ہو جو وہ مرحلہ ثبوت میں رکھتا رہا ہو۔ اس بنا پر ابن عربی کے خیال کے مطابق وجود جو ایک حقیقت واحد ہے اور اصلاً بجز ذات حقیقی کے کوئی دوسری شئے نہیں ہے جو دو فیض یا دو تجلیات کا حامل ہے کہ ایک سے اعیان علم میں ثابت ہوتے ہیں۔ اور دوسرا فیض مقدس ہے جس کے توسل سے علم کے اعیان ثابتہ عالم محسوس میں ظاہر ہو جاتے ہیں اور اس طرح ذات حق ایک تجلی سے کہ جس کو فیض اقدس کہا جاتا ہے۔ اعیان کو علم میں ثابت رکھتا ہے اور دوسری تجلی سے جو فیض مقدس کہی جاتی ہے مشیت کے اقتضا کے مطابق علم کے ان اعیان ثابتہ کو عرصہ ظہور میں وارد کرتی ہے۔ غرض اس بیان کا خلاصہ یہ ہوا کہ ابن عربی کائنات کا مکمل بیان کرتے ہوئے معلوم کرتے ہیں کہ درحقیقت وجود ہی ایک واحد حقیقت ہے۔ ورنہ یہ بات کہ جب ہم اسے "مظاہر" کے لحاظ سے دیکھتے ہیں تو اسے تعدد اور تکثر میں دیکھتے ہیں اور قسم قسم کی شکلوں کو "خلق" کہتے ہیں۔ جب اس وجود واحد کو ذات اور حقیقت کی نظر سے دیکھیں گے تو ان تمام تکثرات کو وحدت کی طرف راجع ہوتا ہوا پاتے ہیں اور اسی وحدت کو عین حق سمجھتے ہیں اور اسی یقین پر ابن عربی کی نظر میں

عالم جو خلق ہے ہر چند حق کے مساوی اور مانند نہیں ہے لیکن حق سے جدا بھی نہیں ہے جس طرح حق بھی خلق سے جدا نہیں ہے اور انھیں معانی کی تشریح کی بنا پر وہ "سبحان ماخلق الاشیاء وھو اعنیہا" کہتے ہیں۔

ان تمام تفصیلات کے باوجود ابن عربی کی نظر ہر اشیاء میں وحدت حق کا وجود اس امر کا مانع نہیں ہے کہ خلق حق سے عشق اختیار کرے کیونکہ ان کے عقیدے کے مطابق حق اور خلق کے درمیان کا فاصلہ یقیناً معتبر ہے اور ان کی حقیقت ایک ہی ہے۔ علاوہ ازیں ہر چیز اپنی جنس سے عشق اختیار کرتی ہے اور یہ کشش جو تمام عالم میں ہے اسی سبب کی بنا پر ہے۔ اسی وجہ سے خدا سے عشق اور محبت الٰہی جس کی باتیں صوفیہ کرتے ہیں ابن عربی کے خیال میں غیر معقول نہیں ہے اور ان کی اس فکر کا یہ بیان جس کو ان کے مذہب کی اساس کہا جاتا ہے اور تفصیل کا طالب ہے اور اس کو یہاں سمیٹنا ممکن نہیں لیکن یہ امر ضرور قابل توجہ ہے کہ وحدت وجود کی اس فکر کو جو ابن عربی کا مذہب فقہا اور متکلمین رد کر چکے ہیں اور اس کا انجام بے جا اور زحمت طلب قرار دیا ہے اور اس کے باوجود ابن عربی کی تصنیفات بعد کے اکثر عرفا اور صوفیا اور خصوصاً ایران اور ایشیاء کوچک کے صوفیا پر بہت زیادہ اثر انداز ہوتی رہی ہیں اور بہت مقبول بھی رہی ہیں۔ ان کتابوں کی باریک اور بدیع تاویل جو انھوں نے عقاید اسلامی سے کی ہے۔ ان کے صدیوں بعد جامی اور دوسرے لوگوں کی تصنیفات میں منعکس ہوئی ہیں اور متکلمین کے مقابلہ میں اہل قلب و نظر کے یہاں زیادہ مقبول رہی ہیں۔

(منقول از باب حکمت صوفیہ)

قطعہ

(۱)

خدا کے نور سے سرشار ہیں محبوب سبحانی
نبی کے واقعی دلدار ہیں محبوب سبحانی

(۲)

ثنائے حضرت غوث الورا واحد سے کیا ہوگی
نبی کے بعد جب مختار ہیں محبوب سبحانی

محمد عبدالواحد واحد

بھیشم ساہنی

ترجمہ : ڈاکٹر یعقوب عمر

چیف کی دعوت

آج مسٹر شیام ناتھ کے گھر چیف کی دعوت تھی۔

شیام ناتھ اور ان کی بیگم کو پسینہ پونچھنے کی فرصت نہ تھی۔ ڈریسنگ گاؤن پہنے الجھے ہوئے بالوں کا جوڑا بنائے منہ پر پھیلی ہوئی سرخی پوڈر کو بھولے اور مسٹر شیام ناتھ سگریٹ پر سگریٹ پھونکتے ہوئے چیزوں کی فہرست ہاتھ میں تھامے ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں آجا رہے تھے۔

آخر پانچ بجتے بجتے تیاری مکمل ہونے لگی۔ کرسیاں، میز، تپائیاں، نیپکن، پھول سب برآمدے میں پہنچ گئے۔ ڈرنک کا انتظام بیٹھک میں کر دیا گیا۔ اب گھر کا فالتو سامان الماریوں کے پیچھے اور پلنگوں کے نیچے چھپایا جانے لگا۔ تبھی شیام ناتھ کے سامنے اچانک ایک مسئلہ آکر کھڑا ہو گیا —— ماں کا کیا ہوگا؟

اس بات کی طرف ان کا اور ان کی سلیقہ مند بیوی دونوں کا خیال نہ جا سکا تھا۔ مسٹر شیام ناتھ اپنی میڈم کی طرف دیکھ کر انگریزی میں بولے۔

"ماں کا کیا ہوگا؟"

میڈم کام کرتے کرتے رک گئیں۔ تھوڑی دیر سوچنے کے بعد بولیں۔ "انھیں پچھواڑے ان کی سہیلی کے گھر بھیج دو۔ رات بھر بے شک وہیں رہیں۔ کل آجائیں۔"

شیام ناتھ سگریٹ منہ میں دبائے شریمتی کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے پل بھر کچھ سوچتے رہے۔ پھر سر ہلا کر بولے: "نہیں، میں نہیں چاہتا کہ اس بڑھیا کا یہاں آنا جانا پھر

شروع ہو جاے۔ پہلے ہی بڑی مشکل سے بند کیا تھا۔ ماں سے کہو کہ جلدی کھانا کھا کر شام کو ہی وہ اپنی کوٹھری میں چلی جائیں۔ مہمان کہیں آٹھ بجے آئیں گے۔ اس سے پہلے ہی اپنے کام سمیٹ لیں۔

مشورہ ٹھیک تھا۔ دونوں کو پسند آیا، مگر شریمتی اچانک بول اٹھیں۔ "جو وہ سو گئیں اور خراٹے لینے لگیں تو؟ ساتھ ہی تو برآمدہ ہے جہاں لوگ کھانا کھائیں گے۔"

"تو انھیں کہہ دیں گے کہ اندر سے دروازہ بند کر لیں۔ میں باہر سے تالا لگا دوں گا یا ماں سے کہہ دیتا ہوں کہ اندر جا کر سوئیں نہیں، بیٹھی رہیں اور کیا؟"

"اور جو سو گئیں تو؟ ڈنر نہ جانے کب تک چلے۔ گیارہ گیارہ بجے تک تو تم ڈرنک ہی کرتے رہتے ہو۔"

شیام ناتھ کا موڈ آف ہو گیا، ہاتھ جھٹکتے ہوئے بولے: "اچھی بھلی یہ بھائی کے پاس جا رہی تھیں تم نے یوں ہی اپنی محبت جتانے کے لیے بیچ میں ٹانگ اڑا دی۔"

"واہ تم ماں اور بیٹے کی باتوں میں، میں کیوں بری بنوں؟ تم جانو اور وہ جانیں۔"

شیام ناتھ چپ رہے۔ یہ موقع بحث کا نہ تھا۔ مسئلے کا حل ڈھونڈنے کا تھا۔ انھوں نے گھوم کر ماں کی کوٹھری کی طرف دیکھا۔ کوٹھری کا دروازہ برآمدہ میں کھلتا تھا۔ برآمدے کی طرف دیکھتے ہوئے جھٹ سے بولے: "میں نے سوچ لیا ہے۔" اور انھیں قدموں ماں کی کوٹھری کے باہر جا کھڑے ہوے۔ ماں دیوار کے ساتھ ایک چوکی پر بیٹھی، ڈوپٹے سے سر اور منہ ڈھانکے ہوے مالا جپ رہی تھی۔ صبح سے تیاریاں دیکھ دیکھ کر ماں کا دل بھی دھڑک رہا تھا۔ بیٹے کے دفتر کا بڑا صاحب گھر پر آ رہا ہے۔ سارا کام ٹھیک ڈھنگ سے ہو جائے تو اچھا ہے۔

"ماں آج تم کھانا جلدی کھا لینا۔ مہمان ساڑھے سات بجے آ جائیں گے۔"

ماں نے دھیرے سے دوپٹہ ہٹایا اور بیٹے کو دیکھتے ہوے کہا۔ "آج مجھے کھانا نہیں کھانا ہے بیٹا! تم جانتے تو ہو گوشت اور مچھلی بنے تو میں کچھ نہیں کھاتی۔"

"جیسے بھی ہو اپنے کام سے جلدی نپٹ لینا۔"

"اچھا بیٹا۔"

"اور ماں ہم لوگ پہلے بیٹھک میں بیٹھیں گے۔ اتنی دیر تم یہاں برآمدے میں بیٹھنا۔ پھر جب ہم

یہاں آجائیں تو تم غسل خانے سے ہو کر بیٹھک میں چلی جانا۔"
ماں کچھ دیر تک بیٹے کا چہرہ دیکھتی رہی پھر آہستہ سے بولی: "اچھا بیٹا۔"
"اور ہاں آج جلدی سو نہیں جانا۔ تمہارے خراٹوں کی آواز دور تک جاتی ہے۔"
ماں شرمندہ آواز میں بولی: "کیا کروں بیٹا میرے بس کی بات نہیں۔ جب سے بیماری سے اٹھی ہوں، ناک سے سانس نہیں لے سکتی۔"
مسٹر شیام ناتھ نے انتظام تو کر دیا مگر پھر بھی ان کی ادھیڑ بن ختم نہیں ہوئی۔ جو چیف اچانک ادھر آنکلا تو؟ آٹھ دس مہمان ہوں گے۔ دیسی افسر، ان کی بیویاں ہوں گی، کوئی بھی غسل خانہ کی طرف جا سکتا ہے۔ اسی الجھن میں وہ سر کھجانے لگے۔ ایک کرسی کو اٹھا کر کوٹھری کے باہر برآمدے میں رکھتے ہوئے وہ بولے: "آؤ ماں، اس پر ذرا بیٹھو تو۔"
ماں مالا سنبھالتی، پلو ٹھیک کرتی ہوئی اٹھی اور آہستہ سے کرسی پر آکر بیٹھ گئی۔
"یوں نہیں ماں، ٹانگ اوپر چڑھا کر نہیں بیٹھتے۔ یہ کھاٹ نہیں۔" ماں نے ٹانگیں نیچے کر لیں۔
"اور خدا کے واسطے ننگے پاؤں نہ گھومنا، نہ تو کھڑاؤں پہن کر سامنے آنا۔ کسی دن تمہاری وہ کھڑاؤں اٹھا کر باہر پھینک دوں گا۔"
ماں چپ رہی۔ "کپڑے کون سے پہنو گی ماں؟"
"جو ہیں وہی پہنوں گی بیٹا! جو کہو پہن لوں!"
مسٹر شیام ناتھ سگریٹ منہ میں دبائے ادھ کھلی آنکھوں سے ماں کی طرف دیکھنے لگے اور ماں کے کپڑوں کے بارے میں سوچنے لگے۔ شیام ناتھ ہر بات میں ترتیب چاہتے تھے۔ گھر کا انتظام ان کے اپنے ہاتھوں میں تھا۔ کھونٹیاں کمرے میں کہاں لگائی جائیں، بستر کہاں بچھیں، کس رنگ کے پردے لگائے جائیں، شریمتی کون سی ساڑی پہنیں، میز کس سائز کی ہو۔ شام ناتھ کو فکر تھی کہ کہیں چیف کا ماں سے سامنا ہو گیا تو شرمندہ نہ ہونا پڑے۔ ماں کو سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے بولے:
"تم سفید قمیص اور سفید شلوار پہن لینا۔ پہن کے آؤ تو، ذرا دیکھوں۔"
ماں دھیرے سے اٹھی اور اپنی کوٹھری میں کپڑے پہننے چلی گئی۔

"یہ ماں کا جھمیلا ہی رہے گا۔" انھوں نے پھر انگریزی میں اپنی شریمتی سے کہا۔ "کوئی ڈھنگ کی بات ہو تو کوئی کچھ بھی کہیں کوئی الٹی سیدھی بات ہو گئی، چیف کو برا لگا تو سارا مزہ کرکرا ہو جائے گا۔"

ماں سفید قمیص اور شلوار پہن کر باہر نکلی۔ چھوٹا سا قد، سفید کپڑوں میں لپٹا ہوا، چھوٹا سا سوکھا ہوا جسم، دھندلی آنکھیں، صرف سر کے آدھے جھڑے ہوئے بال پلو میں چھپ گئے تھے۔

"چلو ٹھیک ہے، کچھ چوڑیاں وغیرہ بھی پہن لینا۔"

"چوڑیاں کہاں سے لاؤں بیٹا، تم تو جانتے ہو سارے زیور تمھاری پڑھائی میں بک گئے!"

یہ جملہ شیام ناتھ کو تیر کی طرح لگا۔ تنک کر بولے: "یہ کون سا راگ چھیڑ دیا ماں! سیدھے کہہ دیتیں کہ زیور نہیں ہے۔ بس! اس سے پڑھائی وغیرہ کا کیا تعلق ہے؟ زیور بکا تو کچھ بن کر ہی آیا ہوں، نرا گنوار تو نہیں لوٹ آیا، جتنا دیا تھا اس سے دوگنا لے لینا۔"

"میری زبان جل جائے بیٹا! تم سے زیور لوں گی۔ میرے منہ سے یوں ہی نکل گیا۔ جو ہوتے تو لاکھ بار پہنتی۔"

ساڑھے پانچ بج چکے تھے۔ ابھی شیام ناتھ کو خود بھی نہا دھو کر تیار ہونا تھا۔ شریمتی کب کی اپنے کمرے میں جا چکی تھیں۔ شیام ناتھ پھر ایک مرتبہ جاتے ہوئے ماں کو ہدایت کرتے گئے۔

"ماں روز کی طرح گم سم ہو کر نہیں بیٹھی رہنا۔ اگر صاحب ادھر آ نکلے اور کچھ پوچھ بیٹھے تو ٹھیک سے جواب دینا۔"

"میں نہ پڑھی نہ لکھی بیٹا، میں کیا بات کروں گی۔ تم کہہ دینا ماں ان پڑھ ہے۔ کچھ جانتی سمجھتی نہیں۔ وہ نہیں پوچھیں گے۔"

سات بجتے بجتے ماں کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ اگر چیف سامنے آ گیا اور اس سے کچھ پوچھ بیٹھا تو وہ کیا جواب دے گی؟ انگریز کو تو دور سے دیکھ کر گھبرا جاتی تھی۔ یہ تو امریکن ہے۔ نہ معلوم کیا پوچھے۔ میں کیا کہوں گی۔ ماں کا جی چاہا کہ چپ چاپ پچھواڑے بیوہ سہیلی کے گھر چلی جائے مگر بیٹے کا حکم کیسے ٹال سکتی تھی۔ چپ چاپ ٹانگیں لٹکائے کرسی پر بیٹھی رہی۔

ایک کامیاب پارٹی وہ ہے جس میں ڈرنک کامیابی سے چل جائے۔ شیام ناتھ کی پارٹی کامیابی

کے عروج پر تھی۔ گردشِ جام اور بات چیت دونوں نہایت سلیقے اور ہم آہنگی سے چل رہے تھے کہیں کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ صاحب کو وہسکی پسند آئی تھی۔ میم صاحب کو پردے پسند آئے، صوفا کور کا ڈیزائن پسند آیا۔ کمرے کی سجاوٹ پسند آئی۔ اس سے بڑھ کر اور کیا چاہیئے؟ صاحب تو ڈرنک کے دوسرے دور ہی میں چٹکلے اور کہانیوں پر آ گئے تھے۔ دفتر میں جتنا رعب رکھتے تھے یہاں پر اتنے ہی دوست پرور نظر آ رہے تھے۔ ان کی بیگم کالا گاؤن پہنے، گلے میں سفید موتیوں کا ہار۔ سینٹ اور پاوڈر سے مہکتی ہوئی کمرے میں بیٹھی تمام عورتوں کی نگاہوں کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ بات بات پہ ہنستی، بات بات پہ سر ہلاتی، شام ناتھ کی بیوی سے تو ایسے باتیں کر رہی تھیں جیسے پرانی سہیلی ہو۔

اسی رَو میں پیتے پلاتے ساڑھے دس بج گئے۔ وقت کے گزرنے کا پتہ ہی نہ چلا۔ آخر سب لوگ اپنے اپنے گلاسوں میں سے آخری گھونٹ پی کر کھانا کھانے کے لیے اٹھے اور بیٹھک سے باہر نکلے۔ آگے آگے شام ناتھ راستہ دکھاتے ہوئے پیچھے چیف اور دوسرے مہمان تھے۔ برآمدے میں پہنچتے ہی شام ناتھ اچانک ٹھٹھک گئے۔ جو منظر انھوں نے دیکھا اس سے ان کی ٹانگیں لڑکھڑا گئیں۔ سارا نشہ ہرن ہوتا نظر آیا۔ برآمدے میں کوٹھری کے باہر ماں اپنی کرسی پر جیوں کی تیوں بیٹھی تھیں۔ مگر دونوں پاؤں کرسی کی سیٹ پر رکھے ہوئے، سر دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں جھول رہا تھا۔ منہ سے گہرے خراٹوں کی آواز نکل رہی تھی۔ پلو سر پر سے کھسک آیا تھا اور ماں کے چھدرے بال آدھے گنجے سر پر الجھ کر بکھرے ہوئے تھے۔ دیکھتے ہی شام ناتھ کو غصہ آ گیا۔ جی چاہا کہ دھکا دیکر ماں کو اٹھا دیں اور انھیں کھڑکی میں دھکیل دیں مگر ایسا کرنا ممکن نہ تھا۔ چیف اور باقی مہمان پاس کھڑے تھے۔

ماں کو دیکھتے ہی دیسی افسروں کی کچھ بیویاں ہنس پڑیں۔ اتنے میں چیف نے دھیرے سے کہا۔ "پوور ڈیر۔"

ماں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ سامنے اتنے لوگوں کو دیکھ کر ایسی گھبرائی کہ کچھ کہتے نہ بنا۔ جھٹ سے پلو سر پر رکھتی ہوئی کھڑی ہو گئی۔ اس کے پاؤں لڑکھڑانے لگے اور ہاتھوں کی انگلیاں تھر تھر کانپنے لگیں۔ "ماں تم جاکر سو جاؤ۔ تم کیوں اتنی دیر تک جاگ رہی تھیں"۔ شام ناتھ یہ کہہ کر کھسیانی

ہوئی نظروں سے چیف کا منہ دیکھنے لگے۔

چیف کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ وہ وہیں کھڑے کھڑے بولے: "نمستے!"

ماں نے سمٹے سمٹائے جھجکتے ہوئے دونوں ہاتھ جوڑے، مگر ایک ہاتھ ڈوپٹے کے اندر مالا کو پکڑے ہوئے تھا، دوسرا باہر، ٹھیک طرح سے نمستے بھی نہ کر پائی۔ شیام ناتھ کو اس پر بھی غصہ آ گیا۔

اتنے میں چیف نے اپنا دایاں ہاتھ ملانے کے لیے ماں کی طرف بڑھایا۔ ماں اور بھی گھبرا گئی۔

"ماں ہاتھ ملاؤ۔" شیام ناتھ نے کہا۔ پر وہ ہاتھ کیسے ملاتی؟ دائیں ہاتھ میں تو مالا تھی۔ گھبراہٹ میں ماں نے بایاں ہاتھ ہی صاحب کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ شیام ناتھ دل ہی دل میں جل اٹھے۔ دیسی افسروں کی بیویاں کھلکھلا کر ہنسنے لگیں۔

"یوں نہیں ماں، تم تو جانتی ہو دایاں ہاتھ ملایا جاتا ہے۔ دایاں ہاتھ ملاؤ۔"

مگر تب تک چیف ماں کا بایاں ہاتھ ہی بار بار ہلا کر کہہ رہے تھے۔ "ہاؤ ڈو یو ڈو؟"

"کہو ماں، میں ٹھیک ہوں، خیریت سے ہوں۔" ماں کچھ بڑبڑائی۔ "ماں کہتی ہے میں ٹھیک ہوں، کہو ماں۔ ہاؤ ڈو یو ڈو"

ماں رکتے رکتے بولی۔ "ہاؤ۔ ڈو۔ ۔ ڈو۔"

بات زیادہ نہ بگڑے اس لئے چیف نے موضوع بدلتے ہوئے اور باتیں شروع کر دی تھیں۔ لوگ ہنسنے چہکنے لگے تھے۔ شیام ناتھ کے من کا غبار بھی کچھ کچھ کم ہونے لگا۔

صاحب ابھی بھی ماں کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے تھے اور ماں سمٹی جا رہی تھی۔ صاحب کے منہ سے شراب کی بو آ رہی تھی۔

شیام ناتھ انگریزی میں بولا۔ "میری ماں گاؤں کی رہنے والی ہے اس لیے آپ سے شرماتی ہے۔"

صاحب بولے۔ "سچ! مجھے گاؤں کے لوگ بہت پسند ہیں۔ تب تو تمہاری ماں گاؤں کے گیت اور ناچ بھی جانتی ہوگی؟" چیف یہ کہہ کر خوشی سے سر ہلاتے ہوئے، ماں کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگے۔

"ماں! صاحب کہتے ہیں کوئی گانا سناؤ، کوئی پرانا گیت، تمہیں تو کتنے ہی یاد ہوں گے۔"

ماں دھیرے سے بولی: "میں کیا گاؤں گی بیٹا، میں نے کب گایا ہے؟"

"واہ ماں، مہمان کا کہا بھی کوئی ٹالتا ہے؟ صاحب نے اتنی محبت سے کہا ہے نہیں گاؤ گی تو بُرا مانیں گے۔"

"میں کیا گاؤں بیٹا، مجھے کیا آتا ہے؟"

"واہ کوئی بڑھیا سا ٹپّا سنا دو۔ دُو پتّر اناراں دے ....."

دیسی افسران کی بیویوں نے اس فرمائش پر تالیاں بجائیں۔ ماں سہمی ہوئی نگاہوں سے کبھی بیٹے کی طرف دیکھتی کبھی بہو کی طرف، اتنے میں بیٹے نے سنجیدہ اور تحکمانہ لہجے میں کہا۔ "ماں!"

اس کے بعد ہاں یا نا کا سوال ہی نہیں اٹھتا تھا۔ ماں بیٹھ گئی اور انتہائی کمزور لرزتی ہوئی آواز میں ایک پُرانا گیت گانے لگی۔

"ہریانی ماسے، ہریانی بہنے، ہریا تو ماگی ماریا ہے۔"

دیسی عورتیں کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ تین مصرعے گانے کے بعد ماں چپ ہو گئی۔

برآمدہ تالیوں سے گونج اُٹھا۔ صاحب تالیاں بجانا بند ہی نہ کرتے تھے۔ شیام ناتھ کا غصہ خوشی اور فخر میں بدل گیا۔ ماں نے پارٹی میں نیا رنگ بھر دیا تھا۔ تالیاں تھمنے پر صاحب بولے:

"پنجاب کے گاؤں کی دستکاری کیا ہے؟"

شیام ناتھ خوشی سے جھوم رہے تھے، بولے: "بہت کچھ ہے صاحب، بس ایک سے ایک ایسی چیز پیش کروں گا کہ آپ خوش ہو جائیں گے۔"

مگر صاحب نے سر ہلا کر انگریزی میں پھر پوچھا۔ "نہیں میں دکانوں کی چیز نہیں مانگتا۔ پنجابیوں کے گھروں میں کیا بنتا ہے؟ عورتیں خود کیا بناتی ہیں؟"

شیام ناتھ کچھ سوچتے ہوئے بولے۔ "لڑکیاں گڑیاں بناتی ہیں، عورتیں پھلکاریاں بناتی ہیں۔"

"پھول کاری کیا؟"

شیام ناتھ پھول کاری کا مطلب سمجھانے میں ناکام ہو کر ماں سے بولے: "کیوں ماں گھر میں کوئی پُرانی پھول کاری ہے؟"

ماں چپ چاپ اندر گئی اور اپنی پُرانی پھول کاری اٹھا لائی۔ صاحب نہایت دلچسپی سے

پھول کاری دیکھنے لگے۔ پرانی پھول کاری تھی۔ جگہ جگہ سے اس کے دھاگے ٹوٹے ہوئے اور کپڑا بوسیدہ ہو چکا تھا۔ صاحب کی دلچسپی دیکھ کر شیام ناتھ کہنے لگے۔ "یہ پھٹی ہوئی ہے صاحب، میں آپ کو نئی بنوا دوں گا۔ ماں بنا دے گی۔ کیوں ماں، صاحب کو پھول کاری بہت پسند ہے، انھیں ایسی ہی پھول کاری بنا دوگی نا؟"

ماں چپ رہی، پھر ڈرتے ڈرتے دھیرے سے بولی۔ "اب میری نظر کہاں ہے بیٹا۔ بوڑھی آنکھیں کیا دیکھیں گی؟"

ماں کی بات سنی ان سنی کر کے شیام ناتھ، صاحب سے بولے: "وہ ضرور بنا دے گی، آپ اسے دیکھ کر خوش ہوں گے۔" صاحب نے سر ہلایا، شکریہ ادا کیا اور آہستہ آہستہ جھومتے ہوئے کھانے کی میز پر پہنچ گئے۔

جب مہمان بیٹھ گئے اور ماں پر سے سب کی توجہ ہٹ گئی تو ماں آہستہ سے کرسی چھوڑ کر سب سے نظریں بچاتی ہوئی اپنی کوٹھری میں چلی گئی۔ کوٹھری میں بیٹھنے کی دیر تھی کہ آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے وہ ڈوپٹے سے بار بار انھیں پونچھتی پر وہ بار بار امڈ آتے جیسے پانی کا بندھ ٹوٹ گیا ہو۔ ماں نے بہتیرا دل کو سمجھایا۔ ہاتھ جوڑے۔ بھگوان کا نام لیا۔ بیٹے کی کامیابی کی دعائیں مانگیں۔ بار بار آنکھیں بند کیں مگر آنسو برسات کے پانی کی طرح تھمنے کا نام نہیں لیتے تھے۔

آدھی رات کا وقت ہوگا، مہمان کھانا کھا کر جا چکے تھے۔ ماں دیوار سے لگ کر بیٹھی، آنکھیں پھاڑے دیوار کو دیکھے جا رہی تھی۔ گھر کے ماحول میں سکون کی سی کیفیت تھی۔ محلے میں جو خاموشی طاری تھی وہ شیام ناتھ کے گھر میں بھی تھی۔ صرف باورچی خانہ میں پلیٹیں وغیرہ رکھنے کی آواز آ رہی تھی۔ اچانک ماں کی کوٹھری کے دروازے پر زوردار دستک ہوئی۔

"ماں دروازہ کھولو۔"

ماں کا دل بیٹھ گیا۔ گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ کیا مجھ سے پھر کوئی بھول ہو گئی ہے؟ ماں کتنی دیر سے اپنے آپ کو کوس رہی تھی کہ اُسے نیند کیوں آ گئی؟ وہ کیوں اونگھنے لگی! کیا بیٹے نے ابھی تک معاف نہیں کیا؟ انہی خیالات میں ماں نے کانپتے ہاتھوں سے دروازہ کھول دیا۔ دروازہ کھلتے ہی

شیام ناتھ جھومتے ہوئے آگے بڑھے اور ماں کے گلے لگ گئے۔

"او ماں! تم نے تو آج کمال کر دیا ... صاحب تم سے اتنا خوش ہوئے کہ کیا کہوں! او ہو!!"

ماں کی آنکھوں میں پھر آنسو آ گئے۔ انھیں پونچھتی ہوئی آہستہ سے بولی۔

"بیٹا تم مجھے ہری دوار بھیج دو، میں کب سے کہہ رہی ہوں۔"

شیام ناتھ کا جھومنا ایک دم بند ہو گیا اور پیشانی پر لکیریں پڑ گئیں۔

"کیا کہا ماں؟ یہ کون سا راگ تم نے پھر چھیڑ دیا؟" شیام ناتھ کا غصہ بڑھنے لگا تھا۔

بولنے لگے: "تم مجھے بدنام کرنا چاہتی ہو کہ دنیا کہے کہ بیٹا ماں کو اپنے یہاں نہیں رکھ سکتا۔"

"نہیں بیٹا! تم اپنی بیوی کے ساتھ جیسا دل چاہے رہو۔ میں نے جی بھر کر زندگی گزار لی اب یہاں کیا کروں گی؟ جو تھوڑے دن زندگانی کے باقی ہیں وہ بھگوان کا نام لے کر گزار دوں گی، تم مجھے ہری دوار بھیج دو۔"

"تم چلی جاؤ گی تو پھولکاری کون بنائے گا؟ صاحب سے تمہارے سامنے ہی پھولکاری دینے کا وعدہ کیا ہے۔"

"میری آنکھیں اب نہیں ہیں بیٹا جو پھولکاری بن سکے تم کہیں اور سے بنوا لو یا بنی بنائی لے لو۔"

"ماں تم مجھے دھوکہ دیکر یوں ہی چلی جاؤ گی؟ میرا بنا کام بگاڑو گی؟ جانتی نہیں صاحب خوش ہونگے تو مجھے ترقی ملے گی۔ کہہ رہے تھے۔ جب تمہاری ماں پھولکاری بنانا شروع کرے گی تو میں دیکھنے آؤں گا کہ کیسے بناتی ہے۔ صاحب خوش ہو گئے تو مجھے اس سے بھی بڑی نوکری مل سکتی ہے، میں بڑا افسر بن سکتا ہوں۔"

ماں کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا۔ آہستہ آہستہ جھریوں سے بھرا چہرہ کھل اٹھا۔ آنکھوں میں چمک آ گئی۔ "تو تیری ترقی ہو گی بیٹا؟" — "ترقی یوں ہی تو نہیں ہو جائے گی؟ صاحب کو خوش رکھونگا تو کچھ کرے گا ورنہ اس کی خدمت کرنے والے اور بھی بہت ہیں۔"

یہ سن کر ماں دل ہی دل میں اپنے بیٹے کے بہتر مستقبل کے لئے دعائیں کرنے لگی اور مسٹر شیام ناتھ "اب سو جاؤ ماں" کہتے ہوئے لڑکھڑاتے جھومتے اپنے کمرے کی طرف چلے گئے۔ (ہندی سے ترجمہ)

مطرب نظامی

فراق صاحب
یادوں کے جھروکوں سے

لمحوں کی خموشی میں بجنے لگی شہنائی　　پھر اس نے مجھے دیکھا یادوں کے جھروکوں سے

فراقؔ صاحب کی موت اردو زبان و ادب کے لیے ایک عظیم اور تاریخی سانحہ ہے۔ فراقؔ صاحب بذاتِ خود ایک انجمن تھے۔ ان کے پاس بیٹھنے والا بہت جلد محسوس کر لیتا تھا کہ وہ کسی عظیم المرتبت اور قدآور شخصیت سے ہمکلام ہے۔

مجھے وہ اکثر یاد فرمایا کرتے تھے 'ویسے تو آنے جانے والوں میں بہت سے حضرات آتے ہی رہتے ہیں لیکن مجھے ان حضرات میں زیادہ دلچسپی ہوتی ہے جو اپنی بات سلیقے سے کہتے ہیں اور دوسروں کی بات غور سے سنتے ہیں۔ ایک مرتبہ دورانِ گفتگو میں نے ان سے کسی بات کی وضاحت بحث کے انداز میں چاہی تو خفا ہو کر بولے کہ میں آج آپ کو جو نصیحت کر رہا ہوں اس کو گرہ میں باندھ لیں۔ اگر آپ کسی ایسے شخص سے گفتگو کر رہے ہیں کہ جس کو آپ عظیم سمجھتے ہیں تو گفتگو کے درمیان بولنے سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ جوابِ جاہلاں باشد خموشی کے مصداق آپ کو نظر انداز کر دے اور جس بات کی اہمیت سے آپ کو وہ روشناس کرانا چاہتا ہے آپ معلومات کے اس بے بہا خزینے سے محروم رہ جائیں جس کے انکشاف سے آپ کے تجربے میں ایک اضافہ ہوتا۔ بحث ہمیشہ برابر کے ذی علم سے مناسب ہے۔ نصیحتوں اور ان کے اخلاص کے تذکروں کے ساتھ ان کو آنجہانی لکھ رہا ہوں۔ ان کے عنایاتِ فراواں اور خورد نوازی نے دل پر ایسے نقوش چھوڑے ہیں جو تمام زندگی اُبھر اُبھر کر نئے رنگ بھرتے رہیں گے۔ ان کے حالات لکھنے میں روشنائی آنسوؤں میں ڈھلی جارہی ہے۔ انگلیاں کانپ رہی ہیں کہ آنجہانی کیسے لکھوں۔ وہ دل کی دھڑکنیں جو گذرے ہوئے

لمحوں میں ڈھل چکی ہیں ان کو کیسے جُدا کر دوں۔ افسوس مستقبل کی خوش آیند نصیحتیں کرنے والا ہمیشہ کے لیئے رخصت ہو گیا۔

فراقؔ صاحب نے موت اور زندگی کے فلسفے پر جب بھی گفتگو کی تو مذہب سے ہٹ کر عقلی اور منطقی دلائل سے سمجھانے کی کوشش کی وہ بالکل آزاد خیال تھے۔ ایک صاحب نے ان سے پوچھا کہ آواگون یا بہشت و جہنم کے قائل ہیں تو فرمایا کہ جنت کے بارے میں غالبؔ نے وضاحت کر دی ہے:

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن دل کے بہلانے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے

اس معاملے میں تو غالبؔ کا پیرو ہوں۔ دراصل آواگون یا جنت و جہنم دونوں ایک ہی سکے کے دو رُخ ہیں۔

● فراقؔ صاحب کے چھوٹے بھائی شری پت سہاے نے ایک بار دورانِ گفتگو مجھ سے فرمایا کہ فراقؔ صاحب نے اپنی ماں سے بھی اچھا برتاؤ نہیں کیا۔ ایک مرتبہ والدہ میرے ہی یہاں موجود تھیں اور فراقؔ صاحب کسی مشاعرے سے واپسی پر وہاں آ گئے۔ جب والدہ صاحبہ کو معلوم ہوا کہ بڑے بھیا آئے ہیں تو وہ ساری بدل کر ملاقات کے کمرے میں منتظر بیٹھ گئیں۔ جب میں نے فراقؔ صاحب سے کہا کہ والدہ صاحبہ آپ کی منتظر ہیں تو کہنے لگے کہ وہ بڑھیا مجھ سے مل کر کیا کرے گی اور والدہ مایوس ہو گئیں برخلاف اس کے جب والدہ کا انتقال ہوا تو ان کے غم میں ایک نظم لکھ دی۔

● فراقؔ صاحب نے عرصہ دراز پہلے اپنی اہلیہ کو گھر سے نکال دیا تھا اور لڑکیوں سے بھی ان کا کوئی خاص رابطہ نہیں تھا اس کی وجہ درمیانی طور پر ایک شخص کی مداخلت تھی اور یہ وجہ فراقؔ صاحب کی کمزوری بن کر رہ گئی تھی اس لیے کہ ان کی روزمرہ کی زندگی نوکروں کے اختیار میں تھی۔ اکثر رات میں فراقؔ صاحب جب شراب پی کر واویلا کرتے تھے تو نوکر بھی اکثر انھیں گالیاں دیتے تھے اور اندھیرے میں ڈھکیل بھی دیتے تھے اور جب وہ کھانے کے لئے کچھ مانگتے تو انڈے کی جگہ آلو اُبال کر رکھ دیتے تھے اور کہتے تھے کہ انڈے فارم کے ایسے ہی آرہے ہیں۔ میری موجودگی میں جب ایسے واقعے پیش آتے تھے تو مجھے بہت دُکھ ہوتا تھا کہ ایک عظیم شخصیت اپنوں کے نہ ہونے کی وجہ سے نوکروں کے ہاتھوں کھلونا بن کر رہ گئی ہے۔

• فراقؔ صاحب عام طور پر صبح کو برآمدے میں ضرور بیٹھتے تھے۔ چائے پینے کے بعد عجیب محویت کے عالم میں سامنے باغ کی طرف نگاہیں اٹھ جاتی تھیں۔ ہمیشہ ہی انھوں نے درختوں اور پھولوں سے دلچسپی لی اور اس کی نگہداشت کے لئے ایک مالی مقرر تھا۔ وہ باغ کی دلکشی سے کافی دلچسپی لیتے تھے۔ چڑیوں کے چہچہانے کی گوش بر آواز ہو جاتے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ چڑیوں کی نغمگی میں وہ کوئی کھوئی شئے تلاش کر رہے ہیں۔ ایسے عالم میں زیادہ تر خاموش رہتے تھے اور ایک دم سے کبھی واہ کہہ دیتے تھے۔

• مکان کے پچھلے حصے میں متعدد کبوتر پلے تھے۔ ان کے دانے کے مصارف بھی اچھے خاصے تھے۔ ایک دن نوکر نے کہا کہ صاحب کبوتروں کا خرچہ بلا وجہ بہت ہے اور کبوتر جس حصے میں ہیں اب اُدھر آپ جا بھی نہیں سکتے۔ اس لئے اگر آپ کہیں تو ان کو کسی کو دے دیا جائے۔ فراقؔ صاحب مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولے کہ یہ فطری حس کو نہیں سمجھ سکتا۔ اس کو کیا معلوم کہ کبوتروں کو ہر چند میں دیکھ نہیں سکتا لیکن ان کے اڑنے کی آوازیں تو سن سکتا ہوں۔ میں اسے یہ کیسے بتاؤں کہ کبوتر جس وقت گونجتا ہے اس کی لطیف آواز کتنی پیچ در پیچ گرہیں کھولتی ہے۔ وہ جس وقت اپنے خانے میں مادہ کو تیز آواز میں غوں غوں کرکے بلاتا ہے تو کبھی یہ آواز مجھے آوازِ جرس معلوم ہوتی ہے کبھی ساز و مضراب کی کشمکش سے بکھری ہوئی جھنکار، کبھی تیز ہوا سے لچکتی ہوئی شاخِ صندل، کبھی غم کی تلخ شیرینی، کبھی حال و مستقبل کے توازن کا برستا ہوا رنگ اور رفتہ رفتہ یہ آواز میرے دل کی دھڑکنوں میں ضم ہو جاتی ہے۔

• جوانی میں فراقؔ نے راتوں کی لذت کو محسوس کیا ہے یہ ان کے اشعار سے واضح ہے مگر آخر عمر میں ان کی راتیں بڑی بھیانک تھیں جو دوسروں کے لئے بھی تکلیف دہ تھیں اور خود ان کی ذات کے لئے بھی۔ نیند ان کو بہت کم آتی تھی۔ اگر شراب پی لیتے تو غل مچاتے تھے اور جب شراب نہیں پیتے تھے تو کسی باتیں کرنے والے کا پاس بیٹھنا بہت ضروری تھا اور باتوں میں زیادہ تر تمام شعرا کی برائی اور صرف اپنی برتری کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا تھا۔ ظاہر ہے جب روز کا یہ معمول بن جائے تو دوسروں کی برائی اور ان کی تعریف کے کتنے فرضی پہلو ڈھونڈے جا سکتے ہیں اس لئے عموماً قریب بیٹھنے والا زیادہ تر خاموش ہی رہتا تھا۔ ایک دن میں نے نیا گوشہ نکالتے ہوئے کہا کہ حضرت آپ

کی اچھی شاعری کے علاوہ میں نے آپ کے تخلص میں یعنی لفظ فراق میں ایک دھڑکن محسوس کی اور اس دھڑکن میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کائنات کی ہر شے اس میں متحرک ہے۔ لفظ فراق ایک ساز بھی ہے اور نغمہ بھی۔ اس معنویت کے علاوہ اس سے مستقبل کی بھی کرنیں پھوٹتی ہیں۔ چونکہ آپ مستقبل، حال اور ماضی کے نمائندہ شاعر ہیں اس لئے فراق تخلص فطرت کا ایک عطیہ ہے۔ فراق صاحب نے گردن ہلاتے ہوئے کہا کہ اس پر کبھی میں نے غور نہیں کیا لیکن آپ کے کہنے پر خیال آگیا کہ اس تخلص کے شاعر بہت کم ہوئے ہیں اور اگر کچھ گذرے بھی تو انھوں نے برائے نام شاعری کی ہے۔ شاید ان کا تخلص ان کے استادوں کا انتخاب ہو اور یہ بھی کوئی ضروری نہیں کہ عطیہ کوئی روشن نگینہ ہو لیکن میں نے اپنا تخلص خود نہیں انتخاب کیا تھا۔ اتفاقیہ طور پر ایک شعر میں یہ لفظ ضرور صرف ہو گیا اور میرے مزاج میں رچ بس گیا۔

● فراق صاحب کو بہت سی بیماریاں تھیں ان کے علاج کے سلسلے میں جو کوئی رائے دیتا تھا اس پر زیادہ تر عمل کرتے تھے۔ ایک زمانے میں پیشاب کی خصوصیات مرارجی دیسائی کے نام سے کافی منسوب ہو چکی تھیں۔ فراق صاحب کو کسی نے رائے دی کہ واقعی پیشاب کئی چیزوں میں فائدہ مند ثابت ہوا اور اپنا تجربہ بڑے دعوے کے ساتھ بیان کرتے ہوئے کہا کہ آپ کی ٹانگیں جو سکڑ گئی ہیں اگر پیشاب کی مالش ہو تو قطعی ٹھیک ہو جائیں گی۔ میں بھی اس وقت موجود تھا۔ زبان پر قابو نہ رہا فوراً بول اٹھا کس کے پیشاب کی مالش کی جائے خود بیمار کا یا کسی اور کا۔ فراق صاحب آنکھیں نچا کر بولے کہ جناب ہر بات کو ہنسی میں نہیں اڑانا چاہیے آخر مرارجی ڈیسائی بھی ہندوستان کا ایک بڑا لیڈر ہے یقیناً کچھ نہ کچھ تجربہ ان کا درست ہوگا۔ میں خاموش ہو گیا اور دوسرے ہی دن سے خود فراق صاحب کی ٹانگوں کی مالش انھیں کے پیشاب سے شروع کر دی گئی۔ پھر نہ پوچھئے گندگی اپنے عروج پر پہنچ گئی۔ دیکھنے والا برداشت نہیں کر سکتا تھا اور یہ سلسلہ بہت دنوں تک چلتا رہا۔ آخر نتیجہ وہی ہوا کہ ویسے جیسے تھے ویسے ہی رہے۔

● میں نے کئی دن بعد عرض کیا کہ آپ کو تو بہت سی بیماریاں ہیں اس لئے ممکن ہے کہ آپ کا پیشاب خراب ہونے کی وجہ سے فائدہ نہ ہوا ہو۔ میری سنجیدگی سے تیر بالکل نشانے پر بیٹھا۔

کہنے لگے یہ تو آپ نے ٹھیک ہی کہا کہ بیمار کا پیشاب بھی خراب ہی ہوگا اور اسی سے اطبا مریض کی بیماری کا اندازہ لگانے کے لئے پہلے پیشاب ہی منگواتے ہیں بلکہ تشخیص کا مدار بھی اسی پر ہوا کرتا ہے واقعی مجھ سے غلطی ہوگئی۔ تب میں نے ان سے کہا کہ اچھا پیشاب تو جب ہی دستیاب ہو سکتے ہیں جب پیشاب کے بینک قائم کئے جائیں۔ یہ سُن کر وہ خاموش ہوگئے ورنہ فوراً دوسری تجویز یہ ہوتی کہ کسی دوسرے کے پیشاب کی مالش ہو اور ممکن تھا کہ میرے ہی پیشاب پر طبع آزمائی شروع ہو جاتی۔

● ایک دن بیٹھے بیٹھے کہنے لگے کہ آپ کی پنشن کے بارے میں گورنر سے اگر کہوں تو کام فوراً ہو جائے گا۔ آپ ایک خط گورنر صاحب کو لکھیئے۔ میں نے حسبِ مراتب مع آداب والقاب خط لکھ کر سنایا۔ سُن کر کہنے لگے آپ نے جو القاب لکھے ہیں سب کاٹ دیجئے۔ وہ اگر سرکاری گورنر ہیں تو میں ادب کا گورنر ہوں۔ صرف بھائی لکھیئے اور بس سلام شوق۔

حسب الحکم خط لکھ کر گورنر صاحب کی خدمت میں بھیج دیا گیا اور چند ہی روز بعد جواب آ گیا کہ آپ تشریف لائیں، میں نے سب انتظام کر دیا ہے ہمہ تن منتظر ہوں۔ فراق صاحب جب گورنر ہاؤس پہنچے تو انتظامیہ کے ایک صاحب بڑے فخریہ انداز میں فراق صاحب سے فرمانے لگے کہ فراق صاحب آپ کے لئے وہی کمرہ رہائش کو رکھا گیا ہے جس میں فلاں مشہور فلمی اداکار ٹھہر چکے ہیں۔ فراق صاحب یہ سنتے ہی برہم ہو گئے اور مجھ سے فرمانے لگے میرا سامان گاڑی میں رکھئے۔ میں یہاں نہیں رک سکتا کسی نے یہ اطلاع گورنر صاحب کو دے دی کہ فراق صاحب خفا ہو کر واپس جا رہے ہیں' یہ سنتے ہی گورنر صاحب بہ نفس نفیس خود تشریف لائے اور پوچھنے لگے بھئی فراق کیا غلطی ہوگئی۔ فراق صاحب برہمی کے انداز میں بولے کہ جناب میرے لئے وہ کمرہ رکھا گیا ہے جس میں ہیجنے گویئے ٹکتے ہیں۔ گورنر صاحب حالات سے بے خبر تھے۔ بجائے اس کے کہ یہ پوچھتے کہ کون سا کمرہ گویئے کا ہے اور کس نے آپ کو اس میں ٹکنے کے لئے کہا ہے ' اپنی ذہانت کا ثبوت دیتے ہوئے بولے نہیں بھئی ان لوگوں نے غلطی سے آپ کو وہ کمرہ بتا دیا ہے آپ کے لئے تو مخصوص کمرہ ہے۔ فراق صاحب مسکراتے ہوئے مجھ سے بولے۔ کیوں مطرب کیسی رہی۔ حالانکہ کمرہ وہی تھا جس میں پہلے انتظام کیا گیا تھا صرف الفاظ اور لہجے کے الٹ پھیر سے خوش ہو گئے۔

● مشاعرے میں جب کوئی شاعر سامعین سے زیادہ دادِ تحسین وصول کرنے لگتا تو فراق صاحب سے یہ برداشت نہیں ہوتا تھا چنانچہ کامیاب شاعر کے پڑھنے کے دوران وہ ایسی آواز حلق سے نکالتے تھے، جس سے معلوم ہوتا تھا کہ جاڑے کے موسم میں آسمان پر قازیں آوازیں ملاکر بولنے لگیں۔ فطری طور پر ایسے عالم میں سامعین بجائے شاعر کا شعر سننے کے ان کی طرف متوجہ ہوجاتے تھے۔ نتیجے میں اس شاعر کا کلام خود اس کی فریاد ہوکر رہ جاتا تھا۔ بمبئی کے ایک مشاعرے میں جہاں تمام شعرا موجود تھے اس میں شاہجہاں بانو یاد بھی تھیں اور برابر فراق صاحب کی حرکات وسکنات پر نظر رکھے تھیں۔ جب یاد صاحبہ کا نام پکارا گیا تو مائک پر پہنچ کر انھوں نے سامعین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "اس مشاعرے میں جہاں اور معروف شعرا شرکت کررہے ہیں ہمیں فخر ہے کہ یہاں حضرت فراق بھی تشریف فرما ہیں۔" فراق صاحب نے اپنی انفرادیت کا جھنڈا بلند ہوتے ہوئے جو دیکھا تو خوش ہوکر فرمانے لگے۔ پڑھو یاد پڑھو۔ لیکن یاد صاحبہ نے اسی پر اکتفا نہیں کی بلکہ فرمانے لگیں کہ میں حضرت فراق کو عظیم شاعر کے علاوہ اپنا باپ سمجھتی ہوں اور یہ کہہ کر فراق صاحب کو مخاطب کیا کہ ابا! مطلع عرض کررہی ہوں۔ فراق صاحب ابا کا لفظ سن کر چونک پڑے اور کہنے لگے بھئی چوٹ دے گئی۔ اب 'ابا' بیٹی پر کیا ہوٹنگ کرے۔

● فراق کے جتنے بھی نوکر تھے وہ کسی دوسرے شخص کا وجود پسند نہیں کرتے تھے اور فراق صاحب مجھے روک روک کر اپنی تنہائی اور اداسی کو دور کرنے کے لئے رکھتے تھے لیکن نوکروں کو ان کی کمزوریاں معلوم تھیں۔ مثلاً ان کے میز پر رکھے دو پوسٹ کارڈ ہٹا دیئے اور جب دوسرے دن انھوں نے نوکروں سے پوچھا کہ یہیں پوسٹ کارڈ رکھے ہوئے تھے وہ کیا ہوئے؟ نوکر حسبِ عادت یہی کہہ دیتے تھے کہ صاحب دن بھر آپ کے پاس نہ معلوم کون کون آتا ہے' فلاں صاحب جو آپ سے باتیں کررہے تھے وہی اٹھالے گئے ہوں گے ہمارے کس کام کے وہ پوسٹ کارڈ؟ فراق صاحب یہ سننے کے بعد یقین کی منزلوں میں پہونچ جاتے تھے اور اتفاق سے وہ صاحب اگر دوبارہ آگئے تو پہلی بات فراق صاحب سے ان کی یہی ہوتی تھی کہ جناب اس دن آپ میرے دو پوسٹ اٹھالے گئے تھے اور یہ سب کچھ کہتے وقت وہ یہ بھی نہیں سوچتے تھے کہ وہ شخص کس اہمیت کا ہے اور کس معیار کا ہے۔ نتیجے میں بددلی کا وہ پہلو نکلتا تھا کہ آنے والا شخص جو ان کی دلچسپی کا باعث ہوتا تھا وہ دوبارہ گریز کرنے لگتا تھا۔

• ایک دن مجھ سے کہنے لگے جناب آپ مجھ پر بہت کرم کرتے ہیں کیا یہ ممکن نہیں کہ زیادہ تر مرے ہاں قیام کریں۔ اب میں نوکروں کی بدسلوکی اور بدتمیزی زیادہ برداشت نہیں کر سکتا۔

• میں ہمیشہ ان سے یہی کہہ دیتا تھا کہ میری ذمہ داریاں اتنی ہیں کہ زیادہ عرصے تک آپ کی خدمت میں رہنے سے قاصر ہوں۔ مگر نوکروں کو اس کے باوجود یہ احساس ہوا کہ ایسا نہ ہو کہ فراق صاحب کے مسلسل اصرار پر میں ہمیشہ رہنے کے لئے تیار ہو جاؤں' ایک آدھ دن قیام کے بعد میں لکھنؤ چلا آیا' یہاں پہنچنے کے بعد ہی مجھے نشور واحدی صاحب کے ہاتھ کا لکھا ہوا خط فراق صاحب کی جانب سے ملا کہ میں آج کل اخراجات کی بنا پر ٹوٹ گیا ہوں اس لئے جب تک میرا خط آپ کو بلانے کا نہ ملے آپ زحمت نہ کیجئے گا۔

• خط پڑھ کر بہت تعجب ہوا کہ فراق صاحب اس قسم کی تحریر مجھے لکھ ہی نہیں سکتے لیکن یقین یوں آ گیا کہ تحریر نشور صاحب کی تھی اور ظاہر ہے کہ نشور صاحب کوئی غیر ذمہ دار انسان نہیں تھے جو بغیر کسی پُر خواہش کے اپنی جانب سے لکھ دیں۔ فوراً خیال آیا کہ نوکروں کی کوئی نئی چال ہے لیکن اس کے باوجود مجھے بہت تکلیف ہوئی اور خودداری کو ٹھیس لگی اس لئے میں نے مکمل خاموشی اختیار کر لی۔ نئے نوکروں کے آنے جانے کی کوئی انتہا نہ تھی تھوڑے ہی عرصے میں ہر نوکر کچھ لے کر فرار ہو جاتا تھا۔

• اسی طرح ایک نوکر کے ساتھ اس کے گھر کی کچھ عورتیں آ کر رہنے لگیں اور رفتہ رفتہ اتنا قابو پا لیا کہ ایک کمرے میں فراق صاحب کو مقید کر لیا۔ ان دنوں فراق صاحب بہت سخت بیمار تھے۔ اخبار والے کے ذریعے مجھے تار بھجوایا کہ فوراً آ جایئے۔ تار ملتے ہی میں فوراً الہ آباد روانہ ہو گیا۔ سخت گرمی پڑ رہی تھی کسی صورت سے بینک روڈ پہنچا تو گھر بند ملا۔ سب طرف سے پکارا مگر کسی نے دروازہ نہیں کھولا بلکہ اندر سے ہنسنے کی آوازیں آتی تھیں۔ مجبوراً مکان کی پشت سے ایک درخت کے سہارے دیوار پر چڑھا گرمی کی شدت سے ہاتھ جل گئے' بہر حال کسی نہ کسی صورت آنگن میں اُتر گیا۔ چند عورتیں مجھے دیکھ کر گالیاں دینے لگیں۔ میں بغیر جواب دیئے فراق صاحب کے کمرے میں پہنچا تو دیکھا کہ بے حال پڑے ہیں' جسم میں نجاست لپٹی ہوئی ہے۔ پیچش کی وجہ سے اتنا کمزور ہو گئے تھے کہ میرے پکارنے پر مشکل سے بولے۔ میں انتہائی افسوس کے عالم میں ان کو دیکھتا رہا کہ اتنا بڑا شاعر ہے اور اس کی گھریلو زندگی ایک معمولی یا عام آدمی سے بھی بدتر ہے۔ پیسہ ہوتے ہوئے بھی بے دست و پا ہے۔ میں نے اسی وقت

پانی گرم کیا، سب کپڑے اتار کر روئی سے سارا جسم پونچھا، بستر بدلا اور دوسرے کپڑے پہنائے۔ جب ان کو قدرے سکون ہوا تو آنکھ کھولی اور پوچھا آپ کیسے آئے ہیں؟ عرض کیا دیوار پھاند کر۔

• دوسرے دن حکیم صاحب کو بلا کر دکھایا اور جب ان کی طبیعت کچھ ٹھیک ہو گئی تو انھوں نے فرمایا کہ کسی صورت سے ان عورتوں کو نکالئے۔ میں نے دوسرے ہی دن عزیز اللہ آبادی کی مدد سے جبراً ان عورتوں کو نکلوایا۔

• فراق صاحب نے بیان کیا کہ جوش صاحب جب میرے مہمان ہوتے تھے تو بہت بے تکلف طریقے پر رہتے تھے حالانکہ میری تنخواہ اس وقت اتنی نہیں تھی کہ میں ان کی خاطر و مدارات کر سکتا لیکن محبت ان کی اتنی تھی کہ میں نے اپنی پریشانی کا احساس انھیں کبھی نہیں ہونے دیا۔ جوش صاحب عام طور پر زمین کا فرش پسند کرتے تھے اور تین بجے دن ہی سے ان کے عقیدت مندوں کا تانتا شروع ہو جاتا تھا اور شب کے دس بجے تک چلتا رہتا تھا۔ ایک دن اتفاق سے بارش ہو گئی اور کوئی بھی نہیں آیا۔ میں اور جوش صاحب فرش پر لیٹے ہوئے تھے۔ میں نے عرض کیا، جوش صاحب میں نے بھی کچھ شعر کہے ہیں۔ جوش صاحب کہنے لگے بھئی میں اتنے دن سے تمہارا مہمان ہوں لیکن تم نے کچھ بھی نہیں سنایا۔
بھائی جوش صاحب، میں یہ گستاخی کیسے کر سکتا تھا کیوں کہ مہمان نوازی میں یہ چیز بد تہذیبی میں شامل ہے بلکہ میں خود اس کا متمنی رہتا ہوں کہ جس قدر زیادہ سے زیادہ آپ کو سن سکوں اتنا ہی میرے لئے بہتر ہے۔ آپ فرماتے ہیں تو عرض کرتا ہوں:

آج بھی قافلۂ عشق رواں ہے کہ جو تھا — وہی میل اور وہی سنگِ نشاں ہے کہ جو تھا
منزلیں گرد کے مانند اڑی جاتی ہیں — وہی اندازِ جہانِ گزراں ہے کہ جو تھا
تیرہ بختی نہیں جاتی دلِ سوزاں کی فراق — شمع کے سر پہ وہی آج دھواں ہے کہ جو تھا

جب تیسرا اور چوتھا شعر پڑھا تو جوش صاحب فرمانے لگے کہ بھئی فراق مطلع سن کر تو مجھے مایوسی ہوئی تھی اور جب دوسرا شعر سنا تو میرا ذہن مصرعہ طرح کی طرف گیا کہ میں بھی کچھ کہوں گا لیکن جب تم نے تیسرا اور چوتھا شعر پڑھا تو میں نے غور کیا کہ تم نے حدیں چھو لیں۔ اب میں اس میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ تیسرے اور چوتھے شعر کا تو جواب ہی نہیں۔ منزلیں گرد کی مانند اڑی جاتی ہیں، اس خیال کی

ترجمانی ہو ہی نہیں سکتی۔ اور اگر توجہ سے اس پر لکھا جائے تو ایک کتاب ہو سکتی ہے۔ شمع کے ہر بہ دعوں خیال کی بلندی کے علاوہ مشاہدے کی اہم تصویر کشی کے ساتھ زندگی اور نفسیات کا گہرا مطالعہ ہے۔

● جوش صاحب نے اپنی کتاب "یادوں کی بارات" فراق صاحب کو ڈاک سے بھیجی اور ساتھ ہی ایک خط بھی لکھا تھا اور خط پر پتہ یوں تحریر تھا۔ "پروفیسر فراق گورکھپوری امرد پرست شاعر برآمدے میں بیٹھا ہوا حقہ پی رہا ہوگا ۸/۴ بینک روڈ الہ آباد یو۔پی۔ ہندوستان۔ خط کا مضمون یوں تھا۔ فراق تم کو یادوں کی بارات بھیج رہا ہوں امید ہے کہ پسند آئے گی۔ میں نے اس میں اپنی زندگی کے صحیح خدوخال کی نشاندہی کی ہے۔ اپنی رائے کا اظہار ضرور کرنا۔ فراق صاحب نے خط سن کر کتاب مجھے دی اور کہا تھوڑی تھوڑی روز سنایئے گا اور اس کے بعد یہ سلسلہ شروع ہو گیا۔ کچھ عرصے کے بعد پوری کتاب فراق صاحب نے سن لی۔ ایک دن بیٹھے بیٹھے فرمانے لگے جوش کو جواب اور میری رائے لکھ دیجئے۔

"یادوں کی بارات کے جوش، میں نے داستان سنی واقعی بڑی دلچسپی کے ساتھ اتنا عمدہ جھوٹ لکھا ہے۔ جھوٹ اس لیے کہ ایک بڑا انسان واقعی اگر اپنی سوانح لکھتا ہے تو وہ عیوب جو اس کی ذات کو بھی داغ دار کر چکے ہیں وہ اس کو بھی بیان کرنے میں گریز نہیں کرتا لیکن تم نے جتنے بھی واقعات لکھے ہیں، چند کو چھوڑ کر صرف اپنی برتری کے یا دوسروں کو کمتر ثابت کرنے کے لئے تم نے اپنے عشق کے واقعات عورت کے بارے میں بہت کچھ لکھے ہیں مگر کوئی واقعہ تم نے اپنے مفعول ہونے کا نہیں لکھا۔....

میں نے ایک دن سوال کیا کہ آپ نے ابتدا میں اپنی شہرت کے لئے جہاں اور بہت ذرائع اختیار کئے وہاں اپنے بارے میں خود مضامین لکھ کر دوسروں کے نام سے چھپوائے، فرمانے لگے یہ باتیں اس وقت شاعر کو زیب دیتی ہیں جب اس میں کوئی صلاحیت ہو اور ابھرنے کا کوئی موقع نہ مل رہا ہو۔ جعفر علی خاں اثر کو لے لیجئے کہ وہ اپنی دولت اور افسر ہونے کی وجہ سے شہرت پا گئے۔

عام طور پر فراق صاحب شام کو چار بجے بہت لطف لے کر شراب پیتے تھے اور نوکر کو یہ تاکید ہوتی تھی کہ ان کے پاس موجود رہے لیکن نوکر اکثر میری موجودگی کا فائدہ اٹھا کر رات میں تو سینما چلے جاتے تھے اور دن میں گھومنے کے لئے نکل جاتے تھے۔ ایک شام کو شراب پینے سے پہلے انہوں نے نوکر کو آواز دی، میں نے کہہ دیا کہ وہ ترکاری لینے گیا ہے۔ میں تو موجود ہوں۔ کہنے لگے چلئے کوئی بات نہیں۔ اور

یہ کہہ کر پیگ پہ پیگ انڈیلنا شروع کر دیئے۔ پیگ بنا کر دینا میرا کام تھا۔ سامنے میز پر ایک پانی کی بوتل، شراب کی بوتل اور دو گلاس بھی رکھے رہتے تھے۔ ابھی فراق صاحب زیادہ مدہوش نہیں ہوئے تھے کہ دھوکے میں میں نے پانی کا گلاس ان کے مانگنے پر بڑھا دیا۔ ایک گھونٹ پیتے ہی کہنے لگے:

بجائے مئے کے دیا پانی کا گلاس مجھے سمجھ لیا ہے ساقی نے بدحواس مجھے

جب شراب بندی کا دور آیا تو مارے خوف کے شراب پینا چھوڑ دی کہ ایسا نہ ہو کہ نقلی شراب پینے سے موت واقع ہو جائے، چنانچہ صحت بھی ان کی چند دنوں میں کافی اچھی ہو گئی۔ ایک صاحب نے کہا کہ جناب آپ بغیر شراب کے آج کل کیا کر رہے ہیں؟ فرمانے لگے "دور تو جاری ہے فرق اتنا ہے کہ کوئی پیشاب پی رہا ہے اور میں زہرِ غم پی رہا ہوں۔"

● گھریلو اخراجات میں کبھی تو ایک ایک پیسہ کا حساب روز لکھتے تھے اور کبھی مزاج کی کیفیت یہ ہو جاتی تھی کہ کچھ بھی خرچ ہو جائے تو کوئی فکر نہیں۔ جب کوئی مہمان ہوتا تھا تو اس کی خاطر میں کبھی گریز نہیں کرتے تھے اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اپنے لئے کچھ اور ہو اور مہمان کیلئے کچھ اور بلکہ نوکروں کو ہدایت کرتے تھے کہ دیکھو کوئی تکلیف نہ ہونے پائے۔

ایک صاحب نے مجھ سے شکایت کی کہ فراق صاحب بہت محسن کش انسان ہیں، میں نے ان کو ایک شیروانی کا کپڑا لا کر دیا اس کے علاوہ بھی خدمت کرتا رہا لیکن اس شخص نے ایسا فراموش کیا جیسے کچھ بھی یاد نہیں۔ میں نے ان سے عرض کیا کہ آپ صحیح معنوں میں فراق صاحب کی طبیعت کا جائزہ نہیں لے سکے۔ آپ کے احسانات کو وہ عمداً بھول گئے یہ آپ کا خیال ہے اول تو ان کا اقتضائے عمر دوسرے ان کے مزاج کی ساخت کہ وہ جہاں دوسروں کا احسان بھول جاتے ہیں وہاں یہ بھی خصوصیت ہے کہ وہ خود جس کے ساتھ کچھ سلوک کرتے ہیں اس کو بھی فراموش کر دیتے ہیں، اس سلسلے میں میرا اپنا واقعہ ہے کہ میری پنشن کے بارے میں لکھنؤ جا کر گورنر کے یہاں قیام کیا اور ان سے کہہ کر میری پنشن میں اضافہ کرایا لیکن میں نے کچھ عرصے بعد جب اس واقعے کا ذکر کیا تو ان کو بالکل یاد نہیں تھا۔ دراصل وہ ان فردعات کو زندگی کے کسی گوشے میں جگہ دینے کے قائل ہی نہ تھے۔

غزل

جگن ناتھ آزاد

اے دلِ ناداں! نہ کر تو نکتہ آرائی بہت ؛ بزم میں اہلِ نظر کم ہیں تماشائی بہت
خونِ دل قطرہ بہ قطرہ رائگاں بہتا گیا ؛ سچے جھوٹے آنسوؤں نے آبرو پائی بہت
کچھ نہ کچھ وقعت تو میں نے شعر سے پائی ضرور ؛ لیکن اس فن سے کھوئی ہے میری رسوائی بہت
تیری بے گانہ روی سے دل بڑی الجھن میں ہے ؛ میں یہ سمجھا تھا کہ ہے تجھ سے شناسائی بہت
آزما اک بار اب تو ہم فقیروں کا بھی ظرف ؛ طور پر تو ہو چکی ہے تجھ سے شناسائی بہت
رنگِ دنیا پر نہ مائل ہو سکا اب کیا علاج ؛ عقل تو اس سمت دل کو کھینچ کر لائی بہت
ہر قدم پر تھی سہارا میری نادانی مجھے ؛ کر گئی برباد داناؤں کو دانائی بہت
اب نگاہوں میں ہے انجامِ گل و انجامِ خار ؛ سیکھ لی دل نے جو طرزِ ناشکیبائی بہت
فصلِ گل آتے ہی گویا روئے آتش دیدہ تھی ؛ اہلِ گلشن نے مجھے زنجیر پہنائی بہت
رودمی و اقبال خود ہوتے ہیں مجھ سے ہم کلام ؛ کیوں نہ ہو محبوب مجھ کو میری تنہائی بہت

یوں تو اے آزاد! میری شاعری میں کچھ نہ تھا
اہلِ دل، اہلِ نظر نے کی پذیرائی بہت

غزل

امین اشرف

فرازِ جلوہ نہ راس آئے گا یہی ڈر تھا ؛ خیالِ گردِ سفر جن کو راستے بھر تھا
جو فاصلے سے ملا اپنے ہی برابر تھا ؛ اسے قریب سے دیکھا تو آسماں پر تھا
نہ آس ہوتی نہ کھلتا تضادِ دیدہ و دل ؛ رگِ گلو جسے سمجھے تھے لوگ خنجر تھا
شکست ساز بھی بگڑے ہوئے توازن سے ؛ کسی کسی نے سنا سر کا بوجھ دل پر تھا
ہے اس کے حسن کو نسبت ہر اک حسین شے سے ؛ الم شناس بھی ہوتا تو سب سے بڑھ کر تھا
مجھے تو ہوش نہ آیا کہ دیکھتا پھر سے ؛ وہ شوخیِ نگہِ ناز تھی کہ نشتر تھا

خوشا وہ خنکیِ شب نرم آنچ آتی تھی
وہ پیرہن بھی عجب شعلۂ معطر تھا

بوچھار — ڈارون عالم ارواح میں

ڈاکٹر یعقوب عمر

ڈارون عالم ارواح میں ٹہل رہا تھا اور نہایت غور سے یہاں وہاں اُڑتے ہوئے فرشتوں کو دیکھ رہا تھا۔ خصوصاً انکے پروں پر سے اسکی نگاہ ہٹ نہیں رہی تھی اُس نے عالم ارواح کے داروغہ سے بڑی منت و سماجت کی کہ وہ اُسے فرشتوں کے پروں کا قریب سے معائنہ کرنے کی اجازت دیدے۔ اُس نے ذرا گھور کر دیکھا تو ڈارون کی روح کو پسینہ آگیا۔ پسینہ آنے کے محاورے سے کہیں کوئی غلط فہمی نہ پیدا ہو اسلئے ہم وضاحت کر دیتے ہیں کہ روح بذات خود نہ نظر آنے والے ایک لطیف ہیولے سے شباہت رکھتی ہے چنانچہ پسینہ آنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا نہ ہمیں عالم ارواح کے لٹریچر کے متعلق کوئی علم ہے کہ ہم اسکی تصدیق کر سکیں بس یوں سمجھ لیجئے کہ بیچارے کی روح کو محاورۃً پسینہ آگیا ہوگا عادتاً نہیں اب مشکل یہ ہے کہ ہم اس دنیا میں بیٹھے بیٹھے عالم ارواح کا صرف تصور ہی کر سکتے ہیں کیونکہ وہاں جاکر تحقیق کرنے کے تصور سے ہی ہمارے دانتوں تلے پسینہ آجاتا ہے۔ اب آپ اسے مان ہی لیں، یہ نہ پوچھیں کہ دانتوں میں مسامات نہیں ہوتے تو پسینہ کہاں سے آسکتا ہے دوسرے دانتوں کے نیچے اوپر آگے پیچھے اگر کوئی چیز آسکتی ہے تو وہ لعاب دہن ہے اب اگر آپ یہ پوچھ بیٹھیں کہ لعاب دہن کے ہوتے ہوئے دانتوں تلے پسینہ کیسے آسکتا ہے تو ہم صرف بغلیں جھانکنے لگیں گے اور آپ کی کم ظرفی پر افسوس بھی کرینگے کیوں کہ پرانے زمانے کے لوگ تو کنویں جھکواتے تھے اور آپ ہیں کہ ہم سے بغلیں جھکواتے ہیں اور وہ بھی اس شدید گرمی میں جبکہ بغلوں کی مہک بلدیہ کی اُس کچرا اُٹھانے والی گاڑی سے بھی سبقت لے جانے کی کوشش کرتی ہے جو دو چار دن میں ایک مرتبہ میر عالم منڈی کا کوڑا کرکٹ اٹھانے آتی ہے۔

بہر حال بات نکلی تھی ڈارون سے اور وہ بھی عالم بالا کی برا ہو میر عالم منڈی کا جس نے ہمیں پھر آدم کی طرح جنت سے زمین پر لا پھینکا۔ ہاں تو آمدم برسر مطلب کہ داروغہ، عالم ارواح نے پھر ڈارون کو گھورتے ہوئے دیکھا اور کہا "ابھی تمہارا کلیجہ ٹھنڈا نہیں ہوا دنیا میں ایک شوشہ چھوڑ آئے تھے کہ انسان آدم کی اولاد نہیں بندر کی ترقی یافتہ شکل ہے اور جب سے آج تک دنیا اس گم شدہ دُم کے چکر میں ہے جو تمہاری تحقیق نے چھڑا دی تھی اور آج تک کسی کھدائی میں دستیاب نہیں ہو سکی ہے اب یہاں کیا تماشہ کرنا چاہتے ہو۔

تمہاری نیت بخیر معلوم نہیں ہوتی۔

کیا یہاں بھی کوئی شوشہ چھوڑنا چاہتے ہو۔" ڈارون نے کہا یہی تو مصیبت ہے کہ تم ابھی سے میری نیت پر شک کرنے لگے ہیں ——— ! میں تو صرف اپنے دل کو تسلی دینا چاہتا ہوں کہ کہیں فرشتے بھی اسی نسل سے تعلق تو نہیں رکھتے جو دُم جھڑ جانے کے فوراً بعد خلاء کی طرف نکل آئی ہو اور یہاں کی آب و ہوا سے انکے پر نکل آئے ہوں۔ داروغہ نے کہا کہ ایسا لگتا ہے تمہاری شامت آ رہی ہے انہ اللہ کو تو اہم تھوڑی

لڑوا دیا اب یہاں فرشتوں کو لڑوانا چاہتے ہو معلوم ہے حساب و کتاب سے پہلے جہنم میں پھینک دئے جاؤ گے۔ تمہاری خیریت اسی میں ہے کہ چپ چاپ پڑے رہو اتنے میں ارشمیدس کی روح بھی اس طرف نکل آئی۔ اُس نے جب یہ مکالمہ سنا تو کہنے لگا داروغہ جی خبردار اسے بالکل اجازت نہ دینا اس کم بخت کو سائنس کی ابجد تک معلوم نہیں کوئی اس ناخلف سے پوچھے کہ اصول ارتقا کی رُو سے جب بندر کی دم جھڑ گئی تو اسکا تمام بندروں پر اثر کیوں نہ ہوا صرف کچھ بندر ہی انسان کیوں بنے آج بھی دنیا کے جنگلوں میں جتنے بندر ملتے ہیں سب کے دم موجود ہے۔ اب ڈارون سے وہاں نہ ٹھہرا گیا بیچارہ چپ چاپ روحوں کے سمندر میں گم ہوگیا۔

غزل

شیوراج بہار

راستی جس بشر کا شیوا ہے ؛ میری مانند وہ بھی تنہا ہے
دورِ حاضر! یہ کیا تماشا ہے ؛ جس کو دیکھو وہی معمّا ہے
اِک نظر ہے کہ کیسے دیکھوں ؛ حسن نئو رنگ سے ہویدا ہے
ہو نہ جس کی بہار سب کے لئے ؛ وہ چمن کیا ہے تنگ صحرا ہے
کوئی خارا شکن نہیں ملتا ؛ سب کو شیشہ گری کا سودا ہے
میں ہوں آشوبِ ذات کا اخبار ؛ میرا پہلا شمارہ دُنیا ہے
بے جھجھکے مِل رہا ہوں میں سب سے ؛ کتنا ہموار اپنا رستا ہے
اپنی آواز سُن نہیں سکتا ؛ میرے اندر وہ شور برپا ہے

دِل کی جانب اشارہ ہو نہ بہار!
اُس نظر میں کوئی تقاضا ہے

روشنی

ناشی حیدری کانٹوی

علم و حکمت کی طلب میں تشنگی ہی روشنی ؛ بندگی میں عجز ہو تو بندگی ہی روشنی
وسعتِ فکرِ رسا کی جگمگاہٹ مرحبا ؛ روشنی ہی روشنی ہے روشنی ہی روشنی
مقصد معبود ظاہر خلقت آدم سے ہے ؛ کائناتِ رنگ و بو میں آدمی ہی روشنی
عشق استقلال ایماں عشق تسلیم و رضا ؛ عشق کی ضو باشیوں سے زندگی ہی روشنی
تیرگی میں دی اذاں جب فکر جوہر ساز نے ؛ ہوگئی ایمائے حق سے تیرگی ہی روشنی
جذبۂ عشق الٰہی میں اگر ہو پختگی ؛ فکر و احساس و شعور و آگہی ہی روشنی

میرے دعوی میں نہیں ناشی غلو کا شائبہ
گر خلاف [illegible] ہو تو شاعری ہی روشنی

ڈاکٹر یعقوب عمر

اے عینکِ مرحوم!

کس درجہ حسین اور نزاکت سے بھری تھی —— شیشے سے تراشی ہوئی تو ایک پری تھی
قسمت کی خرابی نے کیا تجھ سے بھی محروم —— اے عینکِ مرحوم
در دیدہ حسینوں کا تھا دیدار تجھی سے —— تھی آنکھ کی سب رونق بازار تجھی سے
لازم تھا میں تیرے لئے تو تھی مری ملزوم —— اے عینکِ مرحوم
سچ یہ ہے کہ ہر لمحہ حسینوں پہ نظر تھی —— پر راز نہ کھلتا تھا نظر اپنی کدھر تھی
بیباکیٔ دیدار سے اب ہوگیا محروم —— اے عینکِ مرحوم!
کالی تھی مگر رعب تھا یہ جاہ و حشم کا —— خورشید جہانتاب کو یارا نہ تھا دم کا
تو داغ جدائی مجھے دیگی نہ تھا معلوم —— اے عینکِ مرحوم!
آنکھوں سے قریں اور تھی ہمسایۂ کاکل —— دو چند ترے دم سے تھا چہرے کا تجمل
سر آنکھوں پہ رہنا تھا ترے بخت میں مرقوم —— اے عینکِ مرحوم!
پوشیدہ سیاہی میں عجب فیض سا تھا —— کھلتا نہ تھا یہ راز کہ اس پردے میں کیا تھا!
ٹیڑھی تھی کہ بھینگی تھی کہ تھی آنکھ ہی معدوم!! —— اے عینکِ مرحوم!!!

مچھروں کا لشکر

ڈاکٹر یعقوب عمر

شہر میں وہ مچھروں کا لشکر جرار ہے —— بلدیہ بھی ہار بیٹھی اسقدر یلغار ہے
کھولتے ہی منہ نہ یہ کمبخت گھس جائیں کہیں —— رات ہم معشوق سے بھی بات کر سکتے نہیں
ناک میں نمرود کی جو گھس پڑے ہوں بے جھجک —— انکو مچھر دانیاں روکینگی آخر کب تلک
اطلاع پہلے سے دیدیتے ہیں اپنے زور کی —— سائرن سے کم نہیں آواز انکے شور کی
کوئی سیچویشن ہو، کوئی موڈ ہو آتے ہی شب —— بے دھڑک گھستے ہیں مچھر دانیوں میں بے ادب

کاش ہوتی فوج انکی جرمن و جاپان میں —— تو الکشن ہی نہ ہوتا کارٹر ریگان میں
یہ ملٹری آیت اللہ عجم پا جائیں گر —— تو عراقی فوج آئیگی جہنم میں نظر
جنگجو افغانوں کو مل جائے جو یہ نسخہ کہیں —— پھر وہاں پر روسیوں کی فوج ٹکنے کی نہیں
خون کی اک بوند بھی اب جسم میں باقی نہیں
پھر بھی انکی یہ صدائے العطش جاتی نہیں

افسانچے

حسن نظامی کیرانی

جنٹل مین :-

دہرہ دون اکسپریس میں تل دھرنے کو بھی جگہ نہ تھی۔ میں بڑی مشکلوں سے تھرڈ کلاس کمپارٹمنٹ میں داخل ہوا۔ پورا کمپارٹمنٹ کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ مسافر ایک دوسرے پر سوار جیسے تھے۔ صرف ایک پورے برتھ پر ایک جوان جوڑے نے قبضہ کر رکھا تھا۔ عورت لیٹی ہوئی تھی اور مرد نیم دراز کسی انگریزی اخبار کے مطالعہ میں مشغول تھا۔ ان کے لباس، وضع قطع اور رکھ رکھاؤ ان کی امارت اور تعلیم یافتہ ہونے کی چغلی کھا رہے تھے۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ پورے کمپارٹمنٹ کے مسافر ایک دوسرے پر سوار تھے۔ ان کا ہلنا ڈولنا بھی دشوار تھا۔ لیکن کوئی بھی اس برتھ پر بیٹھنے کی ہمت نہ کر رہا تھا۔ آخر امارت اور انگریزی دانی سے خوف کھانا ہی چاہئے۔ میں نے سوچا کہ اگر میں اس شریف آدمی سے گزارش کروں تو مجھے بیٹھنے کی جگہ مل سکتی ہے۔ چونکہ میں لمبے سفر پر تھا اور کھڑے کھڑے سفر کرنا میرے لئے انتہائی دشوار تھا۔ لیکن میں بڑی مشکلوں سے اس تک پہنچنے میں کامیاب ہوا۔ لیکن میں نے جو کچھ دیکھا مجھے حیرت زدہ کرنے کے لئے کافی تھا۔ وہ شریف آدمی بڑے اطمینان سے الٹا اخبار پکڑے ہوئے اس کے مطالعہ میں غرق تھا۔

گبر سنگھ ـــ

حسن نظامی کیرانی

تھانیدار صاحب ایک رات اپنی دھرم پتنی سے اپنے اکلوتے بیٹے پنٹو کے مستقبل کے بارے میں بات چیت کر رہے تھے۔ تھوڑی دیر پہلے وہ ایک سیٹھ کی طرف سے دی گئی ایک مخصوص پارٹی اٹینڈ کر کے لوٹے تھے۔ ابھی تک ان پر فرانسیسی رم اور مس چمپا کلی کی ہوش ربا جوانی کا نشہ چھایا ہوا۔

"میں تو اپنے بیٹے کو ڈاکٹر بناؤں گی۔" ماں نے بے پناہ خوشیوں کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"نو... نو... نیور... پولس افسر کا بیٹا بھی پولس افسر ہی بنے گا۔" انھوں نے اپنا داہنا ہاتھ ہوا میں لہراتے ہوئے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ دس سالہ پنٹو جو اس وقت انگریزی کا سبق یاد کر رہا تھا اپنے والدین کی باتیں سن کر بولا۔ ساری ڈیڈا اینڈ مم میں ڈاکٹر بنوں گا نہ پولس افسر۔ "کیوں" تھانیدار صاحب نے اپنے بیٹے کو تعجب سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہمارے اسکول میں ٹیچرز سمیت سبھی کہتے ہیں کہ اس زمانے میں پولس اور ڈاکٹر دونوں جنتا کو لوٹتے ہیں" ــ پنٹو نے پولس اور ڈاکٹر پر زور دے کر کہا۔ "سب سالے جھوٹ بولتے ہیں"۔ تھانیدار صاحب نے پولس کی روایتی گرجدار آواز میں کہا

"پھر تم کیا بنوگے بیٹے؟" ماں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"شعلے والا گبر سنگھ ممی ــ" پنٹو نے بے دھڑک کہا۔

غزلیں

داؤد نصیب

ٹھہر بھی جایئے دامن کہاں چھڑا کے چلے
یہ کیا جگہ ہے کہاں آپ مجھکو لا کے چلے

ذرا سا اپنے کو محور سے کیا ہٹا کے چلے
تمام گردشِ دوراں کو وہ رُکا کے چلے

خوشی کی بزم میں ورنہ کہاں جگہ ملتی
غموں کے بھیڑ میں ہم راستہ بنا کے چلے

ہمارا حق ہے خوشی کے ہر ایک لمحے پر
غمِ حیات ترا ساتھ ہم نبھا کے چلے

چمن کی سیر میں کانٹے تو خیر کانٹے تھے
ہم اپنے آپ کو پھولوں سے بھی بچا کے چلے

اسی خیال میں کب ان کا سامنا ہو جائے
جہاں جہاں سے چلے ہم نظر جھکا کے چلے

ہوائے وقت بھی اس کو نہ دے سکی جنبش
وہ رہگذار میں ٹھوکر جسے لگا کے چلے

تمہارے نام سے کر کے چراغِ دل روشن
بڑے تپاک سے ہم سامنے ہوا کے چلے

نصیب دیتا رہا غم یہ غمِ جہاں لیکن
ہم ابھرے ہوئے محبت تھے مسکرا کے چلے

دل کسی کا ہو بہر حال یہ دیکھا ٹوٹا
زندگی جس نے تجھے ٹوٹ کے چاہا ٹوٹا

یہ ہیں ساغر کے یہ شیشے کے یہ غم کے ٹکڑے
ہم نے جس کو بھی ذرا ہاتھ لگایا ٹوٹا

وہی الجھن وہی آواز وہی بے چینی
ٹوٹ کر بھی نہ ترے درد کا رشتہ ٹوٹا

آج تک پیاس کی اک چیخ ہے میخانے میں
جام شاید کوئی صدیوں کا تھا پیاسا ٹوٹا

یوں تو محفل میں تری سینکڑوں دل تھے لیکن
ٹوٹنا جس کے مقدر میں لکھا تھا ٹوٹا

وقت نے جب بھی کسی کیلئے انگڑائی لی
میرے احساس کے ہر زخم کا ٹانکا ٹوٹا

یہ فقط اپنے سفینے کا مقدر تھا نصیب
پھر نہ طوفاں کوئی اٹھا نہ کنارا ٹوٹا

کسوٹی

کسوٹی کا مقصد تعمیری تنقید کی حوصلہ افزائی ہے تاکہ اس سے نہ صرف نئی نسل کے ادبا و شعراء استفادہ کر سکیں بلکہ تعمیری انداز فکر کی نشو و نما بھی ہو۔

جناب احمد ندیم قاسمی صاحب کی غزل پر کوئی تبصرہ نہیں آیا لہٰذا اس ماہ ہم پروفیسر عنوان چشتی صاحب کا خط اس عنوان کے تحت پیش کرتے ہیں۔ (ادارہ)

پروفیسر عنوان چشتی کا مراسلہ

صدر شعبۂ اردو۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ نئی دہلی

مکرمی

سلام و رحمت: "ذوق نظر" کا اکتوبر ۸۵ء کا شمارہ دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ 'ذوقِ نظر' علم و ادب کے ساتھ دین و انسانیت کا نقیب بھی ہے آپ 'ذوق نظر' میں جس اہتمام کے ساتھ مذہب اور تصوف پر مسلسل مضامین شائع فرما رہے ہیں' اس سے آپ کے دینی شغف کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس دور میں جہاں فلم اور مخربِ اخلاق افسانوی ادب اور دیگر خرافات کی یلغار ہے' ذوقِ نظر کا یہ انداز پسند آیا۔ جس کو صالح اور تعمیری رجحان کا نمائندہ کہا جا سکتا ہے۔ زیرِ نظر شمارے میں خواجہ شوق' فضا ابن فیضی' زاہد قادری علامہ نجم آفندی اور بشیر وارثی کا کلام پسند آیا۔ ڈاکٹر یعقوب عمر اور ڈاکٹر سید مجاور حسین کے مضامین نے متاثر کیا۔ ڈاکٹر یعقوب عمر ادبیات اور ادیبوں کو جس تاریخی اور سماجی پس منظر میں پیش کرتے ہیں' اس سے موصوف کے علمی تبحر کا اندازہ ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہر ماہ ذوقِ نظر کی منظومات اور مضامین پر ایک جامع' بے لاگ مگر مختصر جائزہ شائع کیا جائے۔ تاکہ لکھنے والوں کے ساتھ پڑھنے والوں کا صحیح ردِ عمل بھی سامنے آ سکے۔ علامہ اقبال پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور بہت کچھ لکھا جانا باقی ہے۔ محمد بدیع الزماں صاحب نے بالِ جبریل کی کی غزلوں پر جو کچھ لکھا ہے' اس سے اقبال کی غزل کی انفرادیت کا پتا نہیں چلتا۔ اقبال نے اگرچہ میدانِ عمل میں اپنا سفر روایت سے شروع کیا تھا لیکن ان کی غزل صوری اور معنوی دونوں سطحوں پر غزل کی روایت سے الگ نظر آتی ہے۔ ضرورت ہے کہ اُن کا تجزیہ کر کے بنیادی خصوصیات کا تعین کیا جائے اور اس سوال پر بھی غور کیا جائے کہ اقبال کی غزل نے بعد کی غزل پر اپنا اثر مرتب کیا ہے یا نہیں؟ اگر نہیں تو کیوں؟ — فضا ابنِ فیضی اس دور کے خوش فکر اور خوش گو شاعر ہیں۔ لیکن ان کی غزل کے مطلع میں ایطا ہے

دریائے جاں کم آب سہی' ڈوب جاؤں گا ؎ اب کے جو کوئی موج اٹھی ڈوب جاؤں گا

سہی اور اٹھی میں ایطا ہے۔ اس دور میں بعض لوگ فیشن کے طور پر عروضی' لسانی اور فنی اصولوں سے

انحراف کرتے ہیں۔ لیکن فضا ابنِ فیضی تو کلاسیکی دبستان کے شاعر ہیں۔ اگر انھوں نے بھی اس قسم کے نقائص کو روا کر لیا تو پھر غزل کی جمالیات اور احسن کی صحت و صداقت کا خدا حافظ ہے۔ ویسے فضا کی غزل خوبصورت ہے۔

"کسوٹی" کے تحت احمد ندیم قاسمی کی غزل دیکھ کر حیرانی ہوئی۔ احمد ندیم قاسمی اردو کے اُن جیالے شاعروں اور ادیبوں میں شامل ہیں، جن کا قلم زندہ ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ انھوں نے اردو کے دامن کو اپنی نظم و نثر سے مالا مال کیا ہے۔ لیکن یہ غزل تو کچھ "بناوٹی" سی محسوس ہوئی۔ اس میں وہ فنکاری اور نادرہ کاری نہیں، جو احمد ندیم قاسمی کے کلام کی بنیادی خصوصیت ہے۔ اس سلسلے میں میری یہ رائے ہے کہ آپ ہر ماہ ایک غزل کا تجزیہ (بلکہ بھرپور تجزیہ) شائع فرمائیے۔ حیدرآباد میں لکھنے والوں کی کمی نہیں۔ پروفیسر سیدہ جعفر، پروفیسر مغنی تبسم، پروفیسر ثمینہ شوکت، ڈاکٹر مجاور حسین رضوی اور دوسرے بہت سے ارباب فکر و فن موجود ہیں۔

مکتوبات

اس عنوان کے تحت خطوط کے اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں

پروفیسر جگن ناتھ آزاد کا خط

شعبۂ اردو۔ جموں یونیورسٹی۔ ۱۷ اگست ۱۹۸۵ء

محبی۔ آداب

ذوق نظر کے دو شمارے ملے۔ میں اس ماہنامے سے آشنا نہیں تھا اب اسے دیکھا تو پتہ چلا کہ یہ جریدہ بڑی محنت سے مرتب ہوتا ہے۔

تازہ شمارے میں علی احمد جلیلی اور ڈاکٹر رحمٰن ثاقب کے مضامین بہت پسند آئے ابھی اول سے آخر تک نہیں پڑھا یقیناً ابھی اور آبدار جواہر ریزے بھی سامنے آئیں گے۔

نیازمند۔ (پروفیسر) جگن ناتھ آزاد

پروفیسر شعیب اعظمی کا خط

شعبۂ فارسی۔ جامعہ ملیہ نئی دہلی۔ اکتوبر ۱۹۸۵ء

برادرم۔ سلام علیکم

ذوق نظر کا ہر شمارہ بڑے غور اور دلچسپی سے پڑھتا رہا ہوں۔ مضامین کا تنوع اس کا خاصہ

ہے ۔ ادب، شاعری، تصوف، تراجم اور شعراء کے کلام پر فنی اور علمی بحث اور انکا تجزیہ اس کے معیار کا بین ثبوت ہیں ۔ تازہ شمارے میں طب سے متعلق مضمون بھی خاصا کارآمد ہے ۔ حیدرآباد نے اردو زبان کی ترقی اور اسکے معیاری رسائل کو شائع کرنے میں ایک تاریخی اور مثالی کارنامہ انجام دیا ہے ۔ والسلام

(پروفیسر) شعیب اعظمی

ڈاکٹر نیر مسعود رضوی کا خط

ریڈر شعبۂ فارسی ۔ لکھنؤ یونیورسٹی

برادرم ۔ آداب

ماہنامہ ذوق نظر کے ادب نمبر میں "حضرت خواجہ معین الدین چشتی کا جہاد" اور "صادقین" دونوں مضمون بڑے شوق سے پڑھے ۔ پہلے سے مستفید اور دوسرے سے محظوظ ہوا رسالے کے سبھی مشتملات معیاری ہیں ۔ اگر ذوق نظر کی کتابت میں قلم اور خفی اور مسطر ۲۵ سطری کر دیا جائے تو اسطرح صفحات میں گنجائش بڑھ جائیگی اور رسالہ دیکھنے میں بھی اچھا معلوم ہوگا ۔

آپ کا (ڈاکٹر) نیر مسعود

جناب سید امین اشرف کا خط

شعبۂ انگریزی ۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

گرامی قدر ۔۔ سلام و رحمت

آپ کا ادبی مجلہ "ذوق نظر" انفرادیت، روحانیت و مادیت کا خوبصورت امتزاج ہے ۔ نعت و منقبت کے ساتھ خوبصورت غزلیں اور سنجیدہ ادبی مضامین کے ساتھ خالص مذہبی اور عارفانہ مضامین ۔ ستمبر کے پرچے میں جناب شارب ردولوی کا مضمون "حسرت کی شاعری میں حسی تلازمے" بطور خاص پسند آیا ۔ کسوٹی کے ذیل میں شاذ تمکنت کے اشعار کا تجزیہ کرنے کے سلسلے میں جو زبان زد عوام شعر پیش کیا گیا ہے وہ شہریار کا نہیں بلکہ بشیر بدر کا ہے[1] ۔ نیاز مند ۔۔ سید امین اشرف

([1] اس توجہ دہانی پر ہم ممنون ہیں قارئین تصحیح فرمالیں ۔ مدیر)

بچوں کا صفحہ

محمد عبدالحمید بادل

وقت بڑا انمول

جمال تھا تو ذہن کا تیز لیکن امتحانوں میں وہ اکثر تھرڈ پوزیشن پر کامیاب ہوتا تھا۔ اس کی وجہ تھی اس کی لاپرواہی اور کاہلی۔ اسے وقت کی قدر کرنا آتا ہی نہ تھا۔ جمال اکثر اسکول دیر سے پہنچتا۔ اس کی جماعت کے سبھی لڑکے ہوم ورک وقت پر کر کے استاد کو بتادیتے لیکن جمال کی سدا استاد کے ہاتھوں پٹائی ہوتی۔ اس کی کاہلی اور لاپرواہی کا یہ عالم تھا کہ وہ امتحان ہال میں بھی دیر سے پہنچتا۔ ویسے وہ ایک سیدھا سادا لڑکا تھا۔ گھر میں چونکہ وہ سب سے چھوٹا اور اکلوتا بیٹا تھا اس لئے وہ ماں باپ کی آنکھ کا تارا تھا۔ جمال کے والد بنک منیجر تھے اور والدہ دل کی مریضہ۔

جمال صبح آٹھ بجے تک سوتا رہتا وہ ماں کے جگانے پر بڑی مجبوری سے بستر سے آنکھیں ملتا ہوا اٹھتا تھا۔ اسے نہ وقت کی پروا ہوتی اور نہ ہی اسکول جانے کی فکر اسے دیکھ کر ایسا لگتا تھا کہ وہ اپنے ماں باپ پر اسکول جا کر احسان کر رہا ہے۔ امتحان اگر سر پر بھی ہوتے وہ اسکول سے آتا بستہ ایک طرف پھینک دیتا اور محلے کے پلے گراونڈ پر اپنا پسندیدہ کھیل کرکٹ اپنے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ کھیلنے نکل پڑتا۔ ماں کے لاڈ پیار کی بدولت وہ ماں سے بالکل ڈرتا نہ تھا حالانکہ وہ اپنی ماں کو بے انتہا چاہتا تھا۔ جب ماں اسے پڑھنے کو کہتی تو جمال کہتا "تم بے فکر رہو ماں ابھی امتحان تو کافی دور ہیں اس سال میں فرسٹ کلاس آؤں گا دیکھ لینا۔" البتہ جب گھر پر والد ہوتے تو وہ چپ چاپ کتاب کھول کر بیٹھ جاتا مگر جیسے ہی وہ گھر سے باہر نکلتے خود بھی ان کے پیچھے نکل پڑتا۔

ایک دن جب جمال اسکول سے گھر لوٹا تو ماں کو آرام کرسی پر سوتا ہوا پایا اسے ماں سے کاپی کے لئے پیسے لینے تھے۔ اس نے قریب پہنچ کر ماں کو آواز دی۔ لیکن لگتا تھا کہ وہ گہری نیند میں سو رہی ہے جمال کو کچھ عجیب سا لگا وہ اپنی ماں کو جھنجھوڑنے اور ماں، ماں کہہ کر زور زور سے پکارنے لگا لیکن یہ بھی بے سود ثابت ہوا تو جمال کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا اس کے ماتھے پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں آ کر جم گئی تھیں۔ اچانک جمال کے ذہن میں یہ خیال بجلی کی طرح کوندا کہ شائد ماں بے ہوش ہو گئی ہے۔

دفعتاً جمال کے والد گھر میں داخل ہوئے۔ اپنے والد کو دیکھتے ہی جمال نے رندھے ہوئے لہجے میں کہا۔ بابا اماں بے ہوش ہو گئیں۔ اچانک یہ خبر سن کر جمال کے والد تقریباً چیختے ہوئے بولے" پھر تم کیا کر رہے ہو جاؤ کہیں سے ڈاکٹر کو لے آؤ"۔ جمال دوڑتا ہوا گھر کے باہر چلا گیا۔

اس وقت دواخانے میں جمال کی ماں کا دو ڈاکٹر بند کمرے میں معائنہ اور ساتھ ہی علاج بھی کر رہے تھے۔ کمرے کے باہر جمال اور اس کے والد کا بڑا ہی عجیب حال تھا۔ جمال کی آنکھوں سے آنسو جھانک رہے تھے اس کا دل اپنی رفتار سے کہیں زیادہ تیزی سے دھڑک رہا تھا لیکن جمال کے والد خود کو ضبط کئے ہوئے تھے۔ جب ڈاکٹر والدہ کا پوری طرح معائنہ کیا تو جمال کے والد سے مخاطب ہو کر ایک ڈاکٹر نے کہا۔ "معاف کرنا آپ نے آنے میں دیر لگا دی۔ اگر تھوڑی دیر پہلے آپ لے آتے تو شائد ہم انہیں بچا لیتے۔"

جب جمال نے یہ سنا تو اس کا سر چکرانے لگا۔ تھوڑی دیر پہلے وہ آنسو جو اس کی آنکھوں سے جھلک رہے تھے۔ اب موتی بن کر ٹپ ٹپ زمین پر گر کر بکھر رہے تھے۔ جمال کے والد کو لگا جیسے دل کے ٹکڑے ٹکڑے ہو کر سینے میں بکھر گئے ہیں۔ اس وقت جمال اپنی ماں کی لاش کے قریب پہنچ کر پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔ اور اس کے والد اسے دلاسہ دے رہے تھے۔ ان کی آنکھیں بھی سرخ اور بھیگی ہوئی تھیں۔ ایک عجیب سا ماحول بن گیا تھا۔ جمال کے ذہن میں ڈاکٹر کے یہی الفاظ کسی گھنٹی کی طرح بار بار گونج رہے تھے کہ "اگر تھوڑی دیر پہلے آپ لے آتے تو شاید ہم انہیں بچا لیتے" اُسے آج معلوم ہوا تھا کہ وقت انسان کی زندگی میں کتنی اہمیت رکھتا ہے۔ وہ سوچنے لگا کاش آج میں۔۔۔، گھر جلدی آگیا ہوتا تو شائد میری ماں بچ جاتی نہ جانے کیوں اسے خود پر بے انتہا غصہ آرہا تھا۔ جمال کو آج پتہ چل چکا تھا کہ وقت کتنا قیمتی ہوتا ہے کتنا انمول ہوتا ہے۔

پیارے بچو! وقت کی قدر کروگے تو زندگی میں ہر جگہ کامیاب ہو گے۔ جو انسان وقت کی قدر کرنا نہیں جانتا وہ زندگی میں کبھی کامیاب ہو ہی نہیں سکتا۔ سچ مچ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کسی کام کو کل کے لئے رکھ چھوڑنا انسان کی سب سے بڑی نادانی ہے۔ کل تو کبھی آتا ہی نہیں۔

غزل

نکہتیں گُل کی ہیں، نسبت سے مہکتا میں ہوں ؛ روشنی اُسکی ہے فانوس میں جلتا میں ہوں
میں ہوں سورج کا نمائندہ اُجالوں کا سفیر ؛ روشنی ملتی ہے محفل کو پگھلتا میں ہوں
لوگ سائے کو مرے اوڑھ کے سوجاتے ہیں ؛ اور صحرا کی طرح دھوپ میں تپتا میں ہوں
جب عمل ہے تو کوئی ردِ عمل بھی ہوگا ؛ بے تھکن چہرے کی یہ احباب کے جلتا میں کھل
لغزشوں نے مجھے بخشا ہے شعورِ جادہ ؛ لڑکھڑاتا ہے کوئی اور سنبھلتا میں ہوں

اس تعلق کو حیات اب بھی نہ سمجھی دنیا
ہو خمار آنکھوں میں اُسکی تو بہکتا میں ہوں

غزل

مہدی۔ پرتاب گڑھی

لوگ جس راہ سے کترا کے گذر جاتے ہیں
لے کے نذرانۂ سر ہم تو ادھر جاتے ہیں

روشِ حسنِ وفا چھوڑنے والا خوش ہے
جتنے الزام ہیں سب میرے ہی سر جاتے ہیں

ہم نے ہر راہ میں کردار کی خوشبو چھوڑی
ہم زمانے سے یہ انداز کر جاتے ہیں

ہم جو خائف نہیں ہوتے کبھی تلوار وں سے
کسی کم ظرف کے احسان سے مر جاتے ہیں

لوحِ ہستی سے کبھی مٹتا نہیں نام ان کا
جیتے جی کوئی بڑا کام جو کر جاتے ہیں

آزمائش سے تو کتراتے ہیں فرزانے بہت
دار کو چوم کے دیوانے گزر جاتے ہیں

رات بھر جن سے سجاتا ہوں میں اپنی دنیا
صبح ہوتی ہے تو وہ خواب بکھر جاتے ہیں

موت سے پہلے ہی کچھ لوگ جہاں میں مہدی
دیکھ کر بارِ گراں خوف سے مر جاتے ہیں

(غیر مطبوعہ)

بزمِ سوال

(اس عنوان کے تحت قارئین کے دو علمی یا ادبی سوالوں کے جواب دیے جاتے ہیں)

س - تاریخ گوئی کی ابتدا کیسے ہوئی۔

ج - جہاں تک میرا مطالعہ ہے اس سلسلے میں کہیں واضح اور دو ٹوک بات نہیں ملتی لہٰذا قیاس اور مشاہدے کی بناء پر یہ گمان کیا جا سکتا ہے کہ اس فن کی ابتدا ایران سے ہوئی۔ فارسی سے یہ فن اُردو میں آیا۔

تاریخ گوئی کی ابتدائی مثالیں سلجوقی عہد سے دستیاب ہوتی ہیں لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس فن کی ابتدا سلجوقی دور کے آس پاس ہوئی ہوگی جبکہ یہ فن اپنی ابتدائی صورت میں تھا۔ نظامی گنجوی کی بعض مثنویوں کی تاریخ میں بے معنی حروف ابجد سے یہ کام لیا گیا ہے۔ جیسے جیسے اس فن میں ترقی ہوتی گئی با معنی الفاظ سے تاریخیں نکالی جانے لگیں۔ رفتہ رفتہ با معنی فقرے استعمال کئے گئے۔ مثلاً حافظ شیرازی کی تاریخ وفات "خاک مصلیٰ" کے فقرے سے نکالی گئی۔ قرآن مجید کے فقروں اور آیتوں سے بھی تاریخ نکالنے کی مثالیں عہد حافظ کے بعد مل جاتی ہیں چنانچہ مشہور شاعر جامی کی تاریخ وفات اس قرآنی ٹکڑے سے نکالی گئی۔ "ومن دخلہٗ کان آمنا"

تیموری عہد میں اس فن نے بے حد ترقی کی اور غالباً اس کے اصول و ضوابط وغیرہ تیموری عہد اور اسکے مابعد متعین ہوئے چنانچہ اس عہد سے ایسی تاریخیں ملنے لگتی ہیں جنمیں پورے مصرعے سے تاریخ برآمد ہوتی ہے مثلاً ؎

ہمایوں بادشاہ از بام افتاد

عہد مغلیہ کے اواخر میں یہ فن اپنی تمام جزئیات کے ساتھ اردو میں آیا اردو شاعری میں غالب و مومن نے تاریخ گوئی میں اپنی فنکارانہ صلاحیتوں کا بہترین مظاہرہ کیا ہے (تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو تحقیقی مقالہ "اردو غزل کے ارتقا میں فارسی غزل کا حصہ" جامعہ عثمانیہ لائبریری (غیر مطبوعہ)

س - یہ شعر کس کا ہے ؎

در فراقِ دارا حالم کمتر از یعقوب نیست

او پسر گم کردہ بود و من پدر گم کردہ ام

ج - یہ شعر شہزادہ دارا شکوہ کے بیٹے کا ہے۔ ایک مرتبہ اورنگ زیب نے احوال پرسی کی تو اس نے فی البدیہہ یہ شعر پڑھ دیا۔ اس شعر میں طنزاً اورنگ زیب کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کیونکہ دارا کا قتل اورنگ زیب کی وجہ سے ہی ہوا تھا چنانچہ دارا کے لڑکے سے احوال پرسی ہو نہ رہا گیا اور اس نے اپنا حال یوں بیان کر دیا کہ (ترجمہ۔ دارا کے فراق میں میرا حال حضرت یعقوبؑ سے کم نہیں ہے انھوں نے اپنا بیٹا کھویا تھا اور میں اپنا باپ کھو چکا ہوں)

قارئین سے استدعا

ذوقِ نظر کی بقا کیلئے ضروری ہے کہ قارئین بڑی تعداد میں سالانہ خریدار بن کر اس مشعلِ علم و ادب کی ضیا باریوں کو کم نہ ہونے دیں امید ہے کہ قارئین کرام توجہ فرمائینگے۔

آہ! ڈاکٹر حفیظ قتیل (۱۹۱۹ء — ۲۶ جنوری ۱۹۸۵ء)

آج پھر ٹپکے مری آنکھوں سے آنسو اس طرح ؛ اوس کی بوندیں برستی ہوں فلک سے جس طرح
میں ابھی بے کل تھا زور[1] و سروری[2] کے واسطے ؛ باقی[3] و سید[4] سے اہلِ آگہی کے واسطے
آج تک ڈوبی ہوئی تھی درد میں دل کی فضا ؛ کیا خبر تھی؟ پھر چلے گی ناگہاں غمگیں ہوا
دیکھتے ہی دیکھتے اک وقت ایسا آئے گا ؛ تجھ سا عالم بھی جہاں سے اے قتیل اٹھ جائے گا
تیری ہر تنقید معیارِ صداقت بن گئی ؛ تیری ہر تحقیق تاریخی حقیقت بن گئی
چاشنی علم و ہنر کی تھی تری تدریس میں ؛ حسنِ سیرت جلوہ گر گفتار کی تقدیس میں
کس قیامت کا تھا تیرا ذوق فطرت آشنا! ؛ تیری تخلیقِ ادب تھی کیسی ندرت آشنا!
تیری توضیحوں سے نظم و نثر کی عظمت بڑھی ؛ مومن و اقبال کے افکار کی رفعت بڑھی
تیری ہر تحریر ہے کتنی تنوع آفریں! ؛ تیرا اندازِ بیاں ہے کس قدر خاطر نشیں!

تو نہیں لیکن ترے آثار ابھی تک زندہ ہیں
عالمِ اردو میں تیرے فکر و فن تابندہ ہیں

(سعادت نظیر)

[1] ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور [2] پروفیسر عبدالقادر سروری [3] جناب عبدالقیوم خاں باقی [4] مولوی سید محمد صاحب

نوٹ:- استادِ محترم ڈاکٹر سید عبدالحفیظ قتیل ریڈر شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ کے حسب ذیل تنقیدی و تحقیقی مطبوعات ہیں:-

۱- غزل اور مسائل ۲- دیوان ہاشمی ۳- تحفۃ الشعرا ۴- میراں جی خدانما ۵- معراج العاشقین

غیر مطبوعہ کتب:-

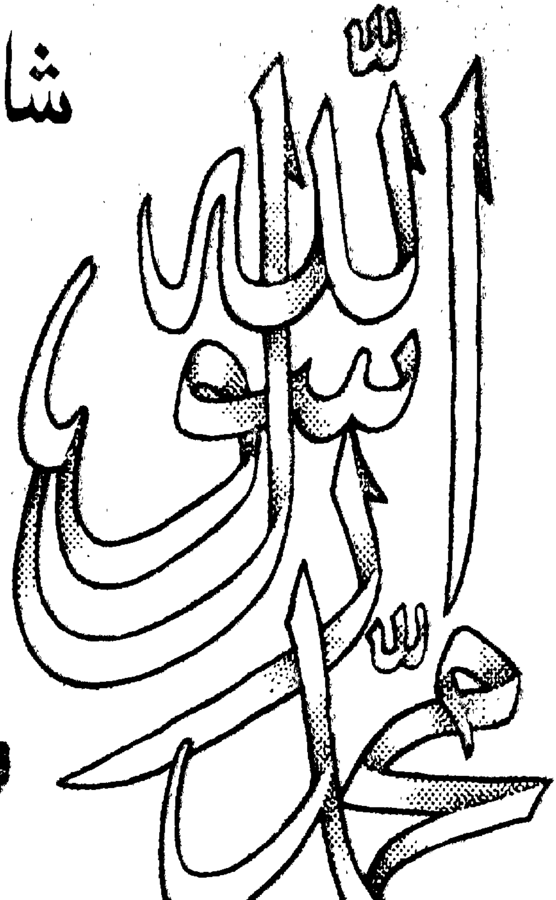
۱- دکھنی ریختی کا ارتقا ۲- قیس کی ریختی گوی ۳- دکھنی لوک گیت

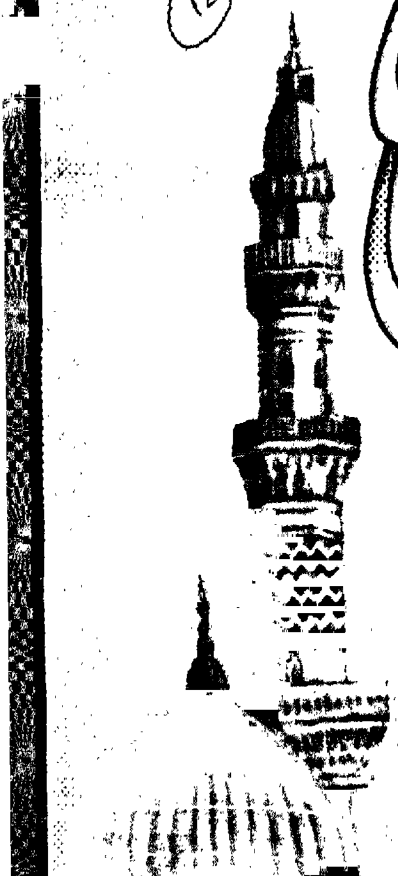
اسی طرح مرحوم کے ڈھیروں رشحاتِ قلم میں سے ذیل کے مضامین بہت فکر انگیز ہیں:-

۱- مومن کا مزاجِ شعری ۲- غزل اور نئی غزل ۳- غالب کا اجتہادِ فکر-

شافع محشر نمبر

(12)





ماہنامہ

ذوقِ نظر

حیدرآباد

"ذوقِ نظر"

"شافعِ محشر نمبر"

حیدرآباد | فون نمبر (525117)

جلد (۱) | دسمبر ۱۹۸۵ء | شمارہ (۱۲)

مدیرِ اعلیٰ:- محمد بشیر الدین بشیر وارثی

مدیرِ انتظامی:- خورشید جنیدی

مدیرِ اعزازی:- ڈاکٹر یعقوب عمر

ناظمِ نشر و اشاعت، عابد قادری

مشیرِ قانونی: محمد نعیم ایڈوکیٹ

مجلسِ مشاورت

ڈاکٹر عبد السّتار خاں

ڈاکٹر وحید اشرف

مبشّر احمد

علی احمد جلیلی

ڈاکٹر عقیل ہاشمی

زرِ تعاون: سالانہ پچاس ۵۰ روپئے فی شمارہ پانچ روپئے
عرب ممالک سے فی شمارہ ۵ ریال

بشیر الدین ایڈیٹر، پرنٹر اور پبلشر نے اعجاز پرنٹنگ پریس میں چھپوا کر دفتر ذوقِ نظر ۲۲-۸-۶۱۳ چھتہ بازار حیدرآباد سے شائع کیا۔

ترتیب

یا رب! میں تیری حمد و ثنا کیا کروں بیاں
شایانِ حمد ملتے ہیں الفاظ ہی کہاں
ذات و صفات بھی ترے مولا عجیب ہیں!
ہر چیز میں نہاں بھی ہے، ہر چیز سے عیاں!!

اُس کے آگے بہارِ جنّت کیا
جس کو کوئے مدینہ مل جائے
جذبِ کامل یہی تو ہے عابدؔ!
ہم سے پہلے ہمارا دل جائے

عابدؔ قادری

حرفِ آغاز

الحمد للہ آج ہم اسی متبرک ہستی کی یاد کے ساتھ ایک سال کی تکمیل کر رہے ہیں جسکو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے "ذوق نظر" کا پہلا شمارہ نکلا تھا۔

وہ دانائے سُبل، مولائے کُل، ختم الرُسل جس نے
غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیٔ سینا (اقبالؔ)

آج ساری دنیا جانتی ہے کہ کسطرح اس حکیم کامل نے غبار راہ کو وہ عظمت عطا کی اسکا ذرہ ذرہ نور ربانی سے منور ہو کر خورشید درخشاں کو شرمانے لگا قرآن مجید میں علم و حکمت اور قرآنی دانش و بینش کو اللہ تعالیٰ نے نور کہا ہے لہٰذا علوم دینی و دنیوی میں مسلمانوں (غبار راہ) نے جو عظمت حاصل کی وہ اسی اسلامی تعلیم کا نتیجہ تھا جس کے ماتحت حضورؐ نے علم کے سیکھنے اور سکھانے کی لاجواب ترغیبیں دیں یہاں تک کہ ان قیدیوں کو جو مفلس تھے اور فدیہ دیکر خود کو چھڑا نہ سکتے تھے ان کا فدیہ ہی تدریس قرار دیا کہ وہ مسلمان بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں تو انھیں آزاد کر دیا جائیگا۔

مسلمان عورتوں اور مردوں کو علم کی طرف وہ زبردست تحریص اور ترغیب کہ "ہر مسلمان مرد اور عورت پر علم کا حاصل کرنا فریضہ" قرار دیا۔ طلب علم کیلئے یہ انقلاب انگیز اعلان کہ "علم حاصل کرو چاہے تمہیں چین ہی کیوں نہ جانا پڑے" یہ حقائق ظاہر کرتے ہیں کہ دور دراز کا سفر بھی اگر اختیار کرنا پڑے تو بھی علم کا حصول اسلام میں عین سعادت ہے۔

اس انقلابی روح نے مسلمانوں کو میدانِ علم و فن میں جو قیادت اور امامت عطا کی اسکی مثالیں آج بھی یورپ کے کتبخانوں میں ملتی ہیں کہ مسلمانوں نے کسطرح فروغِ وادیٔ "سینا" حاصل کیا۔

آج بھی قوم کی بے نور آنکھوں کو فروغ وادی سینا سے روشن کیا جا سکتا ہے صبح کا بھولا شام کو گھر واپس آسکتا ہے۔ توہم پرستی کے طلسم کو توڑا جا سکتا ہے اگر حکیم کامل کے نسخے کو پوری سنجیدگی اور ہوشمندی سے بروئے کار لایا جائے تو یہ امت عرصۂ دنیا پر اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کر سکتی ہے۔

آج دنیا تباہی کے جس دہانے پر آ کھڑی ہے اخلاقی قدریں جس طرح پامال ہوئی ہیں انکے لئے اگر کوئی تریاق مہیا کر سکتا ہے تو یہی امتِ وسطیٰ ہے۔ علم دوسروں کے پاس پہونچ گیا مگر وہاں اسکی بے تقدیری اور بے احترامی نے اسی علم کو مغربی قوموں کیلئے مہلک بنا دیا۔ وہ نسخۂ کیمیا جو علم کو زندگی بخش اور انسانیت کیلئے سود مند بنا سکتا ہے دنیا کی کسی قوم کے پاس نہیں ہے

اور جس قوم کیلئے "غارِ حرا" سے اتر کر آنے والی ہستی "نسخۂ کیمیا" اپنے ساتھ لائی تھی وہ اسی سے بیگانہ محض ہو کر دنیا میں رسوا ہو رہی ہے۔ کاش اس قوم کے اہلِ دل [illegible] و منبر نشیں نوشتۂ دیوار پڑھ لیں اور اپنے "نسخۂ کیمیا" کو عملاً آزمائیں اُسے طاق و محراب و مسجد اور لوگوں کے جزدانوں کی زینت نہ بنائے رکھیں تو آج بھی اس "نسخۂ کیمیا" میں وہ انقلاب پوشیدہ ہے جو غبارِ راہ کو فروغِ وادیِ سینا عطا کر سکتا ہے شرط صرف اتنی ہے کہ اس حکیمِ کامل سے عہدِ وفا پھر استوار کیا جائے ۔

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں (اقبال)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حمد

خدا کے لئے حمد شایاں ہے سب ؛ یہ قدرت اُسی کی نمایاں ہے سب
نہیں بے سبب جب کسی کا ظہور ؛ مُسبّب ہے اسباب کا بھی ضرور
زمین و فلک کا تو مسجُود ہے ؛ ہیں مخلوق سب تو ہی معبود ہے
تجھی سے ہراک عقل کو برتری ؛ حدود و تعیّن سے خود تو بری
ترے فیض سے حُسنِ ادراک ہے ؛ عیوب و نقائص سے تو پاک ہے
ہراک شئے کی تو نے ہی کی ابتدا ؛ کوئی اس سے پہلے نمونہ نہ تھا
ہمیشہ سے ہے تو رہیگا تو ہی ؛ کہ ہے بعدِ کل رہنے والا تو ہی
غفور الرّحیم اور پرودگار ؛ تو آگاہ ہر چیز سے بردبار
بڑا دینے والا الٰہِ بزرگ ؛ تو بندوں کا پشت و پناہِ بزرگ
دمِ بندگی جب سے بھرتے ہیں ہم ؛ عبادت تری خاص کرتے ہیں ہم

ہمیشہ ترا فضل ہم پر رہے
دعا ہم کریں رُوح آمیں کہے

بشیر شاہ وارثی مرحوم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نعت شریف

افسرِ خیلِ حسیناں تاجِ شاہانِ جمال ؛ تو شہِ اقلیمِ محبوبی و سلطانِ جمال
پڑ گیا جس جس جگہ خونِ شہیدانِ جمال ؛ نکلے ایک اک قطرے سے تختہ تختہ گلستانِ جمال
لاکھ چمکیں بن سنور کر ماہرویانِ جمال ؛ سادگی پر اُنکی قرباں سازو سامانِ جمال
ایک یوسف پر نہیں موقوف اے سلطانِ حسن ؛ سب ترے زیرِ نگیں ہیں تاجدارانِ جمال
جمع ہے مدت سے دل میں خرمنِ ارمانِ دید ؛ آ اِسے بھی پھونک جا او برقِ تابانِ جمال
لطفِ گلشن دے رہی ہے عشق میں وحشت مری ؛ ہے رگِ گل مجکو ہر خارِ بیابانِ جمال
اے شہِ حسن اپنی خوبی کا تصدق اک جھلک ؛ تکتے ہیں دامن کو پھیلائے گدایانِ جمال
لاکھ خلوت ہو تو کیا گھونگھٹ ہے سدِّ راہ دید ؛ ساتھ پھرتی ہے حیا اُن کی نگہبانِ جمال
بے خودی کر دے نہ اُن کو محرمِ سرکارِ عشق ؛ پھر رہے ہیں کس ہوا میں میگسارانِ جمال
رحمتہ اللعالمیں جب ساقیٔ کوثر ہیں آپ ؛ پھر بھی کیا محروم جائیں تشنہ کامانِ جمال

کیوں نہ ہو بیدمؔ حسینوں کی ادا پر وہ نثار
پرورش پائی ہو جس نے زیرِ دامانِ جمال

علی احمد جلیلی

ولادت باسعادت

سوتے سوتے تھک گیا تھا نغمۂ حق ساز میں
شورِ باطل ظاہر و پنہاں تھا ہر آواز میں

سادہ ہر تصویر تھی، بے رنگ ہر افسانہ تھا
کفرِ عالم کا اندھیرا نور سے بیگانہ تھا

ہو رہی تھی عرش کو محسوس تنہائی ابھی
اک اداسی تھی زمین و چرخ پر چھائی ہوئی

اہلِ گلشن کو ملا ہی تھا نہ ذوقِ رنگ و بو
یعنی پھیکا تھا ابھی کلیوں کے عارض کا لہو

آبِ حیواں کے لئے تشنہ تھے لب ہائے سبو
کارواں کو تھی امیرِ کارواں کی جستجو

حق پرستوں کا کوئی جیسے ٹھکانا ہی نہ تھا
عشق کے سجدوں کا کوئی آستانا ہی نہ تھا

تنگیٔ داماں سے ہر ذرّہ تھا گھبرایا ہوا
اک اندھیرا تھا کہ تھا چاروں طرف چھایا ہوا

یک بیک ٹوٹا ستارہ ایک انجم زار سے
نکہتیں بکھریں اچانک خلد کے گلزار سے

گونج اٹھی سطحِ زمیں پر اک نوائے دلنشیں
بس گیا آکر زمیں پر رازِ قدرت کا امیں

وہ نبیؐ وہ کشتیٔ مسلم کا پہلا ناخدا
وہ نبیؐ وہ احمدِ مرسلؐ۔ محمد مصطفےٰ

ختم جس پر ہو گئی شانِ نبوت وہ نبیؐ
جس کے در پر آئی خود کھنچ کر رسالت وہ نبیؐ

وہ نبیؐ وہ رحمت و بخشش کا گہوارہ نبیؐ
وہ نبیؐ وہ عاصیوں کی آنکھ کا تارا نبیؐ

جو شہنشاہِ عجم، شاہِ عرب ہے وہ نبیؐ
رحمت اللعالمیں جس کا لقب ہے وہ نبیؐ

وہ نبیؐ منزل ہے مہر و ماہ جس کی وہ نبیؐ
سدرہ و طوبیٰ ہیں گردِ راہ جس کی وہ نبیؐ

مرحبا اس کی ولادت بن کے رحمت آئی ہے
امتِ عاصی کے حق میں خیر و برکت لائی ہے

توحید ورسالت کی جھلکیاں

اس اسلام کی بڑی نعمت توحید ہے۔ اسلامی توحید اسی پر کھلتی ہے جس پر رسالت کھلے بقول کسے توحید کی کنجی رسالت ہے اور رسالت کے سرتاج حضور کریم سیدنا محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے۔ وہ اللہ تعالےٰ کے محبوب ہیں اور حبیب اللہ صرف حضور والاہی کا لقب ہے۔ ان کی اتباع سے اتباع کرنے والے کو اللہ تعالےٰ کی محبوبیت حاصل کرنا ہوتی ہے۔ بالفاظ دیگر حضور کی سنتوں کی پوری پابندی کرنے والے کو اللہ تعالیٰ محبوب بنالیتا ہے۔ جنکی اتباع کا ثمر اللہ تعالیٰ کی محبوبیت ہے تو پھر اس ذات پاک کی محبوبیت کا کوئی اندازہ کر سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے نور سے حضور کریم کو بنایا۔ اور حضور کے نور سے یہ کائنات بنی ؎
افسانۂ حیات کا عنوان ہیں حضور ۔ یہ کائنات جسم ہے اور جان ہیں حضور

حضور ہی کے تشریف لانے سے عرب علاقوں میں کفر وشرک کی لعنت مٹی اور پھر چار دانگ عالم میں توحید کا غلغلہ بلند ہوا۔ حضور ہی کی تصدیق کا نام ایمان ہے۔ حضور کی ذات اقدس ایمان ہے اور آپ کو ماننے والے مومن ہیں۔ حضور کریم ایمان کے آفتاب ہیں اور اسی آفتاب کی ایک کرن کا نام ایمان ہے یہ کرن جس قلب میں پہنچتی ہے اسے منور کر دیتی ہے۔ صرف لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کہنے سے آدمی اسلام میں داخل ہوتا ہے۔ حضور کی محبت اور حضور کی عظمت پر ایمان کی بھی جان ہے ؎
قرآن ہے گواہ کہ ایمان ہیں حضور ۔ ایمان کہہ رہا ہے میری جان ہیں حضور

یہ دنیا اللہ تعالیٰ کی ہے اسی نے اسے بنایا ہے اللہ کی دنیا میں اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق زندگی گزارنی چاہئے اسی لئے کلام مجید میں وہ ضابطہ حیات بنایا گیا ہے اور اس ضابطہ حیات پر پوری طرح حضور اکرم نے پورا پورا عمل کر کے دکھا دیا۔ اور اللہ تعالیٰ نے حضور کریم کی ذات بابرکات کو عام مسلمانوں کے لئے نمونہ بلکہ بہترین نمونہ بنا دیا اب جو اسلامی زندگی گزارنا چاہے اسے سیرت مبارکہ کو پیش نظر رکھنا ہوگا اور قرآنی احکام کی حضور کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق پابندی کرنی ہوگی پس اسلامی زندگی وہی ہے جو سنت کے مطابق ہو۔ جب حضور اکرم کی محبت جزو ایمان ہے تو یہ جتنی بڑھے گی اسی قدر سنتوں کی پابندی آسان ہوتی جائیگی قاعدہ ہے کہ جس سے محبت ہوتی ہے دل اس کی نقل اتارنے کو پسند کرتا ہے اور اس سے اللہ تعالیٰ کی محبوبیت میں اضافہ ہوتا ؎
دل وجان سے جو ہو جائے تمہارا بزم عالم میں ۔ اسی کو کہتے ہیں اللہ والا یا حبیب اللہ

اسی لئے صوفیا فرماتے ہیں کہ اللہ والا وہی ہے جو محمد والا ہو جائے۔

اسی اطاعت اور اتباع میں اللہ تعالیٰ کی پسندیدگی کا شرف بھی پنہاں ہے اور اسی سے وہ زندگی نصیب ہوتی ہے جس سے فلاح دارین نصیب ہوتی ہے۔
اللہ تعالیٰ صحیح علم عطا فرمائے علم کے مطابق۔ اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور عمل میں اخلاص نصیب ہو سے
محمدؐ کی محبت دین حق کی شرط اول ہے، اسی میں ہو اگر خامی تو سب کچھ نامکمل ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اپنے حبیب پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی سچی غلامی نصیب فرمائے اپنی غلامی میں رکھے۔ اسی غلامی میں مارے اور اسی غلامی میں اٹھائے۔

این دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

مرزا شکور بیگ

نعت شریف

حسن کی واں ایک ایک ادا پر لوٹ رہے ہیں دیوانے
ایسا کیوں ہے۔ ویسا کیوں ہے سوچ رہے ہیں فرزانے
کعبہ کو دن رات میں جب بھی دیکھا یوں محسوس ہوا
شمع سی جیسے روشن ہے اور ٹوٹ پڑے ہیں پروانے
حج بھی کیا۔ طیبہ کو چلے۔ مکہ میں رکے اور یوں ٹھیرے
چلتے چلتے تھک کر جیسے بیٹھ گئے ہوں ستانے
ایک ہی میخانہ ہے ایسا جس میں لاکھوں میکش ہیں
پھر بھی ملا کرتے ہیں سب کو۔ پیمانے پر پیمانے
جن رندوں پر خاص کرم ہے طیبہ والے ساقی کا
پیر مغاں بن بیٹھے ہیں وہ کھول کے اپنے میخانے
اُن کی حقیقت کو پانا۔ انساں کے بس کا کام نہیں
نور سے اپنے جس نے بنایا ان کی حقیقت وہ جانے
دونوں جہاں کی محفل مرزاؔ صرف سجی ہے ان کے لئے
ایک حقیقت کی خاطر تیار ہوئے سب افسانے

خاکپائے سگ طیبہ
مرزا شکور بیگ مرزا

مفتی ضیاءؔ یار جنگ

نعتِ شریف

بہ گلشن جشنِ معراج است اے بلبل کجا امشب ۔۔۔ کہ ہر گل می نماید شاہدِ رنگیں قبا امشب

ز سبحان الذی اسریٰ ہویدا گشت بر عالم ۔۔۔ کہ گوید آشنا رمزے بگوشِ آشنا امشب

زہے خلوت کہ دارد طالب و مطلوب را باہم ۔۔۔ ز سوئے مصطفیٰ بیں تا نظر آید خدا امشب

شہود و غیب یکساں ست اینش پیشِ چشمِ بینائے ۔۔۔ کہ در یک لحظہ برہم زد نگاہش پردہ ہا امشب

ضیاءؔ این نعت را اگر عندلیبِ خوش نوا خواند

برآید از لبِ ہر غنچہ شورِ مرحبا امشب

خورشید جنیدی

نعت

نعتِ نبیؐ کا حوصلہ قرآن کی زبان
کیا لطف دے رہی ہے مسلمان کی زبان

پہچانتا نہ تھا کوئی ایمان کی زبان
چمکی نبیؐ کے نور سے انسان کی زبان

اقرارِ وصفِ احمدِ مختارؐ کے لئے
دل چاہیئے اویسؓ کا حسانؓ کی زبان

ایسے کروں میں نامِ حبیبِ خداؐ کا ورد
بن جائے خود یہی مری پہچان کی زبان

جب تک گدازِ عشقِ محمدؐ نہ ہو نصیب
تکمیل کو ترستی ہے ایمان کی زبان

اچھا ہوا کہ سُن لی رسولِ خداؐ کی بات
ورنہ سمجھ میں آتی نہ قرآن کی زبان

قوسین میں کہاں ہے سوال امتیاز کا
یکساں ہے میزبان کی مہمان کی زبان

بے نسبتِ رسولؐ ملے گی نہ مل سکی
احساس کے مزاج سے ایمان کی زبان

خورشید مجھ کو ربط ہے معروفِ کرخ سے
حصّہ میں آئی ہے مرے دربان کی زبان

ڈاکٹر سید مجاور حسین رضوی
ریڈر شعبہ اردو
سنٹرل یونیورسٹی۔ آف حیدرآباد

ندائے نجات انسانی!

اسلامی تاریخ کے کسی بھی رہنما پر قلم اٹھایئے۔ لکھنا آسان ہے! کہہ دیجئے۔ محمد کا غلام ہے اس کا شرف بڑھ جائے گا۔ بتا دیجئے محمد کا صحابی ہے۔ امتیازی صف پیدا ہو جائے گا۔ سمجھا دیجئے محمد کا اقرباء ہے۔ عقیدت و مودت پیدا ہو جائے گی۔ نسبت دے دیجئے کہ یہ فرشتہ اللہ کا پیغام محبوب الٰہی تک لانا تھا، اس کی عظمت میں اضافہ ہو جائے گا۔ لیکن ۔۔۔ قلم سکتہ میں ہے ۔۔۔ ! الفاظ پر کپکپاہٹ طاری ہے۔ ! تشبیہات و استعارات کو کمتری کا احساس ہے ۔۔۔ اس لئے کہ ۔۔۔ اس سراپا قدس اور پیکر نور کا تذکرہ ہے جس کی شعاعوں نے قطرہ کو قلزم اور ذرّہ کو مہر درخشاں بنا دیا جس کی انجمن میں اگر کوئی آیا تو انجم بن گیا۔ اگر نور کا قلم ہو تو لکھنے والا بھی سراپا نور ہو تو شاید اس کی معرفت کا حق ادا کر سکے ۔۔۔!

صاحبانِ عرفان کے لئے تو صرف اس مقدس، مطہر اور تاریخ عالم میں منفرد نام کی وہ اہمیت ہے کہ زبان پر آئے یا قلم لکھے تو گداز قلب پیدا ہوتا ہے۔ آنکھیں جذبۂ عقیدت سے نمناک ہو جاتی ہیں۔ یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ جیسے ہم ایک تخلیق و محبت کرنے والے رہنما کے حضور میں حاضر ہیں اور یہ حضوری نور و سرور پیدا کرتی ہے۔ حجابات اٹھتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں اور آگہی کی وہ دولت نصیب ہوتی ہے کہ راہ حیات بھی روشن و منور نظر آتی ہے لیکن ۔۔۔ اس معرفت کے حصول کے بعد قوت اظہار گنگ ہو جاتی ہے ؎

ہزار بار بشویم دہن ز مشک و گلاب
ہنوز نام تو گفتن کمال بے ادبی است

ایک ایسی واردات قلب پر گزر جاتی ہے جہاں صرف تصور جمال ہوتا ہے اور جہاں اپنے وجود کا احساس ہی فنا ہو جاتا ہے اور یہ محسوس ہوتا ہے۔ جیسے بارش انوار کا ایک قطرہ ہم بھی ہیں اور تب یہ احساس ہوتا ہے کہ اگر دنیا کو معجزہ کا تسلسل دیکھنا ہو تو صرف اسی نام کو زبان سے ادا کر کے دیکھئے! وجدان کو جو گرانمایہ سرمایہ حاصل ہوتا ہے وہ معرفت کا روشن ترین عنوان ہے مگر آج کی اس دنیا میں جہاں وجدان اور قلب و نظر، تزکیہ نفس اور طہارت باطنی کی گفتگو بھی گوارا نہیں ہوتی اور مادی عقل کی روشنی میں یا اپنے اعتبارات نظر کی بنیاد پر ہر شئے کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ شاید یہ باتیں بہت زیادہ متاثر نہ کر سکیں تو ان کے لئے صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ اس تاریخ ساز کیفیت کو اگر اپنے اعتبارات سے بھی کوئی دیکھنا چاہتا ہے تو اسے یہ احساس ہوگا کہ اس لحاظ سے بھی محمد الرسول اللہ

کا معجزہ آج بھی موجود ہے۔

۱۔ تاریخ میں معجزہ کا حضورؐ سے پہلے جو تصور ملتا ہے اس میں معجزہ، صاحبِ معجزہ کی ذات تک محدود ہے اور صاحبِ معجزہ کے اس مادی دنیا سے جانے کے بعد اس کا کوئی ثبوت نہیں رہ جاتا۔ آگ گلزار ہو جائے یا دریائے نیل میں راستہ پیدا ہو جائے یا مردے اللہ کے حکم سے زندہ ہو کر اٹھ کھڑے ہوں یہ معجزے صرف اسی حد تک محدود رہے۔ آج ہم ان معجزوں پر اسی لئے ایمان رکھتے ہیں کہ سرکارِ رسالتؐ اور قرآن نے تصدیق کر کے انھیں معتبر بنا دیا ہے۔

۲۔ تمام معجزات یا انسانوں کے وہ کارنامے جو عقل کو مبہوت و متحیر کر دیتے ہیں اُن سے آج کا انسانی ذہن مرعوب تو ہو سکتا ہے دولتِ آگہی نہیں حاصل کر سکتا لیکن حضورؐ نے جو معجزہ (قرآن) پیش کیا وہ معجزہ مسلسل ہے۔ اور تا قیامت باقی رہے گا۔ انبیاء کی تاریخ ہو یا معجزوں کا تذکرہ۔ یہ بات صرف سرکارِ دو عالمؐ کے ساتھ مختص ہے۔ آپؐ کا معجزہ مسلسل ہونے کے ساتھ ساتھ عقل کو عاجز کر کے احساسِ شکست سے آشنا کرنے کے بعد اس کی رہنمائی بھی کرتا ہے اور اسے جِلا بھی بخشتا ہے۔

۳۔ تاریخ میں جتنے بھی نظامِ فکر ہیں۔ وہ سب کے سب زندگی کے کسی ایک پہلو پر روشنی ڈالتے ہیں۔ یونان (افلاطون کے طلسم میں گرفتار نظر آتا ہے۔ ارسطو سیاسی، معاشی، اخلاقی پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کے ساتھ ساتھ طبیعاتی علوم پر بھی بحث کرتا ہے۔ اور اس کے بعد کے فلسفیوں کی کاوشیں ہوں یا دیگر مذاہب یا دورِ حاضر کے "ازم" زندگی کے ایک پہلو یا کچھ پہلوؤں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ لیکن کہیں بھی انسانی زندگی کے ہر پہلو پر قوانین و ضوابط نظر نہیں آتے۔ صرف اسلام میں یہ بات ہے کہ مہد سے لے کر لحد تک زندگی کے ہر پہلو پر محیط مکمل ضابطۂ حیات موجود ہے۔ یہاں تک کہ انسانی رشتوں کی قدر و قیمت کا کوئی تصور فلاسفۂ یونان سے لے کر دورِ حاضر تک کہیں نہیں ملتا۔ یہ صرف اسلام ہے جس نے ماں، باپ، بہن، بھائی، بیٹی، پھوپی، ماموں، چچا۔ یہاں تک کہ رضاعت کے رشتہ کا بھی تعین کیا ہے۔ لیکن اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ محسوس ہوتی ہے کہ کوئی بھی نظریہ پیش کرنے والا۔ (حضورؐ سے پہلے ہو یا بعد) صرف اگر کوئی کارنامہ پیش کر سکا تو یہی کہ خود اپنے نظریات پر عمل کر سکا اور ظاہر ہے کہ جب نظریہ ہی اکملیت کا حامل نہ ہو تو صاحبِ نظریہ کی زندگی کس طرح مکمل کہی جا سکتی ہے اور یہی سبب ہے کہ ہماری جانیں قربان ہوں حضرت عیسیٰ کے نام پر لیکن ہم ان کے عمل سے یہ نہیں معلوم کر سکے کہ بیٹے کا برتاؤ باپ کے ساتھ، باپ کا برتاؤ بیٹے کے ساتھ۔ بھائی کا برتاؤ بہن کے ساتھ کیسا ہونا چاہئے۔ لیکن سرکارِ دو عالمؐ نے اپنے عمل و کردار سے تمام نظریات اور اصولوں اور انسان کے باہمی تعلقات کا عملی پہلو بھی پیش کر دیا ہے اور اس طرح پیش کیا ہے کہ آپ کے بعد بھی عمل و کردار کا یہ نورانی سلسلہ باقی رہے گا اور اسی لئے یورپ کا مفکر حیران ہو کر کہتا ہے "انقلاب اقتدار کی تبدیلی کا نام ہے۔ لیکن محمدؐ نے جو انقلاب پیش کیا اس نے نہ صرف سماج کو بدل دیا تھا۔ بلکہ فکر کے پیمانے بھی بدل دیئے تھے۔

نہ زندگیاں بدل دی تھیں"۔ حالانکہ یہی یورپ کے مورخین اور کبھی کبھی غیر محتاط الفاظ استعمال کرنے والے اسلامی مورخین بھی یہ لکھتے ہیں کہ عرب میں جہالت کا دور دورہ تھا جب حضور مبعوث ہوئے۔ جس کے معنے یہ بھی نکلتے ہیں کہ جہالت عرب ہی میں تھی۔ دنیا کے دوسرے حصے میں نہ تھی۔ حالانکہ سچائی یہ ہے کہ صرف عرب ہی میں نہیں ساری دنیا جہالت جہالت و گمراہی کے اندھیرے میں گم تھی۔ سرکار دو عالمؐ نے خانہ کعبہ میں لات و منات و ہبل۔ و عزیٰ۔ یعوق و یغوث ہی کو نہیں توڑا تھا بلکہ انسانی فکر کے بھی جو صنم تراشے تھے۔ ان سب کو توڑا تھا۔ اور دنیا اس بات سے واقف ہے کہ پتھروں کے ٹکڑوں سے کہیں زیادہ خطرناک وہ اصنام فکر ہوتے ہیں۔ جو گمراہی پھیلاتے ہیں شاید یہی سبب ہے کہ سرکار دو عالمؐ نے بھی یہ ارشاد فرمایا کہ جس کے پاس فکر نہیں اس کے پاس دین نہیں۔ اور قرآن شریف میں بار بار دعوت فکر "تتفکرون" کہہ کر دی گئی اور ارشاد ہوا علیہ السلام نے یہ کہا کہ ایک لمحہ کی فکر صحیح ہزار دن کی عبادت سے بہتر ہے۔ فکر انسانی کو مہمیز کرنا اور عقل کی روشنی میں اپنے اعمال و افعال کا محاسبہ کرنا۔ یہ وہ کارنامہ ہے جس کی نظیر انسانی تاریخ میں نہیں تھی اور اسی نورانی فکر کا یہ بھی ایک اعجاز ہے کہ دنیاوی نظریات میں فرائض کی بات تو نظر آتی ہے مگر انسانی حقوق کا تذکرہ نہیں ملتا۔ پہلی بار دنیا اس سے آشنا ہوئی کہ انسانوں کے انسانوں پر بھی حقوق ہوتے ہیں .... اور ان حقوق کی نوعیت اجتماعی بھی ہوتی ہے اور انفرادی بھی۔
یہ بھی ایک دلچسپ مسئلہ ہے کہ اسلام سے الگ ہٹ کر جب آج کی دنیا نے جست کی تو اپنی دانست میں انسانی عظمت اور شناخت کے لئے حقوق کا ذکر بڑی شد و مد سے کیا مگر ایک طرف تو حقوق کی بات کرنے والے فرائض کو بھلا بیٹھے اور دوسری طرف ان کے یہاں طبقاتی بنیادوں پر یا اجتماعی سیاسی اداروں کی بنیادوں پر حقوق کا ذکر تو ملتا ہے لیکن کوئی نظریہ یہ بتانے سے قاصر ہے کہ فرد کے بھی حقوق ہوا کرتے ہیں۔ اولاد پہ ماں باپ کے بھی حقوق ہوتے ہیں۔ شوہر پہ بیوی کے بھی حقوق ہوتے ہیں۔ مسکین و یتیم و اسیر و ہمسایہ و مسافر کے بھی حقوق ہوتے ہیں۔ حضورؐ نے انسان کے انفرادی اور اجتماعی حقوق و فرائض کی نظریاتی و عملی تعبیر پیش کر کے انسان کی عظمت کی شناخت بھی کرا دی اور آنے والے ادوار کو لب کشائی کا سلیقہ بھی سکھا دیا کہ اپنے حقوق طلب کر سکیں۔

(۵) کوئی بھی نظریہ یا اصول صاحب نظریہ کے کردار سے پہچانا جاتا ہے۔ کردار میں اگر نقص ہے تو وہ مثالی نہیں بن سکتا اور اگر وہ مافوق الانسان ہے تو اس کا عملی پہلو خارج از امکان ہے۔ سرکار دو عالم کے لئے قرآن نے یہ بتا کر وہ تمہارے جیسا بشر ہے اس پہ مہر ثبت کر دی کہ سرکار دو عالمؐ کے کردار کی پیروی اور تاسی حدود امکان میں ہے۔ اور دوسری طرف آپ کا کردار اتنا مکمل کہ کمال کو بھی اس پہ رشک آئے۔ زندگی کے جس شعبہ میں ہدایت و رہنمائی حاصل کرنے کی تڑپ جاگ اٹھے حضورؐ کی سیرت مبارکہ میں اس کا نمونہ مل جائے گا۔ وہ حسن اخلاق ہو یا سخاوت و شجاعت یا عفو و درگذر یا صبر و رضا یا عبادت و ریاضت یا ذاتی زندگی کے آداب کا حسن ۔ ہر پہلو اتنا روشن اور تابناک ہے اور عقل کی کسوٹی پر اتنا کھرا اترتا ہے کہ اسے بھی معجزہ ماننے کے علاوہ کوئی چارہ باقی نہیں رہ جاتا

حضورؐ کی زندگی کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ جب آپؐ اور آپؐ کے اصحاب مشرکین مکہ کے درمیان رہے۔ ایک رُخ وہ بھی ہے جب مسلمانوں نے آپ کے حکم سے حبشہ میں ہجرت کی۔ ایک گوشہ وہ بھی ہے جب آپؐ نے ہجرت فرمائی اور تاریخ نے وہ منظر بھی دیکھا جب فاتح کی حیثیت سے آپ مکہ میں داخل ہوئے ۔ یہ تمام پہلو اس طرف متوجہ کرتے ہیں کہ بدلتے ہوئے حالات میں کس طرح اپنے اصول و نظریات پر قائم رہنے کے ساتھ ساتھ زندگی گزاری جاسکتی ہے۔ اور مصائب و شدائد کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے اور کس طرح ان سے بھی نباہ کیا جاسکتا ہے جن سے نظریاتی اختلاف ہو۔ دنیا کی تمام جمہوریتوں کے لئے سرکارِ دو عالمؐ کی حیاتِ طیبہ کے یہ گوشے آج بھی مشعلِ راہ بن سکتے ہیں۔

یہ سبھی بڑی وہ منزلیں اور یہ ہے عقل کا وہ تسلسل جو آج بھی دنیا کو اگر ایک طرف نجات کی بشارت دے رہا ہے تو دوسری طرف صاف صاف ڈرا رہا ہے کہ اگر فکر صحیح ہو اور تعقل کی بنیاد راستی پر ہو تو دنیاوی فلاح بھی ہے اور نجاتِ اخروی بھی۔ لیکن موجودہ دین کا انکار کرنے والا خود اگر عرفانِ نظر سے بیگانہ ہے تو پھر انجامِ دنیا اور آخرت میں تباہی اور ہلاکت ہے

سرکارِ دو عالمؐ نے کائنات کو ابدالآباد تک کے لئے دعوتِ فکر دی اور اپنی حیاتِ طیبہ کے نور سے راہِ زندگی کو منور کیا۔ انسان کو یہ بھی بتایا کہ وہ "احسن تقویم" ہے اور نیابتِ الٰہیہ کا مستحق۔ اور یہ بھی سمجھایا کہ وہ "اسفل السافلین" ہے اور اس کے لئے بھیانک عذاب منتظر ہے ۔!

آج بھی آسمان پر نمودار ہونے والا ہلال بلالؓ کی یاد دلاتا ہے اور بدرِ کامل اصحابِ بدر کے تذکرے دہراتا ہے یا دہراتا ہے اس بات کا ثبوت فراہم کرتا ہے کہ کسی انگلیوں کے اشارے نے اسے دو ٹکڑے نہیں کیا تھا بلکہ دنیا کو یہ بتایا تھا کہ حیاتِ انسانی کے دو رخ ہیں۔ اب اسے چاہے کفر و ایمان کہہ لیجئے چاہے حق و باطل یا نور و ظلمت یا تعقل و جہالت۔

حضورؐ کا بتایا ہوا راستہ ایمان کا، صداقت کا، حق کا، نور کا، یا تعقل کا راستہ ہے اور اسی راستے میں ساری دنیا کی نجات ہے۔

قطعہ

جب سجی ہو محفلِ ذکرِ خدا ذکرِ رسولؐ ٭ رحمتِ باری کا پھر کیونکر نہ ہو پیہم نزول
استقامت نیک بندوں کو وہ دیتا ہے بشیرؔ ٭ اولیاء اللہ کی طاعت خدا کو ہے قبول

بشیر وارثی

حضرت کامل شطاری

نعتِ شریف

سرتاجِ رسل، حضرتِ سلطانِ مدینہ
اے صلِّ علیٰ عظمتِ سلطانِ مدینہ

قرآن بھی ناطق ہے فقط میں نہیں کہتا
ہے طالبِ حق، طالبِ سلطانِ مدینہ

سمجھوں کہ مجھے ہو گیا دیدار خدا کا
ہو جائے اگر رویتِ سلطانِ مدینہ

اللہ دکھا دے تو میں دل چیر کے رکھ لوں
وہ صورتِ حق، صورتِ سلطانِ مدینہ

عشاق کی جنّت تو حقیقت میں وہی ہے
ہو جائے جہاں رویتِ سلطانِ مدینہ

صدقہ مرے سرکار کا کس نے نہیں پایا
کونین پہ ہے رحمتِ سلطانِ مدینہ

اس حال میں آرام سے میں جی نہیں سکتا
تڑپائے نہ کیوں فرقتِ سلطانِ مدینہ

کچھ فرق نہیں حبِّ خدا، حبِّ نبیؐ میں
ہے الفتِ حق الفتِ سلطانِ مدینہ

کامل سا گنہ گار بھی بخشا گیا دیکھو
اللہ غنی! نسبتِ سرکارِ مدینہ

نعت سرورِ کائنات

خدا دانی کہاں ممکن، شہِ ابرار سے پہلے
نہیں کلمہ مکمل آپ کے اقرار سے پہلے

کھلا نورِ ازل کب، مرکزِ انوار سے پہلے
کوئی معیار ہی ایسا نہ تھا سرکار سے پہلے

خدائی میں مقامِ مصطفائی ڈھونڈنے والو
خدائی خود کہاں تھی آپ کے اظہار سے پہلے

کرن اقرأ کی ابھر آئی اَو اَدنیٰ کی منزل تک
فرشتوں کو خبر کیا تھی حرا کے غار سے پہلے

یہ کیا کم معجزہ ہے، بعد میں قرآن آتا ہے
بنائی ہے فضا سرکار نے کردار سے پہلے

عطا کی عظمتِ آدم کو کس نے شانِ لولاکی
دو عالم میں بتاؤ ایک تو سرکار سے پہلے

شبِ معراج نے افکار کے دھارے بدل ڈالے
کوئی واقف کہاں تھا نور کی رفتار سے پہلے

لباسِ مشتِ گل میں ہے تجلی گنجِ مخفی کی
خدا سے جسکو ملنا ہو، ملے سرکار سے پہلے

دکھائینگے قدم آقا تو مر جاؤں گا قدموں پر
نہیں تو شوق، مرنا کس کو ہے دیدار سے پہلے

(خواجہ شوق)

کون؟

خدا کا آخری پیغام لانے والا کون
زمیں کو عرشِ معلیٰ بنانے والا کون

وہ کس کے در پہ جبیں کا کوئی سوال نہیں
ہے کون قاسمِ نعمت خزانے والا کون

ملی ہے جنکی غلامی سے عظمتِ شاہی
جہاں میں انسے ہے اونچے گھرانے والا کون

وہ کس کی سیرتِ انور نظامِ ہستی کا
عبادتوں کا طریقہ بتانے والا کون

یہ کس کے ہجر میں سانسیں درود پڑھتی ہیں
یہ ہر نفس ہے مجھے یاد آنے والا کون

وہ جس نے قطروں کو پہونچا دیا سمندر تک
زمیں کے ذروں کو انجم بنانے والا کون

وہ کون؟ جس نے دلائے حقوق رشتوں کے
ہے پستیوں سے بشر کو اٹھانے والا کون

انھیں کو رحمتِ عالم کہا ہے قرآں نے
علاوہ ان کے ہے رب سے ملانے والا کون

حیات انھیں سے کہو، التجا انھیں سے کرو
مدینے ان کے سوا ہے بلانے والا کون

(حیات وارثی)

جنابِ رسالت مآبؐ کا ادبی تبصرہ

حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عہد کی عربی شاعری کی نسبت وقتاً فوقتاً جن ناقدانہ خیالات کا اظہار فرمایا اُن کی روشنی صفحاتِ تاریخ کے لئے خطِ پاشان کا حکم رکھتی ہے۔ لیکن دو موقعوں پر جو تنقیدات آپ نے ارشاد فرمائیں اُن سے مسلمانانِ ہند کو آج کل کے زمانہ میں بہت بڑا فائدہ پہنچ سکتا ہے اس لئے کہ اُن کا ادب ان کے قومی انحطاط کے دور کا نتیجہ ہے اور آج کل انہیں ایک نئے ادبی نصب العین کی تلاش ہے شاعری کیسی ہونی چاہیئے اور کیسی نہ ہونی چاہیئے یہ وہ عقدہ ہے جسے جنابِ رسالت مآب صلعم کے وجدان نے اس طرح حل کیا ہے۔ امراء القیس نے اسلام سے چالیس سال پہلے کا زمانہ پایا ہے۔ روایت ہمیں بتاتی ہے کہ جناب پیغمبر صلعم نے اس کی نسبت ایک موقع پر حسبِ ذیل رائے ظاہر فرمائی۔ اَشْعَرُ الشُّعَرَاءِ وَقَائِدُهُمْ اِلَی النَّارِ یعنی وہ شاعروں کا سرتاج تو ہے ہی لیکن جہنم کے مرحلے میں اُن سب کا سپہ سالار بھی ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ امراء القیس کی شاعری میں وہ کونسی باتیں ہیں جنہوں نے حضور سرورِ کائنات صلعم سے یہ رائے ظاہر کروائی۔ امراء القیس کے دیوان پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں شراب ارغوانی کے دور عشق و حسن کی ہوش ربا داستانوں اور جاں گداز جذبوں، آندھیوں سے اُڑتی ہوئی پرانی بستیوں کے کھنڈروں کے مرثیوں، سنسان ریتلے ویرانوں کے دل ہلا دینے والے منظروں کی تصویریں نظر آتی ہیں اور یہی عرب کے دورِ جاہلیت کی کل تخیلی کائنات ہے۔ امراء القیس قوتِ ارادی کو جنبش میں لانے کی بجائے اپنے سامعین کے تخیل پر جادو کے ڈورے ڈالتا ہے اور ان میں بجائے ہوشیاری کے بے خودی کی کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حکیمانہ تنقید میں فنونِ لطیفہ کے اس اہم اصول کی توضیح فرمائی ہے کہ صنائع و بدائع کے محاسن اور انسانی زندگی کے محاسن یہ کچھ ضروری نہیں کہ یہ دونوں ایک ہی ہوں۔ یہ ممکن ہے کہ شاعر بہت اچھا شعر کہے لیکن وہی شعر پڑھنے والے کو اعلیٰ علیین کی سیر کرانے کی بجائے اسفل السافلین کا تماشا دکھا دے شاعری دراصل ساحری ہے اور اُس شاعر پر حیف ہے جو قومی زندگی کے مشکلات و امتحانات میں دلفریبی کی شان پیدا کرنے کی بجائے فرسودگی و انحطاط کو صحت اور قوت کی تصویر بنا کر دکھادے اور اس طور پر اپنی قوم کو ہلاکت کی طرف لے جائے۔ اس کا تو فرض ہے کہ قدرت کی لازوال دولتوں میں سے زندگی اور قوت کا جو حصہ اسے دکھایا گیا ہے اس میں اوروں کو بھی شریک کرے نہ یہ کہ اٹھائی گیرہ بن کر جو رہی سہی پونجی اُن کے پاس ہے۔ اس کو بھی ہتھیا لے۔

ایک دفعہ قبیلۂ بنو عبس کے مشہور شاعر عنترہ کا یہ شعر حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سنایا گیا۔

وَلَقَدْ اَبِیْتُ عَلَی الطَّوٰی وَاَظَلُّہٗ
حَتّٰی اَنَالَ بِہٖ کَرِیْمَ الْمَاْکَلِ

(ترجمہ) میں نے بہت سی راتیں محنت و مشقت میں بسر کی ہیں تاکہ اکل حلال کے قابل ہو سکوں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جن کی بعثت کا مقصدِ وحید یہ تھا کہ انسانی زندگی کو شاندار بنائیں اور اس کی آزمائشوں اور سختیوں کو خوش آیند اور مطبوع کر کے دکھائیں۔ اس شعر کو سن کر بے انتہا محظوظ ہوئے اور اپنے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ "کسی عرب کی تعریف نے میرے دل میں اس کا شوقِ ملاقات نہیں پیدا کیا لیکن میں سچ کہتا ہوں کہ اس شعر کے نگار ندہ کے دیکھنے کو میرا دل بے اختیار چاہتا ہے۔"

اللہ اکبر! توحید کا وہ فرزندِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم جن کے چہرۂ مبارک پر ایک نظر ڈال لینا ناظرین کے لئے دنیوی برکت اور اخروی نجات کی دوگونہ سرمایہ اندوزی کا ذریعہ تھا خود ایک بت پرست عرب سے ملنے کا شوق ظاہر کرتا ہے کہ اس عرب نے اپنے شعر میں اس کی گون کی بات کہی تھی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو عزت عنترہ کو بخشی اس کی وجہ ظاہر ہے عنترہ کا شعر ایک صحت بخش زندگی کی جیتی جاگتی، بولتی چالتی تصویر ہے۔ حلال کی کمائی میں انسان کو جو سختیاں اٹھانی پڑتی ہیں جو کڑیاں جھیلنی پڑتی ہیں اُن کا نقش پردۂ خیال پر شاعر نے نہایت خوبصورتی کے ساتھ کھینچا ہے حضور خواجۂ دو جہاں صلعم (بابی انت وامی) نے جو اس قدر شعر کی تعریف فرمائی اس سے صنعت کے ایک دوسرے بڑے اصول کی شرح ہوتی ہے کہ صنعت حیاتِ انسانی کے تابع ہے اس پر فوقیت نہیں رکھتی۔

ہر وہ استعداد جو مبدء فیاض نے فطرتِ انسانی میں ودیعت کی ہے اور ہر وہ توانائی جو انسان کے دل و دماغ کو بخشی گئی ہے ایک مقصدِ وحید اور ایک غایت الغایات کے لئے وقف ہے یعنی قومی زندگی جو آفتاب بن کر چمکے، قوت سے لبریز ہو، جوش سے سرشار ہو، ہر انسانی صنعت اس غایت آخرین کی تابع اور مطیع ہونی چاہیے اور ہر شے کی قدر و قیمت کا معیار یہی ہونا چاہیئے کہ اس میں حیات بخشی کی قابلیت کس قدر ہے تمام وہ باتیں جن کی وجہ سے ہم جاگتے جاگتے اونگھنے لگیں اور جو جیتی جاگتی حقیقتیں ہمارے گرد و پیش موجود ہیں (کہ انہیں پر غلبہ پانے کا نام زندگی ہے) ان کی طرف سے آنکھوں پر پٹی باندھ لیں انحطاط اور موت کا پیغام ہے۔ صنعت گر کو چنیا بیگم کے حلقۂ عشاق میں داخل نہ ہونا چاہیئے۔ مصورِ فطرت کو اپنی رنگا رنگ نگار آرائیوں کا اعجاز دکھلانے کے لئے افیون کی چسکی سے احتراز واجب ہے۔ یہ پیش پا افتادہ فقرہ جس سے ہمارے کانوں کی آئے دن تواضع کی جاتی ہے کہ کمال صنعت اپنی غایت آپ ہے۔ انفرادی، اجتماعی انحطاط کا ایک عیارانہ حیلہ ہے جو اس لئے تراشا گیا ہے کہ ہم سے زندگی اور قوت دھوکا دے کر چھین لی جائے غرض یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وجدانِ حقیقی نے عنترہ کے شعر کی خوبیوں کا جو اعتراف کیا اُس نے اصل الاصول کی بنیاد ڈال دی کہ صنعت کے ہر کمال کی صحیح شان ارتقا کیا ہونی چاہیئے۔"

ماخوذ
مضامین اقبال

تضمین بر نعت قدسی

ڈاکٹر یعقوب عمر

آدمیت تھی زسرتا با گنا ہوں میں دبی — تیری بعثت سے مٹی کفر کی تاریک شبی
سرِ ابلیس جھکا، ختم ہوئی بولہبی — "مرحبا سید مکی مدنی العربی
دل و جاں باد فدایت چہ عجب خوش لقبی"

کر رہا ہوں میں تری مدح و ثنا آج رقم — لکھ رہا ہوں دمِ شمشیر پہ آہستہ قدم
مرتبہ تیرا کہاں اور کہاں میرا قلم! — "نسبت خود بسگت کردم و بس منفعلم
زاں کہ نسبت بسگِ کوئے تو شد بے ادبی"

خاکِ طیبہ کو یہ قدرت سے ملا تھا انعام — چومتی تھی جو ترے پاؤں شب روز تمام
پھول صحرا میں کترتی تھی تری موجِ خرام — "نخلِ بستانِ مدینہ ز تو سرسبز مدام
چشمِ رحمت بسوئے ما بکن از بے سببی"

کی ترے واسطے اللہ نے دنیا پیدا — رنگ و بو گل کو ملے، چاند ستاروں کو ضیا
وجہِ تخلیق، دو عالم کا شرف تجھکو ملا — "نسبتے نیست بذاتِ تو بنی آدم را
بہتر از آدم و عالم تو چہ عالی نسبی"

بوجھ سر پہ ہے گناہوں کا نہ ڈوبے لیکن — کون ساحل سے لگائیگا سفینہ کہے کر
ایک تیرا ہی وسیلہ ہے فقط لے دیکر — "چشمِ رحمت بکشا سوئے من انداز نظر
اے قریشی لقبی ہاشمی و مطلبی"

سینکڑوں سال سے قدرت کا یہی ہے دستور — حد سے بڑھ جائے سیاہی تو کرے نور ظہور
ظلمتِ کفر ہوئی ایک ہی پل میں کافور — "ذاتِ پاکِ تو چو در ملکِ عرب کرد ظہور
زاں سبب آمدہ قرآں بزبانِ عربی"

تیرے قدموں سے حرم میں ہوا تبدیل کنشت — دور تھے تجھ سے کہاں خلدِ بریں باغِ بہشت
دیکھتے رہ گئے جتنے بھی تھے پرواز سرشت — "شبِ معراج عروجِ تو ز افلاک گذشت
بمقامے کہ رسیدی نرسد ہیچ نبی"

ہم سکندر تو نہیں، ہیں جو بکیں خضر کے بات اپنی منزل کا پتہ ہے ہمیں لیکن ھیہات
جس طرف دیکھئے تا حدِ نظر ہے ظلمات "ماہمہ تشنہ لبا نیم د توئی آبِ حیات
رحم فرما کہ ز حد میگزرد تشنہ لبی"

ہورہی تھی تری تخلیق ازل میں جس دم "حسنِ یوسف، دمِ عیسیٰ، یدِ بیضا" تھے بہم
پھر بھی لگتا تھا کچھ ایسا کہ کوئی چیز ہے کم! "من بیدل بجمالِ تو عجب حیرانم
اللہ اللہ چہ جمال است بدیں بوالعجبی"

دے رہا ہے یہی آواز نقیبِ قلبی ہجر ہے دشمنِ جاں اور رقیبِ قلبی
جاں بلب ہے ترا بیمار حبیبِ قلبی "سیدی انت حبیبی و طبیبِ قلبی
آمدہ سوئے تو قدسی پئے درماں طلبی"

نعت شریف

دیکھئے نورِ محمد کا اثر چاروں طرف ؛ ہے نگاہِ مردِ مومن معتبر چاروں طرف
کہہ رہی ہے روشنی شمس و قمر کی پھیل کر ؛ نورِ پاکِ مصطفیٰ ہے جلوہ گر چاروں طرف
راز اِنّی جاعلٌ فِی الارض سے ظاہر ہوا ؛ اس جہاں میں تو ہی تو ہے مقتدر چاروں طرف
اپنی صورت پر بنا کر بخشدی اپنی صفات ؛ خود تو ہے پردے میں اور ہیں جلوہ در چاروں طرف
ہو گیا ثابت کہ کعبہ مرکزِ انوار ہے ؛ سجدہ گاہِ خلق ہے خالق کا گھر چاروں طرف
کل جہاں مصروف ہے حمدِ خدائے پاک میں ؛ اور ہے ذکرِ نبی شام و سحر چاروں طرف
آبرو رکھ لی حسینؑ ابنِ علیؑ نے دین کی ؛ اُڑ رہا ہے پرچمِ فتح و ظفر چاروں طرف
یا محمدؐ مصطفیٰ اب وقت ہے امداد کا ؛ ہر مسلماں ہے پریشاں دربدر چاروں طرف

ہے بشیرِ وارثی کی یہ دعا اللہ سے
قلبِ انساں دین سے ہو بہرہ ور چاروں طرف

(بشیر وارثی)

ڈاکٹر سید عقیل ہاشمی

شجاعت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

قدرت کی عطا کردہ ہزار نعمتوں میں سے انسانی محاسن خمسہ کے ساتھ ساتھ جسمانی قوت و طاقت کی فراوانی اعضاء و جوارح کی مضبوطی و توانائی بھی ایک ایسی بیش بہا نعمت ہے جو ہر کس و ناکس کو اس کے قول کے مطابق ملتی ہے۔ اس قوت میں کمی بیشی ممکن ہے یعنی جسمانی نشوونما بالیدگی کے ہمراہ قوت جسمانی کا بھی بڑھنا لازمی و ضروری ہے مگر بسا اوقات صحت کے اصول سے غفلت بھی اس طاقت کے انحطاط اور زوال کا باعث بن جاتی ہے۔ دراصل یہ قوت و طاقت جو فضل یزدانی ہے جدا نہیں حق تعالیٰ کے بتائے ہوئے طریق پر استعمال کی جائے تو یقیناً سودمند ثابت ہوگی۔ چنانچہ اس طاقت کے مضرات کے بارے میں قرآن مجید میں بتایا گیا ہے واعدوا لهم ما استطعتم من قوة۔ (پ ۱۰ سورہ انفال) ترجمہ۔ یعنی دشمنوں کے مقابلہ کے لئے اپنے اندر جس قدر قوت پیدا کر سکتے ہو پیدا کرو کیونکہ اگر تم ضعیف و کمزور ہو گئے تو دشمن پر کس طرح غلبہ پا سکو گے شاید اسی کا نام شجاعت بھی ہے۔ شجاعت کے لغوی معنی بہادری دلیری اور جواں مردی کے ہیں ایسی بہادری و جانبازی جو عقل اور صحیح رائے کے تابع ہو خواہ مخواہ اپنی جان کو ہلاکت میں ڈالنے کا نام شجاعت نہیں۔ ارشاد حق تعالیٰ ہے ولا تلقوا بایدیکم الی التهلکة اپنے کو اپنے ہاتھوں سے ہلاکت میں مت ڈالو۔ علامہ قاضی میاں نے کتاب الاخلاق میں شجاعت کی یوں تعریف فرمائی ہے۔

الشجاعة فضيلة قوة الغضب وانقيادها للعقل یعنی قوت غضبی کی زیادتی اور اس کے تابع عقل ہونے کو شجاعت کا نام دیا جاتا ہے۔ بالفاظ دیگر یہ ایک ایسا وصف ہے جو اپنے پیش نظر ایک اعلیٰ مقصد رکھتا ہے اور اس میں انسان کے کردار کی تشکیل بھی ہوتی ہے چنانچہ علامہ شبلی نعمانی نے سیرۃ النبی میں لکھا ہے کہ یہ وصف انسانیت کا اعلیٰ جوہر ہے اور اخلاق کا سنگ بنیاد بھی۔ عزم و استقلال، حق گوئی، راست گفتاری، صاف دلی یہ تمام باتیں شجاعت ہی سے پیدا ہوتی ہیں۔ اس طرح اعلیٰ کردار انسان کے لئے شجاعت کا وصف بھی ضروری ہے۔ اس ضمن میں اللہ تعالیٰ انبیاء سابقین علیہم السلام کے مکارم اخلاق و محاسن افعال بیان فرماتا ہے اور اس میں ان کو ایسی تمام اعلیٰ چیزوں کا حامل بتاتا ہے کہ وہ مکمل نمونہ ہوا کرتے تھے۔ چنانچہ قرآن مجید میں کئی ایک مثالیں ملتی ہیں۔

حضرت موسیٰ کا مکا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کسی بات پر ایک قبطی کو اس زور سے مکا مارا کہ وہ اسی

سکے کی کتاب تذلاسکا اور وہیں مرگیا۔ قرآن مجید میں یہ تذکرہ یوں ملتا ہے فوکزہ موسیٰ فقضیٰ علیہ (پ۲۰ سورہ قصص) یہ حضرت موسیٰؑ کی قوت بازو اور مضبوط القویٰ ہونے کا ثبوت تھا نہ کہ پیغمبرانہ وصف و معجزہ۔

حضرت داؤد کی طاقت: اسی طرح حضرت داؤد علیہ السلام کی بھی خداوند قدوس نے تعریف فرمائی ان کی قوت جسمانی کا یوں اظہار کیا۔ واذکر عبدنا داود ذا الاید (پ۲۳ سورہ صٓ) بندہ داؤد کو یاد کرو جو صاحب قوت تھا گویا جسم کا مضبوط و توانا ہونا بلاشبہ قدرت کی ایک عظیم نعمت ہے

حضرت طالوت کا جسم: حق تعالیٰ نے حضرت طالوت علیہ السلام کی طاقت اور ان کے جسم کی یوں توصیف فرمائی "وزادہ بسطۃ فی العلم والجسم" (پ۲ سورہ بقرہ) جہاں کہ جہاں قدرت نے آپ کو علم و فہم کی نعمتوں سے سرفراز کیا تھا وہیں آپ کے جسم کو بھی قوی مضبوط بنایا تھا وہ اس طاقت و قوت کے ذریعے بڑی سے بڑی مہم سرکر دیتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان مثالوں سے اگر ایک طرف انسانی قوت جسمانی اور شجاعت کی اہمیت اجاگر ہوتی ہے تو دوسری جانب روحانی مراتب کے حصول کے لئے اس قوت و طاقت کا ہونا ناگزیر ہے ورنہ ضعیف الجثہ شخص حق کی نصرت کا اہل نہیں ہو سکتا جب کہ ناتوانی کی وجہ سے وہ ریاضات بدنی اور اس کے روحانی فیوضات سے مستفید نہیں ہو سکے گا۔ غرض جسمانی طاقت اور اس کے ساتھ شجاعت کا وصف فضل حق سے جدا نہیں یہ اس کی رحمت اور عنایت ہے۔ جو یقیناً انسان کے اعمال کے لئے سب سے بڑا ذریعہ ہے اگر اس طاقت و قوت کا استعمال خدا اور رسول کے بتائے ہوئے طریق و منہاج پر ہو تو کیا عجب کہ انسانی مکارم و محاسن کی بہتر سے بہتر صورت

گری نہ ہو اور پھر افضل البشر تاج الانبیاء خاتم المرسلین ہادی اعظم محبوب رب العالمین احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے لاتعداد روحانی کمالات معجزات کے باوصف خود آپ کی جسمانی قوت و طاقت اور شجاعت مہتم انسان تھی گویا ؎

کوئی خوبی تو ان سے بچ سکی ہو حسنت جمیع خصالہٖ

آئیے اس سراپا رحمت و رافت کی ذات بابرکات سے اکتساب فیض کریں سرورِ عالم کی بعثت کے چند سال جب اس آیت کا نزول ہوا۔ فاصدع بما تؤمر واعرض عن المشرکین (آپ کو جو حکم دیا جاتا ہے اس کو علانیہ بیان کریں اور مشرکوں کی طرف سے منہ پھیر لیں) تو حضور اکرم نے سرگرمی اور عزم کے ساتھ دعوت حق کا آغاز کیا۔ شرک و جہل اور معبودان باطل کی علانیہ مذمت کی اس مرحلہ پر مشرکین قریش غیظ و غضب سے پاگل ہو گئے۔ اور کوئی ایسی مذموم حرکت نہ ہوگی جس کے ذریعہ ان لوگوں نے آپ کو تکلیف دی مزاحمت کی ان مصائب میں حضور اور آپ کے صحابہ ثابت قدم اور راضی بہ رضا رہے۔ یہی ان کی ہمت اور شجاعت تھی کہ شدائد و آلام کے اس بحر متلاطم میں عزم و ہمت استقلال و استقامت کا پہاڑ بنے رہے۔ صحیح بخاری میں حضرت خباب بن الارتؓ سے روایت ہے کہ مصائب و شدائد کے اس دور میں ایک روز میں رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہوا آپ خانہ کعبہ کے سائے میں اپنی چادر مبارک سرہانے رکھے آرام کر رہے تھے۔ میں نے عرض کی یا رسول اللہ آپ ہماری مدد و نصرت کے لئے اللہ سے دعا کیوں نہیں کرتے۔ یہ سن کر آپ اٹھ بیٹھے چہرہ اقدس سرخ ہو گیا۔ فرمایا۔ پہلے لوگوں کا گوشت لوہے کے نکیلے ہتھیاروں

سے ذبح کر کے ہڈیوں سے الگ کیا گیا اس پر بھی دین سے نہیں ہٹے۔ ان کے سروں پر آرے چلائے گئے۔ انہیں چیر کر بیچ میں سے دو ٹکڑے کر دیئے مگر بھی وہ دین پر قائم رہے۔ اللہ اپنے دین کو ضرور کامیاب کرے گا اور وقت آئے گا کہ ایک سوار صنعاء سے حضرموت تک جائے گا اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرے گا۔"

ابتدائے اسلام میں حضور اکرمؐ کا عرب کے مشہور پہلوان سے مقابلہ ہوا۔ رکانہ اس کی شہ زوری و پہلوانی کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ علامہ ابن اسحاق کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ مکہ کی گھاٹی میں اس کی حضورؐ سے ملاقات ہوگئی۔ حضورؐ نے فرمایا اے رکانہ کیا تو اللہ سے نہیں ڈرتا اور میں جس بات کی دعوت دیتا ہوں اس کو قبول نہیں کرتا۔ اس نے جواب دیا۔ ذرا مجھ سے زور آزمائی کر کے دیکھو اگر تم غالب آ گئے تو جانوں گا کہ تمہارے دعویٰ میں کتنی صداقت ہے۔ حضور اکرمؐ اس کی شہ زوری سے بالکل خائف نہیں ہوئے اور اس سے کشتی کی اور دیکھتے ہی دیکھتے رکانہ کو چاروں شانے چت کر دیا۔ اس پر اس نے پھر کہا۔ اے محمدؐ ایک دفعہ پھر۔ حضورؐ نے دوسری مرتبہ پھر اسے پچھاڑ دیا۔ بعض روایات میں تین بار بھی آیا ہے۔ لیکن اس موقع پر اسے قبول اسلام کی توفیق نہ ہوئی۔

علامہ حجازی کہتے ہیں کہ رکانہ نے فتح مکہ سے کچھ پہلے اسلام قبول کیا۔ اسی طرح عرب کا ایک اور مشہور پہلوان ابوالاشد کلاہ بن جمحی تھا اس کی طاقت جسمانی کی کیفیت یہ تھی کہ وہ گائے کے چمڑے پر کھڑا ہو جاتا تھا اور دس دس آدمی مل کر اس کے نیچے سے چمڑا کھینچنے کے لئے زور لگاتے تھے مگر چمڑا پھٹ جاتا اور نہ ابوالاشد اپنی جگہ سے جنبش نہ کرتا تھا۔

علامہ سہیلی نے کتاب روض الانف میں لکھا ہے کہ اسی ابوالاشد نے ایک دفعہ رسول اللہ سے کہا کہ اگر آپ مجھے پچھاڑ دیں تو میں آپ پر ایمان لاؤں گا۔ حضورؐ نے اسے آناً فاناً میں زیر کر لیا۔ اس نے اصرار کیا کہ ایک بار پھر۔ آپ نے اسے دوبارہ سہ بارہ بلکہ کئی بار پچھاڑ دیا۔ مگر وہ اپنے قول سے منحرف ہو گیا اور اسلام کی سعادت سے محروم رہا۔

ایک مرتبہ مشرکین قریش کا ایک وفد ابوطالب کے پاس آیا اور ان سے کہا۔ اے ابوطالب آپ ہمارے بھی بزرگ ہیں۔ اور ہمارے دلوں میں آپ کی بڑی عزت ہے لیکن آپ کے بھتیجے سے ہم تنگ و عاجز ہیں۔ انہوں نے اپنے اسلاف کے دین کو اور ان کے معبودوں کو برا بھلا کہا اور نئی نئی باتیں یا دین پھیلاتے ہیں۔ ان باتوں سے ہم بے چین ہو گئے ہیں۔ ہمارے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے آپ انہیں روکیں ورنہ ہمارے اور آپ کے درمیان تصادم یقینی ہے۔

ابن ہشام کا بیان ہے کہ ان لوگوں کے جانے کے بعد حضرت ابوطالب نے آنحضرتؐ کو بلوایا اور انہیں کفار و مشرکین کے عزائم سے واقف کروایا اور ساتھ ہی یہ کہا بھتیجے مجھ پر اتنا بوجھ نہ ڈالو کہ میں جسے برداشت نہ کر سکوں۔ مناسب یہ ہے کہ تم ایسی باتیں کہنا چھوڑ دو جس سے قوم میں ناگواری پیدا ہو۔ یہ بڑا نازک موقع تھا۔ ایک طرف منصب رسالت دوسری طرف شفقت عم اور قوم کی دشمنی ۔ مگر حضورؐ نے نہایت اطمینان اور عزم و حوصلہ سے جواب دیا چچا جان اگر سورج میرے داہنے ہاتھ پر اور چاند میرے بائیں ہاتھ پر

ڈرادیا تو کہا میں یہ کام نہیں چھوڑوں گا یہاں تک کہ
اللہ تعالیٰ اسے کامیاب فرمادے یا میں اس راہ میں
مارا جاؤں یہ بھی استقامت و شجاعت کی اعلیٰ ترین مثال

غزوۂ بدر :- اسی طرح حق و باطل اسلام و کفر
کی پہلی جنگ غزوہ بدر کی گھمسان کی لڑائی میں جب
تین سو تیرہ مسلمان قریب ایک ہزار کافروں سے
نبرد آزما تھے۔ کیفیت یہ تھی کہ مسلمان نہتے اور بے
سرو سامان، مسلح کافروں کے شدید حملوں سے بے طرح
گھبرا گئے تھے مشرکین کے پیہم حملوں سے ان کے قدم ڈگمگا
جاتے تھے۔ ایسے وقت میں تاریخ کے اوراق سے پتہ
چلتا ہے کہ حضور اکرم ہی کی وہ ذات اقدس تھی جہاں
مسلمان دوڑ دوڑ کر آپ ہی کے سایہ عاطفت میں
پناہ ڈھونڈتے تھے یہی وہ درِ امن تھا جو اس قدر عالی
مقام اور باہمت تھا کہ کفار کا تیغ سے تیغ اور جنگجو
کسی صورت سے بھی جرات نہیں پاتا تھا کہ آپ کا سامنا
کر سکے۔ حضرت علیؓ جن کی شجاعت اور بہادری مسلمہ ہے
جنہوں نے بڑے بڑے معرکے سر کئے ہیں فرماتے ہیں کہ بدر
میں جب زور کا رن پڑا تو ہم لوگوں نے رسول اللہ ہی
کی آڑ لی اور یہی پناہ سب سے زیادہ محفوظ تھی گویا
حضور علیہ التحیۃ والسلام والتسلیم ہی کی ذات مبارک شجاعان عرب
میں ممتاز و مکرم ثابت ہوئی ـــ

ہجرت کے بعد منافقین مدینہ اور یہود
نیز سرداران مکہ میں باہم رسول اللہ کے خلاف سازشیں
شروع ہو گئی تھیں اس موقع پر حضور اکرم کی حفاظت
کے خیال سے کاشانہ اقدس پر اصحاب کرام پہرہ
دیا کرتے تھے۔ ایک رات حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم
نے حجرہ مبارک سے باہر تشریف لا کر ارشاد فرمایا :

ایہا الناس انصرفوا فقد عصمنی اللہ (لوگو واپس جاؤ
میری حفاظت کا اللہ ذمہ دار ہے۔

غزوۂ احد :- رسول اکرم کی جسمانی طاقت
وقوت اور شجاعت کا اس امر سے بھی اندازہ ہو سکتا
ہے کہ آپ لڑائیوں کے موقع پر اکثر دو دو زرہیں پہنا
کرتے تھے۔ چنانچہ معرکہ احد میں آپ کے جسم اطہر پر دو
زرہیں تھیں۔ علاوہ ازیں کبھی کبھی آپ مغفر یعنی خود
کا استعمال بھی فرماتے تھے۔ کیا یہ شجاعت کی مثال نہیں
ہے کہ ایک کی جگہ دو دو زرہوں کا استعمال مع خود کے ہو
اور پھرتی اور تندہی میں کوئی کمی نہ ہو الحمد للہ۔

غزوۂ احد کے موقع پر جب ایک نازک صورت سامنے آئی تو
حضور نے تمام صحابہ سے مشورہ کیا کہ آیا شہر میں رہ کر ہی
مدافعت کریں یا باہر جا کر دشمن کا مقابلہ کیا جائے۔
کثرت رائے سے فیصلہ دوسری تجویز پر ہوا جبکہ
حضور کا منشاء پہلی بات یعنی مدینہ میں رہ کر دشمن
کے مقابلہ کا تھا۔ مشورہ کے فوراً بعد حضور اچھی طرح اسلحہ
سے لیس ہو کر باہر تشریف لائے۔ حضور کی اس تیاری
کے دوران بعض صحابہ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔
وہ شرمندہ ہوئے اور جیسے ہی آپ باہر تشریف لائے
تو ان حضرات نے آپ سے رک جانے کے لئے عرض
کیا۔ لیکن آپ نے بڑے جوش و ولولہ سے فرمایا۔ پیغمبر
زرہ پہن کر اتارا نہیں کرتا۔ (بخاری) یہ حضور کے عزم
و استقلال و جرات و بہادری کی بہترین مثال ہے۔
غزوہ احد میں سرور عالم پر تیروں، تلواروں، برچھیوں
اور پتھروں سے حملہ کیا گیا اور آپ اس جنگ میں شدید
زخمی بھی ہوئے۔ حتیٰ کہ دندان مبارک شہید ہوئے
مگر پائے مبارک میں ذرہ برابر بھی جنبش نہ آئی۔ اس

[illegible] سے [illegible] لیکن [illegible] ۔ جب بھی اس نے یہ کہا
کہ [illegible] میرے پاس ایک گھوڑا ہے جس کو روزانہ تمہارا
چند [illegible] ہوں ایک دن اس پر سوار ہو کر تم کو قتل کروں
گا حضور نے اس کے جواب میں ارشاد فرمایا تھا کہ میں نے
چاہا تو میں تجھے قتل کروں گا۔ احد کے دن ابی بن خلف
اسی گھوڑے پر سوار صفوں کو چیرتا آنحضرت کے روبرو
پہنچ گیا۔ چند صحابہ نے اس کا راستہ روکا تو حضور نے
انہیں منع فرما دیا اور کہا: اسے آگے آنے دو تم لوگ پیچھے
ہٹ جاؤ" اور خود مقابلہ کے لئے آگے بڑھ آئے۔ اس
وقت آپ نے حضرت حارث بن صمہ کے ہاتھ سے برچھی
لی اس کو ایک چرکا دیا جس سے آسنا پاس کے لوگ ہٹ
گئے۔ اب آپ ابی بن خلف کی جانب متوجہ ہوئے جو
بالکل قریب آ پہنچا تھا۔ آپ نے اس کی گردن میں برچھی
کی [illegible] وہ چیخ مار کر بھاگا۔ جب مشرکین کے درمیان
پہنچا تو بار بار یہ الفاظ دہرا رہا تھا "محمد نے مجھے قتل
کر دیا" لوگوں نے اسے دلاسا دیا کہ یہ تو معمولی زخم ہے
ایک ہلکا سا چرکا ہے۔ تم اس قدر خوفزدہ کیوں ہو۔ وہ
کہنے لگا یہ سچ ہے زخم معمولی ہے لیکن زخم محمد کی [illegible]
[illegible] ہے۔ ہم کو یا جاؤ تو اس سے کتنی تکلیف ہے مجھ کو
[illegible] میں بانٹ دوں تو تم سب آن واحد میں مر جاؤ۔
[illegible] سے جانبر نہ ہو سکا اور مکہ سے [illegible] دور
[illegible] گیا۔

[illegible] دشمن [illegible]

[illegible]

سب سے [illegible]
چنانچہ ایک مرتبہ [illegible]
کی وجہ سے عجیب [illegible]
دشمن نے حملہ کر دیا۔ حضور [illegible]
اکرم خود تشریف لائے۔ [illegible]
ان کا گھوڑا (مندوب) مانگا [illegible]
پھر اس بات کا بھی اندازہ نہ کیا کہ [illegible]
کسی جائے۔ اس طرح اشہب پر بیٹھ کر
تمام مقامات کا گشت لگا کے۔ [illegible]
واپسی پر صحابہ کرام بھی آ گئے آپ نے فرمایا
کی کوئی بات نہیں اور نہ [illegible]
گھوڑے کو میں نے تیز رفتار پایا۔
[illegible] میں حضور اکرم [illegible]
تھے۔ دوپہر کے وقت ایک مقام پر آرام
ٹھہر گئے راستے میں جیتوں کے بہت سے [illegible]
کرام مختلف درختوں کے سایہ میں بکھر گئے
رسول اللہ بھی ایک درخت کے نیچے استراحت
آپ کی قمیص پسینے سے بھیگ گئی تھی [illegible]
کر خشک ہونے ڈال دی اور تلوار بھی [illegible]
[illegible] ایک کافر [illegible]
میں [illegible] آیا اور [illegible]
[illegible] اس وقت حضور
[illegible]

[illegible]

اللہ ۔ اتنا سنتے ہی اس کے ہاتھ سے تلوار چھوٹ گئی۔ اور حضورؐ نے بڑی پھرتی سے اُسے اٹھا لیا اب حضورؐ نے اس سے پوچھا۔ اچھا اب بتا مجھ سے کون بچا سکتا ہے۔ وہ کافر موت کے خوف سے لرزنے لگا وہ گھگیانے لگا حضورؐ رحمت عالم نے اسے معاف کر دیا۔

غزوۂ حنین :- اس معرکہ میں مسلمانوں کی تعداد باختلاف رائے (۳ ت) بارہ ہزار نفوس پر مشتمل تھی اور مخالف فریق یعنی بنو ہوازن صرف چار ہزار تھے مگر اس لڑائی میں مسلمانوں کی صف اول میں بڑی ابتری پھیل گئی تھی پھر بے قابو فوج کے پاؤں اکھڑ گئے۔ مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد میدان جنگ سے نکل بھاگی حتیٰ کہ بعض بڑے بڑے صحابہ کرامؓ بھی گھبرا گئے اور ان میں سے بعض لوگوں کے منہ سے نکلا۔ لن نغلب الیوم من قلۃ (ہم قلت لشکر کی وجہ سے تو آج مغلوب نہیں ہوسکتے) اللہ تعالیٰ کو ان لوگوں کی یہ نازش پسند نہ آئی۔ معرکہ کارزار میں ہوازن کے ماہر تیر اندازوں نے ایسی شدت سے تیر برسائے کہ لوگ گھبرا اٹھے مگر اس افراتفری ہراساں اور بھگدڑ کے وقت صرف حضور اکرمؐ اور آپ کے چند جانثار ہی تھے جو نہایت اطمینان و استقامت سے دشمن کے مقابلے پر ڈٹے ہوئے تھے۔

حضرت براءؓ فرماتے ہیں۔

خدا کی قسم جب لڑائی اپنے پورے زور و شور سے جاری تھی تو ہم لوگ آپ ہی کے پہلو میں آکر پناہ لیتے رہے۔ اور ہم سب سے بڑا بہادر وہ شخص سمجھا جاتا جو آپ کے ساتھ کھڑا رہتا۔ اس لمحہ حضور اکرمؐ کی زبان اقدس پر رجز تھا۔

أنا النبي لا كذب
أنا ابن عبد المطلب

(میں نبی ہوں اس میں کوئی دروغ نہیں۔ میں عبدالمطلب کا بیٹا ہوں) حضرت عباسؓ فرماتے ہیں کہ حنین کے دن رسول کریمؐ اپنی خچر کو ایڑ لگا کر کفار کی طرف بڑھ رہے تھے اور میں اس کی لگام تھامے ہوئے اس کو روک رہا تھا کہ وہ تیزی سے کام نہ لے اور ابوسفیان آپ کی رکاب تھامے ہوئے تھے۔

ایک روایت میں ہے کہ جوش و غضب میں حضور اپنی خچر سے اتر پڑے تھے۔ حضورؐ کے ارشاد کے مطابق حضرت عباسؓ نے بلند آواز سے مہاجرین و انصار کو پکارا۔

یا معاشر الانصار و اصحاب الشجرۃ اس آواز کے کانوں میں پڑنا تھا کہ بروایت حضرت عباسؓ سب مسلمان دفعتہً پلٹ پڑے، اور سب کی زبانوں پر لبیک یا لبیک کی صدائیں تھیں پھر انھوں نے کفار کو اپنی تلواروں پر رکھ لیا۔

اللہ اکبر کیسی شان اور کیا قوت و جراٗت کا مظاہرہ تھا۔ کیا شجاعت و دبدبہ، عزم و ہمت و استقلال و جوانمردی کی جلوہ گری تھی کہ ایسے نازک وقتوں میں پائے اقدس میں لغزش نہ آئی۔ حضور کی جراءت و شجاعت کے بارے میں مسند احمد، نسائی، بیہقی و طبرانی میں، حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے مروی ہے کہ جب جنگ کا بازار گرم ہو جاتا اور آنکھیں سرخ ہو جاتیں تو ہم رسول اللہؐ کے دامن عاطفت میں پناہ لیتے اور اس وقت آپ سے زیادہ کوئی شخص دشمن سے قریب نہیں ہوتا تھا۔ گویا حضورؐ کے کمال شجاعت کا یہ عالم تھا کہ بڑے بڑے بہادر و جری بھی حضورؐ کی آڑ لیتے اللہ اکبر اس سے بڑھ کر حضورؐ کے اشجع الناس ہونے کی دلیل کیا ہو سکتی ہے۔

غزوۂ خندق :- غزوہ خندق کا عظیم الشان

واقعہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شجاعت، جسمانی طاقت کے ساتھ ساتھ روحانی کمالات کی ایک دلاویز تفسیر ہے اس معرکہ میں کوئی دس ہزار کفار کا لشکر جرار مدینہ پہ حملہ آور ہوا حضرت سلمان فارسیؓ حضور اکرمؐ کے گوش گزار اپنے ملک کے دستور کے مطابق یہ مشورہ کر رہے تھے کہ جب غنیم کثیر تعداد میں ہوتا تو ہم لوگ شہر کے چاروں طرف خندق کھود لیتے تھے۔ چنانچہ رسول اللہؐ نے دیگر صحابہ کرام سے اس بارے میں دریافت کیا۔ سب نے خندق کھودنے کی حمایت کی اس طرح مدینہ کے چاروں طرف خندق کھودنے کے لئے حضورؐ نے دس دس آدمیوں کی ٹولیاں کر دیں اور کو خندق کھودنے کا حکم دیا۔ صحابہ کرام بھی اس کام میں بڑی شدت ہی جوش و خروش سے جٹ گئے اچانک ایک جگہ ایک سخت چٹان درمیان میں حائل ہوگئی صحابہؓ نے لاکھ لاکھ کوشش کی کہ چٹان ٹوٹ جائے مگر وہ کسی بھی صورت سے نہ ہوا آخر صحابہ عاجز آگئے ان کی ہمتوں نے جواب دے دیا۔ تب انھوں نے حضورؐ تک یہ پیغام بھجوایا کہ حضور اس چٹان کو ملاحظہ فرمائیں۔ رسول اکرمؐ اس مقام پر تشریف لائے واضح ہو کہ اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے شکم مبارک پہ پتھر بندھے ہوئے تھے۔ یہ تین دن کے فاقوں کا نتیجہ تھا۔ باوجود اس حالت کے حضورؐ نے تمام اصحاب کو وہاں سے ہٹ جانے کا حکم دیا خود کدال لئے آگے بڑھ آئے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے آپ نے اپنی بھرپور طاقت سے اس چٹان پہ ایک ضرب لگائی حضرت سلمان فارسی کا بیان ہے کہ میں نے دیکھا پتھر میں ایک بڑا شگاف پیدا ہوگیا اور ساتھ ہی اس میں سے ایک تیز روشنی بھی نکلی اس پہلی ضرب کے ساتھ ہی وہاں پہ موجود اصحاب نے نعرہ تکبیر بلند کیا اس کے بعد آنحضرتؐ نے دوسری ضرب لگائی جس سے پیدا شدہ شگاف اور وسیع ہوگیا اور روشنی بھی پیدا ہوئی تیسری بار آپ کی ایسی ہی ضرب نے چٹان کے ٹکڑے ٹکڑے کر دئے۔ کیا یہ حضور اکرمؐ کی بے مثل طاقت و شہ زوری کا شاہکار نہیں۔ لاریب۔ تا قیام قیامت دنیا میں اس کی کوئی نظیر نہیں مل سکتی۔ یہی نہیں بلکہ آپ نے اپنی ہر ضرب پہ مسلمانوں کو فتح و نصرت کی خوشخبری دیتے تھے جو مستقبل قریب میں پوری ہوئی حالانکہ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ مسلمان جزیرہ عرب ہی کے دیگر قبیلوں اور قوموں سے برسرِ پیکار تھے۔ گویا واقعہ خندق اک طرف رسول اکرمؐ کی جسمانی قوت و طاقت کا عظیم مظاہرہ تھا۔ تو دوسری طرف آپ کی روحانی کمالات و فیوضات کا ایک روشن پہلو بھی تھا۔

جنگ و جدال کے بعض ایسے ہی مواقع پہ حضورؐ کی جسمانی طاقت و شجاعت کا اظہار تو ہو ہی جاتا ہے لیکن عبادات و ریاضت کے لئے بھی اس قوت کا ہونا از حد ضروری ہے۔ ویسے یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ حضور اکرمؐ علاوہ رمضان المبارک و شوال کے بھی اکثر و بیشتر وصالی روزے رکھا کرتے تھے یعنی آپ کئی کئی دن افطار (وقفہ) کے بغیر روزے رکھا کرتے تھے جب کہ عامۃ المسلمین کو اس طرح کے روزے رکھنے سے منع کرتے تھے۔ اکثر یوں بھی ہوا کہ گھر میں پکانے کو کچھ نہ ہوتا اور روزہ کی نیت فرما لیتے تھے۔ یقیناً یہ تمام باتیں اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ مجاہدات روحانی اور محنت شاقہ کے لئے طاقت و قوت جسمانی کا ہونا لازمی ہے علاوہ ان روزوں کے آپ سے قیام اللیل کی پابندی بھی بالالتزام ہوا کرتی تھی آپ یاد الٰہی میں دن کے اوقات کے علاوہ رات رات بھر نماز پڑھا کرتے تھے یہاں تک کہ صحاح کی کئی روایتوں سے

آپ کے پائے اقدس کا متورم ہونا ثابت ہوتا ہے۔ حضرت ابن مسعود فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں بھی آپ کے ساتھ نماز میں شریک ہو گیا۔ مجھے اس قدر تکلیف ہوئی قریب تھا کہ میں بیٹھ جاتا اور آپ کو اکیلا چھوڑ دیتا۔ ایسی ہی متعدد باتیں اور واقعات ہمارے سامنے آتے ہیں کہ بعض اوقات حضورؐ نے نماز میں سورۂ بقر شروع کی اور نماز کے رکوع کے پہنچنے تک آپ نے آل عمران شروع کردی تھی۔ گویا ایک رکعت میں پانچ پاروں سے زیادہ تلاوت فرمائی بہرحال یہ تمام واقعات قوت انسانی سے تعلق رکھتے ہیں جس سے حضور اکرمؐ کی بے نظیر جسمانی قوت طاقت شجاعت واستقلال بہادری وشہزوری جرأت و مبازرت مسلمانوں کو جادۂ حق کی اس منزل کا پتہ دیتی ہے جو ہر آن متبع رسول الانام کو آپ کے اسوۂ حسنہ کی روشن و تابناک آیات کے ذریعے دعوت فکر و عمل کی جانب رغبت دلاتی ہے۔

آخر میں علامہ ابن جوزی کی کتاب تلقیح فہوم الاثر سے حضورؐ کے زیر استعمال ہتیاروں کی تفصیل پیش کی جاتی ہے جس سے حضور کی شجاعت کا پہلو نمایاں ہوگا۔

حضور کی تلواریں:- آپ کی تلواروں کے نام یہ تھے۔ قلعیا جو صحرا کے ایک گاؤں قلع سے آئی تھی۔ تبارہ۔ حتف مخذم رسوب غضب اور ذوالفقار جسے آپ نے حضرت علیؓ کو عنایت فرمایا۔

حضور کی ڈھالیں:- آپ کے پاس تین ڈھالیں تھیں۔ الزلوق الفتق۔ اور تیسری کا نام معلوم نہ ہوسکا۔

حضورؐ کی زرہیں:- سعدیہ۔ فضہ۔ ذات الفضول۔ ذات الوساح۔ ذات الحواس۔ تبرا۔ سعدیہ اور خرنق۔

حضورؐ کے نیزے:- آپ کے پاس کل چار نیزے تھے۔ یعنی المثنی المتثنی۔ بقیہ کے نام معلوم نہ ہوسکے۔ مزید حضورؐ کے پاس کئی کمانیں تھیں۔ جن کے نام یوں بتائے گئے۔ روحا۔ بیضا صفراء۔ یا شوحط۔ الکتوم۔ زورا۔ سداد۔

طبقات ابن سعد میں لکھا ہے کہ جب حضورؐ مدینہ کے ایک یہودی قبیلہ بنو قینقاع سے جنگ کرکے لوٹے تو آپ کو تین نیزے اور تین کمانیں ملیں۔ روحا بیضاء اور صفرا انہی کمانوں کے نام تھے۔

حضورؐ کے ہتھیاروں کی تفصیل کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے مرکب کے نام بھی درج کردیئے جائیں۔ یہاں مرکب سے مراد وہ جانور جو بطور سواری آپ کے استعمال میں ہے۔ اب خواہ وہ گھوڑا، خچر، اونٹ یا خر ہو۔ آپ نے اپنی حیات طیبہ میں کوئی سات گھوڑوں پر سواری کی ان کے نام یہ ہیں۔

السکب:- یہ حضورؐ کا پہلا گھوڑا
مرتجز:- یہ ایک اعرابی سے خریدا تھا۔
لزاز:- یہ اسکندریہ کے بادشاہ مقوقس نے تحفتاً بھیجا تھا
الظرب:- یہ ربیعہ بن البراء نے پیش کیا تھا۔
الورد:- یہ تمیم الداری نے بطور ہدیہ بھیجا تھا۔
لحیف یا لخیف۔ یعسوب۔

اونٹ۔ قصویٰ اسے عضبا اور جدعا بھی کہتے ہیں۔ یہ حضورؐ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ سے آٹھ سو درہم میں خریدی تھی اور اسی پر سوار ہوکر آپ نے ہجرت فرمائی اس کے علاوہ کچھ اونٹنیاں اور بھی تھیں جو دودھ کی خاطر پالیں تھیں چند ایک نام یہ ہیں۔

عجوہ۔ زمزم۔ سقیا۔ برکہ۔ درسہ الہلال وغیرہ۔

خچر اور گدھا۔ شاہ مقوقس نے حضور کی خدمت میں ایک خچر بھیجا تھا۔ جس کا نام سہباء یا دلدل تھا اور ایک گدھا جو یعفور کہلاتا تھا۔

سرکارِ مدینہؐ

اس دائرہ عالم امکاں میں مدینہ — یوں لگتا ہے جیسے ہو انگوٹھی میں نگینہ

وہ بحرِ عناصر ہو کہ ہو قلزمِ عقبیٰ
بے حبِّ نبیؐ ڈوب کے رہتا ہے سفینہ

لے سانس بھی آہستہ کہ یہ جائے ادب ہے
ہشیار اگر ہے بارگہِ شاہ مدینہ

ایماں کیلئے شرط محبت ہے نبیؐ کی
عرفاں جو ہو مقصود تو پہلا ہے یہ زینہ

پھر رحمتِ باری کی گھٹا جھوم کے برسے
آجائے جو اُمت کو محبت کا قرینہ

میں گوندھتا رہتا ہوں درود کے گُل تر
دل کا یہ وظیفہ ہے یہی ذکرِ شبینہ

دانستہ اہانت جو کرے آپ کی آقا!
وہ میری نگاہوں میں ہے کم ظرف کمینہ

ظلمات میں کیوں ڈھونڈتے خضر آبِ بقا کو
ملتا جو انھیں رد کئے محمدؐ کا پسینہ

ہاں اسمِ محمدؐ نے ترایا ہے ہمیشہ
جب جب گھرا طوفاں میں وحیدؔ اپنا سفینہ

ڈاکٹر سید وحید اشرف

نعت شریف

یاد آتے ہیں ایامِ کوئے نبیؐ صبح صل علیٰ شام صل علیٰ
کیسی پیاری گذرتی تھی وہ زندگی صبح صل علیٰ شام صل علیٰ

اللہ اللہ آغوشِ خیر الانامؐ انکے قدموں میں رہتے تھے ہم سب غلام
ہر گھڑی عید تھی ہر گھڑی عید تھی صبح صل علیٰ شام صل علیٰ

گاہے پایئں اقدس میں بیٹھے رہے گاہے روضے کی جالی سے لپٹے ہوئے
گاہے محوِ کرم گاہے محوِ خوشی صبح صل علیٰ شام صل علیٰ

قرب پایا تو سر کو جھکائے رہے دور بیٹھے تو گنبد کو تکتے رہے
ہر قدم پر ملی ایک لذت نئی صبح صل علیٰ شام صل علیٰ

دھن مدینہ کی سرمایۂ زیست ہے ساری فرحت شہنشاہ اسی سے ہی ہے
پھر رہی ہے نگاہوں میں ہر ہر گلی صبح صل علیٰ شام صل علیٰ

[illegible] قادری

حضرت صفیؔ اورنگ آبادی

نعتِ سرکارِ مدینہ

لاکھ مضمون ہیں مداحِ محمدؐ کے لئے
خرچ کے واسطے اندازہ نہ آمد کے لئے

اشرفؐ الخلق، شہنشاہِ رُسل، شافعِ حشر
بخدا ساری خدائی ہے محمدؐ کے لئے

کیا کہوں منہ سے کہ قرآن کا منہ ہے ورنہ
حمد کا لفظ تو ہونا تھا محمدؐ کے لئے

رہی معراج میں دروازے کی زنجیر ایسی
جیسے بے چین کوئی رفتہ کی آمد کے لئے

نفس ہے گنبدِ خضریٰ کے نظر آنے تک
میں نے اس سانپ کو پالا ہے زمرد کے لئے

ناخنوں کا جو انگوٹھوں کے لیا تھا بوسہ
فخرِ آدم کے لئے تھا کہ محمدؐ کے لئے

یہ لطافت کہ کمر سے نکل آیا پٹکا
باندھی اپنی کمر اس نورِ مجرد کے لئے

خلد سمجھے جو ہوا گھر میں کبھی ذکرِ نبیؐ
ہم نے دنیا میں مزے عیشِ مخلد کے لئے

نعت کے واسطے تقلید ہو تازی کی صفیؔ
عربی نیام ہوا اس تیغِ مہند کے لئے

ڈاکٹر یوسف حسین خاں

خودی، عشق اور موت

بقائے نوع کی کوشش فطرت میں ہمیں صاف طور پر نظر آتی ہے۔ گلاب کا پھول مہکتا، دمکتا، کھلتا آس پاس کی فضا کو معطر کرتا اور پھر مرجھا کر جس خاک سے اُگا تھا، اسی میں مل جاتا ہے۔ خود تو فنا ہو جاتا ہے لیکن اپنے بیجوں سے اپنی نوع کی بقا کا سامان مادی حیثیت سے مہیا کر جاتا ہے۔ وہی خاک جس میں وہ مل گیا۔ اس کے بیجوں کی پرورش کر کے آئندہ موسم بہار تک انھیں اس قابل بنا دیتی ہے کہ اپنے نرم اور نازک ٹہنیوں سے گلاب کا پھول پیدا کر سکیں۔ غرض کہ اس طرح حیات نباتی کا مادی تسلسل برقرار رہتا ہے کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مظاہر کونیہ کے وہ تمام مجموعے جن میں شعور کی ترقی نہیں ہوئی اور خودی کا ظہور نہیں ہوا انفرادی طور پر مٹتے رہتے ہیں لیکن نوعی طور پر اپنی بقا کا سامان بہم پہنچا جاتے ہیں۔ ایک پھول سے سیکڑوں ہزاروں بیج مصلحت نوعیہ اسی واسطے پیدا کرتی ہے کہ اس چیز کی بقا ممکن ہو سکے جس کے پیدا کرنے میں اس کو ہزارہا سال نجیب عجیب اہتمام کرنے پڑے تھے۔ چنانچہ عالم نباتات میں بیجوں کی کثرت کا منشا یہی ہے کہ با وجود نامساعد حالات کے وہ نوع ہمیشہ کسی طرح باقی رہ جائے۔ حیوانی عالم میں بھی اس کی مثالیں ملتی ہیں انسانی زندگی میں خودی یا شعور کی بدولت فطرت کو ایک نئے قسم کے مظہر سے واسطہ پڑتا ہے۔ یہی خودی یا ذات وجود تھی جس نے ہست و بود کے گرداب سے زندگی کو باہر کھینچ نکالا اور اس کے لئے کھینچ نکالا کہ خالق حیات کی یہی مرضی تھی انسان کے لئے یہ مقام رضا ہے اس واسطے کہ یہی اس کا مقدر تھا

برون کشید ز پیچاک ہست و بود مرا ٭ چہ عقدہ ہا کہ مقام رضا گشود مرا
تپید عشق درین کشت نا شکیبا من ٭ ہزار دانہ فرو کرد تا درود مرا
ندانم این کہ نگاہش چہ دید در خاکم ٭ نفس نفس بہ عیار زمانہ سود مرا
جہانے از خس و خاشاک در میاں انداخت ٭ شرارۂ دلکے داد و آزمود مرا

فطرت حیات انسانی کے نوعی تحفظ و بقا کا اسی طرح اہتمام کرتی ہے جس طرح حیات نباتی و حیوانی کا لیکن خودی اور شعور کے باعث انسانی روح کی بلندیاں نامحدود ہو گئیں۔ چنانچہ انسان میں موت کے بعد بھی انفرادی بقا کی شدید خواہش ہر زمانے میں موجود رہی ہے۔ ایغو کا جو رجحان محدود اور فنا پذیر اشیاء کی وابستگی سے پیدا ہو گا وہ یقیناً فنا پذیر ہو گا۔ لیکن اس میں لامحدود، غیر فانی اور غیر متغیر کے ساتھ وابستگی کا جو شدید جذبہ موجود ہے۔ جو اخلاق و مذہب کی بنا ہے۔ وہ ضرور ہے کہ انسان کو بھی غیر فانی بنادے

یہ الٰہی عشق انسان کو لازوال بنانے کی ضمانت ہے کہ اس سے وہ وجہ الٰہی کا جزو بن جاتا ہے۔ **کل شیئ ھالک الا وجھہ** کا یہی مطلب ہے۔ وجہ کے معنی ہستی کے ہیں۔ وہی روحیں باقی رہیں گی جن کی ساخت الٰہی وجود کے ساتھ ہم آہنگ ہوگی۔ سوائے وجہ الٰہی کے باقی ہر چیز فانی اور آنی جانی ہے۔ روحِ انسانی چونکہ روحِ الٰہی کا جز ہے اس لئے اس پر فنا کے اعتبار کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ **نفخت من روحی** میں اسی انسانی شرف کی طرف اشارہ ہے۔ **فطرت اللّٰہ التی فطر الناس علیھا** میں بتایا گیا ہے کہ انسانی فطرت الٰہی فطرت کی نہج پر ڈھالی گئی ہے۔ اور چونکہ ذاتِ واجب تعالیٰ زوال و فنا سے آزاد ہے اس لئے روحِ انسانی کا الٰہی جوہر بھی لازوال و فنا سے آزاد ہونا چاہیئے۔

اسلام نے فرد کو پہلی مرتبہ (دنیا میں) آزاد کیا اور اس کی قدر و قیمت کو اخلاق کا معیار ٹھہرایا۔ وہ تعلیم جو انفرادی قدر و قیمت کا ایسا شدید احساس رکھے جیسا کہ اسلام میں ہے، وہ فرد کے بالکل فنا ہو جانے پر کیوں کر یقین رکھ سکتی ہے۔ چنانچہ بقائے روح کا عقیدہ نتیجہ ہے۔ اس تعلیم کا جو اسلام نے فرد کے اس دنیا میں نشو و نما پانے اور ارتقاء کی بلند ترین منزلوں پر پہنچنے کی نسبت پیش کی۔ ایسی قیمتی چیز کو جیسی کہ انسانی خودی یا شخصیت یا روح ہے۔ انتہائی بلندی تک پہنچا کر ہمیشہ کے لئے فنا کر دینا فطرت کی ستم ظریفی ہوگی! فطرت نے معمولی چیزوں کے تحفظ بقا کے لئے ایسے ایسے اہتمام کئے ہوا ہیں کہ جن پر غور کرنے سے حیرت ہوتی ہے۔ اسے وہ کیوں کر فنا کر سکتی ہے سے

چناں بزی کہ اگر مرگِ ماست مرگِ دوام — خدا ز کردۂ خود شرمسار تر گردد
نگاہِ شوق تمنا خیالِ بلند و ذوقِ وجود — مترس از اینکہ ہمہ فنا کہ رہ گزر گردد

اسلامی فلسفے میں حیات بعد موت ایک مسلّم اصول رہا ہے اس لئے کہ اسلامی فکر خودی کے لامحدود امکانات اور روحانی آزادی کی علمبردار رہی ہے۔ ہم مرنے کے بعد اس منزل سے اپنا سفر شروع کرتے ہیں جس منزل پر ہم نے دنیا میں اس کو چھوڑا تھا۔ ہمارے روحانی ارتقاء کا تسلسل بے خلل باقی رہتا ہے۔ جو اس دنیا میں روحانی لحاظ سے محروم رہا وہ آخرت میں بھی محروم رہے گا۔ **ومن کان فی ھذہٖ اعمیٰ فھو فی الاخرۃ اعمیٰ و اضل سبیلا** (جو شخص اس دنیا میں اندھا ہوگا (معنوی اعتبار سے) تو وہ آخرت میں زیادہ اندھا اور زیادہ گمراہ ہوگا) جسمانی طور پر اندھا ہونا بڑی محرومی ہے اور معنوی لحاظ سے اگر کوئی اندھا ہے تو اس کی محرومی کی انتہا نہیں۔ وہ نہ صرف محروم ہوگا بلکہ پابند بھی ہوگا۔ روح کی آزادی سے وہ کبھی آشنا نہیں ہو سکتا جن کو زندگی میں یہ آزادی نصیب تھی وہ موت کے بعد بھی آزاد رہیں گے۔ اور اپنے وجود کے تسلسل کو برقرار رکھ سکیں گے۔ زندگی کا اگر صحیح استعمال کیا جائے تو ایک مرتبہ دینے کے بعد اس کو واپس نہیں لیا جاتا۔ جسم کی موت حقیقت میں موت نہیں بلکہ ایک نئی زندگی میں قدم رکھنا ہے۔ اس لئے موت سے ڈرنا کیا؟ حقیقت میں موت نام ہے زندگی کی بے یقینی اور بے مقصدی کا۔ اقبال کے نزدیک موت صید ہے جس کی تاک میں انسان کو بیٹھنا چاہیئے تاکہ ہستی

کا ارتقاء رکنے نہ پائے۔

از مرگ ترسی اے زندہ جاوید ؎ مرگ است صیدے تو در کمینی
جانے کہ بخشند دیگر نگیرند آدم بمیرد از بے یقینی

دوسری جگہ اسی مطلب کو یوں بیان کیا ہے کہ بندۂ حق شیر ہے اور موت آہو ہے۔ مردِ آزاد کے لئے موت میں زندگی ہے۔ غلام موت کے خوف سے ہر لمحہ مرتا رہتا ہے اور زندگی اس پر بے مقصدی کے باعث حرام ہوتی ہے۔

بندۂ ضیغم و آہوست مرگ ؎ یک مقام از صد مقام اوست مرگ
ہر زماں میرد غلام از بیم مرگ ؎ زندگی اورا حرام از بیم مرگ
بندۂ آزاد را شانے دگر ؎ مرگ او را می دہد جانِ دگر
او ز خود اندیش است مرگ اندیش نیست مرگ آزاداں ز نہ آنے بیش نیست

اگر مرے ہوئے بول سکتے تو عزیز و اقارب کو ماتم کرنے سے منع کرتے اور کہتے کہ ہم مرے نہیں، ہم زندہ ہیں۔ تم نالہ کناں کیوں ہو؟ وہ یہ بھی کہتے کہ عالم ارواح میں خدا کا روحانی قانون اسی طرح نافذ ہے جس طرح مادی عالم میں۔ اسباب و علل کا قانون۔ انسانی روح عالم آخرت میں اپنے ارتقاء کو جاری رکھتی ہے اور اس کو اپنی صلاحیت کے اظہار کے مواقع ملتے رہتے ہیں۔ انسانی جسم کے مر جانے کے بعد روح محفوظ رہتی ہے۔ شعور بدستور فکر کرتا ہے اور اس کی وحدت برقرار رہتی ہے۔ موت کے بعد زندگی حقیقت میں ایک نیا چولا بدلتی ہے۔ وہ اپنی تجدید کرتی اور ابدیت کا جامہ زیب تن کرتی ہے۔ موت انسانی روح کے لئے اسی طرح کی پیدائش ہے جس طرح جسم ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے۔ عالم آخرت میں روح ترقی اور عروج کے راستے پر پڑ کر اپنی صلاحیتوں کے مطابق بلند مراتب حاصل کرتی ہے اور حقیقی علم سے ہمکنار ہوتی ہے۔ روح کی بقا سکوتی حالت نہیں۔ بلکہ فعلیت کی حالت ہے۔ مادی طور پر موت کا مطلب یہ ہے کہ توانائی (انرجی) نے اپنی شکل بدل لی۔ آکسیجن، ہائیڈروجن، کاربن اور نائٹروجن کی نامیاتی ترکیب نے اپنا توازن کھو دیا اور غیر نامیاتی مادوں کی ترکیب میں تحلیل ہو گئی۔ لیکن موت کی یہ توجیہہ بہت ناکافی اور ان کی اخلاقی تمناؤں کے لئے غیر تشفی بخش ہے۔

دلِ من رازدانِ جسم و جان است ؎ نہ پنداری اجل بر من گراں است
چہ غم گر یک جہاں گم شد ز چشمم ؎ ہنوز اندر ضمیرم صد جہاں است

انسانی ضمیر زماں و مکاں سے بالاتر ہے۔ مادی معقولات کے اطلاق سے اس کی کیفیت کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا۔ مادی زندگی میں بھی نفسِ انسانی چاہے زمانے کا پابند ہو لیکن مکان سے آزاد ہو جاتا ہے۔ ہماری فکر یا ہمارے جذبات مکانی نہیں ہوتے۔ ممکن ہے کہ روح کے لطیف کوائف زمانی معقولے سے بے نیاز

ہو جائیں۔ دنیا میں چاہے اور مخلوق زمانے میں زندگی بسر کرتی ہو لیکن انسان میں زمانہ زندگی بسر کرتا ہے دل کی زندگی زمانے کی پابند نہیں اس واسطے کہ دل حلقۂ بود و عدم سے آزاد ہے۔ دم کے جانے کے بعد بھی دل (روح) باقی رہتا ہے ؎

چہ غم داری حیات دل ز دم نیست — کہ دل در حلقۂ بود و عدم نیست
مخور اے کم نظر اندیشۂ مرگ — اگر دم رفت دل باقیست غم نیست

سائنس نے روحانی وجود سے انیسویں صدی میں انکار کیا تھا لیکن اب ۱۹۳۱ء کے انقطۂ نظر میں بنیادی تبدیلی نظر آرہی ہے۔ اب آج سائنس کے بڑے بڑے ماہر یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہیں کہ انسانی تجربہ محض حسی نہیں بلکہ روحانی بھی ہے۔ دراصل ہمارا تجربہ عبارت ہے اس تعامل سے جو ہمارے اور حواس کے درمیان پیدا ہوتا ہے۔ اس تعامل کا ایک حصہ ان تاثروں پر مشتمل ہوتا ہے۔ جو ہمارے اعضائے حسی کے ذریعے لائے ہوئے محرکات کے ساتھ وابستہ ہوتے ہیں اور جن پر غور و فکر سے ہم عالم طبیعی کی کنہ تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ تجربہ اس سے زیادہ وسعت رکھتا ہے وہ حسی تاثروں کی توجیہ تک محدود نہیں ہے۔

اب سائنس کی دنیا مادی ذرات کی دنیا نہیں رہی بلکہ برقی لہروں اور موجوں کی دنیا بن گئی ہے۔ حقیقت کے لئے یہ ضروری نہیں رہا کہ وہ محسوس ہوسکے ورنہ وہ حقیقت نہ ہوگی جس طرح انسانی ذہن کو مادی حوادث سے سابقہ پڑتا ہے اسی طرح روحانی محرک بھی ہیں جو مادہ لطیف ہیں طبعی علوم جب مادی حوادث کی توجیہ و توضیح کرتے ہیں تو وہ بھی ریاضیات کے رمز و اشارے کا جائزہ ہی تو کرتے ہیں روحانی محرکوں کی خصوصیت انسانی شعور میں ہمیشہ سے ایسی مرکوز رہی ہے کہ اس کو علٰحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ روحانی محرک خودی کی تکمیل کرتے ہیں اور ان کا اعلیٰ ترین عنصر اپنے اندر الوہیت کی خصوصیتیں مضمر رکھتا ہے۔

اقبال کے نزدیک انسانی حقیقت روحانی ہے۔ روح ایک لطیفہ وحدت ہے جو مادے سے وابستہ ہے۔ روح جس مادی جسمانی مادی قالب میں ہوتی ہے وہ عالم فطری کی ضرورت کو پورا کرنے کا آلہ ہے چونکہ روح اپنے امکانوں کو مظاہر کو تیہ میں بغیر جسم کی مدد کے نہیں ظاہر کر سکتی اس واسطے ضرور ہے کہ وہ ذات واجب کی طرح باوجود ناقابل تغیر اور مطلق ہونے کے تغیر پذیر اور اضافی کے ساتھ اپنا رشتہ جوڑے اور مادے کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرتی ہے آگہی اس کی خصوصیت ہے آگہی کے ذریعے روح اعلیٰ قوتیں اور صفات حاصل کرتی ہے۔ روح واسطہ ہے انسان اور ذات واجب کے درمیان جس کی بدولت تغیر پذیر، غیر تغیر پذیر کا تصور کرتا ہے۔ اسی واسطے سے جزو کل میں شریک ہو جاتا ہے لیکن یہ اس کا تشخص عارضی نوعیت رکھتا ہے۔ زمانی اور امکانی حوادث کے سیل میں

روح ابدی حقیقت کا دامن نہیں چھوڑتی کہ وہ خود ابدی شعلے کا شرارہ ہے۔ انسان کے مقدر کی تکمیل کا انحصار ذات واجب پر ہے۔ وجود قدر کے تابع ہوتا ہے۔ اور قدر ہی کے ذریعے سے ظاہر ہوتا ہے۔ فطرت اور ذہن کی ثنویت عالم ارواح میں موت کے بعد باقی نہیں رہتی جس طرح وجود اور قدر کی ظاہری طور پر جو جدائی نظر آتی ہے وہ حیات بعد موت میں بالکل مٹ جاتی ہے۔ موت کے بعد رزائل بشریہ دور ہو جاتے ہیں اور روح ملاء اعلیٰ کے رنگ میں رنگ جاتی ہے۔ آدمی کا خاکی جسم مٹی میں مل جاتا ہے۔ لیکن اس کی روح ان امور کی تکمیل کیلئے فراغت حاصل کر لیتی ہے جو اس کا اصلی جوہر ہے اور جو اس کے ساتھ وابستہ رہتے ہیں۔ جب انسانی روح اپنے نیک اعمال سے یکسوئی اور اطمینان حاصل کر لیتی ہے تو وہ ایک لطیفۂ وحدت بن کر اپنے خالق کی طرف رجوع کرتی ہے۔ یٰایتہا النفس المطمئنۃ ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیۃ (اے چین پکڑے دل چل اپنے رب کی طرف، تو اس سے راضی وہ تجھ سے راضی) موت خواب کے پردے میں زندگی کا پیغام ہے۔

موت تجدید مذاق زندگی کا نام ہے ؎ خواب کے پردے میں بیداری کا اک پیغام ہے
جوہر انساں عدم سے آشنا ہوتا نہیں ؎ آنکھ سے غائب تو ہوتا ہے فنا ہوتا نہیں

روح کا علم محسوسات سے ماوراء ہے اور اس کا تعلق انسانی قلب سے ہے۔ عالم روحانی سے قلب میں ایسی فراستیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ جو محسوس حقائق سے نہیں ہوتیں۔ اور یہی ہو سکتی رسول مقبول صلعم نے فرمایا: زویت الی الارض فاریت مشارقھا ومغاربھا (دکھائی گئی مجھ کو زمین پھر دیکھا میں نے مشرقوں اور مغربوں کو) یہ کرشمہ ہے روح ہی کی فراست کا ورنہ جسم کی محدود صلاحیتیں اس کی متحمل نہیں ہو سکتیں۔ بصیرت روح ہی سے حاصل ہوتی ہے جو وجدان کا سرچشمہ ہے۔ اگر ہم تمام اشیاء اور امور کے متعلق صرف اپنے مادی تجربے سے رائے قائم کریں تو ہم زندگی کے اعلیٰ مدارج کی نسبت کبھی کوئی بصیرت نہیں حاصل کر سکتے۔ یہ اسی لطیفۂ روحانی کی بدولت ہے۔ جو خالق کائنات کا اعلیٰ ترین عطیہ ہے۔ اس کے شرف کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ اسے عالم امر میں شمار کیا گیا ہے جو الٰہی احوال سے متعلق ہے۔ امر میں ذات واجب کا کوئی شریک نہیں۔ ان الامر کلہ اللہ (امر پورا اللہ ہی کے لئے ہے) خلق میں انسان خدا کا شریک ہو سکتا ہے کہ اس کو اس کی تھوڑی بہت صلاحیت ودیعت کی گئی ہے۔ امام غزالیؒ اور شاہ ولی اللہؒ دونوں نے بڑی تفصیل کے ساتھ خلق اور امر کے فرق کو ظاہر کیا ہے۔ اور روح کو امر الٰہی بتایا ہے۔ بعض مفسروں نے روح سے حضرت جبرئیلؑ مراد لیا ہے لیکن یہ دونوں حکمائے اسلام روح کو روح ہی کے معنی میں سمجھتے ہیں جس کے لئے قرآن نے دوسری جگہ نفس کا لفظ بھی استعمال کیا ہے۔ جیسے یا ایتہا النفس المطمئنۃ ارجعی الی ربک راضیۃ المرضیۃ۔ جس چیز میں ناپ اور مقدار اور کمیت پائی جائے اسے عالم خلق کہتے ہیں [illegible]

...ہے۔ اللہ عالم حق نے قل الروح من امر ربی کہہ کر روح امر ربی ہے۔ عالم امر
...ت ہے جن میں ناپ اور اندازے کو دخل نہیں۔ جسم کو ٹکڑے کیا جاسکتا ہے۔ اس کی۔
...ن ہے۔ لیکن روح قسمت پذیر نہیں۔ اس میں چھوٹی کی گنجائش نہیں۔ جس طرح حق تعالیٰ تجربے سے
۔ اسی طرح روح بھی حسی معقولات کے لئے گریز اسے ماوراء ہے۔ اور جسم روح کے تصرف
...یں اسی طرح سے ہے۔ جس طرح عالم حق تعالیٰ کے تصرف میں ہے۔ جس طرح کائنات کے فعال
روح کہتے ہیں۔ اس کی بدولت انسان اسیر جہاں ہونے کے بجائے جہاں کو اپنا اسیر بناتا ہے۔

حیات چیست؟ جہاں را اسیر جاں کردن۔
تو خود اسیرِ جہانی کجا توانی کرد۔

نفس بہ نسبت جسم کے باطن اور مطلق حیثیت رکھتا ہے اور روح الٰہی مظہر ہے۔ وجود
۔ وظیفۂ حیات یہ ہے کہ مادے میں روحانیت پیدا کی جائے تاکہ انسانی فطرت الٰہی فطرت
...یک ہو جائے اور ناقابل تغیر اور مطلق کے ساتھ تغیر پذیر اور اضافی کی ہم آہنگی۔ روح کے۔
ہے برقرار ہے
زندگی خارج ذات کے ساتھ گہرا تعلق رکھتی ہے۔ اس تعلق کے ٹوٹنے کو موت کہتے ہیں مادے میں
(انرجی) مختلف شکلیں بدلتی رہتی ہے۔ کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جوں جوں مادے کی پیچیدگی
...افہ ہوتا ہے اور وہ زندگی کی اساس کسی شکلیں اختیار کرتا ہے تو اس میں توانائی کے نئے
...ہر ہونے لگتے ہیں۔ اس میں توانائی کی ایسی شکلیں ظہور پذیر ہوتی ہیں۔ جو معمولی مادے
کی معروف شکلوں سے بالکل مختلف ہوتی ہیں۔ باوجود ان تغیروں کے جو مادے اور توانائی
میں ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ دونوں اپنی اپنی جگہ قائم و برقرار رہتے ہیں جسم اور روح۔
...ے اور توانائی کی شکلیں ہیں۔ جو شکلیں بدل کر برقرار رہتے ہیں۔ مرنے کے بعد بھی۔
...انی وجود برقرار رہتا ہے۔ انسانی وجود کا مرکز اس کی روح ہے۔ جو ذات الٰہی کی طرح لازوال
موت عالم معنی کے سفر سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔

نظر اللہ پہ رکھتا ہے۔ مسلمان غیور؟
موت کیا شے ہے۔؟ فقط عالم معنی کا سفر
خود زندگی کا اقتضاء یہ ہے کہ موت کو خواب گراں سے زیادہ نہ سمجھا جائے ؎
اے برادر من ترا از زندگی دادم نشاں
خواب را مرگ سبک داں مرگ را خواب گراں
انسانی خودی اپنے اندرونی تجربے میں بھی اپنے خارجی وجود پر کامل یقین رکھتی ہے چاہے
...کو ٹھیک ٹھیک الفاظ کے ذریعے سے ظاہر نہ کر سکے جب ہم اپنی 'انا' کا تصور قائم کرنے کی

...ین کے احساس ذات ایسی حقیقت ہے جس کا انکار ممکن نہیں۔ انسانی وجود کو لئے عشق و وجدان تین
...ہیوم نے زندگی کو سمجھنے کی کوشش کی تو وہ اس نتیجے پر پہنچا۔ جب میں اپنے آپ ...
کہتا ہوں، غلط زن ہوتا ہوں تو اپنے سوا کسی اور ہی چیز سے دوچار ہوتا ہوں یا گرمی
روشنی یا سایہ یا محبت یا کرب یا انبساط کی کیفیتیں مجھے ملتی ہیں میں اپنے آپ کو کبھی بھی گر...
...سکتا اور سوائے ادراک کے مجھے کسی شے کا مشاہدہ نہیں ہوتا۔ "خودی یا ذات ...
تجربی فلسفے کی رو سے ... صحیح نہیں ہے۔ اگر خودی کو علم کی ... اشیاء ...
گا۔ تو ہرگز اس کا پتا نہیں لگ سکتا۔ اس کا علم اس طور پر ممکن نہیں جس طرح خارجی اشیا...
احساس نہیں لیکن بغیر اس کے احساس کوئی وجود نہیں رکھتا۔ تجربے کے لحاظ سے بھی ا...
محال ہے۔ ہماری ذات، عمل و تجربہ کرنے والی بھی ہے۔ اور علم حاصل کرنے والی بھی ...
ذریعے ہی ہمارے وجود کی اندرونی وحدت قائم و استوار ہوتا ہے۔ اگر یہ وحد...
نہ ہو تو شخصیت کے لئے یہ بے حضوری کی کیفیت ہوگی۔ جیسے اقبال موت کے متعلق...

بے حضوری ہے۔ تیری موت کا راز
زندہ ہو تو، تو بے حضور نہیں

خودی کی سب سے زیادہ نمایاں صورت یعنی جذبۂ عشق میں ظاہر ہوتا ہے جبکہ ...
کی ساری صلاحیتیں جو بالقوۃ تھیں۔ بالفعل ہو جاتی ہیں۔ اس طرح خودی کی شعوری ...
گیر روحانی قوت کے تخلیقی عناصر اپنا اظہار کرتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ زندگی کا ظاہری ...
ہے۔ لیکن شعوری قوت کے ذریعے اس کا تحقق انفرادی زندگی میں ہوتا ہے اس کا سبب
محرک جذبہ یا عشق ہے۔ جو اس امر کا ضامن ہے کہ زندگی اپنی محدود بنیادوں پر لامحدود ...
کر سکتی ہے۔ جذبہ و شوق کی حالت ہمارے احساس ذات کو اور بھی زیادہ قوی اور شدید ...
ہے۔ دیکارت نے کہا تھا کہ "چونکہ میں فکر کرتا ہوں اس واسطے میں ہوں" لیکن اقبال ...
کہتا ہے کہ "چونکہ میں عشق کرتا ہوں اس واسطے میں ہوں" یہ عشق نہ صرف زندگی کی ...
حیات بعد موت بھی اس کی بدولت ممکن ہوئی اپنے وجود کے متعلق فکر چاہے کتنے شبہات ...
لیکن عشق اس کو تسلیم کرا کے ہی چھوڑتا ہے۔

در بود و نبودِ من اندیشہ گماں ہا داشت
از عشق ہویدا شد ایں نکتہ کہ ہستم من

عشق سے زندگی میں استحکام اور موت کے بعد کی زندگی پر اعتبار پیدا ہوتا ہے ...
غلام ہے۔ اس واسطے کہ زمانے سے وہ بالاتر اور روح کا حقیقی جوہر ہے۔

کر پہلے مجھ کو زندگیٔ جاوداں عطا
پھر ذوق و شوق دیکھ دلِ بے قرار کا
کانٹا وہ دے کہ جس کی کھٹک لازوال ہو
یارب وہ درد جس کی کسک لازوال ہو

موت کے بعد شخصیت کے تسلسل کو باقی رکھنے کا ذریعہ بھی عشق ہے۔ اس کی بدولت کائنات کے نظامِ مقاصد میں خودی اپنی جگہ پیدا کرلیتی اور موت کے صدمے کو برداشت کرکے زندگی کو امکانوں کے نئے راستے پر ڈال دیتی ہے آدمی کا جسم مٹی میں مل جاتا ہے۔ لیکن اس کی روح کو عشق کے لطیفۂ نورانی کے ذریعے سے ان امور کی تکمیل کے لئے فراغت مل جاتی ہے۔ جو اس کا اصلی جوہر ہے اور جو اس کے ساتھ وابستہ رہتے ہیں۔ عشق اور بقائے حیات کے متعلق اقبال نے نکلسن کو ایک خط میں اس طرح اظہار خیال کیا ہے "انسان میں وجود کا مرکز شخصیت یا ایغو کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے شخصیت ایک جوش یا جد وجہد کی حالت ہے۔ شخصیت کا وجود اسی وقت تک ہے، جب تک کہ جوش وجہد کی یہ حالت برقرار ہے۔ چونکہ شخصیت کی کیفیت انسان کی اعلیٰ ترین متاع ہے اس لئے انسان کا فرض ہے کہ اس کا اہتمام کرے کہ اس میں ڈھیل نہ پڑنے پائے۔ وہ چیز جو اس جوش وجہد (کشمکش) کی حالت برقرار رکھتی ہے وہی ہمیں غیر فانی بنا سکتی ہے۔ غرض کہ شخصیت کے تصور کی بدولت ہمیں ایک معیار قدر مل جاتا ہے۔ جس سے ہم خیر و شر کے مسئلے کی جانچ کر سکتے ہیں۔ جو چیز شخصیت کو مستحکم کرنے والی ہے۔ خیر ہے اور جو چیز اس کو کمزور کرتی ہے۔ وہ شر ہے جس طرح خودی کی آزادی کے مسئلے میں مادہ کا ہمیں سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اسی طرح شخصیت کے لافانی ہونے پر بحث کرتے وقت ہمیں زمانے کے تصور سے سابقہ پڑتا ہے۔ برگساں نے ہمیں بتایا ہے کہ زمانہ کوئی لامحدود خط نہیں (مکانی لحاظ سے) جس میں سے ہم گزرنے پر مجبور ہیں شخصی بقا ایک آرزو ہے جس کو وہی حاصل کر سکتا ہے۔ جو اس کے لئے جد وجہد کرے۔ اس کا انحصار اس پر ہے کہ ہم اپنی زندگی میں فکر و عمل کے ایسے طریقے اختیار کریں جن کے باعث شخصیت کے جوش وجہد کی حالت برقرار رہ سکے۔ بدھ مت، ایرانی تصوف اور اسی قبیل کے دوسرے اخلاقی نظام ہمارے مقصد کیلئے مفید نہیں ہیں۔ لیکن ہم انھیں بالکل بے کار بھی نہیں کہہ سکتے کیوں کہ زبردست عملیت کے دور کے بعد ہمیں۔ خواب آور دواؤں کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ فکر وعمل کی یہ صورتیں زندگی کے دنوں کے لئے راتیں ہیں۔ غرضکہ اگر ہمارے عمل کا مقصد یہ ہے۔ کہ شخصیت کے جوش وجہد کی حالت برقرار رہے تو موت کا صدمہ بھی اس کو متاثر نہیں کر سکے گا۔ موت کے بعد ایک وقفہ ممکن ہے۔ جسے قرآن برزخ کہتا ہے جو موت اور حشر اجساد کے درمیان ہے۔ اس وقفے میں وہی خودیاں باقی رہ سکیں گی۔ جنھوں نے موجودہ زندگی میں اہتمام کر لیا ہوگا۔ اگرچہ زندگی کو اپنے عمل ارتقا میں۔

اعادہ و تکرار پسند نہیں ہے۔ تاہم برگساں کے فلسفے کی رو سے جیساکہ ولڈن کار نے لکھا ہے۔ حشرِ اجساد بھی عین، قرینِ قیاس) ہے زمانے کو جب ہم لمحوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ تو ہم اس کو مکانی تصور کرتے ہیں۔ اور پھر اس پر قابو حاصل کرنا ہمارے لئے دشوار ہو جاتا ہے۔ دراصل حقیقی زماں تک ہماری رسائی اس وقت ممکن ہے۔ جبکہ ہم اپنے وجود کی گہرائیوں پر نظر ڈالیں۔ حقیقی زماں اور زندگی کی بقا شخصیت کی اس جوش وجہد کی حالت کو برقرار رکھنے ہی سے ممکن ہے۔ جو اس میں پیدا ہو چکی ہو"

یہ جوش وجہد کی حالت عشق ہے جو زندگی کو دوام بخشتا ہے اس کی بدولت موت ایک مقامِ حیات سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ اس سے عشق اپنا امتحانِ ثبات کرتا ہے۔ زندگی انسانی۔ خودی کے عمل کی جولانگاہ ہے۔ اور موت آزمائش ہے، اس سعی وجہد کی جو وہ بقا کے لئے کرتی ہے۔ موت زندگی کی نفی نہیں بلکہ اس کے عمل تسلسل کا ایک مظہر ہے۔ اس واسطے کہ اس کا نشیمن ابدی حریمِ ذات سے وابستہ ہے۔ جب یہ ہے۔ تو خاکِ لحد کی تاریکی اس کا انجام نہیں ہو سکتا۔

خودی ہے۔ زندہ تو ہے موت اک مقامِ حیات
کہ عشق موت سے کرتا ہے۔ امتحانِ ثبات
خودی ہے۔ مردہ تو مانندِ کاہ پیشِ نسیم۔
خودی ہے۔ زندہ ہے۔ تو سلطانِ جملہ موجودات۔
حریمِ ذات ہے۔ اس کا نشیمنِ ابدی۔
نہ تیرہ خاکِ لحد ہے۔ نہ جلوہ گاہِ صفات

دوسری جگہ عشق کو مرگِ باشرف اور موت کو حیاتِ بے شرف سے تشبیہ دی ہے۔

کھول کے کیا بیاں کروں، سرِّ مقامِ مرگ و عشق
عشق ہے مرگِ باشرف، مرگ حیاتِ بے شرف

اقبال کے نزدیک موت کے بعد جنت کی زندگی سکون و جمود کی زندگی نہ ہوگی۔ اور نہ ہونی چاہیئے۔ وہاں بھی خودی کی جدوجہد جاری رہے گی۔ تاکہ وہ سیرِ دوام اور تماشائے وجود سے بہرہ در ہوتی رہے۔ اس کے نزدیک ملا کا حشر شوقِ قبر پر ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن اہل دل کے لئے جذبۂ عشق میں صبحِ نشور کی کیفیت موجود ہے۔ اس لئے وہ بانگِ صور سے بے نیاز ہوں گے۔

جنتِ ملا مئے و حور و غلام
جنتِ آزادگاں سیرِ دوام
جنتِ ملا خور و خواب و سرود
جنتِ عاشق تماشائے وجود
حشرِ ملا شقِّ قبر و بانگِ صور
عشقِ شورانگیز خود صبحِ نشور

کلاسکی اور نو افلاطونی عقیدے میں روح ہستی مطلق میں ضم ہو جائے گی۔ اس ابدیت میں بے امتیازی کی وحدت کارفرما ہوگی جو تمام تفرد اور علیحدگیوں کو اپنے میں سموئے گی۔ اس طرح تاریخ اور خودی کی نفی کی گئی ہے

اپی کیورس کی لذت پرستی کے عقیدے میں موت کے خوف وہراس کو فریب نظر سمجھا گیا ہے۔ اس کا قول ہے۔

"تمام برائیوں میں سب سے بڑی برائی موت ہے لیکن وہ
ہمارے لئے کچھ بھی نہیں۔ جب ہم زندہ ہوتے ہیں۔ تو موت
نہیں ہوتی اور جب موت ہوتی ہے۔ تو ہم زندہ نہیں
ہوتے۔ اس لئے موت نہ زندوں کے لئے خوف کا موجب
ہونی چاہئے۔ نہ مردوں کے لئے زندوں کے لئے اس کا وجود
نہیں اور مرے ہوئے خود وجود نہیں رکھتے۔"

موت کے کلاسکی تصوّر میں ایک قسم کے بہلاوے کی کوشش کی گئی ہے۔ تاکہ تاریخ بالکل فطرت کی طرح بن جائے اور ابدیت کی بے امتیازیوں میں گم ہو جائے۔

اسلامی عقیدے میں موت خود شر نہیں۔ اگرچہ اس کی وجہ سے جو خوف وہراس کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ وہ شر ہے موت کے خوف کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ انسان کو اندیشہ لگا ہوتا ہے۔ کہ مرنے کے بعد اس کے اعمال کی بازپرس نہ ہو۔ زندگی کا محدود، مشروط اور مختصر ہونا الٰہی حکمت کا جزہے۔ جس میں چوں وچرا کی گنجائش نہیں۔ حیات بعد موت اور حشر کے تصوّر میں تاریخ اپنی تکمیل کرتی ہے۔ ورنہ زندگی اور موت کا سارا سلسلہ بے معنی رہے گا۔ اس طرح ابدیت انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تنوع اور رجحانوں کی تکمیل کرے گی۔ جو تاریخ کی زمانی حقیقت میں ظہور پذیر ہوئے لیکن پوری طرح سے نہیں۔ حشر کے تصوّر سے زندگی اور تاریخ بامعنی بنتے ہیں۔ ورنہ حیاتیاتی امکان کے طور پر تاریخ اپنی تکمیل کرنے سے قاصر ہے۔ انسانی فطرت میں ایک ایسا ابدی جوہر ہے۔ جو موت کے بعد بھی باقی رہنے کا حق رکھتا ہے۔ روح کے غیر فانی ہونے میں یہ بات مضمر ہے کہ تاریخی اختراع کے وہ اجزاء باقی رہیں گے۔ جو محدود احوال سے ماورا ہوگئے۔ ہوں تاکہ زندگی کا اتمام وتکمیل ہو سکے

موت کے خوف میں ایک تو مٹ جانے کا خوف ہوتا ہے۔ اور دوسرے یہ کہ اعمال کی بازپرس ہوگی۔ مٹ جانے کا خوف زندگی کے بے معنی ہو جانے کا خوف ہے۔ یہ خوف اس لئے پیدا ہوتا ہے کہ۔ انسان اپنی کم نظری سے بجائے ذاتِ واجب کے اپنی ذات کو زندگی کے معنی کا مرکز بنا لیتا ہے۔ تاریخ میں چاہے خیر و شر کا امتیاز موثر نہ ہو سکے۔ لیکن آخری فیصلے میں اس کا امتیاز ہوگا۔ جو حقیقت میں انسانی آزادی کے لوازم میں ہے۔ بغیر اس کے زندگی بے معنی رہے گی۔ اور انسانی انجام پے توجہ رہے گا۔ یہ انسان کے مخلوق اور تابع ہونے کی سب سے اہم اور اٹل علامت ہے۔ اور اس سے

اس کے کافی بالذات ہونے کی تردید ہوتی ہے۔

حیات بعد موت کے متعلق خالص مابعد الطبیعی دلائل سے شاید انسان کو کبھی بھی پوری طرح تشفی نہ ہو سکے گی۔ اور نہ اس کی نسبت اس کا عقیدہ استوار ہو سکتا ہے۔ اسلامی تاریخ فکر میں ابن رشد نے فلسفیانہ طور پر اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن وہ اس میں کامیاب نہیں ہوا۔ آج کل مادہ پرستی کا دعویٰ ہے۔ کہ ذہن یا روح محض دماغ کی فعلی حالت ہے۔ اور موت کے بعد جب دماغ کی یہ حالت باقی نہیں رہتی تو ذہن یا روح کا وجود بھی باقی نہیں رہتا۔ اس لئے کہ بغیر جسم کے اس کے وجود کا تصور ممکن نہیں۔ برخلاف اس کے اسلامی عقیدہ یہ ہے۔ کہ انسانی روح مرنے کے بعد بھی باقی رہتی ہے۔

ماہرین نفسیات اس پر متفق نہیں ہیں کہ شعور کا تعلق صرف دماغ سے ہے۔ برقی رو کی توانائی (انرجی) بظاہر موصل (کنڈکٹر) میں ہوتی ہے۔ لیکن فی الحقیقت اس میں نہیں ہوتی بلکہ چاروں طرف کی فضا میں ہوتی ہے۔ اسی طرح روح کا وجود و بقا جسم سے کلیتہ وابستہ نہیں ہو سکتا۔

یہ نکتہ میں نے سیکھا ابوالحسن سے\
کہ جاں مرتی نہیں مرگِ بدن سے\
چمک سورج میں کیا باقی رہے گی\
اگر بیزار ہو اپنی کرن سے

اسلام میں انسانی انجام کی جو توجیہ پیش کی گئی ہے۔ وہ حیاتیاتی بھی ہے۔ اور اخلاقی بھی۔ حیاتیاتی اس معنی کر کہ قرآن پاک میں برزخ کا ذکر ہے۔ جو موت اور قیامت کے درمیان ایک درمیانی وقفہ ہے۔ اقبال کے نزدیک قیامت کا اسلامی تصور مسیحی تصور سے مختلف ہے۔ اسلام میں حیات نظام تکوینی کا ایک عالم گیر مظہر ہے جس کا اطلاق نہ صرف انسانوں پر ہوتا ہے بلکہ فطرت کی تمام ذی روح ہستیوں پر بھی ہوتا ہے۔ انسانی روح (انا) کی زمانے میں ابتدا ہوتی اور زمان و مکاں کے نظام طبیعی میں ظاہر ہونے سے قبل اس کا وجود نہیں تھا پھر مرنے کے بعد روح کا عالم طبیعی میں دوبارہ آنا ممکن نہیں جیساکہ عقیدۂ تناسخ کے ماننے والے کہتے ہیں۔ دراصل انسان کا محدود ہونا اس کی نجات کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ انسان اپنی انفرادی حیثیت سے خالق کائنات کے آگے جواب دہ ہوگا۔ کوئی دوسرا اس کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ وہ فیت کل نفس ما علمت ہر ایک کو اپنا بوجھ خود سنبھالنا ہوگا۔ ہر ایک کو اپنے گزشتہ اعمال کے نتائج بھگتنا پڑیں گے۔ اور اپنے مستقبل کے روحانی امکانوں پر حکم لگانا ہوگا۔ جیساکہ قرآن پاک میں بصراحت مذکور ہے۔ وکل انسان الزمنا طائرہ فی عنقہ و نخرج لہ یوم القیامۃ کتابا یلقاہ منشورا اقرا کتبک کفی بنفسک الیوم علیک حسیبا ہر شخص کے عمل کو ہم نے اس کی گردن میں چپکا دیا ہے قیامت

کہ روز ہم اس کے سامنے ایک لکھی ہوئی کتاب پیش کریں گے۔ اور کہیں گے کہ اپنی کتاب کو پڑھ آج تیرا نفس ہی تیرا حساب کرنے کو کافی ہے۔

اسلامی عقیدے میں نجات یہ نہیں کہ انفرادی خودی گم ہو جائے۔ بلکہ اس کی یکتائی اور استحکام میں اور اضافہ ہونا چاہیئے۔ قیامت بھی ان خودیوں کے اطمینان کو متاثر نہیں کر سکے گی۔ جنھوں نے عشق کے ذریعے گہرائی اور جوش و جہد کی کیفیت پہلے سے پیدا کرلی ہوگی ذات باری کا دیدار بھی خودی اپنی ہستی کو برقرار رکھ کر کرے گی۔ بعض کا یہ اعتراض ہے کہ محدود کا دیدار کیسے کر سکتا ہے۔ تو اس کا جواب اقبال نے یہ دیا ہے۔ کہ ذات باری کی لامحدودیت مکانی نہیں تصور کی جا سکتی۔ اس کی لامحدودیت کو اندرونی شدت اور عمق کے نقطۂ نظر سے تصور کرنا چاہیئے۔ نہ کہ وسعت کے نقطۂ نظر سے اس طرح ایک محدود خودی لامحدود ایغو کا قرب حاصل کر سکے گی۔ ل

اقبال کے ہاں بعض جگہ یہ نکتہ بھی ملتا ہے۔ کہ حیات بعد موت مشروط ہے صرف وہی اشخاص مرنے کے بعد باقی رہیں گے۔ جنھوں نے اپنی خودی کو مستحکم کر لیا ہوگا۔ بقول اقبال شخصی بقا ہمیں۔ بطور حق کے حاصل نہیں ہوگی۔ اس کو جدوجہد سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ انسان اس کا امیدوار ہو سکتا ہے" ان شعروں میں اسی خیال کی تشریح کی گئی ہے۔

بانگ اسرافیل اُن کو زندہ کر سکتی نہیں
روح سے تھا زندگی میں بھی تہی جن کا جسد
مر کے جی اُٹھنا فقط آزاد مردوں کا ہے کام
گرچہ ہر ذی روح کی منزل ہے آغوش لحد

اگر زندگی میں عشق و عمل کے ذریعے خودی اتنی مستحکم ہوگئی ہے۔ کہ وہ موت کے طبعی زوال و تحلیل کے صدمے کا مقابلہ کر سکتی ہے۔ تو وہ عالم برزخ میں داخل ہو جائے گی جو ایک قسم کا عالم شعور ہے یہاں زمان و مکاں کے متعلق خودی کا شعور وہ نہیں ہوگا۔ جو مادی زندگی کی حالت میں تھا۔ ہمارا موجودہ تصور زمانی ہمارے انفعال اعضا کا رہین منت ہے۔ شعور کی تبدیلی کا ہم بعض اوقات خواب کی حالت میں تجربہ کرتے ہیں۔ جس سے پتا چلتا ہے۔ کہ زمانے کے معیاروں میں اختلاف ممکن ہے۔ عالم برزخ میں روح انسانی کے لئے حقیقت کی نئی شاہراہیں کھل جائیں گی۔ یہاں بھی خودی اپنی جدوجہد کے سلسلے کو جاری رکھے گی۔ جب تک کہ وہ اپنے روحانی وجود کو اور زیادہ مستحکم نہ کرلے۔ موت کے بعد زندگی کوئی خارجی واقعہ نہیں۔ بلکہ ایغو کے عمل حیات کا تکمیل پذیر ہونا ہے۔ ایغو کی بقا جسدی وجود کے ساتھ وابستہ نہیں۔ جسمانی وجود کے تحلیل ہو جانے کے بعد بھی روحانی وجود باقی رہ سکتا ہے۔ ہم جسم کے بغیر روح کا تصور کر سکتے ہیں۔ اگر

موجود طبیعی حوالی کے علاوہ دوسرے حوالی کو تسلیم کرلیں جو طبیعی معقولات رکے لئے گریز) اور زمان ومکاں سے ماوراء ہیں۔ یہ خیال کرنا کہ موجودہ انسان کی ذہنی اور جسدی ساخت حتمی اور قطعی ہے۔ اور اس کے بعد ارتقاء کی کوئی منزل باقی نہیں رہی۔ سراسر غلط مفروضہ ہے۔ اس مفروضے کے تحت موت پر جب حیاتیاتی نقطۂ نظر سے غور کیا جاتا ہے۔ تو اس میں کوئی تعمیری اور ایجابی پہلو نہیں دکھائی دیتا۔ حالانکہ اس کا عقلی امکان ہے۔ کہ موت زندگی کی ایک منزل ہو۔ انسان کے ماضی کو دیکھتے ہوئے یہ بات بعید از قیاس معلوم ہوتی ہے۔ کہ اس کے جسدی انتشار سے اس کے سفر حیات کا خاتمہ ہو جائے فعال خودی زندگی میں بھی جسم کے ماورا اپنا وجود قائم کر لیتی ہے۔ وہ جسم سے آزاد ہو کر عمل کر سکتی ہے۔ یہ روحانی ماورائیت زندگی میں بتدریج حاصل ہوتی ہے۔ جسم میں روح کے جاری و ساری ہونے کا تصور ذاتِ باری کے کائنات میں جاری و ساری ہونے کے مماثل ہے۔ جس طرح ذاتِ باری کی ماورائیت باوجود جاری و ساری ہونے کے برقرار رہتی ہے۔ اسی طرح روح کی ماورائیت بھی قائم رہتی ہے۔ یہ تو زندگی کا تجربہ ہے کہ ذہن اپنی روحانی ترقی اور نشوونما کے ساتھ جسم سے ماوراء ہو جاتا ہے۔ ممکن ہے جسم سے آزاد ہو کر روح کی قوتوں میں اور زیادہ اضافہ ہو جائے۔ اور چونکہ انسان اپنی عملی اور روحانی زندگی کی اندرونی کیفیات کو صرف اپنی خودی کے حوالے ہی سے سمجھ سکتا ہے۔ جو جوہر حیات ہے۔ اسی طرح موت کے بعد بھی جب زمان و مکاں کا طبیعی پردہ اٹھ جائے گا۔ تو خودی کے توسط سے حیات اپنا تسلسل برقرار رکھ سکے گی۔ روحانی ارتقاء سے خودی میں یہ صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ کہ تجربوں کے حدود کے ماوراء پہنچ جائے اور عالم امر کی رازدار بنے۔ غرضیکہ زندگی اگر عالمگیر تخلیقی قوت کا مقصد ہو۔ تو جسدی انتشار سے اس کا خاتمہ نہیں ہو سکتا۔ اور خودی جیسی بیش بہا چیز موت کے صدمے سے تباہ نہیں ہو سکتی۔ اس لئے کہ وہ نظام تکوینی کی جان ہے۔

زندگانی ہے صدف، قطرۂ نیساں ہے خودی
وہ صدف کیا کہ جو قطرے کو گہر کر نہ سکے
ہو اگر خود نگر و خود گر و خود گیر خودی
یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مر نہ سکے

اقبال کے مابعد الطبیعی تصورات کا مرکزی نقطہ خودی ہے۔ جس کے بے پایاں امکانوں کی اس نے پردہ کشائی کی ہے۔ خودی میں صرف کائنات کی تسخیر کی صلاحیتیں ہی نہیں ہیں۔ بلکہ اپنے سب سے بڑے مد مقابل موت پر بھی قابو پانے کی قابلیت بدرجۂ اتم موجود ہے۔ تاکہ اس کے ارتقاء کی کوئی منزل آخری منزل نہ ہو۔

لحد میں بھی یہی غیب و حضور رہتا ہے
اگر ہو زندہ تو دل ناصبور رہتا ہے
مہ و ستارہ مثال شرارہ یک دو نفس
مئے خودی کا ابد تک سرور رہتا ہے
فرشتہ موت کا چھوتا ہے گو بدن تیرا
ترے وجود کے مرکز سے دور رہتا ہے

جناب وقار خلیل

رسولِ اکرمؐ

رسولِ اکرمؐ، سلام تم پر درود تم پر
خدائے برتر نے عرش پر آپ کو بُلا کر
شرف تکلّم کا بخش کر،
انبیاء میں افضل، بلند و برتر کسے تھا جانا، تمہیں کو جانا
ہم عاصیوں کا شمار کیا ہے، حساب کیا ہے
ہم امتی ہیں کرم ہو ہم پر

•

مقامِ احمدؐ، پیمبروں کی حدِ نظر سے بھی ماورا ہے
جنابِ آدمؑ کہ جدِّ اعلیٰ:
حضورؐ ہی کی تو معرفت سے خدا سے مانگا کئے اجالا
خلیلؑ نے آپ کے توسل سے جب دعا کی
وہ معجزہ یا دعا کا ثمرہ کہ آگ گلزار ہو گئی تھی
جنابِ ایوبؑ کی دعا نے قبولیت کا شرف جو پایا
وسیلہ کس کا تھا، آپؐ کا تھا
خدا نے اُن کو شفا کی تعبیر سے نوازا
جنابِ عیسیٰؑ مسیح نے بھی ظہورِ انورؐ کی دی بشارت
کہا کہ رتبہ فزوں ہے بے شک
جو طورِ پُر روشنی کی پہلی جھلک سے موسیٰؑ نے ہوش کھوئے
حضورِ اکرم کی آمد آمد، خدائے برتر سے گفتگو کا تھا پیش خیمہ
جنابِ یوسفؑ کا حُسن بھی تو جمالِ احمد کا ایک پرتو

اے ہادیِ اول اور آخرؐ، سلام تم پر، درود تم پر
ہم عاصیوں پر نظر کرم کی
خدائے برتر کی بارگہ میں، عرب کے سلطان، عجم کے سلطان
دیارِ مشرق، دیارِ مغرب
اور ہند کے گوشے گوشے میں رہنے والے سبھوں کی جانب سے
کملی والے! خدائے برتر سے اتنا کہیئے
کہ میری امت پہ رحم فرما!
خطائیں سب کی معاف فرما!!
"فضیلتیں دے، بشارتیں دے، محبتیں دے، عنایتیں دے"
رسولِ اکرمؐ! ہر اُمتی کی یہی دعا ہے
خدائے برتر سے آپ کہیئے
ہر اُمتی ہیں عزیز میرے، مرے وسیلے سے بخش دے تو
ہم عاصیوں پر نظر کرم کی۔
کہ ہم خدا کی زمیں پہ اپنے رسول کی رہگزر پہ ثابت قدم چلیں گے

•

یہ عہد کرتے ہیں کملی والے
پناہ دیجے، پناہ دیجے
رسولِ اکرم، شہِ مکرم، حضورِ سلم، درود تم پر سلام تم پر

•

ڈاکٹر طلحہ رضوی برقؔ

واصفِ شاہِ ہدیٰ حضرت رضاؒ

عالم باعمل فاضل بریلوی حضرت احمد رضا خاں صاحب اسلامی تاریخ کی ایک ایسی عبقری شخصیت اور نابغہ کا نام ہے جس میں انفرادیت کے سارے اوصاف مجتمع تھے۔ ؎

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں (میرؔ)

علم و فضل کے میدان میں حضرت رضا کی بسیار جہتی اہلِ نظر سے خراجِ عقیدت وصول کرتی رہے گی۔ ان کی شاعری، فنی نقطۂ نظر سے معیار و کمال کی حامل اور سر بسر حمد و نعت و منقبت پر ہی مشتمل ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ نعت ایک مشکل ترین صنفِ سخن اور باعثِ خیر و ثواب ہے۔ زورِ قلم اور جولانیِ طبع کے تحت اس فن میں قدم قدم پر خطرات کا سامنا ہے۔ وہ ذاتِ مقدس جس کی سرکار میں [illegible] ذرا بھی سوئے ادب حبطِ اعمال کا سبب ہو۔ اس کی مدح و نعت بڑے ہوش و حواس کا کام ہے۔ ع

"با خدا دیوانہ باش و با محمدؐ ہوشیار"

کی منزل ہمہ دم پیشِ نگاہ رہنی چاہئے۔ "الملفوظ" میں حضرت فاضل بریلوی نے فنِ نعت گوئی کی طرف واضح اشارہ فرمایا ہے۔

اپنی نعت نویسی کے لئے قرآن و حدیث کو ہی شمعِ راہ بنایا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا نعتیہ کلام افراط و تفریط کے عیب اور تخیل کی بے راہ روی سے پاک ہے۔ نعت گوئی میں آپ حضرت حسانؓ کی پیروی کافی سمجھتے ہیں جن کی نعتیں سن کر خود رسالت مآبؐ خوشنود ہوئے اور دعائیں فرمائیں۔ وہ کہتے ہیں ؎

زحمت میں غم و اشک کا ساماں بس ہے
افغانِ دلِ زار حدی خواں بس ہے
رہبر کی رہِ نعت میں گر حاجت ہو
نقشِ قدمِ حضرتِ حساںؓ بس ہے

احکامِ شریعت کی تبلیغ و نگرانی میں آپ بہت ہی سخت تھے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں۔

ہوں اپنے کلام سے نہایت محظوظ
بیجا سے ہے المنۃ للہ محفوظ
قرآن سے میں نے نعت گوئی سیکھی
یعنی رہے احکامِ شریعت ملحوظ

حدائقِ بخشش ہر دو حصص حضرت رضا کی نعتوں کا مجموعہ اور ایک ایسی متاعِ بے بہا ہے جس پر اردو کی نعتیہ شاعری ہمیشہ ناز کرے گی۔ حضرت رضا کی نعتیں سادہ، سہل، عام فہم، سوز و گدازِ قلب اور عاشقانہ جذبات سے مملو ہیں۔ مخصوص فنی نقطۂ نظر سے بھی مشکل اور سخت زمینوں میں آپ کی نعتیں بندش و تراکیب اور قدرتِ بیان کا سارا حسن رکھتی ہیں۔

اردو کی کلاسیکی شاعری کے وہ سارے اوصاف جن پر اہلِ زبان کو ناز ہے۔ حضرت رضا کے کلام میں بھرے پڑے ہیں۔ شوخیِ طبع کے باوجود آپ نے بڑی احتیاط سے عروسِ سخن کو ان تمام زیورات سے آراستہ کیا ہے۔ جو نعت گوئی کے تقدس و احترام کے ساتھ اس کے حسن کو

چار چاند لگاتے ہیں۔ شاعر کو بھی لیاقتِ فن کا پورا احساس تھا۔

بھی کہتی ہے بلبلِ باغِ جناں کہ رضاؔ کی طرح کوئی سحر بیاں

نہیں ہند میں واصفِ شاہِ ہدیٰ مجھے شوخیٔ طبعِ رضاؔ کی قسم

وہ ایک وہبی شاعر تھے، فن کاری حسن آفرینی کے لئے موزونیٔ طبع از بس ضروری ہے۔ یہ محض فیضانِ الٰہی ہے اور کچھ نہیں اسی لئے کہا گیا ہے اَلشُّعَرَاءُ تَلَامِیْذُ الرَّحْمٰن کیونکہ سنت

طبع موزوں نہ کسبی نہ عملی است ز عطیاتِ حقیقی لم یزلی است

انھوں نے زبان و بیان پر ملکہ حاصل کیا تھا۔ فارسی و عربی میں مہارت کے ساتھ ساتھ مقامی زبانوں کا بھی شعور رکھتے تھے۔ ان کی اردو لکھنؤ کی بامحاورہ ٹکسالی زبان ہے۔ کلام کی سنجیدگی، لب و لہجہ کی ہم آہنگی، طنطنہ اور زور اس میدان میں بے مثال استادی کی دلیل ہے۔ ایک نعت شریف کے چند اشعار میرے اس دعویٰ کی تصدیق کریں گے۔ ملاحظہ ہو۔

رشکِ قمر ہوں رنگِ رخِ آفتاب ہوں
ذرہ ترا جو اے شہ گردوں جناب ہوں

درِ نجف ہوں گوہرِ پاک خوش آب ہوں
یعنی ترابِ رہگذرِ بو تراب ہوں

گر آنکھ ہوں تو ابر کی چشم پُر آب ہوں
دل ہوں تو برق کا دلِ پر اضطراب ہوں

خونیں جگر ہوں، طائرِ بے آشیاں شہا
رنگِ پریدۂ رخِ گل کا جواب ہوں

بے اصل و بے ثبات ہوں بحرِ کرم مدد
پروردۂ کنارِ سراب و حباب ہوں

عبرت فزا ہے شرم گنہ سے مرا سکوت
گویا لبِ خموشِ لحد کا جواب ہوں

دل بستہ بے قرار جگر چاک اشکبار
غنچہ ہوں گل ہوں برق تپاں ہوں سحاب ہوں

موئی دبالی نظر دیں ہے گر کر جدا غلام
رشکِ مژہ رسیدۂ چشمِ کباب ہوں

مٹ جائے یہ خودی تو وہ جلوہ کہاں نہیں
دردا میں آپ اپنی نظر کا حجاب ہوں

شاید مجھے سقر میرے اشکوں سے ہے نہیں
آبِ عرقِ چکیدۂ چشمِ کباب ہوں

حسرت میں اپنا گر وہ سزا دیں حلیہ کی اے رضاؔ
ایسا جو ٹیڑھا مہرہ بھی وہ خوش تاب ہوں

واضح ہو کہ امیر غالب ہوں کہ مومنؔ ان میں شہرت و مقبولیت زیادہ ہے اور کمال فن پر حاصل ہوئی کیا رضاؔ کا کلام کسی طرح بھی اس معیار کیف و کم سے کم ہے؟ اس ایک نعتیہ غزل میں شعر و سخن کے کتنے محاسن جمع ہیں۔ اندازِ بیان، ندرتِ تشبیہ، صنعتِ لف و نشر، تضاد، مراعاۃ النظیر، رعایتِ لفظی، سادگی معانی، لب و لہجہ کا بانکپن، شوخیٔ طبع، مضمون آفرینی اور زور فکر اور کیا کچھ نہیں ہے۔

غالبؔ اردو کا مایہ ناز شاعر ہے، حضرت رضاؔ نے غالب کی جن زمینوں میں طبع آزمائی کی ہے۔ ان سے کچھ نمونے یہ ہیں۔ نظرِ انصاف سے دونوں کے اشعار دیکھئے اور معیار و منہاج کے پیشِ نظر ان پر صاد لگائیے۔ غالبؔ کی مشہور غزل ہے۔

غنچہ پھر نا شگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں
بوسے کو پوچھتا ہوں میں منہ سے مجھے بتا کہ یوں

حضرت رضاؔ فرماتے ہیں ؎

میں نے کہا کہ جلوہ ہے اصل میں کس طرح گمیں
صبح نے نورِ مہر میں مٹ کر دکھا دیا کہ یوں

غالبؔ کی ایک اور مقبول غزل ہے ؎

دیر نہیں حرم نہیں در نہیں آستاں نہیں
بیٹھے ہیں رہ گزر پہ ہم کوئی ہمیں اٹھائے کیوں

رضاؔ کی غزل کا اندازہ اس شعر سے لگائیے ؎

جان ہے عشقِ مصطفیٰ روز فزوں کرے خدا
جس کو ہو درد کا مزا نازِ دوا اٹھائے کیوں

حضور انور کے جسم منور کا سایہ نہ ہونے کی بہت ساری شعرا نے توجیہیں بیان کی جاتی رہی ہیں دیکھئے حضرت رضاؔ کس خوبصورتی سے کہتے ہیں ؎

راہ پہ ہیں کیا خاک فرش بیاضِ دیدہ کی
چادرِ ظل ہے ملگجی زیرِ قدم بچھائے کیوں

[illegible]
کوئی بجائے سوزِ غم سازِ طرب بجائے کیوں

آپ نے جو زمانہ پایا ہے وہ ہندوستان میں مسلمانوں کا زوال یافتہ عہد تھا۔ بادشاہت ختم ہو چکی تھی۔ انگریزوں کی غلامی کا دور تھا۔ مسلم معاشرہ، مسلم تہذیب اور اسلامی سلطنت کے عروج کو زیادہ دن نہیں گزرے تھے۔ ہزار عیوب کے باوجود فنونِ لطیفہ کی دلکشی بھی باقی تھی۔ شعر و سخن کا ہر طرف چرچا تھا۔ محفلیں گرم تھیں۔ زباندانی کے سکے بٹھائے جاتے تھے۔ حضرت رضاؔ اپنی بے شمار صلاحیتوں کے ساتھ اگر صرف اس میدان زباندانی میں اپنا علم لہراتے تو کوئی مقابل نہ تھا۔ مگر ان کی ساری توجہ حفاظت دینِ متین اور شریعت محمدؐ کی پاسبانی پر رہی۔ اسلام کے بنیادی عقائد پر جو بالتحریک حملے ہو رہے تھے۔ فتنۂ نجدیہ نے جو طوفان برپا کر رکھا تھا اور جزیرۃ العرب کو ہلاتا ہوا یہ زلزلہ جس تیزی سے ہندوستان میں بڑھ چلا تھا۔ اگر امام احمد رضا خاں اس کا توڑ نہ کرتے تو خدا معلوم کفریات وہابیہ کا سیلاب کتنوں کے سفینۂ ایمانی کو غرق کر دیتا۔ حضرت فاضل بریلوی نے جس جانفشانی اور جگر کاوی کے ساتھ رد وہابیہ کے لئے خود کو وقف کر دیا وہ کچھ انہی کا حصہ تھا ـــ

ع این کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

ان کی زندگی کا یہ مذہبی رخ ان کی شاعرانہ مقبولیت کی راہ میں حائل رہا۔ اور وہ اکثر حلقوں میں موردِ طعن و ملامت رہے۔ مگر یہ تو سنتِ روزِ ازل ہے کہ چراغِ مصطفویؐ سے شرار بولہبی ستیزہ کار رہا ہے۔ اہلِ سنت و جماعت کے امام عصر خاطرِ حق کے لئے کسی کو خاطر میں نہ لائے۔ انہیں اس کا احساس تھا۔ وہ لکھتے ہیں ؎

سُنّیت سے کھٹکے سب کی آنکھ میں
پھول ہو کر ہو گئے کیا خار ہم!

لیکن حوصلہ یہ تھا کہ ؎

کلکِ رضا ہے خنجرِ خونخوار برق بار
اعدا سے کہہ دو خیر منائیں نہ شر کریں

رسولِ مقبول نے نجد سے متعلق جو پیشنگوئیاں فرمائی تھیں وہ سب کی سب اپنے وقت سے ظاہر ہو گئیں۔ ابنِ عبدالوہاب نجدی نے جو کچھ کیا وہ کس سے پوشیدہ ہے۔ اس کے پیروؤں کے عقائد شیطانی ہیں معاذ اللہ۔ حُبِ رسولؐ کی شدت نے دشمنانِ رسولؐ کے لئے کلکِ رضاؔ کو واقعی خنجر خونخوار و برق بار بنا دیا تھا فرماتے ہیں ؎

مومن وہ ہے جو ان کی عزت پہ مرے دل سے
تعظیم بھی کرتا ہے نجدی تو مرے دل سے

تجھ سے اور جنت سے کیا مطلب وہابی دور ہو
ہم رسول اللہ کے، جنت رسول اللہ کی

ذکر روکے فضل کاٹے نقص کا جویاں رہے
پھر کہے مردک کہ ہوں امت رسول اللہ کی

کرے مصطفیٰ کی اہانتیں کھلے بندوں اس پہ یہ جرأتیں
کہ میں کیا نہیں ہوں محمدی ارے ہاں نہیں ارے ہاں نہیں۔

حضرت رضاؔ کی شاعری میں ان کی مذہبیت نے یہ رخ ضرور پیدا کیا ہے جو سراسر حقائق پر مبنی ہے اس کے باوجود

اگر خالص فنی اقدار کا جائزہ لیا جائے تو رضا کی شاعری دلّی اور لکھنؤ کی معیاری شاعری کے نمونے پیش کرے گی۔

زبان کی صفائی، شستگی و برجستگی اور سہل ممتنع کی مثالیں دیکھنی ہوں تو ذیل کے اشعار موجود ہیں۔

اے رضا سب چلے مدینہ کو ؎ میں نہ جاؤں ارے خدا نہ کرے

آنکھیں رو رو کے سُجانے والے ۔ جانے والے نہیں آنے والے
ذبح ہوتے ہیں وطن سے بچھڑے ؎ دیس کیوں گاتے ہیں گانے والے

کیوں رضا آج گلی سونی ہے
اٹھ میرے دھوم مچانے والے

اللہ اللہ کے نبیؐ سے ؎ فریاد ہے نفس کی بدی سے
شب بھر سونے ہی سے غرض تھی ؎ تاروں نے ہزار دانت پیسے

ان کے آگے دعویٰ ہستی رضا ۔ کیا بکے جاتا ہے یہ ہر بار ہم

ان کا تبحرِ علمی ان کے بیشتر اشعار سے ظاہر ہے۔ عربی و فارسی پر کامل عبور نے اشعار میں عربی فقروں کا اتنا حسین اور برجستہ پیوند لگا دیا ہے جس کی مثال کم ملتی ہے ؎

بے ابرِ کرم کے میرے دھبّے ؎ لَا تَغْسِلُهَا الْبِحَارُ آقا
اتنی رحمت رضا پہ کرلو ؎ لَا يَقْرَبُهُ الْبَوَارُ آقا
لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ تھا وعدۂ ازلی ؎ نہ منکروں کو عبث بدعقیدہ ہونا تھا

لمریات نظیرک فی نظرٍ مثلِ تو نہ شد پیدا جانا
جگ راج کو تاج تو رے سر سو ہے تجھ کو شہِ دوسرا جانا

آپ کی مشہور نعت ہے۔

واہ کیا جود و کرم ہے شہِ بطحا تیرا
نہیں سنتا ہی نہیں مانگنے والا تیرا

مقطع کا حسن ملاحظہ ہو ؎

اے رضا چیست غم از جملہ جہاں دشمنِ تست
کردہ ام مامنِ خود قبلۂ حاجاتے را!

ایک دوسری نعت ہے۔

پاٹ وہ کچھ، دھار یہ کچھ زار ہم
یا الٰہی کیوں کر اتریں پار ہم

مقطع فرماتے ہیں ؎

چشم پوشی و کرم شانِ شما ؎ کارِ ما بیباکی و اصرار ہم!

میں عرض کرچکا ہوں کہ حضرت رضا کی زبان خالص ٹکسالی زبان ہے ان کے یہاں کچھ ایسے الفاظ بھی بڑی عمدگی سے ادا ہوئے ہیں جو لکھنؤ کی خالص بیگماتی اردو کا جزو ہیں۔ مثلاً منگتا۔ گُنتا۔ بھرن خدائی خوار۔ گد گدی کرنا۔ سر پہ بلا اٹھانا۔ ہوا بتانا وغیرہ ؎

ان کا منگتا پاؤں سے ٹھکرا دے وہ دنیا کا تاج
جس کی خاطر مرگئے منعم رگڑ کر ایڑیاں
او شہیدِ نمائے زہر در جام گم جاؤں گدر عزتری بدی لٹ
بنہ ملنے کو قریب حضرت ہو دکھا ۔ لمعۂ باطن میں گمنے جلوۂ ظاہر کیا
اپنے کو چہ سے نکالا تو نہ دو
ہیں تو حد بھر کے خدائی خوار ہم
غفلتِ شیخ و شاب پر ہنستے ہیں طفلِ شیر خوار
کرنے کو گدگدی عبث آنے لگی بہار کیوں

؎ یادِ وطن ستم کیا دشتِ حرم سے لائی کیوں
بیٹھے بٹھائے بدنصیب سر پہ بلا اٹھائی کیوں

؎ نام مدینہ لے لیا چلنے لگی نسیم خلد
سوزشِ غم کو ہم نے بھی کیسی ہوا بتائی کیوں؟

روزمرہ، محاورات اور لب و لہجہ کا یہ ستھرا پن ،

ان کے کلام کا خاص جوہر ہے۔ اس کے باوصف سخت اور دشوار زمینوں میں حضرت رضا نے جو مضامین باندھے ہیں وہ ان کی قادر الکلامی پر دال ہیں۔ آپ کی طبیعت مشکل پسند تھی۔ اور یہ مشکل بھی انہیں اتنی سہل تھی۔ گویا کوئی تکلف ہی نہیں چند اشعار ملاحظہ ہوں۔ ؎

کیا ٹھیک ہو رخِ نبویؐ پر مثالِ گل
پامال جلوہ کفِ پا ہے جمالِ گل
رنگِ مژہ سے کر کے خجل یادِ شاہ میں
کھینچا ہے ہم نے کانٹوں پہ عطرِ جمالِ گل

؎ عارض شمس و قمر سے بھی ہیں انور ایڑیاں
عرش کی آنکھوں کے تارے ہیں وہ خوشتر ایڑیاں
دو قمر، دو پنجۂ خور، دو ستارے دس ہلال
ان کے تلوے، پنجے، ناخن پائے اطہر ایڑیاں
چرخ پر چڑھتے ہی چاندی میں سیاہی آگئی
کر چکی ہیں بدر کو ٹکسال باہر ایڑیاں

تشبیہات کی کچھ اور تازہ کاری دیکھئے ؎

دل اپنا بھی شیدائی ہے اس ناخنِ پا کا
اتنا بھی مہِ نو پہ نہ اے چرخِ کہن پھول
دل کھول کے خوں رولے غمِ عارضِ شہ میں
نکلے تو کہیں حسرتِ خوں نابہ شدن پھول

وہ بہادر شاہ ظفر کی طرح لمبی لمبی ردیف میں بھی اشعار بڑی آسانی سے کہتے ہیں۔ ؎

رخِ دن ہے یا مہرِ سما یہ بھی نہیں وہ بھی نہیں
شبِ زلف یا مشکِ ختا یہ بھی نہیں وہ بھی نہیں
نہ آسمان کو یوں سرکشیدہ ہونا تھا حضورِ خاکِ مدینہ خمیدہ ہونا تھا
رضا جو دل کو بنانا تھا جلوہ گاہِ حبیب تو پیارے قیدِ خودی سے رہیدہ ہونا تھا

تلمیحات سے اشعار کا معنوی حسن سوا ہوتا ہے۔ حضرت رضا کے کلام میں تلمیحات کی کثرت ہے جو ان کی وسعتِ علمی اور اعجازِ سخن کی دلیل ہے۔ شاعر کو اس صنعت گری پر کمال حاصل ہے ؎

غنچے ما اوحیٰ کے جو چٹکے دنیٰ کے باغ میں
بلبلِ سدرہ تک ان کی بو سے بھی محرم نہیں
حسنِ یوسفؑ پہ کٹیں مصر میں انگشتِ زناں
سر کٹاتے ہیں ترے نام پہ مردانِ عرب
برقِ انگشتِ نبیؐ چمکی تھی اس پر ایکبار
آج تک ہے سینۂ مہ میں نشانِ سوختہ

وہ رعایت لفظی سے بھی اپنے کلام میں بڑی دلکشی اور جاذبیت پیدا کرتے ہیں ؎

خاک ہو کر عشق میں آرام سے سونا ملا
جان کی اکسیر ہے الفت رسول اللہ کی

کیا ہی ذوق افزا شفاعت ہے تمہاری واہ واہ
قرض لیتی ہے گنہ پرہیزگاری واہ واہ
انگلیاں ہیں فیض پر ٹوٹے ہیں پیاسے جھوم کر
ندیاں پنجاب رحمت کی ہیں جاری واہ واہ

حسنِ تکرار موسیقیت کی جان ہے۔ حضرت رضا ان رموزِ فنی سے پوری طرح آگاہ تھے۔ ترنم نغمگی اور موسیقیت بحروں کے انتخاب پر بھی موقوف ہے۔ ذیل کے اشعار شاعر کے بالیدہ شعور کی غمازی کرتے ہیں ؎

کرتا تو ہے یاد ان کی غفلت کو ذرا روکے
لِلّٰہ رضاؔ دل سے ہاں دل سے ارے دل سے

کرے مصطفےٰ کی اہانتیں کھلے بندوں اس پہ یہ جرأتیں
کہ میں کیا نہیں ہوں محمدی ارے ہاں نہیں ارے ہاں نہیں

اس میں زم زم ہے کہ تھم تھم اس میں جم جم ہے کہ بیش
کثرتِ کوثر میں زم زم کی طرح کم کم نہیں

چمک تجھ سے پاتے ہیں سب پانے والے
مرا دل بھی چمکا دے چمکانے والے

اس سے انکار ممکن نہیں کہ اگر فاضل بریلوی صرف شاعری پر ہی اکتفا کرتے تو آج اردو دنیا میں ان کا مقام میر و غالب ہی کی طرح محفوظ سمجھا جاتا اور شہرت ان کے قدموں سے لگی رہتی لیکن اس عاشقِ رسول نے شعرگوئی و سخن طرازی کو اپنے جذبۂ عشقِ رسولؐ کے اظہار کا وسیلہ بنایا۔ اظہار و ابلاغ کا یہ وسیلہ چونکہ اپنی نوعیت میں فن تھا۔ لہٰذا انھوں نے اس کے آداب و احترام کو کما حقہ ملحوظ رکھتے ہوئے فنی تقاضوں کو تمام و کمال پورا کیا وہ یہ کہنے میں حق بجانب تھے ؎

ملکِ سخن کی شاہی تم کو رضاؔ مسلّم
جس سمت آ گئے ہو سکے بٹھا دیئے ہیں

اے رضاؔ جانِ عنادل ترے نغموں پہ نثار
بلبلِ باغِ مدینہ ترا کہنا کیا ہے۔

نعت شریف

چمکا عرب کا چاند کچھ اس آب و تاب سے
دنیا کی نظریں پھر گئیں ہر اک شباب سے

پوچھو نجوم و برق و مہ و آفتاب سے
چمکے ہیں کس کے نور سے کس انتساب سے؟

نعتِ رسولِ پاکؐ کے اس انتساب سے
بخشش کی ہے توقع خدا کی جناب سے

آدمؑ سے لے کے عیسیٰ مسیحؑ تک کوئی نبیؑ
رتبہ میں بڑھ سکا نہ رسالتمآبؐ سے

ہے جنؐ کا حسن باعثِ صد نازشِ چمن
ان کو مثال دیں بھلا کیا گلاب سے؟

گفتار بھی قرآن ہے کردار بھی قرآن
حضرت کی شان ہے عیاں اُم الکتاب سے

الصالحون لی و الطالحون لی
امت ہے خوش نصیب بہت اس خطاب سے

وہ حاملانِ عرش ہوں یا ساکنانِ فرش
پہنچا ہے سب کو فیض رسالت مآب سے

نعتِ نبیؐ ہے عینِ عبادت تو پھر بھلا
زاہدؔ ہو مستفید نہ کیوں اس ثواب سے

از
سید غوث الدین علی خاں زاہدؔ قادری

دسمبر ۱۹۸۵ء
ذوق نظر حیدرآباد

ڈاکٹر یعقوب عمر

شاہنامۂ اسلام میں حضورؐ کی سیرت نگاری

آخری قسط

شاہنامۂ اسلام کی چوتھی جلد میں حفیظ کے قلم کی جولانی میں بظاہر کچھ کمی محسوس ہوتی ہے۔ اور قاری کچھ اکتانے لگتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ قلم میں کوئی ضعف نہیں آیا۔ ایسا صرف اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ حفیظ نے اس جلد میں غیر ضروری تفصیل اور طوالت سے کام لیا ہے جس سے جولانی سخن میں کچھ کمی کا احساس ہوتا ہے۔ اگر اس جلد میں سے کچھ غیر ضروری اشعار کم کر دیے جائیں تو اس میں اور پہلی تین جلدوں کے اشعار میں بہت کم فرق رہ جائیگا۔

جنگ احد کے خاتمے سے اس جلد کا آغاز ہوتا ہے۔ شہدائے احد کی تدفین کے بعد زخمیوں کیساتھ حضورؐ مدینے کی طرف مراجعت کرتے ہیں۔ خود سرکار دوعالمؐ کے دندان و رخسار زخمی ہیں۔ سیدنا حمزہؓ جیسے الوالعزم اور جانثار چچا کی شہادت کا صدمہ آپ کو مضطرب کئے ہوئے ہے۔ اس کے باوجود خلق عظیم کی شان نظر آتی ہے کہ ؎

در دندان جبین و شانہ و رخسار زخمی تھے ❊ صحابہ سے زیادہ احمد مختار زخمی تھے
مگر سرکارؐ کو پروا نہ تھی اپنی جراحت کی ❊ تمنا تھی فقط اصحاب کے آرام و راحت کی
کہاں سامان جراحی نمک تک اس جگہ کم تھا ❊ تسلی دینے والا ہاتھ ہی زخموں کا مرہم تھا
شریک حال امت درد مند و دردمنداں تھا ❊ نگاہ لطف و احساں دیکھ کر ہر زخم خنداں تھا

منافقوں نے اس موقع سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور مسلمانوں کے زخموں پر نمک چھڑکنے کی انتہائی کوشش کی اور طرح طرح سے دلآزاری کی باتیں کیں کہ ہماری بات مان کر مدینے ہی میں رہ کر مقابلہ کرتے تو یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔ مگر مسلمانوں کی قیادت ایک اس عظیم الشان ہستی کے ہاتھوں میں تھی ایسی باتیں سن سن کر بھی ؎

مگر ایمان محکم اور محکم ہوتا جاتا تھا ❊ یہ زہر اخلاص کے زخموں کا مرہم ہوتا جاتا تھا
رسالت کی زباں سے تقنطو فرمائی جاتی تھی ❊ قیام دور اسلامی کی ساعت آتی جاتی تھی
اندھیرا اٹھتا جاتا تھا اجالا ہوتا جاتا تھا ❊ محمد مصطفٰےؐ کا بول بالا ہوتا جاتا تھا

منافق زہر کی پچکاریاں لیکر نگاہوں میں ۔ پڑے پھرتے تھے گھر گھر میں گلی کوچوں میں راہوں میں
مگر ایمان والے تھے سپاس و شکر کے عادی ۔ نہ گریاں تھے نہ نالاں تھے نہ شاکی تھے نہ فریادی
یہ زخمی شمشیر زنجیر اخوت کے تھے زنجیری ۔ بہم ایک دوسرے کی کر رہے تھے سب خبر گیری
شکستہ ہڈیاں جڑتی تھیں پھر سنگھا و سلے تھے ۔ زدوغ پنبہ و مرہم سے تن پر پھول کھلتے تھے ۔

ایک بہترین فوج کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہر دم جوکنا رہے اور ہر حالت میں کوچ کے لئے تیار رہے اور یہ ایسی قوم سے تیار کی جاسکتی تھی جو بہترین نظم و ضبط کی حامل ہو اور جس کی تربیت ایک بہترین اور بے مثال منتظم کے ہاتھوں ہوئی ہو۔ وہ منتظم جو خود زخموں سے چور رہے۔ مگر اس کو ایک ایسی قوم کی تشکیل منظور ہے جو آگے بڑھ کر دنیا کی امانت سنبھالے وہی منتظم یعنی سرکار دوعالم عین اس حالت میں حکم دیتے ہیں کہ

مجاہد جو احد کے معرکے میں آج تھے شامل ۔ انہیں ہونا ہے پھر رنگ جہاد و جنگ پہ مائل۔
وہ مسجد میں ہوں یا اپنے گھروں میں ہوں کہیں ہوں بھی ۔ شکستہ پا ہوں یا مغرور و مجروح زمیں بھی ہوں۔
نماز صبح پڑھتے ہی مدینے سے نکلنا ہے ۔ تعاقب میں قریشی فوج کے ہم سب کو چلنا ہے

اصحاب رسول اللہ جو بے حد خستہ اور زخمی تھے۔ اپنی تمام تکلیفوں کو بھول کر اٹھ کھڑے ہوئے

پیمبر کا یہ حکم آیا جو ہی گوش سماعت میں ۔ اٹھا لبیک کہہ کر ہر کوئی جوش اطاعت میں
جراحت بار تھے۔ یہ بحر سے زخمی تھے خستہ تھے ۔ نماز صبح میں لیکن یہ بندے دست بستہ تھے

سرور عالم اپنی امت کے ہمراہ اپنے جانثاروں کے جھرمٹ میں ایک بے مثال کردار لئے نمایاں تھے

تھے ان سب میں زیادہ رحمۃ للعالمین زخمی ۔ در دنداں شکستہ تھے جبین مہ جبیں زخمی
نشاں تھا خود کی کڑیوں کا رخسار مبارک پہ ۔ اثر تھا گوہر دنداں کا گفتار مبارک پہ
اسی حالت میں امت کی امامت اس نے فرمائی ۔ ادائے فرض و تاب استقامت اس نے فرمائی
وہی اک عبدہٗ بیشک وہی انسان کامل تھا ۔ فرض بندگی میں دوسروں سے بڑھ کے شامل تھا۔
عبودیت میں تھی مصروف اک مغرور پیشانی ۔ وہ پیشانی وہ آمت کہ جس نے تاج سلطانی
جھکی تھی دیکھتی تھی شعلۂ طور مسجد میں ۔ کہ بے پروائے ضرب و زخم تھا اک نور مسجد میں
وجود پاک گویا اک چمن تھا زخم کاری کا ۔ مگر اللہ اکبر حوصلہ محبوب باری کا
ادھر محراب مسجد میں امامت اس کا حصہ تھا ۔ ادھر میدان میں فوجوں کی قیادت اس کا حصہ تھا
بڑھا جب وہ در مسجد سے اسوار فرس ہو کر
معیت میں امڈی تکبیر آواز جرس ہو کر

مسلمانوں کے اس حوصلہ اور سرکار دوعالم کے اس جراتمندانہ اقدام نے جنگ احد سے لوٹے ہوئے کفار مکہ کو دم بخود کر دیا ورنہ وہ تو اس آس میں ٹھہرے ہوئے تھے کہ مسلمان

مرہم پٹی اور آہ و بکا میں مصروف ہونگے۔ اور یہ مدینے پر شب خون مار کر قصہ ختم کردیں گے۔ چنانچہ جب قریش کا جاسوس معبد خزاعی مدینے سے آیا تو ابوسفیان نے نہایت مسرت کے عالم میں اس سے پوچھا معبد کچھ مدینے کا حال سناؤ ؎

مدینہ آج جیسے سادہ چپ ہے یا آہ و بکا میں ہے ۔ محمدؐ اور محمدؐ کی جماعت کس ہوا میں ہے
ہم اپنے مرکبوں کو دے رہے ہیں آج پھر کاوا ۔ ارادہ ہے کہ چل کر شہر یثرب پر کریں دھاوا

معبد نے جو جواب دیا اس پر ابوسفیان کو یقین ہی نہیں آیا۔ مگر جب آنکھ سے دیکھ لئے تو اس کی بھی سٹی گم ہو گئی معبد نے کہا کہ مدینے میں ؎

کوئی بھی شہر بھر میں رات گھر میں تھا نہ آسودہ ۔ مثالِ شعلہ جو آلہ ہیں سب غیض آلودہ
محمدؐ کے لب و رخسار پہ جو زخم آیا ہے ۔ یہ منظر اور بھی لیش و غضب میں انکو لایا ہے
سویرے منہ اندھیرے چل چکا ہے شہر کا لشکر ۔ غضب کی فوج غصے کا سمندر قہر کا لشکر

ابوسفیان کی بے یقینی پر ؎

کہا معبد نے اٹھ کر خود مدینے کی طرف دیکھو ۔ نظر آتا ہے کیا ٹیلے کے پیچھے صف بصف دیکھو

ابوسفیان اور کفار ان قریش نے دیکھا تو وہ بھی حواس باختہ ہو گئے۔ یا تو مدینہ پر شب خون مارنے کے منصوبے بنا رہے تھے یا لشکر کفار کو یوں بھاگنے پر مجبور ہونا پڑا ؎

نہ پائی دسترس اہلِ ہدایت پر تہ ہاری پر ۔ ابوسفیان مجل تھا کفر کی اس نامرادی پر

اہلِ ایمان کی اس جاںبازی نے جہاں ان کے ایمان کی مضبوطی اور ثابت قدمی کو ہویدا کیا وہیں کافروں کو نفسیاتی ہزیمت سے دوچار کر دیا۔ حمراء الاسد تک اہلِ ایمان نے کافروں کا تعاقب کیا۔ اور شام کو وہیں پڑاؤ ڈالا۔ حضورؐ نے چند مخبروں کو خبر لانے کے لئے آگے بھیج دیا۔ وہ لوگ تہجد تک خبر لے آئے کہ کفار بڑی تیزی سے مکے کی طرف بھاگے جا رہے ہیں۔ یہ سن کر حضورؐ نے ارشاد فرمایا ؎

انھیں کھینچے لئے جاتی ہیں زنجیریں تذبذب کی ۔ لہٰذا اب کوئی حاجت نہیں ان کے تعاقب کی
یہ سب ہے عفو و احسانِ خدائے قادر و قاہر ۔ کیا ہے جس نے حملہ آوروں کو خائب و خاسر

مسلمانوں کی بہترین تربیت جو حضورؐ کے ہاتھوں ہوئی غالباً اس کی کوئی نظیر گزشتہ امتوں میں نظر نہیں آتی۔ اتنے بڑے جانی نقصان پر جو سوگ ماتم عام طور پر قوموں میں بچھ جاتی ہے۔ اور جس سے نوجوانان قوم میں یا تو انتہا پسندی پیدا ہو جاتی ہے یا پھر تنزلیت کا غلبہ ہو جاتا ہے اس کا سدباب

حضورؐ نے اسلامی تعلیمات کے ذریعے اس طرح کیا کہ اس امت وسطیٰ میں ایسا متناسب اعتدال پیدا ہوا کہ یا بلد دشائید اس پر صبر عظیم کی جو دولت اسلام نے اپنے ماننے والوں کو دی ہے۔ علم نفسیات کے ماہرین نے اسے بہترین اندمال آفات و مصائب تسلیم کیا ہے۔ چنانچہ جب عرب کے رواج کے مطابق شہدائے احد پر مدینے میں صدائے آہ و بکا بلند ہوئی تو حضورؐ نے سب کو دلاسہ دیتے ہوئے فرمایا ؎

تمہیں اسلام صبر و ضبط کی تلقین کرتا ہے ؏ صبوری کی خدائے پاک خود تحسین کرتا ہے
شہیدا حسان کرتے ہیں فرزندان آدم پر ؏ لہو ان کا فریدا بن برساتا ہے عالم پر
نہ جانو مردہ آب تیغ کے لذت چشیدوں کو ؏ خدا ضائع نہیں کرتا کبھی اپنے شہیدوں کو
لہٰذا یہ بکا یہ پیٹنا یہ سوگ یہ ماتم ؏ یہ کپڑے پھاڑنا یہ بین کرنا بیٹھ کر باہم
کرو پرہیز ان سے جاہلیت کی ہیں یہ باتیں ؏ بجائے ان کے لازم شکر حق ہے اور مناجاتیں
یہ ارشادات والا سن کے لوگوں کو سکوں پایا ؏ سمجھ میں معنیٰ انا الیہ راجعون آیا

لوگوں کے زخم مندمل ہوتے چلے گئے۔ سرکار دو عالم کی رحمت و شفقت نے لوگوں کے دلوں سے بہت جلد یہ داغ زائل کر دئے آپ نے سیدنا حمزہؓ کی دردناک شہادت کو جس صبر و شکیبائی سے انگیز کیا اس نے بھی عامۃ المسلمین پر گہرا اثر کیا بلکہ ہمارے آقا نے خود اپنے عمل سے صبر و استقامت کی جو مثال قائم کی ہے۔ وہ ہمارے لئے بھی قابل تقلید ہے اور اس کی بنا پر امت وسطیٰ میں بے مثال صبر و ایثار پیدا ہو گیا۔ مدینے کے لوگوں کو صحیح رشتہ حضورؐ سے قربت نے کندن بنا دیا۔ حضورؐ کی وضع نے امت کے دلوں پر اپنی محبت کا نقش دائمی قائم کر دیا تھا۔ اس پر امت ناز کرتی تھی۔

زہے امت ملا جس کو محمد مصطفیٰ ہادی ؏ کہ جس کی شرع بھی سادی ہے جس کی وضع بھی سادی
یہ چہرہ صاف آئینہ تھا سینے کی صفائی کا ؏ یہی چہرہ مدینے میں تھا مرکز دل ربائی کا
محبت آفریں آنکھیں محبت آفریں چہرہ ؏ محمدؐ کی حسیں آنکھیں محمدؐ کا حسیں چہرہ
اسی چہرے سے ماہ و مہر نے تابانیاں پائیں ؏ بہ فیض جبہ سائی نور کی پیشانیاں پائیں
وہ خورشید رسالت صبح خنداں جس کی پیشانی
وہ پیشانی مقدر کے ستارے جس سے نورانی

پھر حضورؐ کے جو اصحاب صفہ تھے۔ ان کی حضورؐ سے محبت اور حضورؐ کو جو ان سے محبت تھی اس کی مثال عیسائیوں کے زبردست حلقۂ رہبانیت سے بھی نہیں دستیاب ہو سکتی یہ وہ لوگ تھے کہ ؎

فقط اللہ واحد کی رضا مطلوب تھی ان کو ؏ فقط دنیا میں حب مصطفیٰ مطلوب تھی ان کو
انھیں پروائے زینت تھی نہ دولت سے علاقہ تھا ؏ لباس ان کا تھا حسرت ان کا دامن فقر و فاقہ تھا
حضور مصطفیٰ لاتے تھے یہ کاسے گدائی کے ؏ ملا وہ کچھ کہ قاسم بن گئے ساری خدائی کے۔

بظاہر بے سر و ساماں تھے اور آفت کے مارے تھے ۔ مگر اصحابِ صفہ سرورِ عالم کے پیارے تھے
جو حاصل تھا انھیں ملتا تھا کب وہ بادشاہوں کو ۔ میسر تھی کہاں یہ سرفرازی کج کلاہوں کو
عبودیت کے سجدے اس لئے تھے نقشِ پیشانی ۔ یہ اک دن ٹھکرائیں گے اٹھ کر تاجِ سلطانی
یہ بندے تھے پناہِ دردمنداں کی پناہوں میں ۔ پناہیں دیتے پھرتے تھے یہ دنیا بھر کو راہوں میں
یہ بندے زندگانی ہی میں تھے اللہ سے واصل ۔ کہ ان کو دولتِ حبِّ رسول اللہ تھی حاصل
یہ مسجد میں ہمیشہ حاضرِ دربار رہتے تھے ۔ بہ فکرِ اکتسابِ دولتِ دیدار رہتے تھے
بلند ان کی نگاہیں، فقر تھا ان کے شمائل میں ۔ رسول اللہ اکثر بیٹھتے تھے ان کی محفل میں
روا رکھا نہ جاتا تھا کوئی بھی امتیاز ان سے ۔ یہ بندے خاص تھے سرور تھا بندہ نواز ان سے

جب ان کی صف میں شامل آپ خود بھی کملی والا ہو
جہاں میں رتبۂ اصحابِ صفہ کیوں نہ بالا ہو

ادھر مدینے میں بظاہر امن و سکون تھا مگر باطل پرست قوتیں ہر طرف اسلام کے خلاف ریشہ دوانیوں میں مصروف

ادھر دار الاماں تھا اور نویدِ دورِ خوش حالی ۔ ادھر چاروں طرف فتنہ، غضب وہ جوشِ پامالی
جہاں بھر میں محمدؐ کا مدینہ ایک بستی تھی ۔ جہاں راحت کا دورہ تھا جہاں راحت برستی تھی
منافق اور یہود اپنی دغا بازی پہ قائم تھے ۔ دلوں میں سنگ و آہن تھے زبانوں سے ملائم تھے
مگر فرما رہے تھے چشم پوشی حضرتِ باری ۔ کہ مسلکِ عفو تھا اسلام کا آئینِ آزادی

کافر برابر پھونکوں سے اس چراغ کو بجھانے کی کوشش کرتے رہے مگر اللہ تعالیٰ نے سرکارِ دوعالم کی قیادت میں اس کو اور تابناک بنانے کا کچھ ایسا اہتمام فرما دیا تھا کہ باطل اسلام پہ کڑے سے کڑا وار کرنے کے باوجود ناکام رہا۔ واقعہ بیر معونہ ایسا دلدوز اور ہمت شکن تھا کہ دنیا کی کوئی اور تحریک اس کے نتیجے میں ختم ہو جاتی مگر ؎

بنائے آسماں بھی جس زمیں پر ڈگمگاتی تھی
محمدؐ تھا کہ اس کے پاؤں میں لغزش نہ آتی تھی

قبیلۂ بنو عامر کے سردار ابو براء کو حضور سے مخاصمت تھی وہ اپنے کینے کو دل میں چھپائے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا کہ میں بیمار ہوں اور شفا حاصل کرنے آیا ہوں حضورؐ نے اس کے لئے دعا کی اور شہد عطا فرمایا۔ جسے استعمال کرنے سے وہ شفایاب ہو گیا۔ دوسری مرتبہ اس نے آکر کہا کہ میرے قبیلے کے لوگ اسلام سے واقف ہو جائیں تو شائد اسلام قبول کر لیں اگر آپ چند اصحاب روانہ فرمائیں تو نوازش ہوگی۔ حضورؐ کو نجدی قبائل سے دغا بازی کا اندیشہ تھا۔ چنانچہ آپ کے پس و پیش کرنے پر خود ابو براء نے ان کی ضمانت لی۔ کسی سردار کا ضمانت لینا عرب میں حتمی سمجھا جاتا تھا۔ لہٰذا آپ نے ستر حفاظ انصار میں

سے ابو براء کے ساتھ روانہ کردیئے۔ اور جاتے وقت اسلامی تبلیغ کے لئے نکلنے والے اس گروہ سے خطاب فرمایا ؎

نبیؐ نے ان کے ذوق علم کی تحسین فرمائی ؏ حیا و صبر و عفو و حلم کی تلقین فرمائی
کہا تبلیغ حق ہی اصل مقصد ہے نبوت کا ؏ نہ آنے پائے اس میں شائبہ اظہار قدرت کا
تمھیں جو کچھ بھی پیش آئے اسے انگیز کرنا ہے ؏ بہرحالت جواب تلخ سے پرہیز کرنا ہے
تمھیں معلوم ہے ذات خدا دانا و بینا ہے ؏ وہ شاہد ہے شہادت ہی مسلمانوں کا جینا ہے
وہ ساعت سب سے بڑھکر نیک ہوتی ہے رسولوں پہ ؏ کیا جاتا ہے ان کو ذبح جب ان کے اصولوں پہ

محمدؐ کے رفیقو فی امان اللہ ہاں جاؤ
خدا کے نام لیواؤ خدا کا نام پہنچاؤ

ان منزہ ہداتِ شب بیدار مبلغین اسلام کو گھیر کر نہایت سفاکی سے قتل کردیا گیا۔ رحمۃ للعالمین کو اس بے انتہا ظلم پر سخت افسوس اور دلی صدمہ ہوا کہ آپ نے ان کے قاتلین پر لعنت فرمائی۔ اسی طرح قبیلہ قارہ نے بھی آپ سے درخواست کی کہ ان کے یہاں بھی مبلغین کو بھیجیں۔ بیر معونہ کے شہیدوں کی ابھی خبر نہ آئی تھی کہ آپ نے ان کے ہمراہ دس مبلغین بھیج دیئے۔ انھیں بھی راستے میں گھیر کر آٹھ صحابہ کو شہید کردیا گیا۔ اور مکر و حیلے سے دو صحابیوں حضرت خبیبؓ اور حضرت زیدؓ کو کافروں نے زندہ گرفتار کرکے مکے میں ان لوگوں کے ہاتھ نیلام کردیا جن کے سرپرست احد کے میدان میں مسلمانوں کے ہاتھوں جہنم رسید ہوئے تھے۔ حضرت خبیبؓ کو جس نے خریدا اس نے اسے اپنی بیوی کی نگرانی میں چھوڑ گیا اس نیک عورت نے دریافت کیا کہ اگر کوئی چیز کی خواہش ہو تو پوری کردے۔ خبیبؓ نے کہا کہ مجھے کچھ نہیں چاہیئے البتہ طہارت کے لئے استرا مل جائے تو ٹھیک ہے۔ اس نے اپنے کمسن لڑکے کے ہاتھ استرا بھیجا۔ مگر کچھ دیر بعد وہ اس تصور سے کانپ گئی کہ کہیں قیدی اس کے لڑکے کو استرے سے نقصان نہ پہونچائے دوڑتی ہوئی آئی تو یہاں عجیب منظر دیکھا کہ معصوم لڑکا قیدی کی گود میں بیٹھا اس سے پیاری پیاری باتیں کررہا تھا جب عورت نے آکر قیدی سے اندیشے کا حال سنایا تو حضرت خبیبؓ نے کہا کہ مائی میں مسلمان ہوں جو کسی معصوم کی جان نہیں لے سکتا۔ اللہ اکبر! صاحب خلق عظیم کی بلند کرداری خوشبو کی طرح ان کے صحابہ میں رچ بس گئی تھی کہ خبیبؓ نے اس عورت سے کہا ؎

یہ طفلِ بے گناہ، معصوم مخلوقِ خدا بچہ ؏ یہ پیارا بھولا بھالا سیدھا سادھا بے ریا بچہ
خدا جانے خدا کو اس سے کیا کچھ کام لینا ہے ؏ اسے شاید کسی دن رایتِ اسلام لینا ہے۔
مسلمان اور خونخواری کرے یہ ہو نہیں سکتا ؏ خدا کا بندہ غداری کرے یہ ہو نہیں سکتا

وہ عورت اس زبردست اخلاقی مظاہرے سے مبہوت ہوگئی ؎

وہ اب بھی کر پر تو ہے یہ سب خلق محمدؐ کا ؏ چراغ ان کے دلوں میں ہے اسی نور مجرد کا

الغرض حضرت خبیبؓ کو اشرار نے اذیتیں دے دے کر شہید کردیا پھر حضرت زیدؓ کی باری آئی اذیت

دینے سے پہلے ابو سفیان نے زیدؓ سے اسلام چھوڑ دینے کی فرمائش کی مگر انھوں نے بھی ثابت قدمی سے انکار کیا تو ابو سفیان بول اٹھا کہ ابھی اذیت شروع ہوگی تو پتہ چلے گا۔ بقول ؎

تری نیت بدل جائے جو یہ منظر نظر میں ہو ۔۔۔ محمدؐ ہوں یہاں تیری جگہ تو اپنے گھر میں ہو۔

حضرت زیدؓ سے برداشت نہ ہو سکا انھوں نے جواب دیا ؎

کہا او بے وقوف او لذتِ ایماں سے بیگانے ۔۔۔ محمدؐ اور محمدؐ کی محبت کو تو کیا جانے

کہاں برداشت دیکھی تو نے شیدائے محمدؐ کی
خلش تک ناگوار ہے مجھے پائے محمدؐ کی

اس اخلاقی بلندی کے مظاہرے کی کافر تاب نہ لا سکے اور انھیں بھی بیدردی سے شہید کر دیا گیا۔

یہودی مکے میں حضورؐ کے الطاف و عنایات کے زیر سایہ رہتے تھے مگر یہ ایسی بدترین محسن کش قوم تھی کہ طرح طرح سے سرکار دو عالم اور مسلمانوں کو اذیت دیتی تھی۔ یہ لوگ کھلم کھلا حضورؐ کو سلام کرنے کے بجائے بدشگونی کے الفاظ کہتے تھے۔ جسے سن کر ایک مرتبہ حضرت عائشہؓ کو غصہ آگیا تو حضورؐ نے حضرت عائشہؓ سے نرمی اختیار کرنے کے لئے کہا۔ یہودیوں کے قبیلہ بنو نضیر نے حضورؐ کو قتل کرنے کی سازش کی۔ سازش کا راز فاش ہو جانے کے بعد حضورؐ نے انھیں پابند کرنے کے لئے ان سے معاہدہ تحریر کرانا چاہا مگر ان کی سرکشی اتنی بڑھ گئی کہ معاہدہ کرنے کے بجائے قلعہ بند ہو کر مقابلے پر آمادہ ہو گئے۔ آخر حضورؐ نے ان کا محاصرہ کر لیا۔ اور انھیں ہتھیار ڈالتے پڑے مگر کس شرط پر؟ یہ دنیا کی تاریخ کا عجوبہ ہے کہ ظالموں کی سرکوبی کر کے انھیں شکست سے دوچار کرنے کے باوجود خلقِ عظیم کا یہ مظاہرہ کہ نہ صرف جاں بخشی کی بلکہ جس قدر اٹھا کر لے جا سکتے تھے [illegible] و زر لیجانے کی اجازت بھی دیدی۔ دنیا کی تاریخ فتح و شکست میں رسول اللہؐ کی اس سیرت کی مثال نہیں مل سکتی ؎

محمدؐ جود کا منبع محمدؐ لطف کا معدن ہے ۔۔۔ محمدؐ عفو کا دریا محمدؐ رحم کا مخزن
محمدؐ کو نہ تھا مطلوب ذاتی انتقام ان سے ۔۔۔ فقط مقصود تھی آزادیٔ دار السلام ان سے
نبوت نے انھیں ہر شے اٹھانے کی اجازت دی ۔۔۔ جدھر بھی جاتے تھے ان کو جانے کی اجازت دی
مسلمانوں سے فرمایا کرو احسان جوانمردو
انھیں کچھ زادِ راہ بھی دو سواری بھی عطا کر دو

الغرض یہودیوں کے جانے کے بعد مسلمانوں نے ایک گونہ سکون و اطمینان محسوس کیا اور بہ جد کم سہولتوں کے ساتھ باہم شیر و شکر ہو کر زندگی بسر کرنے لگے۔ مدینہ دار السلام بن چکا تھا ؎

بجا تھا جن دنوں اندھیر دنیا کے سفینے میں ۔۔۔ وجودِ اہلِ حق موجود تھا بس اک مدینے میں
محمدؐ کا مدینہ تھا کہ تھا فردوس بہار آرا ۔۔۔ وگرنہ باغِ آدم زاد تھا وقفِ خزاں سارا

کہاں تھے یہ نصیب اللہ اکبر سنگ اسود کے ؎ یہاں کے پتھروں نے پاؤں چومے تھے محمدؐ کے
غلاموں کی رہائی کا یہاں سامان ہوتا تھا ؎ کوئی زنگی ہو یا رومی یہاں آدم کا پوتا تھا
حیاتِ نو میسر تھی چمن کو اپنے مالی سے ؎ اُمیدیں جھومتی تھیں پتے پتے ڈالی ڈالی سے
نگاہِ عرشیاں میں فرش فردوس نظارا تھا ؎ خدا کے فضل سے انسانِ کامل جلوہ آرا تھا
یہاں روح الامین خیر الامین کے در پہ حاضر تھا ؎ یہاں رحمت تھی سرگرم عمل اللہ ناظر تھا
نہ رعب پادشاہی تھا نہ فر تاجداری تھی ؎ محمدؐ کی قیادت میں خدا کی شرع جاری تھی
نہ شانیں تھیں دکھاوے کی نہ پوشاکیں نمائش کی ؎ نہ تمہیدیں تفاخر کی نہ ترکیبیں ستائش کی
یہاں ہر رنگ کے پھولوں کا اک گلزار کھلتا تھا ؎ غریبوں بے زبانوں کو لب گفتار ملتا تھا
یہاں مٹی نے سیکھا مطلع الانوار ہو جانا ؎ نصیبے کو جگانا دولتِ بیدار ہو جانا
یہاں پس ماندگی نے درس پایا شہسواری کا ؎ یہاں حاصل تھا محکوموں کو رتبہ شہریاری کا
دلوں میں جاگ اٹھتا تھا یہاں احساس خدمت کا ؎ مریض انسانیت کو مل رہا تھا غسل صحت کا
یہاں مسجد تھی جس میں نور کے فوارے چلتے تھے ؎ یہاں قرآں تھا جس سے فیض کے دریا ابلتے تھے
یہاں وہ کملی والا تھا محمدؐ نام تھا جس کا ؎ جہاں میں صلح و پاس و آشتی پیغام تھا جس کا
نہ شخصی دولت و حشمت نہ تخت و تاج والا تھا ؎ محمدؐ سرورِ کونین تھا معراج والا تھا
محمدؐ مرکزِ خیر دو عالم مخزنِ خوبی ؎ ہمہ اخلاق اور احسان سراپا حسن محبوبی
وہ مامورِ من اللہ مذہب اسلام کا بانی ؎ دلانے آیا تھا بندوں کو غیر اللہ سے آزادی

نہ حاصل تھی جو قوت بادشاہوں کجکلاہوں کو
محمدؐ نے وہ بخشی عام مومن کی نگاہوں کو

بدر و احد میں کا فران قریش کے منصوبوں کی ناکامیابی اور یہودیوں کی ہزیمت نے ان تمام باطل قوتوں کو ایک ساتھ کر دیا تھا اور یہ سب ملکر اپنے تمام وسائل سے خورشید ایماں کی تابانیوں کو تاریکی میں بدلنے کا تہیہ کر چکی تھیں چنانچہ عرب کے تمام ممتاز قبائل اور یہودیوں کے گٹھ جوڑ سے ایک عظیم لشکر تیار کیا گیا جو مدینہ پہ حملہ کی نیت سے چل پڑا۔ یہ معرکہ جنگ احزاب کہا جاتا ہے۔ اور یہ حق و باطل کی آخری بڑی مڈبھیڑ تھی جس کے نتیجے میں باطل کی کمر ٹوٹ گئی۔

آنحضرتؐ نے صحابہ کو مسجد میں بلایا اور مشورہ طلب کیا۔ اس پر حضرت سلمان فارسیؓ کی رائے سب سے زیادہ صائب تھی۔ ملت اسلامی کی غیر جانبداری اور اسلامی اخوت میں مساوات کے انقلابی اصول ملتے ہیں۔ یہ اس کی عملی مثال تھی کہ ایک ایسی ہستی کی رائے کو تسلیم کیا گیا جو غیر عرب تھی۔ اس سلسلہ میں رائے کی اصابت پیش نظر تھی۔ رائے دینے والا کون ہے۔ اسلام کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں کیونکہ وہ تو عالمگیر اخوت کا علمبردار ہے

عرب و عجم کی عصبیت اس کی بنیادی تعلیمات کے منافی ہے۔ چنانچہ سرکارِ دو عالم نے سلمان فارسیؓ کی رائے پر مدینے کے اطراف خندق کھودنے کا فیصلہ کیا ؎

رسولِ پاکؐ نے اس رائے کی تحسین فرمائی ✤ پسندِ خاطرِ عالی ہوئی سلمان کی دانائی
حدیں قائم ہوئیں خندق کی دستِ پاک ہادی سے ✤ ہوئے مصروفِ کار اہلِ وفا ذوقِ ارادی سے
زمیں پر دید نی تھی آسمانی نور کی صورت ✤ نبیؐ شامل تھا مزدوروں میں اک مزدور کی صورت
نگاہِ عرش سوئے فرش تھی حیرت سے آئینہ ✤ جمی تھی بازوؤں پر گرد اٹا تھا خاک سے سینہ

دنیا کی کوئی تحریک اس کی مثال پیش نہیں کر سکتی کہ خود قائد اور کمانڈر ایک معمولی کارکن یا سپاہی کی طرح عام لوگوں میں بلا امتیاز شریک کار ہو جائے اور رسول اللہؐ کے کیا کہنے فداک ابی و امی آپ نہ صرف شریک کار تھے بلکہ شریکِ حال بھی تھے اور اس سلسلے میں فاقہ کشی کی بناء پر اہلِ ایمان کو جو دشواری پیش آرہی تھی وہ کیفیت زیادہ شدت کے ساتھ خود سرکارِ دو عالم کی بھی تھی۔ رُخِ شامی پہ خندق کھودنے کے دوران ایک سخت چٹان حائل ہو گئی ؎

لگا کر ضرب پتھر پہ جوان ہمبیر سب ہارے ✤ پیمبرؐ کی طرف تکنے لگے اللہ کے پیارے
گزارش کی یہ پتھر ہو گیا ہے کام میں حائل ✤ غلامانِ نبی کی قوتیں ہیں بھوک سے زائل
کیا نظارا حسنِ صابری کا چشمِ شاہد نے ✤ کہ پتھر باندھ رکھا تھا شکم پر اس مجاہد نے
تبسم لب پہ آیا اور شکم سے پیرہن سرکا ✤ ہوا آئینہ سب پہ حوصلہ صبرِ پیمبرؐ کا

عجب عالم نظر آئے یہاں فاقہ گزاری کے
کہ دو پتھر بندھے تھے پیٹ پہ محبوبؐ باری کے

اس دوہری فاقہ کشی کے باوجود اللہ کے رسول کے حوصلے کا یہ عالم تھا کہ ؎

اڑا دی چادرِ حیرت فلک پر اس نظارے نے ✤ لیا دستِ مبارک میں کدال اللہ کے پیارے نے
زبانِ پاک سے اللہ اکبر کی صدا نکلی ✤ لگائی ایک ضرب ایسی کہ پتھر سے ضیا نکلی
مرقع قصر ہائے احمر بن شام کا پایا ✤ اشارہ اہلِ دیں نے غلبۂ اسلام کا پایا
لگائی دوسری اک ضرب جب اللہ والے نے ✤ دکھایا اک نیا منظر مقدر کے اجالے نے
اجالے میں جھلک تھی فارس کے قصرِ مدائن کی ✤ یہ ضربِ دستِ حق کنجی تھی کسریٰ کے خزائن کی
پڑی ضربِ سوم سنگین چٹاں اب پارہ پارہ تھی ✤ نبیؐ کے ہاتھ کی قوت جہاں میں آشکارا تھی
نظر خیرہ ہوئی اس مرتبہ بھی وہ چمک دیکھی ✤ یمن کا ملک دیکھا شہرِ صنعا کی جھلک دیکھی

یہ نظارے فتوحاتِ ممالک کے اشارے تھے
نبیؐ کے ہاتھ نے سب کام امت کے سنوارے تھے

خندق تیار ہوگئی۔ کافروں کا لشکر مدینے کی سرحد پہ آپہونچا۔ چوبیس ہزار لوگوں کے مقابلے میں ایک ہزار اہل ایمان، بڑا عجیب مقابلہ تھا۔ کافر خندق کے عادی نہ تھے۔ عرب میں یہ پہلا جنگی تجربہ تھا۔ اس خندق کو عبور کرنے کی کوشش میں کئی کافر جہنم رسید ہوگئے۔ چنانچہ شدید تیر اندازی شروع ہوگئی۔

اس دوران چار سوار اپنی طاقت پہ نازاں گھوڑے کداتے ہوئے خندق میں آگئے اور مبارز طلبی کی۔ ان میں عبدِ وُد عرب کا مشہور پہلوان تھا۔ اس نے للکارا کہ میں ایک ہزار کا مقابلہ کر سکتا ہوں، ہے کوئی میرے مقابل میں آنے والا؟ جواب میں حضرت علیؓ نے جن کے چہرے سے جلال ہاشمی ہویدا تھا۔ رسول اللہ سے اذن جہاد مانگا۔ حضرت نے تین مرتبہ منع کیا کہ یہ عرب کا مشہور پہلوان عبدِ ود ہے تو حضرت علیؓ نے عرض کی مگر میں جانتا ہوں ؎

جلالِ ہاشمی اسوقت چہرے سے ہویدا تھا ؎ نگاہوں میں وہ گرمی تھی کہ صد خورشید پیدا تھا
یہ صورت دیکھ کر مسرور تھا وہ نورِ ربانی ؎ جزاک اللہ کہا اور چوم لی حیدرؓ کی پیشانی
طمانیت کا عہدِ دائمی لولاک نے باندھا ؎ کہ عمامہ علیؓ کے سر پہ دستِ پاک نے باندھا

غرض حضرت علیؓ نے انتہائی بہادری سے مقابلہ کرتے ہوئے عبدِ ود کو جہنم رسید کیا ؎

گرے مٹی میں ابن عبدِ ود کی لاش کے ٹکڑے ؎ دو رنگی کے مظاہر بنکے پہ فاش کے ٹکڑے
رسول اللہ کی آنکھیں تھیں بامِ عرش کی نگراں ؎ نگاہِ عرش تھی عالی مقام فرش کی نگرانی

کافروں کی ایک نہ چلی تو انھوں نے مدینہ کے منافقین کو بغاوت پر ابھارنے کی کوشش کی چنانچہ ایک ایک کرکے وہ لوگ بہانے سے اپنے گھروں کی حفاظت کا عذر پیش کرکے رخصت ہونے لگے ؎

نبیؐ سنتا تھا روز و شب بہانے ان لعینوں کے ؎ اسے معلوم تھا جو کچھ بھی دل میں تھا لعینوں کے
نہ تھی بے غیرتوں کو تاب اب غیرت دلانے کی ؎ تحمل سے اجازت ان کو مل جاتی تھی جانے کی
براہِ مکر و حیلہ یہ منافق سب کو لے سرکے ؎ رہِ صدق و صفا پہ رہ گئے پیرو پیمبرؐ کے

منافق حسب معمول ساتھ چھوڑ گئے تو مدینے کے آخری سرے پہ بسنے والے یہودی قبیلے بنو قریظہ نے کافروں کی حکمت عملی کی پیروی میں مستورات اور مسلمان بچوں کو نشانہ بنانے کی کوشش کی مگر سرکار دو عالمؐ کی تربیت نے عورتوں کو بھی جوانمرد بنا دیا تھا۔ آپ کی پھوپھی حضرت صفیہؓ نے ایک بدنیت یہودی کو خیموں کے اطراف دیکھا تو خود باہر نکل کر اس کا خاتمہ کر دیا۔

مسلمانوں کی ثابت قدمی اور صبر انتہا پہ تھا، کافروں کی ناکہ بندی انتہائی شدید تھی۔ ان نامساعد حالات میں اللہ کے رسول نے دستِ دعا بلند فرمائے ؎

بسوئے عرش دیکھا رحمتِ مواج نے آخر ؎ دعا کو ہاتھ اٹھائے صاحبِ معراج نے آخر
الٰہی کفر کی طاقت میں ایسا زلزلہ آئے ؎ دوبارہ جمع ہونے کا نہ ہرگز حوصلہ پائے
الٰہی دعوئے باطل کو اور باطل کو رد فرما
محمدؐ اور اصحاب محمدؐ کی مدد فرما

حضورؐ نے دعا کے ساتھ ساتھ جنگی حکمت عملی بھی بروئے کار لائی اور وہ اس طرح کہ کافران قریش یہود اور دیگر عرب قبائل کا گھناونا اتحاد پارہ پارہ ہوگیا اور ان میں زبردست پھوٹ پڑگئی۔ یہود نے ساتھ چھوڑ دیا۔ دوسرے دن کافران قریش نے ایک فیصلہ کن حملے کا ارادہ کرلیا مگر ہوتا وہی ہے۔ جو منظور خدا ہوتا ہے۔

خبر کیا تھی محمدؐ نے دعا کو ہاتھ اٹھائے ہیں ؎ خبر کیا تھی زمین پر حاملان عرش آئے ہیں

رات کو وہ زبردست آندھی آئی کہ کافروں کے خیمے ساز و سامان سمیت اڑ گئے۔ آگ کے انگارے تیز ہوا میں شرر باری کرتے ہوا اڑتے نظر آنے لگے جس سے اور دہشت پیدا ہوگئی۔ ابوسفیان کو پورا یقین ہوگیا کہ اگر وہ یہاں ٹھہر گیا اس کی اور پورے لشکر کی موت یقینی ہے اس نے اندھیرے ہی میں لشکر کو کوچ کا حکم دیا۔ اور انتہائی بدحواسی میں سب سے پہلے بھاگ کھڑا ہوا ؎

بلا کا عبرت افزا انقلاب چرخ گرداں تھا ؎ ابھی تک شور برپا تھا ابھی اک ہو کا میداں تھا
اڑا کر لیگئی اندھوں کو آندھی اس اندھیرے میں ؎ سحر تک خاک اڑتی رہگئی باطل کے ڈیرے میں
سحر کے وقت جب گونجی صدا اللہ اکبر کی ؎ تو باطل ہوچکی تھیں ظلمتیں باطل کے لشکر کی
نسیمِ صبح کے آزاد جھونکے سرسراتے تھے ؎ طلوعِ مہر کا عالم تھا ذرے مسکراتے تھے
یہ اصحاب اور یہ ایمان اصحاب محمدؐ کا
کرشمہ تھا فقط مہر جہاں تابِ محمدؐ کا

(ختم شد)

نعت شریف

تو ہی ہوشِ اول تو حسنِ ازل ؎ نہیں تیرا ثانی نہ تیرا بدل
تجھے دیکھ لینا عبادت مری ؎ تری یاد ہے میری مشکل کا حل
محمدؐ محمدؐ محمدؐ ہی ہے ؎ مرے لب پہ شام و سحر آجکل
جنونِ محبت بھی ہو باادب ؎ مدینہ ادب کی جگہ ہے سنبھل
اسے دین و دنیا کی دولت ملی ؎ ملا جس کو دامن ترا بے محل
جو اپنی طرح ان کو سمجھے اسے ؎ سمجھ لو کہ یہ ہے دماغی خلل
قریب آگیا ہے دیارِ نبیؐ ؎ نہ ہو مضطرب صرف دو گام چل
نبیؐ کی محبت میں جو مرگیا ؎ اسی کے قدم چومتی ہے اجل
کرم کے سہارے پہ بے ہوش ہوں ؎ نہ زہد و عبادت نہ حسنِ عمل

بے ہوش محبوب نگری

نعتِ شریف

اپنی ہر سانس کو اک ساز بناتے رہیے — نغمۂ عشقِ نبیؐ آپ سناتے رہیے

مجھ سے کہتا ہے مرا جذبِ عقیدت ہر دم — جب بھی موقع ملے بس نعت سناتے رہیے

انؐ سے الفت ہے حقیقت میں عبادت اپنی — اس حقیقت کو زمانے سے چھپاتے رہیے

آپ سے پوچھیں اگر سیرتِ محبوبِ خداؐ — پوچھنے والوں کو قرآن سناتے رہیے

مشغلہ اور کوئی آپ روا مت رکھیے — ہاں مگر، ذکرِ نبیؐ آپ سناتے رہیے

طور تک موسیٰ عمرانؑ کی رسائی معلوم — عرش تک بھی کوئی پہنچا ہے بتاتے رہیے

آپ شائستۂ آدابِ محبت ہیں اگر — نام سنتے ہی معاً ہوش سے جاتے رہیے

مذہبِ عشق میں جائز یہ نمائش تو نہیں — ان سے الفت مگر ہر آن جتاتے رہیے

"یا محمدؐ" یہ کوئی کفر کا نعرہ تو نہیں — آپ یہ نعرہ بہر حال لگاتے رہیے

کل کے دن دامنِ سرورؐ کے یہ موتی ہوں گے — دیدۂ تر سے سدا اشک بہاتے رہیے

رہِ طیبہ میں کیسے آبلہ پائی کا خیال — آپ ان کانٹوں کو پلکوں سے اٹھاتے رہیے

دل کے کاشانے میں یادوں کا اجالا رکھیے — شمع کی لو کو سدا آپ بڑھاتے رہیے

جب بھی آ جائے تصور میں مدینے کی گلی — احتراماً نگہ و دل کو جھکاتے رہیے

فرقتِ شاہؐ میں آنکھوں سے جو آنسو نکلیں — اپنی پلکوں پہ انہیں آپ سجاتے رہیے

گر مدینے ہی میں مرنے کی تمنا ہے تمہیں — دیدہ و دل میں مدینے کو بساتے رہیے

بے وضو نام بھی لینا ہے خلافِ حرمت — خود کو اس جرأتِ بیجا سے بچاتے رہیے

کس نے سمجھا ہے حقیقت کو نبیؐ کی عابد

اتنے پردے ہیں کہ بس آپ اٹھاتے رہیے

بچوں کا صفحہ

انگوٹھی کا حساب

ہارون رشید کے کئی لڑکے تھے۔ ان میں سے قاسم موتن نامی لڑکے کو باپ کی حکومت و دولت اور دنیاوی جاہ و جلال کی کوئی پرواہ نہ تھی چنانچہ ان تمام چیزوں سے علٰحدگی اختیار کرتے ہوئے وہ ہمہ وقت فکرِ آخرت اور عبادت خداوندی میں مصروف رہا کرتا تھا اس کے لباس اور رکھ رکھاؤ سے بھی بادشاہ کے لڑکے کی جھلک نہیں محسوس ہوتی تھی۔ ایک دن وہ ہارون کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ ہارون کے خواص میں سے ایک شخص سے دیکھ کر ہنسنے لگا۔ ہارون نے اس سے ہنسی کا سبب پوچھا۔ اس نے جواب دیا۔ اس نے اپنے اس عمل اور پرانے لباس اور عوام میں اپنی رفت و آمد کی وجہ سے آپ کو ذلیل و رسوا کر رکھا ہے۔ ہارون نے جواب دیتے ہوئے کہا" اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ اب تک ہم نے اس کے لئے کوئی منصب معین نہیں کیا ہے" اس کے بعد ہارون نے اپنے لڑکے کو طلب کیا اور نصیحت کرتے ہوئے کہا تم نے اپنی یہ کیا حالت بنا رکھی ہے۔ اس طرزِ رہائش سے تمہاری رسوائی ہوتی ہے۔ میں ایک صوبے کی حکومت تمہارے نام لکھ دیتا ہوں۔ تم اس بلند مرتبہ حکومتی منصب کو سنبھالو اور پرستش و عبادات کا کام بھی انجام دو۔ قاسم نے کہا ابا جان آپ کے کئی لڑکے ہیں مجھے اس دنیاوی عہدہ و مقام اور جاہ و جلال سے دور رکھئے اور مجھے دوستانِ خدا کے سامنے شرمندہ نہ کیجئے"۔ بہرحال ہارون نے اتنا زیادہ اصرار کیا کہ قاسم کو سکوت اختیار کرنا پڑا۔ اس کے بعد اس نے درباری کاتب کو اشارہ کیا کہ مصر کی حکومت قاسم کے نام لکھ دے تاکہ قاسم کل صبح مصر کے لئے روانہ ہو جائے لیکن قاسم رات ہی میں بغداد سے بصرہ پہنچ گیا۔ عبداللہ بصری کا بیان ہے کہ میرے گھر کی دیوار گر گئی تھی اور مجھے مزدور کی تلاش تھی۔ میں مزدور کی تلاش میں بازار گیا۔ دیکھا کہ مسجد کے قریب ایک نوجوان تلاوتِ کلام پاک میں مصروف ہے اور اپنے سامنے بیلچا اور تھیلا رکھے ہوئے ہے۔ میں نے اس نوجوان سے پوچھا" کیا تم مزدوری کرتے ہو ؟"

اس نے جواب دیا" کیوں نہیں" اپنی روزی روٹی کمانے کے لئے ہر شخص کو محنت مزدوری کرنی چاہیئے۔ میں نے کہا" بس اٹھو۔ میرے ساتھ آجاؤ۔ اس نے کہا" پہلے میری مزدوری طے کر لو" میں نے اس کی مزدوری ایک درہم طے کر دی۔ وہ نوجوان میرے ساتھ گھر آ گیا اور شام تک بڑی محنت سے کام کرتا رہا اس کے کام سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اس نے اکیلے دم دو آدمیوں کا کام انجام دیا ہے۔ شام کے وقت میں نے اسے دو درہم دینا چاہا مگر وہ اس بات پر راضی نہ ہوا اور کہنے لگا۔ مجھے بس اتنی ہی مزدوری چاہیئے۔ جو پہلے طے ہوئی ہے اس سے زیادہ نہیں لوں گا بہرحال اجرت حاصل کرنے کے بعد وہ واپس چلا گیا۔ دوسرے دن صبح کے وقت میں پھر اس مسجد کے قریب آ گیا تاکہ گھر کا باقی کام بھی اسی سے کراؤں۔ لیکن وہ وہاں موجود نہ تھا۔ لوگوں نے بتایا کہ وہ ہفتے میں ایک دن سنیچر کو کام کرتا ہے اور باقی دنوں میں وہ عبادتِ خداوندی میں مصروف رہا کرتا ہے پس میں نے سنیچر سے کام لیا اور دوسرے

سنیچر کو میں اسے اپنے گھر لے گیا۔ اس نے اپنا کام انجام دیا۔ اجرت لی اور واپس چلا گیا۔ تیسرے ہفتہ کو میں اس کی تلاش میں پھر نکلا مگر وہ نہیں ملا۔ لوگوں سے دریافت کرنے پر پتہ چلا کہ وہ دو تین دنوں سے بیمار ہے میں نے پتہ معلوم کیا اور اس کے پاس پہنچ گیا۔ اس کا سر اپنے زانوں پر رکھ لیا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے آنکھ کھولی مجھے فوراً پہچان لیا اور کہنے لگا۔ کیا تو مجھے پہچاننا چاہتا ہے؟" اس نے جواب دیا۔

میں ہارون رشید کا لڑکا قاسم ہوں۔"

اس کا یہ جواب سنتے ہی میرا بدن تھرتھرانے لگا۔ میں نے سوچا کہ اگر ہارون رشید کو پتہ چل گیا کہ میں نے اس کے لڑکے سے معمولی مزدور کا کام لیا ہے۔ تو وہ میرے ساتھ کیا سلوک کرے گا۔

قاسم کو یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ میں ڈر گیا ہوں" کہنے لگا۔ درحقیقت اس شہر میں مجھے کوئی نہیں پہچانتا اور اس وقت اگر موت کے آثار نمودار نہ ہوئے ہوتے تو میں تمہیں بھی اپنا نام نہ بتاتا۔ اب تم سے میری خواہش ہے کہ جب میں اس دنیا سے اٹھ جاؤں تو میرا یہ بیلچہ اور تھیلا اس شخص کو دے دینا جو میری قبر تیار کرے۔ میرے اس مونس حقیقی یعنی مجید کو ایسے آدمی کے سپرد کرنا جو اس کی تلاوت کرے۔ اس کے بعد قاسم نے اپنی انگلی سے ایک انگوٹھی اتار کر کہا۔ "تم یہ انگوٹھی لے کر بغداد چلے جانا۔ میرے والد ہارون سے دوشنبہ کے دن دربار عام میں ملاقات کرنا یہ انگوٹھی ان کے سامنے رکھ دینا اس انگوٹھی کو وہ پہچان لیں گے۔ یہ مجھے انھوں نے ہی دی تھی۔ ان سے کہنا کہ تمہارا بیٹا قاسم بصرہ میں موت سے ہم آغوش ہو گیا اس نے مجھ سے یہ وصیت کی تھی میں یہ انگوٹھی تمہارے پاس پہنچا دوں اور اس کا یہ پیغام بھی تمہاری خدمت میں پیش کر دوں کہ اباجان! آپ لوگوں کا مال جمع کرنے میں بڑی ہمت اور بہادری سے کام لیتے ہیں۔ اس انگوٹھی کو بھی مال کے اس انبار میں شامل کر لیجئے۔ میرے پاس اتنی طاقت نہیں ہے کہ میں قیامت کے دن اس انگوٹھی کا حساب دے سکوں۔

عبداللہ بصری کہتے ہیں کہ یہ جملہ ادا کرتے ہی قاسم کی روح اس کے آشیانہ بدن سے پرواز کر گئی۔

بزمِ خیال

(اس کے تحت قارئین دو علمی یا ادبی سوالات پوچھ سکتے ہیں)

س - کیا یہ صحیح ہے کہ حضورؐ کو کھانے میں زہر دیا گیا تھا۔

ج - بیان کیا جاتا ہے کہ فتح خیبر کے موقع پر ایک یہودن نے۔ جسکا نام زینب تھا اور جو سلام بن مشکم کی بیوی تھی، ایسی حرکت کی تھی جسکی پروردگار عالم نے آپ کو بروقت اطلاع دیدی۔
یہودی ذہن مکاری میں کتنا تیز ہوتا ہے اسکا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس عورت نے زہر دینے سے پہلے پوری تحقیق کی کہ حضور کو کیا چیزیں پسند ہیں اور انمیں بھی وہ کونسی چیزیں ہیں جنھیں آپ زیادہ رغبت سے کھاتے ہیں جب اُسے معلوم ہوا کہ حضورؐ بکری کا گوشت پسند کرتے ہیں تو اس میں زہر ملا دیا اور یہ معلوم کرنے کے بعد کہ بکری کے گوشت میں حضور کو بازو کا حصہ زیادہ مرغوب ہے تو دست کے گوشت میں زیادہ زہر ملایا اور یہ پکوان حضورؐ کے پاس بھیج دیا۔ حضورؐ نے لقمہ منہ میں رکھتے ہی تھوک دیا اور فرمایا کہ اس گوشت نے مجھے بتلا دیا ہے کہ اسمیں زہر کی آمیزش کی گئی ہے چنانچہ آپ نے صحابہ کو بھی اسکے کھانے سے روک دیا مگر حضرت براءؓ لقمہ نگل چکے تھے چنانچہ اس کے اثر سے وہ شہید ہوگئے۔ اس یہودن کو بلا کر پرسش کی گئی تو اس نے اقرار کر لیا۔ حضورؐ نے اسکے قبیلے کے یہودیوں کو بلا کر سختی سے پوچھا تو انھوں نے بھی اعتراف کیا مگر مکاری سے یہ کہانی گڑھی کہ ہم اس بات کا امتحان لینا چاہتے تھے کہ آپ سچے نبی ہیں یا نہیں۔ یہ دراصل بہانہ تھا ورنہ یہ وہ قوم ہے جس نے اپنے سچے نبیوں کو بے دریغ قتل کیا ہے اور قرآن اس پر گواہ ہے۔

س - حضورؐ پر جادو کس نے کروایا تھا۔

ج - آج دنیا میں یہودیوں نے اپنے مفاد کی خاطر جس طرح ہر جائز اور ناجائز عمل کو اپنے لئے حلال سمجھ لیا ہے یہ ذہنیت حضورؐ کے زمانے سے ہی چلی آئی ہے اور اس قوم نے اپنے عمل سے ثابت کر دیا ہے کہ سورۂ فاتحہ میں "مغضوب" کہہ کر جس قوم کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ یہی قوم ہے چنانچہ لبید بن عاصم نامی یہودی نے اپنی قوم کے اصرار پر یہ گھناؤنا عمل کیا جس سے حضورؐ ایک عجیب کیفیت سے دوچار ہوگئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی آپ کو اس سے آگاہ کیا۔ حضورؐ کے بالوں پر کچھ سحر پھونک کر اسے ایک کنویں میں ڈال دیا گیا تھا۔ وحی الٰہی نے آپ پر اس کنویں اور کیفیت سحر سے آگاہ کر دیا چنانچہ حضورؐ نے کنویں میں سے سحر زدہ بال نکلوا کر سحر کے اثرات کو بحکم الٰہی زائل کر دیا۔

نذرِ عقیدت بہ شاعرِ "محمد نامہ"

علی افسر فدا کارِ محمدؐ ؛ خوشا! گلچینِ گلزارِ محمدؐ
دُرے در بارِ دُربارِ محمدؐ ؛ نثارِ شمعِ رخسارِ محمدؐ
بحکمِ رب بہ جنت رفت و آنجا ؛ مشرف شد بہ دیدارِ محمدؐ

آر۔ بانو